تعلیم کا تہذیبی نظریہ

نعیم صدیقی

تعلیم کا تہذیبی نظریہ

نعیم صدیقی

370.115 Naeem Siddiqi
Taleem ka Tehzeebi Nazria / Naeem Siddiqi.- Lahore: Al-Faisal Nashran, 2009.
679p.

1. Tehzeeb aur Taleem I. Title card

ISBN 969-503-762-3

زیر اہتمام
ادارہ مطالعہ و تحقیق
19/BIII(Ext)-ایجوکیشن ٹاؤن، وحدت روڈ، لاہور
فون: 042-5419508 * E.mail:isrpk@hotmail.com

مئی 2009ء
محمد فیصل نے
آر۔آر پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی۔

قیمت:-/500 روپے

AL-FAISAL NASHRAN
Ghazni Street,Urdu Bazar,Lahore.Pakistan
Phone : 042-7230777 Fax : 09242-7231387
http : www.alfaisalpublishers.com
e.mail : alfaisal_pk@hotmail.com

ترتیب

حصہ اول

تعلیم — فکری اساس

حصہ دوم

پاکستانی نظام تعلیم ۲۷۹

ہمارے مفکرین کے تعلیم و تہذیب پر اثرات

موجودہ نظام تعلیم

تعلیم کی تشکیل نو

سرکاری تعلیمی پالیسیاں

غیر ملکی سامراج اور نظام تعلیم

مسائل تعلیم

حصہ سوم

عمل تعلیم

مدارس

معلم

طالب علم

نصابِ تعلیم

ہم نصابی سرگرمیاں

معاشرہ

حصہ چہارم

غیر رسمی تعلیم

رسمی تعلیم

پیش لفظ

زمین پر انسان کے کردار' جو قرآن کے الفاظ میں استخلاف سے عبارت ہے اور علم کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تخلیق آدم کا فیصلہ اور حضرت آدمؑ کو علم کے زیور سے آراستہ کرنا اس رشتے کا مظہر ہے: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (البقرہ ۲:۳۰) (میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں) کے فیصلے کے معاً بعد وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا (البقرہ ۲:۳۱) (اس کے بعد اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے) اس حقیقت کا غماز ہے کہ زمین پر خلافت کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کا تعلق جس صلاحیت اور تیاری سے ہے' اس کی بنیاد علم ہے۔ علمِ اشیا کے ساتھ خیر و شر اور حق و باطل کا علم ہے جسے الھدیٰ کی جامع اصطلاح سے بیان کیا گیا ہے اور جس کی روشنی میں انسان ان صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کر کے ترقی کی معراج تک پہنچ سکتا ہے جو اس میں ودیعت کی گئی ہیں: فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (البقرہ ۲:۳۸) (پھر میری طرف سے کوئی ہدایت تمھارے پاس پہنچے' تو جو میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہو گا۔)

کائنات میں انسان کے لیے ہدایات اور رہنمائی کا جو نظام اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے اس میں انسان میں علم کے حصول کی صلاحیت اور سمع' بصر اور فواد کے ذریعے انفس اور آفاق دونوں دنیاؤں سے حصولِ علم اور الہامی ہدایت کے ذریعے اس علم اور ان صلاحیتوں کا صحیح صحیح استعمال شامل ہیں۔ علم کا اسلامی مثالیہ (Paradigm) عبارت ہے انسان میں ودیعت کردہ اندرونی استعداد کے ساتھ باہر کی اشیا کے علم' اس کے حاصل کرنے کے وسائل اور صلاحیتوں کی تفویض اور وحی کے ذریعے دی جانے والی ہدایت کے ذریعے علم کی پوری دنیا کی صحیح خطوط پر درو بست اور صحیح حدود کے اندر اسے اس کی معراج تک پہنچانے کے مواقع اور مساعی سے ___ یہ تینوں مل کر' ایک دوسرے کی تکمیل اور تحفظ کرتے ہوئے' انسان کو اس کے حقیقی

کردار کے ادا کرنے کے لائق بناتے ہیں۔

اس تصور میں مرکزیت اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی دی ہوئی ہدایت کو حاصل ہے' لیکن رب سے اس تعلق کے ساتھ خالق کائنات نے خود میں جو قوتیں اور امکانات رکھے ہیں' ان تک رسائی اور ان سے استفادہ بھی اس کا حصہ ہے۔ البتہ اسلامی اور جاہلی تصور میں فرق یہ ہے کہ جاہلی تصور میں انسان کائنات میں پائی جانے والی قوتوں' وسائل اور امکانات میں کھو جاتا ہے' اور رب سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ جب کہ اسلام کے تصورِ علم میں رب سے رشتے کی استواری اور اللہ کی رہنمائی کی مرکزیت کے ساتھ کائنات میں پائی جانے والی تمام قوتوں اور امکانات کی تسخیر شامل ہے۔ اولین وحی میں اس نازک مگر انقلابی تصور کو بڑی خوب صورتی سے پیش کر دیا گیا ہے' اور علم کی جامعیت اور اپنے مرکز سے استواری ہی اسلامی تصور کی اصل جان ہے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ○ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ○

(العلق ۹۶:۱۔۵)

پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا' جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی' پڑھو اور تمھارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا' انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔

ان پانچ آیات میں مرکزی کردار خالق ارض و سما کا ہے اور علم کا اصل سرچشمہ بھی وہی ہے۔ اسی نے اسما کے علم سے نوازا اور خیر و شر کے پیمانوں سے رہنمائی فرمائی۔ اس لیے علم' زندگی اور تہذیب و تمدن کے لیے اصل مرکز و محور اللہ اور اس کا دیا ہوا علم ہے۔ لیکن غور کرنے کی بات ہے کہ یہاں تین مزید حقیقتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے' یعنی خلق جو پورے نظامِ طبع اور کائنات کا عنوان ہے۔ دوسرے' علق جو طبعی اور مادی دنیا کے ساتھ انسانی اور حیاتیاتی دنیا کی علامت ہے اور تیسرے قلم جو انسان اور کائنات کے وسائل کے عمل و تعامل کے نتیجے میں رونما ہونے والے وسائل' اور ٹکنالوجی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو علم کا سارا میدان یہی چار دنیائیں ہیں یعنی عالمِ خلق (Physical World) عالمِ علق (Biological World)' قلم یعنی ٹکنالوجی (Technology) اور ہدایت۔ اسلام کا تصورِ علم ان چاروں کا

جامع ہے جو مربوط (Intergrated) بھی ہے اور منضبط بھی اور جسے مربوط اور کلی (Holistic) کہا جا سکتا ہے۔ اسی کے نتیجے میں ایک ایسی شخصیت رونما ہوتی ہے جو مربوط بھی ہو اور متوازن (Balanced) بھی۔ اور ایسا معاشرہ اور تہذیب وجود میں آتی ہے' جو نہ صرف مربوط اور متوازن ہو بلکہ توازن (Equilibrium) اور عدل کا بہترین نمونہ ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیائے کرام کے ذریعے علم' انسان اور تہذیب کے لیے اسی نمونہ کو ہمارے سامنے پیش فرمایا۔ یہ انبیائے کرام علیہم السلام انسانیت کو اسی نمونے کی تعلیم دینے کی خدمت انجام دیتے رہے' جس کا مکمل ترین نمونہ خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ نے پیش کیا اور فرمایا کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں: **انما بعثت معلمًا۔**

نبی اکرم ﷺ نے انسانی تاریخ میں جو انقلاب برپا کیا' اسے اگر ایک ہمہ گیر تعلیمی انقلاب کہا جائے تو شاید اس کی صحیح ترین تصویر کشی ہو سکے گی۔ بلاشبہ اس انقلاب کا ایک اہم پہلو اسلام کو ایک غالب اور بالا دست قوت بنانا بھی تھا اور لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے۔ الصف ۶۱:۹) اس کا حصہ ہے، لیکن یہ پورا عمل ایک تعلیمی تحریک سے وابستہ ہے' جس میں فرد کی اندر سے قلب ماہیت اور اس نئے انسان کے ذریعے ایک نئے خاندان' نئے معاشرے، نئی معیشت' نئی سلطنت اور نئی تہذیب کا قیام ہے۔ تعلیم اس کی روح رواں ہے اور تعلیم ہی وہ ذریعہ ہے جس سے وہ انسان اور ادارے وجود میں آتے ہیں' جو زندگی کے پورے نظام کی اسلام کی اقدار اور مقاصد کے مطابق صورت گری کرتے ہیں۔ اس لیے امت مسلمہ کی ترقی اور زوال اور سطوت اور محکومی کا سارا انحصار تعلیم اور نظام تعلیم پر ہے، اور احیائے اسلام کی تحریک دراصل ایک انقلابی تعلیمی تحریک ہے۔ آج امت کے مسائل اور مصائب کی جڑ تعلیم کے غیر تسلی بخش انتظام میں دیکھی جا سکتی ہے' اور جس شخص کو بھی امت کی تعمیر اور تشکیل نو کی فکر ہو گی وہ تعلیم کے مسئلے کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

برادر محترم و مکرم نعیم صدیقی امت کے ان دردمند مصلحین میں سے ہیں جن کی سوچ اور فکر کا محور اسلام تھا اور جنھوں نے اپنی پوری زندگی اس کار خیر کے لیے وقف کر دی کہ اسلام کی روشنی میں مسلمانوں کی زندگی کی تعمیر نو کریں اور اسلام کو ایک بار پھر فرد اور معاشرے کی اصل کارفرما قوت بنا دیں' تاکہ اقبال کے الفاظ میں وہ صحرا نشین تاریخ میں جو کردار ادا کریں اسے ان چار لفظوں میں سمیٹا جا سکے:

جہاں گیرو جہاں دارو جہاں بان و جہاں آرا

نعیم صدیقی ایک بالغ نظر مفکر' ایک صاحب دل داعی' اور ایک دردمند مصلح تھے ___ بیسویں صدی میں تحریک اسلامی کی ایک قیمتی متاع! اور میرے لیے وہ ایک بڑے بھائی ہی نہیں ایک قائد اور مربی بھی تھے۔ نعیم صاحب نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی۔ محسن انسانیتؐ ان کا شاہکار ہے۔ معاشی موضوعات پر انھوں نے بڑی دقت نظر سے کلام کیا ہے اور نئے نئے گوشے اجاگر کیے ہیں۔ معاشی ناہمواریوں کے موضوع پر ان کی کتاب کلاسیک کی حیثیت رکھتی ہے۔

محترم نعیم صاحب نے تعلیم کے موضوع پر بے شمار مضامین لکھے اور قیمتی مباحث میں حصہ لیا اور بڑے محکم دلائل سے اپنے نقطۂ نظر کو پیش کیا۔ تعلیم پر زیرنظر کتاب ان کے انھی مقالات اور مباحث کا مجموعہ ہے' جو تقریباً ساٹھ سال پر پھیلی ہوئی ان کی علمی اور تحریکی جدوجہد کے دوران لکھے گئے یا تقریر اور انٹرویو کی شکل میں پیش کیے گئے۔

ان مضامین میں اسلام کے تصورِ علم کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے سے تعلیم کے گہرے تعلق کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ تعلیم کے جاہلی تصور پر بھرپور جرح وتنقید ہے۔ مسلمانوں کی تعلیمی روایت کی صحیح صحیح عکاسی ہے اور جدید تعلیمی نظام کی اس سے دُوری پر کڑا احتساب ہے۔ مسلمانوں کے اپنے تعلیمی نظام میں جو خامیاں اور کمزوریاں ہیں' ان کی نشان دہی ہے اور سب سے بڑھ کر اسلام کے علم اور نظام تعلیم کی بھرپور عکاسی ہے۔ نیز تعلیم کی اسلامی تشکیلِ جدید کے لیے فکری اور عملی سطح پر جو کچھ کرنا ضروری ہے اس کی نشاندہی ہے۔

چونکہ یہ کتاب مختلف اوقات میں لکھی جانے والی تحریروں پر مشتمل ہے' اس لیے اس میں وہ تسلسل نہیں جو کسی ایک موضوع پر لکھی جانے والی کتاب میں ہوتا ہے' لیکن اس کی حیثیت اس گلدستے کی سی ہے' جس میں علم اور تعلیم سے متعلق پھول' چمن کے ہر گوشے سے لا کر ایک جگہ پیش کر دیے گئے ہوں۔ اپنی موجودہ شکل میں علم اور تعلیم کے موضوع پر یہ ایک وقیع پیش کش ہے' اس میں تعلیم کی تشکیل نو کے تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کرلیا گیا ہے۔ جس میں فکر کی صحت اور گہرائی کے ساتھ عملی مسائل اور مشکلات کا پورا شعور' ادراک اور مسائل کو حل کرنے کے لیے روشنی کا بھرپور سامان ہے۔

مجھے بڑی خوشی ہے کہ ان بکھرے ہوئے موتیوں کو نہایت محنت اور قابلیت سے ایک

حسین مالا میں جوڑ دیا گیا ہے۔ جس سے اس کتاب نے ایک چراغِ راہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ طالبینِ علم کے لیے یہ روشنی کا مینار اور نظامِ تعلیم کی اصلاح کرنے والوں کے لیے مشعلِ راہ کا کردار ادا کرے گی۔

خورشید احمد

اسلام آباد
۲۱/ اپریل ۲۰۰۸ء

تعلیم — تہذیب وثقافت

نعیم صدیقی کا تعلیم وتعلم سے جو تعلق رہا ہے اس سے اکثریت آگاہ ہے۔ وہ معلّموں کے خاندان میں پیدا ہوئے، والد گرامی قاضی سراج الدین اور بعض دیگر قریب ترین رشتہ دار تعلیم کے نامور مدرس تھے ہی، بلکہ تعلیم کا اگر وسیع تصور سامنے رکھا جائے تو اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ''سو پشت سے ہے پیشۂ آباء معلّمی''۔ نعیم صدیقی صاحب نے بھی ابتداءً معلّمی ہی کا پیشہ اختیار کیا لیکن تصنیف وتالیف اور صحافت کا مشغلہ اختیار کرنے سے وہ سلسلہ منقطع ہو گیا، گو کام کی نوعیت بہ اعتبارِ حقیقت معلمانہ ہی رہی۔ اقامتِ دین کی ذمہ داری کے شعور نے زندگی کے تمام شعبوں کو ایک خدا، ایک کتاب اور ایک رسول ﷺ کی مرکزیت اور باہمی ارتباط پر مطمئن کر دیا، زندگی کا مشن رزمِ حق و باطل میں حضورؐ کے ایک ادنیٰ سپاہی کا کردار ادا کرنا قرار پایا۔

''تعلیم کا تہذیبی نظریہ'' بنیادی طور پر نعیم صدیقی (۱۹۱۶ء -- ۲۰۰۲ء) کے تعلیم سے متعلق مقالات، مضامین، تقریروں، تبصروں، مشوروں اور تجاویز سے متعلق اس وسیع مواد ہی سے ماخذ ہے جو انھوں نے اس طویل عرصہ میں وقتاً فوقتاً پیش کیا، لیکن اس کا افق اس سے بہت وسیع تر ہے۔

> ''مجھے اپنے شعوری ایمان کی بنا پر اپنے متعلق یہ حسنِ ظن ہے کہ مجھے خزانہء ازل سے تخلیقی جوہر تھوڑی بہت مقدار میں ودیعت کیا گیا ہے، جس سے کام لے کر میں اپنی قوم میں وہ انقلابی شعور اُبھار سکتا ہوں جو اغیار کے مسلط کردہ نظامِ تعلیم کے گرداب کا حلقہ توڑ کر نکلنے کا ضامن ہو سکتا ہے۔
>
> یہ سارا ہمارے تصورِ تہذیب کا اُلٹ ہے۔ بدقسمتی سے مغربی تہذیب کی اُلٹی کھوپڑی ابھی تک ہمارے سروں پر لدی ہے۔ معاشرہ اور اس کے بہت سے ادارات اور علم وادب کے شہ پارے مکڑوں کی طرح ہمارے اپنے تصورِ تہذیب کے خلاف جالے تن رہے ہیں۔''

میرے خیال میں نعیم صدیقی کا یہ مختصر اقتباس اس تشریح کے لیے بہت کافی ہے کہ یہ اس ''کروسیڈ'' یا تہذیبوں کی جنگ کا مکمل احاطہ بھی کرتی ہے جو دنیا بھر کی طاغوطی طاقتوں (حیوانی تہذیب) نے، اقوامِ متحدہ کے زیرِ سایہ، تمام حدود و قیود سے آزاد، دہشت گردی کی کسی واضح اور متعین تعریف کے بغیر، یکطرفہ طور پر اُمّتِ مسلمہ کے خلاف یہاں وہاں، اِدھر اُدھر چھیڑ رکھی ہے۔ کتاب میں بعض مقامات پر تفصیلات اور گہرائی مطلوب معیار اور ضرورت سے کم تر ہوسکتی ہے کیونکہ یہ سب کچھ باقاعدہ ایک کتاب کا نقشہ ذہن میں رکھ کر تحریر نہیں کیا گیا، لیکن وہی بات ہے ''الل ٹپ بھی نہیں ہے'' انشاء اللہ کتاب اپنا مقام اور افادیت ثابت کرے گی۔

کتاب کے نام میں 'تہذیبوں کی جنگ' کی عدم موجودگی کا احساس اسی تہذیبی شکست و ریخت کا تسلسل نظر آتا ہے جو پیچھے سے چلا آرہا ہے۔ نعیم صدیقی نے جب شعوری طور پر اسلام کو اختیار کرنے کے بعد اقامتِ دین کا کام شروع کیا تو عملی جدوجہد نے ان پر واضح کیا کہ اسلام یا مسلمان کے الفاظ اپنے مفہوم، تعارف، اور حدودِ اربعہ میں چودہ سو سال پہلے جتنے فصیح اور جامع تھے، شیطان نے باطل تہذیبوں کے ہاتھوں چھیل چھال، کاٹ پیٹ کر ان کی وہ شکل وصورت متعارف کروادی ہے جس سے نہ تو ان کی شناخت ممکن رہی اور نہ تعارف۔ چنانچہ نعیم صدیقی کو بات شروع کرنے سے قبل بہت سی تفصیلات لفظ ''شعور'' میں سمو کر سابقہ (دیباچہ) کے طور پر اسلام اور مسلمان کے ساتھ متعارف کروانا پڑیں۔ ہمارے خیال میں یہی وجہ ہے کہ وقت کے چند ایک کرنوں کے گذرنے کے ساتھ آج ہم اسی مقام پر غلطاں و حیراں کھڑے ہیں، ورنہ تعلیم پر پالیسی اور نصاب سمیت بیشمار موضوعات سے متعلق ایک باعمل اسلامی سکالر اور دانشور کی کتاب جس کا ماٹو یہ رہا کہ '' میرا نیزہ، میری تلوار، میرا تیر، جو کچھ ہے یہ قلم ہے۔''، لامحالہ رزمِ حق و باطل اور تہذیبوں کی جنگ سے متعلق تو ہوگی ہی۔

نوآبادیاتی استعمار ملکہ برطانیہ کی سربراہی اور یہود کی معیت میں یورپ سے آگے بڑھتے ہوئے پورے عالمِ اسلام کو محکوم بناتا ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں برِصغیر میں داخل ہوا تو اُن کا نشانہ مسلم حکمرانوں کے ساتھ ساتھ اسلام اور اسلامی تہذیب تھی جسے وہ روندتے چلے آرہے تھے۔ انگریز نے مغربی تہذیب کے اساسی نظریہ کے مطابق مذہب کا کانٹا زندگی کی

تگو دو سے نکالنے کے بعد، اقتدار کی غلام گردشوں، سول و خاکی بیوروکریسی اور پڑھی لکھی سوسائٹی میں سیکولر ذہنیت اور مذاق کی رسم و راہ متعارف کروائی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی (غدر) کے بعد ہندوستان براہِ راست تاجِ برطانیہ کے تحت آ گیا جس سے صورت حال یکسر مختلف ہوگئی۔ ایسے میں سامراجی طاقتوں کے طریقہ کار کے مطابق محکوم قوم کو دائمی غلامی اور محکومی کے شکنجے میں جکڑنے کے لیے تلوار سے بڑھ کر تعلیم و تربیت، ثقافت اور کلچر کو استعمال کیا جاتا ہے۔ تلوار کا دائرہ ءکار تو میدانِ جنگ میں فتح تک محدود ہوتا ہے جبکہ تعلیم، ثقافت اور کلچر شہروں، گلی کوچوں، اور گھروں میں فاتح قوت کے ذہنی اور تہذیبی غلبہ کا باعث بنتی ہے۔ اس حکمتِ عملی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ غلام قوموں کا پڑھا لکھا طبقہ، علم و دانش کے میدان میں سامراجی طاقتوں کے عزائم کی تکمیل کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ غلام قوم اور احساسِ کہتری کا شکار اس کے نام نہاد لیڈر، شعراء، حکماء، اور علماء ان ہی مقاصد کی تبلیغ کرنے لگتے ہیں، جو سامراجی قوتوں کے پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ چنانچہ لارڈ میکالے جو اس نظامِ تعلیم کا بانی تھا، نے کہا تھا کہ ہمارے نظامِ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی اپنی چمڑی کی رنگت کے اعتبار سے تو ہندوستانی رہیں لیکن اپنے ذہن، فکر، تہذیب، ثقافت اور اپنی معاشرت کے اعتبار سے یورپی بن جائیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد اگر دیانت وشعور کے ساتھ کوئی کارفرما قوت کام کرتی تو تعمیر فردا کے لیے اس کا اوّلین میدان کار نظامِ تعلیم ہوتا۔ پاکستان کے نام پر جو انقلاب مطلوب تھا اس کا پہلا قدم تعلیمی انقلاب ہی ہو سکتا تھا، مگر اُلٹا ہوا یہ کہ غلامی کے نظامِ تعلیم کی ایسی کڑی حفاظت کی گئی، گویا وہ کوئی مقدس میراث ہو۔ چنانچہ تعلیم جیسا بنیادی اور اہم شعبہ بھی نظریاتی اور تنظیمی دونوں پہلوؤں سے جس چاک دامانی میں مبتلاء ہے وہ بہت بڑا نمونہ عبرت ہے۔ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی ہدایت کے بارے میں جو مسلمانِ کرام احساسِ کمتری بلکہ (نعوذ باللہ احساسِ مجرمانہ کے جذام میں مبتلاء ہوتے گئے اور جنھوں نے سامراجی طاقتوں کی تہذیب و تعلیم کی نقالی (اب تو درآمد) کو باعثِ ترقی و روشن خیالی سمجھ کر برسوں کی محنتیں اور مالی ذرائع میکالے کے تعلیمی سسٹم پر کھپا دیئے، انہیں پاکستان سے پہلے تو کیا پاکستان کی آزاد فضاؤں میں کچھ نہ ملا۔ وہ نیم کے درخت پر انگور کی بیلیں (قلمیں) لگا لگا کر یہ امید کرتے رہے کہ عنقریب دامن انگوروں سے بھر جائیں گے۔ مگر کسی قیمت پر انہوں نے درخت بدلنے یا اسکی جڑوں کو

اُکھیڑ کر اپنے اصول و مقاصد اور ضروریات کے مطابق تعلیم کا نیا پودا لگانے کی کوشش نہ کی۔ سو نعیم صدیقی کے الفاظ میں:-

> ''انقلابِ تعلیم کو بپا کرنے میں کوتاہی کے جو سنگین نتائج ہم نے بھگتے ہیں سو بھگتے، اب تو تاریخ کے تباہ کن عوامل کی زد سے اپنے آپ کو نکالنے کے لیے جہاد و اجتہاد کی جس قوت کی شدید ضرورت ہمیں درپیش ہے اس کا حصول نظامِ تعلیم کو فوری طور پر بدلے بغیر ممکن نہیں ہے۔''

جو لوگ قرآن و سنّت سے منوّر دل و دماغ رکھتے ہیں، علیم و خبیر کی کسوٹی سے جلاء پاتے رہتے ہیں۔ وہ مروّجہ وسیع الظرف نہیں لیکن انکے دماغ وسیع ہوتے ہیں جن سے سوچتے اور کام کرتے ہیں ان کے افادات و خیالات کی جڑیں ایک طرف پندرہ سو سال قبل کے چشمہء صافی اور رشد و ہدایت کے منبع سے منسلک ہوتی ہیں تو دوسری طرف ان روشن چراغوں کے ساتھ باہم مربوط ہوتی ہیں جو آگے پیچھے کسی دور میں ہو گذرے ہوں۔ یہ روشن چراغ نہ ستائش کے مرہونِ منت، نہ داد بے داد سے متاثر ہونے والے، یہ اصول و قوائد، اقدار و روایات نبھانے والے، ان کی بصیرت و بصارت دور مستقبل میں اس افق پر ہوتی ہے، اس یقین سے کام کرتے ہیں کہ ہمارا ایک ایک پُر خلوص لفظ (شجرِ طیّبہ کا) وہ بیج ہے جو آج نہیں تو کل پھوٹے گا جہاں بہر حال حق کو اس بالا تر تہذیب کو ایک مرتبہ پھر غالب آنا ہے۔ چاہے یہ انکار کرنے والوں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔

اس کتاب کے مصنف نعیم صدیقی کا شعور اور قرآن پر ایمان و اعتقاد نے انہیں وہ اعتماد عطاء فرمایا کہ رزمِ خیر و شر کے ادنیٰ سپاہی کی حیثیت میں چوکھی لڑتے، جنگاہ میں جہاں کہیں کوئی مورچہ کمزور یا خالی دیکھا اس کی ذمہ داری بھی اپنے اوپر واجب کر لی اور جس کام پر توجہ دی گویا حق ادا کر دیا۔ یہی صورت یہاں محاذِ تعلیم اور تہذیبی جنگ اور معرکہ حق و باطل کی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک شخص کس طرح سالہا سال، پاکستان بننے سے پہلے دور سے مسلسل اپنی زندگی کے آخری دور تک یعنی، آغا خاں بورڈ اور ترقی و روشن خیالی کے اس آخری دَور تک تعلیم کے محاذ پر بھی دیدبانی کرتا رہا اور الّا ماشاءاللہ کوئی اہم پہلو یا بات اس کی توجہ حاصل کیے بغیر نہیں رہی۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ شعبہء تعلیم سے تعلق رکھنے والے ہر شخص

کے لیے اس کتاب کا مطالعہ انتہائی ضروری ہی نہیں لازمی ہوگا۔ان کے لیے بھی جو موجودہ نظامِ تعلیم کو نام نہاد ترقی و روشن خیالی کی راہوں پر بگٹٹ دوڑائے لیے جا رہے ہیں، جو تعلیم یا نظام سے کوئی جذباتی تعلق نہیں رکھتے، ملازمت کرتے ہیں اور کرنا جانتے ہیں، باتیں بنانا بھی پسند نہیں کرتے۔تعلیم پر بات کرنا اور بنانا بھی آ جائے گا اور خوب تر، انشاء اللہ۔

ہمارے / اسلامی نظامِ تعلیم و تربیت کو اس کے تسلیم شدہ بالا تر مقام پر دوبارہ سرفراز کرنے کے لیے اسے اسکی بنیادوں پر کھڑا،سوتوں سے منسلک اور اس ''شجرِ طیبہ'' کی اُن روٹس (جڑوں) کی از سرِ نو پیوند کاری لازم و ملزوم ہے جنھیں جبراً کاٹ دیا گیا،(جبکہ بدیسی بد روحیں آج بھی مدارس کی آخری حد تک بیخ کنی میں مصروف ہیں)۔اور ترقی و روشن خیالی کے سراب (حقیقتاً ''بلیک ہول'') دکھا دکھا کر احساسِ کہتری اور تقلید کے مسمریزم میں مبتلا کر دیا گیا اور :-

> '' ہمارا حال ایک ایسے آسیب زدہ آدمی کا سا ہے جس پر کسی بدروح نے اپنا منحوس سایہ ڈال رکھا ہو، اس کا دماغ، اپنی زبان اور ہاتھ پاؤں اس کے بس میں نہ ہوں بلکہ وہ آسیب کے منشاء کے مطابق ہو۔اس کی اپنے عادات، اطوار اور ذوق و آداب سب گم ہو جائیں، اس کی شخصیت مٹ جائے، اور ایک اجنبی شخصیت اس کے پیکر میں اپنا آشیانہ بنا لے۔ ذہنی غلامی کا آسیب ہمارے سروں پر ایسا سوار ہوا ہے کہ گھروں، بازاروں ذرائع ابلاغ، تعلیم گاہوں، پارلیمانی اور حکومتی دفتروں تک اس آسیب کے منحوس سائے پھیلے ہوئے ہیں۔
>
> سو جب تک ہم اپنے آسیب کی زبان اور لہجے میں بات کر رہے ہیں، ہمارے دل و دماغ سب اس کے قبضے میں ہیں۔ وہ جب رخصت ہوگا تو سب سے پہلے ہماری زبان ہی شہادت دے گی کہ بلا ٹل گئی ہے''

اب ایک تو ''تن بہ تقدیر'' والی حکمتِ عملی ہے۔لیکن نعیم صدیقی نے بجا طور پر تبدیلی کا ممکنہ راستہ، ہمہ جہت انقلاب کی شکل میں تجویز کیا ہے۔ یہ دنیا جامد اور دبّو افراد کے لیے نہیں بنی۔چنانچہ ہمیں آگے بڑھ کر اقدام کرنا ہوگا۔کہ دُور افق کے اس پار اسلامی نشاۃ ثانیہ کے اُبھرتے دَور کو اپنی روایات، اقدار و اصول و قوائد کے اُس درخشاں دور کے ساتھ یوں مربوط

کر دکھائیں کہ گویا بیچ میں ترقی پسندی اور روشن خیالی کی چکا چوند سے مسحور ہو کر کوئی دورِ جہالت آیا ہی نہیں۔ اور دینِ اسلام کا قافلہ پندرہ سو سال قبل کے اُس سیلِ رواں کا حصہ بن کر تعلیم و تربیت کے سابقہ اعلیٰ و ارفع مقام پر بارِ دیگر متمکن ہو اور تمام عالمِ انسانیت کے لیے علوم وفنون وترقی وخوشحالی کی راہیں جملہ حقوق (copy right) کی کسی قدغن کے بغیر کھلی ہوں۔

اس وقت یکساں (ایک ہی) نظامِ تعلیم ہوگا۔ اصحاب صفہ کے ابتدائی تعلیمی و تدریسی مکتب اور مکتبِ فکر سے (وہی علامہ اقبالؒ اور ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا جدید خانقاہی نظامِ تعلیم بمع عملی تربیت) بھی رابطے بحال ہوں گے۔ ہر طلباء جمعیت اور انجمن طلبہ عربیہ ایک ہی گھر میں سوکناپے کا شکار نہیں ہونگی۔ بلکہ وسیع القلبی کے سبب مہاجرین و انصار والی باہمی اخوت، اسلامی بھائی چارہ اور طبقاتی ہم آہنگی کا نقشہ ہوگا۔ تعلیم و تربیت سے روحانی و مادّی ترقی کی جدید راہیں، اجتہادی فلسفہ کے تحت، حاکمیتِ الٰہیہ کے زیرِ سایہ قدرتی انداز میں مترتب ہوتی چلی جائیں گی۔

'تعلیم کا تہذیبی نظریہ' ابتداءً ایک تقریر تھی، پھر مصنف نے اپنے ذہنِ رسا میں تعلیم سے متعلق افادات کے مجوزہ مجموعہ کے مسودہ کو اس نام سے موسوم کر دیا۔ عملاً کام نہیں ہو سکا لیکن مسودہ ضخیم سے ضخیم تر اور مواد کا دائرہ پھیلتا چلا گیا۔ نعیم صدیقی مرحوم ومغفور (۱۹۱۶ء — ۲۰۰۲ء) کے بعد ادارہ نے جب از سرِ نو کام پر توجہ دی تو مقالات، مضامین، تقاریر اور دوسری باقاعدہ تحریروں پر مشتمل حصہ تو خود مصنف کی طرف سے دیکھا ہوا مترتب موجود تھا لیکن سوالات، انٹرویوز، مختلف بحث مباحث بسلسلہ تعلیم و تدریس، گورنمنٹ ہینڈ آؤٹ و احکامات پر مشاورتی تنقید و رائے وغیرہ سے متعلق تقریباً نصف مواد باقاعدہ مترتب مسودہ کی شکل میں اپنی متعین جگہ پر نہ تھا۔ چنانچہ اس اہم کام کو سنوارنے کی ذمہ داری نوید اسلام صدیقی نے قبول کی اور اسے نبھایا۔ ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن صدیقی نے سارے کام کو اوّل تا آخر دیکھا، پڑھا اور رہنمائی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائے۔ آمین!

ادارہ سینئر پروفیسر خورشید احمد صاحب کا خصوصی طور پر ممنون ہے جنھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے ساتھ ''تعلیم کا تہذیبی نظریہ'' پر اس کتاب کی اہمیت، افادیت اور ضرورت کو جانتے ہوئے ایک مختصر مگر خوبصورت پیش لفظ سے ماموں فرمایا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے اور ان دیگر احباب اور معاونین کو بھی جنھوں نے اول و آخر اس کام کو سنوارنے اور

تکمیل سے ہمکنار کرنے میں پسِ پردہ چھوٹی بڑی کوئی بھی معاونت فرمائی۔ آمین!

اب یہ خدمت جو کچھ بھی ہے اور جیسی بھی ہے تعلیمی حلقوں کے استفادہ کے لیے پیش کرتے ہوئے ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مصنف اور ادارہ کی اس کوشش کو قبول فرمائے اور اس حقیقی مقصد اور نتائج میں ممد و معاون بنائے جس کے لیے یہ سعی ہے۔ ترتیب و تدوین میں جہاں کہیں کوئی غلطی یا کوتاہی پائی جاتی ہے اس کی ذمہ داری ادارہ پر ہے۔ آخر میں قارئین سے یہ درخواست بھی ہے کہ اس کام میں جہاں کہیں بھی غلطیاں اور کوتاہیاں پائیں، یا کسی مفید حذف و اضافہ کی نشاندھی کر سکیں تو ہمارے ساتھ ضرور تعاون کریں۔ ہم انشاء اللہ ان کے مشوروں کی روشنی میں مسودہ کی نظر ثانی کر کے اسے مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

شکریہ

۲۵/ستمبر ۲۰۰۸ء

ادارہ مطالعہ و تحقیق (رجسٹرڈ)
ایجوکیشن ٹاؤن۔ لاہور

تمہید

آغاز اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے اور جس کی شان یہ ہے کہ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ (العلق آیت ۵) (اس نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا)۔

تعلیم کے مسئلے پر بات چھیڑتے ہوئے ——— اور خصوصاً اسلامی نقطۂ نظر سے ——— یہ حقیقت میرے ذہن میں ابھر آئی ہے کہ سب سے پہلا اور سب سے بڑا معلم خود خدائے علیم و خبیر ہے جس کی درس گاہِ ازل میں آدم علیہ السلام کو "علم اشیاء" تفویض ہوا' اور جس کی معلمانہ شان کا اعتراف فرشتوں نے نہایت ہی عاجزانہ انداز سے کیا کہ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَاعَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ۔ (البقرہ:۳۲) (ترجمہ) ہم اپنے آپ کچھ نہیں جانتے' ہاں بس وہی کچھ جس کی آپ نے ہمیں تعلیم دی ہے۔ یقیناً اصل صاحب علم اور صاحب حکمت آپ ہی کی ہستی ہے۔ پھر وہی استادِ ازلی ہے جو کبھی موسیٰ علیہ السلام کو جبل طور پر ایک مختصر مدت کے کورس کے لئے بلوا کر الواح پر احکام عشرہ تفویض کرتا ہے' کبھی غار حرا میں آخری نبی حضرت محمد ﷺ کو جبریل کے ذریعے اقراء کا فرمان سناتا ہے۔ اور پھر وہی معلم و مربی ہے جس نے پوری کائنات کو ایک درس گاہ اور پوری تاریخ کو ایک تجربہ گاہ (Laboratory) کی حیثیت دے کر انسان کو جستجوئے حقائق اور اخذ عبرت کا سبق دیا' اور زندگی کے بنیادی علم (Basic Knowledge) یا جسے خود اسی کی اصطلاح کے مطابق "العلم" کہنا چاہئے' اس کا نصاب ہر دور کے لئے خود مرتب کر کے دیا۔ جی ہاں' اس صاحبِ قلم و کتاب نے بدلتے ہوئے زمانوں اور مختلف ملکوں سے تعلق رکھنے والی اقوام کو ہمیشہ ایک کتاب ہدایت یا گائیڈ بک یا رہنما کتاب عطا کی' اور اس نصابی کتاب میں اس نے ایسے اصول ثبت فرمائے کہ جو مقالید علوم کی حیثیت رکھتے ہیں کہ ان کنجیوں کو تدبر و تفکر سے استعمال کر کے بے شمار مخفی خزانہ ہائے علم کے دروازے کھولے جا سکتے ہیں۔ ان لامتناہی خزانوں میں اللہ تعالیٰ کی بے شمار آیات کے موتی بھرے پڑے ہیں۔ نوع انسانی کو بنیادی علم فلاح سے آراستہ کرنے کے لئے اس کے مدارج شعور و

مدنیت کے مطابق یکے بعد دیگرے زبور، تورات، انجیل کو اور سب سے آخر میں قرآن کو تا آخر نصابی کتاب مقرر فرمایا۔

اس نے صرف کتاب ہی مہیا نہیں کی بلکہ ساتھ ہی خود انسانوں میں سے بار بار ایسے معلم اٹھائے جنہیں اس نے خاص طور پر تربیت دے کر انسان گری یا انسان سازی کے علم و ہنر کا ماہر بنایا۔ ہر پیغمبر صاحب پیغام معلم تھا۔ اور حضور خاتم النبیین علیہ الصلوۃ والسلام کے معلمانہ مرتبے کو تو قرآن نے خوب اچھی طرح اجاگر کر دیا۔ فرمایا:

بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ:۲)

''اس نے (وحی کی) تعلیم سے محروم قوم میں رسول بھیجا جو خود انہی میں سے ہے۔ وہ ان کے سامنے خدا کی آیات پڑھ کر سناتا ہے۔ ان کا ذہنی و اخلاقی تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب الٰہی اور حکمت (دینی) کی تعلیم دیتا ہے۔''

تلاوت آیات، تزکیہ، تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت، یہ تمام کی تمام اصطلاحات جس کو حضور ﷺ کی ذمہ داریوں کے طور پر قرآن نے متعدد مقامات پر دوہرایا ہے، ایک معلمانہ شخصیت کو نمایاں کرتی ہیں۔ کہیں کہیں حضورؐ کا فریضہ تبیین بتایا گیا۔

لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (النحل:۴۴)

''ان پر واضح کر دیں کہ کیا کچھ (احکامات و ہدایات) خدا کی طرف سے انسانوں کے لئے نازل کی گئی ہیں، (اور ان کے عملاً تفصیلی تقاضے کیا ہیں) اور اس سعی کی آخری منزل یہ بتائی گئی کہ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ:۲۵۶) (ترجمہ) رشد و غیّ یا ہدایت و ضلالت کی راہیں اچھی طرح واضح ہو گئیں اور حق و باطل، خیر و شر اور حلال و حرام چھنٹ کر پہچانے جا سکتے ہیں۔ ان کی کوئی معجون مرکب باقی نہ رہے۔ نیکی بدی کی پہچان میں کوئی مغالطہ باقی نہ رہ جائے۔ اس تعلیم و تبیین کے لئے حق تعالیٰ نے حضورؐ رحمت للعالمین کو جو راستہ بتایا وہ ''دلیل'' و ''برہان'' اور ''بینہ'' اور ''حجتہ'' کا راستہ ہے۔ غور و استدلال کی ساری راہیں وحی کی تربیت یافتہ عقل سے روشن ہوتی ہیں۔

جس طرح خداوند تعالیٰ نے حضور پاک ﷺ کو اپنے زیر تعلیم و تربیت رکھ کر امت کے لئے معلم بنایا، اسی طرح حضورؐ نے اپنے بعد کے ادوار کے لئے پوری امت کو نوع انسانی

کے لئے معلمانہ ذمہ داریاں سونپیں۔ اور اس امت کے فکر و کردار کی درستی کے لئے خلفاء اور اہل مشورت کا سسٹم تجویز کیا۔ جس طرح رسول پاکؐ امت کے لئے شاہد و نقیب بنے' اسی طرح سے اس امت کو امت وسط قرار دے کر ساری نوع انسانی کے لئے شاہد و نقیب مامور فرمایا۔ اب اس امت کا یہ کام ہے کہ یہ ساری دنیا کے لئے شاہد' مبشر اور نذیر بنے اور ان کا تزکیہ کرنے کی راہیں نکالے' رشد و غیّ کو چھانٹ دے اور لوگوں کی زنجیریں اور بیڑیاں کاٹے اور ان کے بوجھ اتارے۔ مستضعفین یعنی سوشل نظام میں کمزوری کا شکار ہونے والوں کو سہارا دے کر اٹھائے اور ''مستکبرین'' (معاشرے میں بے جا قوت پا کر اس کا بے جا استعمال کرنے والے لوگوں) کا نشۂ استکبار توڑ کر انہیں خداوندی کے تخت سے اتار دے۔

اتنی تمہید کے ساتھ مجھے جس اہم ترین نکتہ پر ساری گفتگو کی بنیاد رکھنی ہے' وہ یہ ہے کہ ہم ایک صاحب پیغام قوم ہیں' ایک مشن اور ایک نصب العین کا علمبردار گروہ! پس ایک صاحب پیغام قوم کا نظام تعلیم صرف وہ ہوسکتا ہے جو اس کے پیغام اور مشن اور نصب العین سے پوری پوری مطابقت رکھتا ہو' اور اس پیغام کے مخالف فکری و اخلاقی رجحانات کی کاٹ کر سکے۔ کسی ''صاحب پیغام'' قوم کا راستہ تقلید' نقالی' جمود اور احساس کمتری کا راستہ نہیں ہوسکتا۔ اس کا راستہ خودی اور خودداری اور ایجاد و اجتہاد کا راستہ ہے۔

نظام تعلیم کی گفتگو کرتے ہوئے یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ انسان کا مرکزِ قوت اور اس کا اولیں سرمایۂ کار وہ شے ہے جسے ہم دل و دماغ کہتے ہیں' یا انگریزی میں لفظ Mind سے موسوم کرتے ہیں۔ ہمارے دل و دماغ کو دو صفات ایسی دی گئی ہیں' جو اگر نہ ہوتیں تو ہم انہیں جانوروں میں شامل ہوتے جن کا ایک چھوٹے سے جبلی دائرے کے سوا کوئی نظام تعلیم و تربیت نہیں ہوتا۔ انسانی دل و دماغ کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ معلومات و تجربات کا پچھلا ذخیرہ حافظہ کے ریکارڈ روم میں محفوظ رکھتا ہے' دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ پچھلے ذخیرے سے فائدہ اٹھا کر نت نئے خیالات پیدا کرتا ہے اور نئے نئے تجربوں کی راہیں کھولتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسانی دل و دماغ وہ مقام اتصال ہے جہاں ماضی اور مستقبل ایک دوسرے سے معانقہ کرتے ہیں۔ ہمارا ذہن اپنی انہی صفات کی بنا پر اس قابل ہے کہ وہ اپنے سے پہلے کی صدہا نسلوں کے سیاسی و اقتصادی اور تہذیبی و اخلاقی تجربوں کے خزائن جمع کرکے نئے خزائن کی تلاش و تحقیق کا سفر جاری رکھے۔

یہ انسانی ذہن ہی تھا جس نے فطرت اور تاریخ کے ہر چیلنج کا جواب پیدا کیا' ہر مشکل کا توڑ نکالا' ہر کمزوری و کوتاہی کا ازالہ کیا' اور جب جیسے ذرائع و وسائل اور اداروں کی ضرورت پیش آئی' اس نے یہ ضرورت پوری کر لی۔ بھوک' قحط' موسموں' درندوں اور لڑائیوں نے انسان کے سامنے جتنے چیلنج بھی رکھے' اس کے ذہن نے ہر چیلنج کا مقابلہ کیا۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ یہ ذہن انسانی کسی چیلنج کی زد میں آ کر ہی پوری طرح متحرک ہوتا ہے۔ اور مشکلات و مصائب ہی میں یہ اپنے حیرت انگیز کمالات دکھاتا ہے۔ یہ لہلہاتی فصلیں' یہ پھولوں سے لدے ہوئے درختوں کی قطاریں' یہ ہوائی جہاز اور ٹینک بنانے کے کارخانے' یہ ایٹم بم اور میزائیل' یہ عدالتیں اور جیل' یہ بازار اور منڈیاں' یہ سڑکیں اور پارک' یہ شہروں کی پولیس اور چھاؤنیوں میں پریڈ کرتی ہوئی افواج' یہ سرمایہ اور یہ دیو پیکر مشینیں' یہ پارٹیاں اور گروہ بندیاں' یہ سب ذہن انسانی کے کرشمے ہیں۔ یہ سب کچھ اس کے سحر تدبیر اور سحر تسخیر کا نتیجہ ہے۔ ذہن انسانی کی پرورش اور اس کا نشوونما اور اس کا روز بروز قوی تر ہوتے چلے جانا انسانیت کی تعلیمی سرگرمیوں کا مرہون منت ہے۔

انسانِ اول کو صرف تین چیزیں دے کر زمین پر اتارا گیا۔ ایک یہی دل و دماغ' اور دوسرا اس کا بدن جو ارضی موسموں اور اس کے نباتی اور حیوانی موجودات سے بھرے ہوئے ماحول کے لئے سازگار ترین ثابت ہوا ہے جب کہ دوسری طرف خود یہ ماحول انسانی جسم و دماغ کے لئے سازگار ترین ہے۔ اور تیسرا پیغام ہدایت جو اللہ تعالیٰ نے ذہن و جسم سے صحیح کام لینے کے لئے تفویض کیا۔ باقی سب کچھ انسان نے خدائی ہدایت' ذہن کی خیال انگیزی اور جسم کی مشقت سے خود مہیا کیا ہے۔ اور ہر نسل اپنی زندگی کا حاصل سفر بعد والوں کو سونپ کر رخصت ہو جاتی رہی۔ آج ہم لوگ ساری تاریخِ انسانی کے وارث ہیں' اور ہمارا فرض ہے کہ اس وراثت میں بہترین اضافہ کر کے اگلی نسلوں کی جھولی میں ڈالیں۔ اس فرض کی صحیح ادائیگی کی صورت یہ ہے کہ ہم اپنے سرمایۂ عقائد و افکار (جن کا تصحیح شدہ اور تکمیل یافتہ آخری ڈیکلریشن ہمارے پاس محفوظ ہے) اور پورے عالمی محنتوں سے جمع شدہ دولت معلومات و تجربات میں سے نہ صرف یہ کہ بہترین اور مفید ترین اجزا چھانٹ کے اپنے اخلاف کو دیں بلکہ انہیں اپنے تہذیبی شعور کے مطابق بہترین ترتیب کے ساتھ پیش کریں۔ بغیر چھنائی کے متفرق معلومات کو آگے منتقل کر دینا' آئندہ نسلوں کو پریشانی میں ڈالنا ہے۔ بس اسی

خدمت کا نام تعلیم ہے!

○

"تعلیم" کا موضوع دور حاضر کا بہت بڑا موضوع فکر و بحث ہے' اور اس کے متعلق سوچنے اور تجربے کرنے والوں نے فلسفہ تعلیم' فن تعلیم اور طریق تعلیم پر اتنا وسیع لٹریچر مہیا کر دیا ہے کہ اس معرکتہ الآرا موضوع پر قلم اٹھانے کی جسارت ہما شما کے بس کا روگ نہیں۔

اس احساس کے باوجود میں مسائل تعلیم پر کیوں لکھتا رہا' اور آج کیوں یہ جرأت کر رہا ہوں کہ اپنے لکھے ہوئے سابق اور تازہ مضامین کو یکجا ایک کتاب میں مرتب کر کے پیش کروں۔ جواب یہ ہے کہ میرے پاس کہنے کی کچھ ایسی ضروری باتیں ہیں جنہیں میں ہی اپنے خاص نقطۂ نظر اور طرز اظہار سے۔ آپ کے سامنے لا سکتا ہوں۔

جدید مغربی فلسفہ طرازانِ تعلیم و تربیت اور اس کے عملی تجربات کرنے والے ماہرین کے نظریات پر ایک نظر میں نے ڈال لی۔ ان میں سے جن متاخرین کا زیادہ اثر ہمارے ہاں پایا جاتا ہے' بطور خاص میں نے غور سے ان کی تحریروں' یا خلاصوں کو پڑھا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دور جدید کے اولین ماہرین میں سے دوچار کے ہاں مذہب و اخلاق کی تعلیم بھی ایک شعبہ کار ہے لیکن بلحاظ کورس یا بلحاظ عملی تربیت یہ شعبہ اتنا کمزور ہے کہ آہستہ آہستہ یہ اجزاء عملاً بے اثر اور خارج ہو گئے۔ کیونکہ عیسائی قوموں کے ہاں جو طوفان الحاد پھیلا اور جس کے زیر اثر زندگی کے متعلق تمام اہم مضامین سیکولر مزاج میں ڈھل گئے' ایسی فضا میں مذہب و اخلاق کی تعلیم کیا کرتی' جس کا انحصار خدا کی الہامی تعلیم پر تھا۔ پیروان عیسیٰؑ نے اول تو وہ اصل تعلیم گم کر دی۔ اور پھر جب پادریوں کی گھڑی ہوئی فقہ کا طلسم ٹوٹا اور دوسری طرف جدید علوم کے علمبرداروں اور متاخرین کی خدا' مذہب' اخلاق' روحانیت اور پادریوں کے خلاف فاتحانہ جنگ تکمیل کو پہنچی' تو اس کے بعد تعلیم و تہذیب کا رخ یکسر انسان کے حیوانی تصور حیات' انسان کا محض جسم حیوانی ہونا' کائنات کے خالص مادی نظام' روحانیت کی لایعنیت اور حسی و قیاسی عقل کی برتری اور تمام عقائد و حقوق کے مقابلے میں قوت کی بالادستی کی طرف مڑ گیا' اور فکر و عمل میں یک رُخا پن بلکہ ادھورا پن پیدا ہو گیا۔

اس الحادی اور مادی فضا کے اندر تعلیم کے مسئلے پر سوچنے اور تجربہ کرنے والوں کے نظریات کا مطالعہ کیا تو بعض کے ہاں جزوی طور پر نہایت اچھی باتیں دیکھنے کے باوجود

(جیسے ریت میں ابرق کے ذرے چمکتے ہیں) زیادہ تر میں نے نظریات کا اشتراک ان باتوں میں دیکھا کہ:

- عمل پہلے اور تعلیم بعد میں'
- شے کا مشاہدہ پہلے اور اس کا نام (لفظ) بعد میں'
- تجربہ پہلے اور اخذ ہونے والے اصول بعد میں۔

میں بات صرف بنیادی تعلیم' بلکہ درحقیقت تدریس کی کر رہا ہوں۔ کیونکہ الحادی اور مادی نظام میں اشیاء و واقعات کے مشاہدے اور ان کا ایسی عقل سے تجزیہ جس عقل کی الہامی و روحانی تربیت نہ ہو بلکہ جو حواس کے ذریعے جمع ہونے والی حسّی معلومات اور ان معلومات کے قیاسی جائزے اور وضاحت کے علاوہ جن حدود حقیقت میں وہ محض اپنی صلاحیتوں کے بل پر نہ جھانک سکے' حالانکہ ذہن و قلب حیات و کائنات کے متعلق ایسے سوالات ہر انسان کے اندر سے ابھرتے ہوں' جن کے جوابات دینے کے لئے حیات و کائنات صدہا اشارات و آیات لئے سامنے موجود ہو اور سچی اور محفوظ وحی کی خدائی کتاب ہدایت ان اشارات و آیات کو اس طرح نمایاں کرے اور ان کے ظاہری خلاؤں کو پر کر دے کہ عقل اس طرح حاصل ہونے والے جوابات کو اطمینان سے تسلیم کر لے۔ اس الحادی و مادی نظام فکر کے تحت ایک بے راہ رو تہذیب اور کلچر کا ظہور تو ہوتا ہے مگر اس میں نہ استحکام ہے' نہ تقدس ہے' اور نہ انسانی زندگی میں بالاتری۔

یہ ما حاصل ہے میرے محدود سے مطالعہ کا جو میں نے مغربی مفکرین تعلیم کا کیا ہے۔ اس فکر کو پاکستان میں پھیلانا اور اس کو پیش کرنے والی کتابوں کو نصاب بنا کر نوجوانوں کے ذہن میں انڈیلنا ایسا ہی ہے جیسے آپ ان کے اندر زہر اتار رہے ہوں۔

تعلیم سمیت جن موضوعات و مسائل سے بھی مجھے دلچسپی ہے' ان کے متعلق مسلسل مطالعہ و تفکر کی وجہ سے زبان و قلم سے کام کرتے ہوئے مجھے اپنے اوپر یہ اعتماد ہمیشہ رہا ہے کہ میں جاہل و بے خبر نہیں ہوں۔ میں اتفاق سے معلموں کے ایک خاندان میں پیدا ہوا' اور والد مرحوم کے علاوہ قریب ترین رشتہ داروں کی اکثریت معلمانہ خدمات انجام دے رہی تھی۔ بلکہ تعلیم کا اگر وسیع تصور سامنے رکھا جائے تو اپنے بزرگان سلف نے بھی زیادہ تر ایسی ہی خدمات اپنے ذمے لیں جن کی نوعیت معلمانہ تھی۔ اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ''سو پشت سے

ہے پیشۂ آباء معلمی"۔ میں خود بھی بہ لحاظ پیشہ معلمی ملازمت کی راہ پر جاتے جاتے بچا۔ مگر تصنیف وصحافت کا مشغلہ اختیار کرنے کی وجہ سے کام کی نوعیت' بہ اعتبار حقیقت' معلمانہ ہی رہی۔ خاندان کے متعدد اصحاب آج بھی اپنے خاندانی راستے پر ہی گامزن ہیں جن میں بعض عزیز فوقانی مدارج تعلیم سے منسلک ہیں۔ علاوہ ازیں میرے احباب ورفقا میں بھی اساتذہ کی اچھی خاصی تعداد شامل ہے۔

پھر جب صبح شعور کے طلوع ہونے کے بعد سنجیدہ موضوعات پر مطالعہ کا آغاز کیا تو ایک میدان جس میں مجھے خصوصی دلچسپی تھی' فلسفے کا میدان تھا۔ اس میدان میں الٰہیات کے مراحل سے ہوتا ہوا نفسیات تک' نفسیات سے علم اخلاق تک اور پھر آگے فلسفہ سیاست اور فلسفہ تعلیم تک پہنچا۔ چنانچہ پہلے ہی دور مطالعہ میں وہ وقت آیا کہ میں مری کی لائبریری میں (۱۹۴۱ء) بیٹھ کر تعلیمات کے متعلق ممکن الحصول کتابوں کو کھنگال رہا تھا اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے ذریعے تعلیمی اصطلاحات کو سمجھنے اور تعلیمی ماہرین کا تعارف حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے بعد تو گویا تعلیم کے موضوع پر باب مطالعہ ہمیشہ کے لئے کھل گیا۔ نہ صرف باب مطالعہ' بلکہ تفکر وتخلیق کی راہیں بھی وا ہوتی گئیں۔ اس زمانے میں مجھے عملاً اپنے مطالعہ کی روشنی میں تعلیمی تجربات کے محدود سے مواقع بھی ملے' اور ان سے خاصا فائدہ پہنچا۔ اس کے ساتھ میرا اصل سرمایہ میری اس سوچ بچار کا ماحصل ہے جو کسی بھی تعلیمی مسئلے یا بحث کے سامنے آنے پر حرکت میں آتی رہی۔

ادھر پاکستان بننے کے بعد یہ بحث بھی اٹھ کھڑی ہوئی کہ نظام تعلیم کو بدلا جائے اور اسے اسلامی مقاصد کے مطابق از سر نو مرتب کیا جائے۔ میں چونکہ پاکستان میں اٹھنے والی سیاسی' سماجی' فکری' ادبی تحریکات سے عملی دلچسپی لیتا رہا ہوں' اس وجہ سے مسئلہ تعلیم پر بھی تشکیل پاکستان کے بعد سے اب تک کے لمبے دور میں مسلسل پڑھا' سوچا اور اظہار رائے کیا ہے۔

اوپر کی سطور کو "قصیدہ بہ شان خویش" نہ سمجھا جائے' مدعا فقط یہ عرض کرنا ہے کہ میں اگر تعلیمات پر بات کروں تو اگرچہ ماہرین میں میرا شمار نہیں' مگر میں اس بحث میں اتنا کورا بھی نہیں کہ زبان رکے یا قلم اٹکے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ کہ اس مقصد کے لئے مروجہ نظریات تعلیم کا تحقیقی مطالعہ اس وجہ سے ضروری ہے کہ دور حاضر کے تمدنی احوال میں اپنی حکمت تعلیم کو جامہ عمل پہنانا' اس کے لئے ادارات اور نظام عمل کی تشکیل کرنا' اس کے لئے مردان کار فراہم

کرنا اور تعلیمی مسائل پر مروجہ اصطلاحات میں بات کرنا' اس کے بغیر اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ لیکن بایں ہمہ ہمارے لئے تحقیقی کاوشوں سے زیادہ (مگر ان کے ساتھ ساتھ) ایک زوردار تخلیقی رجحان کو روبعمل لانے کی ضرورت ہے۔ جو تبدیلی کی تحریک پیدا کرنے کا موجب بن سکے۔ ہمارا کام' محض اکتسابی نہیں' ہماری ذمہ داریاں انقلابی نوعیت کی ہیں' اور بدقسمتی سے اپنے مجموعی نظام زندگی اور اس کے دوسرے مختلف شعبوں کی طرح تعلیم کے دائرے میں بھی اب تک اس انقلابی عمل کا آغاز نہیں ہو سکا۔ جو ہمیں پاکستان کی غایتِ وجود کی راہ پر گامزن کر سکتا۔ اور نہ ہمارے طرز فکر میں وہ تخلیقی روح کارفرما ہو سکی ہے جو قوموں کو اتفاقات کی بنائی ہوئی ڈگر سے ہٹا کر انہیں اپنے ایمان و تہذیبی شعور کی روشنی میں نئی راہیں نکالنے کے لئے متحرک کر دیتی ہے۔

مجھے اپنے شعوری ایمان کی بناء پر اپنے متعلق یہ حسن ظن ہے کہ مجھے خزانہ ازل سے وہ تخلیقی جوہر تھوڑی بہت مقدار میں ودیعت کیا گیا ہے جس سے کام لے کر میں اپنی قوم میں وہ انقلابی شعور ابھار سکتا ہوں جو اغیار کے مسلط کردہ نظام تعلیم کے گرداب کا حلقہ توڑ کر نکلنے کا ضامن ہو سکتا ہے۔

○

ہماری تاریخ کا یہ بڑا المیہ ہے کہ جو نظام تعلیم ہمیں دور غلامی کی میراث کے طور پر ملا' ہم سالوں پہ سال گزرتے جانے کے باوجود اسے توڑ پھوڑ کر ایک ایسا نیا نظام تعلیم تعمیر نہ کر سکے جو ہمارے ملی مزاج کے مطابق ہوتا اور جو نئی نسلوں کے افکار و کردار کو ہمارے تہذیبی تقاضوں کے سانچوں میں ڈھال سکتا۔ ہماری ایمان و اخلاقی ساخت کو توڑنے کے لئے اور ہماری فولادی خودی کو گھلا دینے کے لئے جس نظام تعلیم میں پورا اہتمام کیا گیا تھا' چاہئے تو یہ تھا کہ ہم آزادی کے پہلے ہی دن اس کے پورے ڈھانچے کو ٹھیک اس جذبہ سے چکنا چور کر دیتے جس جذبے کے تحت کسی قید خانے کے محافظوں سے لڑ کر نجات پانے والے قیدی ذلت کی زنجیروں کو توڑ پھینکتے ہیں اور قید خانے کے لباس کو جلد از جلد بدن سے الگ کر دیتے ہیں۔ مگر پستیِ فکر و عمل کا یہ عبرت ناک عالم دیکھئے کہ دورِ آزادی میں ہماری سیاسی' فکری اور تعلیمی قیادت کرنیوالے طبقے ہی دور غلامی کے تعمیر کردہ زندان تعلیم کی دیواروں اور زنجیروں کے محافظ اور پہرہ دار بن کر کھڑے ہو گئے۔

مغالطہ انگیز ہیں وہ ساری برائے نام تبدیلیاں جو اسلام پر احسان کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً کی گئیں۔ یہ صرف پیوند کاری کا کارنامہ ہے جو ہمارے داغ دوزوں نے نظامِ تعلیم کے ٹاٹ میں کہیں کہیں ریشم و کم خواب کی دو چار دھجیاں ٹانک کر انجام دیا ہے۔ یہ دھجیاں اس بے جوڑ پن کی فریادی ہیں جس کی وجہ سے ان کی رنگینی و نزاکت خود ایک اضحوکہ بن کر رہ گئی ہے۔

○

یہ معاملہ غور طلب ہے کہ آخر وہ تبدیلی زندگی کے دوسرے تمام شعبوں کے ساتھ ساتھ نظامِ تعلیم میں رونما کیوں نہیں ہوتی' جس تبدیلی کے عزائم کے ساتھ بے حساب قربانیوں کے نتیجے میں پاکستان کی تشکیل کی گئی؟

دنیا کی ساری تاریخ گواہ ہے کہ جس قوم نے بھی آزادی پا کر اپنی تعمیرِ نو کی طرف توجہ کی' یا جس گروہ نے دوسروں پر تسلط جما کر ان کا استحصال کرنا چاہا' یا جس تحریک نے کسی معاشرے پر حاوی ہو کر اپنی ضرورت کے معیاری افراد تیار کرنے اور اپنے اصول و مقاصد سے مطابقت رکھنے والے ادارات کی تشکیل کرنے کا انقلابی عمل شروع کیا' اس نے لازماً پورے زور سے اولیں اقدام نظامِ تعلیم کو اپنے منشا کے مطابق ڈھالنے کے لئے کیا۔

برطانوی' فرانسیسی' ڈچ اور دوسری مغربی اقوام نے برصغیر' ایشیائی' افریقی اور عرب ممالک میں جہاں جہاں اپنے امپیریلزم کے جھنڈے گاڑے وہاں انہوں نے اولین توجہ نظامِ تعلیم کو بدلنے پر صرف کی۔

اشتراکیت اور نازی ازم کی تحریکیں عروج پر آئیں تو انہوں نے کوئی کوتاہی اور تاخیر تعلیم کو اپنے اصول و مقاصد کے مطابق تبدیل کرنے میں نہیں کی۔

خود یورپ میں نشاۃ ثانیہ' ریفارمیشن (Reformation) جمہوریت' لبرل ازم (Liberalism) نیشنلزم' ریشنلزم (Rationalism) وغیرہ مختلف ذہنی' سماجی اور سیاسی تحریکات نمودار ہوئیں تو انہوں نے درس گاہوں کا رخ کیا۔

اپنے ماضی پر ہم نظر ڈالیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ انسانیت کی تعمیرِ نو کے سب سے بڑے داعی جلیل القدر پیغمبر حضرت محمد ﷺ نے سب سے زیادہ توجہ تعلیم پر دی اور اپنے آپ کو معلم قرار دیا۔

آنحضورؐ اور آپؐ کے بعد آپؐ کے تربیت دیئے ہوئے قائدین نے کسی بھی علاقے

میں گورنر یا افسروں کا تقرر کرتے ہوئے تحریری فرامین میں بھی اور زبانی ہدایات کی صورت میں بھی پورے زور سے تاکید کی کہ وہ عوام کو اس دین اور نظام حیات کی تعلیم دیں جسے عملاً قائم و نافذ کرنا حکومت کا اصل مقصود ہے۔

بھارت جو ہمارے ساتھ ہی آزاد ہوا' اس کی ہندو اکثریت کے قائدین نے آزادی کامل کے حصول سے پہلے ہی واردھا اسکیم اور ودیا مندرا اسکیم کی صورت میں اپنا نقشۂ تعلیم تیار کر لیا اور نیم آزادی کے دور میں ان اسکیموں کا عملی تجربہ بھی کر ڈالا۔[1]

ادھر ہمارا یہ حال ہے کہ متذکرہ تاریخی تجربوں کے برعکس یہاں نہ تو کسی عملی نصب العین کے مطابق کوئی نیا نقشۂ تعلیم تجویز ہو سکا اور نہ کوئی اسکیم عملی تجربے سے گزاری جا سکی۔

○

اس کے وجوہ بہت سے ہیں: مثلاً ایک یہ کہ ہم نے پاکستان کے عنوان سے جو نصب العین اختیار کیا' وہ ایک سیاسی سلوگن کی حد تک تو نمودار ہوا لیکن اسے قوم کے سامنے اتنی واضح نظریاتی و مقصدی شکل میں لایا ہی نہیں گیا کہ اس سے تبدیلی کا جذبہ پیدا ہوتا' تبدیلی کی سمت واضح ہوتی اور تبدیلی کے لئے کوئی ٹھوس اقدام ہو سکتا۔[2] پھر زندگی کے کسی بھی شعبے کے متعلق

---

[1] یہ نہ بھولئے کہ مشرقی پاکستان کا المیہ جن محرکات سے رونما ہوا ان میں تعلیمی اداروں' معلمین' نصابی کتب' ہندی لٹریچر اور رسم الخط وغیرہ کا گہرا دخل ہے۔ اسی طرح مشنری تعلیم گاہیں تعلیم کے شربت میں عیسائی رجحانات یا خلافِ اسلام ثقافتی و معاشرتی مظاہر اور اسلام سے گریز کا زہر ملا کر کام کرتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک تو وہ مغرب اور عیسائی اقوام کی برتری کا سکہ ہمارے بچوں کے ذہنوں پر جما کر ان کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتی ہیں' اسلامی عقائد و عبادات کے متعلق ان میں ندامتی جذبہ نہیں تو معذرتی رجحان ضرور پیدا کر دیتی ہیں۔ اگر وہ ان کو عیسائی نہیں بنا سکتیں تو اسلام کے کام کا بھی نہیں چھوڑتیں۔

[2] چاہئے یہ تھا کہ پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے اس کے دس بیس رہنما مل کر پورا ایک نقشۂ زندگی تیار کرتے اور قوم کو بتاتے کہ پاکستان کے بنتے ہی ہر شعبے کو کن بنیادوں پر کس طرح تعمیر کیا جائے گا۔ یہ ایک طرح کا جامع منشور ہوتا اور اس کی تعلیم ساری قوم کو حاصل ہو جاتی۔ اور پاکستان بنتے ہی ہر شعبے میں تعمیر کا کام فوراً شروع ہو جاتا۔ کسی طرح کی نزاعات نہ ہوتیں۔ نقشۂ زندگی کو وضاحت سے پیش کرنے کے بجائے صرف قرآن کے نظام کا گول مول نعرہ لگایا جاتا رہا۔ اب دیکھ لیجئے کہ قرآن کا نظام کس شان سے چل رہا ہے اور کیسے کیسے مجتہد پیدا ہو رہے ہیں۔

نظریہ پاکستان کے مطابق تہذیب اسلامی کے احیاء کا مقصد سامنے رکھ کر کوئی اسکیم بروقت تیار کرنا تو کجا' اچھی طرح سے علمی بحثیں بھی نہیں ہوئیں کہ مستقبل کے لئے کم سے کم حرکت انگیز انقلابی فکر تو تیار ہوسکتی۔

جذباتیت کے ایک غبار میں قافلے نے دھندلی راہوں پر سفر شروع کیا اور ارض موعود میں داخلے کے بعد جب کام کرنے کی گھڑی آئی تو غبار ہی میں قافلہ منتشر بھی ہو گیا۔

پاکستان کے ابتدائی ڈیڑھ دو سال کا زمانہ وہ زریں دور تھا جب زندگی کے ہر شعبے سے تبدیلی کی رو اٹھائی جانی چاہئے تھی اور ساری قوم کو انقلاب کی مہم میں اس طرح مصروف کر دیا جانا چاہئے تھا' جس طرح چیونٹیوں کا لشکر ایک ٹوٹے ہوئے گھر سے نکلنے کے بعد اپنا نیا گھر تیار کرتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے نصب العین سے تعلق اتنا کمزور تھا کہ لوگ اول روز ہی سے مفاد کے گوئے و چوگان میں منہمک ہو گئے اور پریشان و پراگندہ و مضمحل انسانی مسالے سے ایک عظیم الشان قوم اٹھا کھڑی کرنے کی مہم ایک دن کے لئے بھی نہ چل سکی۔ پاکستان ایک تہذیبی قومیت کے جلوہ گاہ بننے کی بجائے ایک نسلی قومیت کا گھر بن کر رہ گیا۔ بس ایک غیر شعوری طرز کی اعتقادی اور تہذیبی اور مقصدی وحدت کی قوت کارفرما رہی جو افراد اور طبقوں اور نسلوں کو تھوڑا بہت جوڑ کر رکھ سکتی تھی۔ مگر اس کے ذریعے مجرد ایک عام نسلی و وطنی قومیت بھی مستحکم نہ ہوسکی بلکہ جلد ہی اس کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ حتیٰ کہ آج وحدت ملت کا جرس کارواں بھی خاموش ہو چکا ہے اور سارا کارواں ٹکڑیوں میں بٹا ہوا بغیر کسی اصولی یا نظریاتی و ایمانی اور تہذیبی و اخلاقی اسپرٹ کے مختلف اطراف میں چلا جارہا ہے۔ جس گروہ کا جی چاہتا ہے وہ اعلان کر دیتا ہے کہ ہم ایک الگ گروہ ہیں ہمیں اپنے مفاد سے غرض ہے۔

۱۹۷۱ء میں ملک دو ٹکڑوں میں بٹ گیا اور ایک ٹکڑہ ہماری معاند قوتوں کی ساحری کا شکار ہو کر ہمارے خلاف لڑ کر ہم سے جدا ہوا۔ اس کے فوراً بعد بقیہ نصف پاکستان میں بھی علیحدگی پسند قوتیں زیادہ فعال ہوگئیں اور چار قومیتوں کے نظریئے کے ظہور کے ساتھ ہی ساتھ سندھ' سرحد اور بلوچستان کی علیحدگی کے چرچے ہونے لگے۔ اور اب تو پانچویں قومیت کا آوازہ بھی سنائی دیتا ہے۔ شاید آگے چل کر ہر فرد ایک قوم بن جائے۔ دیکھئے پیچھے سے کام کو درست طور پر نہ کرنے سے کس بری طرح ہمارا شیرازہ بکھرا۔

اگر چند سال پہلے تک بھی' کم سے کم نظام تعلیم پاکستان کے نصب العین کو نشوونما دینے

والا سرچشمۂ فکر بن گیا ہوتا تو نئی نسلیں ایک انقلابی شعور سے آراستہ ہو کر پاکستان کے قومی وجود کی محافظ اور تہذیبی لحاظ سے اس کے احیاء کی ضامن بن سکتیں۔ مگر ایسا نہ ہو سکا بلکہ خود تعلیم اور یونیورسٹیوں کو تقسیم کیا جانے لگا اور اس کی بہت بڑی سزا بھگتی جا چکی ہے اور مزید سزا سننے کے لئے ہم وقت کی عدالت کے سامنے بہ حیثیت قوم مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہیں۔

اتنی بڑی کوتاہی کیوں؟

○

تعلیم سے متعلق ایک مجموعہ مضامین کے دیباچے میں اتنے بڑے سوال پر کما حقہ' تفصیلی بحث کرنا ممکن نہیں ہے۔ بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ ہم بحرانِ قیادت کا شکار ہیں' بلکہ بحران زندگی کا' یعنی معاشرے کی وسیع درس گاہ کو موزوں معلمانِ ملت میسر نہ آ سکے' یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ بہ حیثیت قوم ہمارے وجود کا انحصار جس طرح کے انسانی مسالے پر ہے وہ اس قابل نہیں تھا کہ اپنے لئے اچھی قیادت فراہم کر سکے۔ فراہم کرنا تو کجا اس قوم میں صلاحیت بھی نہیں کہ اچھی اور بری قیادت کو پہچان سکے۔ یہ فرومائیگی نتیجہ ہے۔ دورِ غلامی کے نظامِ سیاست و معیشت اور اس کے نظامِ تعلیم کے عملِ مسلسل کا! بحرانِ قیادت جہاں کہیں بھی پایا جائے وہ نتیجہ ہوتا ہے نظامِ تعلیم کی خرابی کا۔

وجوہ جو کچھ بھی ہوں' ان کا اظہار تاریخِ پاکستان میں جن تین شکلوں میں ہوا ہے اور ہو رہا ہے ان میں سے ایک کا عنوان ہے نالائقی' دوسری کا منافقت اور تیسری کا خیانت' ہم آج جو کچھ بھی بھگت رہے ہیں اپنی نالائقیوں اور منافقتوں اور خیانتوں کا خمیازہ بھگت رہے ہیں' اور سب کچھ بھگت کر بھی ہم ہوش میں نہیں آئے بلکہ ان تینوں عظیم الشان صلاحیتوں میں مسلسل ترقی کر رہے ہیں۔

یہ داستانِ درد اس لئے بیان کی گئی ہے کہ آج بھی' جب کہ پانی سروں سے گزر رہا ہے اگر ہم میں تلافی مافات کا ولولہ پیدا ہو جائے تو پاکستان کی سرزمین پر ملتِ اسلامیہ کے تہذیبی احیاء کا خواب پورا ہو سکتا ہے۔

○

کالجوں' یونیورسٹیوں کی چار دیواریوں کے اندر داخلی محاذ پر بھی اب کام کرنے کی راہیں زیادہ کشادہ ہیں' کیونکہ تعلیمی پالیسی' تعلیمی نظم و نسق اور تعلیمی نصابات سے متعلق بہت

سے عملی مسائل جن کونسلوں' بورڈوں اور کمیٹیوں کے دائرہ اختیار میں ہیں ان میں طلبہ کو بھی نمائندگی حاصل ہے۔ وہ اپنی قوت نمائندگی کو محض چھوٹے چھوٹے روزمرہ مسائل کی حد تک ہی استعمال نہ کریں بلکہ تجدید تعلیم کے اصل بڑے مسئلے پر بھی قوت صرف کریں۔ وہ انتظامی اور اکیڈیمک مجالس میں بھی' اپنے مذاکروں میں بھی اور کلاس روم میں بھی ایسے مباحث چھیڑیں اور ایسے مسائل اٹھائیں کہ یونیورسٹیوں اور درس گاہوں کے کار پردازوں اور معلموں کی توجہ اس فراموش شدہ فریضے کی طرف مبذول ہو جو پاکستان بنتے ہی ان پر عائد ہو گیا تھا۔ اس کام کے لئے ٹکراؤ سے زیادہ افہام و تفہیم کی پالیسی مفید ہو سکتی ہے۔ یعنی سیاسی انداز کے دھونس کے بجائے ایسے دلائل اور پر کشش تجزیے رکھے جائیں جو دوسرے عام طلبہ کو بھی ہم خیال بنانے کا ذریعہ ہوں اور اساتذہ کے دل و دماغ بھی اثر پذیر ہوں۔

○

قوموں کے اقبال و ادبار' ان کی فتح و شکست' ان کے اتحاد و انتشار' ان کی عزت و ذلت کے فیصلے میدان جنگ میں نہیں ہوتے بلکہ درس گاہوں میں ہوتے ہیں۔ ایک قوم اگر تباہ ہو رہی ہو گی تو وہ درس گاہ میں اپنی تباہی کا سامان کر رہی ہو گی اور اگر بننا ہے تو جو کچھ بنے گی اپنی درس گاہوں کے راستے سے بنے گی۔ جیسا انسان وہ اپنے تعلیمی نظام کے ذریعے سے پیدا کرے گی ویسے نتائج اس کو آگے چل کے ملیں گے۔ اس کا تیار کردہ انسان اگر اچھا ہو گا تو اس قوم کو اچھے نتائج ملیں گے اور برا ہو گا تو برے نتائج اسے ملیں گے۔ یہ تعمیر قوم اور تعمیر انسان کا وہ ذریعہ ہے جس پر سب سے زیادہ توجہ ہونی چاہئے۔

جمہوریت کی ناکامی اور مارشل لا اور آمریت اور پھر فسطائیت کے ظہور کا مسئلہ ہو' تین قومی جنگوں کے نتائج کا معاملہ ہو' اقتصادی زندگی میں استحصال اور معاملات میں خیانت کا روگ لگنے کا قضیہ ہو' جرائم کی کثرت اور فحاشی کے فروغ کا جھمیلا ہو' بین الاقوامی سطح پر ہمارے قومی وقار کی تباہی کا دکھڑا ہو' نظریۂ پاکستان سے انحراف اور شیرازۂ وحدت کی پریشانی کا مبحث ہو' ان سارے احوال بد کے ظہور کے پیچھے نظام تعلیم کی کوتاہی کارفرما ہے۔ یہ نظام تعلیم سرے سے ایسے مسلم پاکستانی پیدا کر کے دے ہی نہیں سکا جن کے ہاتھوں علم و فکر' سیاست و اقتصاد' معاشرت و ثقافت' قانون و عدل اور سفارت و دفاع کے دائروں میں کرنے کا کام ہو سکتا' یا

نامطلوب چیزوں کی روک تھام ہو سکتی ہے۔

سوچنے کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ نظام تعلیم ایمان و عمل کے ایسے پیکر تراشنے کے قابل نہیں ہے جن میں سے ایک ایک اپنے مشن کا سپاہی بن کر عمر گزار دے' وہ پاکستان کے وجود کا' ملت کے مفاد کا' دین کے اصول و مقاصد کا اور اخلاق عالیہ کی اقدار و روایات کا محافظ ہو۔ آج کتنے لوگ ہیں جو اپنی قومی خودی کا بچاؤ کرنے کے لئے فکر و ثقافت اور پروپیگنڈے اور سازشی کارروائیوں کے ان مسلسل حملوں کی بھرپور مزاحمت کر سکیں جن کی ہم پر بوچھاڑ ہو رہی ہے۔ تاحال تو قوم کا عالم یہ ہے کہ نہ حالات کا شعور ہے' نہ اپنے اندر ایمان محکم ہے اور نہ غیر متزلزل قسم کا کردار! اور موجودہ نظام تعلیم ایسی ہی قوم بنا سکتا ہے' اور ایسی قوم کے احوال وہی کچھ ہو سکتے ہیں جو اب تک ہمیں پیش آئے ہیں۔

انتہائی یاس انگیز فضا میں جب کہ نہ ماہرین تعلیم کے عالم افکار میں کسی صبح نو کے ظہور کے آثار ہیں' نہ معلمین کے ذہنوں میں حیاتِ نو کی کوئی لہر اٹھتی ہے' لے دے کے ایک ہی سرمایۂ امید ہے اور وہ درس گاہوں میں تربیت پانے والے ایسے نوجوانوں کی اکثریت ہے جو مخالفانہ علمی و فکری اور ثقافتی و تہذیبی ماحول میں گھرے ہونے کے باوجود اپنا رشتہ چودہ سو سالہ تاریخ میں تموج پیدا کرنے والی اسلام کی انقلابی تحریک سے جوڑے ہوئے ہیں۔ اب مفکرین تعلیم اور معلمین تعلیم کی کوتاہی کی تلافی شاید یہ نوجوان قوت کر دکھائے اور متعلمین اپنے معلمین کو وہ سبق دے سکیں جو معلمین سے متعلمین کو نہ مل سکا۔

میرا اصل روئے سخن اسی قوت کی طرف ہے۔[1]

---

[1] اچھے نوجوانوں کی قوت بھی حالت قائمہ میں نہیں رہ سکتی۔ اس پر چاروں طرف سے مخالفانہ نظریات' ملحدانہ تہذیب' دولت پرستانہ معاشرے اور متقابل نوجوان قوتوں کا ردعمل اور ان کی زیادتیوں پر انتقامی رجحانات' نیز تہذیبی و دینی اسپرٹ پر نامطلوب انداز کی سیاست بازی (جو داعیانہ اور معلمانہ اور پر محبت کردار پر قائم نہیں رہنے دیتی) کا غلبہ ایسی مخالفانہ قوتیں ہیں جو زیادہ بہتر اور اونچے کام کر سکنے والی اس واحد مفید نوجوان قوت کو نقصان پہنچا کر انقلاب تعلیم کے اصل کام سے دور ہٹا سکتی ہیں۔ اسلامی نہج پر سوچنے والے جوانوں کا سرمایہ قوت ہمارے پاس ایک خدائی امانت ہے جیسے ہم خواتین کے ناموس کی حفاظت کرتے ہیں۔ شیطان بھی ان کے اندر سے اور باہر سے مسلسل حملہ آور رہتا ہے۔ ہمیں اس قوت کی اسی طرح حفاظت کرنا چاہیے۔

وہ نوجوان قوت جو ایک ناساز گار نظام تعلیم کے تخریبی عمل کی تختۂ مشق رہنے کے باوجود توانا دل و دماغ لے کے میدان میں آ رہی ہے' اور جو ملت کے تہذیبی وجود کا شعور اور اس کی برتری کا احساس اور اس کے احیاء کا جذبہ رکھتی ہے جس میں اسلامی انقلاب کا ولولہ کار فرما ہے اور جو پاکستان کے گم شدہ نصب العین کی بازیافت کرنے میں قدرے کامیاب رہی' اب یہ ذمہ داری اس کی ہے کہ وہ جہاں تھوڑا بہت کام درس گاہوں کے اندر سے موجودہ فاسد نظام تعلیم کے خلاف کرتی رہے' وہاں فارغ التحصیل ہونے کے بعد اسے ایک طرف علمی و تحقیقی سطح پر موجودہ نظام تعلیم کو تنقید کا تختۂ مشق بنا کر اس کے عیوب کو پوری طرح بے نقاب کر دینا چاہئے' اور دوسری طرف ایک مضبوط فکری تحریک اسلامی نظام تعلیم کے نفاذ کے لئے اٹھانی چاہئے۔ خصوصاً وہ نوجوان جو تعلیمی فلسفہ وفن کے ماہرین کی حیثیت سے میدان میں آ رہے ہیں یا وہ جنہیں تدوین نصابات و کتب نصاب یا معلمی کے فرائض انجام دینے ہیں' تعلیمی انقلاب برپا کرنے کا فریضہ ان کے سر زیادہ عائد ہوتا ہے۔

اوپر کی عرض کردہ دو خوفناک کوتاہیاں ہی تو تھیں جن کے بارے میں مولانا مودودیؒ نے بروقت تنبیہ کی تھی کہ اسلامی نظام کو چلانے کے لئے پہلے سے فکر کرنا ضروری ہے ورنہ جس قسم کے افراد کو جس طرز کے نقشہ تنظیم پر اکٹھا کر کے جن طریقوں سے تحریک چلائی جا رہی ہے ان سے اسلامی نظام کا ظہور ممکن نہیں' بلکہ الٹا وقت آنے پر اسلامی نظام کے لئے وہی قوت رکاوٹ بن جائے گی جو آج اس کا نعرہ لگا رہی ہے۔

بدقسمتی سے یہی ہو کے رہا!

کاش کہ آج تعصبات کے مختلف پنجروں سے آزاد کوئی ایک ذی شعور متنفس بھی ایسا ملتا جو کشادہ دلی سے یہ اعتراف کرتا کہ مولانا مودودیؒ نے نہایت صحیح انتباہ ہمیں دیا تھا اور جن کوتاہیوں کی انہوں نے نشاندہی کی تھی اور ان سے جیسے نتائج نکلنے کا اندیشہ ظاہر تھا' واقعات نے ان کی توثیق کر دی۔

مگر سیاست کی نگری کا آئین یہی ہے کہ اپنے گناہوں کی سزا دینے کے لئے ہمیشہ کسی دوسرے کو تلاش کیا جائے ـــــ بالخصوص عین اس شخص کو جس نے کسی غلطی سے بچنے کے لئے بروقت انتباہ دیا ہو۔

اب کیا ہو!

میں یہ کہتا ہوں کہ تمام ارباب شعور و احساس آج یہ سوچیں کہ پاکستان کے وجود کو بچانے اور اس میں اسلامی نصب العین کا علم بلند رکھنے کے لئے کدھر کدھر کون سے عناصر موجود ہیں اور ان کا بالکل ایک جماعت بننا ممکن نہیں' تو اپنے اپنے دائروں میں رہ کر وہ کس طرح ہم آہنگی سے کام کر سکتے ہیں۔

محبان پاکستان اور خادمان اسلام کو ساری بحثیں اس نہج پر اٹھانی چاہئیں نہ یہ کہ کاغذی عدالتیں لگا کر ایک دوسرے کے خلاف فرد جرم لگانے اور سزائیں سنانے کا مضرّت رساں مشغلہ جاری رکھا جا سکے۔

اصل میں ہمارا مسئلہ کسی فلسفہ تعلیم کی اختراع کرنا یا مروجہ نظریات کا مطالعہ و تجزیہ کر کے ان میں سے اپنے پسند کردہ اجزا کو جوڑ جاڑ کر کچھ نئے نظریئے وضع کرنا نہیں ہے بلکہ اسلامی نظام حیات کی جامعیت پر ایمان رکھتے ہوئے اس کی تعلیم دینے کے لئے خود اس کی سکھائی ہوئی حکمت تعلیم کو روبہ عمل لانا ہے۔

جو کشادہ دلی سے یہ اعتراف کرتا کہ مولانا مودودیؒ نے نہایت صحیح انتباہ ہمیں دیا تھا......

○

ہمارے بدقسمت ملک کے ساتھ یہ سانحہ پیش آیا کہ ورلڈ بنک اور انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ بنک کی طرف سے پاکستان کے تعلیمی ادارات کا سروے (تقریباً خفیہ) کیا گیا[۱] اور ایک رپورٹ تیار کی گئی جس کا مقصد دراصل پاکستان کے تعلیمی نظام کو بالکل نئے راستے پر ڈالنے اور پالیسی کو بالکل اتھل پتھل کر دینے کا تھا اور اس کی روح گویا ایک فرمان بادشاہ کی سی تھی۔ چنانچہ ہماری حکومت نے اس عظیم قومی مسئلہ کو پارلمینٹ یا اخبارات یا عوامی حلقوں میں بحث کے لئے پیش کرنے کے بجائے چپکے سے اسے منظور کرتے ہوئے اپنی طرف سے ایک پالیسی نوٹ وزارت تعلیم اور ادارات تعلیم کے نام جاری کر دیا۔ نئی تعلیمی پالیسی کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ تعلیم اب خارج از مرکز (De Centralize) کر دی گئی۔

---

۱ مزید تفصیل کے لیے مضمون دیکھئے: ''مغربی سامراج کا نیا ہدف...... تعلیم''

۲۔ اسے غیر قومی (De Nationalize) بنا دیا گیا ہے۔

۳۔ تعلیم میں اب مرکزی اہمیت ترقی (سائنسی و معاشی) کو حاصل ہو گی۔

۴۔ تعلیمی ادارے آزاد ہوں گے۔ سکول' کالج' یونیورسٹیاں ہر شخص یا سوسائٹی یا مذہبی گروہ یا ادارہ قائم کر سکتا ہے اور اس کے اخراجات چلانے کے لئے دولت مندوں' فرموں یا کسی بھی حکومت سے چندے حاصل کر سکتا ہے۔ اور طلبہ پر بھاری فیسیں لگا سکتا ہے۔ وہ اپنا سارا نظام خود مقرر کر سکتا ہے' نصاب خود مرتب کر سکتا ہے' تعلیمی پالیسی طے کر سکتا ہے۔ جس زبان کو چاہے تعلیمی زبان بنا سکتا ہے' امتحانات کا ملکی یا غیر ملکی کوئی بھی نظام چلا سکتا ہے۔ استادوں کو لینے کا جو معیار چاہے اختیار کر سکتا ہے' جب چاہے کسی کو نکال سکتا ہے' ان کے گریڈز وغیرہ خود مقرر کر سکتا ہے۔ گویا اب تعلیم میں پاکستانیت' تعلیم میں اسلامیت' تعلیم کے لئے قومی زبان کی اہمیت' تعلیم پر بجٹ میں سے اخراجات' درسگاہوں کی تعلیمی پالیسیوں یا ان کے نصابوں اور کتابوں یا ان کے اصول نظم و ضبط' یا ان کے طریق امتحانات' یا ان میں کسی خاص مذہب یا فرقے کے رنگ' یا کسی دشمن ملک سے اعانت حاصل کرنے وغیرہ کے سارے معاملات میں حکومت کا کوئی تعلق نہیں۔ گویا پاکستان میں لادینیت کا پورا انتظام کر دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے نہ صرف میرے مباحث کی اہمیت بڑھ گئی ہے بلکہ اس سلسلے میں کچھ نیا کام کرنا ضروری ہے۔

○

اس طویل تمہیدی گفتگو کا خاتمہ میں اس وضاحت پر کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کتاب دراصل مجموعہ ہے مسئلہ تعلیم سے متعلق میرے ان مقالات' تقاریر' نوٹس اور سوالوں کے جوابوں کا جو پچھلے ۴۰' ۴۲ سال کے عرصے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ پس ہو سکتا ہے کہ قارئین کو بعض خیالات یا جملوں یا بحثوں کی تکرار محسوس ہو اور شاید کہیں کہیں کوئی گفتگو یا موضوع ایسا بھی سامنے آئے جس کا اپنے جس ماحول سے تعلق تھا وہ جوں کا توں باقی نہ رہا ہو۔ کچھ نہ کچھ قطع و برید کی گئی ہے۔ مگر بسا اوقات دو مختلف سلسلہ ہائے کلام میں ملتی جلتی باتوں کا لانا ناگزیر تھا۔ نیز اگر کسی

بحث کا تعلق گزرے ہوئے احوال یا ادوار سے بھی تھا تو بھی اس میں آج کے لئے اور کل کے لئے افادیت باقی ہے۔

تحریروں کا یہ مجموعہ بالکل ویسا تو نہیں ہو سکتا جیسے پہلے سے نقشۂ موضوعات و مآخذ مرتب کر کے لکھی ہوئی ایک باضابطہ تصنیف یا کتاب۔ مگر ایسا بھی نہیں کہ یوں ہی اوراق کا ایک ڈھیر سوچے سمجھے بغیر پلندہ کی شکل میں پیش کر دیا گیا ہو۔ امید ہے کہ اس ناچیز کوشش کو آپ قبول کریں گے۔

نعیم صدیقی
ستمبر ۱۹۹۷ء

تعلیم —— اسلامی تناظر میں *

(انٹرویو: نعیم صدیقی)

سوال: آپ کی رائے میں تعلیم کا مفہوم' اسلامی تناظر میں کیا ہے۔؟

جواب: جیسا کہ میں اپنے نقطۂ نظر کو پہلے بھی ایک مضمون میں بیان کر چکا ہوں۔ تعلیم ذرا جامع اور وسیع مفہوم کے لحاظ سے ایک اعتقادی' روحانی اور اخلاقی شعور کو اس کے برتنے' اس کے حاصل ہونے والے نتائج اور زندگی کی ضرورتوں کی تکمیل میں جو حصہ ہوتا ہے اس کے ساتھ اس مادی دنیا' مادی جسم اور مادی اشیاء کے پورے کاروان محسوسات کے ساتھ زندگی کے سفر کو طے کرنے' راستے کی مشکلات کے تجربات' دوسروں کے اعمال اور کارناموں سے حاصل ہونے والے احساسات' ایجاد و اجتہاد اور تخلیق و تحقیق کے رجحانات کا برسرِ عمل آنا اور اسی طرح کی پھیلی ہوئی ساری فکری' مشاہداتی اور تجرباتی' اخذ کردہ معلوماتی یا انکشافاتی واقعیتوں کا اپنے استدلال و استشہاد کے ساتھ اگلی نسل کو منتقل کر دینا اور اس کے لئے متفرق موثر وسائل کے علاوہ ایک باقاعدہ مخصوص اداراتی سسٹم کو وجود میں لانا وہ عمل ہے جسے ہم تعلیم کہتے ہیں۔
لیکن تعلیم کے لئے ایسا نہیں ہوتا کہ ہر چند سال بعد متعلمین کو جمع کر کے بتا دیا جایا کرے کہ اس عرصے میں فلاں فلاں ذہنی قوتیں' نفسیاتی عوامل' اور ان کو نمایاں کرنے والے حوادث یا ان سے پیدا ہونے والے قابل تحقیق مسائل سامنے آ چکے ہیں۔ اسی طرح فلسفے میں' ریاضی میں' قوانین تاریخ میں' اخلاقی ضابطوں میں خدا پرستانہ تہذیب اور لادین تہذیب کے متصادم و دائر نظریات و عملیات کا ایک خلاصہ ہر دس پندرہ سال بعد بتا دیا جائے۔
علاوہ اس کے کہ کئی امانت داران علم و حقیقت' تجربات و مشاہدات ساتھ کے ساتھ رخصت ہوتے رہتے ہیں اور کئی متعلمین کا رشتۂ حیات کسی وقت منقطع ہو سکتا ہے اس

---

* مجلّہ: ''تعلیمی زاویے'' جولائی ۱۹۹۷ء

لئے ضروری ہے کہ سلسلہ تعلیم و تعلم ایک بہتی ندی کی طرح مستقلاً جاری رہے۔
دوسری اہم تر بات یہ ہے کہ بہت سے پیچیدہ ذہنی و دانشی حقائق اور طبی و سائنسی انکشافات ایسے ہوتے ہیں کہ جن تک انسانی قافلہ بڑی مشکل سے ایک ایک قدم رکھ کر پہنچتا ہے اور اس عمل کی بہت سی گہرائیاں' باریکیاں اور عجائبات ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا سمجھنا صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ تعلیمی و تدریسی عمل ہر روز جاری رہے اور جدید سے جدید معلومات جزء بہ جزء متعلمین تک پہنچیں تا کہ وہ ان کی مربوط زنجیر بنا کر محفوظ کر سکیں۔ اگر یکا یک ہم نے ''کلون'' کا مسئلہ یا کمپیوٹر کے وائرس اور اس کے انٹرنیٹ کا قصہ ایک نوجوان کے سامنے رکھ دیا تو وہ بے چارہ کیا سمجھے گا؟ یہی کہ مداری کا کوئی تماشا ہے کہ یکا یک ایک چیز سامنے آ گئی۔ اسے انسان کا تولیدی نظام معلوم ہو (دوسرے ذی حیات موجودات کا بھی) اسے جنییات کا علم ہو۔ وہ DNA کو جانتا ہو' جین کے ذریعے مورث قریبی کے جسمانی خدو خال' ذہنی احوال اور صحت کے بعض سلسلے یا اعضا کے نقائص کیسے آگے چلتے ہیں۔ اسی طرح اسے پہلے کمپیوٹر کا تصور دلایئے' اسے کام کرتے ہوئے دکھایئے' کمپیوٹر کھول کر اس کے ایک ایک حصہ کے بارے میں بتایئے' پھر کئی مرحلے طے کر کے آپ انٹرنیٹ کا تصور دلا سکیں گے۔ یہی حال زبان اور شعر و ادب اور استعاروں اور اصطلاحات کے بدلنے اور منقلب ہونے کا ہے۔
طولِ کلام کو چھوڑ کر اب مختصر بات یہ ہو گی کہ زندگی کی صحت مندی' علم اور عمل دونوں کے اقدام کے ساتھ ساتھ ہونے میں ہے' چاہے نظریہ آپ کوئی بھی اختیار کریں۔
ہمارے ہاں اسی لئے کہا جاتا ہے کہ الایمان قول و عمل' یعنی ایمان جو قلب کا احساس' یا ذہنی شعور کی محفل کا فانوس ہے' اندر رہنے تک تو وہ ہے جو ہے اس کے باہر اظہار کے راستے دو ہیں۔ قول اور عمل' یا ایمان کا اقرار' ایمان پر کلام' ایمان پر غور اور اس کے ساتھ عمل کی ہم آہنگی۔

سوال: جامعہ پنجاب لاہور میں انجمن فاضلین ادارہ تعلیم و تحقیق کے زیرِ اہتمام منعقدہ ایک تعلیمی سیمینار میں آپ نے اپنے صدارتی خطبہ میں تعلیم کی تدوین و تعمیر میں ''تہذیبی شعور'' کو مرکز خیال بنایا تھا: کیا آپ کے مجوزہ تعلیمی فکری ماڈل میں کہیں ''مادی

احتیاجات'' کی نفی (Negation) تو نہیں کی گئی۔؟

جواب: ''تہذیبی نظریۂ تعلیم'' کی تقریر میں نے فکری غلامی اور کلچرل مزارعت کے تصور کی بنیادیں اکھیڑنے کے لئے لکھی ہے۔ ورنہ یہ منشا نہیں کہ مادی احتیاجات کی نفی (Negation) کی گئی ہو۔ اس خطاب میں جس کے ایک پہلو کا آپ نے حوالہ دیا ہے' دوسرے پہلو بھی مذکور ہیں' نیز میرے دوسرے بہت سے مضامین میں ان تعلیمی سوالات کے جوابات موجود ہیں جن میں آپ کے اس اندیشے کا سدباب کر دیا گیا ہے۔

ہمارا دین' معاش و معاد پر' ہماری زندگی روح و بدن پر' اور ہماری تہذیب ہوس ناکی اور اخلاقیت کی جنگ پر مشتمل ہے جس میں اخلاقیت غالب ہو۔ ہوسنا کی غالب ہو جائے تو پھر وہ ہماری تہذیب یا زندگی نہیں رہتی۔ اسی طرح نظام تعلیم کے لئے دونوں پہلو ضروری ہیں۔ نظام کوئی بھی ہو وہ بہرحال ''تارحریر دو رنگ'' ہی ہوتا ہے۔

سوال: پاکستان میں ہمہ جہت تعلیمی ترقی کے لئے کن مقاصد کو اہمیت دی جانی چاہیۓ۔؟

جواب: پاکستان یا کسی بھی ملک کی ترقی کا دارو مدار اس پر ہے کہ جس معنی میں ترقی مطلوب ہے یا جتنی جہتوں اور وسعتوں میں' آیا تعلیم (اور معاشرہ) اس کے لئے اسی طرز کا انسان مہیا کرنے پر کاربند ہے۔ اگر مطلوبہ صفات کے انسانوں کی صفیں کی صفیں تیار ہو کر ہر سال آ رہی ہیں کہ اس طرز کے انسانوں کی فکر' تحقیق و معلومات' اخلاقی رویوں' سیاسی و معاشی شعور اور اخلاقی قدروں' مجلسی شعائر اور تاریخی روایتوں کے سانچے میں نظام حیات کا ہر شعبہ ڈھلتا چلا جائے گا تو ٹھیک۔

بنیادی ضروریات تعمیر انسان برائے ترقی ہمہ جہتی کم سے کم حسب ذیل ہیں:-

❶ ایک اٹل ایمان اور تعمیری مشن بہ حیثیت بنیادی قوت حرکت و حرارت (Motive Force)

❷ علم اشیاء' اپنے جسم' حیات ارضی' قوانین مادہ' نظام فلکیات پر شعوری طور پر حاوی ہونا۔

❸ اخلاقی حس — خدا سے تعلق کے لئے' بندوں سے تعلق کے لئے' مادی قوت و دولت پر حاوی ہونے کے لئے۔

۴. نظم —— ہر کام میں بہترین' اشخاص و اشیا کی درجہ بندی' اپنا مقام!
۵. صحت مند معاشرے کا تصور —— کن اصولوں اور کن قوانین سے کوئی بھی چھوٹی یا بڑی اجتماعیت قائم ہوتی ہے' عائلی' معاشرتی و مدنی' سیاسی و معاشی' کن صورتوں میں زیادہ سے زیادہ انسانوں کو مساوات و اخوت اور جذبہ خدمت کے خط پر قائم کیا جا سکتا ہے۔؟ کن صورتوں میں انسانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو ظلم اور دکھ اور بے بسی و محرومی سے بچایا جا سکتا ہے' کن صورتوں میں اولادِ آدم کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو انصاف اور امن کے ساتھ مشکل میں سہارا پہنچایا جا سکتا ہے۔
۶. کوئی بھی تقلیدی ذہن کا انسان اور غیروں کے کلچر کی گاڑی کا قلی چاہے کتنے ہی سنہرے اور روپہلی ساز و برق سے آراستہ کیا گیا ہو' کبھی کسی اجتماعیت کو ترقی کے کسی ایک پہلو پر بھی نہیں ڈال سکتا ہے' کجا کہ آپ ہمہ جہتی ترقی چاہیں۔
۷. یہی اوپر کی آفت اس زبردست تعمیری' انقلابی اور دفاعی قوت کو کھوکھلا کرنے کا سبب بن جاتی ہے جسے حقیقی معنی دینے کے لئے قوت ایجاد اور قوت تخلیق کی ضرورت ہوتی ہے۔

وہ نظام تعلیم کسی قوم و معاشرہ کے لئے پیام مرگ ہے جو اپنے تعلیمی اداروں میں سولہ سولہ برس رکھ کر طلبہ کو اس حالت میں نکالے —— اور یہ کام سالہا سال سے مسلسل ہو رہا ہے کہ وہ اپنے دل و دماغ کو غلامی اغیار کے سانچے میں کامیابی سے ڈھلوا لانے کی سند اعزاز لے کے ہر سال نکلیں' اور جن میں سامراجی طاقتوں کے فلسفے اور کلچر پر نہ تو ان کو تنقیدی نظر ڈالنے کا ملکہ ہو اور نہ وہ اپنے سرمایۂ تہذیب و علوم کا سراغ لگا سکیں' اور نہ ان میں قوت ایجاد' قوت تخلیق یا ندرت فکر کا کوئی داعیہ مفلوج ہونے سے بچ سکا ہو۔ آخر غلامی کے پروردہ اور ملازمت پسند اور دشمن فلسفوں اور کلچرز کے وکیل بننے والوں کو متذکرہ قوتوں کی ضرورت کیا ہے۔

ایسے جوانوں سے بننے والی قوموں پر کوئی بھی پارٹی حکومت کرے' کسی کی وزارت عظمیٰ قائم ہو' کیسے ہی شاندار منشور اور نعرے فضا میں پھیلا دیئے جائیں' ریت کے ڈھیروں سے قلعوں کی تعمیر نہیں ہو سکتی' اور نہ ان پر ترقی کے جھنڈے لہرا سکتے ہیں۔ کیا یہ سبق ہم اپنے ملک کے پچاس سالہ دور کے نت نئے سیاسی تھیٹر کے بعد بھی اخذ

نہیں کر سکے۔

مجھے یہ گستاخانہ بات کہتے ہوئے معاف کر دیجئے کہ نظام تعلیم کی مشینری کے بعض پیچ پرزوں کو بدل دینے سے ہماری اجتماعی تقدیر نہیں بدل سکتی۔ خدا کے پاس تو بہ ارشاد اقبال ''تقدیرات حق لا انتہا ہیں'' مگر ہم اپنے آپ کو کسی نئی تقدیر کا اہل ثابت تو کریں۔ ''کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں۔''

سوال: آپ کی نظر میں تعلیمی عمل کے دو اہم عناصر ''نصاب اور معلم'' کیا یکساں اہمیت رکھتے ہیں؟ یا کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل ہے۔؟

جواب: بہت مختصر جواب! نصاب ایک مستری کے اوزاروں کا بکس ہے' اور مستری اگرچہ محدود و مقرر اوزار رکھتا ہے' مگر وہ نصاب سے زائد خود ایک چیز ہے۔ اگر اس میں ندرت خیال' ایجاد فکر اور قوت تخلیق (تعلیمی معنوں میں) ہو تو وہ نصاب سے اعلیٰ تر جز و سبق خود اپنی طرف سے شامل کر دیتا ہے۔ نصاب میں تنقیدی دروازہ بند ہے۔ لیکن وہ سبق پڑھاتے ہوئے تاریخ کے واقعات اور معاشرے کے حادثات' اور آئینہ ادب میں محفوظ مختلف کرداروں کو لے لے کر ایک دوسرے کے مقابل رکھتا ہے اور تنقید کر کے ایک کو دوسرے سے چھانٹتا ہے' اور پھر اسی ذہنی فضا کی آب و ہوا میں وہ درسی کتاب کا کوئی حصہ سبق لیتا ہے اور اس کی توضیح کرتا ہے۔ کیا وہ ایک شعر عظیم کو واضح کرنے کے لئے اسے مختلف پہلوؤں سے نہیں دیکھے گا اور مختلف آراء سامنے نہیں لائے گا' اگر ایسا کرے گا تو اسے سارے مواد تقریر میں سے وہ نکات چھانٹنے ہوں گے جو کسی کلام یا فارمولے میں پرچم کی طرح بلند ہیں۔ نیز وہ اپنے شرکائے محفلِ درس کے ذہنوں کو ان دوسری وضاحتوں اور اشارتوں سے کیسے خالی کرے گا جو اس کی زبان سے صادر ہوئیں۔ بلکہ یہ تو عین اس کی ضرورت اور منشا تھیں کہ ظاہر ہوں۔ بات لمبی ہو رہی ہے۔ ختم اس پر کرتا ہوں کہ ایک غیر مفید یا غیر معیاری نصاب کی درسی کتابوں کو پڑھاتے ہوئے کسی دوسرے تنقیدی' تعمیری' باغیانہ تقابلی یا اختلافی رجحان کو کامیابی سے پیش کر سکنے والے استادوں کا تناسب ہمارے ہاں کیا ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ ۱۰۰۰ء یا کوئی عدد لکھ لیجئے۔ ورنہ اگر کام کے ایک سو استاد ہمارے ہاں موجود ہوتے تو وہ نظام تعلیم کے سمندر کو اتھل پتھل کر دیتے۔

میں پہلے کسی مضمون میں ذکر کر چکا ہوں کہ پروفیسر ایرک سپریان آنجہانی' اسلامیہ کالج لاہور میں چھوٹی سے تنخواہ پر برسوں کام کرتے رہے۔ کسی شخص نے ان سے پوچھا کہ آخر اتنی بڑی قابلیت کے ساتھ آپ حقیری تنخواہ پر یہاں کیوں پڑے ہیں۔ سپریان نے کہا کہ میرا مقصد تنخواہ نہیں' میں ہر سال اس کالج سے پانچ سات افراد ''اپنے طرز فکر کے'' تیار کر کے نکالتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میرا یہی حصہ بہت تسکین بخش ہے —— فرمایئے! آپ کے پاس کتنے استاد ایسے ہیں۔نہیں ہیں تو مقالے تو انباروں لکھے جا چکے ہیں اور لکھے جائیں گے۔ مگر شاید دس برس میں بھی ایسے دس استاد نہ بن سکیں گے۔

سوال: اساتذہ کی تربیت کے حوالے سے آپ نے اپنے ایک مضمون میں یہ نقطۂ نظر پیش کیا ہے کہ سکول کی سطح پر مختلف مضامین کے نمایاں موضوعات وتصورات کے سلسلے میں رہنمائے اساتذہ کتب (Teachers' Guides) تیار ہونی چاہئیں۔ براہ کرم اس کی وضاحت فرمادیں۔

جواب: میرا منشا اس سے اساتذہ کے لئے ایسی گائیڈ بکس تیار کرنا تھا جو کسی مضمون کی کسی کتاب کے مندرجات میں سے ایک ایک کو چیک کر کے یہ واضح کرے کہ یہاں جو نقطۂ نظر (فقروں یا پیروں کا حوالہ) دیا گیا ہے وہ ہماری ایمانی یا اخلاقی یا فکری یا تجربی' یا مشاہداتی مسلمہ حقیقتوں سے ٹکراتا ہے یا ہمارے تہذیبی سسٹم سے متصادم ہوتا ہے' اس لئے ہم اس کے بالمقابل فلاں فلاں معلومات یا دریافتوں یا تجربات یا الہامی ہدایات یا نبویؐ اسوہ (عقلی وعملی واشاراتی پیرائے میں) رکھتے ہیں۔

اس کی ایک صورت یہ ہے کہ مثلاً مغربی معاشرت کا ایک حوالہ ہے۔ اس پر استاد کو یہ بتانا ہے کہ یہ چونکہ خالص تجربی (غیر الہامی) عقل پر مبنی ہے' اس لئے اسے بلحاظ نتائج و اثرات چیک کرنا ہوگا۔ مثلاً جنسی آزادی' یا کسی خالص فلسفیانہ کلئے کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ دوسرا پہلو اوجھل رہ گیا ہے۔ یہاں چاہیں تو یورپین فلاسفی میں سے ہی متذکرہ کلئے کے خلاف تنقید دکھائی جائے۔ مثلاً فرائڈ یا ایڈلر کے کسی ٹیڑھے نظریئے کا مسئلہ ہو۔

جیومیٹری میں یا طب میں یہ کیا جائے کہ فلاں چیزیں جو یونانیوں یا یورپیوں نے ایجاد

کی ہیں۔ حوالے سے بتایا جائے کہ یہ چیزیں تو فلاں فلاں مسلمان فلسفیوں نے فلاں وقت ایجاد کی تھیں اور فلاں دریافت تو ہمارے اسلاف کی ہے۔

حساب میں یا اکنامکس میں سود کا نظریہ آتا ہے۔ اجارہ داری کا آتا ہے۔ غربا کو بے سہارا چھوڑنے کا آتا ہے تو ایسے معاملات میں ہمارے استاد کی نظر اپنی صحیح تعلیمات پر ہونی چاہئے۔ وہ مختصر نوٹ پڑھنے کے علاوہ خاص موضوعات پر چند اہم کتابیں بھی پڑھے۔

("Revolt Against Reason") پہلے ایک خیالی سی کتاب تھی' مگر ابھی اسی سال ۹۷۔۹۶ء میں بعض مضامین انگریزی جرائد میں ایسے شائع ہوئے ہیں جن میں موجودہ عقل پرستی کو قفس یا زنداں قرار دیا گیا' بالکل جدید لوگوں نے جن کا تعلق مختلف شعبوں سے ہے' انہوں نے اسے عقل کی ڈکٹیٹر شپ کہا ہے اور اس پر دلائل دیئے ہیں۔

امریکہ میں پچھلے سال سے اب تک جنین کشی (اسقاط) کے خلاف خیالات کا دریا بڑا طوفانی ہے' کہا گیا ہے کہ ایک طرح کا قتل ہے اور ۱۹۴۷ (جب اسقاط کو جائز کیا گیا) سے لے کر اب تک غالباً ۵۰ ملین قتل ہو چکے ہیں۔ پہلے ہم مسلمان اسے قتل کہتے تھے تو مذاق اڑایا جاتا تھا' اب خود تحریک اٹھائی گئی ہے کہ یہ قتل جنین کا سلسلہ بند ہونا چاہئے۔ بعض جوشیلے گروہوں نے اسقاط کے ہسپتالوں پر حملے کئے ہیں۔ کئی ڈاکٹروں اور نرسوں کی مار پیٹ کی گئی ہے۔

ایٹم بم پھٹنے پر جوہری اجزاء کے ذرات کی جو بارش ہوتی ہے' اسے حرف آخر سمجھا جاتا ہے' یہاں ہمارے مسلمانوں کے تخلیقی ذہن کو کام کرنا چاہئے۔ کہ ایٹم بم پھٹنے کے ساتھ ہی عین اس مقام پر کوئی اور بم ایسا پھٹنا چاہئے جس کے ذرات بم کے یورینیمی ذرات کے ساتھ مل کر ان کو ایک بے ضرر مادے میں بدل دیں۔ افسوس ہے کہ یہ بات ابھی کہیں بھی نہیں سنائی دے رہی۔ یہ ہے قحط رجحان تخلیقِ افلاس قوت ایجادو اختراع۔

آخر یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ لیزر شعاعوں کو کسی اور طرح کی شعاعوں کے ساتھ مرکب کر کے اس حالت تک پہنچا دیا جائے کہ جہاں اس نئے مادے کی شعاع پڑے وہاں

اگر ایٹمی مواد ہوتو وہ بھک سے اڑ جائے اور اگر بارود سے وہ شعاع مس کرے تو بارود دھماکہ کر دے۔

یہ فرضی مثالیں ہیں۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ ہمارا استاد ایسی تمام امکانی چیزیں جمع کر کے انہیں بھی مروجہ درسی کتابوں کے مضامین کے اجزاء پر بحث کرتے ہوئے طلبہ کے کانوں میں ڈالے کہ وہ بڑے ہو کر اس طرح سوچیں۔ یا ان سوچوں کے ساتھ بڑے ہوں اور مطالعہ کریں۔

اور یہ چیزیں اسکولوں کے داخلی امتحانات میں باقاعدہ سوالوں کے ذریعے معلوم کی جائیں کہ طلبہ کیا جانتے اور سوچتے ہیں۔ اور ان کو آزادی ہو کہ وہ اور جو چیزیں مناسب سمجھیں سوچیں اور لکھیں اور بعض پر انعامات بھی دیئے جائیں۔

یہ اہتمام بھی کیا جا سکتا ہے کہ یہ تنقیدی تخلیقی پرچے الگ لکھوا کر چند دن آگے پیچھے ان کے بارے میں فائلیں بنوا لی جائیں۔ اور ان کی حیثیت دماغی مشق کی ہو اور مقررہ درسی کتابوں اور امتحانی پرچوں سے ان کا تعلق نہ ہو۔ لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہر مضمون کے پرچے میں کم از کم ۲۵ نمبر کے سوال تنقیدی، تخلیقی (دور اختلافی) ہوں۔ نیز ایسے امور کے متعلق سوالات زیر تربیت اساتذہ سے کر کے درسی کتاب کے ایک ایک سبق کے متعلق پوچھا جائے کہ اس کے اجزاء پر آزادی سے ناقدانہ و تخلیقی اظہار خیال کرو۔ اور کوئی صورت مدرسین تیار کرنے کی نہیں۔ ظاہر ہے کہ پہلے اساتذہ کے سامنے ضروری امور وضاحت سے رکھے جائیں۔

سوال: پاکستان میں خواتین یونیورسٹی کی تشکیل سے متعلق چند سال قبل آپ کا تفصیلی مقالہ ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور[1] اور دیگر کئی جرائد میں چھپ چکا ہے۔ اس میں نظری مباحث کا بھی جامع احاطہ کیا گیا ہے اور عملی نقشہ اور لائحہ عمل بھی بڑا واضح ہے۔ لیکن ابھی تک یونیورسٹی کا قیام ایک خواب و خیال ہی ہے — آپ کی نگاہ میں اس کی کوئی خاص وجہ یا کہیں سے کوئی نمایاں مزاحمت؟

جواب: میرے نزدیک محض ووٹروں اور عوام کے پریشر سے یا وزارت کے الجھنوں میں پڑ جانے پر اس طرح کے مسائل کو منوایا جا سکتا ہے، مگر یہ صحیح راستہ نہیں۔ بلکہ ہونا یہ

---

[1] یہ مضمون اس کتاب میں شامل ہے۔

چاہیے کہ معاشرے کا ضمیر اور ملک کی مجموعی فضا اور اہل سیاست کے رجحانات ''اس ضروری کام'' کی بھوک محسوس کرنے لگیں۔ ہمارے ہاں اس طریقے کا کوئی تجربہ مکمل نہیں ہوا۔ سوائے' کسی حد تک قرارداد مقاصد پاس ہونے کے۔ دباؤ کا تھوڑا سا اثر اس میں بھی تھا مگر اس وجہ سے کہ ملحدین' کمیونسٹ اور مغرب پرست سیکولرسٹوں کی ایک طاقت اندر سے اور ایک باہر سے زور لگا رہی تھی کہ پاکستان اس وقت ایک سیکولر ڈیموکریسی کی حیثیت سے دستوری طور پر مسلم ہو جائے۔ ایسے فیصلہ کن مرحلے میں دباؤ بہت تھوڑا استعمال کیا گیا' البتہ اسلامی دستور' اسلامی ریاست اور قرارداد مقاصد پر بے شمار لٹریچر پھیلا دیا گیا اور علما اور نوخیز نوجوان دانش مندوں کی ٹیمیں دیہات تک لوگوں کو شعور دلا آئیں کہ اس وقت کیا ہونے والا ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ چنانچہ اس وقت کے ایک امریکی دانشور نے پاکستان سے واپس جا کر یہ رپورٹ لکھی کہ میں دیہات میں کسانوں کے پاس بھی گیا۔ ایک ہل چلانے والے کو روک کر پوچھا: پاکستان کا اس وقت سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟ اس نے فوراً کہا ''اسلامی دستور''۔ امریکی صاحب نے لکھا کہ میں حیران رہ گیا کہ پاکستان کے ان پڑھ دیہاتی تک اپنے مسئلۂ دستور کو جانتے ہیں۔ حالانکہ امریکہ میں اچھے اچھے تعلیم یافتہ اصحاب' دستور اور اس کی ترمیمات اور ان کی کانگریس' سینٹ یا اخباری بحثوں کے متعلق کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ بات یہ تھی کہ اندر بھی ایک مضبوط فورس کام کر رہی تھی اور باہر سے بھی اس کے ہاتھ مضبوط کئے جا رہے تھے۔ ورنہ محض دباؤ کی وجہ سے قرارداد مقاصد پاس بھی ہو جاتی تو اب تک اڑ جاتی۔

افسوس کہ خواتین یونیورسٹی کے متعلق کماحقہ کام نہیں ہوا' اور کام کرنے والے بھی کم جانتے ہیں کہ عام سیاسی شوشوں کے بجائے اس قسم کے موضوعات پر کام کیسے ہونا چاہیے۔

حصہ اول

تعلیم —— فکری اساس

آئیڈیالوجی اور نظام تعلیم

ہمارا نظام تعلیم وہی ہوسکتا ہے جو ہماری اپنی آئیڈیالوجی ــــ اسلامی آئیڈیالوجی ــــ کا آئینہ دار ہو۔ جس آئیڈیالوجی نے ہمیں غیر ملکی تسلط سے نجات پانے کے لئے جدوجہد کا عزم دیا' جس نے ہندو اکثریت کے فسطائی عزائم کے خلاف ہمیں اکٹھا کھڑا کیا' جس نے ہمیں تقسیم ہند کی تحریک برپا کرنے کی توفیق دی' وہی ہمیں ملی خودی سے آراستہ کر کے ترقی کی راہوں پر لے جا سکتا ہے۔ صرف اسی کے ہونے سے ہمارے اندر اپنے وجود کا' اپنی قوت کا' اپنی عزت وعظمت کا بھرپور احساس پیدا ہوتا ہے اور اپنے وجود ــــ ملی اور تہذیبی وجود ــــ کے لئے مخالف قوتوں سے ٹکرانے اور مزاحمتوں پر فتح پانے کا ولولہ اُبھرتا ہے۔

ہمیں ایسے نظام تعلیم کی ضرورت ہے جس کے ذریعے اسلامی تصور حیات اور اسلامی نظام تہذیب کے لئے ہمارے اندر وہ روح فعال کام کرنے لگے جسے ایمان کہتے ہیں۔ ہمارا بچہ بچہ اس تصور اور نظام کا مشعل بردار (Torch Bearer) بن کے اٹھ کھڑا ہو۔ اس کے اندر اسلام کے متعلق کوئی احساس کمتری باقی نہ رہے اور وہ کسی دوسری آئیڈیالوجی' کسی دوسری تہذیب یا کسی دوسری قوم کی طرف مرعوبیت کے انداز میں نگاہ اٹھا کے نہ دیکھے۔

پاکستان کی اساس اسلامی آئیڈیالوجی پر رکھی گئی ہے سوال یہ ہے کہ وہ اسلامی آئیڈیالوجی کیا ہے؟ اس کا اصولی جوہر کیا ہے؟ اس کے اندر کونسے تمدنی تقاضے مضمر ہیں؟ اس سے کیسا نظام تہذیب پیدا ہونا چاہیے؟

ان سوالات کے جواب میں اپنی آئیڈیالوجی کا دھندلا تصور کافی نہیں۔

جس نظریہ حیات پر ایک عظیم مملکت کا پورا نظام تمدن چلایا جانا ہو اور جس کے بل پر تعمیر نو کا وسیع انقلابی کام کیا جانا ہو اس کا نہایت تفصیلی اور سائنٹیفک شعور ہر شہری کے دل میں کار فرما ہونا چاہیے؟ ــــ یہ شعور ہماری نئی نسل میں تبھی پیدا ہوسکتا ہے جب ہمارا نظام تعلیم' ہمارے تعلیمی ادارے' ہمارے اساتذہ' ہمارے نصابات اس نظریاتی کشمکش کے دور کا مقابلہ

کرنے کے لئے ہر لحاظ سے تیار ہوں۔

اسلامی آئیڈیالوجی پورے نصاب تعلیم، پورے تعلیمی ماحول اور اساتذہ کی شخصیتوں اور کرداروں پر اس طرح چھائی ہوئی ہو کہ پاکستان کے نظام تعلیم کے پروردہ نوجوان مادی تصور حیات، ملحدانہ نظریات اور سیکولر نظاموں کے خلاف فکری جہاد کرنے کیلئے میدان میں نکل آئیں۔ وہ تقلیدی رجحان کے روگ سے نجات پا کر مخالف اسلام نظریات اور نظاموں کے بالمقابل تنقیدی استدلال لے کے کھڑے ہوں۔ خصوصاً فلاسفی اور سوشل سائنسز میں مغربی نظریات (Western Thought) کے بالمقابل ایک مضبوط خدا پرستانہ فکری محاذ قائم کر دیں۔

نظریہ کی اہمیت

نظریہ (Idealogy) ایک قوم کے لیے روح کی سی حیثیت رکھتا ہے جس کے ہونے سے زندگی برقرار رہتی ہے اور جس کے فقدان کی صورت میں انسانی معاشروں سے اس حرارت و حرکت کا خاتمہ ہو جاتا ہے جس کا نام زندگی ہے۔ نظریہ تمدن کے لیے گویا حرکی قوت (Motive Power) رکھتا ہے، وہ معرکہ خیر و شر میں تلوار کا کام دیتا ہے، وہ تعمیر نو کے لئے اساس بنتا ہے، وہ انسانیت کو نصب العین دیتا ہے، وہ خودی کے جوہر کو چمکاتا ہے، وہ کردار کے لیے جڑ[1] کی حیثیت رکھتا ہے، وہ قربانی کے لئے ولولہ پیدا کرتا ہے اور زندگی کے تمام اجزائے پریشاں کو مربوط کرنے والا شیرازہ بنتا ہے۔ اس موقع پر ونسنٹ کا قول ذہن میں گونجنے لگتا ہے کہ:

> ”نظریات وہ قوت ہیں جو تہذیبوں کو جنم دیتے اور جو انقلابات کی تحریک کرتے ہیں، ان میں بموں سے کہیں زیادہ طاقت ور آتشیں مادہ پوشیدہ ہے۔“

آئیڈیالوجی کا مفہوم غالباً قائداعظم کے ایک جملے میں کم سے کم لفظوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مسٹر گاندھی کو ایک خط لکھتے ہوئے اپنے نظریہ و مقصد کی تعریف یہ بتاتے ہیں کہ

---

[1] جڑ بھی ایسی زندہ جڑ کہ قوم کے سینے میں بار بار پھوٹنے والی۔ اوپر سے آپ تنا اور شاخیں کاٹ دیجئے نئی کونپلیں پھوٹ آئیں گی، آپ اس کے اوپر بھاری سل رکھ دیں، نیا تنا نشوونما پا کر رینگتا ہوا اس کے ایک طرف سے آ نکلے گا یا جڑ اندر ہی اندر پھیل کر کہیں دور سے جا پھوٹے گی۔ یہ فطرت کا ایک غیر متبدل عمل ہے، کوئی اس کا راستہ نہیں روک سکتا۔

"وہی چیز جو وہ کچھ کرنے میں ہماری رہنمائی کرتی ہے' جو کچھ ہم کرتے ہیں۔"

قوم کی یہ زندگی بخش نظریاتی روح اگر زندہ و توانا ہو تو دوسری تمام قوتیں ہاتھ آ جاتی ہیں اور تھوڑی قوتوں سے بہت زیادہ نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ نظریہ سے سرشار ہونے والی قوموں کا عشق اتنا جسور اور فقر اتنا غیور ہوتا ہے کہ وہ کبھی خوار نہیں ہوتیں' لیکن نظریہ کی مرکزی قوت ختم ہو جائے یا کمزور پڑ جائے تو محض روپے پیسے' صنعت و تجارت' فوجوں اور اسلحہ' ادارات اور تنظیموں اور معاہدوں اور بلاکوں کے بل پر کسی انسانی گروہ کو نہ زندگی حاصل ہو سکتی ہے' نہ ترقی و کامیابی۔ بدن میں اگر روح ختم ہو رہی ہو اور شجاعت کا جوہر فعال کام نہ کر رہا ہو تو بھینسے جیسا عظیم جثہ گوشت کے ایک ڈھیر سے زیادہ نہیں۔ نظریہ سے محروم معاشرے یا تو قائم ہی نہیں رہ سکتے' یا پھر وہ دوسروں میں ضم ہو جاتے ہیں اور کسی نظریاتی تمدن کے تابع مہمل بن جاتے ہیں۔ اقوام کا زوال "بے زری" سے نہیں ہوتا' اور ان کا عروج تونگری کا مرہون منت نہیں ہوتا۔ اسی طرح اسلحہ کی کمی کے بھی معنی لازماً یہ نہیں ہوتے کہ ایک قوم کمزور ہے' بلکہ اگر اس کے جوانوں کی خودی فولاد کی سی قوت رکھتی ہے تو وہ بہت زیادہ محتاج شمشیر نہیں رہتی۔ دوسری طرف اگر خودی ہی جواب دے جائے تو پھر جو کچھ رہ جاتا ہے وہ خالی زرنگار نیام ہوتے ہیں جن میں شمشیریں نہیں ہوتیں۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو زیادہ خوبی سے اجاگر کیا ہے اور بڑے سادہ لفظوں میں:

"قوموں کی حیات ان کے تخیل پہ ہے موقوف"

اور اس حقیقت کا دوسرا رخ یوں بیان کیا ہے کہ:

"قومیں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں"[1]

کسی بھی نظریۂ حیات کی لازمی شان یہ ہے وہ انسان کو غایت حیات دے' اس کے سامنے کوئی مقصد اور نصب العین رکھے' اس میں حرکت و اقدام پیدا کرنے کے لئے کسی منزل کمال تک پہنچنے کا شوق دلائے۔ ایک نہ ایک نصب العین —— محدود یا وسیع' پست یا ارفع' شعوری یا نیم شعوری —— ہر نظریہ میں مضمر ہوتا ہے۔ نصب العین افراد اور اقوام کے سامنے

[1] خطبہ صدارت با اجلاس مسلم لیگ ۱۹۳۲ء

منتہائے نظر بنتا ہے' یہاں تک کہ وہ ایک جنون انگیز معشوق بن جاتا ہے جس کے ایک ایک غمزہ حشر آفریں سے مست ہو کر اہل دل بڑی بڑی بازیاں کھیل جاتے ہیں اور ساری عمر جدوجہد اور تگ وتاز میں صرف کرنے کے بعد خاک وخون میں تڑپ جانے کو اپنے لئے رتبہ کمال سمجھتے ہیں ؎

تمنت سلیمیٰ ان نموت بحبھا
واھون شیئ عندنا ما تمنت

خلاصہ مدعا یہ ہے کہ نصب العین وہ اعجاز آفریں قوت ہے کہ جس کے فیض سے کسی قوم کے قوائے عمل حرکت میں آتے ہیں۔ رفتار ارتقا تیز ہو جاتی ہے۔ زندگی میں تنظیم وترتیب پیدا ہو جاتی ہے۔ فکر وعمل میں وحدت وہم آہنگی آ جاتی ہے۔ پس انسان جیئے تو کسی اعلیٰ نصب العین کے شاہد مقصود کا دیوانہ بن کر جیئے اور پروانہ وار اس شمع کا طواف کرتے ہوئے ایک ایک لمحۂ عمر کھپا دے۔ صرف ایسی ہی زندگی بسر کیے جانے کے شایان شان ہو سکتی ہے۔

کوئی آئیڈیالوجی کتنی بھی اچھی کیوں نہ ہو' اس وقت تک بے کار ہے جب تک کہ اس کے لئے کام کرنے والے ایسے انسانی افراد موجود نہ ہوں جو اس پر ایمان رکھتے ہوں اور اس کے لئے مل جل کر کام کرنے کا ارادہ ان میں کارفرما ہو۔ یہ افراد اپنے ایمان جذبے اور کردار کے لحاظ سے جتنے بہتر ہوں گے سفرِ مقصد اتنی ہی اچھی رفتار سے طے ہو گا۔

اقبال نے ایک فکر دی' ایک تصور دیا' ایک نقشہ دیا! قائداعظمؒ نے اس تصور کو سامنے رکھ کر اسلامی ریاست کا وطنی پیکر تراش کر مہیا کر دیا۔ اب اس سلسلہ کار کی تیسری کڑی باقی ہے' یعنی پاکستان کے پیکر میں اسلامی آئیڈیالوجی ایک روح بن کر عملاً کام کرنے لگے۔

برصغیر ہندو پاک کے مسلمانوں نے جدوجہد آزادی کی راہ پر قدم رکھا اور پھر تحریک پاکستان کی تاریخی مہم کا آغاز کیا تو ان کے ہاتھوں میں ایک آئیڈیالوجی کی مشعل تھی۔ اسی آئیڈیالوجی کے شعلۂ تابناک سے تصور پاکستان کا شرر ٹوٹا اور اس شرر کے بیج کی آبیاری جب پسینے کی بوندوں' آنسوؤں اور لہو کی دھاروں سے کی جا چکی تو اس سے ایک آزاد وطن ایک

سلطنتِ خداداد کا وجود نمودار ہوا۔ آج ہم پاکستان کے نخلِ شاداب کا کوئی تصور اس آئیڈیالوجی کے بیج سے الگ کر کے نہیں باندھ سکتے ہیں۔ وہی اس درخت کی قوت نمو ہے' وہ اسکی ہر شاخ میں جاری و ساری ہے اور وہ اسکے پتے پتے پر نقش تقدیر بن کر ثبت ہے۔ کوششیں ضرور کی گئیں کہ اس درخت کا تعلق اسکی آئیڈیالوجی کے بیج سے کاٹ دیا جائے اور اسکی ٹہنیوں اور پتیوں سے اس کا رس نچوڑ کے الگ کر دیا جائے ــــــ دوسرے لفظ میں پاکستان کی فطرت کو مسخ کر دیا جائے ــــــ مگر بہت سے داناؤں کی ایسی نادانیاں بار بار نامرادی پر منتج ہو کر رہیں' اور ان شاء اللہ آئندہ بھی ایسی کوششوں کے بار آور ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

ہم بار بار کہتے ہیں کہ پاکستان ایک آئیڈیالوجی کی بنیاد پر کھڑا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ وہ اسلامی آئیڈیالوجی ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر پاکستان کی وہ اسلامی آئیڈیالوجی ہے کیا؟

جس آئیڈیالوجی کو کسی ملت کی روح حیات بن کر کام کرنا ہو' جس پر ریاست و سلطنت کی اساس رکھی جانی ہو اور جس پر ایک نظام زندگی اور ایک تہذیب و تمدن کو استوار ہونا ہو اس کا مبہم تصور اور دھندلا شعور کافی نہیں ہو سکتا۔ اس آئیڈیالوجی کا حکیمانہ مطالعہ کیا جانا چاہیے' اس کا مکمل سائنسی تصور نگاہوں میں رہنا چاہیے' ہر پہلو سے اس کا اتنا واضح شعور عام ہونا چاہیے کہ اس پر بچے بچے کو یقین محکم حاصل ہو۔ یہی آئیڈیالوجی ہمارا سرمایۂ وجود' ہماری قوت عمل اور کارزارِ حیات میں ہماری تلوار ہے۔ اس سے محض سرسری واسطہ رکھ کر تو ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔

پھر ہم اسلامی آئیڈیالوجی کا سفینہ اپنے دورِ تاریخ کے طوفانی سمندر میں ڈال رہے ہیں جس میں نظریات اور نظاموں کا ٹکراؤ نہایت خوفناک طریق سے ہو رہا ہے ہمارے مخالفین اس دور کو تہذیبوں کی جنگ قرار دے رہے ہیں۔ ہم اگر آگے بڑھنا چاہیں تو ہر سمت سے شدید مزاحمت و مسابقت کا سامنا ہے۔ ایک جداگانہ نظریۂ حیات کو لے کر ہمارا پیش قدمی کرنا زمانے کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے نظریات جن کا ڈنکا بج رہا ہے اسے زک دینے کی سرتوڑ کوشش کریں گے اس میں کامیابی نہ ہو گی تو اس میں نقب لگا کر اسے اپنے ساتھ خلط ملط کرنے کی تدبیر کریں گے تاکہ وہ مسخ ہو کر بے زور ہو جائے۔ اس فکری اور سیاسی کشمکش سے عہدہ برا ہونا گہرے شعور اور محکم ایمان کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ہم اپنی آئیڈیالوجی کے سرسری تصور پر اکتفا کر ہی نہیں سکتے۔ اپنی آئیڈیالوجی کے مطابق ہمیں زندگی کی حقیقت کا

علم ہونا چاہیۓ علم اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ اعتقاد بنے' اس اعتقاد میں اتنا جذبہ عمل حل ہونا چاہیے کہ یہ ایمان کے مرتبے کو پہنچے اور یہ ایمان اس درجہ جاندار ہونا چاہیے کہ اس کے سرچشمہ سے ایک تحریک کی دھار پھوٹ نکلے۔

زندگی کے مختلف نظریئے

کوئی نظام زندگی ایسا نہیں جس کی اساس ایک نہ ایک نظریۂ حیات پر نہ ہو۔ جس دور تہذیب کو بھی آپ لیں' جس نظام اجتماعی کا بھی مطالعہ کریں' کسی نظام کے ذیلی شعبوں کو دیکھیں' معاشرے کے اداروں کا جائزہ لیں' قبیلوں اور خاندانوں کے ضابطوں اور روایات کی تحقیق کریں بلکہ نیچے اتر کر ایک ایک فرد کے ذاتی کردار اور اسکے کسی بھی نجی فعل کا تجزیہ کریں' ہر جگہ انسانی فکر و عمل کی تہ میں کوئی نہ کوئی تصور و اعتقاد کام کرتا ملے گا ـــــ کہیں شعوری' کہیں نیم شعوری اور کہیں غیر شعوری سطح پر! یعنی نظریہ اعتقاد سے خالی کر کے ہم انسانی زندگی کا کوئی تصور ذہن میں نہیں لا سکتے! دوسرے لفظوں میں زندگی بسر کرنے کے لئے نظریہ و اعتقاد کا ہونا لازمی ہے۔

حقیقت کو جاننے کی پیاس انسانی فطرت میں رکھی گئی ہے۔ اسکے پیدا ہوتے ہی یہ پیاس اپنا کام کرنے لگ جاتی ہے۔ وہ اپنے گردوپیش کو جاننا چاہتا ہے۔ اپنے آپ کو سمجھنا چاہتا ہے۔ پھر وہ ظاہری حقیقتوں کے پردے کے پیچھے جھانکنے کی کوشش کرتا ہے۔ علم کا ایک جرعہ پیتا ہے تو پیاس اور بھڑکتی ہے' پھر پورا ساغر چڑھا جاتا ہے اور تشنگی اور بھڑک اٹھتی ہے' پھر خم کے خم پیتا جاتا ہے مگر کبھی جگر کی آگ نہیں بجھتی۔ اس کا ذوق علم ایک بڑی سی علامت استفہام ہے' اسے وہ اپنی سلطنت علم کی سرحد پر لے جا کے نصب کرتا ہے۔ ''کون' کیوں' کیا اور کیسے'' کی جو صدا اسکے اندر سے اٹھتی ہے اسکے لئے بانگ رحیل بنتی ہے اور وہ حقیقت کی نامعلوم سرزمینوں پر قدم رکھتا ہے۔ پھر علامتِ استفہام آگے جا کر نصب ہو جاتی ہے۔

سب سے بڑا سوال جو انسان کے اندر ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ ساری کائنات کیا ہے' اس میں میرا کیا مقام ہے اور مجھے کس درجہ پر رکھا گیا ہے اور میری زندگی کی راہ راست کدھر سے ہو کے جاتی ہے؟

اس سوال کے دو بڑے جواب ہو سکتے ہیں:

ایک یہ کہ یہ کائنات جو کچھ ہے از خود ہے' اس کا کوئی پیدا کرنے والا' بنانے والا' منظم طور پر اسے ارتقا دینے والا' اس میں تدبیر امر کرنے والا سرے سے کوئی ہے ہی نہیں۔ اس میں زندگی کا ظہور اور ان کی پیدائش محض ایک حادثہ ہے۔ موجودات کے اس جنگل میں اپنی اپنی قوت کے بل پر جس کا جو جی چاہے کرے' جو کچھ فوائد وہ دوسروں سے حاصل کر سکتا ہو عین اس کا استحقاق ہے اور دوسرے اگر اس سے اس کا اثاثۂ حیات چھین جھپٹ کر لے اڑیں اور اسے پیروں میں روند کر آگے نکل جائیں تو کوئی بالاتر قانون نہیں جو اس میں آڑے آئے اور کوئی عظیم تر قوت نہیں جو باز پرس یا گرفت کرنے والی ہو۔

دوسرا یہ کہ اس کائنات کا کوئی خالق اور پروردگار ہے جس نے اسکی نقشہ بندی کی ہے' اسے نظم و توافق سے متصف کیا ہے' اس میں حکیمانہ قوانین جاری کئے ہیں' بالاارادہ ایسی موزونیت کے ساتھ بنایا ہے کہ اسمیں زندگی جلوہ گر ہو سکے' زندگی کے مختلف پیکر تجویز کئے ہیں اور انسان کو زندگی کا بہترین پیرایہ عطا کیا ہے' اس کائنات کی ہر چیز اسکے آگے سربسجود' اسکی تسبیح خواں' اسکی تابع فرمان اور پابند قانون ہے اور اسمیں انسان کا صحیح مقام بھی یہی ہے کہ وہ اس خالق و پروردگار کے حضور جذبۂ عبودیت کے ساتھ سرِ تسلیم خم کرے' اسکی سلطنت میں رعیت بن کے رہے' تصور امانت کے تحت اشیا اور قوتوں کو اسکی مرضی کے مطابق مقررہ حدوں میں استعمال کرے اور جو قدم بھی اٹھائے پھونک پھونک کر اٹھائے کہ کہیں اسکی رضا' اسکی ہدایت اور اسکے ضابطوں سے انحراف نہ ہونے پائے اور ساری زندگی اس احساس کے تحت بسر کرے کہ میں اپنے خالق و پروردگار کے سامنے جواب دہ ہوں۔

پہلا جواب نظریۂ الحاد کے مطابق ہے اور دوسرا جواب اسلامی آئیڈیالوجی پر مشتمل ہے۔ اصل یہی دو بڑے جواب ہو سکتے ہیں اور ان سے یہی دو نظریے یا عقیدے نمودار ہوتے ہیں۔ لیکن انسان کی پیچیدگی پسند ذہانت اوہام' خواہشات اور جذبات کی زد پر آ کر موخر الذکر صحیح جواب میں طرح طرح کے رخنے پیدا کر کے کچھ ایسے مرکب نظریات پیدا کرتی رہی ہے جو نتیجہ کے لحاظ سے اول نظریہ الحاد سے بہت زیادہ مختلف نہیں رہتے۔ مثلاً کبھی خالق و پروردگار کی ہستی واحد کے ساتھ بے شمار موہوم ہستیوں کا وجود فرض کر کے خدائی صفات و اختیارات ان میں تقسیم کر دئے گئے اور اس تقسیم کی وجہ سے زندگی بھی خانوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی۔ اور ان موہوم ہستیوں کی رضا طلبی کے لئے طرح طرح کے من گھڑت ضابطے تمدن میں جاری ہو

گئے۔ ایک تصور خالق و پروردگار کے ظل و بروز کا پیدا کیا گیا جس کا منشا یہ تھا کہ خالق و پروردگار کسی انسان کے روپ میں جلوہ گر ہو گیا ہے اور اب اسی انسان کی مرضی خالق و پروردگار کی ترجمان ہے۔ ایک اور تصور یہ نمودار ہوا کہ خالق و پروردگار سے انسانی تعلق کا صرف ایک چھوٹا سا گوشہ ہے جس کا عنوان مذہب ہے اور جس کے تحت چند عقیدوں' پوجا پاٹ اور پرارتھنا کی رسموں اور تھوڑی سی جزئی اخلاقی بھلائیوں سے اپنے آپ کو آراستہ کر کے انسان زندگی کے بقیہ وسیع دائروں میں آزاد ہے کہ اپنے معاملات جس طرح چاہے سر انجام دے۔ پھر ایک اور تصور یہ بھی سامنے آیا کہ خدا ہے مگر انسانوں سے نہ اسے تعلق ہے اور نہ اس کی ہستی کا کوئی تقاضا ہے جسے پورا کرنا ضروری ہو۔ اسی طرح ایک تصور یہ بھی ابھرا کہ خالق و پروردگار ہی نے اپنی مخلوق (یا مادہ) کا روپ دھار لیا ہے اور اس کی کوئی مستقل ہستی نہیں کہ خالق و پروردگار کی حیثیت سے جس کا کوئی حق مخلوق پر آتا ہو۔ ایک نظریہ یہ بھی نمودار ہوا کہ اس کائنات کے پردے میں کوئی حکیم و علیم اور فعال ہستی موجود نہیں' بلکہ وہ محض ایک اندھی قوت ہے جو شعور و ارادہ کی منزل تک پہنچنے اور اپنا عرفان حاصل کرنے کے لئے محوِ تگ و دو ہے۔ بعض لوگوں نے یہ بھی سوچا کہ خدا ہو گا مگر ہم اسے جاننے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں رکھتے۔ یہ سارے مختلف مرکب تصورات صاف ستھری اسلامی آئیڈیالوجی سے ہٹا کر انسان کو قریب قریب انہی ٹیڑھے راستوں پر ڈال دیتے ہیں جن کی طرف نظریہ الحاد لے جاتا ہے۔ اسلامی آئیڈیالوجی اپنی صداقت کے مقابل میں ان سب کو یکساں باطل قرار دیتی ہے۔

اسلامی آئیڈیالوجی کی اساس ــــــ تصورِ خدا

اسلامی آئیڈیالوجی جس کے شعور پر فرد کا صالح کردار اور معاشرہ کا نظام عدل صحیح طور پر کھڑا ہو سکتا ہے' خدا' انسان اور مادہ (کائنات) کی حقیقتوں کی ترجمان ہے اور وہی ان تعلقات کو معین کرتی ہے جو ان کے مابین ہونے چاہئیں۔ انسان کا تعلق خدا سے کیا ہے؟ انسان کا تعلق انسان سے کیا ہے؟ اور انسان کا تعلق مادہ سے کیا ہے؟ــــ انہی سہ گانہ تعلقات کی کوئی شکل کسی بھی نظام تمدن کو ایک مخصوص ہیئت دیتی ہے۔ ہر نظریہ حیات ان تعلقات کو بالکل الگ انداز سے جوڑتا ہے۔ اسلامی آئیڈیالوجی کے تحت یہ سہ گانہ تعلقات اپنی ایک خاص شکل پاتے ہیں اور ان سے اسلامی تمدن نمودار ہوتا ہے۔ اسلامی آئیڈیالوجی انسان اور

خدا کے تعلق کو اولین اساسی اہمیت دیتی ہے۔ کیونکہ دوسرے تعلقات کی صحت کا دارومدار اس تعلق کی صحت پر ہے۔ اور اس اولین تعلق کی بنیاد خدا کے تصور ـــــ اور صحیح تصور ـــــ پر ہے۔

پہلا سبق ـــــ درس گاہِ کائنات سے

تصور خدا جو اسلامی آئیڈیالوجی کا اصل جوہر ہے اس کا پہلا سبق انسان کو خود کائنات ہی کی درس گاہ سے ملتا ہے۔ اور یہ سبق ہر آن نت نئے اسالیب سے دوہرا دوہرا کر ذہن نشین کرانے کا انتظام موجود ہے۔ درس گاہ کا اصول تعلیم "دیکھو اور سوچو" ہے۔ اس درس گاہ میں موجودات کی کتابوں کا مطالعہ کرایا جاتا ہے اور ان کتابوں پر واقعات و حوادث کے نت نئے ابواب اور اسباق ثبت ہوتے اور مٹتے رہتے ہیں۔ قرآن جو اسلامی آئیڈیالوجی پر حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے بار بار کتاب کائنات کا حوالہ دیتا ہے۔ وہ توجہ دلاتا ہے کہ زمین و آسمان کے نظام کو دیکھو، دریاؤں کی روانی اور سمندروں کی جولانی پر نگاہ ڈالو، ہواؤں کی روا رو کا مشاہدہ کرو، گھٹاؤں کی گرج اور بجلیوں کی کڑک کی طرف توجہ دو، درختوں اور سبزہ کی روئیدگی پر کاوش کرو، سورج چاند اور تاروں کی گردشیں دیکھو ـــــ ہر چیز اور ہر واقعہ تمہیں حقیقتِ عظمیٰ کا سراغ دیگا۔

اس کائنات کے کسی بھی پہلو پر نگاہ ڈالئے، ہر طرف ایک نظم کارفرما ہے کہیں بے نظمی نہیں۔ ایک ترتیب پائی جاتی ہے، انتشار نہیں۔ توافق کارفرما ہے، تصادم نہیں۔ ہر واقعہ کی کوئی علت ہے اور ہر جنبش کی کوئی غایت۔ موجودات مشین کے پرزوں کی طرح کسے ہوئے ہیں اور ہر کوئی اپنے حصہ کا فرض ادا کر رہا ہے۔ جو کچھ دکھائی دے رہا ہے ایک عظیم الشان کارخانے کی مانند ہے جس کا ہر شعبہ دوسرے سے مربوط ہے۔ طرح طرح کی قوتیں آپس میں تعاون کرتی دکھائی دیتی ہیں۔

پھر اس کائنات کو ہم ایک تقدیر کے تابع دیکھتے ہیں۔ یعنی ہر وجود اور ہر قوت کے لیے ایک مقدار اور ایک حد مقرر ہے۔ ہر حرکت کا ایک اندازہ بندھا ہوا ہے۔ تاروں کے فاصلے اور مدار معین ہیں، روشنی اور آواز کی رفتاریں لگی بندھی ہیں، درختوں اور جانوروں کے قد و قامت ایک اندازے کے تابع ہیں، زمین اور اسی کی طرح دوسرے سیاروں کے لئے دن اور رات کی

مدتیں اور موسموں کے دور حساب کے پابند ہیں' اسی طرح زندہ موجودات کے لئے کوئی نہ کوئی اجل مسمی ضرور ہے۔

پھر یہ سلطنت باقاعدہ دستوری اور آئینی سلطنت ہے جس میں اٹل قوانین کا سکہ رواں ہے۔ حرکت و سکون کے قوانین' کشش اور مزاحمت کے قوانین' حرارت اور روشنی کے قوانین' زندگی اور موت کے قوانین' نشوونما کے قوانین' صحت و مرض کے قوانین' نفسیاتی اور اخلاقی قوانین برابر اپنا کام کر رہے ہیں۔ یہ قوانین حد درجہ عقلی ہیں' اٹل ہیں اور بے لاگ طریق سے کام کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''کفایت قوت'' (Economy of Energy) کا ایک کلیہ پیش نظر رکھئے کہ عقل اسکی صحت و افادیت پر ایمان لائے بغیر نہیں رہ سکتی اور یہ کلیہ ایک ایک حرکت و عمل میں ہمیشہ سے کارفرما ہے۔ جو شے بھی وجود رکھتی ہے ان قوانین کے بندھنوں میں جکڑی ہوتی ہے اور جو عمل ان میں واقع ہوتا ہے وہ ان قوانین کے تحت واقع ہوتا ہے۔ کسی وجود اور قوت کی مجال نہیں کہ ایک آن کے لیے کسی ایک قانون کو توڑے اور مقررہ نظم سے انحراف کر سکے۔

اور پھر اس کائنات کے ہر گوشے میں ارتقا ہے۔ کاروان وجود ادنیٰ حالتوں سے بہتر حالتوں کی طرف تدریجاً بڑھ رہا ہے۔ یہ نظام قوت اور حسن یا جلال اور جمال کے زیادہ بہتر مدارج کی جانب رواں دواں ہے۔ یہ اپنے فرسودہ اور ناکارہ اجزا کو ختم کرتا ہوا اور زیادہ بہتر اجزا کو ابھارتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس میں ادنیٰ کو اعلیٰ کے لئے قربان کرنے کا قانون کام کر رہا ہے۔

ایک ایسا وسیع و عظیم نظام جس میں توافق اور توازن' تقدیر اور حساب' ضابطہ اور قانون پایا جاتا ہو اور جو مسلسل ارتقا کر رہا ہو اسکے متعلق یہ مفروضہ کیسے قائم کیا جا سکتا ہے کہ وہ اتفاقی حادثات کے بل پر چل رہا ہے۔ یا وہ کسی اندھی قوت کا کرشمہ ہے۔ کائنات کی قطعی شہادت ہے کہ کوئی ایسی ہستی اسے بنانے اور چلانے اور اس کو نشوونما دینے والی ہے جو علیم و خبیر' حکیم و بصیر' مختار و قاہر اور حکمران و کارفرما ہے۔ اور پھر اس کائنات کی شہادت یہ بھی ہے کہ وہ ہستی وحدہ لاشریک بھی ہے۔ کائنات کے نظم کی وحدت اسکے خالق و پروردگار کی توحید پر ایک روشن دلیل ہے۔ قرآنی استدلال کے بموجب اگر دنیا کی کارفرمائی بیک وقت کئی کئی ہاتھوں میں تقسیم ہوتی تو اس میں فساد اور بگاڑ ہوتا اور اسکے ہر گوشے میں آئے دن ایسے تصادم ہوتے رہتے کہ

یہ ساجھے کی ہنڈیا چوراہے میں کبھی کی پھوٹ چکی ہوتی۔

دوسرا سبق ــــ کتابِ نفس سے!

حقیقت عظمیٰ کا دوسرا سبق انسان کو خود اپنے نفس کی کتاب سے ملتا ہے۔ (وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ۔اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ) (الذاریات:۲۱) کائنات میں جو نظم' توافق' توازن' تقدیر' قانون اور ارتقا کارفرما ہے اس کی شانِ کمال انسان کو خود اپنے وجود میں دکھائی دیتی ہے کیونکہ اسے بزمِ مخلوق کی مسندِ صدارت پر بٹھایا گیا ہے۔ اس کا قد و قامت' اسکی مخصوص ساخت' اسکی قوتیں' اس کا نظام تنفس' دوران خون' ہضم و تحلیل کی کل' اعصابی تانا بانا' جسم کا اہتمام تطہیر' امراض کے مقابلے میں مدافعتی محاذ' کارخانۂ بدن کی مرمت کا خود کار نظام' اس کا حافظہ' اس کے فکر کی قوت اور اسکی قوت ارادی ایسے عجائبات ہیں کہ ایک موجد' ایک نقشہ گر اور ایک خلاّق' ایک مدبر' ایک مصور اور ایک رب کا تصور ہمارے قلب میں مرتسم کر کے رہتے ہیں۔ لیکن یہاں تک نفس انسانی کائنات کی فراہم کردہ شہادتوں کی محض تائید مزید کرتا ہے۔ اس سے آگے وہ خود نیا سبق بھی دیتا ہے' جس سے اس خارجی شہادت میں نئے دلائل کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

مادی کائنات کا ماحول جس میں انسان زندگی کے امتحان سے گزرتا ہے درحقیقت بڑا مہیب ماحول ہے۔ موجودات کے حجم' اوزان' فاصلے اور رفتاریں' طبعی حوادث کے طوفانوں کے شور اور دھماکے' موسموں کے انقلاب اور نیرنگیاں' بجلیوں کے کڑکے اور ژالہ باریاں' آتش فشانوں کا پھٹنا اور زلزلوں کی جنبشیں' قحطوں اور بیماریوں کے حملے' درندوں کی چنگھاڑیں اور اژدہاؤں کی پھنکاریں' آپس کی جنگیں اور خوں ریزیاں' ان کے مقابلے پر انسان اپنے آپ کو مجبوری و بے چارگی کے مقام پر پاتا ہے۔ وہ اپنی بہترین قوتوں سے کتنا بھی کام لے اور تسخیر کی مہم میں کتنا بھی آگے بڑھتا جائے ہر حال میں ایسے لمحے آتے ہیں۔ جبکہ اسے یہ تلخ حقیقت ماننی پڑتی ہے کہ وہ مجبوری اور بے بسی کے مقام پر کھڑا ہے۔ بارہا وہ کبر اور سرکشی کے جام چڑھا کر حقیقت فراموشی کی کوشش کرتا ہے' اپنی دولت اور اپنے سروسامان کو دیکھتا ہے تو اونچی فضاؤں میں اڑنے لگتا ہے۔ اس کی تدبیر کی سبک روکشتی عقل و حکمت کے بادبان اڑاتی جب کبھی بھنور کے پنجے میں آتی ہے اور چٹانوں سے ٹکراتی ہے تو مادی سہاروں کے ختم ہو جانے پر وہ کسی اٹل روحانی سہارے کا دامن تھامنا چاہتا ہے۔ زندگی میں اکثر ایسے لمحے آتے

ہیں جب محاورے کے مطابق خدا یاد آ جاتا ہے۔ انسان کا یہ احساس بے چارگی' روح پر چھایا ہوا ایک خوف' ایک گونہ تنہائی کا شعور اس میں ایک نفسیاتی پیاس پیدا کرتا ہے۔ نفسِ انسانی میں ایک پائیدار اور فوق الفوق سہارے کی طلب پائی جاتی ہے جو کسی بھی حال میں ساتھ نہ چھوڑے۔ جسے ہر حال میں پکارا جا سکے' جس پر بھروسہ رکھا جا سکے' جس سے مدد مانگی جا سکے' جس کی محبت مصیبتوں اور غموں کے ہر زخم کے لئے مرہم شفا بن سکے۔ آخر کوئی ہے جو مادیت کے طوفانی سمندر میں زندگی کے سفینے کو تھامے ہوئے ہے۔

انسانی زندگی ایک کٹھن سفر' ایک عظیم مہم اور ایک معرکۂ جنگ ہے۔ ہم ایک ایسی مشعل امید کے ضرورت مند ہیں جو کبھی گل نہ ہو' ہمیں ایک ایسے رفیق کی احتیاج ہے جو ہر آن دستگیر بنے' ہمیں ایسی تلوار چاہیے جس کی کاٹ کبھی جواب نہ دے اور ایسی ڈھال چاہیے جو کسی حال میں نہ ٹوٹے۔ یہ ضرورت نفس انسانی میں پیوست ہے۔

نفس انسانی کا دوسرا انمٹ رجحان ایک گہرا جذبۂ سپاس ہے جو بے شمار نعمتوں سے استفادہ کرتے ہوئے فطری طور پر ابھرتا ہے۔ سب سے بڑی نعمت خود زندگی ہے اور پھر انسان ہونا ہے۔ حواس اور قوتیں' خیالات اور ارادے' جذبات اور میلانات' کتنی قیمتی دولتیں ہیں۔ پھر زندگی گزارنے کے لئے ایک سازگار طبعی ماحول مہیا ہے۔ دنیا کیسا اچھا گھر ہے جس میں سبزہ کا فرش بچھا ہے' آسمان اس کی چھت ہے جو قندیلوں سے سجی ہے' نیلے پہاڑ اس کی دیواریں ہیں' دریاؤں کی نہریں اس میں بہتی ہیں' جنگل اسکے پائیں باغ کی کیاریاں ہیں' ہوائیں اسمیں جھاڑو دیتی ہیں' گھٹائیں چھڑکاؤ کرتی ہیں' پرندے اسکے نغمہ زن اور مطرب ہیں' مویشی اس گھر میں خادموں کی حیثیت رکھتے ہیں اور نت بدلتے مناظر اس کی آرٹ گیلری کو سجاتے ہیں۔ پھر انسانی جسم کی ضرورتوں کے مطابق رزق مہیا ہے بلکہ ایک خوان یغما لٹ رہا ہے۔ پھر حسن و جمال کے مظاہر چار جانب پھیلے ہوئے ہیں جو چشم و گوش کے لئے سرمایۂ نشاط ہیں۔ تھکن کے عالم میں تازہ ہوا میں ایک سانس کھینچ کر اور بھڑکتی پیاس کی حالت میں ٹھنڈے پانی کا ایک گھونٹ پی کر انسان کو جو کیف ملتا ہے وہی جذبہ سپاس کا روپ اختیار کرتا ہے۔ شکرانِ نعمت کا یہ جذبہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب محسن کا سنگ آستاں ہی ہوسکتا ہے جس پر پیہم سجدہ پاشیاں کی جائیں۔

یہ جذبۂ سپاس مسلسل نشوونما پاتا ہے اور والہانہ فریفتگی اور سرافگندگی کا ایک واضح اور

مستقل رجحان بن جاتا ہے۔نفسیات انسانی کا تقاضا ہوتا ہے کہ کوئی ایسا ہو جس سے لو لگائی جائے' کوئی ہو جس کے لئے راتوں کی نینداور دنوں کا آرام قربان کیا جائے' کوئی ہو جس کے اشارۂ ابرو پر سب کچھ نچھاور کر دیا جائے۔کوئی ہو جس سے بے لوث پیار کیا جائے' کوئی ہو جس کے سامنے انتہائی فروتنی اور انکسار اختیار کیا جائے۔کوئی ہو جس کے گن گائے جائیں اور جسکی حمد کے ترانے الاپے جائیں کوئی ہو جس کے آگے گڑگڑایا جائے اور آنسوؤں کے موتی جسکے قدموں میں بکھیرے جائیں' کوئی ہو جس کے سامنے اپنی غلطیوں پر ندامت کا اظہار کیا جائے اور اپنی کوتاہیوں پر معافی مانگی جائے۔ اس نفسیاتی رجحان سے انسانیت کبھی خالی نہیں رہی۔ اس رجحان کو اگر صحیح آستانہ نہیں مل سکا تو اس نے خیالی دیوتا گھڑے' اس نے جابر و قاہر بادشاہوں کو معبود بنایا' اس نے خاندانوں اور نسلوں کے بت تیار کر لئے' اس نے وطنیت اور قومیت کے الٰہ تراش لئے اور اس نے جنسیت کی مورتیاں تیار کر لیں۔ حالانکہ عقلی جائزہ لینے کے بعد اس عالی شان جذبہ سپاس اور والہیت کے اس مقدس رجحان کا جائز مخاطب ان میں سے کوئی بھی نہیں۔ پس یہ جذبہ حمد و سپاس اور والہیت کا یہ فطری رجحان جو انسانیت کی ایک مستقل متاع ہے بجائے خود خدا کی ہستی پر ایک دلیل روشن ہے۔

فطرت انسانی خیر و شر کا فرق کرتی ہے۔ انسان کی یہ امتیازی صفت ہے اور یہی اسے انسان بناتی ہے کہ وہ خود اپنے افکار و اعمال کو دو قسموں میں بانٹتا ہے۔ کچھ امور کو وہ غلط اور ناروا' موجب شر اور حرام قرار دیتا ہے اور کچھ کو وہ صحیح اور جائز' برحق اور حلال گردانتا ہے۔ وہ بار بار فیصلہ کرنے میں الجھتا ہے' غلط فیصلے کرتا ہے اور فیصلوں کو نت بدلتا ہے مگر کسی طرح خیر و شر کے تصور سے وہ الگ نہیں ہو سکتا ہے۔ وہ نت بدلتے ضابطوں کے پیچھے کسی مستقل ضابطے کا جویا رہتا ہے۔ دراصل تمیز خیر و شر کے اس ذوق کے پیچھے دبا دبا ایک احساس جواب دہی موجود رہتا ہے۔ اسکی فطرت کہتی ہے کہ وہ کوئی ذمہ دار ہستی ہے اور کسی کے سامنے جواب دہ ہے۔ ذمہ داری اور جواب دہی کا یہ احساس کتنا بھی مبہم اور غیر شعوری رہے اس کی مے کا سرور آدمی کو بعض اصولوں' ضابطوں' روایات اور اقدار کا پابند بناتا ہے' وہ برائی سے بچنے کے لئے کتنے ہی فوائد کو چھوڑ دیتا ہے اور کسی فرض کی ادائیگی کے لیے کیا کیا نقصانات سہ جاتا ہے۔ نفس انسانی کبھی بھی خیر و شر کے تصور' ضابطہ کی طلب اور ذمہ داری و جواب دہی کے احساسات سے خالی نہیں ہو سکتا۔ آدمی کی نفسیات کا یہ گوشہ بھی خدا کی ہستی کی ایک دلیل ہے کیونکہ اسی کی

ہستی ہے جس کے سامنے جواب دہی واجب آتی ہے اور اسی کی رضا خیر و شر کے لئے کسوٹی بن سکتی ہے۔

کائنات اور نفس کی یہ شہادتیں نفس انسانی ہی کی اس قوت کو متحرک کر دیتی ہیں جسے ہم عقل کہتے ہیں۔ عقل حسی حقیقتوں پر قانع نہیں ہوتی اور مادیت کے قفس کو توڑ کر مابعد الطبیعی فضاؤں میں پرواز کرتی ہے۔ حسی علم میں کوئی کمی ہے جسے پورا کرنے کے لئے عقل ادھر ادھر چکر لگاتی ہے' گویا وہ کسی متاع گم شدہ کی تلاش میں ہے۔ علم میں ایک خلاء ہے جسے وہ پر کرنا چاہتی ہے۔ عقل کی مضطربانہ تگ و تاز بھی ایک نفسیاتی شہادت ہے کہ ہم کسی حقیقتِ عظمیٰ کو جاننے کے محتاج ہیں۔ عقل مجرد حسی معلومات کے سہارے جب اس کائنات کی حقیقت و ماہیت پر غور کرتی ہے تو یہ سارا نظام ایک معما بن کے رہ جاتا ہے۔ کسی بھی شعبہ وجود اور دائرہ حوادث کو لیجئے اسباب و علل کی کڑیاں کچھ دور تک جڑتی جاتی ہیں مگر جلد ہی وہ مقام آ جاتا ہے جہاں اہم ترین کڑی غائب ہو جاتی ہے۔ کسی مسئلہ کے صندوق کو بھی کھولئے تو صندوق در صندوق ایک سلسلہ چلتا ہے مگر سابقہ ایسے تالوں سے پڑتا ہے کہ جنکے کھولنے کی کنجی عقل کو ہاتھ نہیں آتی۔ وجود کے تانے بانے کے تار کتنے بھی سلجھاتے جائیں ان کا سر نہیں ملتا۔ درختِ حیات کی پتیاں اور کونپلیں ہمارے سامنے ہیں مگر جڑ کا سراغ ہاتھ نہیں آتا۔ عقل تقاضا کرتی ہے کہ اس معما کی کوئی کلید ہونی چاہیے۔

پھر عقل یہ دیکھتی ہے کہ موجودات میں ہر پست کے مقابلے میں کوئی بلند تر اور ہر ناقص کے مقابلے میں کوئی بہتر موجود ہے مگر یہ سلسلہ بھی بیچ ہی میں رک جاتا ہے اور بلند ترین کی پستیاں اور بہترین کے نقائص نگاہوں پر فاش ہو کر کہتے ہیں کہ لازماً اس سے آگے کوئی کامل و اکمل ہونا چاہیے۔ خود انسان جو بزمِ مخلوق کا صدر ہے اسکے حیرت آفریں کمالات عیب و نقص اور کوتاہی و خطا سے پاک نہیں۔ اس کا بدن' اس کا علم' اس کا ارادہ' اسکے اعمال اور اسکی مجموعی ہستی عیوب و نقائص کی آئینہ دار ہے۔ پھر اس کائنات میں ہر کمال کے لئے زوال ہے' ہر بلندی پستی کا شکار ہو جاتی ہے' زندگی موت کا لقمہ بنتی ہے' ہر پرواز طائر پراں کو آخر نیچے پٹخ دیتی ہے' ہر بہار کے بعد خزاں ہے۔ ہر صبح روشن کے تعاقب میں شام سیاہ چلی آ رہی ہے —— آخر وجود اور حیات' حسن اور قوت' علم اور ارادے کا کوئی ایسا کامل مظہر ہونا چاہیے جو زوال کی دسترس سے بالاتر ہو۔ جو خوبی و محبوبی کا مجسمہ ہو کہ عیب و نقص کے ہر داغ سے پاک

ہو۔ گویا عقل کے لئے خود اپنی یہ مانگ بھی خدا کی ہستی پر ایک نفسیاتی شہادت ہے۔

تیسرا اسبق ـــــ تعلیم نبوت سے!

مگر عقل اگر انفس و آفاق کی درسگاہوں سے یہ اسباق ٹھیک ٹھیک حاصل کر بھی لے تو بھی وہ ''ہونا چاہیے'' سے آگے نہیں جا سکتی۔ یہ دعویٰ کرنا اسکے بس میں نہیں ہے کہ جسے ہونا چاہیے وہ واقعہ میں ہے بھی! پھر اگر وہ وجدان اور قیاس کا سہارا لے کر ''ہونا چاہیے'' سے جست لگا کر ''ہے'' تک جا بھی پہنچے تو محض حسی علم کے شواھد اسے یہ نہیں بتا سکتے کہ خدا ہے تو کیا ہے' کن صفات سے آراستہ ہے اور پھر انسان سے اس کا کیا تعلق ہے اور وہ اس سے کیا چاہتا ہے؟ سو عقل کاوش و تحقیق کی راہ پر چند قدم چلنے کے بعد ایک سرحد پر جا کر رک جاتی ہے جہاں سے آگے اسکے لئے تاریکی ہی تاریکی ہے' اور گویا سامنے آہنی پردۂ غیب حائل ہے۔ اس سرحد پر کھڑے ہو کر وہ قیاسات کے تیر تکے چلاتی ہے' مگر قیاسات متضاد الجھے ہوئے تصورات کا ایک ڈھیر اسکے سامنے لگا دیتے ہیں۔ اور وہ صدیوں بھی اگر بحر حقیقت کے کنارے پڑے ہوئے ان خزف پاروں سے کھیلتی رہے تو اسے حقیقت کا کوئی موتی ہاتھ نہیں آ سکتا۔ حقیقت کے جو متفرق اجزا قیاس کے ذریعے ملتے بھی ہیں وہ بے شمار شکوک و شبہات میں خلط ملط ہو کر ملتے ہیں۔ ان پر بھی یقین اور اطمینان نہیں ہو سکتا۔ ان سے ایک ایسی واضح آئیڈیالوجی نہیں بنتی جس پر محکم شعوری ایمان قائم ہو سکے ـــــ اور ایک محکم شعوری ایمان کے بغیر صحیح زندگی کی تشکیل ممکن نہیں ہے۔

عقل جب اس سرحد پر عاجز و سرگرداں ہو کر کھڑی ہوتی ہے اور ایک طرف وہ جانی ہوئی ابتدائی حقیقتوں سے آگے کی حقیقت عظمیٰ کو جاننے کے لئے مضطرب ہوتی ہے اور دوسری طرف وہ اپنی کوتاہیٔ نظر کے اعتراف پر مجبور ہو جاتی ہے تو یکا یک نبوت الہامی روشنی لے کے اس کے سامنے نمودار ہوتی ہے۔ عقل نے جس ہستی کے لئے ''ہونا چاہیے'' کا حکم لگایا تھا' نبوت اسکے بارے میں ''ہے'' کا مژدہ سناتی ہے۔ اور کائنات اور نفس انسانی کی شہادتوں کی توثیق کر کے انسانی علم حقیقت کے خلاء کو بھر دیتی ہے۔ حسیات سے آگے علم حقیقت کی شدید طلب کا موجود ہونا' عقل کا اسکے لئے جادہ پیمائیاں کرنا اور پھر عاجز ہو کر ٹھٹک جانا ہمیں یہ تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ حواس سے بالاتر بھی کوئی ذریعہ علم ہے اور وہ ہے وحی والہام۔ نبوت اسی ذریعہ علم

کے بل پر ہمارے سامنے اس حقیقت عظمٰی کی پردہ کشائی کرتی ہے جس کا شعور انسانی زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ نبوت صرف اتنا ہی نہیں بتاتی کہ خدا ہے بلکہ وہ اسکی صفات' اسکے حقوق اور اسکے مطالبات سے بھی آگاہ کرتی ہے۔ وہ خدا اور انسان کے تعلق کی تفصیل دیتی ہے۔ وہ اس تعلق کو درست رکھنے کے لئے خدا کا مقرر کردہ ضابطہ حیات بھی تفویض کرتی ہے۔

نبوت جس ذریعہ علم سے حقیقت کو بے نقاب کرتی ہے' عقل اپنی عادت سے مجبور ہے کہ اس کا جائزہ لے اور اسکے متعلق اطمینان حاصل کرے۔ نبوت بتاتی ہے کہ یہ ذریعہ علم اس کائنات میں ہر آن کام کر رہا ہے۔ آخر وہ کونسی رہنما قوت ہے جو شہد کی مکھی کو چھتے کے شش پہلو خانے ایک ہی پیمائش سے بنانا سکھاتی ہے اور اسے اڑا کر پھولوں تک لے جاتی ہے کہ یہاں تیرے لئے غذا رکھی گئی ہے۔ وہ کونسی رہنما قوت ہے جو ایک ہی باڑے کے اندر رات کی تاریکی میں بچے دینے والی کئی کئی بھیڑوں کو یہ صلاحیت دیتی ہے کہ وہ منہ اندھیرے چراگاہ کو جا کر جب شام کو لوٹیں تو ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے بچے کو پہچان لے۔ وہ کونسی رہنما قوت ہے جو دیوار کے قریب اُگے ہوئے پودے کو یہ ہدایت دیتی ہے کہ وہ دیوار کے مقابل سمت میں پھیلاؤ اختیار کرے۔ اس قوت کے کرشمے نفس انسانی میں آ کر اور زیادہ محیر العقول ہو جاتے ہیں۔ نفس انسانی میں ایک روزن ایسا کھلتا ہے جس سے علم کی شعاعیں وقتاً فوقتاً داخل ہوتی رہتی ہیں۔ وجدان کے اس روزن سے ایسے ایسے خیالات کا القا ہوتا ہے کہ جن کا کوئی جوڑ سابق حسی معلومات یا ان معلومات سے حاصل کردہ افکار سے نہیں لگایا جا سکتا۔ ایجادات' انکشافات' تخلیقات اور اختراعات میں عالم بالا سے برسنے والی ان شعاعوں کا کتنا بڑا حصہ ہے۔ اسی روزن سے ایسے ایسے سچے خواب انسانوں پر القا ہوتے ہیں کہ جن کی کوئی عقلی توجیہ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اسی روزن سے مسرت اور حزن کے ایسے پرتو کبھی اچانک مزاجوں پر پڑتے ہیں کہ جن کے محرکات بظاہر خارج میں موجود نہیں ہوتے۔ لیکن بعد کے واقعات ان کی معنویت حیرت انگیز طریق سے واضح کر دیتے ہیں۔ کتنے ہی حادثات کا نقش پیشگی آدمی کے دل میں ابھرتا ہے۔ کتنے ہی واقعات ہیں کہ لوگوں کو اپنی موت کا دن اور وقت بہت پہلے سے ٹھیک ٹھیک معلوم ہو گیا۔ کتنی ہی بار ایسا ہوتا ہے کہ دو راستوں میں سے عقلی دلائل کی روشنی میں ہم کسی کا انتخاب نہیں کر سکتے اور پھر یکا یک بے بس ہو جانے والی قوت فیصلہ کو کوئی طاقت ہاتھ پکڑ کر راستے پر ڈال دیتی ہے۔ اسکی کتنی ہی مثالیں موجود ہیں کہ ایک شخص ہزاروں میل

دوری پر بیٹھے بیٹھے کسی دوست یا عزیز کی حالت سے آگاہ ہو گیا۔ عام انسانوں میں یہ ذریعۂ علم نہایت ناقص اور محدود پیمانے پر کام کرتا ہے۔ لیکن انبیاء میں یہی اپنے کمال کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ اس ذریعۂ علم ـــــ یعنی وحی ـــــ کی دستگیری کے بغیر عقل مجرد اپنے حسی ذرائع سے حقیقت عظمیٰ ـــــ خدا ـــــ سے آشنا نہیں ہو سکتی اور نہ اس کا ناقص علم زندگی کے لئے ایک مضبوط آئیڈیالوجی فراہم کر سکتا ہے۔ عقل تنہا اپنے بل بوتے پر خدا کے متعلق صرف ''ہونا چاہیے'' کا حکم لگا سکتی ہے لیکن وہ نہ ''ہے'' کا دعویٰ کر سکتی ہے اور نہ ''نہیں ہے'' کا قطعی فیصلہ کر سکتی ہے۔ ''ہے'' اور ''نہیں ہے'' کے درمیان محض تشکک کا مقام پایا جاتا ہے اور شک سے کوئی آئیڈیالوجی نہیں بنتی۔ پس ''ہے'' اور ''نہیں ہے'' کے درمیان لٹکی ہوئی عقل محتاج ہے کہ کوئی ایسی قوت ہو جو اسے یا تو آگے دھکیل کر ''ہے'' تک لے جائے اور یا پیچھے کھینچ کر ''نہیں'' پر لائے۔ یا واضح اثبات ہونا چاہیے یا قطعی نفی! ایک حالت استفہام اور ایک عالم تشکک سے زندگی کو کوئی رہنمائی نہیں مل سکتی۔

نبوت سے انسان کو حقیقت عظمیٰ کا جو تکمیلی درس ملتا ہے اپنی جگہ وہ بے حد مدلل ہے۔ نبوت اپنے ساتھ عقل کو اطمینان دلانے کے لئے مضبوط شواہد رکھتی ہے۔ سب سے پہلے تو نبوت کا دیا ہوا تصور حقیقت اپنے حق میں آپ ہی ایک دلیلِ قاطع ہے' کیونکہ انفس و آفاق کی ابتدائی شہادتیں اس پر منطبق ہو جاتی ہیں۔ اور جو سبق انسانی عقل نے پہلے پڑھے ہوتے ہیں وہ اس آخری سبق سے میل کھا جاتے ہیں۔ نبوت خدا کی ذات' اُسکی توحید' اُسکی صفات' ـــــ حیات وارادہ' قدرت واختیار' خلق وصورت گری' ربوبیت و رزّاقی' علم وحکمت اور عدل و رحمت ـــــ کا جو علم ہمیں عطا کرتی ہے وہ ہر اس پیاس کا تسکین بخش جواب ہے جو نفس انسانی میں پیدا ہوتی ہے۔ نبوت کے دیئے ہوئے عرفانِ خدا سے تمام خلاء بھر جاتے ہیں جو عقل کو محسوس ہوتے ہیں۔ کائنات کے نظم وقانون کا راز سمجھ میں آ جاتا ہے' انسانیت کو جس سہارے کی احتیاج ہے' جس مرکزِ محبت کی جستجو ہے اور ضابطہ خیر وشر معین کرنے اور باز پرس کرنے والے جس فرماں روا کی ضرورت ہے وہ یکا یک ہاتھ آ جاتا ہے۔ الحاد کے مقابلے میں بھی' شرک کے مقابلے میں بھی' ہمہ اوست کے مقابلے میں بھی اتنا زیادہ عقلی ہے کہ یہ خود اپنی صداقت کی دلیل بھی ہے اور نبوت کی ترجمانیٔ حق پر بھی برہان!

نبوت کے تصور خدا کی صداقت پر دوسری بڑی شہادت یہ ہے کہ اس تصور کو پیش کرنے

والے اپنے اپنے دور میں بہترین خلائق تھے اور اول درجے کے راست باز اور امانت دار۔ ساری تاریخ میں ایسے رجال مقدس کی ایک جماعت پھیلی ہوئی ہے جس نے ہمیشہ سازِ حقیقت کا بالکل ایک ہی راگ الاپا ہے۔ مقابلے کے نظریات و تصورات نے نہ جانے کیا کیا رنگ اختیار کئے' کتنی ہی شکلیں بدلیں اور کتنی ہی شاخوں میں بٹ گئے' مگر انبیاءؑ نے ہمیشہ ایک ہی پیغام سنایا اور اسکے لئے ایک ہی سے دلائل دیئے۔ بالعموم ایک ہی ڈھنگ سے ان کی مخالفت کی گئی اور نتائج بھی یکساں ہی رہے۔ تاریخ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلے ہوئے اور زمین کے مختلف گوشوں میں بکھرے ہوئے کئی لاکھ داعیوں میں ایسی وحدت دعوت کا پایا جانا' پھر ان سب کا ایک ہی فوق الالہام ذریعۂ علم ـــــ یعنی وحی و الہام ـــــ سے بہرہ ور ہونے کا دعویٰ کرنا' پھر اس دعویٰ پر زہر گداز مزاحمتوں کے باوجود جمے رہنا' اسکے لئے انتہا درجہ کی عظیم قربانیاں دینا اور پھر اپنی اس خدمت اور قربانی کی کوئی قیمت وصول نہ کرنا بجائے خود انبیاءؑ کی دعوت اور ان کے تصورِ حقیقت اور فرمان خدا پر ایک ناقابل تردید شہادت ہے۔

پھر نبوت اپنی دعوت' اپنے تصورِ حقیقت اور اپنے عرفان خدا کی صداقت واضح کرنے کے لئے ہمیں سیرگاہ تاریخ میں گھماتی ہے۔ وہ تباہ شدہ اقوام کی آبادیوں کے کھنڈر دکھاتی ہے۔ جنگوں اور تصادموں کے واقعات کا مطالعہ کراتی ہے اور یہ ثابت کرتی ہے کہ ساری تاریخ' حق و باطل کی ایک ایسی رزم گاہ ہے جس میں بناؤ کی راہ پر وہی افراد اور قومیں بڑھیں جنہوں نے حقیقت عظمٰی کا وہ صحیح تصور جذب کیا جو نبوت کے ذریعے سامنے آیا اور دوسری طرف ان افراد کے کردار غارت ہو گئے اور وہ معاشرے فساد کا شکار ہو گئے جنہوں نے نبوت کی دعوت مسترد کی۔ انبیاءؑ کی تعلیم جس نے جتنی اختیار کی' اس نے اتنے ہی قدم تعمیر و ترقی کی راہ پر بڑھائے اور جس نے اس سے جتنا انحراف کیا تخریب کے اتنے ہی وجوہ اسکے درپے ہو گئے۔ زندگی جب بھی صحیح خدا پرستی کی بنیاد پر استوار ہوئی وہ حیات طیّبہ بن کے رہی اور جب بھی کوئی نظام الحاد' شرک یا کسی اور باطل نظریے پر استوار ہوا تو انسان کے لئے جینا عذاب ہو گیا۔

نبوت کے تین عطیات

نبوت محض عرفان خدا ہی نہیں دیتی اور حقیقت کے متعلق ہمارے دھندلے تصورات کو

واضح اعتقادات کا جامہ ہی نہیں پہناتی بلکہ تین ایسی ضرورتیں پوری کرتی ہے جنہیں نہ تنہا عقل کسی بھی طرح پورا کر سکتی اور نہ ان کو پورا کرنے کا کوئی دوسرا ذریعہ موجود ہے۔

ایک یہ کہ وہ خدائی ضابطۂ حیات انسان کے سامنے لا رکھتی ہے۔

دوسرے یہ کہ وہ محاسبۂ آخرت کا پورا تصور دلاتی ہے۔

تیسرے یہ کہ وہ اپنے عطا کردہ اعتقاد اور خدائی ضابطہ حیات کے مطابق تعمیر حیات کے لئے عملی نمونہ و مثال ہمارے سامنے رکھتی ہے کہ فرد کی اٹھان کیسے ہونی چاہیے' جماعتی ہیئت کس طرح کام کرے اور ریاست و تمدن قائم ہو تو اس کا نقشہ کیا ہو۔

اور عقل سلیم الہامی علم کے ان عطیات کو بسر و چشم قبول کرتی ہے۔

ظاہر بات ہے کہ جس کائنات کے ہر گوشے میں خدائی قانون چل رہے ہیں اور جس کا ذرہ ذرہ ان قوانین کا پابند ہے۔ اور اللہ کے سامنے مطیع و مسلم ہے اس میں انسان کے لئے مادر پدر آزادی اور آوارہ خرامی و ہرزہ گردی کی گنجائش کیونکر ہو سکتی ہے۔ اور پھر جب انسان طبعی' نامیاتی' حیوانی اور نفسیاتی لحاظ سے خدائی قوانین میں جکڑا ہوا ہے تو کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ اسکی عقلی' اخلاقی اور تمدنی زندگی کے لئے اوپر سے کوئی ہدایت نہ دی جاتی ہو۔ ضابطۂ حیات کی ضرورت اتنی لابدی ہے کہ اگر خدائی ضابطہ اختیار نہ کیا جائے تو انسان خود ضابطے گھڑتا ہے۔ یا اپنے جیسوں سے حاصل کرتا ہے۔ مگر اسکی مشکل یہ ہے کہ ایک تو اس کا علم ناقص اور اسکی نگاہ محدود ہے اسلئے بار بار ضابطے بناتا اور توڑتا ہے اور ان میں پائیداری نہیں ہوتی۔ دوسرے اسکی بے شمار خواہشات اس کے قافلۂ فکر کے لیے راہزن ہیں اور وہ اسے بھٹکا دیتی ہیں۔ پھر اس کی حمایتیں اور عداوتیں' اسکی گروہ بندیاں اور دھڑوں کی عصبیتیں اسے ادھر سے اُدھر بھگاتی پھرتی ہیں۔ وہ ضابطہ بناتے ہوئے نقطۂ عدل اور خطِ اعتدال کو گم کر دیتا ہے۔ صحیح اخلاقی ضابطہ تلاش کرنے میں ''تجربہ ——— لغزش ——— اور اصلاح'' کا فارمولا اسلئے ناکام ہو جاتا ہے کہ اول تو ایک نظام تمدن کے وسیع تجربہ کے اجزا کو الگ الگ کر کے دیکھنا مشکل' پھر ہر ہر واقعہ کے اسباب و علل کی وسعت اور اس کے نتائج و اثرات کی درازی حائل۔ اس فارمولا کی ناکامی اس حقیقت سے ظاہر ہے کہ بے شمار برائیوں کو برائی ماننے کے باوجود انسان ہمیشہ دوہراتا ہے اور ایک تجربہ کی ناکامی کے بعد پھر اسی کی تکرار کرتا ہے۔

انسانیت کے لئے اصولی ضابطۂ حیات ایسا ہونا چاہیے جو محکم اور پائیدار ہو' جس میں

کسی کی ذاتی اغراض دخیل نہ ہوئی ہوں' جس کے پیچھے کوئی حمایت' عداوت یا عصبیت کارفرما نہ ہو' جو عدل کامل کا مظہر ہو' جس میں تقدس پایا جائے' جو بدلتے زمانوں کے وقتی اثرات سے بالاتر رہ کر ساری تاریخ میں اس کا ساتھ دے سکے' جو بے شمار نسلوں' قوموں اور طبقوں کو اپنے سایہ میں سمیٹ سکے اور جسے انسانی اختلافات کو حل کرنے کے لئے معیار فیصلہ بنایا جا سکے۔ یہ اوصاف کسی انسانی ضابطے میں نہیں پائے جا سکتے۔ یہ شان صرف الٰہی ضابطے کی ہو سکتی ہے۔ یہی الٰہی ضابطہ ہے جسے سامنے رکھنے کے بعد انسان آوارہ خیالی سے نجات پا کر یکسوئی سے اپنا مسلک طے کرتا ہے۔ الٰہی ضابطہ ہی نظام زندگی کو پائیدار اخلاقی بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ ایسے ایک اٹل اور بالاتر ضابطے کی عقلی ضرورت صاف محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ ضرورت جس ادارے سے بھی پوری ہو انسانیت کو اس کا ممنون ہونا چاہیے۔ یہ ادارہ نبوت ہے۔ جو مرضی الٰہی سے ہمیں آگاہ کرتا ہے اور خیر و شر اور حلال و حرام کی قطعی تقسیم کر دیتا ہے۔

ضابطہ سامنے آ جانے پر ذمہ داری و جواب دہی کا دھندلا سا فطری احساس بھی واضح شعور میں بدل جاتا ہے جو انسانی نفس میں پیوست ہے۔ نبوت جب اس شعور کو اجاگر کر دیتی ہے تو عقل یہ ماننے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ انسان کے اعمال اور اسکے کارنامۂ حیات کے نتائج برآمد ہونے چاہئیں۔ ایک عادل حکمراں کی سلطنت کی رعیت ہوتے ہوئے انسان بجز اسکے کیا سوچ سکتا ہے کہ جو کوئی اسکے ضابطہ کی پابندی میں زندگی بسر کرتا ہے اسے مقبول بارگاہ ہونا چاہیے اور جو کوئی اس ضابطہ سے انحراف کرتا ہے اسے موردِ عتاب ہونا چاہیے۔ وہ لوگ جنہوں نے خدا کی رضا کو سامنے رکھ کر انسانیت کی بہبود کے لئے ساری عمر اپنے مفاد اور آرام چھوڑے اور بے شمار مصائب اور نقصانات بھگتے ان کے درختِ کردار پر میٹھے پھل آنے چاہئیں اور دوسری طرف جن لوگوں نے اپنے مالک اور بادشاہ کے ضابطے کو توڑ توڑ کر ذاتی فوائد سمیٹے اور لذتیں حاصل کرنے کے لئے انسانیت کو عمر بھر چرکے دیئے ان کے اعمال بد کی جھاڑیوں کو کانٹوں سے بھر جانا چاہیے۔ اس امتحانی زندگی میں نیکی اور بدی کا پورا پورا پھل دینے کا نہ انتظام کیا گیا ہے اور نہ انسانی مہلت عمر میں یہ ممکن ہے کہ حساب پورا ہو جائے۔ اس لئے عقل سلیم کے سامنے عالم آخرت کی ضرورت از خود آتی ہے۔ اور پھر نبوت اسے بتاتی ہے کہ ہاں ایسا ایک عالم آخرت ہے جہاں ہر انسان کو پورے کارنامہ حیات کا حساب دینا ہے اور کیے کرائے کا صلہ پانا ہے۔ آخرت کے محاسبہ کا یہ تصور جہاں گم ہو جاتا ہے' انسان کے

سامنے غرض پرستی کے سوا کوئی مسلک باقی نہیں رہ سکتا اور لازماً بے اصولی اس کا اصول بن جاتی ہے۔ آخرت سے نگاہ ہٹا لینے کا نتیجہ افادی نظریۂ اخلاق اور میکیا ویلی کا دیا ہوا سیاسی ساحری کا درس ہے۔ تصورِ آخرت سے جب انسان خالی ہو جائے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ ایک خواہش پرست حیوان اور ایک ظالم درندہ بننے سے بچ سکے۔ اخلاقی ذمہ داری کا پورا احساس تصورِ آخرت پر قائم ہو سکتا ہے۔ جس عقیدے کا ترک، زندگی بگاڑے اور جس کا قبول اسے سنوارے، اسکی صداقت از خود واضح ہے۔

نبوت جس تصورِ خدا اور جس الٰہی ضابطہ کو محاسبۂ آخرت کا تصور دلا کر ہمارے حوالے کرتی ہے اسکے مطابق وہ صحیح ترین زندگی گزارنے کا نمونہ بھی خود پیش کرتی ہے۔ انبیاء اسی لیے ہمیشہ انسانوں میں سے اٹھائے گئے اور اسی لئے وہ کبھی تارک الدنیا نہیں ہوتے کہ انہیں دنیائے آب و گل میں بسنے والے خاکی انسانوں کو جملہ تمدنی علائق کے ساتھ پاکیزہ زندگی گزارنے کا درس دینا ہوتا ہے۔ انبیاء کا درسِ حیات محض زبانی اور کتابی درس نہیں ہوتا بلکہ عملی درس ہوتا ہے۔ وہ واعظ نہیں ہوتے پیکر کردار ہوتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اسے کر کے بھی دکھاتے ہیں۔ ان کے اصول فلسفیانہ اور شاعرانہ تصورات نہیں ہوتے کہ جو فقط بزم دانش کی رونق ہوا کریں اور جس کا جی چاہے حسب دل خواہ ان کی تاویلیں کرتا پھرے۔ وہ اپنے ہر اصول کا مفہوم عمل کے لغت میں ثبت کرتے ہیں۔ نبوت کی دی ہوئی آئیڈیالوجی جس طرز کا انسان پیدا کرنا چاہتی ہے اس کا بہترین، کامل اور معیاری نمونہ خود نبی ہوتا ہے۔ یہ آئیڈیالوجی جس طرح کی انقلابی حرکت اٹھانا چاہتی ہے اس کا اولین علمبردار اور قائد بھی خود نبی ہوتا ہے۔ یہ آئیڈیالوجی جس طرح کی ہیئتِ اجتماعیہ تشکیل کرنا چاہتی ہے اسکی نیو بھی خود نبی ڈالتا ہے اور پھر اگر ریاست و تمدن کے قیام کا وقت آ جائے تو اس آئیڈیالوجی میں جو نقشہ مضمر ہے عین اس پر خود نبی پورا نظام اٹھاتا ہے۔ سو اسلامی آئیڈیالوجی پر ایمان لائیے تو پھر نبی کو زندگی کا معلم، زندگی کا گائیڈ، زندگی کا اسوہ اور زندگی کا نمونہ مانئے اور اسی کو اس آئیڈیالوجی اور خدائی ضابطہ حیات کا شارح تسلیم کیجیے! نبی جو علم حقیقت کے لحاظ سے بھی اور ازلی صداقتوں پر ایمان رکھنے کے لحاظ سے بھی مرتبہ کمال پر ہے، وہی عملی لحاظ سے بھی معیاری مقام رکھتا ہے۔ اول تو منصب نبوت کے لئے اس کا انتخاب بہترین انسان کی حیثیت سے ہوتا ہے، وحی و الہام کی روشنی سے اس کا نہاں خانہ روح ہر آن منور رہتا ہے، علاوہ ازیں شر کی قوتوں کے حملوں سے اس کی بطور

خاص حفاظت کی جاتی ہے ـــــ اور انہیں وجود سے وہ مرتبۂ عصمت پر فائز ہوتا ہے۔ مرتبۂ عصمت کا خلاصۂ مفہوم یہ ہے کہ نبی میں کسی آن بھی رضائے الٰہی اور قانون الٰہی سے انحراف کا ارادہ کارفرما نہیں ہوتا۔ حق کے مقابلے میں ہوائے نفس اسکے اندر کبھی زور نہیں پکڑ سکتی' اسکے علم و فکر کے چشمے کو شیطانی طاقت گدلا نہیں کر سکتی ـــــ جہاں سہوِ نظر یا لغزشِ قدم کا کوئی موقع آیا' آسمانی انتباہ فوراً خطرے سے آگاہ کر دیتا ہے۔

انسان ہمیشہ ضرورت مند رہا ہے کہ اسکے سامنے کوئی انسانی شخصیت بطور نمونہ و معیار موجود رہے۔ وہ انسان کامل کا متلاشی ہے۔ اسے انسانیت کی راہ پر بڑھنے کے لئے رہنما کی ضرورت ہے۔ اس فطری ضرورت کی وجہ سے ہر فرد بشر ایک یا چند شخصیتوں سے غیر معمولی طور پر متاثر رہتا ہے اور ان کی سی ادائیں اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔ پھر جو شخصیتیں کسی ایک پہلو سے بھی اپنے ماحول میں ممتاز ہوتی ہیں' ان پر لوگ غیر معمولی توجہ دیتے ہیں۔ بسا اوقات حکمرانوں' آمروں' خطیبوں' لیڈروں' ایکٹروں' بہادر سپاہیوں اور کہانیوں کے ہیروؤں (Heroes) کی شخصیتیں نگاہوں میں کھب جاتی ہیں۔ پھر ''بڑے لوگ'' ـــــ خواہ وہ کیسے ہی محدود معنوں میں بڑے کہلائیں ـــــ ہمیشہ انسانیت کے ذہن اور لٹریچر کے صنم خانوں کی رونق رہے ہیں۔ حتیٰ کہ اکابر پرستی کا رجحان دنیا میں عام ہے۔ بعض لوگوں کی نگاہ اگر حقیقی انسانوں کی بڑائی پر مطمئن نہیں ہو سکی تو انہوں نے انسان کامل کے خیالی اصنام گھڑے اور ان کو اسوہ و نمونہ کی حیثیت دی۔ اس جائزہ سے یہ حقیقت سمجھ میں آتی ہے کہ انسانیت کی یہ بھی ایک فطری ضرورت ہے کہ کوئی نہ کوئی انسان کامل اسکے سامنے رہنما اور نمونہ بنے۔ اس ضرورت کو بھی صحیح معنوں میں نبوت ہی پورا کرتی ہے۔ وہ جس عظیم سچائی کا درس دیتی ہے اسکے مطابق بہترین نمونۂ انسانیت اور بہترین نقشۂ زندگی بھی خود پیش کرتی ہے۔ وہ اپنی تعلیم کی شارح آپ ہوتی ہے۔

پس نبی پر ایمان لانے کا ایک تقاضا جہاں یہ ہے کہ ہم اسکی عطا کردہ آئیڈیالوجی اور اسکے تفویض کردہ خدائی قانون کو بسر و چشم قبول کریں وہاں دوسرا تقاضا یہ بھی ہے کہ ہم نبی کو سفر حیات کا رہنما' انسانیت کا اسوہ اور خدا کی رضا اور اسکے قانون کی اطاعت کا کامل نمونہ بھی مانیں' اسکی تعلیم کو اسکی شخصیت اور کارنامۂ حیات سے منقطع نہ کریں بلکہ اسکے پیغام کا مفہوم اسکے عمل سے سمجھیں!

دیکھئے کہ ایک تصور خدا سے یکے بعد دیگرے متعدد اعتقادات نمودار ہوتے گئے اور ایک مکمل آئیڈیالوجی ترکیب پا گئی۔ خدا کا اگر کوئی فلسفیانہ تصور باندھیے تو خواہ وہ کتنا ہی پیچیدہ کیوں نہ ہو جائے عملی زندگی کے قافلے کے لئے وہ کسی مکمل آئیڈیالوجی کی قندیل مہیا نہیں کر سکتا۔ لیکن یہاں چونکہ خدا کا عرفان عملی زندگی کی درستی کے لئے ہے اسلئے ایک تصور مجرد نہ رہا بلکہ ایک نظام فکر بن گیا۔ خدا پر ایمان لانا لازم کر دیتا ہے کہ نبوت پر' خدائی ضابطہ پر اور محاسبۂ آخرت پر ایمان لایا جائے۔

خدا کو مانئے تو اس پوری آئیڈیالوجی کو قبول کیجئے جو اسکی ذات و صفات کے عرفان سے حاصل ہوتی ہے۔

خدا کو مانئے تو اسکی رضا اور اسکے ضابطۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کیجئے۔

خدا کو مانئے تو خدا کا پیغام دینے والے اور اس کا ضابطہ پہنچانے والے نبی کو اپنے لئے رہنما اور نمونہ تسلیم کیجئے!

اور خدا کو مانئے تو ساری زندگی اس احساس ذمہ داری کے ساتھ گزارئیے کہ ہر قول اور ہر فعل کا حساب اسکی عدالت میں دینا ہے۔

یہ ہیں اسلامی آئیڈیالوجی کے ایمانی تقاضے!!

جب کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں' ہر آئیڈیالوجی اپنے ڈھب کے جس تمدن کی تشکیل کرتی ہے اس میں زندگی کے تین بڑے رابطے سب سے پہلے معین ہوتے ہیں۔ انسان کا رابطہ خدا سے' انسان کا رابطہ انسان سے اور انسان کا رابطہ مادہ سے۔ ہر نظریہ ان رابطوں کو الگ الگ شکل دیتا ہے اور انہی تین رابطوں کی ترتیب کا اختلاف ایک تمدن کو دوسرے تمدن سے مختلف بناتا ہے۔ ان رابطوں کی کوئی سی ترتیب نظام تمدن کے چھوٹے سے چھوٹے جزء کو متاثر کرتی ہے۔ ہر نظام اور ہر شعبہ اور ہر ادارہ اسی ترتیب سے مطابقت پیدا کر لیتا ہے۔ انبیاء کی عطا کردہ اسلامی آئیڈیالوجی ان سہ گونہ رابطوں کو ہمیشہ اپنے ایک خاص نقشے پر استوار کرتی رہی ہے۔ انبیاء نے انہی اساسی رابطوں کو بدلنے کے لئے اپنے اپنے دور میں انقلابی جدوجہد کی ہے۔ چونکہ وہ نہایت بنیادی اور جامع قسم کی تبدیلی کے داعی رہے ہیں اسی لئے ان کو سنگین مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

ہمارے نظام تعلیم کی بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ طالب علموں کے ذہن اس معاملہ

میں یکسو کر دے کہ ہماری اسلامی آئیڈیالوجی تمدن کے سہ گانہ بنیادی رابطوں کو کیا خاص شکل دینا چاہتی ہے۔ کیونکہ اس حقیقت کو جاننے کے بعد ہی انہیں اسلامی آئیڈیالوجی کا پورا عرفان حاصل ہو سکتا ہے اور اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ وہ اسلامی نظام زندگی کی طرف بڑھنے کے لئے یہ سوچ سکیں کہ انہیں کیا کچھ کرنا ہے اور فکر و عمل کی دنیاؤں میں کدھر سے کیسا انقلاب لانے کی ضرورت ہے۔

قرآن ـــــ حکمتِ تعلیم

(سورۂ لقمان کی روشنی میں)

جب بھی کوئی شخص قرآنی نظام تعلیم کا خاکہ مرتب کرنے بیٹھے گا تو سب سے پہلے اس کی نگاہ اس حقیقت پر جائے گی کہ قرآن جو بہ حیثیت صحیفۂ حقائق اور بہ حیثیت کتاب ہدایت اور کتاب حکمت (وہ کتاب قانون بھی ہے' کتاب سیاست بھی اور کتاب تہذیب بھی)' ایک خاص طرز کا انسان تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے انسان مطلوب کا نہایت تفصیلی نقشہ تیار کرتا ہے' وہ بتاتا ہے کہ اس کے معتقدات کیا ہونے چاہئیں ۔ اس کا طرز فکر اور زاویہ نظر کیا ہو' اس کا مقصدِ حیات اور نصب العین کیا ہو' اس کے جذبات کیسے ہوں' اس کے مختلف رابطوں کا نہج کیا ہو' وہ تفہیم خیر وشر کے لیے کس معیار اور پیمانے کو استعمال کرے' وہ تاریخ انسانیت کی کس صفِ رجال کو اپنے لیے نمونہ بنائے' وہ کس ہستی کو قائد حیات تسلیم کرے' کن حدود و ضوابط میں اپنے آپ کو پابند رکھے' اور کیسے آداب و اطوار اختیار کرے۔ فکر و عمل کا وہ ایک مکمل سانچہ ہے جو قرآن کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔

قرآن کا جب ہم اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت مانے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ قرآن کتاب تعلیم بھی ہے' اور نصاب تعلیم بھی۔ یہ ایک مکمل تہذیب اور تہذیبی تحریک کا نصاب تعلیم ہے ۔ یہ اسلامی معاشرہ کی اساسی اور مرکزی کتاب علم و حکمت ہے۔ اس ''الکتاب'' سے جس طرح ہم دوسرے تمام شعبوں کے لیے رہنمائی اخذ کر سکتے ہیں' اسی طرح یہ ہمیں حکمت تعلیم بھی فراہم کرتی ہے ۔ یہ حکمت تعلیم پورے قرآن میں پھیلی ہوئی ہے اور اسے برآمد اور مرتب کرنے کے لیے تفصیلی تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔ یہاں ہم قرآن کے صرف ایک مقام کو لے رہے ہیں' وہ ہے سورۂ لقمان کا وہ حصہ جس میں وہ تعلیم بیان کی گئی ہے جو حضرت لقمان نے اپنے فرزند کو دی تھی۔ ایک بڑی حقیقت جو قرآن نے نمایاں کر دی ہے وہ یہ ہے کہ صحیح تعلیم کا مقصد ایک مکمل انسان کو صحیح سانچے میں ڈھالنا ہے۔ اور ہر نظام تعلیم اسی

بنیاد پر دوسرے سے ممیز ہوتا ہے کہ وہ کیسے انسان تیار کرنا چاہتا ہے۔ ہمارے یہاں نظام تعلیم کو چلانے اور اسے تبدیل کرنے کے خواہش مندوں کو اصل چیز یہی طے کرنی چاہیے کہ وہ کس نقشے کا انسان تیار کرنا چاہتے ہیں۔

گھر ــــ تعلیمی اہمیت

گھر نہ صرف قرون رفتہ میں تعلیم گاہ تھا' بلکہ وہ آج کے دور کے وسیع ادارہ ہائے تعلیم کے ہوتے ہوئے بھی خاصی تعلیمی اہمیت رکھتا ہے![1]

یہ بالکل فطری امر ہے کہ ہر باپ اپنی اولاد کو بہترین نقشے پر اٹھانا چاہتا ہے۔ اور اگر اس پر حق وراستی اور خیر وفلاح کا جادۂ ہدایت پوری طرح واضح ہو تو وہ اولاد کے لیے نہایت پرجوش معلم ہوتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ والدین سے بڑھ کر اولاد کا کوئی خیر خواہ نہیں ہو سکتا' اور نہ کوئی عظیم الشان ادارہ اور نہ کسی نظام کے بہترین کارندے بھی ماں باپ کا بدل ہو سکتے ہیں۔ بیرونی ادارے اور کارندے ایک تو ماں باپ کے محدود اوقات کے دوسرے بے شمار مصارف کی وجہ سے ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں' دوسرے جن علوم وفنون میں ان کو دستگاہ نہیں ہوتی یا کم ہوتی ہے' ان میں ان کی اولادوں کی خدمت انجام دے کر ان سے تعاون کرتے ہیں۔

قرآن میں ایک مثال حضرت یعقوب علیہ السلام کی ہے۔ موت کا مرحلہ سامنے آ جانے پر وہ اولاد کو سامنے بٹھا کر یہ سوال کرتے ہیں کہ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ؟[2] ارضی زندگی کے

---

[1] گزشتہ ادوار میں بھی گھر کے باہر انبیاء اور دوسرے نیک نہاد حکماء کے خطبات اور ملفوظات ذریعہ تعلیم ہوتے تھے۔ اس طرح کچھ مدبر فلسفی اور گیان دھیان کرنے والے تارک الدنیا لوگوں کے گرد جمع ہونے والے عوام ان سے فیضان حاصل کرتے تھے۔ کسی حد تک معابد اور خانقاہوں کا استعمال بہ طور تعلیم گاہ کے بھی ہوتا تھا۔ ہمارے اس دور میں جو مغرب کی اٹھان سے شروع ہوا ہے چونکہ انسانی معلومات کا دائرہ مختلف شعبوں میں بے حد وسیع ہو گیا ہے' سائنس اور ٹیکنالوجی نے تجربات اور آلات وسائل کے انبار لگا دیئے ہیں' پوری دنیا کی رنگا رنگ آبادیاں سمٹ کر نگاہوں کے سامنے آ گئی ہیں' بلکہ اب تو خلاء میں نفوذ کا دور ہے۔ سو اس دور کے آغاز سے تعلیم کے لیے مستقل ادارات وجود میں آئے اور کسی ایک شخصیت کی بجائے مختلف شعبہ ہائے علم کے لیے کئی کئی معلم یکجا کام کرنے لگے۔ مستقل تعلیم گاہوں کا اچھے معیار پر قیام بھی مسلمانوں کے دور عروج میں زیر عمل آیا۔

[2] البقرہ آیت ۱۳۳

آخری لمحات میں وہ کسی مال و جائیداد کی فکر نہیں کر رہے، کسی کاروبار کے انتظام و انصرام کی وصیت نہیں کر رہے، کسی جاہ و منصب کو سنبھالنے کی تلقین نہیں کر رہے اور نہ کسی دشمن سے انتقام لینے کا معاملہ اٹھاتے ہیں۔ ان کے سامنے اہم ترین اور مرکزی سوال یہ ہے کہ میری اولاد میرے بعد کس کی بندگی و اطاعت میں زندگی گزارے گی؟ اولاد ان کو صحیح اور حوصلہ افزا جواب دیتی ہے اور یہ جواب نتیجہ ہے اس تعلیم و تربیت کا جو حضرت یعقوب علیہ السلام اپنی اولاد کو دیتے رہے۔

اسی طرح حضرت زکریاؑ بڑھاپے میں اپنی بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود خدا سے اولاد کی دعا کرتے ہیں تو اس مقصد سے کرتے ہیں کہ وہ مشن برقرار رہے جس کے لیے انہوں نے عمر بھر کام کیا۔ وہ ایسی اولاد چاہتے ہیں جس کی شان یہ ہو کہ یَرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ (مریم:۶) یعنی وہ میری اور آل یعقوب کی وارث ہو۔ یہاں مراد کسی مال و جائیداد کی وراثت نہیں ہے بلکہ مقصد ایمان و علم کی اس وراثت کو سنبھالنا اور اس مشن کو جاری رکھنے میں جانشینی کرنا ہے جس کے امانت دار حضرت زکریاؑ خود بھی تھے اور جو آل یعقوب سے چلی آ رہی تھی۔

ٹھیک اسی طرح حضرت لقمان اپنے بیٹے کو اپنے ایمان، علم، کردار اور مشن کا وارث بنانے کے لیے اسے مخاطب کر کے تعلیم دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ قرآن کے اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہ ہوگا کہ یہ کسی ایک ہی موقع کا معاملہ ہوگا کہ حضرت لقمان نے چند کلمات نصیحت اپنے صاحبزادے کو مخاطب کر کے فرما دیئے ہوں گے۔ بلکہ یہ تعلیم تو انہوں نے عمر بھر دی ہوگی اور مختلف مواقع پر مختلف اجزاء بڑی تفصیل سے بیان کیے ہوں گے۔ قرآن نے تاریخ گوئی اور واقعہ بیانی کے اپنے خاص اسلوب کے مطابق تعلیم لقمان یا حکمت لقمان کا جوہر نکال کر مختصر ترین لفظوں میں ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔

حکمت لقمان کیا تھی

حضرت لقمان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے کہ ہم نے انہیں حکمت عطا کی ﴿وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِکْمَۃَ۔ آیت: ۱۲﴾ یوں تو ہر قوت اور صلاحیت اور خیر و خوبی مختلف وجوہِ نسبت سے عطیۂ خداوندی ہی ہے۔ لیکن یہاں بات ایک خاص رنگ میں واضح ہے۔ یعنی

یہ حکمت جس کا آگے ذکر کیا جارہا ہے' حضرت لقمان نے بہ طور خود ایجاد نہیں کی تھی' بلکہ یہ اللہ کی طرف سے دی گئی تھی۔ ضروری نہیں کہ وہ براہ راست ہی دی گئی ہو۔ انبیاء کی تعلیمات جو اللہ تعالیٰ کی الہام کردہ ہوتی ہیں اور جنہیں دوسروں تک پہنچانے کے لیے انبیاء مامور ہوتے ہیں اور وہ اپنے پیروکاروں کو بھی اس فریضے میں مددگار بناتے ہیں' ان کا کسی شخص تک پہنچنا' فی الحقیقت خدا ہی کے قائم کردہ نظام تعلیم انسانیت کا فیضان ہے۔ پھر محض تعلیم کے پہنچنے پر بات مکمل نہیں ہوتی' اس کا کسی کے دل میں اترنا بھی خدائی قوانین کے تحت خدائی اذن سے ممکن ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے دلوں کے دروازے اچھی طرح بند کر کے انہیں تاریکی کے لیے وقف کر رکھا ہے اور اس تاریکی میں بدی کے کیڑے مکوڑوں کو پلنے پوسنے کا موقع دے رکھا ہے' خدائی ہدایت اور انبیاءؑ کی تعلیم زیادہ سے زیادہ ان کے کان کے پردوں سے ٹکرا کر واپس پلٹ جاتی ہے۔

گویا حضرت لقمان پر اللہ تعالیٰ کا یہ احسان دوگونہ تھا کہ ایک تو ان تک درس ہدایت پہنچا اور دوسرے ان کے دل و دماغ کی حالت اتنی صحت مندانہ تھی کہ خدا کی مشیت نے اس روشنی کو ان کے اندر اترنے کا اذن دیا اور ان کے نہاں خانۂ فکر و احساس کو اس سے منور کر دیا۔ اس حقیقت کی روشنی میں نظام تعلیم پر غور کرتے ہوئے ہمیں فی نفسہٖ خود علم و حکمت کے متعلق یہ شعور حاصل کرنا چاہیے کہ علم حق اور حکمت عدل کا اصل سرچشمہ خدا کے سوا کوئی نہیں اور سارا انسانی علم اور ذرائع حصول علم اسی کے عطا کردہ ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بگاڑ کی شیطانی قوتیں ہمیں معلومات کو غلط طور پر ترتیب دینے اور ان سے غلط نتائج نکالنے یا حقائق میں تحریف اور صداقتوں کی باطل تاویل کرنے کا تخریبی فن سکھا دیں' یا تعصّبات' ضد' آبا پرستی' جدت پسندی یا کسی اور اندھے جذبے کے قفل ہمارے دماغوں میں لگا دیں تاکہ خالص صداقت و حقیقت کے اندر داخل ہونے کا امکان نہ رہے' اور ہم ادھورے علم کو پورا علم سمجھ کر فکر و عمل کی وادیوں میں ٹامک ٹوئیے مارتے پھریں۔

قرآنی حکمتِ تعلیم کی رو سے تعلیم کا نقطۂ آغاز اس امر واقعہ کا اعتراف ہے کہ علم صحیح اور حکمت صافی کا سرچشمہ خدا کی ہستی ہے۔ جو نظام تعلیم اس اولیں صداقت کو اپنی اساس اور روح نہیں بناتا وہ اسلامی نظام تعلیم نہیں ہوسکتا۔

سوال یہ ہے کہ حضرت لقمان کو اگر اللہ تعالیٰ نے حکمت سے اس مرتبہ خاص تک نوازا

تھا کہ اس کا ذکر قرآن جیسی کتاب عظیم میں کیا گیا تو وہ فی نفسہٖ تھی کیا؟
کیا حکمت سے مراد کھیتی باڑی کا علم تھا؟ شکار کھیلنے کی بصیرت تھی؟ مکان بنانے یا کپڑا بنانے کی ضروری صنعتیں تھیں؟ شعر و غنا کا فن تھا؟ ادب و خطابت کا ہنر تھا؟
یہ سوال اس لیے اہم ہے کہ ہمارے ہاں قرآن اور حدیث کے نوشتوں میں علم و حکمت کے الفاظ جہاں کہیں آتے ہیں' ایسے تمام مقامات کو جمع کر کے ہمارے دانشور یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جہاں کہیں سے جس طرح کا علم اور جس نوع کی حکمت حاصل ہو' اسے سمیٹو اور اس کی دعوت اسلام نے دی ہے۔

العلم والحکمت

اسلامی نوشتوں' قرآن و حدیث میں علم و حکمت کے الفاظ دو معنوں میں آتے ہیں۔ایک عام وسیع لفظی معنوں میں اور دوسرے مخصوص اصطلاحی معنوں میں اور صورت واقعہ یہی ہے کہ العلم اور الحکمۃ کے الفاظ کا مخصوص اصطلاحی معنوں میں استعمال نہایت کثرت سے ہوا ہے اور انہی معنوں کے لحاظ سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔
العلم اور الحکمت سے اصطلاحی حیثیت میں مراد اولاً ان حقائق کو جاننا' قبول کرنا اور ان پر یقین کر کے ان کو بنائے عمل بنانا ہے جنہیں خدا کے عطا کردہ الہامی علم اور اس کے قائم کردہ سلسلۂ نبوت کے بغیر پوری طرح سمجھا نہیں جاسکتا۔ ثانیاً ان طریقہ ہائے فکر و نظر' ان اخلاقی اصولوں اور ان قانونی حدود کو جاننا ہے جن کے سانچے میں ڈھل کر ہی انسان معیار انسانیت کو پاسکتا ہے۔
اس اساسی علم اور اساسی حکمت کو زندگی میں مرکزی جگہ دی گئی ہے۔ضرورت کے تمام بقیہ علوم اور فنون کے حصول کا داعیہ فطری طور پر انسان کے تحت الشعور خود ہمہ وقت کام کر رہا ہے' اس کے ذریعے جو کچھ بھی معلومات مختلف شعبوں میں حاصل ہوں' ان کو اس اساسی علم و حکمت کے معیار پر پرکھ کر اور اس سے ہم آہنگ پا کر قبول کرنا چاہیے اور اس کے گرد ترتیب دینا چاہیے۔
اصطلاحی علم و حکمت انسان کو سوچنے سمجھنے والا اور خیر و شر کی تمیز کرنے اور نیکی کے غلبے کے لیے بدی کے خلاف جنگ کرنے والا صحیح انسان بناتا ہے۔باقی رہے وہ طبعی اور تاریخی اور

تمدنی اور سائنسی علوم سو جب یہ صحیح طور پر تعمیر شدہ انسان انہیں حاصل کرے گا تو ان کی تشکیل بھی درست طریق سے کرے گا اور ان کا اور ان سے حاصل ہونے والے وسائل کا استعمال بھی صحیح شکل میں کرے گا۔ بخلاف اس کے اگر انسان صحیح انسان ساز علم و حکمت کے سانچے میں ڈھال کر تیار نہ کر لیا گیا ہو تو پھر جغرافیہ و تاریخ سے لے کر فنون لطیفہ تک اور نفسیات سے لے کر سائنس اور ٹیکنالوجی تک وہ جو جو کچھ افکار اور تجربات اور وسائل جمع کرے گا' نہ تو ان کے اجزاء کو کسی صداقت برتر کے معیار پر پرکھ سکے گا' نہ ان کو صحیح ترتیب دے سکے گا اور نہ خیر و خوبی کے لیے ان کا صحیح استعمال کر سکے گا۔

پس سب سے بڑا علم اور سب سے بڑی حکمت وہ ہے جو انسان کو ذہن و کردار کے لحاظ سے بہترین پیرائے میں تشکیل دے۔ انبیاء کے ذریعے جو دین اسلام ہم تک پہنچا ہے وہ اسی بڑے علم اور اسی بڑی حکمت پر مشتمل ہے۔

یوں تو اس دعوے کے لیے قرآن و حدیث میں سے جا بجا پھیلے ہوئے ثبوت نکال کر سامنے لائے جا سکتے ہیں مگر طوالت سے بچنے کیلئے ہم خود اسی مقام کو اثباتِ مدعا کے لیے کافی سمجھتے ہیں جس پر گفتگو ہو رہی ہے۔

شکر کا مسلک

فرمایا یہ گیا ہے کہ "ہم نے لقمان کو یہ حکمت عطا کی کہ اللہ کا شکر ادا کرو ـــــ یا یہ کہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے زندگی گزارو ﴿اَنِ اشْکُرْ لِلّٰهِ﴾ (آیت:۱۲) خدا کا حق پہچانو! احسان شناسی کی روش اختیار کرو۔

حضرت لقمان کو عطا کردہ حکمت کی مکمل تعریف ان الفاظ میں کر دی گئی ہے' لیکن آگے ان کی طرف سے جو تعلیم بیٹے کو مخاطب کر کے دی گئی ہے وہ ساری بھی اس کی توضیح و تفسیر ہے۔

یہ حکمت جو بے حد مختصر الفاظ میں بیان ہوئی ہے کہ "اللہ کا شکر ادا کرو" اس میں آئی ہوئی اصطلاح "شکر" کا نہایت محدود مفہوم رائج ہو گیا۔ اس وجہ سے اس آیت کی حکمت سمجھنا مشکل ہو گیا ہے۔

اسلام نے خدا کا جو تصور دلایا ہے وہ بنیادی طور سے ایک رحیم' شفیق اور ودود ہستی کا

تصور ہے "رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ" (الاعراف:۱۵۶) اس کا قہر وغضب اس کی صفت عدل کی وجہ سے اور اس کی صفت عدل خود صفت رحمت ہی کی مظہر ہے۔ چنانچہ قرآن کا ایک بڑا حصہ یہی احساس دلانے کے لئے وقف ہے کہ انسان پر خدا کے احسانات وانعامات کس درجہ وسیع ہیں۔ احسان اور رحمت کا حق یہ ہے کہ شکر کا رویہ پیدا ہو۔ ہمارے دین کا تعلق باللہ کی اساس فی الحقیقت جذبہ شکر پر ہے۔ تقویٰ اور خشیت شکر کے ساتھ ایک لازمی پہلو کی حیثیت سے ہے۔ نعمت اور رحمت کا شعور جہاں شکر کا جذبہ ابھارتا ہے وہاں اس کے چھن جانے کا اندیشہ بیم وخشیت بھی پیدا کرتا ہے۔

روّیہ شکر کی تلقین کے ساتھ ایک اہم بات یہ کہی گئی ہے کہ جس نے طریقِ شکر اختیار کیا اس نے خود اپنے ہی بہبود کے لیے شکر کیا ﴿وَمَنْ یَّشْکُرْ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ﴾ (آیت:۱۲) یعنی خدا کو مان کر اس کے سامنے شکر کا رویہ اختیار کرکے زندگی گزارنے میں انسان کا اپنا ہی بھلا ہے۔ افراد کے لئے بھی اور اقوام کے لیے بھی۔

بندوں کے شکر کی خدا کو کوئی احتیاج نہیں کہ اس کے بغیر اس کے کام اٹکے جاتے ہوں۔ خدا کے سامنے شکر کی روش کا اختیار کرنا خود ہمارے اپنے احسان کیش بننے اور اپنی زندگیاں سنوارنے کے لیے ضروری ہے۔ جو شخص خدا کے ان گنت احسانات سے استفادہ کرکے اس کی عنایات کا احساس نہیں کرتا۔ ایسا احسان فراموش زندگی کی صحیح تعمیر کے لئے پھر کوئی بنیاد بھی نہیں پاسکتا۔ اس لیے حق تعالیٰ نے فرما دیا کہ وَمَنْ یَّشْکُرْ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ (آیت:۱۲) جو کوئی خدا کا حق پہچانے گا اس کا یہ رویۂ احسان شناسی خود اسی کی ذات کے لیے نفع بخش ہے۔ یہ بہرحال محسن بننے کے لیے نقطۂ آغاز جذبۂ شکر ہے۔

شکر کی روش کی ضد کفر ہے۔ "کفر یا کفران" اور "شکر" دو مختلف اور متضاد رویے ہیں۔ واضح کر دیا گیا کہ جو کوئی شکر کی راہ کو چھوڑ کر کفر کی روش اختیار کرے تو اس کا وبال بھی خود اسی کو بھگتنا ہے۔ اللہ تو غنی وحمید ہے اور اسے نہ کسی کے شکر کی احتیاج ہے نہ کسی کے کفر سے کوئی اندیشہ۔ جو کفر کا رویہ اختیار کرے گا اس کی پوری زندگی کفر ہی کی آئینہ دار ہوگی اور جو شکر کا رویہ اختیار کرے گا اس کی پوری زندگی شکر ہی کی آئینہ دار ہوگی مگر کفر اور شکر کے رویوں کی بحث سے بھی پہلے یہاں زیادہ اہم مسئلہ دوسرا ہے۔

مندرجہ بالا مختصر الفاظ میں دو اہم باتیں مضمر ہیں۔ پہلی یہ کہ انسان اور اس کے گرد پھیلی

ہوئی کائنات کا کوئی خالق و مالک و حاکم ہے اور وہی اللہ ہے۔ اسی حقیقت کے شعور سے حکمت لقمان کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی بیج سے اسلام کا شجرۂ طیبہ پھوٹتا ہے اور یہی بنیادی جوہر ہو سکتا ہے اسلامی نظام تعلیم کا۔

دوسری یہ کہ انسان پر اس کی رحمتیں اور احسانات ہیں جس کا جواب اس کے شکر کے رویے سے دینا چاہیے۔ زندگی کی نعمت' احسن تقویم پر پیدا کرنے کی نعمت' بہترین اعضا اور قوتوں اور صلاحیتوں سے آراستہ کرنے کی نعمت' رزق رسانی کی نعمت' پرورش اور اس کے انتظامات کرنے کی نعمت' اور پھر پاکیزہ زندگی بسر کرنے کے لیے جادۂ خیر و فلاح کی فطری طلب کی نعمت اور اس فطری طلب کو پورا کرنے کے لیے سلسلۂ نبوت کے ذریعے تعلیم ہدایت کی نعمت۔ یہاں خدا کی دوسری بے شمار تفصیلی نعمتوں کا ذکر چھیڑنے کا مقام نہیں۔

علم و حکمت کا مقام یہ ہے کہ آدمی ان دو حقیقتوں کا ادراک کرے جن کے اتنے شواہد اس کے چاروں طرف پھیلا کر رکھ دیئے گئے ہیں کہ وہ اگر ان کا انکار کرتا ہے تو پھر وہ اپنے جس علم کو علم کہتا ہے وہ جہالت کے سوا کچھ نہیں اور اپنی جس حکمت کو وہ حکمت قرار دیتا ہے وہ دیوانہ پن سے بر تر نہیں اور اپنی جس عقل پر وہ نازاں ہے اس کا صحیح نام حمق ہونا چاہئے۔ اللہ کی طرف سے حضرت لقمان کو اور حضرت لقمان کی طرف سے ان کے صاحبزادے اور دوسرے نامعلوم لوگوں کو جو حکمت پہنچائی گئی تھی' اس کی اساس یہی دو نکات تھے کہ آدمی اپنے خالق و مالک و حاکم کو مانے اور اس کی ان نعمتوں کا اعتراف کرے جن پر اس کی زندگی اور صحت زندگی کا انحصار ہے۔

دوسرے لفظوں میں آدمی کو خدا شناس اور خدا پرست ہونا چاہئے اور اس کے صدہا احسانات وانعامات سے ہر لمحہ مستفید ہونے کی بناء پر اسے خدا کا عبد شکور ہونا چاہئے۔

عبد شکور کا رویہ شکر یہ ہے کہ وہ زندگی کا ہر لمحہ خدا پر ایمان اور اس کی نعمتوں کے اعتراف کے ساتھ گزارے۔ وہ ہر عمل واقدام میں اس کی رضا کو ملحوظ رکھے' وہ تمام سرگرمیوں میں اس کے ضابطۂ ہدایت کا پابند ہو اور وہ ساری زندگی کو اس نصب العین کے لیے مخصوص کر دے جو اس کے مالک محسن نے معین کر دیا ہے۔ اس طرح وہ زبان سے بھی اس کا شکر ادا کرے' دل کے اندر بھی جذبۂ تشکر کا رفرما ہو' اور اقوال واعمال [illegible] کہ یہ خدا کے عبد شکور کے اقوال واعمال ہیں۔

اس کے برعکس جو شخص اس تصور سے زندگی کا آغاز کرتا ہے کہ اس کا کوئی خالق و مالک ہے ہی نہیں' یا ہے تو اس کی زندگی سے وہ بے تعلق ہے' یا اس کے بہت سے شرکاء اور چہیتے ایسے ہیں کہ ان کے آگے نذریں گزار کر اور چڑھاوے دے کر کام چلایا جا سکتا ہے۔ اس کا رویہ خدا کی نعمتوں کے جواب میں کفران کا رویہ ہوتا ہے۔ خدا کے انکار' یا خدا کی نعمتوں کے کفران کے سانچے میں ڈھلنے والے انسان کو کسی بھی شعبے سے متعلق علم و حکمت میں سے جو حصہ ملتا ہے وہ حق و باطل کا ملغوبہ ہوتا ہے اور اس کا استعمال وہ اپنی اور دوسرے انسانوں کی فلاح و سعادت کے لیے مخصوص نہیں کر سکتا بلکہ وہ جتنا زیادہ علم حاصل کرتا ہے اور جتنے زیادہ وسائل مہیا کرتا ہے اتنا ہی وہ اپنے لیے اور انسانیت کے لیے وجہ ضرر بنتا جاتا ہے۔

ماحصل یہ ہوا کہ اسلامی نظام تعلیم وہ ہے جس کا پہلا اور اہم ترین سبق ''اَنِ شْكُرْ لِلّٰہ!'' ہو اور یہ سارے کے سارے نصابات اور علوم و فنون پر چھایا ہوا ہو۔

شکر کا جذبہ انعامات' احسانات اور عنایات کے شعور سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سورۂ میں یہ شعور دلانے کا اہتمام بھی ہے۔ دعوت دی گئی ہے کہ بے شمار ظاہری اور باطنی نعمتیں تقاضا کرتی ہیں کہ ان پر غور و فکر کرو فرمایا:

- اس نے زمین و آسمان کو ستونوں کے بغیر کھڑا کیا جیسے کہ تم دیکھتے ہو اور زمین پر ایسے بوجھ جما دیئے کہ تمھیں لیے ہوئے (اپنی گردش میں) کسی طرف ڈھلک نہ جائے اور اس میں سب طرح کے جانور پھیلا دیئے اور آسمان سے بارش برسانے کا نظم مقرر کیا اور پھر اس کے ذریعے سے نباتات کے نہایت ہی خوب خوب جوڑے ہر طرح کے اگائے۔ (آیت:۱۰)
- کیا یہ لوگ غور نہیں کرتے کہ سب کچھ جو کچھ زمین و آسمان میں ہے۔ اسے اللہ نے نفع رسانی میں لگا رکھا ہے اور تم پر ظاہری اور باطنی نعمتوں کی بوچھاڑ کر دی ہے۔ (آیت:۲۰)
- کیا تو نے غور نہیں کیا کہ خدا تعالیٰ رات کو دن میں سے اور دن کو رات میں سے پرو کر نکالتا ہے...... الخ (آیت:۲۹)
- کیا تو نے غور نہیں کیا کہ سمندر میں اللہ تعالیٰ کی نعمت کے ساتھ کشتی چلتی ہے۔ (آیت:۳۱)۔...... اور جب اس کے مسافروں کے سروں پر کوئی لہر لکۂ ابر کی

طرح چھا جاتی ہے تو (مصیبت میں گھر کر) وہ اللہ کو پکارتے ہیں۔ اس کے لیے جذبۂ عبودیت کو خالص کر کے!۔۔۔ (آیت:۳۲)

یعنی چاروں طرف سے خدا کی نعمتیں اُنڈی پڑ رہی ہیں۔ ایک وسیع خوان بچھ رہا ہے۔ قدرت کے اس ماحول میں ایک حقیقت پسند اور حق شناس انسان کے اندر لازماً جذبۂ شکر ابھرنا چاہیے۔ نظام تعلیم کا یہ فرض ہے کہ وہ اس ماحول سے اس طرح طلبہ کو روشناس کرائے کہ انہیں خدا کے احسانات وانعامات کا شعور حاصل ہو اور عبدیت کے احساس کے ساتھ ان میں شکر کا جذبہ ابھرے۔ ہمیں سائنس' جغرافیہ' تاریخ' اور دوسرے تمام مادی وطبعی علوم کی تعلیم اس طرح دینی چاہیے کہ خدا پرستانہ شعور اس میں سمودیا گیا ہو۔ ہر تجربہ' مشاہدہ' انکشاف' ایجاد و اختراع اور عملِ تسخیر ہمارے اندر خدا کے شکر کی اکساہٹ پیدا کرے۔ حضورؐ کا یہ معمول تھا کہ سواری پر بیٹھتے تو جذبۂ شکر کے ساتھ خدا کی حمد کرتے اور اپنے عجز کا اقرار ''سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَلَنَا هٰذَا'' (الزخرف:۱۳) ٹھیک اسی طرح ہمارے سائنس دان جب کسی راز فطرت کو سمجھ لیں' ہمارے موجد جب کوئی چیز ایجاد کریں' ہمارے کاریگر جب کسی مشین سے کام لیں اور ہمارے سپاہی جب کسی اسلحہ کو ہاتھ میں لیں تو ان کی روحیں ''سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَلَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ'' (الزخرف:۱۳) پکار اٹھیں۔ اسی خدا پرستانہ جذبۂ شکر کے فقدان نے مغربی تمدن کو مادہ پرستی میں اتنا بہکا دیا ہے کہ قدرت کے عطیات رحمت ہونے کی بجائے عذاب بن گئے ہیں۔ ہمارے نظام تعلیم کو اس اندھی مادہ پرستی سے انسانیت کو بچانا ہے۔

لوگوں نے اس طرح کی آیات سے عموماً یہ بات ثابت کرنے کی کوشش تو کی ہے کہ قرآن سائنس اور دوسرے علوم حاصل کرنے کی تلقین کرتا ہے مگر ہمارے جدید طبقے نے یہ کاوش نہیں کی کہ وہ کس اسپرٹ کے ساتھ اور کس نقطۂ نظر کے ساتھ علوم کی تحصیل واشاعت چاہتا ہے۔ قرآن کا اولین منشا یہ ہے کہ خدا اور اس کی صفات اور اس کے حقوق کی معرفت' اس کے احسانات وعنایات کا شعور اور جذبۂ شکرو سپاس کا سرمایہ مطالعہ انفس و آفاق سے حاصل کیا جائے اور کسی بھی علم کے دائرے میں کوئی قدم آگے بڑھاتے ہوئے ایمان باللہ کو مشعل راہ کی حیثیت دینی چاہیے۔ ورنہ تمام علوم غلط رخ پر ڈھل جائیں گے اور ان سے جو عمل پیدا ہوگا وہ بھی فاسد ہوگا۔

اوپر جن آیات کا حوالہ دیا گیا ہے ان کو اور ان بے شمار ہم مقصد آیات کو آپ دیکھئے ان سب کا منشا یہ شعور دلانا ہے کہ یہ کائنات اگر کوئی نظام رکھتی ہے' اس کے عناصر اگر تمہارے لیے سازگاری رکھتے ہیں' اس کے قوانین اگر تمہارے لیے تسخیر کی راہیں کھولتے ہیں تو یہ نظام فطرت یونہی از خود ایسے نہیں بن گیا۔ کسی بنانے والے نے حکمت کے ساتھ اسے ایسا بنایا ہے اور تمہیں پیش نظر رکھا ہے۔ ہمارے علوم کو بھی اسی شعور کی راہ پر جانا چاہئے اور ہمارے نظام تعلیم کو بھی یہ مقصد سامنے رکھنا چاہئے۔

اس نکتۂ معنی کو ہم آیت ۳۲ میں بہت ہی واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں انسان کے عالم نفسیات سے ایک کیفیت پیش کر کے عبرت دلائی گئی ہے۔ انسان جہاں اس کائنات کی وسیع نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوتا ہے' وہاں اس کی مہیب قوتوں کے سامنے وہ اپنے آپ کو انتہائی بے بس بھی پاتا ہے۔ یہ بے بسی اسے ایک ایسے روحانی سہارے کا محتاج بناتی ہے جو تدابیر کی بازی ہر جانے کے بعد بھی قائم رہے۔ سمندر کی موجیں بھی ایک ایسی قوت ہیں کہ جب کبھی انسان ان کی زد پر آتا ہے تو سارے سہارے کھو بیٹھنے کے بعد خدا کی طرف بڑے سچے والہانہ جذبے سے رجوع کرتا ہے۔ آج بھی جب جہاز تباہی کے طوفان میں گھر جاتے ہیں تو جدید الحاد پسند انسان بھی خدا کو یاد کرتا ہے اور بارہا خدا اپنے بے بس بندوں کی دکھ بھری فریادیں سن کر ان کو بچا نکالتا ہے لیکن بچ نکلنے کے بعد کم ہی ہیں جو راہ حق پر "مُقْتَصِدٌ" بن کے چلتے ہیں' بقیہ پھر جمود میں پڑ جاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ علم النفس کا ایک باب ہے مگر اپنی ایک خاص غایت کے ساتھ۔ اسی غایت کو سامنے رکھ کر نفسیات کا علم مدون کرنے کی' نفسیات کا تعلیمی نقشہ بنانے کی اور نفسیات کا نصاب ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ اس غایت عبرت اندوزی اور خداشناسی کو مقصود بنائے بغیر نفسیات کا علم مدون کرنا یا اس کا سلسلہ تعلیم و تعلم جاری رکھنا اسلامی نقطۂ نظر سے قطعاً بے سود بلکہ الٹا مضر ہے۔

اسلامی نظام تعلیم کی اولین غایت خدا اور اس کی صفات اور اس کے حقوق کی معرفت دینا ہے۔ وہ خدا جس کا مقام یہ ہے کہ:

- اللہ ہی ہے جو قیامت (کی گھڑی) کا علم رکھتا ہے۔
- وہی ہے جو مینہ برساتا ہے۔
- وہی ہے جو یہ جانتا ہے کہ رحموں کے پردے میں کیا کچھ ہے۔ (آیت ۳۴) اور اس

کے بالمقابل انسان ـــــ عقل کے اس پتلے ـــــ کا حال یہ ہے کہ:

- کسی جان کو نہیں معلوم کہ کل وہ کیا کرے گی۔
- کسی جان کو نہیں معلوم کہ وہ زمین کے کس حصے میں دم توڑے گی۔ (آیت: ۳۴)

کائنات اور زندگی کے سارے احوال کا مکمل علم صرف اللہ کو ہے۔ ﴿إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾ (آیت: ۳۴)

یہ ہے وہ مزاج جس سے ہمارے نظام تعلیم کو آراستہ ہونا چاہیے' اس نقطۂ نظر سے معلومات مرتب ہونی چاہئیں اور پھر بعد کی نسلوں کی طرف منتقل ہونی چاہئیں۔

اسی سورہ میں آتا ہے کہ اگر زمین کے سارے کے سارے درختوں سے بیشمار قلم بنا لیے جائیں اور ساتوں سمندر روشنائی میں بدل لیے جائیں اور لکھنے کے اس سامان کے ساتھ ''كَلِمَاتُ اللّٰهِ'' (آیت:۲۷) یعنی خدا کی نعمتوں' اس کی قدرتوں' اس کی آیتوں' قوانین و نوامیس' اس کے احکام اور فیصلوں' اس کی مخلوقات کے احوال کو قلمبند کیا جانے لگے تو روشنائی کے سمندر ختم ہو جائیں گے اور قلم گھس گھس کر نابود ہو جائیں گے مگر خدا کے کلمات احاطۂ تحریر میں نہ آ سکیں گے۔ ذکر تو اس کے مقامِ عظمت' اس کی قدرت کی لامحدود وسعتوں اور اس کی بے پایاں تخلیقات کا ہے۔ لیکن ایک واضح اشارہ یہ ہے کہ اصل کاوش کا میدان انسان کے لیے یہی ہے کہ وہ کلمات الٰہی سے اپنا دامن علم و ایمان بھرتا رہے۔ افراد اور قومیں اور نسلیں اپنی محنتیں اس مقصد پر کھپاتی چلی جائیں۔

''کیا اور جہاں میں رکھا ہے' اس جان جہاں کی بات کریں''

اسلامی نظام تعلیم کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ اپنے زیر اثر ذہنوں میں تحریک پیدا کرے کہ وہ مطالعۂ آفاق و انفس کریں تو اس مقصد سے کریں کہ کلمات الٰہی کی جستجو کرنی ہے' ان کو سمجھنا ہے اور ان سے روشنی اور قوت حاصل کرنی ہے۔

شکر کا رویہ اختیار کرنے والے خدا پرست ہی بلحاظ خیالات اور بلحاظ کردار مقام فلاح و سعادت پا سکتے ہیں اور انہی کے ذریعے عدل و احسان کی بنیادوں پر وہ نظامِ رحمت چل سکتا ہے جس کے سائے میں ہر متنفس کو سکھ ملے۔

خدا پرستانہ اساسی حقیقت کے اس جزو کو بھی ہمیں اپنے نظام تعلیم کے ذریعے اپنی نسلوں تک منتقل کرنا چاہیے۔ قرآن نے خدا پرستی اور رویہ شکر کو اندھا دھند طریق سے منوانا

نہیں چاہا ہے' بلکہ اس کے لیے عقلی دلائل بھی دیئے ہیں' کائناتی شواہد کو بھی اس کی تائید میں سامنے رکھا اور ہزار ہا سال کی تاریخ اقوام وملل کے سبق آموز احوال سے بھی اس کی پشت پناہی کی ہے۔ ہمیں بھی ان تینوں طرح کے دلائل کو نصابی ضروریات کے مطابق جمع اور مرتب کر کے اپنی اولاد کے قلوب اور دماغوں تک پہنچانا چاہیئے تاکہ وہ بات کو پورے شعور کے ساتھ بہ رضا ورغبت مانیں۔

خدا پرستی اور شکر للّٰہ کا رویہ' جہاں تقاضائے حق و صداقت ہے' وہاں ہماری اپنی ضرورت بھی ہے۔ یعنی سکھ چین اور امن وعدل اور مساوات واخوت کی پاکیزہ زندگی اس کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ اقوام ماضیہ کی مثالوں کے علاوہ خود اس دور کی بڑی بڑی قوتوں کے ہاں تعلیم کے فروغ' سیاست وقانون' اخلاق ومعاشرت کو منضبط کرنے والے موثر اداروں میں سائنس کی ترقی اور مادی وسائل کی کثرت کے باوجود ایک ایسا ذہنی' اخلاقی' تہذیبی اور معاشرتی بحران برپا ہے کہ دنیا کے کسی گوشے میں انسان کے لیے امن وسکون نہیں رہا۔ وہ ہر جگہ مضطرب ہے اور ناقابل اصلاح احوال کے قفس کو توڑنے کے لئے ایسی دیوانہ وار حرکات کر رہا ہے کہ معاملہ اور بگڑ جاتا ہے۔ ایسے بحران سے وہی تمدن بچا رہ سکتا ہے جس کی اساس شکر للّٰہ پر ہو۔

اس موقع پر ایک اہم آیت کو سامنے لانا مفید ہوگا۔ خدا کا ارشاد ہے کہ ﴿مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا﴾ (طٰہٰ:۱۲۴) یعنی جس کس نے میری یاد چھوڑ دی اور مجھے بھلا دیا یعنی میری ہدایت اور میرے احکام سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا' اسے تنگی اور بدحالی کی زندگی گزارنی ہوگی۔ یہاں لفظ معیشت سے بعض لوگوں نے مجرد رزق مراد لیا ہے' مگر فی الحقیقت مراد پوری مادی وجسمانی زندگی اور اس کے تمام لوازم ہیں۔ اس آیت کا صحیح مفہوم آج کی ترقی یافتہ اقوام کے پرشکوہ تمدنوں نے اچھی طرح واضح کر دیا ہے۔ جن کے سایے میں بسنے والے انسان طرح طرح کے اضطرابات' پریشانیوں' پست جذبوں' تعصبات' رقابتوں' جرائم اور ذہنی بیماریوں کا شکار ہیں۔ کہیں غربت وافلاس نے انسانوں کو جانور بنا دیا ہے اور کہیں امارت وخوشحالی کے ردعمل نے انہیں حیوانیت کی طرف دھکیل دیا ہے۔ اطمینان نہ یوں ہے' نہ دوں۔ شکر خدا کے رویے سے انحراف کا یہ نتیجہ جا بجا مختلف عبرتناک شکلوں میں ہمارے سامنے ہے۔

خشیت

شکر دین کا اگر ایک پہلو ہے تو دوسرا لازمی پہلو خشیت ہے۔احسان کی قدر از خود احسان کے چھن جانے کا اندیشہ پیدا کرتی ہے۔سو جہاں خدا کی رحمت کے لیے تمنائے بے تاب موجود رہنی چاہیے۔وہاں رحمت سے محرومی کی فکر بھی کارفرما ہونی چاہیے۔آدمی رحمت الٰہی کے نشے میں پڑ کر بعض اوقات اپنی ذمہ داریاں بھول جاتا ہے اور جب یکایک قہر کی بدلیاں چمکتی دیکھتا ہے تو حواس کھو بیٹھتا ہے۔ ﴿وَاِذَآ اَنۡعَمۡنَا عَلَى الۡاِنۡسَانِ اَعۡرَضَ وَنَاٰبِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـــُٔوۡسًا﴾ (بنی اسرائیل:۸۳) پس خشیت کا جذبہ ایک پاسبان جذبہ ہے اور یہ آدمی کو مختار اور چوکنا رکھتا ہے۔اسے برسرِعمل لانے کے لیے آخرت کے محاسبے کا تصور دلایا گیا ہے۔سورۂ لقمان میں انتباہ دیا گیا ہے کہ:

- معاملات کا آخری فیصلہ اللہ کی بارگاہ میں ہوگا۔(آیت:۲۲)
- اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو اور اندیشہ رکھو اس دن کا جس دن نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کے کام آئے گا اور نہ بیٹا اپنے باپ کے لیے کچھ مفید ہو سکے گا۔ یقیناً خدا کا وعدہ سچا ہے۔سو تم کو دنیوی زندگی دھوکے میں نہ ڈالنے پائے اور تم کو اللہ کے بارے میں وہ دغاباز (شیطان) کسی فریب میں مبتلا نہ کر دے۔(آیت:۳۳)

بہت سے مغالطے صاف کرنے کے لیے یہ بھی جتا دیا کہ لکھوکھہا انسانوں کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنے میں خدا کو کوئی مشکل درپیش نہیں ہے:

- تم سب کو بنانا اور تم سب کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے بس ویسا ہی ہے جیسے ایک فرد کا!(آیت:۲۸)

> اور حضرت لقمان بھی اپنے فرزند کو خدا کی مضبوط گرفت سے یوں آگاہ کرتے ہیں کہ: اے میرے بیٹے! اگر رائی برابر بھی کوئی چیز کسی پتھر کے اندر ہو یا آسمانوں میں یا زمین میں (کہیں) ہو تو اللہ (جب چاہے) اسے لا حاضر کرے۔ (آیت:۱۶)

اسلامی زندگی خدا کے محاسبے اور خدا کی گرفت کا خوف رکھے بغیر نہیں بنتی۔اسلام کا انسان مطلوب وہی ہے جو محاسبہ آخرت کو ذہن میں رکھ کر سوچتا' زبان کھولتا اور عملی سرگرمیاں

جاری رکھتا ہے۔ وہ ادنیٰ' ادنیٰ وقتی مفادات کے بجائے' خدا کی رضا جیسا اونچا منتہا سامنے رکھتا ہے۔

اسلامی نظام تعلیم پر بھی واجب آتا ہے کہ وہ اس خشیت سے دلوں کو آراستہ کرے' محاسبہ آخرت کا احساس تازہ کرے اور رضائے الٰہی پر نگاہوں کو مرتکز کرا دے۔ حکمت اور نیکی کے لیے یہ خشیت ایک لازمی بنیاد ہے۔

توحید

حضرت لقمان کی معلمانہ شخصیت میں سموئی ہوئی اساسی حکمت کو تمہید کے طور پر بیان کرنے کے بعد قرآن وہ نکات پیش کرتا ہے جن پر حضرت لقمان کی دی ہوئی تعلیم مشتمل تھی۔

> ان میں سے اولین نکتہ یہ ہے کہ اے میرے عزیز بچے! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا کیونکہ بالیقین شرک ایک ظلم عظیم ہے۔ (لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ) (آیت:۱۳)

ظلم کہتے ہیں حق ماری کو۔ یہ خدا کی حق ماری ہے اور اس لیے بہت بڑی حق ماری ہے کہ اس کا کھا کر گن دوسروں کے گائے جائیں۔

خدا کے احسانات کے جواب میں شکر اور احسان شناسی کا رویہ صرف توحید کو تسلیم کرنے ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ ورنہ اگر خدا کے عطیات سے استفادہ کر کے احساس شکر پورے کا پورا اس کے حضور پیش کرنے کی بجائے کچھ دوسری مفروضہ ہستیوں پر تقسیم کر دیا جائے تو جس کا حق واجب تھا اس کا حق تو ادا نہ ہوا' اور جن کا حق کچھ بھی نہ تھا ان تک بے جا طور پر جا پہنچا۔

خدا پرستی اور شکر للّٰہ کے رویے سے فرار کا سیدھا سیدھا راستہ انکارِ خدا ہے' مگر دنیا میں اسے بہت کم لوگوں نے اختیار کیا ہے' انسانوں کی اکثریت خدا کو ماننے کے بعد اس کے حقوق واحکام سے بھاگنے کے لیے شرک کا چور دروازہ استعمال کرتی رہی ہے۔ خدا کا وجود کسی صورت میں تسلیم کرنے کے بعد چاہے کوئی شخص بتوں اور دیوتاؤں اور روحوں اور تاریخی شخصیتوں کو خدائی صفات وحقوق کے مقام پر رکھے' چاہے وہ وقت کی کسی مسلط سیاسی' مذہبی' قبائلی یا قوم پرستانہ قوت کے سامنے سر جھکائے' چاہے وہ آج کل کے دور میں ریاست کے ادارے یا کسی خاص نظام کو خدائی کا مرتبہ دے' اور چاہے تو وہ خود اپنے نفس کو الٰہ بنا لے' شرک

کی یہ تمام صورتیں خدا پرستی اور رویہ شکر کو ختم کر دیتی ہیں۔

اسی وجہ سے شرک کو ظلم عظیم کہا گیا ہے کہ خدا کی صفات وحقوق کو جواز کی کسی سند و دلیل کے بغیر انسان کچھ دوسری مفروضہ حقیقی یا خیالی ہستیوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

خدا کا انکار کرنے والوں کا معاملہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص کسی حکومت کا وجود اصولاً تسلیم ہی نہ کرتا ہو اور شرک کرنے والوں کی مثال ایسی ہے جیسے کچھ لوگ کسی حکومت کو ماننے کے بعد اس کے شہری بن کر پھر کچھ اغیار کو حاکمیت و اختیار میں حصہ دار قرار دے کر ان سے احترام و اطاعت کا تعلق رکھیں۔ یہ کسی نظم کو اندر سے تباہ کرنے کی خوفناک شکل ہے۔

اسلامی نظامِ تعلیم کو خدا پرستی کی تعلیم دیتے ہوئے اپنے سارے نصابی مواد کو اس طرح اصولِ توحید پر مرتب کرنا چاہیے کہ خدائی صفات وحقوق میں طالب علم کو کوئی دوسرا حصہ دار نہ دکھائی دے۔

سماجی روابط کی درستی

خدا کے بالاتر حق کی تلقین کے بعد انسانوں میں سے سب سے اہم حق کا بیان کیا گیا ہے، اور اس اولین انسانی رابطے کی صورت متعین کی گئی ہے جس کی صحت پر باقی سارے تمدنی رابطوں کی درستی کا انحصار ہے۔ یعنی والدین کی اطاعت کا اصول۔

اس اصول کو بیان کرتے ہوئے حضرت لقمان کی روایت کردہ گفتگو کے درمیان وضاحتِ مدعا کے لیے ایک جملۂ معترضہ کے طور پر خدا تعالیٰ نے اپنی طرف سے بتایا ہے کہ ہم نے انسان کو والدین کے بارے میں نصیحت کی ہے ﴿وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ﴾ (آیت:۱۴) پھر اولاد کے لیے ماں باپ کی قربانیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ماں کے اس دورِ تکلیف کا خصوصی ذکر کیا گیا ہے جو وہ بچے کی پیدائش اور ابتدائی پرورش کے لیے اٹھاتی ہے۔ ﴿حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ﴾ اس کے بعد فرمایا کہ والدین کے لیے اولاد کو ہماری وصیت یہ ہے کہ میرا شکر بجالانے کے ساتھ ساتھ میرے ہی حکم پر میرے ہی دائرہ اطاعت کے اندر مقررہ محدود دائرے میں ان کا بھی شکر ادا کرو۔ یعنی جس طرح بڑے پیمانے پر خدا کے لیے رویہ شکر اختیار کرنا لازم ہے، اسی طرح اس بڑے دائرے کے اندر چھوٹے دائرے میں والدین کے لیے بھی شکر کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

حضرت لقمان خدا کا مطالبہ یوں بیان کرتے ہیں کہ:

''میرا شکر ادا کر اور (میرے بعد) اپنے والدین کا بھی''! (آیت:۱۴)

سماجی رابطوں میں دین حق نے والدین کو اولین مقام دیا ہے' خدا کے عظیم حق کے بعد جو شخص والدین کے حق کو بھی پہچان لیتا ہے' پھر وہ دوسرے تمام رابطوں کے حقوق کا احساس کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے کردار میں یہ جذبہ احسان شناسی اس اصل الاصول کی حیثیت سے پیوست ہو جاتا ہے کہ مجھے ہر بھلائی کا جواب بھلائی سے دینا ہے۔ مجھے جس سے فائدہ اٹھانا ہے اس کو فائدہ پہنچانا بھی ہے۔ جس سے میں کچھ لیتا ہوں اسے دینا بھی ہے' گھر' خاندان' معاشرہ اور اس کے ادارات' حکومت' قوم اور انسانیت سبھی سے آدمی کو بے شمار فائدے پہنچتے ہیں اور اگر وہ احسان شناس ہو تو وہ ہر استفادہ کے جواب میں کوئی نہ کوئی خدمت پیش کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ والدین کا جس نے حق پہچانا' پھر وہ خاندان اور ذوی القربیٰ اور پڑوسیوں اور افسروں اور ماتحتوں' بلکہ جانوروں تک کے حقوق کا احساس کرنے لگتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے تمام سماجی روابط کی درستی کا دارومدار والدین کا حق پہچاننے پر ہے۔

لیکن والدین کی طاعت و خدمت خدا کی عبادت و اطاعت سے نچلے مرتبہ پر ہے۔ مقدم خدا کا حق ہے۔ خدا کا حق مار کر اگر والدین کا حق ادا کیا جائے تو شرک کی راہ کھل گئی۔ خدا کے شکر کے ساتھ والدین کا شکر کا تقاضا سامنے آنے سے شرک کا جو اندیشہ پیدا ہو سکتا تھا اسے نہایت وضاحت سے رفع کر دیا گیا ہے' جیسا کہ ہم اگلے نکتے میں عرض کر رہے ہیں۔

والدین کے لیے جذبۂ شکر اور رویۂ محبت و اطاعت کا مطالبہ کرنے کے ساتھ ساتھ خدا نے ایک دوٹوک اصولی بات کہہ دی ہے۔ وہ یہ کہ اگر وہ تجھ سے اس بات کا تقاضا کریں اور زور ڈالیں کہ تو کسی ایسی ہستی کو میرا شریک ٹھہرا جس کے بارے میں تیرے سامنے کوئی قطعی علم نہیں ہے کہ وہ میرے ساتھ کسی درجے میں شریک ہے تو اس صورت میں ان کی اطاعت سے انکار کر دے۔ ﴿وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾ (آیت:۱۵) اس صورت میں خود والدین بھی اپنے آپ کو درحقیقت خدا کا شریک بنا رہے ہوتے ہیں' کیونکہ وہ خدا کے حکم کے خلاف اپنا ایک مطالبہ منوانے پر اصرار کرتے ہیں۔

سب سے بڑے انسانی تعلق کو بیان کرتے ہوئے اور حقوق والدین پر زور دیتے

ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہ واضح کر دیا کہ جب وہ خدا کے خالق' رازق' مالک یا فرماں روا ہونے میں یا اس کی ان صفات جو خدا کے لیے خاص ہیں کسی اور کو شریک تسلیم کرنے کے لیے مجبور کریں یا ایسے احکامات کی اطاعت کا حکم دیں جو خدا کے احکام سے ٹکراتے ہوں تو ان کی اطاعت واجب نہیں یہاں یہ اصول خود بخود اخذ ہو جاتا ہے کہ خدا کے احکام کے خلاف کسی دوسری طاقت کا حکم اگر سامنے آئے تو وہ قابل استرداد ہے۔ یہی اصول ہے جسے ''لا طاعته لمخلوق فی معصیته الخالق'' کے الفاظ میں واضح کیا گیا ہے' یعنی کسی مخلوق کے کسی حکم کی اطاعت کرنے سے اگر خدا کی معصیت و نافرمانی سرزد ہوتی ہو تو مخلوق کا وہ حکم قبول نہیں کیا جائے گا۔

والدین' اساتذہ' حتیٰ کہ حکام وعمال اور قائدین اور علماء میں سے کسی کا یہ کام نہیں کہ وہ نئی نسلوں کو خدا کے دین سے ہٹا کر کسی اور دین کی طرف موڑنے کی جبری کوشش کریں۔ ان کا کام صرف خدا پرستی' توحید' اطاعت الٰہی اور شرک سے اجتناب سکھانا ہے۔ اس لیے والدین یا کسی اور کی خاطر ان کے پسندیدہ دین کو (جب کہ وہ خدا کے دین کے خلاف ہو) اختیار نہیں کیا جا سکتا۔

ایک خاص صورت میں والدین کی اطاعت سے انکار کر دینے کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہ بھی چاہا کہ اس حالت میں بھی اولادوں کی طرف سے والدین کے لیے عام دنیوی معاملات میں خدمت اور حسن سلوک کا رویہ برقرار رہنا چاہیے۔ ان کی مالی مدد بھی جاری رکھی جا سکتی ہے' ان کی ہر تکلیف میں ان کی خدمت کی جانی چاہئے' ان کی بیماری میں ان کے علاج کا انتظام بھی کرنا چاہئے اور جی جان سے ان کی تیمارداری بھی کرنی چاہیے۔

یہاں سے یہ اصول بھی اخذ ہوتا ہے کہ کسی مسلمان کا یہ کام نہیں کہ وہ دینی اختلاف کی بنا پر قابل احترام بنیادی تمدنی و معاشرتی رابطوں کو توڑ دے۔ عام معاملات میں ماں باپ' اساتذہ' رشتہ داروں' محلہ داروں' ازواج' اولاد' کاروباری شرکاء' ملازمین' افسروں اور سفر کے ساتھیوں کے ساتھ درجہ بدرجہ بلا امتیاز عقیدہ و مذہب حسن سلوک اور خدمت کا رویہ نبھانا چاہیے[1]۔

---

[1] یہ رویہ درست نہیں کہ محض نقطہ ہائے نظر کے اختلاف کی وجہ سے حسن معاملات کو ترک کر دیا جائے' بجز اس کے کہ کسی خاص صورت کے لیے ایسا حکم ہو۔

اسلامی نظام تعلیم کے تیار کردہ انسان میں یہ خوبی موجود ہونی چاہئے کہ وہ فکر و اعتقاد اور مذہب و مسلک کے اختلافات کے باوجود تمدنی و معاشرتی رابطوں کو نبھائے اور جو درجہ جس تعلق کو دیا گیا ہے اس کے مطابق امکانی خدمت انجام دے۔

خدا پرستانہ جادۂ حیات اختیار کرنے والوں کے لیے ایک ہی اہم انسانی رابطے کا بیان آدمی کے لیے ایک حالتِ آزمائش پیدا کر دیتا ہے یہاں تین باتیں اکٹھی ہو گئیں۔

- والدین کی اطاعت (شکر) کرو۔
- ایک استثنٰی یہ ہے کہ اگر وہ کسی کو خدا کا شریک بنانے یا کسی مشرکانہ دین کی طرف بلانے کے لیے حکم دیں تو یہاں اطاعت سے انکار کرو۔
- مندرجہ بالا صورت میں انکارِ اطاعت کے باوجود دنیوی تعلقات کے لحاظ سے پوری طرح حسن سلوک اور خدمت کا تعلق قائم رکھو۔

ان تین تقاضوں میں سے اگر کسی پر بھی ضرورت سے زیادہ زور دیا جائے تو کوئی دوسرا تقاضا لازماً کمزور ہو جائے گا۔ ان کو توازن سے ملحوظ رکھنا انسان کی ذمہ داری ہے۔ یہ ذمہ داری چونکہ بڑی بھاری ہے اس وجہ سے خداتعالیٰ نے یہ کہہ کر متنبہ کر دیا کہ تمہیں زندگی گزارنے کے بعد میرے حضور میں پیش ہونا ہے (اِلَیَّ الْمَصِیْرُ) (آیت:۱۴) اور پھر یہ کہہ کر بات کو مزید کھول دیا کہ جب تم میرے پاس حساب دینے کے لیے حاضر ہو گے تو میں تمہارا نامۂ اعمال تمہارے سامنے رکھ کر بتا دوں گا کہ تم کیا عمل کرتے رہے' کس روش پر چلتے رہے اور کہاں کیا گڑبڑ کی۔ ﴿فَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (آیت:۱۵)

جس تعلیم کا ایک سرا توحید تھا اس کا دوسرا اہم سرا آخرت ہے۔ ایمان بالآخرۃ کو اگر نظام دین سے الگ کر دیا جائے تو سب کچھ بے اثر ہو کے رہ جاتا ہے۔

اگر آدمی پر یہ واضح ہو کہ اس کا ایک خدا ہے اور وہ نعمتوں سے برابر نوازنے والا ہے اور اس نے کوئی نظام ہدایت اور کوئی ضابطۂ خیر و شر مقرر کیا ہے' لیکن نہ تو اس کے اعمال کا کوئی ریکارڈ رکھا جا رہا ہے' نہ ان اعمال پر کوئی باز پرس ہونی ہے' نہ کسی عدالت سے ان کی جزا و سزا ملنی ہے تو پھر بہ طور ایک مفروضہ کے کسی شخص کا خدا پرستی اور پابندئ اخلاق کی راہ اختیار کرنا اور اپنی بے شمار خواہشوں اور فائدوں کی قربانی دینا اور ساری عمر بدی کے خلاف رزم آرا رہنا' محض اس کا ایک رضا کارانہ مسلک ہوگا اور ایسے رضا کارانہ مسلک پر مدت العمر تک بغیر انحراف کے سیدھا چلتے رہنا فرشتوں کی سی فطرت چاہتا ہے۔ اگر انسانیت ایسے دو چار فرشتے

پیدا کر بھی دے تو خدا پرستی بلا تصور آخرت میں یہ قوت نہیں ہے کہ وہ کسی معاشرے کی اکثریت کو خیر و فلاح سے آراستہ کر دے۔ بگڑتے ہوئے معاشرے کے لیے دو چار فرشتہ صفت انسانوں کو سامان زینت تو بنایا جا سکتا ہے' لیکن اس طرح نظام حیات کو عدل پر قائم کرنے کی راہ نہیں نکلتی۔ بلکہ کوئی بھی فاسد معاشرہ اکا دکا فرشتہ خصلت آدمیوں کے وجود کو اپنے لیے وجہ پریشانی سمجھتا ہے۔ جیسا کہ حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام اور دوسرے متعدد انبیائے برگزیدہ کو ان کی کج شعار اقوام برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھیں۔

پس تعمیر انسانیت اور اصلاح معاشرہ کے لیے عدالتی طرز کے محاسبۂ اعمال اور باقاعدہ جزا و سزا کا عقیدہ انتہائی درجہ کی اہمیت رکھتا ہے۔[1]

---

[1] آخرت سے صریح انکار کرنے والے لوگوں کی تو تاریخ انسانی میں ایک معمولی اقلیت ملے گی' بیشتر لوگوں نے آخرت کا انکار کیے بغیر کچھ ایسے عقائد و تصورات گھڑ لیے کہ اصل عقیدہ آخرت بے اثر ہو گیا۔

- کچھ لوگوں نے آخرت کو دور کی چیز کہہ کر غیر اہم قرار دے دیا' اور اس عقیدے کو بے جان بنا کر ذہن کے بہت پچھلے حصے میں دھکیل دیا۔
- کچھ لوگوں نے کفارہ کا عقیدہ اختیار کر کے ہر قسم کے اعمال کے باوجود آخرت میں اپنی نجات کا فیصلہ اسی دنیا میں خود ہی کر لیا۔
- کچھ لوگوں نے شفاعت کے صحیح اور محدود تصور کو بدل کر یہ شکل دے لی کہ وہ جس نبی یا بزرگ کے عقیدت مند ہیں اس کو ماننے کے بعد وہ جتنی اور جیسی بھی بد اعمالیاں کر لیں' قیامت کے دن ان کا شفیع ان کے انتظار میں کھڑا ہو گا اور پکارے گا کہ آؤ اے گنہ گارو! بدکارو! جرائم کیشو! انسانیت دشمنو! ضعیف آزارو! لٹیرو! درندو! چورو' ڈاکو! زانیو' قاتلو! خائنو' راشیو! منافقو! تفرقہ پردازو! میرے پاس آؤ۔ خوشی سے جھومتے ہوئے آؤ کہ میں تمہارے گناہ بخشوانے کے لیے کھڑا ہوں۔ گویا ان لوگوں کے نزدیک خدا کی طرف سے جاری کردہ نظام ہدایت اور سلسلہ نبوت و الہام کا مقصد ہی یہ ٹھہرا کہ ہمارے داعی ہدایت اور پیغمبر وقت اور ہمارے بندگان متقی سے عقیدت رکھنا ایک لائسنس ہے آزاد زندگی گزارنے کا۔
- کچھ لوگوں نے آواگون یا تناسخ کا وہ نظریہ پیش کیا جس میں انسان کو اس کے مختلف جنموں کے اعمال کی سزا بغیر کسی عدالتی کارروائی کے آٹومیٹک طور پر ملتی چلی جاتی ہے اور وہ اس چکر سے کسی طرح نکل نہیں سکتا۔ اسے معلوم نہیں کہ پچھلے جنم میں وہ کیا تھا اور اس نے کیا اعمال کیے تھے جس کی سزا میں اس کو کتنے جانداروں کی شکل میں کتنے مختلف جنم لے کر ان کا حساب بھگتنا ہے۔ سزائے اعمال کا یہ غیر عدالتی آٹومیٹک سسٹم انسان کے لیے امید اصلاح اور اس چکر سے نجات کے دروازے بند کر ←

والدین کے ساتھ طرز معاملہ کو متعین کرتے ہوئے مسلک زندگی کے متعلق ایک اہم اصول متعین کر دیا گیا۔ جہاں یہ واضح کیا کہ والدین جو تمدنی زندگی کے دائرے میں سب سے زیادہ قابل احترام واطاعت ہیں، وہ بھی اگر شرک (یا کفر یا معصیت) اختیار کرنے پر زور دیں تو اس معاملے میں انکار کر دو، وہاں یہ ہدایت دی کہ اپنا عقیدہ حیات، اپنا مسلک حیات اور اپنا اخلاقی رویہ اختیار کرنے کے لیے کسی ایسے شخص کے راہ عمل کی پیروی کرو جو میری طرف (یعنی خدا کی بندگی کی روش اختیار کر کے عاجزی سے جھکنے والا ہو)۔ (وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ) عاجزی سے خدا کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا نمونہ پیش کرنے والا بدرجۂ کمال تو کوئی نبی ہی ہو سکتا ہے، اور اس سے نیچے اتر کر ہر وہ پیرو تعلیم و اسوۂ نبی آتا ہے جو خود اللہ کے سامنے عاجزی سے سر تسلیم خم کر کے زندگی گزار رہا ہو اور اسی مسلک کے لیے نبی کی تعلیمات اور نبی کے اسوۂ کی طرف دوسروں کو دعوت دے۔

کسی بھی خدا پرست آدمی کو فلسفۂ حیات، یا طریق حیات یا ضابطۂ حیات کا درس صرف نبی سے براہ راست یا اس کے پیروؤں کے ذریعے لینا چاہیے۔ صحیح خدا پرست معاشرے میں گھر اور معبد سے لے کر سیاست اور معیشت کے دائروں تک ہر جگہ یہی اصول کام کرے گا۔ اور جو کوئی کسی اور نظریہ و مسلک کی طرف بلائے تو اس کے متعلق وہی حکم ہو گا کہ ایسی دعوت کا اتباع نہ کرو۔ (فلا تطع)!

"وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ" (آیت:۱۵) ہم کو یہ سبق بھی ملتا ہے کہ زندگی میں پیروی کرو تو صرف ایسے ہی رہنماؤں کی جو خداوند تعالیٰ کی طرف رجوع رکھنے والے ہوں۔ زندگی کے اصول و اقدار انہیں سے لو۔ یہاں اشارہ یہ بھی ہے کہ اسلامی معاشرہ میں سیاسی اور ذہنی قیادت کے مناصب ایسے افراد کو سونپے جائیں جن کی زندگیاں رجوع الی اللہ کی آئینہ دار ہوں۔ گویا معیار انتخاب بھی متعین ہو گیا۔ علاوہ ازیں یہ اشارہ بھی یہاں سے اخذ ہوتا ہے کہ ہمیں درسگاہوں کے معلمین بھی ایسے ہی لینے چاہئیں جو رجوع الی اللہ کی صفت سے متصف ہوں، کیونکہ طلبہ ان کے اتباع میں چلیں گے۔

← دیتا ہے۔ نتیجۃً وہ بے بسی کی حالت میں نیکی بدی سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ آخرت کے غلط تصورات عملاً وہی نتیجہ پیدا کرتے ہیں جو صحیح عقیدۂ آخرت کے انکار کا ہے اور یہی چیز ان تصورات کے باطل ہونے کی علامت ہے۔

اس ہدایت کی روشنی میں ایک اسلامی نظام تعلیم کو ان امور کی تربیت دینی چاہیے۔

- خدا کی اطاعت کے تحت سب سے بڑھ کر والدین کی اطاعت اور پھر درجہ بدرجہ دوسرے تمام روابط کے حقوق کو پورا کرنا۔
- خدا کی اطاعت سے اگر والدین یا کسی دوسرے کا حکم ٹکرائے تو اسے قبول کرنے سے انکار کرنا۔
- اعتقاد و مسلک کے اختلاف کے باوجود جائز دنیوی معاملات کی حد تک سماجی رابطوں کو نبھانا۔
- زندگی کے سفر میں صرف ایسے عناصر کی رہنمائی قبول کرنا جو خدا کی طرف رجوع دلانے والے ہوں۔

ان نکات میں ہماری سوکس Civics کی تربیت ہونی چاہیے۔

اسلام کا انسان مطلوب

آیئے سب سے پہلے ہم اس سورہ کے آئینہ میں اسلام کے انسان مطلوب کی ایک جھلک دیکھیں۔ سورۂ کے دیباچہ ہی میں انسانیت کے اس بہترین کردار کا ذکر موجود ہے جسے ظہور دینے کے لیے الہامی حکمت تقاضا کرتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں اور ان آیات میں جو ہدایت و رہنمائی ہے اور اس ہدایت و رہنمائی میں جو رحمت مضمر ہے وہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو احسان کیش ہوں۔ قرآن کا نظام فکر و عمل صرف محسنین کے ذریعے چل سکتا ہے اور یہ نظام اسی طرز کے قائدین و کارکن مانگتا ہے۔ (آیات ۱ تا ۳)۔ ان کے نقشۂ زندگی کے چند اہم آثار بھی بیان کر دیئے کہ:

- وہ نماز قائم کرنے والے ہوں۔
- وہ زکوٰۃ دینے والے ہوں۔
- وہ آخرت کو پیش نظر رکھنے والے ہوں۔ (آیت:۴)

بیان کی نوعیت احاطہ و احصار کی نہیں بلکہ مدعا یہ ہے کہ ان ناگزیر اوصاف کے بغیر احسان کیش کردار پیدا نہیں ہو سکتا۔ ''ایسے ہی لوگ ہیں جو اپنے رب کے دیئے ہوئے نظام ہدایت پر چل سکتے ہیں اور ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔'' (آیت:۵)

واضح رہے کہ محسن یا احسان کیش کا مفہوم اسلامی اصطلاح میں یہ ہے کہ آدمی اپنے ہر خیال، عمل اور سرگرمی میں حسن و خوبی پیدا کرنے کا اہتمام کرے اور اپنی ساری کی ساری داستان حسن اعتقاد اور حسن کردار سے آراستہ کرے۔ پھر بات انفرادی اور نجی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ مطلوب یہ ہے کہ ہمارا پورے کا پورا تمدنی نظام اس کے سارے شعبے اور ادارے اور ہماری جملہ اجتماعی سرگرمیاں حسین ترین پیرایہ رکھتی ہوں۔ یعنی اسلام حسن فکر اور حسن عمل کا ایک مکمل نظام مانگتا ہے۔ وہی چیز جسے دوسری جگہ حیات طیبہ کہا گیا ہے۔ ایسے انسانی کردار اور ایسے نظام تمدن کے ذریعے ہی انسان کو فلاح حاصل ہوتی ہے۔ زندگی اپنے تقاضوں کو صحیح طور سے پورا کرتی ہے اور انسانیت اپنے فطری مقاصد تک پہنچتی ہے۔ فلاح! اس دنیا میں بھی اور فلاح آخرت میں بھی۔ اس دنیا میں '' حیات طیبہ'' کا حصول بجائے خود فلاح کی آخری شکل ہے۔ یہی حیات طیبہ اُخروی فلاح کی ضامن ہوتی ہے۔

گویا ہمارے نظام تعلیم کا منتہا ایسے احسان کیش کرداروں کی تشکیل ہے جو نماز، زکوٰۃ اور فکر آخرت کے اوصاف کو بنیاد بنا کر حیات طیبہ پیدا کریں اور اپنی ذات سے لے کر بڑے بڑے تمدنی ادارات تک ساری زندگی کو سنوار دیں۔

مقابل کا فاسد کردار

قرآن کا اسلوب بالعموم اضداد کو متقابلاً دکھانے کا ہے۔ اب جہاں انسان مطلوب کا نقشہ بیان ہوا، وہاں نامطلوب کردار کی بھی ایک جھلک دکھانی لازم تھی۔ مطلوب کردار تو وہ ہے جو مسلکِ احسان کا متلاشی ہے جو حیات طیبہ کے حصول کے لیے مضطرب رہتا ہے، جو ہدایت رب کو جاننا چاہتا ہے جو اس کی آیات کی روشنی کا پیاسا ہے، جو فلاح کی جستجو میں ہے اور جس کے سامنے فوری مزے اور چسکے ہی نہیں ہیں بلکہ آخرت کے نتائج بھی ہیں۔

لیکن مقابل کا کردار وہ ہے جو ''لھو الحدیث'' کا شائق ہے۔ بے مقصد اور لا حاصل قسم کے قصے کہانیوں سے اسے رغبت ہوتی ہے۔ وہ زندگی کی حقیقتوں اور اس کے مسائل سے بھاگ کر یاوہ گوئی میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ اتنا ہی نہیں کہ خود پناہ ڈھونڈتا ہو بلکہ وہ تفریحی ادب کے افسوں کو کام میں لا کر دوسروں کو بھی خدا کی راہ سے ہٹا لے جانا چاہتا ہے۔ درآنحالیکہ اس کے پلے کچھ بھی علم حقیقت نہیں ہوتا۔ اپنی جہالت کی وجہ سے وہ خدا کی راہ اور خدا کی ہدایت کا

مذاق اڑاتا ہے' وہ عظیم اور اٹل حقائق کو تمسخر میں اڑا دینا چاہتا ہے۔ (آیت :۶)۔ اس کے سامنے جب اللہ کی کتاب حکیم کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ اپنے نشۂ پندار میں بہک کر ان سے اس طرح روگردانی کرتا ہے گویا اس نے کچھ سنا ہی نہیں' گویا کہ اس کے کان بہرے ہیں۔ (آیت :۷)

ہمیں اپنے نظام تعلیم کی حکمت متعین کرتے ہوئے خوب صراحت سے طے کر لینا چاہئے کہ ہمیں اپنے ہاں اس طرز کے کردار کو پروان نہیں چڑھنے دینا ہے۔ خصوصاً علوم میں' ادب میں اور فنون لطیفہ میں ہمیں ان رجحانات کونشوونما نہیں دینی جن کا ماحصل لھوالحدیث ہو اور جن کی وجہ سے لھوالحدیث کا ذوق بڑھے۔ وہ تمام فضولیات جو فراریت پسندوں کی پناہ گاہ ہوں' جو راہ حق سے ہٹانے والی ہوں' جو آیات الٰہی کے لیے کانوں کو بہرہ کر دیں' جو خدا کے سامنے عبدیت کی بجائے استکبار کے مقام پر کھڑا کریں اور جن کی وجہ سے دلوں میں خدائی ہدایت کی تضحیک کا میلان پیدا ہو۔

عروۃ الوثقی

اپنے محدود علم قرآن کی روشنی میں میری ناقص رائے یہ ہے کہ سورۂ لقمان کی آیت نمبر ۲۲ مرکزی اہمیت رکھتی ہے اور یہی روح کلام ہے' پڑھیے:

اور جس نے اللہ کی بارگاہ میں اپنا سر تسلیم خم کر دیا اور وہ احسان کیش بن گیا تو بس اس نے ایک مضبوط رشتے کو تھام لیا......الخ

یہاں پھر ''محسن'' کی شان سامنے آتی ہے۔ کوئی شخص احسان کیش نہیں ہو سکتا اور زندگی کو حسن وخوبی سے مالا مال نہیں کر سکتا جو اللہ کے وجود کی عظیم صداقت کو نہ تسلیم کرے اور اس کا حاکمانہ مقام پہچان کر اپنی باگ ڈور اس کے حوالہ نہ کر دے۔ خدا سے یہ تعلق وہ مضبوط ترین رشتہ ہے جسے تھام لینے کے بعد زندگی تباہ کن ٹھوکروں سے بچ جاتی ہے' خیالات کی آوارگی وپریشانی' جذبات کی بے راہ روی اور اعمال کی بے ربطی کا پوری طرح ازالہ ہو جاتا ہے۔ حقیقت کے اس مرکزی نقطہ کے گرد فرد کی ساری قوتیں اور تمدن کی جملہ سرگرمیاں منظم ومرتب ہو جاتی ہیں اور نظم وترتیب کے فقدان میں کوئی حسن نہیں پیدا ہو سکتا۔

ایک صحیح نظام تعلیم کا کام یہ ہے کہ وہ انسانیت کو اس عروۃ الوثقی تک لائے اور خدا پرستی

کے رشتہ محکم کو تھامنے کی صلاحیت دے۔ اسلامی نظام تعلیم کی یہ اساسی ذمہ داری ہے کہ وہ بندوں کو خدا کے سامنے سرتسلیم پوری طرح خم کر دینا اور خم کیے رکھنا سکھائے۔ یہ حالت اس استکبار کی عین ضد ہے جو آیت ۶ میں بیان ہوا ہے۔

سورہ کی تمہید کے ساتھ مرکزی روح کلام کی آئینہ دار آیت کو ملا کر آپ دیکھ چکے۔ آیئے اب اس مربوط ٹکڑے کو لیں جس میں چند اہم نکات تسلسل سے بیان ہوئے ہیں۔ اس ٹکڑے میں حضرت لقمان اپنے صاحبزادے کو ــــــ بلکہ یوں کہیے کہ نئی نسل کو ــــــ اساسیات کی تعلیم دیتے ہیں۔[1] ایک ایک نکتہ کو الگ الگ لیتے ہیں۔

عقیدۂ آخرت

نصیحت لقمان کا اب جو حصہ آ رہا ہے وہ آخرت کے متعلق ارشاد خداوندی ہی کی تائید میں ہے۔ حضرت لقمان اپنے صاحبزادے سے فرماتے ہیں کہ اے میرے فرزند عزیز! اگر تمہارا وجود رائی کے ایک دانے کے برابر بھی ہو اور وہ کسی پتھر کے اندر مستور ہو چاہے آسمانوں میں ہو چاہے زمین میں ہو' اللہ تعالیٰ اسے پالے گا یا برآمد کر لے گا کیونکہ وہ اپنے لطیف انداز سے ہر چیز سے باخبر رہتا ہے۔ ﴿يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ﴾ (آیت: ۱۶)

انکار آخرت کرنے والوں کا نقطۂ نظر رہا ہے کہ مرنے کے بعد جب جسم گل سڑ جائیں گے اور ہڈیاں چورا ہو جائیں گی' اور سارا کچھ زرہ زرہ ہو کر کہیں سے کہیں بکھر جائے گا تو اس کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کا کیا امکان۔ یہاں بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسا لطیف وخبیر ہے کہ پوری کائنات میں رائی کے دانوں جیسے حقیر وجود بھی جہاں کہیں پائے جاتے ہیں ــــــ پتھروں میں' پہاڑوں کی کانوں میں' سمندروں کی گہرائیوں میں' خلائے بسیط میں ــــــ اللہ تعالیٰ

---

[1] اس قدیم بحث کو ہم نہیں چھیڑنا چاہتے کہ حضرت لقمان نبی تھے یا حکیم۔ بہرحال وہ خدا پرست اور صاحب ایمان تھے اور انہوں نے بالکل اللہ تعالیٰ کی الہامی ہدایت کے موافق باتیں فرمائیں اور ان باتوں کو قرآن نے قبولیت دی۔ خدا نے یہ فرما کر ان پر مہر توثیق ثبت کر دی کہ ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ﴾ (آیت ۱۲) حضرت لقمان نے خدا کی سکھائی ہوئی حکمت کے تحت گفتگو فرمائی۔

کی ہر چیز پر نظر بھی ہے اور گرفت بھی۔ وہ جسے جب چاہے اپنے سامنے حاضر کر لے خواہ وہ کہیں بھی ہو اور کسی بھی شکل میں ہو۔

اور اس کا ایک دوسرا مطلب بھی ہے کہ اگر تم کہیں چھپ چھپا کر بھی خدا کی نافرمانی کرو گے' تو یہ نہ سمجھو کہ تم اور تمہارا عمل اس کی نگاہ علم سے چھپا رہ جائے گا۔ تم کسی سنگین قلعے میں چھپ کر بھی اس کی نگاہ سے چھپ نہیں سکتے اور اس کے ہاتھ کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔

یعنی خدا پرستانہ زندگی گزارنے کے لیے یہ شعور ضروری ہے کہ ہم ہر آن خدا کی نگاہوں کے سامنے ہیں اور ہر وقت اس کی دسترس میں ہیں۔ اب لقمانی نصیحت و تعلیم کا وہ حصہ آتا ہے جو خلاصہ ہے اس مسلک کا جس کی طرف اوپر ہدایت دی گئی ہے کہ کسی ایسے شخص کا اتباع کرو جو میرے لیے بندگی و عاجزی کی روش پر چلنے والا ہو۔ ہم اس اہم حصہ کے ایک ایک جزو کو الگ الگ لیتے ہیں۔

حضرت لقمان اپنے شاگرد عزیز کو تعلیم دیتے ہیں کہ نماز قائم کرو۔ یہ خدا پرستانہ مسلک اختیار کرنے والوں کے لیے بنیادی اور مرکزی فریضہ ہے جو ان کی ساری زندگی کو منضبط کرتا ہے اور ساری زندگی کے لیے روح تحریک انگیز فراہم کرتا ہے۔

خدا پرستانہ طریق زندگی یا دین برحق کا اپنا ایک نظام تربیت ہے جس میں نماز کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے اور ترک نماز کے ساتھ اپنے آپ کو خدا پرستانہ مسلک سے وابستہ گردانا کچھ عجیب سی بات ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نماز سارا دین نہیں' لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ نماز کے بغیر دینی زندگی کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔

مثلاً فوج میں بھرتی ہونے والا سپاہی وقت آنے پر جہاد کا حق کیسے ادا کرے گا یہ تو آگے کی بات ہے' بالکل اولیں مرحلے میں دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو نظامِ تربیت کے لیے پیش کرتا ہے یا نہیں' وہ ڈسپلن کے ابتدائی تقاضے پورے کرتا ہے یا نہیں' وہ پریڈ کے لیے میدان میں آتا ہے یا نہیں' وہ اپنی ریاست و قوم سے وفاداری کے تقاضے پورے کرتا ہے یا نہیں' وہ ضروری آداب و شعائر کو اپناتا ہے یا نہیں۔ ایک سپاہی جو سپاہیانہ تربیت' ڈسپلن' پریڈ اور فوجی آداب و شعائر کو اختیار کرنے سے انحراف کرے اور پھر یہ اصرار بھی کرے کہ میں بڑا جانباز سپاہی ہوں' مجھے فوج میں شامل کیا جائے اور میں میدان جنگ میں بڑے کارنامے انجام دوں گا تو اس کے ساتھ فوجی ڈسپلن صرف یہی سلوک کرے گا کہ اسے نکال باہر کرے۔ ایسے

سر پھرے مدعیٔ سپہ گری کو کوئی فوج قبول نہیں کر سکتی۔ معلوم نہیں، ہم لوگوں نے اپنے آپ کو ترکِ صلوٰۃ کے باوجود خدا پرستانہ مسلک رکھنے والی اس فوج کا سپاہی کیسے قرار دے لیا ہے، جسے قدم قدم پر برائی کے خلاف جنگ آزما ہونا ہے۔

سو حضرت لقمان اپنے فرزند کو خدا پرستانہ مسلک کا سبق اول یہ سکھاتے ہیں کہ نماز قائم کرو! (یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ)۔ (آیت: ۱۷)

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

خدا پرستانہ مسلک کا دوسرا بڑا اصول جو مسلمان کی زندگی کا نصب العین متعین کرتا ہے، حضرت لقمان کے الفاظ میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ لوگوں کو نیکی کی تلقین کرو اور ان کو برائی سے روکو ﴿وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آیت: ۱۷)

یہی فریضہ قرآن میں امت مسلمہ کے ذمے لگایا گیا ہے کہ دنیا میں نیکی کو قائم کرنے اور برائی کو مٹانے کی سعی کرے۔

یہی کلیہ ہے جس کے خمیر سے انسانی کردار اس قابل بنتا ہے کہ وہ دنیا میں امن اور فلاح و سیادت کو فروغ دینے کا ذریعہ ہو اور جبر و ظلم اور ناانصافی اور جرائم اور فواحش کا خاتمہ ہو۔ یہی وہ بڑا کام ہے جس کی مشکلات کو آدمی عبور نہیں کر سکتا، جب تک نماز اس کی پشت پناہ نہ ہو۔ ورنہ ترک نماز کی وجہ سے خدا سے رابطے کی جو کمی اس کے کردار میں رہے گی اس کی وجہ سے یا تو وہ مفوضہ معرکے میں دل ہار دے گا یا نیکی کی علمبرداری کرتے کرتے بدی سے گٹھ جوڑ کر لے گا۔

یہاں اسلامی نظام تعلیم کے سر ایک ذمہ داری یہ عائد ہوتی ہے کہ وہ نئی نسلوں پر واضح کرے کہ معروف کی تعریف میں کیا چیزیں داخل ہیں جن کو قائم کرنے کے لیے وہ محنت و ایثار سے کام لیں اور منکر کی تعریف میں کیا چیزیں آتی ہیں جن کو مٹانے کے لیے وہ عمر بھر سرگرمِ جہاد رہیں۔

معروف و منکر کی لغوی تشریح اور پھر ان الفاظ کے استعاراتی مفہوم پر بحث کیے بغیر اجمالاً یہاں یہ کہہ دینا کافی ہے کہ معروف سے مراد خدا پرستانہ نقطۂ نظر سے نیک قرار پانے والے کام ہیں جو فرد اور معاشرے اور انسانیت کے لیے باعثِ فلاح ہوتے ہیں، دوسری طرف

منکر سے مراد وہ بُرے کام ہیں جو فرد' معاشرے اور انسانیت کے لیے باعث ضرر ہوتے ہیں۔

زندگی میں معروف و منکر کی تقسیم کے معنی' ہدایت و ہلاکت' حلال و حرام' حق و باطل اور جائز و ناجائز کی تقسیم کے ہیں۔ یہ تقسیم اگر خدا کو ماننے بغیر اور اس کے انبیاء کی تعلیمات کی روشنی قبول کئے بغیر آدمی خود صحیح طور پر کر سکتا تو پھر سرے سے خدا کو ماننے' اس کی ہدایت اور اس کے انبیاء کی تعلیمات کو قبول کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ چنانچہ غیر خدا پرستانہ (یا مشرکانہ) نقطۂ نظر سے سوچنے والے داناؤں کے جو افکار ہمارے سامنے ہیں وہ ناقص' باہم دگر متضاد اور غیر یقین بخش ہیں۔ اسی طرح غیر خدا پرستانہ اور مشرکانہ شخصیتوں اور قوموں کے کردار اور ان کے نظام بعض خوبیاں رکھنے کے باوجود ہمیشہ تمدنی بگاڑ اور شرفِ انسانیت کی تباہی اور تہذیبی ارتقاء میں رکاوٹ کا سبب بنے ہیں۔ وقتی طور پر کسی غیر خدا پرستانہ فکر اور کردار اور نظام سے آنکھیں کتنی ہی کیوں نہ خیرہ ہوں' جب بھی اس کے منفی برگ و بار سامنے آئیں گے' معلوم ہوگا کہ ایک فریب نظر تھا اور انسانی تاریخ ' فریب ہائے نظر کا ایک عبرت انگیز عجائب خانہ ہے۔

پس خدا پرستی اور خدا کے لیے رویۂ انابت کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہمیں معروف اور منکر کی تقسیم' اس کی ہدایت اور اس کے انبیاء کی تعلیم سے اخذ کرنی ہے۔

یہ فریضہ اسلامی نظام تعلیم پر عائد ہوتا ہے کہ معروف و منکر کی خدا پرستانہ تقسیم سے وہ نئی نسلوں کو آگاہ کرے۔ انہیں افکار' اقوال' اخلاق' اعمال' اجتماعی ادارات کی سرگرمیوں میں سے چھانٹ چھانٹ کر یہ واضح کرے کہ اچھائی کیا ہے اور برائی کیا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ یہ کام بھی ایسا کام ہے جو سوائے خالص ٹیکنیکل نصاب کے باقی سارے نصاب میں پھیلا دینا ہوگا۔ ہر شعبۂ حیات سے متعلقہ علم کے سلسلۂ نصابات میں یہ بتانا ہوگا کہ اس شعبہ میں خدا پرستانہ نقطۂ نظر یا الہامی ہدایت کے لحاظ سے معروف کیا ہے اور منکر کیا ہے۔

اس ضمن میں دوسری ذمہ داری اسلامی نظام تعلیم کی یہ ہے کہ وہ نوجوان نسل کو زندگی کا متذکرہ نصب العین اختیار کرنے کے لیے تیار کرے اور قوم کے ایک ایک فرزند کو آگاہ کرے کہ خدا نے اسے جس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اور اسے جس غایت کے لیے بہ طور خاص امت وسطہ کا ایک سپوت بنایا ہے وہ صرف یہ ہے کہ تمہیں اپنی ساری زندگی' اپنی ساری قوتیں

اور اپنے سارے ذرائع اس ایک مشن میں کھپا دیتے ہیں کہ خدا پرستانہ مسلک کے مطابق جو کچھ معروف ہے اس کا بول بالا ہو اور جو کچھ منکر ہے اس کا انسداد ہو جائے۔ ملت اسلامیہ گویا نیکی کے نظام کو کامیاب اور غالب کرنے والے سپاہیوں کی ایک فوج ہے اور ہر مسلمان نوجوان اس مقدس فوج کا سپاہی ہونے کی حیثیت سے بقیہ انسانوں سے ممتاز ہے۔

فلاح انسانیت کے اس عظیم نصب العین کے سامنے عہدے' ملازمتیں' کاروبار اور معاشی سرگرمیاں بالکل ثانوی اہمیت رکھتی ہیں۔ اسی طرح جنس اور ازدواج کے معاملے اپنی جگہ کتنی بھی اہمیت رکھتے ہوں' ہمارا بنیادی نصب العین ان سب سے بالاتر ہے۔ معاش اور ازدواج ایسی چیزیں نہیں ہیں جن پر زندگی کا پورا سرمایہ قوت کھپا دیا جائے یا جن پر غالب توجہ صرف کی جائے۔ اصل معشوق تو یہ نصب العین ہے۔ اس کی فکر سب سے اول ہے اور اس کے لیے تگ و تاز زندگی کے ایک سرے سے دوسرے تک جاری رہے گی۔ زندگی کے باقی تقاضے ساتھ ساتھ پورے ہوتے رہیں گے۔[۱]

تفریحات کے دائرے میں ایک قسم ایسے لغویات وفضولیات کی بھی ہے جو آدمی کو

۱۔ ایک دائرہ تفریحات کا بھی ہے جو انسان کی توجہ اپنی طرف کھینچتا ہے۔ بلاشبہ کچھ کھیل اور تفریحات ایسے ہیں جو جسمانی اور ذہنی قوتوں کو بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ ایسی جائز صورتوں میں ہمارے اندر تازگی پیدا کرتے ہیں جو کسی لحاظ سے خدا پرستانہ نظام اعتقاد و اخلاق سے متصادم نہیں ہیں۔ مگر تفریحات کی طرف بہت زیادہ جھکاؤ کی مہلت کسی ایسے دیانت دار سپاہی کو کہاں مل سکتی ہے جسے زندگی کے نصب العین کا عظیم الشان معرکہ درپیش ہو۔ کجا یہ حال کہ مسلک خدا پرستی کے علمبرداروں کے معاشروں میں بے شمار لوگ مجرمانہ اور فاسقانہ تعیشات میں گم ہیں اور اسراف و تبذیر کے ذریعے زندگی کی خود پیدا کردہ تلخیوں کا مداوا کرنا چاہتے ہیں۔
ان لوگوں کی حیثیت ان بھگوڑے سپاہیوں کی ہے جو فوج میں بھرتی ہوئے' ادائے فرض کا حلف لیا اور پھر چھاؤنی یا محاذ سے تنخواہ کا روپیہ لے کر بھاگ گئے اور کسی میخانے یا بھنگڑ خانے یا طوائف خانے میں جا چھپے۔ جائز اور مفید تفریحات کو بیہودہ اور فحش مشاغل سے الگ کر کے پہچاننا دینی شعور کے راسخ ہو جانے ہی سے ممکن ہے اور پھر جائز تفریحات کو زندگی کی سرگرمیوں میں صحیح تناسب کے ساتھ جگہ دینا اور اعتدال و توازن قائم رکھنا صرف اس ایمان کے بل پر ہی ممکن ہے کہ انسان کو اپنی قوتوں' اپنے مال اور اپنے وقت کے بارے میں حساب دینا ہے کہ ان امانتوں کو کہاں کہاں' کس طریقے اور کس تناسب سے خرچ کیا۔

بشری عظمت کی طرف بڑھنے سے روکتی' اور پستی اور سہل پسندی کی طرف راغب کرتی ہے۔ اسی لیے اعراض عن اللغو کی تاکید کی گئی ہے۔ خصوصاً خدا اور آخرت سے غافل کرنے والے اور ذمہ داریوں سے نگاہِ توجہ ہٹانے والے مشاغل میں دلچسپی لینے سے اجتناب ضروری ہے۔

اسلامی نظام تعلیم سے فیض یاب ہونے والوں کو اپنے خدا پرستانہ نصب العین کے لیے اس سے زیادہ جنونی اور فدائی (پورے علم و شعور کے ساتھ) ہونا چاہئے جتنا جرمن نسل کی برتری کے لیے نازی تھے یا مارکسزم کی سربلندی کے لیے کمیونسٹ۔

خدا پرستانہ مسلک حیات کے سالکوں کا مرکزی نصب العین بیان کرنے کے ساتھ حضرت لقمان اپنے شاگرد عزیز کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ اپنے نصب العین کی دعوت دیتے ہوئے یا اس کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے اگر مخالفتیں اور مزاحمتیں پیش آئیں تو ان کے مقابلے میں مضبوطی سے جمے رہو۔ ﴿وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَآ أَصَابَكَ﴾ (آیت: ۱۷)

یہ بات واضح رہے کہ جب بھی کوئی شخص یا گروہ کسی بھی نقطۂ نظر سے اپنے معاشرے کے بگاڑ سے مصالحت کرنے کی بجائے غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح قرار دے کر اصلاح کی سعی شروع کرتا ہے تو اسے لازماً مخالفتوں اور مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ علی الخصوص خدا پرستانہ نصب العین کے کارکنوں کا معاملہ تو زیادہ سخت ہے۔ وہ پوری زندگی میں معروف کو قائم کرنے اور منکر کو مٹانے کی جب جدوجہد شروع کرتے ہیں تو خواہ وہ کتنی ہی نرمئ گفتار اور لطافتِ بیان سے کام لیں ان کی دعوت کی زد رائج الوقت عقیدوں' اخلاق' طرزِ معاملات پر' حتیٰ کہ ہیئتِ سیاسیہ پر بھی پڑتی ہے۔ ایسی ہمہ گیر دعوت اصلاح وتغیر کے اٹھتے ہی ماحول کی تمام خوابیدہ قوتیں بیدار ہو کر دلائل سے لے کر دشنام تک اور بحث و مجادلہ سے لے کر جبر و تشدد تک کے سارے اسلحہ سے لیس ہو کر چاروں طرف سے حملہ آور ہو جاتی ہیں۔

ایسی صورت میں خدا پرستوں کا مقام صبر و ثبات ہے۔ یعنی سب کچھ سہہ کر اور قربانیاں دے کر بھی اسی حق و صداقت کی علمبرداری کرنا جس پر ان کا ایمان قائم ہے۔

جو شخص (خواہ کسی بھی مسلک کا ہو) اپنے اختیار کردہ اصول و مقاصد کو ہر مرحلۂ مخالفت کے پیش آنے پر ان سے روگردانی کرنے لگے اور اپنے نصب العین کے راستے پر چلتے ہوئے کسی بھی رکاوٹ کے سرراہ ہونے پر راستہ چھوڑ دے یا اگر صحیح طریق سے کام کرنے کا نتیجہ جلد نکلتا نظر نہ آئے تو کسی غلط طریقے کو اپنا لے تو اسے کبھی بھی ایک مستحکم کردار حاصل نہ

ہو سکے گا اور مستحکم کردار کے بغیر کسی بڑے مشن یا نصب العین کی خدمت نہیں کی جا سکتی۔ بڑی بڑی قوتیں اٹھتی ہیں' سلطنتیں بنا لیتی ہیں' فتوحات حاصل کرتی ہیں' انقلابات برپا کر دکھاتی ہیں مگر وہ مضبوط کردار سے خالی رہی ہوں تو ان کے بنے بنائے کھیل وقت کی چند گردشوں کے بعد بگڑ جاتے ہیں۔

پس جتنا بڑا اصول یا بڑا مقصد سامنے لے کے کوئی اٹھے' اسے اتنا ہی بڑا صبر اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے۔

اور کیا ہی خوب تکمیلی جملہ حضرت لقمان نے فرمایا کہ یہ ہے اہل عزم کے کرنے کا کام! یہ ہے ہمت و جوان مردی کا کام! یہ ہے کار عظیم! ﴿إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ﴾ (آیت : ۱۷) مطلب یہ کہ بہت سا رزق سمیٹنے کے لیے ساری عمر کھپا دینا' (یا آج کل کے لحاظ سے عہدوں کے حصول اور ان میں ترقی کرنے کے لیے ساری کاوشیں صرف کر دینا یا شہرت کے پیچھے دوڑتے پھرنا' یا صحرائے عشق میں بگولوں کی طرح آوارہ رہنا' یا حسد و انتقام کے کسی چکر میں پڑ کر اپنی متاع قویٰ خرچ کر دینا' یا گھٹیا درجے کی لذت کے لیے مے خانہ ہوس میں جام لنڈھاتے رہنا اہل ہمت کے شایان شان نہیں ہے۔ اہل ہمت کے کرنے کا کام تو یہ ہے کہ وہ انسانی فلاح کے عظیم نصب العین کو لے کے اٹھیں اور اسے حاصل کرنے کی جدوجہد میں آفات و آلام کے طوفانوں سے ٹکرائیں' حوادث کے تھپیڑے کھائیں اور اپنے چہرے اور سینے پر مزاحمتوں کے زخم آراستہ کئے ہوئے دنیا کی امتحانی زندگی کی رزم گاہ سے نکل کر اس اللہ کی بارگاہ میں جا پیش ہوں جس کے سپرد کردہ کار عظیم میں انہوں نے قوت کی ہر رمق کھپا دی اور وہاں جان مار کر کام کرنے والے ایک وفادار کارکن کی حیثیت سے اپنی کارگزاری کی شاندار رپورٹ پیش کرنے کے قابل ہوں۔

قرآن میں صبر کی تعلیم جن معنوں میں دی گئی ہے' ان میں سے ایک یہ ہے کہ اپنے مسلک حق اور اپنے نصب العین پر ہر قسم کے حالات میں جمے رہو' دوسرے یہ کہ اگر مخالف و مزاحمت باقاعدہ جنگ کا چیلنج لے کر آ جائے تو پھر ڈٹ کر اس کا مقابلہ کرو اور تیسرے یہ کہ اپنی دعوت اور اپنے نصب العین کے لیے کام کرتے ہوئے اپنی محنتوں کے برگ و بار ظاہر ہونے میں اگر قوانین مشیت کے تحت دیر لگتی ہو تو صبر سے لمبی سے لمبی مدت تک انتظار کرو۔ ہو سکتا ہے کہ ایک نسل میں شروع ہونے والا کام دوسری' تیسری یا چوتھی نسل میں جا کر اتمام پذیر ہو

کیونکہ کسی دعوت کے ثمرات کے برآمد ہونے میں جہاں فی نفسہٖ دعوت کی صداقت اور اس کے داعیان کے خلوص و محنت کا ایک حصہ ہے' وہاں اس کے مخاطب معاشرے کی اچھی یا بری صلاحیت اور اس کے اچھے یا بُرے ردعمل کا بھی ایک حصہ ہے اور پھر ان ادلتے بدلتے تاریخی احوال کا بھی حصہ ہے جو مختلف طاقتوں کی دوستیوں اور دشمنیوں سے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اب اگر کوئی صاحبِ دعوت فرد یا گروہ اپنے کام کے نتائج صرف اپنے ہی ادا کردہ حصے کے بل پر (خود اس کے کام اور حصے کا بھی صحیح اور معیاری ہونا ضروری نہیں) جلد حاصل کرنا چاہے اور اگر انتظار کی گھڑیاں طویل ہو جائیں' تو وہ بددلی' مایوسی' اضمحلال اور سرگرمیٔ کار میں کمی جیسی بیماریوں میں مبتلا ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ جوہرِ صبر سے خالی تھا یا یہ کہ اس کی قوت صبر دعوت اور نصب العین کے تقاضوں سے کم تھی۔ خدا پرستانہ مسلک میں صبر کو اساسی ضروریات میں جگہ دی گئی ہے اور یہاں اس کا پیمانہ اتنا بڑا رکھا گیا ہے کہ آدمی کو دنیا میں اگر نیکی کا کوئی نتیجہ خیر بھی نہ ملے بلکہ الٹا زمانہ ظلم اور بدی سے جواب دے تو وہ اپنی خدمات کے ثمرات آخرت میں وصول کرنے کے لیے پوری عمر انتظار میں گزار سکتا ہے۔

علم حق کی مشعل

اس سورۂ تعلیمات میں ایک بیش قیمت نکتہ یہ بھی سکھایا گیا ہے کہ آدمی کو جادۂ ہستی پر ہر قدم علم ـــــ یعنی علم حق ـــــ کی روشنی میں بڑھانا چاہیے۔ جہالت کے اندھیروں میں کوئی قدم نہ رکھنا چاہیے۔

آیت ۶ میں اس فاسد کردار کو بیان کیا جو لہوالحدیث کے ذریعے مسافرانِ حیات کو اللہ کے راستے سے بھٹکاتا ہے اور یہ کارنامہ وہ بغیر علم سرانجام دیتا ہے۔

آیت ۱۵ میں حضرت لقمان کی نصیحت میں شرک سے منع کرتے ہوئے ﴿ مَالَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ﴾ کے الفاظ آئے ہیں یعنی جب تک تمہیں واضح طور پر علم نہ ہو کہ خدا کا کوئی ساجھی ہے ـــــ تم نے دیکھا ہو یا دلیل قطعی سے جانا ہو' یا الہامی رہنمائی سے معلوم کیا ہو ـــــ تو تمہارا یہ کام نہیں کہ محض والدین کے کہنے یا کسی اور کے زور ڈالنے سے ایک نامعلوم بات کو واقعہ تسلیم کر لو۔

آیت ۲۰ میں ایک فاسد کردار کا ذکر ہے جو اللہ کے بارے میں اور اس کے دین کے

بارے میں بغیر کسی علم کے بحثا بحثی کرتے ہیں' مختلف دعوے پیش کرتے ہیں' حقیقتوں کی تردید کرتے ہیں۔ ان کو کوئی یقینی ہدایت حاصل نہیں ہوتی اور ان کے پاس کسی ثابت شدہ اور غیر محرف الہامی نوشتے کی سند نہیں ہوتی۔ علم کے بغیر جو لوگ ٹامک ٹوئیے مارنے کے عادی ہو جاتے ہیں ان کو جب اللہ کے نازل کردہ ہدایت نامہ کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو وہ اس بنیاد پر اسے قبول نہیں کرتے کہ ہم تو اسی روش پر چلیں گے جس پر ہمارے باپ دادا چلتے آئے ہیں ان کی اس جاہلانہ ذہنیت کو خود ان پر نمایاں کرنے کے لیے یہ استفہامی اشارہ فرمادیا کہ ﴿أَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطَانُ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ﴾ (آیت:۲۱) یعنی یہ بھی سوچا ہوتا کہ کیا ہوگا نتیجہ اگر تمہارے باپ دادوں کو یا خود تم کو شیطان جہنم کے عذاب کی طرف لیے جارہا ہو۔

ان آیات کی مدد سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اسلامی نظام تعلیم کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ نئی نسلوں کو واضح قسم کے علم حقائق ـــــ جو ثابت شدہ الہامی ہدایت پر مبنی ہو یا مشاہدہ و تجربات کا یقینی ماحصل! ـــــ کی روشنی میں سوچنے اور کلام کرنے اور عملی روش اختیار کرنے کی تربیت دے۔ عالم افکار ہو یا عالم کردار۔ ہمارے نظام تعلیم کے تربیت یافتہ ضمیر' انسان کو علم کی روشنی کے بغیر ظن وتخمین کے اندھیروں میں گامزن نہ ہونے دیں۔ اندھی آباء پرستی اور قوم پرستی اور ہر قسم کی ''پرستی'' اور جھوٹے تعصبات سے طلبہ کو بچایا جائے۔ وہ بڑی بڑی قوموں' جابر وظالم حکمرانوں اور غلط ماحول سے متاثر ہو کر حقائق کی راہ سے ہٹ کر کچے قیاسات اور ادھورے نظریات کے سامنے مرعوبانہ اور مقلدانہ شان سے سرخم نہ کریں۔ ان پر حقائق اور نظریات کا فرق واضح ہونا چاہئے۔ وہ قابل ہو جائیں کہ قیاسی نظریات پر اخلاق' کردار اور تمدن کی بنیاد ہرگز نہیں رکھی جاسکتی۔

تہذیب وشائستگی

خدا کے لیے جذبہ شکر عبودیت کی جس راہ پر لے جاتا ہے اس میں کبر ورعونت کا کوئی مقام نہیں آسکتا۔ مسلک شکر اور مسلک کبر میں کامل منافات ہے۔

حضرت لقمان بچے کو تاکید کرتے ہیں کہ ''لوگوں کے مقابلے میں اپنے گال نہ پھلاؤ اور زمین میں گھمنڈ کی چال نہ چلو' خدا کسی شیخی باز غلط کار کو پسند نہیں کرتا۔ (آیت ۱۸)

خدا پرستی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی دوسرے انسانوں کے لیے مساویانہ مرتبے کا احساس کرے کیونکہ سب ایک ہی خالق کی مخلوق اور ایک ہی اللہ کے بندے ہیں۔ دوسروں کے مقابلے میں فخر وغرور' اکڑفوں اور ان کی تحقیر کے لیے اسلامی زندگی میں گنجائش نہیں۔ جس شخص میں رتی بھر کبر بھی ہوگا وہ اخروی کامرانی حاصل نہ کر سکے گا اور نہ وہ اس ارضی زندگی میں احسان کیش بن کر حیات طیبہ سے بہرہ مند ہو سکتا ہے۔ غرور مال' غرور حسن' غرور صحت' غرور وطن' غرور آباء' غرور اولاد' غرور علم اور غرور اقتدار کے تمام دروازے یہاں بند ہیں۔ نہ انفرادی کبر کی رخصت ہے' نہ طبقاتی اور نہ جماعتی فخر کی۔

انسانی معاشرے کے فساد کی شاید سب سے وسیع الاثر بنیاد یہی ہے کہ کوئی فرد' کوئی خاندان' کوئی نسل' کوئی طبقہ یا کوئی جتھا اپنے متعلق یہ سوچتا ہے کہ میں بڑا ہوں اور دوسرے چھوٹے ہیں۔ میرے حقوق زیادہ ہیں' میرے مفادات اہم تر ہیں اور مجھے ترجیح حاصل ہے۔ پھر جس کا داؤ چل جاتا ہے وہ اقتدار' قانون' روایات' معاشی تسلط' ذہنی تفوق' طبقاتی بالادستی کے زور سے زندگی کے توازن کو غارت کر دیتا ہے۔ جواباً دوسروں میں بھی ایسا ہی مقام حاصل کرنے کے لیے بے چینی پیدا ہوتی ہے اور پھر رسہ کشی ہونے لگتی ہے۔

کبر ہی کے تحت ماضی کے کچھ سر پھرے انسانوں نے خدائی کے دعوے کیے۔ کبر ہی کے تحت چنگیزوں اور ہلاکوؤں نے مدنیت کو پیروں تلے روندا' کبر ہی کے تحت ہٹلر اور مسولینی کی آمریت اُبھری اور کبر ہی کے تحت آدمی آدمیوں کے خلاف گھناؤنے جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔

اسلام انسانوں کے لیے مساوات کی تعلیم دیتا ہے اور ہماری درسگاہوں کو بھی طلبہ کے اندر یہی روح پھونکنی چاہئے۔ نظام تعلیم نئی نسلوں کو تلقین کرے کہ وہ انسانیت کے سامنے گال پھلائے اور تیوری چڑھائے ہوئے نہ آئیں اور زمین پر متکبرانہ روش کے ساتھ زندگی نہ گزاریں۔ ان کو مختال فخور نہیں بننا چاہئے۔

کبر کی روش

اب آگے تعلیم لقمان کا وہ حصہ آتا ہے جس میں ایک ایسی روش سے روکا گیا ہے جو ایک طرف تمام انسانی رابطوں کے حسن کو تباہ کر دیتی ہے' دوسری طرف خدا سے بھی انسان کے

تعلق بندگی واطاعت کو استوار نہیں ہونے دیتی۔ اس ہدایت کا پہلا جزیہ ہے کہ لوگوں کے درمیان اپنے گال نہ پھلائے رکھ۔ (وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ)

انسان میں دوسروں سے برتر رہنے اور ان کو کمتر دیکھنے کی ایک بری خواہش بھی کام کرتی ہے۔ وہ دوسروں پر اقتدار جمانا اور کمانڈ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ سو کبھی کسی حقیقی قابلیت و فضیلت کو وجہ بنا کر اور کبھی محض خیالی احساس برتری سے کام لے کر وہ لوگوں سے کبر و نفرت کا معاملہ کرتا ہے۔ حاکم میں غرور اقتدار' عالم میں غرور علم' دولت مند میں غرور دولت' زاہدین میں غرور زہد' اچھے تناسب اعضا اور بدن اور چہرے کی پرکشش رنگت رکھنے والوں میں غرور حسن اور اہل فن میں غرور فن ابھر آتا ہے۔ اسی طرح نسل و نسب کی بنا پر قوم و وطن کی بنا پر' تاریخ ماضی اور اسلاف کے کارناموں کی بنا پر' استکبار کی روحیں نکلتی ہیں۔ یہی بلا جب اجتماعی سطح پر کام کرتی ہے تو دلوں میں غرور نسب' غرور دولت' اور غرور علوم پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی بیماری کی ایک شکل وہ ہے جسے اقبال نے ''نشۂ قوت'' سے تعبیر کیا ہے اور اس کے متعلق کہا ہے کہ:

صاحبِ نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک!

وہ خدا پرست جس نے شکر کا رویہ اختیار کیا ہو' وہ یہ جانتا ہے کہ خدا نے ہر کسی کے حصے میں کچھ نہ کچھ فضائل رکھے ہیں اور جو فضیلت اس کو عطا ہوئی ہے وہ ایک امانت ہے جسے خدا کی عبادت اور بندوں کی خدمت کے لیے استعمال کیا جانا ہے۔ پس اس میں خدا کے لیے بھی محبت پیدا ہو گئی ہے اور انسانوں کے لیے بھی۔ وہ سارے انسانوں کو خدا کے خلق کردہ انسانوں کی حیثیت سے دیکھتا ہے اور اپنے آپ کو ان کے ساتھ برابر کی سطح پر کھڑا کرتا ہے۔ جو نعمت بہ طور خاص اس کو ملی ہو۔ نعمتِ حکومت و دولت یا نعمتِ علم و ہدایت۔ اسے وہ اپنے ساتھ دوسروں کی بہبود کے لیے استعمال کرتا ہے۔

مذہبیات کے دائرے میں عام طور پر یہ خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ جو آدمی خدا آشنا اور ہدایت یافتہ ہو جاتا ہے وہ اگر اپنے اوپر کڑی نظر نہ رکھے' تو دوسروں کے لیے اس کے دل میں نفرت اُبھر آتی ہے اور وہ انہیں نگاہِ تحقیر سے دیکھتا ہے۔ حالانکہ یہ مسلک خدا پرستی کے خلاف ہے۔ خدا پرست' خدا کے سامنے مقامِ عجز پر اور بندوں کے ساتھ مقامِ اخوت پر کھڑا ہوتا ہے۔

۲۔ انسانوں سے حسن روابط ـــــ اہل ایمان کے ساتھ ان کے حق کے مطابق' اور مخالفین

کے ساتھ ان کے درجے کے مطابق ـــــ خدا پرستی کا نہایت ہی اہم تقاضا ہے۔ اور اس تقاضے کو روش کبر وغرور تباہ کر دیتی ہے۔ پس اس پر حضرت لقمان اپنے شاگرد کو متنبہ کرتے ہیں کہ وہ اس سے بچے۔

متذکرہ ہدایت کا دوسرا پہلو یہ بتایا گیا ہے کہ زمین میں گھمنڈ کی چال نہ چل۔

اس سے اگر مراد یہ لیا جائے کہ راستہ چلتے ہوئے اور قدم رکھتے ہوئے اکڑنے اور اترانے کا طریقہ اختیار نہ کرو تو یہ پہلی بات ہی کی تاکید مزید ہوگئی اور اسے آداب کے دائرے میں بھی رکھا جا سکتا ہے۔ جن کا تفصیلاً آگے بیان آ رہا ہے۔ لیکن اسے وسیع تر معنوں میں بھی لیا جا سکتا ہے اور اس معنی میں اس کا ربط شکر کے رویے سے جڑ جاتا ہے۔ یہاں گھمنڈ کی چال نہ چلنے سے مطلوب زندگی بسر کرنے کے مجموعی طور طریقے کو متکبرانہ رنگ سے پاک رکھنا ہے۔ یعنی عاجزانہ مگر باوقار طریقے سے زندگی بسر کرو۔

اور تعلیم لقمان کے اس حصے کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بدعمل گھمنڈی کو پسند نہیں کرتا۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ﴾ (آیت ۱۸ : ۳۱)

اسلامی نظام تعلیم کے لیے لازم ہے کہ وہ طلبہ کو انسانوں کے ساتھ تحقیر آمیز غرور کا رویہ اختیار کرنے سے روکے' اور ان کو انسانوں سے محبت و خدمت کا تعلق قائم کرنا سکھائے۔ نیز انہیں مجموعی زندگی کو متکبرانہ انداز سے بسر کرنے کی روش سے بچائے۔

اب بات آداب کے دائرے میں داخل ہوئی ہے مدرسۂ خدا پرستی کے طالب علم کو ایک ہدایت جس کا تعلق اوپر سے بھی جوڑا جا سکتا ہے یہ دی گئی ہے کہ اپنی رفتار میں میانہ روی اختیار کر (وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ) انداز رفتار میں نہ اکڑ پائی جائے اور نہ بالکل مردنی کا منظر پیدا ہو۔ نہ آدمی ایسے چلے کہ گویا وہ گھبراہٹ کی وجہ سے تیز تیز لپکا جا رہا ہے۔ اور نہ اس طرح کہ جیسے بمشکل بدن کو گھسیٹا جا رہا ہو۔

اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ زندگی کے تمام معاملات خصوصاً آداب کے لیے اعتدال اور میانہ روی کو ایک اساسی صورت کی حیثیت حاصل ہے۔

آداب کے وسیع دائرے میں سے ایک اور اہم چیز کو حضرت لقمان نے لیا ہے۔ ان کی تعلیم یہ ہے کہ اپنی آواز (اور لب ولہجہ) کو دھیما رکھو۔ (وَاغْضُضْ مِن صَوْتِكَ)

زور سے بولنے کی عادت بالعموم تہذیب و شائستگی کے لحاظ سے پسماندہ معاشروں اور

قبیلوں میں پائی جاتی ہے۔ جن علاقوں میں جس رفتار سے تہذیب و شائستگی میں ترقی ہوتی جاتی ہے' وہاں آواز دھیمی' لہجہ سنجیدہ اور الفاظ ملائم ہوتے جاتے ہیں۔

کرخت لہجے والے افراد اور معاشروں میں جذباتیت کا عنصر عقل و تدبیر پر غالب رہتا ہے' نیز زور زور سے بولنے والے لوگوں میں جب کبھی اختلافی امور پر گفتگوئیں ہوتی ہیں تو آہستہ آہستہ ان میں تلخی بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی ہاتھا پائی تک نوبت پہنچتی ہے۔

اس تعلیم کے ساتھ جو تمثیل دی گئی ہے وہ بھی اس حیثیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یعنی گدھے کی آواز گو بہت پر زور ہوتی ہے' مگر نہایت ناخوشگوار بھی' اور پھر ایسی بلند آہنگی تو حیوانی صفت ہی ہوسکتی ہے۔ ﴿إِنَّ أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ﴾ (۱۹ : ۳۱)

معلّمی ایک مقدس فریضہ

قرآن نے تعلیم لقمان کا اتنا ہی حصہ اپنے ہاں لیا ہے مگر اس خلاصے سے ظاہر ہے کہ بات بہت بڑے اصولوں سے چل کر روزمرہ زندگی کے آداب تک پہنچ گئی۔

اس سے یہ سبق اخذ ہوتا ہے کہ تعلیم پورے انسان کو اپنا موضوع بناتی ہے اور پوری انسانی زندگی کو اپنے دائرے میں لیتی ہے اور وہ محض اصول و حقائق یا معلومات ہی بہم نہیں پہنچاتی' بلکہ نئی نسلوں کے اخلاق و کردار کی تشکیل بھی کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں تعلیم کے اندر عملی تربیت بھی شامل ہے۔ جسے اقبال نے فیضانِ نظر سے تعبیر کیا ہے۔ ؎

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی؟
سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی؟

یہاں سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ تعلیمی مقصد و مواد اور تعلیم دینے والے کے کردار میں تضاد یا تصادم نہیں ہونا چاہیئے۔ مقصد تعلیم اور معلم میں ہم آہنگی ضروری ہے۔ کوئی جھوٹا آدمی کامیاب معلم نہیں ہوسکتا' کوئی شخص میلے جسم اور گندے لباس کے ساتھ صفائی ستھرائی کی تعلیم نہیں دے سکتا' اسی طرح کوئی شخص غیر اسلامی ذہنیت اور غیر اسلامی کردار رکھتے ہوئے اسلامی نظامِ حیات کا موزوں معلم نہیں ہوسکتا۔

حکمت لقمان کے لیے لقمان کی شخصیت چاہیے۔ حضرت اسماعیل کو آدابِ فرزندی سکھانے کے لیے حضرت ابراہیمؑ جیسا معلم درکار ہے۔ اس اصول پر اسلامی نظام تعلیم ایسے

اساتذہ کے بغیر نہیں چل سکتا جن کے خیالات اور رویے اسلام کے آئینہ دار ہوں۔

تعلیم محض ایک پیشہ نہیں کہ اس میں جو شخص بھی کسی بڑھئی یا پلمبر یا مکینک کی طرح فنی مہارت پیدا کر لے وہ معلّمی کی مسند سنبھال لے۔ تعلیم کوئی کاروباری ادارہ نہیں کہ جہاں دماغی تاجر بیٹھ کر تنخواہ کے عوض افکار و معلومات کی کچھ اجناس بیچتے رہیں۔ یہ اپنی روح کے اعتبار سے ایک مشنری سرگرمی ہے۔ تعلیم دینا درحقیقت اسلامی یا کسی غیر اسلامی تہذیب کے حق میں ایک تحریک چلانے اور اس تحریک کے لیے افراد تیار کرنے کے مترادف ہے۔ بنیادی طور پر یہ مقدس کام وہ ہے جسے انبیاء نے پہلے پہل سرانجام دیا۔

پس نظامِ تعلیم کو' جب کہ وہ اسلامی ہو' ایک مشن اور تحریک کے تصور پر استوار ہونا چاہیے۔ میں نے سورۂ لقمان کو جس طرح سے سمجھا ہے اجمالاً مطالعہ کا ماحصل پیش کر دیا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس سورۃ کے نکات اسلامی نظامِ تعلیم کی بنیادوں' اصولوں اور مقاصد کو بخوبی معین کر دیتے ہیں۔ ان نکات کی شرح و تفصیل کے لیے نہ صرف پورے قرآن سے استفادہ کرنا لازم ہے بلکہ حضورؐ نے عملاً ایک نظامِ تعلیم و تربیت چلا کر قرآن کی جو شرح پیش فرمائی ہے نیز زبانِ مبارک سے حکمتِ قرآن کو جس طرح واضح کیا ہے اس سارے کارنامے کی مدد لے کر ہی ہم کسی تعلیمی خاکے میں صحیح رنگ بھر سکتے ہیں۔ مگر بنیادی خاکہ ہمیں سورۂ لقمان میں یکجا ملتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ ——— بحیثیت معلمِ انسانیت[1]

آغاز' خداوند علیم و حکیم کے نام سے جو اپنی پیدا کردہ ہر مخلوق کے لئے خلق کے ساتھ ہی ساتھ اس کی تقدیر معیّن کرتا ہے اور اس کے لئے راہ ہدایت کی نشاندہی کرتا ہے ——— جس نے اپنے پیدا کردہ آدمؑ کو علم الاسماء کے اعزاز سے نوازا' اور جو تمام انسانوں کا اولین معلم حقیقت و ہدایت ہے۔[1]

صد ہا سلام اس انسانِ عظیم ﷺ پر جسے خود انسانوں ہی کے اندر سے بشیر و نذیر بنا کر اٹھایا گیا' اور ساری انسانیت کے لئے معلمِ فلاح و سعادت کے منصب پر قیامت تک کے لئے مامور کیا گیا۔ وہ کہ جس کی تعلیم کی صداقت اور جس کے معلمانہ کردار کی اعجاز آفرینی پر تاریخ کا یہ حیرت انگیز واقعہ گواہ ہے کہ سرزمین حجاز کے صحرائی کلاس روم میں معلمؐ صدق و صفا سے درس لینے والی تہذیب نا آشنا قوم دیکھتے دیکھتے اقوام عالم کے لئے نہ صرف راستی' مساوات' عدل' اخوت' احسان اور امن کی رہنما بن گئی بلکہ اس نے تدبر و تفکر کی کنجیوں سے علوم و فنون کے بند خزانوں کے دروازے ساری نوع انسانی کے لئے کھول دیئے۔ حق یہ ہے کہ حضورؐ کی تیار کردہ جماعت ہی نے نئے بین الاقوامی دورِ تہذیب کا افتتاح کیا' اور آج کے فاسد علوم اور بے توازن تحریکوں میں جہاں کہیں کسی قابل قدر جوہر کا کوئی ذرہ چمکتا دکھائی دیتا ہے یہ اسی قومِ محمد ﷺ کے فیضان کی یادگار ہے جو دوسروں کو منزل کا سراغ بتانے کے بعد خود اپنا سراغ گم کر بیٹھی۔

اصل مبحث کا آغاز کرنے سے پہلے میں اپنے اس احساس ندامت کو پیش کرنا چاہتا

---

[1] یہ مقالہ تعلیمی کانفرنس منعقدہ مری (جولائی ۷۰ء) میں پیش کیا گیا تھا۔ مقالہ لکھتے ہوئے اس مجوزہ تعلیمی انقلاب کے مسائل و ضروریات میرے پیش نظر رہے جس کے لئے پاکستان کی ذہنی فضا میں ایک جذبۂ بے تاب نشوونما پا چکا ہے۔

ہوں کہ ملت اسلامیہ ہونے کی حیثیت میں ہم نے نبی پاکؐ جیسے عظیم ترین معلم ایمان وعمل کی پیروی کا حق ادا نہیں کیا۔ ہمارا مقام یہ تھا کہ ہم حضورؐ کو اپنی تمام فکری و عملی سرگرمیوں میں سرچشمۂ ہدایت تسلیم کرتے' اپنے کاروان حیات کو ہر پیچ وخمِ تاریخ سے گزارتے ہوئے حضورؐ کا دامن قیادت تھامتے' اور سیاست و اقتصاد اور تعلیم و دفاع اور دوسرے تمام شعبہ ہائے کار میں حضورؐ کے معلمانہ منصب سے روشنی حاصل کرتے۔ مگر ہماری افسوسناک حرکت یہ ہے کہ ہم اس ہستی کو جو قائد تہذیب انسانی تھی' ایک آراستہ و پیراستہ عجائب خانۂ عقیدت میں مسند آرا کر کے اپنے قافلہ ہائے فکر وعمل کو وادی وادی میں گھماتے پھرتے ہیں۔ موجودہ بحران زدہ تہذیب کے بدراہ اور پراگندہ فکر اکابر کے دروازوں پر ہدایت کی بھیک مانگنے کے لئے مرعوبیت کا کشکول اٹھائے صدا لگاتے ہیں۔

تاریخ اور علم کے افق پر ابھرنے والے نت نئے ''آفلین'' کی عارضی درخشانی کو دیکھ کر جھومتے ہوئے پکار اٹھتے ہیں کہ یہ رہا ہمارا مقصودِ نظر۔ پھر جب جگنو کی سی چمک دکھا کر' آنکھوں کا ایک تارا ڈوب جاتا ہے' تو پھر کسی اور کو تلاش کر کے اس پر مرمٹتے ہیں۔ ہمیں کبھی اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ حضورؐ کے ہوتے ہوئے ہم کیسی کیسی ٹھگنی اور بھینگی شخصیتوں کی تقلید میں ٹامک ٹوئیے مارتے پھرتے ہیں۔

دوسری تمہیدی بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ دنیا میں' اور دنیا کے کسی بھی معاشرے میں بڑے بڑے بحران اس وقت آتے ہیں جب خود علم تاریکیوں میں گھر جاتا ہے' جب تعلیم بھٹک جاتی ہے' جب مکتب اپنے مقصود کو گم کر دیتا ہے۔ اور جب معلم اپنا فریضہ اور کردار صحیح طور سے ادا نہیں کرتا۔ علم اور تعلیم کے بھٹکے ہوئے خورشید ومہ کے پرتو میں نہ سیاست صحت مند رہ سکتی ہے' نہ جمہوریت نشوونما پاتی ہے' نہ اقتصادی عدل قائم ہوسکتا ہے' نہ اخلاقی شعور اتنا زوردار ہوتا ہے کہ جرائم کا راستہ روک سکے' نہ قومی خودی اس حد تک توانا ہوسکتی ہے کہ بین الاقوامی مسائل کو حل کرنے کے لئے دفاعی' سفارتی اور نشری قوتوں کو صحیح طور سے بروئے عمل لا سکے۔

دورِ غلامی تو الگ رہا' آزادی پانے کے بعد بھی ہم لوگ تعلیم کے بھٹکے ہوئے خورشید کے پرتو میں کئی سال سے جادہ پیمائی کر رہے ہیں۔ اسی کا نتیجہ وہ بحران ہے جو بالکل ابتدا سے آہستہ آہستہ پرورش پا کر اب پوری طرح جوان ہو گیا ہے۔

اور اگر ہم نگاہ کو ذرا سا وسیع کر کے پورے عالمی احوال کو دیکھیں تو اس حقیقت سے

انکار کرنا ممکن نہیں کہ علوم وفنون' تنظیمات و ادارات' ذرائع و وسائل اور تفریحات و تعیشات کی تیز رفتار افزائش کے باوجود انسان تہذیبی بحران سے دو چار ہے۔ جنگوں' انقلابات' قومی و طبقاتی تعصبات' طرح طرح کے منافرت انگیز متصادم نظریات اور منحوس قسم کے خونخوارانہ جرائم کے ہجوم میں کھڑا ہوا ہے بس انسان دل و دماغ کا سارا سکون گنوا کر ہمدردی کے ایک مخلصانہ بول کے لئے ترس رہا ہے۔

پس آج ملکی اور قومی لحاظ سے بھی' اور عالمی لحاظ سے بھی زندگی کو سنوارنے کے لئے سب سے زیادہ توجہ طلب شعبہ تعلیم کا شعبہ ہے۔ اسی کی درستی پر ہماری اپنی سلامتی کا بھی انحصار ہے' اور اسی کو صحیح اصول و مقاصد کے سانچے میں ڈھال کر ہم نئی نسلوں کو اس قابل بنا سکتے ہیں کہ فساد بحر و بر میں مبتلا دنیا کو امن و انصاف کا راستہ دکھا سکیں۔

اس مقالے کا مقصد یہی ہے کہ ہم اپنے نظام تعلیم کی درستی کے لئے حضورؐ خاتم النبیین کی معلمانہ حیثیت کو سامنے رکھ کر کچھ مفید اشارات و نکات اخذ کر سکیں۔

حضورؐ کے معلمانہ کارنامے پر کوئی گفتگو اس وقت تک بے معنی ہو گی جب تک ہم اس حکمت علم اور حکمت تعلیم پر نظر نہ ڈال لیں جس کے مطابق حضورؐ نے سارا معلمانہ کام کیا۔

ہماری حکمت علم

علم کیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اور اس کے ذرائع حصول کیا ہیں؟ ان سوالوں کو چھیڑتے ہوئے جب ہم مغرب کے نظریہ علم (Theory of Knowledge) کو دیکھتے ہیں تو پھر ہم پیروان محمد ﷺ اور حاملین قرآن کی حیثیت سے یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس رائج شدہ باطل نظریۂ علم کی وجہ سے تمام علوم بگڑ کر رہ گئے ہیں۔ ان میں جو تھوڑے بہت سچائی کے اجزاء ہیں وہ غلط افکار و تصورات کے ساتھ اس بری طرح خلط ملط ہو گئے ہیں کہ ان کے ذریعے زندگی کو پوری طرح خیر و خوبی سے آراستہ کرنا ناممکن ہے' اور جو نظام تعلیم محض ان علوم و افکار کو منتقل کرنے کا وسیلہ بن کے رہ گیا ہو' وہ نہ ہمیں مسلمان کے سے ایمان و کردار سے آراستہ کر سکتا ہے' اور نہ انسانیت کو موجودہ بحرانی دور سے نجات دلا سکتا ہے۔

مغربی نظریۂ علم کی رو سے حقیقت صرف وہ ہے جسے ہم حواس اور قیاس کے ذریعے پا سکتے ہیں۔ ہمارے حواس اور قیاس کے دائرے سے باہر خواہ کتنے ہی بڑے سے بڑے حقائق

موجود ہوں' ہمارے لئے کالعدم ہیں۔ ہم ایک خاص مرحلے میں جو کچھ اور جتنا کچھ جس شکل میں سمجھتے ہیں جان لیتے ہیں' اس مرحلے میں وہی کچھ حقیقت ہے' بعد میں اگر نئی معلومات پچھلے مسلّمات کو بدل دیتی ہیں تو حقیقت نئی صورت اختیار کر کے سابق صورتوں کو منسوخ کر دیتی ہے۔ اس نظریہ علم کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ ہمارا سارا سرمایہ علم' کسی بھی مرحلے میں' ایسے یقینیات سے خالی رہے جن پر ہم انفرادی اخلاق اور اجتماعی تہذیب کی تاسیس کر کے مطمئن ہوسکیں کہ فی الجملہ ہم نے صحیح عمارت اٹھائی ہے' اور اب مزید معلومات و تجربات کی مدد سے اسے بنانے سنوارنے کا کام جاری رکھنا ہے۔ آج کے علمی ظنّیات ایسی ٹھوس بنیادی حقیقتیں فراہم کرنے سے قاصر ہیں جن کو ہم تعمیر حیات کے عمل میں قابل اعتماد اساسیات قرار دے سکیں۔ آج کے نظریئے' آج کی تحریکیں' آج کے سماجی نظام' آج کے معاشرے اس طرح کے ریت کے گھروندے ہیں جنہیں بچے ساحل سمندر کی ریت سے بناتے ہیں' پھر اپنے حاصل محنت کو توڑتے ہیں اور بار بار اسی کھیل کو دہراتے ہیں۔ غضب یہ کہ وہ اس کھیل کھیل میں اپنے اپنے گھروندوں کو صحیح اور بہتر اور دوسروں کے ریت کے قلعوں کو غلط اور گھٹیا قرار دے کر آپس میں لڑتے بھی ہیں۔

اس تنقیدی گفتگو کو طول دینے کے بجائے اس حکمت علم پر مثبت گزارشات پیش کرتا ہوں جسے حضورؐ نے سامنے رکھا۔

واضح رہے کہ یہاں علم کی وہ ٹیکنیکل اقسام زیر بحث نہیں ہیں جن کا مقصد زندگی کی مختلف ضروریات پوری کرنے کے لئے اسباب و وسائل پیدا کرنا اور ان کو ترقی دینا ہے۔ یہاں مدار گفتگو علم کی وہ اقسام ہیں جن کی روشنی میں انسانی رابطوں' رویوں اور تہذیبی اداروں کی غایات طے کی جاتی ہیں۔

اس سلسلے میں نبی پاکؐ نے بہ حیثیت معلم انسانیت ہمارے سامنے اولین حقیقت یہ رکھی ہے کہ علم کامل صرف خدا کو حاصل ہے۔[1] وہی کائنات کے اسرار و رموز کو جاننے والا' ظاہر و

---

[1] ملاحظہ ہوں آیات اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰہِ (۶۷۔ ۲۶' ۴۶۔ ۲۳) اِنَّ اللّٰہَ عَالِمُ غَیْبِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۳۵۔ ۳۸) یَعْلَمُ سِرَّکُمْ وَجَھْرَکُمْ۔ (۶۔ ۳) وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (۲۔ ۲۸۲) وَسِعَ رَبِّیْ کُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا (۶۔ ۸۰) یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ۔ (۲۔ ۲۵۵)

پنہاں سے آگاہ' اور ماضی اور مستقبل کا خبیر و بصیر ہے۔

انسان کو جو کچھ علم حاصل ہے یا آئندہ ہو گا وہ سب اسی کا عطیہ ہے۔[۱] انسان کو محدود ذرائع علم حاصل ہیں' وہ اسی کے عطا کردہ ہیں۔ سماعت' بصارت اور تفکر کی قوتیں اسی نے دی ہیں[۲] انسانی علم کے متعلق یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ وہ صدیوں کی حاصل کردہ ترقیوں کے باوجود اور مستقبل کے ہونے والے انکشافات سمیت بہت ہی محدود ہے۔[۳] خدا کے علم کامل کو سامنے رکھتے ہوئے جب انسان کو اپنے علم قلیل کی محدودیت کا اندازہ ہو جائے تو لازمی طور پر اس میں ایک تو طلب علم پیدا ہو گی' اور دوسرے وہ علم کامل کے سرچشمہ سے استفادہ کرنے کے لئے کوشاں ہو گا اور اس سے استفادہ کے وسیلے کو تلاش کرے گا جو صاحب علم کامل اور اس کے زیر تعلیم متعلم کے درمیان بروئے عقل موجود ہونا چاہئے۔ اپنے علم کی محدودیت کا شعور انسان کو اس جسارتِ بے جا سے بھی روکنے کا ذریعہ ہے کہ وہ اپنی ناقص اور مشکوک معلومات پر نت نئے نظاموں' اور تمدنوں کے بے ڈھنگے اور بے متوازن ڈھانچے کھڑے کرے' ان پر اندھا دھند انسانی قربانیوں اور محنتوں کی بھاری مقداریں صرف کرے' اور پھر وہ یکے بعد دیگرے خوفناک تباہی کے ساتھ ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے رہیں۔ حضورؐ کی حکمت علم انسان کو یہ بتاتی ہے کہ انسانی علم' کائنات میں خدائی اور کارفرمائی کا پارٹ ادا کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس علم کی محدودیت گواہ ہے کہ انسان بندگی و نیابت کے مقام پر رہ کر کسی بالاتر ہستی کے زیر ہدایت کام کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔[۴]

علم قلیل کے مقام پر ہونے کی وجہ سے انسان مجبور ہے کہ وہ نہ صرف حسّی اور قیاسی ذرائع سے کام لے کر اپنے علم میں مسلسل اضافہ کرے' بلکہ حسی و قیاسی دائرے سے بالاتر کسی دوسرے ذریعہ علم کا بھی سراغ لگائے جو تعمیر حیات کے لئے چند یقینی اساسیات مہیا کر سکے۔ پس انسان ایک لامتناہی وادی علم کا مسافر ہے جس کے لئے کمر کھولنے کی منزل کہیں نہیں آتی۔ حضورؐ کے ذریعے اضافہ علم کی دعا جذبہ طلب علم کو متحرک رکھنے کے لئے سکھائی گئی ہے۔[۵]

۱۔ ملاحظہ ہو آیت: عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (۹۶-۵)

۲۔ ملاحظہ ہو آیت: وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ (۶۷-۲۳)

۳۔ ملاحظہ ہو آیت: وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (۱۷-۸۵)

۴۔ ملاحظہ ہو آیت: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (۵۱-۵۶)

۵۔ ملاحظہ ہو آیت: رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا۔ (۲۰-۱۱۴)

مگر دوسرے نظریوں کے مقابلے میں اسلامی حکمت تعلیم یہ چاہتی ہے کہ مسافر علم کے سامنے کچھ نشانات راہ ضرور واضح ہوں' اس کے پاس کچھ نہ کچھ زاد راہ بھی ہو' اور وہ مشعل بھی ساتھ رکھتا ہو جو تاریکیوں میں راستہ دکھا سکے۔ نبی اکرمؐ کی عطا کردہ قرآنی حکمت کی رو سے تین حقیقتیں ایسی ہیں جن کے صحیح شعور پر انفرادی کردار اور اجتماعی نظام کی صحت کا دارومدار ہے۔

ان میں سے اولین حقیقت عظمیٰ (Supreme Reality) خدا کی ہستی ہے۔ یہاں میں خدا کی ہستی پر دلائل نہیں دوں گا۔ کہنا یہ ہے کہ اسلامی حکمت علم کی بنیاد تصور خدا پر ہے اس کی ذات' اس کی صفات اور اس کے حقوق کا شعور ہی انسانی زندگی کی فلاح کا ضامن ہے۔

دوسری بڑی حقیقت خود انسان ہے۔ انسان خدا کی ساری مخلوق میں امتیازی مرتبہ رکھتا ہے۔[۱] اس کا منصب خدا کی عبادت یعنی پرستش و اطاعت ہے۔[۲] وہ اگر صحیح روش پر چلے تو اس کے لئے خلافت و نیابت کا درجہ بلند ہے۔[۳] اسے عقل و علم سے بہرہ ور کرنے کے ساتھ ساتھ تمیز خیر و شر دی گئی ہے۔[۴] بنابریں وہ ذمہ دار اور جواب دہ ہے۔[۵]

تیسری بڑی حقیقت مادی کائنات ہے جو نامعلوم محرکات کے تحت کسی حادثے کے طور پر نہیں بن گئی' وہ رام لیلا یا کھیل تماشا نہیں ہے۔[۶] وہ بے مقصد و بے نتیجہ نہیں ہے۔[۷] اس کی ایک غایت ہے۔[۸] اس میں نظم و ترتیب ہے۔[۹] اس میں ہر چیز اٹل قوانین میں جکڑی ہوئی

۱۔ ملاحظہ ہو آیت: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (۱۷۔۷۰) وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (۹۵۔۴)

۲۔ ملاحظہ ہو آیات: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ ......(۲۔۲۱) وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (۵۱۔۵۶)

۳۔ ملاحظہ ہوں آیت: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ .... (۲۴۔۵۵)

۴۔ ملاحظہ ہو آیت: وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (۹۰۔۱۰)

۵۔ ملاحظہ ہو آیت: اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا (۲۳۔۱۱۵)

۶۔ ملاحظہ ہو آیات: وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (۲۱۔۱۶) لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ (۲۱۔۱۷)

۷۔ ملاحظہ ہو آیت: رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (۳۔۱۹۱)

۸۔ ملاحظہ ہو آیت: خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (۶۴۔۳'۱۶۔۳)

۹۔ ملاحظہ ہو آیت: هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ (۶۷۔۳)

ہے۔[1] اس میں توازن ہے۔[2] اور اس میں حسن و زیبائی ہے۔[3] پوری کائنات ایک ہی کل ہے جو ایک ہی قوت کے زیر فرمان چل رہی ہے۔[4] اس کائنات کی تمام مادی اشیاء اور قوتیں جن تک انسان کی دسترس ہو' اس کے لئے "متاع" کی حیثیت رکھتی ہیں۔[5] اور ان سے وہ بہ حیثیت نائب الٰہی فائدہ اٹھانے اور ان کو حدود اللہ کے اندر رہ کر استعمال کرنے کا مجاز ہے۔ کائنات مادی کے موجودات اور ان کی قوتوں سے کام لینے کے لئے ان کا علم حاصل کرنا بھی ضروری ہے' اس علم کو حضورؐ نے علم ابدان قرار دیا ہے۔ یعنی وہ علم جو مجسم موجودات ـــــ نامی وغیر نامی ـــــ اور ان کی قوتوں اور ان کے استعمالات سے بحث کرتے ہیں۔

ان سہ گانہ حقیقتوں کے درمیان سفر کرنے والے طالب علم کے سامنے حقائق کے دو بڑے دائرے آتے ہیں۔ ایک ظواہر و محسوسات کا دائرہ' دوسرا امور غیب[6] کا دائرہ۔ امور

---

1. ملاحظہ ہو آیت: مُسَخَّرٰتٌ بِاَمْرِهٖ (۱۶۔۱۲)
2. ملاحظہ ہو آیت: وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ (۵۵۔۷)
3. ملاحظہ ہوں آیات: اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا (۱۸۔۷) اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ نِ الْكَوَاكِبِ (۳۷۔۶) وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ (۱۵۔۱۶) حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَ ازَّيَّنَتْ ..... (۱۰۔۱۰)
4. ملاحظہ ہوں آیات: لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (۲۱۔۲۲) نیز قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا ۔ (۱۷۔۴۲)
5. ملاحظہ ہوں آیات: ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۳۔۱۴) وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ (۷۔۲۴'۲۔۳۶)
6. امور غیب کی کئی اقسام ہیں جو ماضی و مستقبل کے دائرے میں پائے جاتے ہیں۔ نیز ایسے دور رس اور وسیع الاثر قوانین و عوامل جو صدھا تاریخی واقعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ پھر اخلاقی و تمدنی سلسلۂ اسباب و علل کے وہ بے حساب اور ناقابل استقصا نتائج جو ہزارہا اشخاص سے ہوتے ہوئے کئی نسلوں تک پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ اور بسا اوقات ان کا دائرہ وسعت عالمگیر ہوتا ہے۔ (واضح رہے کہ الہامی علم و ہدایت میں ایسے حقائق و امور کی بھی نشاندہی کی جاتی ہے۔)

دوسرے وہ امور جو ایک وقت میں کسی کے لئے غیب ہیں' کسی کے لئے شہود۔ جیسے مری میں بیٹھے ہوئے ہم نہیں جانتے کہ اس لمحے لاہور کی مال روڈ یا کراچی کی بندرگاہ پر کیا ہو رہا ہے اور وہاں کون کون سے اشخاص موجود ہیں۔ یا مثلاً اس وقت کہاں کہاں بارش ہو رہی ہے۔ یا مثلاً ایک آدمی ریلوے ٹائم ٹیبل دیکھ کر یہ جان چکا ہے کہ فلاں نام کی گاڑی کس جگہ' کب آنے والی ہے اور اب کس مقام سے گزر ←

غیب محسوسات کے پردے کے پیچھے ہیں اور ان تک براہ راست رسائی حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ہمیں نہیں دیا گیا۔ لیکن ہم امور غیب سے بالکل بے نیاز ہو کر بھی نہیں چل سکتے۔ ہر فرد انسانی چند نمایاں سوالات سے دو چار رہتا ہے کہ آیا کوئی خالق و مالک ہے یا نہیں؟ یہ زندگی ایک وقتی ظہور ہے یا اسے موت کے بعد بھی کسی شکل میں جاری رہنا ہے؟ ہم اپنے اعمال سے جو کچھ اور جیسے کچھ نتائج فوری طور پر پا لیتے ہیں' بس معاملہ ان ہی پر ختم ہے یا کسی باقاعدہ قانون کے تحت عدل و انصاف کے مطابق ان کے صحیح اور مکمل نتائج ملنے ہیں؟ زندگی کا معاشی اور جنسی کامرانیوں سے بلند تر بھی کوئی مقصد ہے؟ ان سوالات کا جواب طے کئے بغیر زندگی کی سرگرمی کو حسن و خوبی سے جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ ہر شخص اثباتاً نہیں تو نفیاً' شعوری طور پر نہیں تو نیم شعوری طور پر' باقاعدہ استدلال سے نہیں تو ظن و تخمین سے' ان سوالات کے جوابات طے کرتا ہے اور پھر اس کی زندگی اس کے پسندیدہ جوابات کے مطابق کوئی نہج اختیار کرتی ہے۔

ان امور غیب کے متعلق انبیاء وحی و الہام سے حاصل کردہ علم کو ہمارے سامنے رکھ کر کائنات اور تاریخ کے شواہد سے ثابت کر کے دکھاتے ہیں کہ الہامی رہنمائی کو پیش کرنے اور قبول کرنے والے ہی فلاح پاتے ہیں۔

اس سلسلے میں یہ وضاحت شاید مفید ہو گی کہ تاریخ کے مطالعہ میں اسلامی حکمت علم جس چیز پر ہماری توجہات کو مرتکز کرتی ہے وہ ''سنتہ اللہ''[۱] اور ''امر اللہ'' ہے۔ اس سنتہ اللہ اور امر

← رہی ہو گی' لیکن اس بارے میں دوسرے بے شمار لوگ لاعلم ہیں یا مثلاً ایک شخص کسی خاص زبان یا علم و فن کا مطالعہ کرنے کی وجہ سے بے شمار ایسے امور سے واقف ہوتا ہے جن کو دوسرے نہیں جانتے۔

تیسرے وہ امور جو ایک زمانے کے لوگوں کے لئے دائرہ غیب میں ہوتے ہیں اور دوسرے زمانے میں شہود بن جاتے ہیں۔ جیسے ریڈیو' بجلی یا جوہری توانائی کا وجود' یا جیسے چاند کی حقیقت کے بہت سے گوشے جو خلائی جہازوں کے استعمال سے قبل نامعلوم تھے' یہ ساری اقسام ممکن الشہود غیب کی تعریف میں آتی ہیں۔

چوتھے وہ امور جنھیں ہم محض اشیاء و حوادث کے علم کی ہزار وسعتوں کے بعد بھی براہ راست نہیں جان سکتے۔ مثلاً خدا کی ہستی' سلسلہ وحی و الہام' حیات بعد الموت وغیرہ۔

اسی بحث میں ہم نے امور غیب کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

۱ ملاحظہ ہو آیت ۷۷۔۱۷

اللہ کے زیرِعنوان آنے والے قوانین ونوامیس میں سے جو زیادہ جامع، بدیہی اور اساسی ہیں، ان کی تصریح مثالوں کے ساتھ قرآن نے کر دی ہے۔ تاریخ کا صحیح مطالعہ کر کے مزید شواہد دریافت کئے جا سکتے ہیں۔[1]

اسی طرح مطالعہ کائنات کے سلسلے میں قرآن کی ایک اصطلاح بہت اہم ہے اور وہ ہے ''آیت'' جس طرح آیات قرآن علم حقیقت اور علم حوادث سے بہرہ مند ہونے کے لئے ہماری رہنما ہیں، اسی طرح مادی کائنات میں پائے جانے والے تمام مظاہر تلاش حقیقت کے سفر میں ہمارے لئے نشانات راہ ہیں[2] اور ان پر بھی آیات کا اطلاق ہوتا ہے۔ کائنات کی ''آیات'' سے ایک فلسفی اور ایک سائنس دان یکساں استفادہ کر سکتے ہیں بلکہ ان آیات میں جمال کا جو پہلو پایا جاتا ہے، اس سے ادیب، شاعر، مصور اور جملہ فنون لطیفہ کے وابستگان بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔

یہاں اس اشارے کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ کائنات کی آیات اور تاریخ میں کام کرنے والے نوامیس الہامی تعلیم کی آیات سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اور یہی ہم آہنگی الہامی تعلیم کی صحت وصداقت کے لئے ایک مؤثر عقلی دلیل قرار پاتی ہے۔

اس الہامی ذریعۂ علم سے ہمارے حسی وقیاسی ذرائع حصول علم کی کوتاہی کی تلافی ہوتی ہے اور ہمیں ایسے یقینیات حاصل ہو جاتے ہیں جن پر انفرادی کردار اور اجتماعی تمدن کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ یہ الہامی یقینیات نظام تمدن میں اسی ضرورت کو پورا کرتے ہیں، جیسے ریاضی میں دو اور دو چار کا فارمولا ہے۔

نبوت جہاں ہمیں بعض تفصیلی احکام وقوانین اور حدود وشعائر کا سرمایہ فراہم کرتی ہے، وہاں اس کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ وہ ہمیں ''العلم'' (The Knowledge) یا اساسی علم (The Basic Knowledge) بہم پہنچاتی ہے۔ اس کے ذریعے ہمیں مرکزی حقیقت عظمٰی (The Great Central Reality) کا شعور ملتا ہے۔ اس کے ذریعے ہمیں رہنما اصول حیات (Guiding Principles) اور بنیادی صداقتوں (Basic Realities) نیز مستقل اخلاقی قدروں (Values Permanant Moral) کی دولت نایاب ہاتھ آتی ہے،

۱۔ ملاحظہ ہوں آیات: ٨_٤٤، ١١_١٦، ١_١٦، ٣٣_٣٨

۲۔ ملاحظہ ہوں آیات: ١٢_١٠٥، ١٦_١٢، ١٣، ١٦_٢٦_١٢_٧٠، ٣_١٣، ١٠_٩٢

اس قسم کے اٹل یقینیات کو قرآن ''قول ثابت''[1] قرار دیتا ہے کہ جو کردار اور تہذیب کی اساس کے طور پر اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ ان اساسی حقائق و قوانین کے چوکھٹے میں دیگر تفصیلی ضوابط ترتیب پاتے ہیں۔ یہ وہ علم ہے جسے ورثۃ الانبیاء قرار دیا گیا اور یہی وہ علم ہے جس کے متعلق حضورؐ نے فرمایا کہ اس کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔[2] ورنہ اگر یہاں علم سے مراد جملہ اقسام کے علوم لئے جائیں تو پھر ہر مسلمان پر لازم ہوگا کہ وہ روئی دھننے اور چمڑے کی دباغت کرنے سے لے کر انجینئری اور ڈاکٹری اور جوہری توانائی اور خلائی پرواز تک کے سارے علوم حاصل کرے اور نہ کر سکے تو ترک فرض کے جرم کی سزا کا مستحق قرار پائے۔ فی الحقیقت سارے کا سارا قرآن اسی ''العلم'' کا آئینہ دار ہے اور نبی اکرم ﷺ نے بہ حیثیت معلم کتاب و حکمت اصل زور اسی العلم کو پھیلانے پر صرف کیا ہے۔ اس کی مختصر جامع تعریف حضورؐ نے ان الفاظ میں کی ہے کہ ''وہ علم جس کے ذریعے اللہ کی رضا حاصل کی جاتی ہے۔'' (روایت ابو ہریرہ مشکوٰۃ کتاب العلم)

علم کا آخری مقصد کیا ہے؟ قرآنی اصطلاحات کے مطابق اس سوال کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ علم حق کے ذریعے عمل صالح کا حصول، اعمال صالحہ سے حیات طیبہ کی تشکیل، اور حیات طیبہ سے نفس مطمئنہ کے مقام تک رسائی ـــــ علم کا مقصود ہے۔

اگر ذرا اور اجمال سے کام لیا جائے تو کہنا یہ چاہئے کہ علم کا کام یہ ہے کہ وہ غلط اور صحیح، حق اور باطل، مفید اور مضر، نیکی اور بدی کو الگ الگ چھانٹ کر ہمارے سامنے رکھ دے، تعلیم نبوت کا منتہا رشد و غیٔ میں امتیاز پیدا کر دینا ہے۔[3] نبی کی تعلیم کا فرقان ہونا لازم ہے۔[4]

اسلامی حکمت علم کی پوری تفاصیل کو سمیٹنے کے لئے ایک مستقل مقالہ چاہئے یہاں محض بیان کردہ چند نکات پر اکتفا کئے بغیر چارہ نہیں۔ البتہ یہ غلط فہمی رفع کر دینا ضروری ہے کہ العلم کی متذکرہ اہمیت کا مطلب یہ نہیں کہ دوسرے طبعی اور عقلی علوم سے توجہ ہٹائی جائے جن کی مدد

---

[1] ملاحظہ ہو آیت: يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (۱۴۔۲۷)

[2] ملاحظہ ہو حدیث: اطلبو العلم فریضه علی کل مسلم و مسلمة (مشکوٰۃ کتاب العلم)

[3] ملاحظہ ہو آیت: قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (۲:۲۵۶)

[4] ملاحظہ ہو آیت: هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ (۲:۱۸۵)

کے بغیر انسانی زندگی کی بہت سی ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں۔

قابل لحاظ بات صرف یہ ہے کہ ہمیں ''العلم'' کی اساس پر تمام علوم کو مدون کرنا چاہئے اور اپنے نظام تعلیم اور نصابات کے لئے اسی کو محور بنانا چاہئے۔ یہ ہے تعلیمی انقلاب کا نقطۂ آغاز جس کو کار پردازان تعلیم نے اب تک نہیں سمجھا اور ہم ایک ناسازگار اور نامطلوب نظام تعلیم کے زنداں میں محبوس ہیں۔

حضورؐ ایک تعلیمی تحریک کے سربراہ تھے

جب کبھی کوئی نبی اٹھتا ہے تو وہ ایک ہمہ گیر تہذیبی انقلاب اور ایک تعلیمی تحریک کا علمبردار بھی ہوتا ہے۔ حضورؐ بھی زندگی کے ہر شعبے میں تبدیلی لانے کے لئے دین حق کو لے کر مبعوث ہوئے اور عقائد و افکار سے لے کر احکام و قوانین تک ہر چیز کی تعمیر نو کا کام آپ کے سامنے تھا۔ اتنا بڑا کام انجام دینے کے لئے حضور ﷺ معلم الناس ہی نہیں تھے' ایک وسیع تعلیمی تحریک کے سربراہ بھی تھے۔

اسلام جس طرح دین ہدایت ہے' اسی طرح بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ علم اور دین تعلیم و تعلم بھی ہے۔ جس دین کا آغاز حکم ''اقراء'' سے ہوتا ہو۔[1] جس کے اصل مخاطب اولوالالباب[2] ہوں جس کے اسرار و رموز کو پا کر ایمان کے معیار کمال تک پہنچنے والے الراسخون فی العلم ہوں[3] جو براہین پیش کر کے مخالفین سے بینات و براہین طلب کرتا ہو[4] جو تدبر و تفکر کا مطالبہ کرتا ہو' اور جو سمع' بصر اور فواد سے کام نہ لینے والوں کو مویشیوں سے بدتر قرار دیتا ہو[5] جو کتاب الٰہی کا پشتارہ کندھوں پر لاد کر اس میں غور و فکر نہ کرنے والوں کو ایسے گدھے سے تشبیہ دیتا ہو جس پر علم کا دفتر لدا ہو۔[6] اس کے بارے میں یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ وہ اسلام کے لئے ایک تعلیمی تحریک کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (۹۶:۱)

۲۔ لِیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِهٖ وَلِیَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۳۸۔۲۹)

۳۔ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ (۳:۷)

۴۔ ملاحظہ ہو آیت: هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۲۔۱۱۱)

۵۔ ملاحظہ ہو: اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (۲۵۔۴۴)

۶۔ ملاحظہ ہو آیت: كَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا (۶۲۔۵)

دین حق کی تعلیمی تحریک کے سربراہ کی حیثیت سے حضورؐ کے لئے پورا معاشرہ کلاس روم تھا' اور آپ ذہنی و فکری لحاظ سے بھی تعلیم دینے والے تھے۔ اخلاقی و معاشرتی لحاظ سے بھی فریضہ تعمیر ادا کرنیوالے تھے' سیاست و اقتصاد کے دائروں میں بھی صراط مستقیم کی نشاندہی کرنے والے تھے اور مخالف و مزاحم تخریبی قوتوں کے مقابلے میں جنگاہ کے اندر بھی کمان کرنے والے تھے۔ حضورؐ نے عملاً تعلیمی تحریک چلا کر توسیع علم کے لئے جو کام کیا اس کا بڑا نمایاں نتیجہ یہ نکلا کہ جن لوگوں تک حضورؐ کا پیغام پہنچا ان کے اندر طلب علم کی اتھاہ پیاس پیدا ہو گئی اور جوں جوں دین حق پھیلتا گیا ہر قسم کی علمی ترقیات کی رفتار تیز ہوتی چلی گئی۔

نبی اکرم ﷺ کا معلمانہ منصب اور حکمت تعلیم

قرآن میں ایک سے زیادہ مرتبہ حضورؐ کو معلم کتاب و حکمت اور مزکی قرار دیا گیا ہے[۱] حضورؐ خود اپنے آپ کو معلم قرار دیتے ہیں۔[۲] مسجد نبوی میں بیک وقت آپؐ ایک طرف حلقہ ذکر دیکھتے ہیں اور دوسری طرف مجلس تعلیم و تعلم' تو دونوں کا استحسان کرتے ہوئے مجلس تعلیم کو ترجیح دے کر اس میں جا شریک ہوتے ہیں۔[۳] حضورؐ نے رات کے تھوڑے سے حصے میں تعلیم دینے کو شب زندہ دارانہ عبادت سے افضل قرار دیا۔[۴]

آیئے ذرا ایک نظر اس تعلیمی حکمت پر بھی ڈالتے چلیں جس سے حضورؐ نے بہ حیثیت معلم کام لیا اور بعد کے معلمین کے لئے واضح نشانات راہ چھوڑ گئے۔ حضورؐ کی حکمت تعلیم کے نکات کو نمبر وار پیش کیا جا رہا ہے۔

1. قرآن میں حضورؐ کے لئے معلمانہ ذمہ داری کو بلاغ مبین تک محدود کر دیا گیا ہے۔[۵] یعنی وضاحت سے بات پہنچا دینا اور تفہیم کا حق ادا کر دینا ہر سچے معلم کی معلمانہ ذمہ داری ہے۔

---

[۱] ملاحظہ ہو آیات: ۲:۲-۶۲'۲'۱۱-۳'۱۶۴
[۲] مشکوٰۃ کتاب العلم۔ روایت عبداللہ بن عمرؓ۔
[۳] ایضاً
[۴] مشکوٰۃ کتاب العلم۔ روایت ابن عباسؓ۔
[۵] ملاحظہ ہو آیت: فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۳:۲۰

- اوپر کے اصول کا دوسرا پہلو یہ کہہ کر حضورؐ پر واضح کیا گیا کہ آپ مخاطب لوگوں کے لئے چوبدار یا جبار نہیں بنائے گئے ہیں۔[۱] یعنی معلمانہ کام کی روح محبت و خیر خواہی ہے۔ اس فریضہ کو انجام دینے میں جبر و تشدد کی اسپرٹ راس نہیں بیٹھتی۔
- حضور کو جو حکمت تعلیم سکھائی گئی اس کا تقاضا یہ ہے کہ معلم نرم خو ہو' تند خو نہ ہو[۲] بصورت دیگر یا تو زیر تعلیم جماعت تتر بتر ہو جائے گی یا آج کل کے نظام میں اگر اسے کلاس روم میں بیٹھنے کا پابند کیا گیا تو کم سے کم طلبہ کے دل و دماغ ضرور کلاس روم سے فرار کر جائیں گے۔

حضورؐ نے خود اپنے رفقائے کار کو ہدایات دیں کہ لوگوں کے لئے آسانیاں پیدا کرو' مشکلات نہ پیدا کرو' ان کو بشارت دینے والے بنو' نفرت دلانے والے نہ بنو۔[۳]

- حضورؐ کے سامنے اپنا تعلیمی نصب العین پوری طرح واضح تھا یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر کار بند ایک ایسی مرکزی جماعت کا تیار کرنا جو ساری انسانیت کے سامنے خدا پرستانہ نظام حیات کی صداقت کی گواہی دے سکے اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ اس نظام حیات کو چلانے کے لئے ایمان و کردار سے آراستہ لیڈر' افسر' کارکن اور شہری تیار کئے جائیں۔
- حضورؐ کی حکمت تعلیم ہمیں معلمانہ کام کا مشنری تصور دلاتی ہے۔ ہر نبی نے اپنی مخاطب قوم کو تعلیم حق دیتے ہوئے یہ اعلان کیا تھا کہ میں تم سے اس خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا[۴] میرا اجر تو اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے۔ یہی اصول حضورؐ کا بھی تھا اور آپؐ نے اپنے تیار کردہ معلّمین کو اس سے منع فرمایا کہ وہ شاگردوں اور طلبہ سے کوئی حق الخدمت وصول کریں۔

۱۔ ملاحظہ ہو آیات: وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ (۵۰۔۴۵)

۲۔ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (۸۸۔۲۲)

۳۔ حدیث: یسروا ولا تعسروا بشروا ولا تنفروا (ریاض الصالحین۔ باب العلم و الا فادة والرفق روایت حضرت انس) نیز حدیث: انما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین۔ بخاری روایت ابی ھریرہ۔

۴۔ ملاحظہ ہو آیت۔ لَا يَسْئَلُكُمْ اَجْرًا (۳۶۔۲۱)

اس اصول سے یہ بات لازمی نتیجے کے طور پر اخذ ہوتی ہے کہ معلم کا کام کسی بڑھئی یا ترکھان یا آہن گر کی طرح کا پیشہ ورانہ کام نہیں ہے کہ جس نے پیسے دیئے اس کے حسب منشا کام کر دیا۔ بلکہ یہ مشنری سپرٹ سے کرنے کا کام ہے اور اسے وہی انجام دے سکتا ہے جو اس چیز کا خود قائل ہو اور اس پر ایمان رکھتا ہو جس کی تعلیم دینے وہ چلا ہے۔ اسلامی نظام تعلیم میں مخالفین اسلام یا منافقین کے لئے کام کرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ چنانچہ حضورؐ کا ایک ارشاد ہے کہ منافقین میں تفقہ فی الدین کی صفت نہیں پیدا ہو سکتی۔[۱]

تعلیم کے اس مشنری تصور کے ساتھ جب بڑے پیمانے پر تعلیمی ادارات قائم کر کے کثیر التعداد معلمین سے ان کا پورا وقت لیا جانا ہو تو اس صورت میں یہ ذمہ داری ریاست کی ہے کہ وہ ان کی کفالت کا انتظام کرے۔

◆ ۶ تعلیم کے مشنری کام کو سرانجام دینے کے لئے اوپر کے اشارات کے مطابق معلم میں جہاں اپنے مخاطبین کے لئے محبت و خیر خواہی اور نرم خوئی کے جذبات ہونے چاہئیں' وہاں حضورؐ کے مسلک کا تقاضا یہ ہے کہ خوش آئند طرز تکلم اختیار کیا جائے۔[۲] اور بحث و اختلاف کا موقع پیش آئے تو جدال احسن سے کام لیا جائے یعنی خوشگوار انداز میں تبادلہ خیالات کیا جائے۔[۳]

◆ ۷ حضورؐ کی حکمت تعلیم کا ایک تقاضا یہ تھا کہ لوگوں سے ان کی عقلی و ذہنی استداد کے مطابق خطاب کیا جائے۔ اس میں عمر کو بھی ملحوظ رکھنا ہو گا' شہری اور دیہاتی کے فرق پر بھی نگاہ رکھنی ہو گی' مبتدی اور منتہی کے مراتب کا خیال بھی کرنا ہو گا۔

◆ ۸ حضورؐ نے تعلیم و تربیت میں تدریج کے اصول کو اختیار کیا ایک حدیث میں قبائل میں جا کر تعلیم و تبلیغ کا کام کرنے والوں کو یہ ہدایت فرمائی کہ چھوٹتے ہی دین کے سارے تقاضے لوگوں کے سامنے رکھ کر انہیں دہلا نہ دیا جائے بلکہ پہلے انہیں اساسی کلمہ کا قائل بنایا جائے' پھر اگر وہ توحید و رسالت کو مان لیں تو ان کو نماز کی دعوت دی جائے پھر اس کے بعد روزہ' زکوٰۃ اور حج کی دعوت دی جائے۔[۴]

---

۱ مشکوٰۃ۔ کتاب العلم۔ روایت ابی ہریرہؓ

۲ ملاحظہ ہو آیت: قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (۲:۸۳)

۳ ملاحظہ ہو آیت: وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (۲۹۔۴۶)

۴ حدیث (مشکوٰۃ کتاب الزکوٰۃ روایت ابن عباسؓ)

٭ حضورؐ کی حکمت تعلیم میں ایک اصولی بات یہ ملتی ہے کہ آپؐ مخاطب جماعت کی اکتاہٹ کا پورا خیال رکھتے تھے کہ تعلیم وخطاب کا سلسلہ اتنا بوجھل نہیں ہونا چاہئے کہ لوگ اکتانے لگیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ نے حضورؐ کی اس خوبی کو بیان کیا ہے کہ آپؐ مناسب وقفوں پر خطاب فرماتے تھے[1]

حضورؐ کے اس اصول کی ایک شہادت حضرت ابن عباسؓ کی طرف سے حضرت عکرمہؓ نے ہم تک پہنچائی ہے کہ ابن عباسؓ نے حضورؐ کے مسلک کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہیں یہ تلقین کی کہ لوگوں کو ہفتے میں ایک بار جمعہ کے دن تعلیم دو۔ اگر زیادہ کی ضرورت ہو تو دوبار یا حد سے حد تین بار۔[2]

اس اصول کی بنا پر حضورؐ ہمیشہ مختصر تعلیمی خطاب فرماتے تھے جو تیر بہدف ہوتے تھے۔ حضورؐ کا سب سے طویل خطبہ حجتہ الوداع کا خطبہ ہے۔ مگر وہ بھی اپنی جگہ بے حد مختصر ہے۔

پھر ایک خاص بات یہ سامنے آتی ہے کہ احادیث میں مختلف افراد اور مجالس سے حضورؐ کی جن تعلیمی گفتگوؤں کا ریکارڈ ملتا ہے' ان میں سے بعض میں ایک بات' بعض میں دو باتیں اور بعض میں چار یا پانچ باتیں ملتی ہیں۔ کوئی مثال ایسی نہیں ہے کہ بیسیوں تلقینات اور نصیحتیں ایک ہی سانس میں کر ڈالی گئی ہوں۔

٭ تعلیم و تدریس کے لئے طلب علم کی ذہنی فضا موجود ہونا ضروری ہے' چنانچہ حضورؐ کی معلمانہ حکمت[3] یہ تھی کہ مجالس صحابہ میں جب تشریف لاتے تو جن موضوعات پر گفتگو ہو رہی ہوتی' ان کا تسلسل جاری رہنے دیتے اور خود بھی ان میں حصہ لیتے۔ تعلیمی گفتگو کے لئے آپؐ یا تو طلب علم کی فضا کے متلاشی رہتے جو کسی سوال یا بحث یا اجتماعی قضیے سے از خود ہو جاتی' یا پھر خوبصورت طریقے سے ایسی فضا پیدا فرماتے۔

اسی بنا پر حضرت ابن عباسؓ نے یہ کہا کہ جب کسی مجلس کے لوگ اپنی باتوں میں مشغول ہوں تو ان کی باتوں کو منقطع کر کے تعلیم و تبلیغ شروع نہ کر دو بلکہ خاموش رہو' تا آنکہ لوگ خود ہی حصول علم کی خواہش کریں' یعنی کوئی سوال اٹھائیں۔[4]

۱۔ حدیث (مشکوٰۃ کتاب العلم۔ روایت عبداللہ بن مسعودؓ (مسلم و بخاری)

۲۔ حدیث مشکوٰۃ کتاب العلم۔ روایت عکرمہؓ (بخاری)

۳۔ حدیث (مشکوٰۃ کتاب العلم۔ روایت عبداللہ بن عمروؓ)

۴۔ مشکوٰۃ کتاب العلم۔ روایت عکرمہؓ

◆ معلمی کا فریضہ اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک کہ معلم اپنے مخاطب گروہ کی توجہات کو مرتکز نہ کرے چنانچہ حضورؐ نے توجہات کو اپنی بات کی طرف مرتکز کرنے کے لئے مختلف موثر صورتیں اختیار فرمائیں۔ مثلاً

کبھی چونکا دینے والی کسی بات سے آغاز کلام کیا گیا۔ جیسے یہ قرآنی پیرایہ آغاز سورہ کہ "آن پہنچا اس کا فیصلہ۔" [۱]

کبھی سوال سے گفتگو شروع فرماتے مثلاً کیا تم فلاں بات جاننا چاہتے ہو یا کیا میں تم کو بھلائی کے راستے نہ بتاؤں؟ یا مثلاً هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا [۲] یا مثلاً خطبہ حجتہ الوداع کے آغاز میں مجمع سے دریافت کیا یہ کون سا شہر ہے؟ یہ کون سا مہینہ ہے؟ یہ کون سا دن ہے؟ [۳]

کبھی کوئی حیرت زا منظر ذہنوں کے سامنے آراستہ فرما دیتے مثلاً' جب آسمان پھٹ جائے گا' جب تارے جھڑ جائیں گے اور جب دریا اپنی رودگاہوں سے باہر نکل کر آپس میں مل جائیں گے اور جب قبریں کھول دی جائیں گی۔ [۴]

اس سلسلے میں زیادہ مثالیں پیش کرنا غیر ضروری ہے۔

◆ اصولِ تکرار سے بھی حضورؐ نے بارہا کام لیا۔ کسی اہم بات کو ذہن نشین کرانے کے لئے تین تین بار اسے دہراتے۔ اسی طرح کسی کے ہاں تشریف لے جاتے تو تین مرتبہ اجازت طلب فرماتے۔ [۵]

◆ حضورؐ نے کارِ تعلیم کے لئے مختلف دائرے اور مختلف سطحیں مقرر فرمائیں۔

—— ایک دائرہ عمومی تعلیم کا تھا۔

—— دوسرا دائرہ خصوصی مجالس کا تھا جن کا مقصد معیاری علماء اور قائدین کو تیار کرنا تھا۔

---

۱ ملاحظہ ہو آیت ۱۶۔۱

۲ ملاحظہ ہو لہ‌تت: ۱۸۔۱۰۳

۳ حدیث بخاری و مسلم۔ باب قصہ حجتہ الوداع۔ روایت جابرؓ بن عبداللہ و عائشہؓ

۴ ملاحظہ ہو آیت: ۸۲۔ ۱ تا ۴

۵ حدیث۔ مشکوٰۃ۔ کتاب الاسیذان۔ روایت ابو سعید خدریؓ

ــــــ تیسرا دائرہ خواتین کی تعلیم کا تھا جس کے لئے آپؐ نے ہفتے میں ایک دن مخصوص کر دیا تھا اور جس کے لئے حضرت عائشہؓ کو مامور فرما کر لوگوں کو تلقین فرمائی کہ دین کا آدھا علم یعنی نظام معاشرت اور خواتین کے متعلق معلومات' ان سے حاصل کرو۔

ــــــ چوتھا دائرہ خاص موقعوں پر خاص خاص افراد کو انفرادی توجہ سے تعلیم و تربیت دینے کا تھا۔

ــــــ پانچواں دائرہ باہر سے حصول تعلیم کے لئے آنے والے وفود کو تیار کر کے قبائل میں فروغ تعلیم کے لئے واپس بھیجنے کا تھا۔

◆ ''العلم'' کے علاوہ حضورؐ نے ہر قسم کے مفید علوم و فنون کے سیکھنے کی طرف توجہ دلائی۔ نوشت و خواند کو پھیلانے کی سعی فرمائی۔[۱] صحت زبان کے اہتمام کی تلقین کی' فن کتابت کے لئے ہدایات دیں۔ صحابہ کو عبرانی زبان سیکھنے اور تورات کا علم حاصل کرنے پر متوجہ کیا۔ میدان بدر میں مجاہدین کی صف بندی کرا کے اور آغاز جنگ کے لئے انہیں پابند فرمان بنا کر اور کوڈ ورڈز کی تعلیم دے کر دفاعی نظام کا بالکل نیا تجربہ شروع کیا۔[۲] نوجوانوں کو تعلیم جہاد دینے کے لئے دوڑ اور تیر اندازی کے مقابلے کرائے' عین میدان جنگ سے قلعہ شکن آلات بنانے کی تربیت حاصل کرنے کے لئے صحابہ کی ایک جماعت کو مقام جرش کی طرف بھیجا۔[۳]

خواتین کو اس دور کی ضروریات کے مطابق چرخہ کاتنے کی نصیحت کی۔ قریش کی عورتوں میں بچوں کی تربیت کا جو سلیقہ پایا جاتا تھا' اس کی تحسین کر کے اس صلاحیت کو بڑھانے کا راستہ نکالا۔ زیر تربیت رفقاء کو استیذان کے آداب سکھائے' پراگندہ بالوں کو ترشوانے اور کنگھی کر کے سنوارنے کی تلقین کی' عیدین کے تہوار مسرت سے منانے کے لئے جائز حدود میں تفریح کا موقع پیدا کیا' شادی بیاہ کے موقعوں پر اعلان نکاح کر کے مسرت آمیز انداز سکھائے اور لوگوں کو صحنوں کی صفائی کی نصیحت کی اور راستوں سے کانٹے اور کوڑا کرکٹ ہٹانے کی

۱؎ حدیث۔ مشکوٰۃ کتاب الاداب۔ روایت زید بن ثابتؓ (ترمذی)

۲؎ حدیث۔ مشکوٰۃ۔ کتاب الجہاد۔

۳؎ ملاحظہ ہو آیت۔ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ (۸۔۶۰)

تربیت دی۔ نیز خندہ پیشانی کے ساتھ لوگوں میں میل جول کے آداب سکھائے۔

حضورؐ کا یہ وسیع تصور تعلیم قرآن کے جس کلمہ حکمت پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو آخرت کی بھلائی کے ساتھ دنیا میں بھی بھلائی حاصل کرنی ہے۔[۱]

۱۵ حضورؐ نے اپنی تعلیمی حکمت میں جسم کے حقوق کو پوری اہمیت دی۔ قرآن نے حضرت طالوتؑ کو بنی اسرائیل کی سیاسی قیادت پر مامور کرتے ہوئے یہ معیار انتخاب پیش کیا ہے کہ ان کو علم اور جسم دونوں سے برتری حاصل ہے۔[۲] اسی معیار کے مطابق حضورؐ نے جسم کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر فرمایا کہ فان لجسدك عليك حق[۳]

اس موقعہ پر حضورؐ کا یہ ارشاد قابل توجہ ہے کہ قوی مومن کمزور مومن سے بہتر ہے۔[۴]

— جسم کی ضروریات مدنظر رکھنے کا ثبوت وہ طبی تعلیم بھی ہے جو حضورؐ نے اس دور کے فن طب کے مطابق اپنے پیرووں کو دی۔[۵]

۱۶ حضورؐ نے تعلیم کے فروغ کے لئے سوال کو یہ فرما کر بڑی اہمیت دی کہ علم ایک صندوق ہے جس کی کنجی سوال ہے۔ یعنی سوالات اٹھانا اور سوالات کا خیر مقدم کرنا بھی منصب معلمی کا لازمہ ہے۔

۱۷ حضورؐ نے جدید دور کے فلسفیوں سے بہت پہلے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ تعلیم کا آغاز مہد سے ہونا چاہئے اور اس کا تسلسل لحد تک جاری رہنا چاہئے۔[۶]

۱۸ حضورؐ کی حکمت تعلیم کا ایک سبق یہ ہے کہ علم یہ دیکھ کر سیکھو کہ کس سے سیکھ رہے ہو یعنی آیا تمہارا معلم و استاد بلحاظ قابلیت اور بلحاظ کردار قابل اعتماد ہے؟[۷]

۱۔ ملاحظہ ہو آیت: رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۲۔۲۰۱)

۲۔ ملاحظہ ہو آیت: زَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (۲۔۲۴۷)

۳۔ حدیث: ریاض الصالحین۔ باب فی الاقتصاد فی الطاعۃ۔ روایت عمرو بن العاص۔

۴۔ حدیث: ریاض الصالحین۔ باب فی المجاہدہ۔ روایت ابو ہریرہؓ

۵۔ احادیث و رباب طب۔ زاد المعاد از حافظ ابن القیم۔ ج ۳ ذکر الادویہ والا غذیہ۔ نیز ملاحظہ ہو: الاصابہ از ابن حجر و طبقات الاطباء عن ابن ابی اصیبعہ۔

۶۔ حدیث: اطلبوا العلم من المهد الى اللحد۔ منهاج المتعلم (بحوالہ تاریخ تعلیم و تربیت اسلام از ڈاکٹر احمد شبلی

۷۔ مشکوۃ کتاب العلم۔

اس ارشاد کی روشنی میں ایک اسلامی ریاست کے لئے یہ لازم آتا ہے کہ معلموں کے انتخاب میں بڑی چھان بین سے کام لے اور نہ صرف ان کی سندات اور علمی قابلیت کا جائزہ لے بلکہ بلحاظ کردار ان کے خاندانی پس منظر اور تعلیمی دور کے ریکارڈ کو بھی زیر غور لائے۔ جن لوگوں کو نئی نسل کے خیالات اور کردار کی تعمیر و تشکیل کا نازک ترین فریضہ سونپا جا رہا ہو' ان کے متعلق دوسری ملازمتوں کے امیدواروں سے زیادہ سخت چھان بین ہونی چاہئے۔ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ آیا معلمی کا کوئی امیدوار محض پیشہ ورانہ ذہنیت کے ساتھ آ رہا ہے یا اس کے اندر صحیح مشنری جذبہ موجود ہے۔ بلکہ ملازمت میں آنے کے بعد بھی اساتذہ کے کردار کا ریکارڈ زیر نظر رکھنا چاہئے اور جہاں کہیں کوئی آدمی اس کام کے لئے غیر موزوں نظر آئے اسے فوراً اس مقدس ذمہ داری سے الگ کر دیا جائے۔

۱۹. حضورؐ نے ایسے علم سے بچنے کے لئے خدا کی پناہ طلب فرمائی جس سے لوگوں کو نفع نہ ہو۔[۱] اس کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ کسی شخص کا علم حاصل کر کے اسے روک کے بیٹھ رہنا علم کی منفعت کو ضائع کرنا ہے' دوسرے یہ کہ بعض علم و فنون ایسے ہو سکتے ہیں جو کوئی ٹھوس افادیت انسانوں کے لئے نہ رکھتے ہوں۔

۲۰. حضورؐ نے علم اور دماغی قوتوں کے غلط استعمالات سے پرہیز کی تاکید کی ہے۔[۲] مثلاً آپؐ نے جبر و قدر کے مسئلے پر ایک ایسی بحث کرنے سے صحابہؓ کو روک دیا جس میں ایک فریق حقیقت کے ایک نصف حصے کو لئے ہوئے تھا اور دوسرا فریق دوسرے نصف حصے کو اور سچائی کے دونوں حصوں کو آپس میں ٹکرایا جا رہا تھا۔ اسی سلسلے میں آپؐ نے فرمایا کہ قرآن کے ایک حصے کو اس کے دوسرے حصے سے نہ ٹکراؤ۔ واضح رہے کہ بحث و مناظرہ کی بیشتر صورتوں میں جو باعث تفرقہ و انتشار ہوتی ہیں' یہی خرابی پائی جاتی ہے۔ پھر آپؐ نے ایسے سوالات پر بحث کرنے سے منع فرمایا جن کا نتیجہ سوائے گمراہی کے کچھ نہیں۔ مثلاً یہ سوال کہ خدا کو کس نے پیدا کیا؟[۳] اس طرح کے سوالات سے منع کیا گیا ہے

---

۱. حدیث۔ مشکوۃ باب الاستعاذہ۔ روایت زید بن ارقم و ابو ہریرہؓ

۲. حدیث۔ مشکوۃ باب الایمان والقدر۔ روایت ابو ہریرہؓ

۳. حدیث۔ مشکوۃ۔ باب الوسوسہ۔ روایت ابو ہریرہؓ (ابوداؤد)

کہ جس دائرہ حقائق کے لئے ذرائع علم دیئے ہی نہیں گئے۔ اس میں قدم رکھنے سے سوائے گمراہی کے کچھ حاصل نہیں۔

۲۱ ایک ہدایت حضورؐ نے یہ دی ہے کہ علم کے ذریعے مغالطہ نہ دیا جائے[۱] اور یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے بیشتر اہل علم اور دانش ور اپنی ذہنی برتری کے ذریعے کم علم اور سادہ دل لوگوں کو مغالطے دیتے ہیں۔ آج بے شمار ایسے حکیمانہ اقوال اور دانشورانہ نکات کو علم و استدلال اور پروپیگنڈے کے زور سے ناقابل تردید کلیات کا مقام دے دیا گیا ہے۔ جن کا تجزیہ کریں تو وہ ایک دلفریب مغالطہ ثابت ہوتے ہیں۔

پوری نوع انسانی کو آج کے علم نے چند بڑے بڑے مغالطوں کا شکار بنا دیا ہے۔

ایسے دائرہ ہائے امور غیب میں قدم رکھنے سے بھی روکا جن تک آدمی کے علم کی سرے سے دسترس ہی نہیں اور نہ ایسے دوائر کے لئے اسے وسائل علم دیئے گئے ہیں۔[۲]

حضورؐ نے حجود بآیات اللہ' یعنی خدا کی آیات کی مخالفت کرنے کو شدید قسم کے نقصان علم کا موجب بتایا۔[۳] جس کے اثر سے سمع' بصر اور فواد کی قوتیں بھی صحیح طور پر کام نہیں کر سکتیں۔

۲۲ بچوں کے متعلق حضورؐ کی حکمت تعلیم ہمیں ایک خاص نقطہ نظر دیتی ہے جس کے چند نمایاں ارشادات یہ ہیں:

—— حضورؐ نے بچوں کی معصومیت کی تعبیر یہ کہہ کر فرمائی کہ یہ تو جنت کے باغوں کے پھول ہیں' یعنی ان سے محبت و ملاطفت کا برتاؤ کرنا چاہیے۔[۴]

—— پھر بچوں کے متعلق یہ فرمایا کہ وہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتے ہیں' بعد میں گھر اور معاشرے کا ماحول انہیں کسی دوسرے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔[۵]

۱۔ حدیث۔ مشکوٰۃ کتاب العلم۔ روایت معاویہ۔

۳۔ ملاحظہ ہو آیت: وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ (۱۷۔۳۶)

۲۔ ملاحظہ ہوں آیات: وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ (۲۹۔۴۹) وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ (۳۱۔۳۲)

۴۔ حدیث: مشکوٰۃ۔ کتاب الوسوسہ۔ بحوالہ حضرت عائشہؓ (مسلم)

۵۔ حدیث۔ مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر' روایت ابوہریرہ (مسلم)

ــــ میرے نزدیک فطرت اسلام سے مراد وہی بات ہے جو قرآن میں تمام انسانوں کے لئے کہی گئی ہے۔[۱] اور اس کی تشریح ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے جس میں حضورؐ بتاتے ہیں کہ ہر فرزند آدم کے اندر ایک آواز فرشتے کی ہوتی ہے اور ایک آواز شیطان کی' یعنی اس کے اندر خیر وشر کے دوگونہ رجحان پائے جاتے ہیں۔[۲] اور اسی کے ساتھ ساتھ اسے تمیز خیر وشر کا میلان بھی دیا گیا ہے۔ اس ارشاد کی رُو سے یہ گھر' مدرسے اور معاشرے کی تعلیمی سرگرمیوں پر منحصر ہے کہ وہ بچے کے اندر نیکی کی ملکوتی آواز کو زور دار بنادیں' یا بدی کی شیطانی پکار کو غالب کر دیں۔

ــــ پھر بچوں کی تربیت کے سلسلے میں حضورؐ نے والدین کو یہ تاکید بھی کی کہ وہ اپنی ساری اولاد سے مساوات کا معاملہ کریں' بصورت دیگر بچوں میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی اصول اجتماعی نظام تعلیم پر بھی لاگو ہوگا۔ درسگاہوں میں تمام طلباء کے ساتھ مساویانہ معاملہ ہونا چاہئے اور سب کے لئے حقوق وفرائض کی یکسانی کے ساتھ' اساتذہ کا رویہ ایک ہی جیسا ہونا چاہئے۔

ــــ حضورؐ کی حکمت تعلیم نے نظریۂ سزا بھی دیا جس کے دو نکات ہیں۔ ایک یہ کہ شدید ضرورت کے تحت سات سال کی عمر سے سزا دی جا سکتی ہے۔[۳] دوسرے یہ کہ ایسی جسمانی سزا نہیں دی جانی چاہئے جو نشان چھوڑنے والی ہو۔ سخت قسم کے تھپڑ یا گھونسے یا بید یا قمچیاں نہیں لگانی چاہئیں۔ لازم نہیں کہ سزا جسمانی ہی ہو' اس کی دوسری صورتیں بھی ہیں۔ جیسے کہ نشوز کی صورت[۴] میں عورتوں کو خواب گاہوں سے الگ کرنے کے قرآنی حکم کی مثال موجود ہے۔

نظریۂ سزا کے سلسلہ میں چند وضاحتیں ضروری ہیں:

(الف) تعلیم کا بنیادی تقاضا محبت وشفقت ہے' سزا کی گنجائش محض غیر معمولی مواقع کے لئے استثنائی درجے میں رکھی گئی ہے۔

---

۱ ملاحظہ ہو آیت: فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا (۳۰۔۳۰)

۲ حدیث: ان للشیطان لمتہ بابن ادم وللملك لمتہ' الخ۔ مشکوۃ کتاب الایمان۔ روایت ابن مسعود۔

۳ حدیث: مشکوۃ' کتاب الصلوٰۃ روایت عمرو بن شعیب (ابوداؤد۔ کتاب الایمان)

۴ ملاحظہ ہو آیت: سورہ نساء۔ آیت ۳۴

(ب) اس نظریۂ سزا کے سامنے یہ حکیمانہ شعور بھی ہونا چاہئے کہ بگڑے ہوئے ماحول کے مقابلے میں اس دور سعادت کا معاملہ الگ تھا جس کو پیش نظر رکھ کر حضورؐ نے نظریۂ سزا بیان فرمایا۔ سنوری ہوئی سوسائٹی میں ڈسپلن توڑنے اور سرکشی کرنے کی مثالیں شاذ ہوتی ہیں۔ اور ان پر معمولی سی سزا دینی بھی اس لئے مؤثر ہوتی ہے کہ پورا ماحول سزا دینے والے ہاتھ کے پیچھے ہوتا ہے۔ بگڑی ہوئی سوسائٹی میں جہاں برائی کی قوتیں حسین و دلکش اسالیب سے غلط روش کو مزین بنا کر سامنے لاتی ہوں اور ان کی وجہ سے فکری و اخلاقی محاذ پر ایک مستقل جنگ برپا ہو' دو ہی طرز عمل ہو سکتے ہیں یا تو سزا اصول عام بن جائے' مشفقانہ رویہ صرف نادر صورتوں میں سامنے آئے۔ یا پھر نیکی اور سچائی کے معلم اپنی شفقت کو اور زیادہ وسیع و عمیق بنا دیں۔ ظاہر ہے کہ پہلی صورت سزا کو غیر موثر بنا دے گی' لہٰذا دوسری صورت ہی مفید نتائج دے سکتی ہے۔

(ج) سزا دہی کا معاملہ طبیب کی سی حکمت عملی کا تقاضا کرتا ہے۔ ہر قسم کے حالات میں موقع اور محل کی مناسبت کا لحاظ ضروری ہے۔

(د) بعض اصحاب کو ایک حدیث سے غلط فہمی ہوتی ہے جس کی بنا پر حضورؐ نے فرمایا کہ اولاد کے سروں سے تادیب کے عصا کو ہٹا نہ دیا جائے۔[1] یہاں تادیب کے عصا سے مراد سچ مچ کا عصا نہیں ہے بلکہ یہ ویسا ہی ہمارا استعاراتی انداز بیان ہے جیسے کہا جائے کہ اپنے مخالفین کو بھی احسان کی زنجیروں میں باندھ کر رکھو یا دشمن کو مارو تو بھلائی کی تلوار سے مارو۔ اگر کوئی شخص ان مواقع پر زنجیروں اور تلوار کے لفظ کے لغوی معنی لے لے تو وہ صریحاً غلطی کرے گا۔ یہاں استعاراتی مفہوم لیا جاتا ہے۔ یعنی احسان کی زنجیروں اور بھلائی کی تلوار سے مراد احسان اور بھلائی کے سوا کچھ نہیں۔ ٹھیک اسی طرح تادیب کے عصا سے مراد محض تادیب ہی ہے۔ تادیب یا ادب سکھانا یا تربیت دینا ایک فن لطیف ہے۔

◆ حضورؐ کی تعلیم کا مرکزی نصاب قرآن[2] تھا۔ جو پوری انسانی زندگی کے لئے جامع

---

[1] حدیث: ولا ترفع عنهم عصاك ادبا۔ مشکوۃ باب الکبائر وعلامات النفاق۔ روایت حضرت معاذؓ

[2] متعدد احادیث: مشکوۃ کتاب فضائل القرآن

گائیڈ بک ہے۔ تعلیم کے بقیہ شعبے اسی مرکزی نصاب کے ارد گرد مرتب ہوتے ہیں۔

- سرکار رسالت مآبؐ کی حکمت تعلیم کا ایک لازمی تقاضا یہ ہے کہ جس طرح معلم کو متعلمین کے ساتھ محبت و شفقت کا برتاؤ کرنا چاہئے۔ اسی طرح متعلمین کے لئے لازم ہے کہ وہ معلم کا ادب و احترام رکھیں۔[1] اس ہدایت میں یہ تقاضا از خود مضمر ہے کہ معلم بلحاظ قابلیت اور بلحاظ کردار معلمانہ روش کے ایسے اوصاف سے متصف ہو کہ طلباء میں اس کے لئے احترام نشوونما پائے۔

توسیع تعلیم کے لئے حضورؐ کی مساعی

اب اجمالاً ان مساعی پر نگاہ ڈالئے جو حضورؐ نے توسیع تعلیم کے لئے سرانجام دیں۔ ایک طرف تو نظام صلواۃ' اس میں تلاوت قرآن اور خطاب جمعہ کا نظام بجائے خود فروغ تعلیم کا ذریعہ تھا' دوسری طرف حضورؐ خاص مواقع پر زائد خطابت بھی دیتے اور تعلیمی مجالس بھی منعقد فرماتے۔

توسیع تعلیم کے لئے آپؐ کا یہ ارشاد بڑا اہم ہے کہ اچھے لوگ وہ ہیں جو معلم ہوں یا متعلم[2] پھر آپ نے قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نارا کے قرآنی حکم کے تحت والدین پر ذمہ داری ڈالی کہ وہ اپنی اولاد کو تعلیم دیں۔[3] پڑوسیوں کو پڑوسیوں سے علم حاصل کرنے کی تلقین کی۔

لکھنے کا ہنر عام کرنے کے لئے بدر کے قیدیوں کے لئے یہ فدیہ میں بھی مقرر کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کو لکھنا سکھا دیں۔[4]

حضورؐ نے دور مکہ میں دار ارقم کو جس طرح عبادات اور مشاورت کا مرکز بنایا' اسی طرح وہ تعلیم کا پہلا مرکز بھی تھا۔[5]

مدنی دور میں دوسرا وسیع تر اور باقاعدہ قسم کا مدرسہ صفہ کے نام سے مسجد نبوی میں قائم

۱۔ حدیث: تواصعوا لمن تتعلمون منه (الجامع الصغیر الکامل لابن عدی۔ منہاج المتعلم)

۲۔ حدیث: سنن دارمی۔ المقدمہ۔ باب ۲۵۔ ۳۱

۳۔ ملاحظہ ہو سورہ تحریم: آیت ۶

۴۔ مسند امام احمد بن حنبل۔ ج ۱' ص ۲۴۶۔ نیز الکامل للمبرد۔ ج ۱' ص ۱۷۱۔

۵۔ تاریخ الامم والملوک (طبری) بحوالہ ڈاکٹر احمد شلبی

ہوا جس میں زیادہ تر باہر سے آنے والے نو مسلم اور کچھ مقامی لوگ مقیم رہ کر تعلیم حاصل کرتے۔ اسے ڈاکٹر حمید اللہ اور ڈاکٹر احمد شلبی نے اقامتی درس گاہ قرار دیا ہے۔[۱] اس درسگاہ میں نہ صرف قرآن کی سورتیں یاد کرائی جاتیں اور فن تجوید کی تعلیم دی جاتی تھی بلکہ لکھنے پڑھنے کا فن اور فقہ کا علم بھی سکھایا جاتا تھا۔[۲] مسند امام احمد بن حنبل کی ایک روایت کے مطابق درسگاہ صفہ کے طلبہ کی تعداد ایک موقع پر ستر تک پہنچی۔[۳]

حضرت عبادہؓ بن صامت کا بیان ہے کہ خود انہوں نے چند اصحاب صفہ کو قرآن اور کتابت کی تعلیم دی۔[۴] اس درسگاہ کے ایک درخشندہ طالب علم حضرت ابو ہریرہؓ تھے۔[۵]

حضورؐ کے توسیع تعلیم کے منصوبے کا ایک اہم جزو یہ تھا کہ ہر مسجد مرکز تعلیم بھی تھی۔ خود آنحضورؐ کے دور میں مدینہ میں نو مسجدیں[۶] ایسی تھیں جہاں بڑوں اور بچوں کو دین اور قرآن اور معاملات زندگی کی تعلیم دی جاتی تھی۔

توسیع تعلیم کے لئے حضورؐ مختلف قبائل کی طرف قراء کو بھجواتے۔ واضح رہے کہ درسگاہ صفہ کے فارغ التحصیل قراء کہلاتے تھے۔[۷] قراء قاری کی جمع ہے' مگر یہ لوگ آج کل کے معنوں میں قاری نہ ہوتے تھے بلکہ تلاوت قرآن کے ساتھ ساتھ فہم قرآن اور تفقہ فی الدین میں مہارت حاصل کرتے تھے۔ یہ قراء فوجی دستوں کے ساتھ بھی علاقوں میں بھجوائے جاتے' تاکہ وہ خود مجاہدین کی تعلیم کا سلسلہ سفر میں بھی جاری رکھیں۔ اور اگر کوئی قبیلہ اطاعت قبول کرے تو اس کے لوگوں کو تعلیم دیں۔[۸]

درسگاہ صفہ کے ذریعے ان قراء کی تعداد اس تیزی سے بڑھی کہ ایک مرتبہ ستر قاریوں کا قافلہ علاقہ نجد کے قبائل کی تعلیم کے لئے روانہ کیا گیا۔ ان قیمتی ہستیوں کو بئر معونہ کے مقام پر

۱۔ حدیث: سنن ابن ماجہ باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم۔
۲۔ مسند امام احمد بن حنبل۔ ج ۳' ص ۳۷۱
۳۔ ایضاً
۴۔ حدیث: ابوداؤد۔ کتاب فی کسب العلم۔
۵۔ مسلم۔ کتاب الفضائل۔ باب فضائل ابی ہریرہؓ۔ (بحوالہ تاریخ اسلام' معین الدین ندوی)
۶۔ عینی شرح بخاری' ج ۲۔ ص ۳۶۸۔ (بحوالہ تاریخ اسلام' معین الدین ندوی)
۷۔ حدیث: مسلم کتاب الامارہ ثبوت الجنۃ للشہید۔
۸۔ حدیث: بخاری' ج ۲۔ ص ۴۵

ان فریب کار بدویوں نے شہید کر دیا جنہوں نے خود ہی درخواست کر کے ان کو بلوایا تھا۔[۱]

جن ممتاز صاحب علم شخصیتوں کو حضورؐ کسی مقام پر اپنا عامل یا نمائندہ بنا کر بھیجتے ان کے ذمے وہاں کے لوگوں کو تعلیم دینے کا کام بھی کرتے۔ چنانچہ بنی حارث کی طرف خالد بن ولید کو بھیجا گیا تو ان کو تعلیم کی ذمہ داری بھی سونپی تھی۔[۲] اسی طرح عمرو بن حزم عامل یمن کو حضورؐ نے تحریری ہدایات دیں کہ وہ لوگوں کو قرآن سکھائیں' اس میں تدبر و تفکر کی تربیت دیں اور انہیں آگاہ کریں کہ ان کے حقوق کیا ہیں؟ اور ان پر فرائض کیا عائد ہوتے ہیں۔[۳]

سورۂ توبہ کی آیت ۱۲۲ کے مطابق مختلف نومسلم قبائل کے وفود مدینہ میں آ کر قیام کرتے اور حضورؐ اور صحابہؓ سے علم حاصل کر کے واپس جاتے اور اپنے لوگوں کو تعلیم دیتے۔[۴] اس قسم کا ایک وفد مالک بن الحویرث کی سرکردگی میں مدینے آ کر ۲۰ روز تک مقیم رہا۔[۵]

بعض خاص مواقع پر حضورؐ نے خصوصی معلمین کا تقرر فرمایا۔

مثلاً سب سے پہلی مثال ہجرت سے قبل کی ہے جب کہ آپؐ نے اہل مدینہ کے لئے سعدؓ بن العاص کا تقرر بہ طور معلم فرمایا اور انہیں مامور کیا کہ وہ دین سکھانے کے علاوہ لوگوں کو لکھنے کی تعلیم دیں۔ واضح رہے کہ حضرت سعدؓ خوش نویس تھے۔[۶] ان کے متعلق المجر کی روایت یہ ہے کہ انہیں معلم حکمت کا لقب دیا گیا۔[۷]

اسی طرح فتح مکہ کے بعد حضرت معاذؓ کو مکہ کے نومسلموں کی تعلیم کے لئے مامور کیا گیا۔

ان مساعی کے واضح نتائج تاریخ ہمارے سامنے رکھتی ہے۔

۱۔ حدیث: مسلم۔ کتاب الامارہ۔ باب ثبوت الجنۃ للشہید

۲۔ الوثائق السیاسۃ' مکتوب ۷۹۔

۳۔ ایضاً

۴۔ تفسیر خازن۔ تفسیر ما کان للمومنین لینفروا کافۃ (بحوالہ تاریخ اسلام' مولانا معین الدین ندوی)

۵۔ حدیث بخاری۔ باب الرحمۃ البہائم (بحوالہ تاریخ اسلام' معین الدین ندوی)

۶۔ المجر ورق ۱۵۹ (ابوداؤد)

۷۔ ایضاً

۸۔ حدیث: بخاری۔ ج ۱ ص ۴۷

وہ قوم قریش جس کے ہاں اسلام سے پہلے جملہ ۱۷ آدمی نوشت و خواند جانتے تھے۔ ان کے نبیؐ کے گرد مدینہ میں کاتبان وحی اور محرران مکاتیب کا ایک وسیع سیکرٹری ایٹ موجود تھا۔

مردوں کا معاملہ الگ رہا۔ ۵ خواتین بھی لکھنا پڑھنا سیکھ گئیں تھیں اور وہ یہ تھیں: (۱) حضرت حفصہ بنت عمرؓ (۲) حضرت ام کلثومؓ بنت عقبہ (۳) حضرت عائشہؓ بنت سعد (۴) حضرت کریمہؓ بنت مقداد اور (۵) حضرت الشفاءؓ بنت عبداللہ عدویہ جو حضرت حفصہؓ کی استاد تھیں۔[1] قرون اولیٰ میں ۱۵۴۳ خواتین محدث تھیں۔[2]

آہستہ آہستہ اہل تخصص (Specialists) پیدا ہوئے جب کہ حضورؐ نے علم فرائض میں زید بن ثابتؓ کو، قرآن خوانی اور تجوید میں ابی بن کعبؓ کو، حرام و حلال کے احکام کا علم رکھنے میں حضرت معاذؓ بن جبل کو مرتبہ اول پر شمار کیا۔[3] اسی طرح ایک موقع پر فرمایا کہ چار آدمیوں سے قرآن سیکھو: عبداللہ بن مسعود سے، سالم مولیٰ ابو حذیفہ سے، ابی بن کعب سے اور معاذ بن جبل سے۔[4]

کتنا حیرت ناک واقعہ ہے کہ یہ تیز رفتار تعلیمی سرگرمی ایسے حالات میں روبعمل آئی جب کہ مسلسل ایمرجنسی کا دور تھا اور مدینہ کی چھوٹی سی اسلامی ریاست کثیر التعداد دشمنوں کے حملہ ہائے مسلسل کی زد میں تھی۔ بات یہ ہے کہ اصل چیز تو یہ تعلیم دین ہی تھی جس کے بل پر ریاست کھڑی تھی اور جس کی دی ہوئی سپرٹ مسلمانوں کو معرکہ ہائے کارزار میں اپنے سے بڑی طاقتوں پر فتح دلا رہی تھی۔ اس تعلیم کے کام میں اگر کوتاہی رہ جاتی تو پھر اور کچھ بھی نہ ہوتا۔

دوسرا بڑا نتیجہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ العلم کے ساتھ ساتھ مختلف دینوی علوم و فنون میں بھی مسلمانوں میں نہایت تیزی سے ترقی ہوئی اور ہیئت، نجوم، جغرافیہ، طب، جراحت، فلسفہ، سائنس، ریاضی، الجبرا، کتابت، نقاشی، تزئین، تعمیر، جنگی فنون، جہاز رانی، آہن گری، صیقل گری وغیرہ میں

---

[1] فتوح البلدان۔ بلاذری۔ ص ۴۳۸

[2] ابن حجر۔ الاصابہ۔ فی تمیز الصحابہ۔

[3] ترمذی۔ مناقب عشرہ مبشرہ۔ روایت انس۔

[4] بخاری و مسلم۔ باب جامع المناقب، علم التواریخ، فن روایت و درایت۔

صدی دو صدی کے اندر مسلمانوں نے ایسے کارنامے انجام دیئے کہ ان کی علمی قوت نے یورپ کو مرعوب کر کے اپنے دائرہ اثر میں لے لیا۔

تیسرا سبق آموز نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ حضورؐ کی شروع کی تعلیمی مہم نے مسلمانوں میں ایسا فکری' تہذیبی استحکام پیدا کر دیا کہ انہوں نے یونان' ایران اور ہندوستان کے باطل اور فاسد علوم سیکھے مگر وہ ان سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے تنقیدی صلاحیتوں سے کام لے کر ہر چیز کو اپنے العلم کی کسوٹی پر پرکھا' پھر جو کچھ اس کے مطابق پایا اسے قبول کیا اور جو کچھ اس کے خلاف پایا اسے یا تو تشکیل نو کے عمل سے گزارا یا مسترد کر دیا۔ آج جب کہ علمی پسماندگی کے ساتھ ساتھ داخلی طور پر فکری و تہذیبی استحکام موجود نہیں ہے اور بحیثیت ملت اسلامیہ کے ہماری اجتماعی خودی کمزور ہو گئی ہے' ہم غالب اقوام کے نظریات اور علوم کے سامنے نہایت اطمینان سے شکست کھا کر فخر محسوس کرتے ہیں۔

ہم کہاں کھڑے ہیں

آیئے' اس گفتگو کو ختم کرتے ہوئے ہم اپنے مقام کو دیکھیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ایک غیر قوم نے باہر سے آ کر ہمیں اپنی ضرورتوں کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے ایک نظام تعلیم ہم پر مسلط کیا جو ملت اسلامیہ کے مزاج کے خلاف تھا۔ نبی اکرمؐ کی حکمت علم اور حکمت تعلیم کے خلاف تھا اور جس نے ہمیں آہستہ آہستہ اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا۔ اس نظام تعلیم کے تیزاب میں ہماری خودی اس طرح تحلیل ہو گئی کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد سالہا سال گزر جانے کے باوجود ہم اس تعلیمی قفس سے نجات نہیں پا سکے۔

بدقسمتی سے نظریۂ پاکستان اور اسلام کے دلکش الفاظ کو سیاسی کھلونوں کی طرح استعمال کیا جاتا رہا ہے جب کبھی ایسا ہوا کہ قمار خانہ مفاد میں ہر دوسری نرد پٹ گئی تو مقامروں نے فوراً نعرہ اسلام کو اٹھا کر بساط پر رکھ لیا۔ پھر جب وقتی بازی مکمل ہو گئی تو اس نعرہ کو کسی آئندہ ایمرجنسی کے لئے محفوظ رکھ دیا گیا۔

کارپردازان تعلیم کے حلقوں میں زیادہ سے زیادہ اب تک جو کچھ سوچا گیا ہے وہ بس اتنا ہے کہ اس مسلط شدہ نظام تعلیم کے نصابات میں چند اچھی باتیں اسلام کی بھی داخل کر دی جائیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی ٹینک میں چند پرزے شکر سازی کی

مشین کے فٹ کر کے یہ سمجھیں کہ اب یہ ٹینک شکر بنانے لگے گا۔

ایک خاص تہذیبی نظام کی علمبردار ملت اور تحریک فلاح انسانیت کی مشعل بردار قوم اپنی ضرورت کا پورا نظام تعلیم خود بناتی ہے۔ وہ اپنے تعلیمی نظریات کی بنیاد اپنے ایمان و معتقدات پر رکھتی ہے۔ وہ نصابات کے ہر جزو میں اپنے اجتماعی نصب العین کی روح داخل کرتی ہے۔ وہ اپنی حکمت تعلیم پر علوم کی بنیادیں رکھتی ہے اور اس کی تعلیم کا مقصد ایسے انسان تیار کرنا ہوتا ہے جیسے انسان مخصوص نظام حیات کو چلانے اور اس کی بین الانسانی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے مطلوب ہوتے ہیں۔

میں ملک کے ذی شعور معلمین اور ماہرین تعلیم کو توجہ دلاؤں گا کہ وہ نبی اکرمؐ کے تعلیمی کارنامے کی روشنی میں ملت پاکستان کے لئے ایک صحت مند نظام تعلیم کا نقشہ مرتب کریں اور اسے موجودہ خلاف ایمان اور خلاف مزاج نظام تعلیم سے نجات دلائیں جس نے ہماری نسلوں کو فکری اور اخلاقی لحاظ سے بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

انسان —— کائنات میں حیثیت

جب ہم اپنے گردوپیش کی دور دور تک پھیلی ہوئی دنیا پر پہلی ہی نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ سارا عالم نور وظلمت اور یہ تمام جہان رنگ و بو بہترین نظم سے آراستہ اور بہترین آئین سے مالا مال ہے' یہ بے آئینی اور بد نظمی اور بے ترتیبی اور اندھیر گردی کی تماشا گاہ نہیں۔ مادے کی تمام کی تمام گونا گوں اشکال کشش و ثقل' سکون و حرکت' حرارت و برودت' قوت اور انرجی' لا معیت و اشاعیت' نشوونما' تغیر و حدوث اور عمل و ردعمل کے اٹل قوانین کے آگے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔ قطرے اور سمندر' ذرات اور سورج' درخت اور پہاڑ' چیونٹیاں اور ہاتھی سب کے سب کوئی جنبش کیے بغیر نظم و ضبط کا جوا اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ یہ ایک ایسی نگری ہے جس کی کوئی تعمیر مقررہ نقشے سے گھٹی بڑھی ہوئی نہیں ہے' ہر چیز اپنے صحیح استعمال کے لیے وقف ہے' پروگرام کے اوقات قطعی طور پر معین ہیں' حرکت کے لیے راستے بنے بنائے ہیں اور موجودات کی گاڑیاں ان سے بال برابر ادھر ادھر نہیں ہوتیں' ٹریفک کے قواعد مقرر ہیں اور کوئی حرکت کرنے والا ان قواعد کی خلاف ورزی نہیں کرتا' ہر کسی کے حدود عمل کو باہمد گر الگ کر دیا گیا ہے' قوتیں اور فرائض تقسیم کر دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ بڑے سے بڑے وجود اور چھوٹے سے چھوٹے اجسام یک جا رہتے ہیں مگر کوئی کسی پر زیادتی نہیں کرتا' تیز سے تیز اور سست سے سست رفتار پر موجودات کی بھاری بھرکم گاڑیاں بیک دم اربوں کی تعداد میں ایک دوسرے کے متوازی اور ایک دوسرے کو کاٹنے والے راستوں پر دوڑ رہی ہیں' اور لاکھوں برس سے دوڑ رہی ہیں مگر بغیر کسی خلل کے یہ روا رو جاری ہے۔ ٹھوس اجسام اور مائعات اور گیسوں کی دنیائیں ایک دوسرے میں بالکل گتھی ہوئی ہیں مگر گڑبڑ نہیں ہوتی۔ جمادات اور نباتات اور حیوانات کے مختلف الاحوال عالم ایک دوسرے پر چھائے ہوئے ہیں مگر صلح و سلامتی سے نبھاؤ ہو رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس بستی کی ساری رونق آئین کا کرشمہ ہے' اس بزم کی ساری ہما ہمی نظم کا عطیہ ہے اور اس گھر کی ساری آبادی ہدایت

کے دم قدم سے ہے! جس طاقت نے موجودات کو خلق کیا ہے' اس نے آئین اور نظم بھی مقرر کیا ہے' اس نے ان کو ہدایت بھی دی ہے! یہی ہدایت ہر وجود کا ''دین'' ہے! کائنات کی بقا خالق کی ہدایت پر منحصر ہے' موجودات کا نشو و ارتقا خالق کے دین پر دار و مدار رکھتا ہے یہاں جو چیز پیدا ہوتی ہے اپنی ہدایت اور اپنا دین ساتھ لے کے آتی ہے۔ یہاں مادہ کی جو نئی شکل بھی ظہور پاتی ہے اپنے لیے ضابطہ اور آئین گلے میں آویزاں کئے ہوئے نمودار ہوتی ہے۔ یہاں جو قوت بھی ابھرتی ہے اپنی پیشانی پر اپنا پروگرام لکھا کے لاتی ہے۔

جمادات کو دیکھئے تو ان کی ہدایت کا ذریعہ طبعی جبریت ہے' نباتات کا مطالعہ کیجئے تو فطرت نامیہ کو ان کی رہنمائی پر مامور پائیں گے' حیوانات کا جائزہ لیجئے تو جبلت ان پر راہ عمل واضح کرنے کے لیے سرگرم کار ملے گی لیکن انسان کا معاملہ موجودات کے ان تینوں خانوادوں سے کچھ دور تک تو ہم آہنگ رہتا ہے' لیکن جہاں سے اس کی شعوری اور ارادی زندگی کی سرحد شروع ہوتی ہے وہاں سے بالکل نئی صورت حالات سامنے آ جاتی ہے۔ انسانی زندگی کا ایک دائرہ ہے جہاں طبعی جبریت اپنا فرض ادا کرتی ہے' پھر ایک دائرہ ہے جس میں فطرت نامیہ کام کرتی ہے' پھر ایک اور دائرہ ہے جس میں حیوانی جبلت کا پارٹ سامنے آتا ہے' لیکن ان دائروں سے آگے جب اخلاقی و اجتماعی میدان کار شروع ہو جاتا ہے تو یہ تینوں رہنما قوتیں اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں اور ہر ایک معذرت کرتی ہے کہ اب اگر میں ایک سر مو بھی آگے بڑھوں تو پر جلتے ہیں!

سوال یہ ہے کہ کیا یہ شعوری' اخلاقی اور اجتماعی زندگی کا دائرہ ایسا ہے کہ اس میں ہدایت اور دین کی ضرورت باقی نہیں رہتی؟

یہ لکیر ہے کہ جسے پھاندتے ہی انسان کو ارادہ و اختیار کی گراں بہا ذمہ داری سے نواز دیا جاتا ہے۔ یعنی اب کوئی قوت کشاں کشاں زندگی کو کسی لگے بندھے راستے پر بطور جبریت نہیں لے جائے گی' دوسرے لفظوں میں اب بیک دم کئی راستے سامنے ہوں گے اور ان میں سے راہ حق اور صراط مستقیم کا انتخاب کرنا ہوگا' ہر قدم پر دوراہے اور چوراہے پیش آئیں گے اور اپنے ارادے سے کسی ایک پر سوچ سمجھ کر قدم بڑھانا ہوگا کہ کونسی راہ فلاح کی منزل کی طرف جانے والی ہے۔

یہ ارادہ و اختیار انسان کو جس پوزیشن میں لا کے کھڑا کر دیتا ہے وہ بڑی پیچیدہ پوزیشن ہے۔ وہ بیک وقت اپنے آپ کو طبعی ماحول اور اپنی ضروریات کی کشمکش میں بھی مبتلا پاتا ہے' اپنی خواہشات اور جذبات اور اپنی عقل کے درمیان بھی ہر لحظہ ایک نئے تصادم سے دوچار ہوتا ہے' قریب کے فائدوں اور نقصانات اور دور کے نتائج اعمال کے درمیان گھر کر بھی وہ بری طرح الجھتا ہے' وہ اپنی ذات کی خود غرضانہ حس اور معاشرے کے اجتماعی تقاضوں کے درمیان بھی رسہ کشی پاتا ہے' وہ قدامت پسندی اور جدت پرستی کی اونچ نیچ سے بھی دوچار ہوتا ہے۔ وہ افراط و تفریط اور عمل اور ردعمل کے تند اثرات کی زد پر بھی آتا ہے۔ شعور و اختیار کی زندگی ان الجھنوں سے اس طرح بھری ہوتی ہے کہ آدمی کو جیسے ایک گھنے جنگل میں کھڑا کر دیا گیا ہو جہاں اونچے اونچے درخت سائیں سائیں کر رہے ہوں' کانٹے دار جھاڑیاں ہر طرف پھیلی ہوئی ہوں' سر سے اونچی گھاس چاروں طرف سے گھیرا ڈالے ہوئے ہو' طرح طرح کی بیلیں جال پھیلائے ہوئے ہوں اور جہاں کہیں کوئی خلا دکھائی دے' یہی گمان ہو کہ بس راہ نجات یہی ہو گی۔

الجھنوں کے اس جنگل میں اہوائے نفسانی درندوں کی طرح ہونکتی پھرتی ہوں' جذبات کے ناگ پھنکار رہے ہوں اور شیطان وساوس کے غول کے غول وہاں اتارے' زندگی کو اپنا شکار بنا لینے کے لیے پوری تدابیر لڑا رہا ہو۔

انسان کے پاس حواس خمسہ موجود سہی مگر وہ تو صرف گرد و پیش کے عالم مادی کے خواص سے آگاہ کر کے بس کر دیتے ہیں' عقل کا ایک ٹمٹماتا دیا بھی روشن سہی مگر وہ تو اسی تیل سے روشن ہے جو حسی علم سے فراہم ہوتا ہے' قیاس آرائی کی صلاحیت کارفرما سہی مگر یہ صلاحیت ہزار گھوڑے دوڑانے کے بعد بھی منزل یقین و آگہی تک تو نہیں پہنچاتی' یہ بھی تو کبھی گمان کی ایک پگڈنڈی کی طرف اشارہ کرتی ہے' کبھی دوسری کی طرف اور کبھی تیسری کی طرف۔

یہ پوزیشن ہے جہاں سیکولر فلسفے انسان کو لا کے کھڑا کر دیتے ہیں کہ جا بیٹا چڑھ جا سولی' رام بھلی کرے گا۔ مگر سوچنے کی بات ہے کہ کیا یہ ساری کائنات اسی امر کی گواہی دیتی ہے کہ اس کا خالق خلق کر دینے کے بعد مخلوق کو ہدایت دیئے بغیر الجھنوں کے جنگل میں لاوارث چھوڑ دیتا ہے کہ جاؤ' مرو یا جیو' مجھے کوئی واسطہ نہیں! وہ کہ جس کو مٹی کے ایک حقیر ذرے تک کی بقا کی فکر ہے' جو گھاس کی ایک بے قیمت سی پتی کے نشوونما کا اہتمام کرتا ہے' جو ایک مچھر اور

مکھی کے امن کا سروسامان کرتا ہے' جو ایک بیل اور گدھے کے لیے لا اینڈ آرڈر مقرر کرتا ہے' کیا انسان جیسی اعلیٰ ترین مخلوق ہی اس کی نگاہ میں ایسی بے وقر ہو کے رہ گئی ہے کہ اس نے اسے بالکل عاق کر دیا ہو کہ جاؤ جہنم میں' تمہارے لیے میرے پاس کوئی رہنمائی نہیں' ضابطہ نہیں' ہدایت نہیں' دین نہیں۔

اس بات کے ماننے سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ سرے سے خدا کے ہونے کا انکار کر دیا جائے۔ لیکن خدا کو مان کر اس کا یہ تصور باندھنا کہ وہ مخلوق تو پیدا کرتا چلا جاتا ہے' لیکن اس کو زندگی کی راہ فلاح بتانے کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا' کسی معقول انسانی ذہن کو سجتا نہیں۔ کوئی اور اس تصور کو پیش کرتا ہو تو کرے' اسلام ایسے خدا کا تصور نہیں دلاتا۔ دوسرے انسان اسے قبول کر سکتے ہوں تو کریں' کسی مسلمان کا ذہن اسے قبول نہیں کرتا۔

انسانی ارادہ و اختیار کا راستہ عمل کی جن پیچ در پیچ وادیوں سے ہو کر جاتا ہے وہ تقاضا کرتی ہیں کہ اس کی رہنمائی کا کوئی سروسامان ہو اور چونکہ اس کی زندگی شعوری زندگی ہے اس لیے اس کی رہنمائی بھی شعوری ہو۔ اس کو ہدایت دی جائے اور اس کی عقل کو خطاب کر کے دی جائے۔ اسے دین بہم پہنچایا جائے اور اس کے ارادہ و اختیار کی اپنی رضامندی حاصل کر کے پہنچایا جائے۔

وہ ایک ہدایت کا ضرورت مند ہے کہ جب اس کے طبعی ماحول اور اس کے تقاضا ہائے نفس کے درمیان کشمکش ہو تو وہ جان سکے کہ کہاں تک اسے آگے بڑھنا ہے اور کس صورت میں اسے پیچھے ہٹنا چاہیے۔ وہ ایک ضابطے کا ضرورت مند ہے کہ جب اس کی خواہشات اور اس کی عقل کے درمیان رسہ کشی ہو تو وہ دونوں کو کس متعین نقطے پر جمع کرے۔ وہ ایک قانون کا ضرورت مند ہے کہ جب اس کے سامنے مختلف آراء اور اقدامات اور لائحہ عمل قریبی نتائج اور دور کے نتائج کو پیش کر کے الجھن میں ڈالیں تو وہ کس کے مقابلے میں کس کا انتخاب کرے۔ وہ ایک دین کا ضرورت مند ہے کہ جب اس کی ذات کی خود غرضیاں اور اس کے معاشرتی ماحول کے تقاضے بیک وقت اس پر دباؤ ڈال رہے ہوں تو وہ اپنے آپ کو کس موقف پر جمائے؟ وہ ایک معیار فیصلہ کا ضرورت مند ہے کہ جب قدامت اور جدت' افراط و تفریط' عمل اور ردعمل کے مختلف مؤثرات اس کی زندگی کے سامنے اپنے اپنے مطالبے رکھ رہے ہوں تو

کسے وہ قبول کرے اور کسے رد کرے! وہ ضرورت مند ہے ایسی متعین حدود کا کہ خیر و شر کے معرکوں میں اسے معلوم ہو سکے کہ کہاں تک بڑھتے چلے جانا ہے اور کہاں پہنچ کر رک جانا ہے۔ وہ ضرورت مند ہے ٹریفک کے ایسے قواعد کا اور ایسے نشانات و علامات راہ کا کہ جن کی پابندی میں وہ شہر حیات کے اندر افکار و اعمال کی گاڑیاں حادثوں کے اندیشے سے بے نیاز ہو کر چلا سکے۔

انسان چونکہ ارادہ و اختیار رکھتا ہے' اس لیے وہ کسی دین اور ہدایت اور ضابطے کو صرف اسی صورت میں مان سکتا ہے جب کہ اس کے پیچھے کوئی ایسی اتھارٹی ہو جسے اس کی عقل واجب الاطاعت سمجھے۔ پھر ارادہ و اختیار ہی کی وجہ سے چونکہ وہ دین' ہدایت اور ضابطے میں دخل دینے اور تحریف اور رد و بدل کر دینے پر بھی قادر ہے۔ اور اس کی خواہشات و جذبات کے تندریلے ہر حد کو توڑ دینے کا موقع بھی رکھتے ہیں' لہٰذا اس کی ضرورت ایک ایسا دین' ایک ایسی ہدایت اور ایک ایسا ضابطہ چاہتی ہے جس میں تقدس موجود ہو اور وہ رد و بدل کے ارادے سے اس کی طرف انگلی بھی اٹھانے کی جرأت نہ کرے پھر اس کی فطرت "بیم و رجا" تقاضا کرتی ہے کہ اس کے لیے دین اور ضابطۂ ہدایت ایسا ہو کہ جس سے انحراف کرنا موجب سزا اور جس کی اطاعت کرنا ذریعۂ حصول جزا ہو۔ پھر چونکہ انسانی زندگی کو مختلف زمانوں' مختلف قسم کے ماحول اور مختلف حالات سے سابقہ پیش آتا ہے لہٰذا وہ ایسی رہنمائی کی ضرورت مند ہے جو ادلتے بدلتے حالات میں اسے یکساں کام دے سکے۔

یہاں تک ہم نے انسانی زندگی کے لیے دین کی جو ضرورت واضح کی ہے ٹھیک اسی کا جواب ہے اسلام!

اسلام کے بالمقابل دوسرے کچھ مذہبی نظریے اور نظام بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کا فکری تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سرے سے اس تقاضے اور اس ضرورت کو پیش ہی نہیں کرتے جس کو پورا کرنے کے لیے انسان ایک دین چاہتا ہے۔ اسی لیے وہ دین بہم پہنچانے کے بجائے ایک مذہب اور دھرم اور مت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان میں کوئی ایسا ہے جو زندگی کو جبری عذاب قرار دے کر اپنے آپ کو عذاب سے نجات دلانے والے وسیلے کی حیثیت سے پیش کرتا ہے' کوئی ایسا ہے جو روح کو سرور بخشنے کے لیے ایک مشروب مسکن' ایک نبیذ

خواب آور یا ایک بادہ سرور بخش بن کر سامنے آتا ہے' کوئی ایسا ہے جو انسانی روح کے قطرے کو ذات باری تعالیٰ کے سمندر سے جا ملانے کا پروگرام پیش کرتا ہے اور کوئی ایسا ہے کہ آدم کے گناہ اول کے نتائج سے اولاد آدم کو بچانے کی اسکیم سامنے رکھتا ہے۔ کسی نے انسان کی احتیاج ہدایت' اس کی تشنگی دین اور اس کی طلب ضابطہ کا جواب بنا کر اپنے آپ کو متعارف نہیں کرایا اور نہ کاروان زندگی کی رہنمائی کی بھاری ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔

ان مذہبی نظاموں نے ایک خدا' اور دو خداؤں اور بے شمار خداؤں' اور ان کے علاوہ بے حد و حساب دیوتاؤں اور روحوں کا تصور انسان کو محض ایک روحانی تسکین کے لیے دیا ہے۔ انہوں نے اوہامی معتقدات کی بھول بھلیوں میں ڈال کر اسے حیرت زدہ اور مبہوت کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے پوجا پاٹ' نفس کشی اور ترک دنیا کے ایسے اسالیب وضع کیے ہیں کہ آدمی ان کے اندر بھگتان بھگتتے ہوئے مگن رہے کہ وہ مایا کے جال' جیون کے عذاب اور گناہوں کے چکر سے نجات پانے کی قیمت ادا کر رہا ہے۔ انہوں نے قلب کو جلا دینے کے لیے کچھ محدود اخلاقی ضابطے بھی بنائے ہیں جس پر عمل پیرا ہونے سے میل اترتا ہے اور روح اس قابل ہو جاتی ہے کہ ذات باری میں جذب ہو جائے۔

بس اس سے آگے نہ مذاہب نے انسانی زندگی کے بارے میں کوئی ذمہ داری قبول کی ہے' نہ کوئی کمانڈ اور ہدایت سیاست و تمدن کے معاملات میں فراہم کی ہے۔ آخر جو مذاہب دنیا کو ملعون اور ترک دنیا کو ذریعۂ نجات قرار دیتے ہیں' وہ خود اس ملعون دنیا کے لیے پروگرام اور منصوبہ اور ضابطہ کیسے دے سکتے ہیں۔ جن مذاہب نے سیاست و تمدن سے انسان کو بائیکاٹ کرنے کی تعلیم دی ہے وہ کیسے سیاست و تمدن کے لیے نقشۂ کار بنا کے سامنے لا سکتے ہیں۔ جن مذاہب نے زندگی کی ہماہمیوں کو ایک عقوبت اور ایک سزا اور گناہ کا ایک چکر قرار دیا ہے وہ کس منہ سے ان ہماہمیوں کے درمیان کھڑے ہو کر نوع انسانی کو روز مرہ مسائل میں رہنمائی دے سکتے ہیں۔ جن مذاہب نے دنیوی امارت و بادشاہت کے متعلق یہ خبر دی ہو کہ اس میں دلچسپی لینے والے۔ آسمانی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتے ان سے کیسے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ خود ہی دنیوی امارت و بادشاہت کے نظم و انصرام کا کوئی درس دے سکیں گے۔

اس طرح کے مذاہب نے صدیوں سے انسان کو عجیب الجھن میں ڈال دیا ہے۔ وہ اپنے معاملات زندگی میں منہمک ہوتا ہے تو یہ اسے ٹوکتے ہیں کہ خبردار! دینا کے جنجال میں پڑ

گئے تو خدا نہیں ملے گا۔ وہ خدا کی طرف ان کے بنائے ہوئے نقشے پر چلتا ہے تو اس کا اپنا جسم کرب میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس کی طبعی ضروریات اس کا منہ نوچتی ہیں' اس کے بال بچے بھوکوں مرتے ہیں' اس کا گھر اجڑتا ہے' اس کا کاروبار تباہ ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ دو قدم خدا کی طرف آگے چلتا ہے' پھر اپنے فطری تقاضوں کی کھینچا تانی کے زور سے اپنے دنیوی معاملات کی طرف چار قدم پیچھے پلٹتا ہے تو احساس گناہ کا کانٹا ضمیر میں چبھتا ہے۔ وہ مذہب سے پوچھتا ہے کہ میرے لیے ان دنیوی معاملات میں کوئی رہنمائی ہے جو مجھے احساس گناہ سے نجات دلا سکے؟ اسے کوئی جواب نہیں ملتا۔ اب یا تو وہ تمدن سے مستقل طور پر بھاگ کھڑا ہوتا ہے' یا مذہب کا قلادہ گلے سے نکال کر دنیا کے میدان میں پوری چھوٹ پالیتا ہے۔

ان مذاہب کا یہ خلاء کہ یہ انسان کو دنیا میں اجتماعی زندگی کے سارے فرائض انجام دیتے ہوئے خدا سے نہیں ملا سکتے اور سیاسی و تمدنی مسائل میں کوئی مکمل رہنمائی بہم نہیں پہنچاتے' یہی اس کا موجب ہوا کہ تاریخی مواقع پیدا ہو جانے پر ''مذہبی طبقات'' آگے بڑھیں' اس خلاء کو پر کریں اور خدا اور مذہب کے نام پر اپنی مرضی کو مقدس ضابطہ بنا کر عوام الناس پر ٹھونس دیں۔ اس لحاظ سے تھیوکریسی کا ظہور ہمیشہ کسی مذہبی نظام کے اس نقص کا نتیجہ تھا کہ وہ دنیوی معاملات کے لیے رہنمائی نہیں دیتا تھا اور اس نظام کے زیر اثر آنے والے انسانوں کے لیے مذہب کی منظوری لیے بغیر دنیوی معاملات چلانا طمانیت ضمیر سے محرومی کا موجب تھا۔ چنانچہ مذہبی طبقوں اور عام لوگوں میں یہ سودا ہوا کہ ہم تم کو دنیوی معاملات میں مذہب کی منظوری بہم پہنچائیں گے تم ہمارا اقتدار مانو۔ اس سودے نے مذہب (جیسا کچھ بھی رہا ہو) کا الگ ستیاناس کر دیا اور نظام تمدن کا الگ حلیہ بگاڑ دیا۔ یہ تلخ تجربہ اس انجام کو پہنچا کہ مذہبی طبقوں کے تسلط کے خلاف عام آدمی کو جنگ لڑنی پڑی۔ یہ جنگ خون خرابوں کے بعد اس سمجھوتے پر ختم ہوئی کہ دنیا کے معاملات میں مذہب کا کوئی دخل نہ ہوگا' اور مذہب کے امور میں اہل دنیا مداخلت نہیں کریں گے۔ دونوں کا دائرہ کار ایک خط تقسیم کھینچ کر الگ کر دیا گیا ہے۔ اسٹیٹ اور کلیسا نے زندگی کی جاگیر تقسیم کر لی۔ اجتماعی زندگی اسٹیٹ نے اپنے قبضے میں لے لی اور انفرادی اور نجی زندگی کلیسا کے حوالے کی گئی۔ یوں دین اور سیاست الگ الگ ہوئے۔

اس ساری تاریخ فساد کی اصل جڑ کیا ہے؟ مذاہب کا حقیقی انسانی ضرورت کا مکمل جواب نہ ہونا اور زندگی کی رہنمائی کی صلاحیت نہ رکھنا۔

اسلام ان تمام مذاہب کے بالمقابل (خواہ وہ اسلام کی اصل ہیئت کو بگاڑ کر ایک نئی وضع پر لائے گئے ہوں' یا وہ خود انسانی ایجاد و اختراع کا نتیجہ ہوں) اپنے آپ کو ایک جداگانہ حیثیت سے سامنے لاتا ہے۔ وہ انسانی زندگی کی ہر ایک بنیادی ضرورت کا جواب بن کر ابھرا ہے وہ تمام کے تمام دنیوی معاملات میں رہنمائی کی پوزیشن اختیار کر کے اپنی دعوت پیش کرتا ہے۔ وہ حالات وضروریات اور نظریات و احساسات کے جنگل میں انسانی ارادہ و اختیار کے سامنے صحیح راستہ نکال دینے کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ اس کی بغل میں خدا کا دیا ہوا ضابطہ ہے نہ کہ کسی طبقے کا گھڑا ہوا ـــــ یہ ایک مستقل اور مقدس ضابطہ ہے۔

اسلام کا خدا نہ تو پتھر کا ایک بت ہے' نہ کھیل تماشے رچانے والا شعبدہ گر ہے' نہ مخلوق کو عذاب میں ڈال کر لطف لینے والا کوئی عشرت پسند مہاراجہ ہے' اور نہ وہ ایک غیر ذمہ دار خالق ہے۔ وہ اپنی خلق کا خالق و رزاق بھی ہے' ان کا منتظم اور منصرم بھی ہے' ان کا ہادی اور قانون ساز بھی ہے اور ان کا فرمان روا اور حاکم بھی ہے۔ واحد اور لاشریک فرمان روا اور حاکم! چنانچہ اسلام اپنے دروازے سے داخل ہونے کی شرط اول یہی قرار دیتا ہے کہ خدا کو اس کی ساری صفات کے ساتھ اپنی زندگی کا الٰہ مانو' اسے حکم و اختیار کے لحاظ سے سب سے برتر مانو' اسے واجب الاطاعت ہونے کے لحاظ سے درجۂ اول پر رکھو' اس کے آگے پوری طرح گردن ڈال دو! تقاضا کیا جاتا ہے کہ اپنا سب کچھ لا کے اسی ایک الٰہ کے حوالہ کر دو' اپنی قوتیں' اپنے اعضاء اپنے اموال' اپنے اوقات! مطالبہ ہے کہ پوری کی پوری زندگی کا سودا چکا لو اور اس طرح چکا لو کہ پھر دوسرے تاجروں اور دوسرے گاہکوں سے کوئی معاملہ کرنے کی گنجائش باقی نہ رہے! اصرار ہے کہ زندگی میں تصرف کر کے' حق خدائے واحد کے لیے اس حد تک خاص کر دو کہ اس کے مقابلے میں کسی غیر کا تو کیا' خود تمہارا اپنا بھی کوئی حق باقی نہ رہے۔ بہ صد تکرار چاہا گیا ہے کہ ایک بار ادھر رخ کر لو تو پھر ہر طرف سے منہ موڑ لو' ہر جانب سے آنکھیں پھیر لو' ایک ہی بارگاہ کی طرف یکسو ہو جاؤ!

پھر رسولؐ کو سامنے لایا جاتا ہے تو اس حیثیت سے سامنے لایا جاتا ہے کہ یہ اللہ کا بھیجا ہوا نمائندہ خاص ہے' یہی ہے جس کے ہاتھ سے ضابطہ ملے گا' جس کی زبان الٰہی ہدایت کی

ترجمانی کرے گی۔ جو خدا کی مرضیات کی عملی تفسیر پیش کرے گا' جو مستقل اسوۂ حسنہ ہو گا' اس کی بے چون وچرا اطاعت کرنی ہو گی' اس سے معاملات میں رہنمائی لینی ہو گی' اس سے اختلافات ونزاعات میں آخری فیصلہ لینا ہو گا۔ اس سے امور حیات میں سند پکڑنی ہو گی' جو کچھ یہ طے کر دے کوئی دوسرا اس کی تنسیخ نہیں کر سکتا' جسے یہ منسوخ کر دے اسے کوئی دوسرا جائز نہیں ٹھہرا سکتا' جسے یہ حرام کر دے وہی حرام ہو گا' جسے یہ حلال کر دے وہی حلال ہو گا۔ اس کا دامن تھام کے چلو گے تو اللہ کے دین پر کاربند ہو سکو گے۔

اسلام کا یہ ہے خدا' اور ایسا ہے اس کا رسول ؐ کہ جن کی اتھارٹی اور سند سے جو ضوابط' جو اصول کار' جو قوانین اور جو احکام ملتے ہیں وہ ایک مسلمان کو مسلمان ہونے اور رہنے کے لیے پورے کے پورے قبول کرنے پڑتے ہیں۔ عقائد' عبادات' اخلاقی احکام اور اجتماعی زندگی سے متعلق قوانین وضوابط سب کے سب مل کر ایک دین بنتے ہیں جسے رد کرنے والے پورا رد کرتے ہیں اور قبول کرنے والے پورا قبول کرتے ہیں۔ یہاں کا تصور توحید اگر وحدت الٰہ کا عقیدہ دیتا ہے تو اسی کے ساتھ ساتھ وحدت آدم اور وحدت حیات کا شعور بھی دیتا ہے۔ یہاں زندگی کی جاگیر کو خدا اور قیصر' کلیسا اور اسٹیٹ' مذہب اور سیاست کے درمیان بانٹنے کے لیے کوئی لکیر نہ کھنچی ہوئی ملے گی' نہ کھینچنے کی گنجائش۔

یہاں تقسیم حیات کے معنی صریحاً شرک کے ہیں۔ یہاں زندگی کے کسی شعبے کو خدا کے حکم واختیار سے نکال کر کسی دوسرے کے حوالے کرنے کا مفہوم سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ اس شعبے میں خدائے واحد کے بالمقابل ایک دوسرا خدا مان لیا گیا۔ یہاں کسی معاملے کو خدا کے رسول ؐ کی تعلیم کی زد سے باہر لے جانے کا کوئی مطلب اس کے سوا نہیں لیا جا سکتا کہ رسول ؐ کے مقابل کی ایک دوسری اتھارٹی مان لی گئی۔ یہاں کسی چیز کو کتاب الٰہی کے دائرہ اثر سے خارج قرار دینا صرف ایک ہی نتیجہ دیتا ہے کہ کتاب الٰہی کے مقابلے میں کوئی دوسرا معیار فیصلہ برتر قرار دے دیا گیا۔

اور آگے چلیئے تو یہ امر واقعہ سامنے آتا ہے کہ مسلمان قوم کی ایک عظیم الشان تاریخ ہے جس کا اولین باب اسلام کا ایک دور زریں ہے۔ اس دور کے مطالعہ سے ہر فرد مسلم گہرا اثر لیتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ خدا کی ہدایت سے فائدہ اٹھا کر عرب میں ایک پسماندہ ترین قوم اٹھی اور

اس پر ترقی کے دروازے کھل گئے اس کے اندر سے علم و حکمت کے سوتے جاری ہو گئے۔ اس کی ظلمتوں میں اخلاق عالیہ کے دیئے جگمگا اٹھے' اس میں انتہائی اونچے معیار کا ڈسپلن پیدا ہو گیا' اس میں ایک پاکیزہ معاشرت پروان چڑھنے لگی' اس کے ہاتھوں ایک تہذیب آناً فاناً پروان چڑھ گئی' اس نے عدل و انصاف کے نئے معیار قائم کر دیئے' اس نے اخوت و مساوات کی ہمیشہ تابندہ رہنے والی روایات پیدا کر دیں' اس نے زندگی کی حرکت ارتقاء کو تیز تر کر دیا اور بعد کی نسلوں کے لیے زندگی بخش نظیریں ہر ہر پہلو سے قائم کر دیں۔

تاریخ کے اس زریں باب کو مسلمان قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ سینے سے لگائے چلا آ رہا ہے۔ چودہ صدیوں میں ایک لحظہ بھی ایسا نہیں آیا کہ وہ اس تاریخ کو اپنے سینے سے جدا کر سکا ہو' یا اس کے سنہرے اوراق کو حافظہ سے اتار سکا ہو۔ یہ تاریخ قوم کے سارے کے سارے لٹریچر میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ یہ خطابت کی روح بن کر کام کر رہی ہے۔ یہ شعر و ادب کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہی ہے' یہ تمام قومی تحریکوں کو گرمی اور حرکت سے مالا مال کرنے والی ہے۔ اس تاریخ کی اپیل عوام کی توجہ کو کھینچنے کا موثر ترین ذریعہ ہے۔ یہی تاریخ ہے جو اس کے لیے قرآن و سنت کے مطابق بسر کی جانے والی اسلامی زندگی کی کسوٹی ہے۔ یہ کسوٹی جب تک کہ اس کے ذہن میں پیوست ہے' اسے کسی نظام زندگی کے تحت راضی نہیں رکھا جا سکتا۔

پھر مسلمان دیکھتا ہے کہ اس کی قوم ٹھیک اس روز سے اولین دور اسلام کی سعادتوں سے محروم ہو کر زوال و فساد کا شکار ہونا شروع ہوئی ہے جس روز اس دور سے انحراف کا آغاز ہوا ہے۔ دین کی ہدایت سے جتنی جتنی دوری ہوتی گئی ہے' مسلمان قوم اتنی ہی اتنی پیچیدگیوں میں الجھتی اور پستیوں میں گرتی چلی گئی ہے' یہاں تک جب وہ دین و سیاست کی مکمل تفریق کے آخری مقام پر آ گئی ہے تو وہ نکبت و ادبار اور دوسروں کی غلامی اور خیمہ برداری میں مبتلا ہو گئی ہے۔

جو قوم یہ سارا سرمایۂ تاریخ سینے سے لگائے چلی آ رہی ہو' جس کی یہ حسرت کبھی نہ مری ہو کہ ایک بار پھر اسی دور زریں کی سحر اس کی حیات اجتماعیہ کے افق سے ظہور کرے' کیا کسی طریقہ سے اسے دین و سیاست کی تفریق پر راضی کیا جا سکتا ہے؟

جس نظام میں دین برحق کا وہ جزو اعظم جو اجتماعیات سے متعلق ہے' معطل کر دیا

جائے اور مسلمانوں کو مجبور کر دیا جائے کہ وہ اس کے صرف اس جزء پر اکتفا کریں جو ذاتی اور نجی امور سے واسطہ رکھتا ہے تو اس سے دنیا کا خطرناک ترین تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ تضاد ایک سوال یہ پیدا کرتا ہے کہ دین کا وہ جزو جو معطل کیا جا رہا ہے کیا خدا اور رسول کا دین نہ سمجھا جائے گا اور اگر جو بھی دین ہے تو کیا وہ موجب خیر و برکت اور واجب الا طاعت نہیں' بلکہ اس کی صرف تلاوت و قرأت کافی ہے؟ دوسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اگر زندگی میں بیک وقت دو اقتدار' دو نظریئے اور دو الگ الگ ضابطے بر سر عمل لائے جائیں تو چاہے ان کے لیے کتنی ہی باریکی سے میدان کار تقسیم کیا گیا ہو دونوں کے تقاضوں میں تصادم ہوئے بغیر نہیں رہتا' ایسی صورت میں کونسی طاقت فیصلہ کن اور بالاتر قرار پائے گی؟ ظاہر بات ہے کہ اسٹیٹ ''انا و لا غیری'' کے دعویٰ کے ساتھ کام کرتا ہے تو فوج' پولیس قانون' عدالت' خزانے' ریڈیو' نظام تعلیم کی ساری مؤثر طاقتوں کو جلو میں لیے جب یہ کوئی اقدام کرے گا تو ''مذہب'' کی مجال نہیں ہو سکتی کہ دم مار سکے۔ یوں جب فیصلہ کن طاقت اسلام کے مقابلے میں غیر اسلام ہو تو اسے تسلیم کر کے کوئی مسلمان کیسے مسلمان رہے گا! اس کے لیے تو ابتداء ''اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ'' پر! پھر ایک عام سوال یہ نمودار ہو گا کہ خدا و رسول کا جو دین اجتماعی زندگی کے وسیع اور پیچ در پیچ معاملات میں ذریعۂ ہدایت اور حل مشکلات کی حیثیت میں کام دینے والا نہیں رہا اس کی اور ضرورت کیا ہے؟ کیا دوسرے انفرادی مذاہب کی طرح محض ضمیر کو سن اور روح کو مست کرنے کے لیے کلمہ کا ورد اور نماز روزہ کی عادت اور ذکر و تسبیح کے وظیفہ کو استعمال کر کے یہ امت اطمینان حاصل کر سکتی ہے کہ دین داری کا حق ادا ہو گیا؟ یہ اس لیے ممکن نہیں کہ یہاں کلمہ اور نماز روزہ اور ذکر میں سے جس جزء کو بھی لیجئے' خود ہر ایک کے اندر ایک اجتماعی نظام کا تصور پوری طرح جذب ہے اور اسلام کے عقیدے اور اس کی عبادات خود بخود دین و دنیا کی وحدت کی طرف لے جاتی ہیں۔

اسلام کو اگر آپ پرائیویٹ مذہب بنا کر رکھنا چاہیں گے تو یہ اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک ہو گا جیسے کسی تناور درخت بننے والے پودے کو گملے میں گاڑ دیا جائے' وہ اپنے پھیلاؤ کے لیے جگہ نہیں پائے گا اور وہ اپنی ضرورت کے مطابق غذا حاصل نہیں کر سکے گا' بالآخر گملا ٹوٹ جائے گا اور پودا سوکھ جائے گا۔ جس دین کا ایک بڑا حصہ لوگوں کے سامنے اس حالت

میں موجود رہے گا کہ عملی زندگی میں اس سے کوئی رہنمائی نہیں لینی ہے' اور وہ دیکھیں گے کہ اس رہنمائی کے بغیر ہم اپنی زندگی اپنے ڈھب پر بناتے چلے جا رہے ہیں تو ان کے دلوں میں از خود یہ سوال پیدا ہوگا کہ پھر اس دین کے باقی حصے کے بغیر ہی زندگی کیوں بسر نہیں ہو سکتی جس دین کے ستر حصوں کو آپ طاق نسیاں پر دھر دیں اس کے باقی تیس حصوں کو کب تک کندھوں پر لادے رہیں گے۔ ایک نظام کے بڑے بڑے قیمتی اجزاء کو اگر عمل کے لحاظ سے مسترد کرنے کا اختیار آپ نے پالیا تو بقیہ کا اتنا احترام کیسے باقی رہے گا کہ اسے کوئی چھیڑ نہیں سکتا۔

تقسیم دین و سیاست کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اسلام ہر چیز دو دو روپے کی صدا لگانے والے کسی پھیری والے کا ایک خوانچہ ہے جس میں سے کنگھا' سیٹی' بٹن' چاقو جو چیز آپ کو پسند آئے لے لیں اور بقیہ کو چھوڑ دیں۔ بلکہ اس آزادیٔ انتخاب میں آپ کا یہ اختیار بھی مضمر ہے کہ آپ ایک روپیہ بھی نہ صرف کریں اور سارے خوانچے پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر اسے رد کر دیں۔ اسلام کے بارے میں یہ پوزیشن اگر کوئی شخص حاصل کرنا چاہے تو اسے سوچنا چاہئے کہ پھر لفظ مسلم اپنے معنوی و اصطلاحی معنوں کے اعتبار سے اس پر چسپاں ہو سکے گا؟

اگر مسلم کی یہ پوزیشن ہو سکتی ہے تو دنیا کا کوئی اکفر آدمی بھی کبھی ایسا نہیں ہوا جس کی زندگی میں خدا کی دی ہوئی ہدایت کا کوئی نہ کوئی جزو موجود نہ ہو۔ فرعون اور نمرود' ابوجہل اور ابو لہب بھی پھر مسلمین صالحین شمار ہوں گے کیونکہ اسلام کا کوئی نہ کوئی جزء تو ان کی زندگیوں میں بھی موجود تھا۔ قوم نوحؑ' قوم عادؑ' قوم ثمودؑ' قوم شعیبؑ اور قوم لوطؑ بھی اس معنی میں تارک اسلام نہ تھیں کہ خدا کے دین کا کوئی بھی حصہ ان کے ہاں سرے سے نہ تھا۔ پھر کیا دین و سیاست کی تفریق کے علمبردار حضرات ایسی ہی "مسلمانی" پر ساری مسلمان قوم کو لانا چاہتے ہیں؟ اور وہ لانا چاہتے ہیں تو کیا قوم اس مسلمان کو شرح صدر کے ساتھ قبول کر لے گی؟

ایسی مسلمانی پر آ رہنے کے بعد پھر اسلام کا کوئی ایک جزء بھی بچ کے نہیں رہ سکتا۔ آہستہ آہستہ سارے پر پانی پھر جائے گا' کیونکہ زندگی کی وحدانی فطرت ہے ہی ایسی کہ وہ اس نظریئے کو جو اجتماعی زندگی پر چھایا ہوا ہو بالآخر عملاً زندگی کے کونے کونے تک پہنچا کے رہتی ہے اور اس کی مزاحمت کرنے والے نظریئے کو دبا کے چھوڑتی ہے۔

پھر اس مصیبت کا کیا حل کہ جب آپ زندگی اور دین کو اس طرح پھاڑ دیتے ہیں کہ

مذہب الگ ایک دائرے میں سکڑ جائے اور سیاست مذہب کی مداخلت سے بے نیاز ہو کر میدان حیات میں جولانیاں دکھائے تو اس سے معاشرہ دو طبقوں میں بٹتا ہے اور دونوں کے دونوں فساد زدہ ہو جاتے ہیں۔ جو طبقہ سیاست میں کارفرما بنتا ہے وہ بنا اور بگاڑ کے وسیع اختیارات تو پالیتا ہے لیکن اس کے ذہن و سیرت کو کنٹرول کرنے والی کوئی طاقت نہیں رہتی۔ اس وجہ سے ظلم و خیانت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ دوسری طرف جب دین کے پیکر کو ہاتھ پاؤں اور پر پرزے کاٹ کر آپ نے ایک لوتھ کی لوتھ بنا کے ڈال دیا تو بے بسی کے سارے نتائج مذہبی طبقے کو پیش آ کے رہیں گے۔ اس طبقے میں تفرقہ آئے گا' اس میں انتشار پیدا ہوگا' اس میں ظرف کی محدودیت نمودار ہوگی' اس میں حوصلوں کی پستی آئے گی' یہ مذہب کو کاروباریت کے رنگ میں رنگے گا' یہ دربار داری اور قصیدہ خوانی اور کسی نہ کسی کی دامن برداری کے فتنوں میں مبتلا ہوگا۔ نہ خیر ادھر رہے گی' نہ فلاح ادھر ہوگی۔ ادھر بھی فساد ہوگا' ادھر بھی بگاڑ ہوگا۔ دونوں کا فساد اور بگاڑ خود معاشرے کے لیے تباہ کن ثابت ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان کسی ایسے نظام کے تحت امن چین سے نہیں جی سکتے جو زندگی کو تقسیم کر کے دو طاقتوں اور دو نظریوں اور دو طبقوں کو وجود دیتا ہو۔

آج کی ''مہذب دنیا'' بھی دین و سیاست کی تفریق کا عبرت ناک نتیجہ ہے جو ہمارے سامنے موجود ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ خدا اور اس کے پیغمبروں کی ہدایت و رہنمائی سے آزاد ہو کر جو دنیا انسان نے تعمیر کی ہے کیا وہ قابل اطمینان ہے اور کسی مسلمان کے لیے بھی قابل اطمینان ہے۔ یہ مہذب دنیا جو ایک طرف ذرائع و وسائل کے لحاظ سے ایٹم کے دور میں آ داخل ہوئی ہے اور دوسری طرف علم و حرکت کے لحاظ سے کہیں کی کہیں جا پہنچی ہے' آدمی کے لیے امن کا گھر ہونے کے لحاظ سے آج اس سے زیادہ مایوس کن ہے جتنی کسی تاریک ترین دور میں رہی ہوگی۔ مقاصد کے لحاظ سے دیکھئے کہ مادی ترقی سے زائد کوئی نصب العین اقوام اور افراد کے سامنے نہیں رہا۔ اخلاق کے لحاظ سے دیکھئے تو انسانی فطرت اور انسانی ضمیر کو جن جن چیزوں سے گھن آتی تھی ان میں سے ایک ایک سند جواز پا کر پھیل رہی ہے۔ قانون نظم کے لحاظ سے دیکھئے تو جرائم کی رفتار روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ معاشرت کا مطالعہ کیجئے تو گھروں کا امن چین اٹھ چکا ہے' خاندانوں کا شیرازہ بکھر گیا ہے' عصمت و حیا کا نور چہروں سے غائب

ہو چکا ہے' رشتہ ازدواج کا احترام کافور ہو چکا ہے' بدکاری تہذیب کی ایک عام صفت بن گئی ہے۔ افراد کی ائتلاف کو دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ سیاسی دھڑوں اور معاشی طبقوں کی تقسیم معاشروں کو گھن کی طرح کھا رہی ہے۔ معاشی لحاظ سے دیکھئے تو آدمی آدمی کو لوٹ لینے کے درپے ہے اور ہر کمزور آدمی کو کئی کئی طاقتور جونکیں چمٹی ہوتی ہیں۔ سیاسی پہلو کا جائزہ لیجئے تو بے ایمانی مکر اور جھوٹ کا دور دورہ ہے۔ بین الاقوامی فضا پر نظر ڈالیے تو معاہدوں اور بلاک بندیوں کے جال ڈال کر قوموں کو پھانسنے میں ماہی گیر ہمہ تن محو ہیں اور ایک قیامت ساماں جنگ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ فرد کا نفسیاتی مطالعہ کیجئے تو آج سے زیادہ وہ کبھی اضطراب اور اختلال سے دوچار نہیں ہوا۔ یہ حالات ہیں جن کی وجہ سے خود مغرب کے حکماء پریشاں ہیں اور وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہے کہ اجتماعی زندگی کے الحاد کے راستے پر دور تک بڑھ جانے کے بعد اب وہ اس کا رخ کیسے موڑیں' اور کس اسلوب سے مذہب کو از سرنو اس میں دخیل بنائیں۔

ایک مسلمان اس چمکتی دمکتی نئی دنیا کا جب یہ حال زار دیکھتا ہے تو وہ کبھی یہ رائے قائم نہیں کر سکتا کہ خدا کی ہدایت سے آزاد ہو کر اجتماعی زندگی کی تعمیر سے کوئی اچھا نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اگر سارا دین وایمان دے کر اسے اس طرح کا ایک فساد زدہ نظام حاصل ہوتا ہے جو مغرب کے ہر ملک میں کارفرما ہے تو وہ یہ خسارے کا سودا کیوں کرے؟ آپ اس کا کتنا ہی مذاق اڑائیں اور کتنی ہی دھمکیاں اسے دیں' وہ اپنی مرضی سے تو کبھی بھی ایسے پرفتن نظام کو حاصل کرنے کے لیے اپنی سیاست کو بے دین بنانے پر تیار نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ہاں کے چند مغرب پرست حضرات کا اقلیتی طبقہ موجودہ مغربی نظاموں پر کتنا بھی کیوں نہ ریجھ گیا ہو' عام مسلمان ان کی حقیقت کو خوب اچھی طرح محسوس کر رہا ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ ہمارا یہ اقلیتی طبقہ اپنے نقطۂ نظر کو ڈنڈے کے زور سے عوام پر ٹھونسنے پر اتر آئے اور آمریت کی مسند پر بیٹھ کر جمہور کی تمناؤں کو پامال کرے اور اسلام کو اجتماعی زندگی میں داخلہ سے روکنے کے لیے سنگین اور تلوار کو مامور کر دے۔

سوچنے کا ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ اجتماعی زندگی ہمیشہ ایک اساسی نظریے کی محتاج ہوتی ہے' اور آج جب کہ نظریات کی کشمکش کا دور ہے کسی بھی قوم کے لیے نظریہ ونصب العین

کی طاقت کو ساتھ لیے بغیر معرکہ ہائے حیات سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں رہا۔ توڑ پھوڑ کے اس خاص دور سے سلامتی کے ساتھ وہی ریاستیں اور وہی معاشرے گزر سکیں گے جو نظریات و مقاصد کے بل پر زندہ ہیں۔ اسلام ہمیں سیاست و تمدن کے لیے ایک بلند ترین نظریہ و نصب العین دیتا ہے۔ جسے اگر مرکزی روح قرار دیا جائے تو ہماری ساری سرگرمیاں اس کے ذریعے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ اس سے ہمیں ایک اجتماعی طرز فکر اور ایک نقطۂ نظر ملتا ہے' وہ ہمیں ایک معیار فیصلہ فراہم کرتا ہے' وہ ترقی کے راستے پر ہماری رہنمائی کرتا ہے' اور وہ قدم آگے بڑھانے کے لیے ایک زور دار محرک و داعیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ سیاست کے دائرے سے اسلام کو نکال باہر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نظریہ و نصب العین کا ایک خوفناک خلاء پیدا ہو جائے۔ یہ خلاء جب اپنے پُر کیے جانے کا شدت سے تقاضا کرے گا تو آپ کو بیرونی دنیا سے نظریۂ وطن پرستی و قوم پرستی کو مستعار لینا پڑے گا۔ عقلمندی یہ ہے کہ اسلامی نظریہ اختیار کرکے یہ خلاء باقی نہ رہنے دیا جائے۔

یہ بجا ہے کہ آج کسی ملک میں اسلامی نظام برسرعمل نہیں ہے۔ اور بھی بہت سی مطلوب چیزیں ہیں جو مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتی رہی ہیں۔ ان میں ایکا نہیں رہا' ان میں ایک اصولی ہیئت اور ایک مقصدی تحریک ہونے کا شعور مر گیا ہے' ان سے انسانیت کی رہنمائی کا منصب چھن چکا ہے' ان کی تحقیق و ایجاد کی صلاحیتیں ٹھٹھر چکی ہیں' ان میں دوسروں سے مسابقت کا داعیہ برسرعمل نہیں رہا' ان میں کردار کی بلندی باقی نہیں' ان کی اخلاقی قدروں کی جڑیں سوکھ رہی ہیں' ان میں معاشی بدحالی پھیل چکی ہے' ان میں دوسروں کی غلامی نے بہت سی خرابیاں پیدا کر دی ہیں۔ جس طرح ان سارے پہلوؤں میں سے کسی پہلو میں بھی اصلاح و تعمیر کی کوششیں اس دلیل سے لغو اور باطل نہیں ٹھہرائی جا سکتیں کہ چونکہ مدت سے یہی حال چلا آ رہا ہے لہٰذا اب اسے کیوں بدلا جائے' یا چونکہ کوئی مسلمان ملک بھی آج کسی مطلوبہ نعمت سے مالا مال نہیں' لہٰذا پاکستان ہی کیوں اس سے بہرہ مند ہو' اسی طرح اسلام کو بہ حیثیت ایک دین کے پوری کی پوری زندگی پر کارفرما بنانے کی کوشش کا بطلان اس دلیل سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح کی منطق اگر انسانی دنیا میں مقبول ہو گئی ہوتی تو نہ جمہوری انقلابات واقع ہوتے' نہ اشتراکی اور فسطائی نظام قائم ہو سکتے' نہ ہی پہلے سے چلی آنے والی کسی غلط اور نامطلوب

صورت حالات کو بدلنے کا ارادہ کسی دل میں راسخ ہو سکتا۔

آخر دین و سیاست کو اسلامی نظریہ کے تحت ایک کرنے کی جس مثال کا مطالبہ کیا جاتا ہے وہ کہیں نہ کہیں پہلے قائم کرنی ہی پڑے گی۔ خود ہی اسے روکنا اور پھر خود ہی کہنا کہ اس کی کوئی مثال موجود نہیں ہے' لہٰذا اسے شجر ممنوعہ قرار دینا چاہیے' نامعقولیت کی ایک اونچی مثال ہے۔

○

انسان کی کائنات میں اصل حیثیت سے متعلق اس بنیادی بحث کے بعد یہ جاننا ضروری ہے کہ انسان کے لیے علم کی حقیقت اور اہمیت کیا ہے' اور اس کے لیے بالآخر جامع' متوازن اور مکمل تعلیمی اسکیم کون سی ہے؟ (ادارہ)

اسلامی نظامِ تعلیم

چند بنیادی نکات

حقیقت علم

حقیقت علم صرف یہ ہے کہ ہم اپنے متعلق جان لیں کہ سارے کائناتی ماحول کے بالمقابل ہمارا مقام کیا ہے؟ انسان ہونا کیا ہے اور اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔

اس بارے میں اقبال کا ایک شعر بڑا کام دیتا ہے۔

شاہد اول شعور خویشتن
خویش را دیدن بہ نور خویشتن
شاہد ثانی شعور دیگرے
خویش را دیدن بہ نور دیگرے
شاہد ثالث شعور ذات حق
خویش را دیدن بہ نور ذات حق

مطلب یہ کہ اپنی حقیقت کو جاننے کے لئے پہلی شہادت خود اپنے ہی شعور کی ہوتی ہے اور ''میں ہوں'' یا ''میں سوچتا ہوں'' یا ''میں نیکی اور بدی میں تمیز کرتا ہوں'' سے بات شروع ہو کر نفسیات کی گہرائیوں اور بلندیوں تک چلی جاتی ہے۔

دوسری شہادت غیر کی شہادت ہے یعنی ہم سے غیر جو کچھ پایا جاتا ہے اس کے مجموعے کا نام کائنات ہے۔ کائنات کے حقائق اس کے نظم' اس کے قوانین' اس کے جمالیات اور اس کے اندر بلاخلل متضاد قوتوں کا کام کرنا' یہ سب کچھ جب نقطہ بہ نقطہ سامنے آتا ہے تو ہم اپنی حقیقت کو سمجھنے کے زیادہ قابل ہو جاتے ہیں۔

تیسری شہادت خدا کی شہادت ہے۔ ہماری عقل اور ہمارا علم جب حواس کی وادیوں

سے گزر کر کسی قدر قیاس کی شعبدہ کاریوں کی سیر کرا چکتا ہے تو پھر ایک دھند لکے کے سامنے لا کر چھوڑ دیتا ہے نہ عقل آگے جا سکتی ہے' نہ حواس' نہ قیاس' البتہ عقل اپنی ساکھ بچانے کے لئے طرح طرح کی باتیں کرتی ہے کہ بس آگے کچھ نہیں یا یوں ہو گا' یا ممکن ہے کہ ایسا ہو' یا قیاس اوہام و ساوس کی شکل میں طرح طرح کے ہیولے بنا کر دکھاتا ہے۔ اس جگہ آ کر آدمی کی ساری عقلیت' فلسفہ اور سائنس اوندھے منہ گر پڑتے ہیں۔

تب وہ تیسرا شاہد نمودار ہوتا ہے' بذریعہ نبوت' اور وہ خدا ہے۔ جب خدا کے وحی کردہ علم کے ذریعے ہم اپنے سابق علم خود (یا علم انسان) اور علم کائنات کو جانچتے ہیں تو کئی ٹیڑھ سامنے آتے ہیں۔ اس تیسری شہادت کی کسوٹی پر پورا اترنے کے بعد ہم اس کی ذمہ داریوں سے بھی آگاہ ہو جاتے ہیں۔ اس کی عرش رس عظمت بھی سامنے آ جاتی ہے اور اسے اسفل السافلین میں گرانے والی قوت باطل بھی۔

میرے نزدیک علم انسان کا اپنے آپ کو پہچان کر اور خود کو صحیح مقام پر رکھ کر اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے جامع شعور کا نام ہے جو مرتبہ کمال کو پہنچ کر ایمان بن جاتا ہے۔

اہمیت علم

علم و شعور انسانی قوت (اور اس میں اضافے) کا ایک اہم ذریعہ ہے یعنی اگر ہم اولاً خدا کے متعلق اور اس کے دین کے متعلق' ثانیاً خود اپنی قومی اور تہذیبی ہستی اور اس کی تاریخ کے متعلق اور ثالثاً اشیاء' مخلوقات اور دولت کے متعلق علم و شعور سے آراستہ ہو جائیں اور ہمارے ایمانیات میں بھی شعور کارفرما ہو (یعنی بات کی پوری سمجھ بوجھ) تو ہماری قوت بڑھ جاتی ہے۔ علم کو بڑھانے کے لئے نظام تعلیم اہم ترین ذریعہ ہے۔ اس ذریعہ کو صحیح طور پر کام کرنا چاہئے۔ اس وقت ہم میں ایمانی و اخلاقی یا سیاسی و معاشی یا تعزیری و دفاعی پہلو سے کمزوریاں ہیں تو علم کی کمی اور اس کے اجزا کی ترتیب کی غلطی کی وجہ سے ہیں۔ موجودہ نظام تعلیم نسخہ ہے غلام قوم کے لئے اور یہاں استعمال ہو رہا ہے ایک آزاد مسلم قوم پر جو احیائے اسلام کا کام کرتے ہوئے مستحکم بننا چاہتی ہے۔

علم اور ایمان کا تعلق

کوئی سنی ہوئی بات یا سوچی ہوئی بات ضروری نہیں کہ فوری طور پر علم کی سطح تک پہنچ جائے۔ علم قرار پانے سے پہلے ہمارے پاس بہت سے ظنیات اور قیاسات اور استفہام ہوتے ہیں۔ نیز کئی معاملات میں غلط اور صحیح کے مرکبات موجود ہوتے ہیں' یعنی آدھا خیال حقیقت سے تعلق رکھتا ہے اور آدھا محض خواہش سے۔ لیکن جب کوئی خیال' یا کسی طرح کی معلومات دلائل اور تجربوں کی مدد سے محکم ہو جائیں یا ہمارے بعض علم نما سوالات اپنے قطعی جواب تک پہنچ جائیں تو ہمیں وہ یقین حاصل ہوتا ہے جو کسی رائے یا کسی بیان یا کسی احساس کو علم بنا دیتا ہے۔

یعنی' معلومات + یقین = علم

یہی یقین ہے جو علم کے لئے ایمان کو لازم کر دیتا ہے۔ یعنی اگر آپ کو یہ علم یقین کی حد تک حاصل ہے کہ دودھ میں نیبو نچوڑنے سے دودھ پھٹ جائے گا تو آپ دودھ کو ضائع کرنے پر کبھی تیار نہ ہوں گے یا آپ کو اگر یقینی علم ہے کہ آگ جلاتی ہے تو آپ اس میں کبھی ہاتھ نہ ڈالیں گے۔ اس سے سمجھ لیں کہ یقینی علم سے ایمان پیدا ہوتا یا اس میں اضافہ ہوتا ہے اور یقینی علم یا ایمان رکھنے والا کوئی متنفس اپنے علم اور اپنے ایمان کی عملاً خلاف ورزی نہیں کرتا۔ بجز اس کے کہ سہواً کوئی ناروا بات ہو جائے مثلاً آپ ننگے پیر چل رہے تھے اور راکھ پر پاؤں آ گیا جس میں چنگاریاں موجود تھیں اور آپکا پاؤں جل گیا۔ یا آپ نے ایک نہایت ہی خستہ حال کتے کو دیکھ کر رحم کھایا اور اسے لا کے پانی پلوا دیا۔ وہ پانی پیتے ہی ہلاک ہو گیا۔ (یہاں خود علم میں نقص تھا یا ایمان میں کمزوری)

بس یقینی علم ہی ایمان کی شکل اختیار کرتا ہے اور یقینی علم اور ایمان میں کبھی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ دوسرے یقینی علم یا ایمان انسانی اعمال اور اس کے کردار کو اپنے مطابق بنا لیتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر معلوم کرنا چاہئے کہ خود علم ہی تو کمزور نہیں ہے جس کی وجہ سے اس پر قائم ہونے والا ایمان بھی مؤثر نہیں ہوتا۔

دوسرا نکتہ ہے کہ علم کا تعلق دماغ سے ہے اور ایمان کا تعلق دماغ کے واسطے سے قلب اور ضمیر سے ہے۔ انسانی زندگی میں جب دماغ اور قلب و ضمیر ہم آہنگ ہو جاتے ہیں تو حالت

ایمان حاصل ہوتی ہے لیکن اگر دماغ اور قلب وضمیر میں کشمکش چلی رہے تو حالت مطلوب حاصل نہ ہوگی۔

اسلام ایک مکمل نظام تعلیم

اسلام فی نفسہ سب سے بڑی تعلیمی اسکیم ہے۔ ایک مکمل اور جامع نظام تعلیم ہے مغربی طرز تعلیم کے برعکس اس میں علم اور اخلاق حسنہ کی ہم آہنگی اور دونوں پلڑوں کا برابر ہونا لازمی ہے۔ مغربی طرز تعلیم میں آداب شائستگی کا تو ایک خاص پیمانہ ہے مگر کوئی اخلاقی سسٹم نہیں ہے خصوصاً تعلیم تو اب Quality اور Progress کے خرادوں پر چڑھ کر اتنی چھل چھلا گئی ہے کہ نظام اخلاق کا تعلیم میں گزر نہیں۔ ہمارے ہاں تعلیم کے ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں ایک وہ علم ہے جو حواس سے شروع ہو کر عقل کی رہنمائی میں تجربہ و مشاہدہ کی کٹھالیوں میں (یا آج کل کی اصطلاح میں ٹسٹ ٹیوبوں میں) پختہ ہو کر سائنس کی مختلف ٹیکنیکل شاخوں میں پھیل جاتا ہے اور ضمناً تجربی عقل اور حواسی شعور کے ساتھ ساتھ سائنس کے سہارے قیاس کی جڑوں کے بل پر فلسفہ کی بیل ہر طرف پھیلتی چلی جاتی ہے۔ یہی وہ دائرہ ہے جہاں سائنسی قوتوں کے نشے میں بدمست انسان نے زندگی کے حقائق کے متعلق بڑی بڑی تباہ کن ٹھوکریں کھائی ہیں اور قیاسی فلسفہ جسے بعض قوتیں سائنسی فلسفہ کہہ کر بلکہ کبھی کبھی (سائنس+قیاسات) عین سائنس قرار دے کر بہت مرعوب کرتی ہیں۔ مگر سائنس کی رہنمائی میں قیاسی فلسفہ قدم قدم پر نئے ظن وگمان کے ساتھ آخر ایک ایسی لکیر پر جا کھڑا کرتا ہے کہ پیچھے سے چلا آنے والا لمبا سلسلہ معلومات و دلائل یکا یک ٹوٹ جاتا ہے اور سائنس تو اس مقام پر آ کر پہلے ہی کانوں پر ہاتھ رکھ کر دور ہٹ جاتی ہے کہ ناں بابا' میں اس سے آگے کا کچھ پتہ نہیں دے سکتی کہ آگے کیا ہے؟ نہ یہ بتا سکتی ہوں کہ آگے کوئی اور دنیا ہے نہ یہ کہہ سکتی ہوں کہ خدا ہے اور نہ ایسا کہہ سکتی ہوں کہ خدا نہیں ہے۔ وہ تو کہتی ہے کہ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ کائنات کا آغاز کس طرح ہوا؟ میں نہیں جانتی کہ کائنات میں قانون' ریاضی' جیومیٹری' جمالیاتی آرٹ اور اس کے ہر حادثۂ ظہور و فنا اور حرکت و گردش میں مقصدیت کیوں ہے؟ قیاسی فلسفہ تھوڑی بہت زبان چلاتا ہے اس سے آگے نہیں بڑھتا کہ یہ ہوگا' یا یوں ہوسکتا ہے یا اس اس طرح کے امکانات

ہیں۔ اس کی عادت ہے کہ "چپ نہ شود"۔

یہ وہ بے بسی کا مقام ہے جہاں خدا کے انبیاء جو مختلف زمانوں اور علاقوں میں خدا پرستی اور حسن اخلاق کی ایک ہی دعوت اور اس کے لئے ایک جیسے بے داغ اعلیٰ کردار اور ذاتی لحاظ سے کامل بے لوثی کے ساتھ طرح طرح کی سختیاں برداشت کرتے ہوئے' انسان کو بتاتے آتے رہے کہ اس کائنات کا ایک منتظم اور مالک' حاکم اور ایڈمنسٹریٹر اور ڈائریکٹر ایسا ہے جو پورا علم' پورے وسائل اور پوری قاہرہ قوت اسے چلانے کے لئے رکھتا ہے۔ اس نے انسانی علم کو پردہ غیب کی حقیقتوں تک پہنچانے کے لئے ہمارے ذریعے یہ انتظام کیا ہے کہ ہم وحی والہام کی مدد سے یہ بتائیں کہ حواس اور قیاس کی حدوں سے آگے کیا ہے۔

یہ ہستیاں تھیں جنہوں نے انسان کو شعور برتر کی ایک نئی قسم ایمان سے آگاہ کیا اور زندگی بسر کرنے کا ایک اخلاقی ضابطہ ان کے سامنے رکھا جس پر قدروں کے چراغ روشن ہیں۔

اب گویا مغربی علم اور اسلامی علم کے فارمولے یوں بنے:۔

1. (حواس + تجربہ و مشاہدہ = سائنس) + قیاسی فلسفہ۔ بعد ازاں تاریک خلاء
2. الہامی علم = (ایمان' ہدایت فکر و عمل + اخلاق) + (حواس + تجربہ و مشاہدہ بہ سائنس) + قیاس و فلسفہ تابع الہام۔ کوئی تاریک خلا نہیں

اس تصور کے مطابق موجودہ تعلیم ہمیں ایمان و اخلاق سے دور ہٹانے کی کوشش کر رہی ہے۔ بخلاف اس کے صحیح اسلامی حکمت تعلیم انسان کو ایمان' اخلاق' علم اشیاء اور کائنات میں خدا کے نیابتی تصرف کی ذہنی اور عملی صلاحیتوں سے آراستہ کرتی ہے۔

طریق تعلیم

طریقۂ تعلیم کا پہلا اہم ترین اصول یہ ہے کہ طریقۂ تعلیم اور طریقۂ تدریس ایسا ہو جو طلبہ میں نفرت یا اکتاہٹ یا عدم دلچسپی پیدا نہ کرے۔ اس حقیقت کا ترجمان یہ شعر بڑا وسیع المعنی ہے۔

درس ادیب گر بود زمزمۂ محبتے
جمعہ بمکتب آورد طفل گریز پائے را

مطلب یہ کہ اگر تعلیم آدب (ادب کہتے ہیں ہر چیز کو اس کے منصب پر رکھ کر طرز عمل اختیار کرنا) ایسی پرلطف ہو جیسا محبت کا کوئی نغمہ ہو سکتا ہے تو پھر بجائے اس کے کہ "طفل" یعنی طالب علم مدرسے اور کلاس سے بھاگے، وہ تو جمعہ (یعنی چھٹی) کے دن بھی یہ چاہے گا کہ مکتب کھلا رہے اور وہ حاضری دے۔

معلم ـــ پرائمری سطح کا ہو یا کالج اور یونیورسٹی کی سطح کا، اسے علم، مباحث، متعلقات علم اور انطباقات علم (Application of the Knowledge) غرضیکہ پورے مواد کو طلبہ کے لئے انتہائی دلچسپ بنا دینا چاہئے۔ بلحاظ ترتیب، بلحاظ زبان اور بلحاظ انداز بیان، اور بحیثیت مجموعی طلبہ کے ساتھ ایسے علمی رابطے اور مؤثر ابلاغ (Communication)، کہ وہ محسوس کریں معلم یا پروفیسر کے ساتھ ہم سب مل کر ایک قافلے کی شکل میں سفر علم پر نکلے ہیں اور مرحلہ بہ مرحلہ عجائبات سامنے آ رہے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے ٹھوس حقائق بھی کسی ڈزنی لینڈ کے تفریحی تماشے ہیں۔ تعلیم میں محبت کے عنصر کی اہمیت کو آنحضورؐ کی ایک حدیث واضح کرتی ہے جس میں دو صحابیوں کو آپ ایک علاقے میں دعوت و تعلیم کی مہم پر بھیجتے ہوئے تاکید فرماتے ہیں کہ:۔

بَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا

یعنی تم لوگوں کے لئے بشارت اور نوید (بلکہ بشاشت) دینے والے بنو، نہ کہ نفرت اور گریز پیدا کرنے والے۔

گویا حکمت تعلیم کا ایک عظیم اصول حضورؐ نے دو لفظوں میں بیان فرما دیا۔

طریقہ تعلیم کا دوسرا بڑا اصول جو اصول تدریس بھی ہے "تدریج" ہے۔ اس کی وضاحت ان جملوں سے ہو سکتی ہے:

- معلوم سے نامعلوم کی طرف
- آسان سے مشکل کی طرف
- اجمال سے تفصیل کی طرف
- معلوماتی نقص یا کمی سے معلوماتی تکمیل کی طرف
- اصول سے اطلاق (Application) کی طرف
- علاقائی یا خاندانی یا نسلی محدودیت سے آفاقیت کی طرف (یعنی پوری انسانیت نظر میں

آ جائے)

- ادہام سے حقائق کی طرف
- رائج العام غیر منطقی افکار سے روشن دلائل کی طرف
- عقل کی حدود سے ماوراامور میں وحی الٰہی کی طرف
- محض معلومات اور افکار کے بجائے اخلاق یا اجتماعی رابطوں یا سائنسی معاملات میں عمل کی طرف

تیسرا اصول اساتذہ اور طلبہ و طالبات کے متعلق یہ کہ سچی اور صحیح باتوں کی تعلیم دینا یا ایسی تعلیم حاصل کرنا۔ ہر فرد کو ذہن نشین کرا دینا کہ چاہے آپ معلم ہوں یا متعلم' اگر صحیح شعور و مقصد کے ساتھ اپنا کام کر رہے ہیں اور یہ نیت رکھتے ہیں کہ وہ حاصل ہونے والی صلاحیتوں کو خدا اور رسولؐ کی طرف سے مقرر کردہ مقاصد کے لئے دیانت داری سے ظلم اور بدی اور باطل کے خلاف استعمال کریں گے تو ان کا ہر لمحہ جو اس کام میں صرف ہو رہا ہے وہ عبادت اور صدقہ کی تعریف میں داخل ہے اور گویا وہ ادائے فرض میں مصروف ہیں۔

میں نے اس بات کو اصول تعلیم میں اس لئے شامل کیا ہے کہ اس شعور کے ساتھ اگر معلم تعلیم دے گا تو وہ اپنا کام زیادہ تیاری' زیادہ محنت اور زیادہ انہماک سے کر سکے گا۔ اور اگر طلبہ و طالبات اس شعور کے ساتھ تعلیم حاصل کریں گے یا لیکچر' سبق میں شریک ہوں گے یا مطالعہ و تحقیق کریں گے تو وہ سارے دائروں میں ایک نیا کیف و سرور پائیں گے۔

یہاں میں یہ اضافہ کرتا ہوں کہ غیر مسلم اساتذہ و طلبہ میں کم سے کم یہ شعور کارفرما ہونا چاہئے کہ وہ انسانیت کی بہترین خدمت انجام دینے' بھلائی کی قوتوں کو ترقی دینے اور برائی کی قوتوں کا زور توڑنے کے لئے اس مہم میں مصروف ہیں تو طریق تعلیم اور طریق تعلم کا رنگ بدل جائے گا۔

مقصد تعلیم

علوم کا ایک بہت بڑا سمندر ہے جس میں انبیاء و حکما سے لے کر ہر خطیب و ادیب اور ہر صاحب فن و حکمت نے اول روز سے اب تک مسلسل نسل انسانی کی ذہنی میراث کا عرق نچوڑ نچوڑ کر شامل کیا ہے۔ اور آج ان بے شمار محسنوں کی محنتوں کے نتیجے میں علوم اور معلومات کا

ایک بڑا سرمایہ ہم میں سے ہر شخص کے لئے یکساں کھلا ہے۔ اس میکدے سے جس کا جتنا جی چاہے اور جس میں جتنی ہمت ہو اپنے خم وسبو بھر کے لے جاتا رہے، خوب سیراب ہو اور جسے چاہے سیراب کرے۔

جس طرح مطالعہ کے لئے زباندانی کی کنجیاں بہت ضروری ہیں کہ ان سے آدمی مختلف کتابوں اور تحریروں اور معلومات کے دروازے کھول سکے اور ایوان مطالعہ میں داخل ہو کر خوب مطالعہ کرے، اسی طرح ریاضی، جیومیٹری یا جغرافیہ وتاریخ اور سائنس کے دروازہ ہائے علوم کی کچھ کلیدیں ہوتی ہیں۔ پہلے درجے پر محدود سے دائرے میں ماں باپ اور خاندان اور دوسرے درجے میں مکتب و مدرسہ اور کالج یونیورسٹیاں یہی کام کرتی ہیں کہ وہ نہ صرف طالبوں کو علوم کی کنجیاں دیتی ہیں بلکہ ایسے طریقے بھی سکھاتی ہیں کہ وہ ایک خاص تدریجی نہج سے مطالعہ کریں، اس میں مسلسل اضافہ کرتے جائیں بلکہ حافظہ کو تربیت دیں کہ وہ ان کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے حاصل کردہ علوم اور ان پر بحثوں اور غور وفکر کا ریکارڈ رکھتا رہے۔

اس سے زیادہ تعلیم گاہوں کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ تعلیمی ادارات پچھلی تمام نسلوں کی جمع کردہ معلومات و افکار اور ان کی واضح ہونے والی غلطیوں اور غلطیوں کی اصلاحات کا پورا ریکارڈ ہمارے سامنے رکھ دیتی ہیں جو ایک طرح کا خلاصہ ہوتا ہے۔ اور پھر وہ محنتی طلبہ کو ریسرچ کا وہ راستہ دکھا دیتی ہیں جو انہیں دور دور تک پھیلی ہوئی وادیوں کے ہر گوشے میں پہنچ کر گل چینی کا موقع دیتا ہے۔ اس طرح وہ اعلیٰ درجے کے علم کے گل دستے تیار کر کے بعد والوں کو بھی (اور ہم عصروں کو بھی) نمونہ بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ لیکن جب سے حصول تعلیم کا مقصد معاش قرار پایا ہے، توسیع علم وفکر کا سارا منصوبہ ناکام ہو گیا ہے جس کا تقاضا سب سے زیادہ تو مذاہب وادیان کرتے ہیں اور پھر دنیوی ضروریات۔

تعلیم کا مقصد علم حاصل کرنا، علم کی تلاش کے راستوں کو جاننا، ایسی کلیدیں مہیا کرنا جن سے ہر شعبہ علم کے دروازے کھل سکیں، وہ طریقے جاننا جن کی مدد سے کسی بھی وادی علم کے بوٹے بوٹے اور پتے پتے کو بلکہ ذرے ذرے کو کسی باضابطہ طریق سے سمجھا جائے اور پھر تفکر کر کے نتائج نکالے جائیں۔ نتائج کا مقابلہ دوسرے پیشرووں یا ہم عصروں کے نتائج سے کیا جائے۔ فرق محسوس ہو تو دریافت کیا جائے کہ غلطی کہاں ہے اور کس جانب ہے، اور غلطی کے دلائل کیا ہیں؟

محض معاش کے لئے علم حاصل کرنے والے طالب علم کی نگاہ اتنی بلند اور دور رس نہیں ہوتی' بلکہ اس کا سارا سفر ایک ڈگری یا ڈپلومے یا سند تک پہنچنا ہوتا ہے' چمنستان علم کے گونا گوں رنگوں اور نگہتوں پر توجہ کرنے کی اسے فرصت ہی نہیں ہوتی۔ مسائل حیات وکائنات اور معاملات خدا پرستی والحاد پر وہ اپنی قوتیں صرف نہیں کرتا۔ وہ تو ناک کی سیدھ ڈگری کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس کے لئے جائز وناجائز ذرائع کھلے دل سے استعمال کرتا ہے۔ محض رٹا لگانے کی بیماری ہی اس کے لئے ارباب مطالعہ وتفکر کی مجلس میں داخلے کا امکان باقی نہیں چھوڑتی۔ ایسے آدمی کو نہ فلاسفی کا کوئی نکتہ دماغ سوزی پر آمادہ کرسکتا ہے' نہ سائنسی حقائق یا (حقائق + قیاسات) پر مبنی نظریئے اسے متوجہ کرتے ہیں کہ ہر معاملے کی کنہ معلوم کرے۔ اسی طرح ادب وشعر کی نزاکتیں اور لطافتیں نہ اس کے قلب کو گرماتی ہیں نہ جگر کو پگھلاتی ہیں' وہ پتھر کا پتھر بنا ان سب کو روندتا گزر جاتا ہے۔

اسی وجہ سے آپ دیکھیں گے بہت سے گریجوایٹ اور پوسٹ گریجوایٹ آپ کو ایسے ملیں گے جو راست گفتاری سے بات نہیں کرسکتے' بلکہ شرابی کی طرح ان کا کوئی قدم کہیں جا پڑتا ہے اور کوئی کہیں۔ متضاد چیزوں کو جمع کر لیتے ہیں' ایک بات پر استدلال کرتے کرتے دوسرے موضوع پر چلے جاتے ہیں۔ ان کے مزاج میں شائستگی اور لطافت پیدا نہیں ہوتی۔ الا یہ کہ وہ اس قسم کا مصنوعی خول اپنے اوپر چڑھا رکھیں۔ ان کا منتہا چونکہ معاش ہوتا ہے' لہٰذا دولت مل جائے تو پھر انہیں اور کوئی چیز قیمتی معلوم نہیں ہوتی اور دولت نہ ملے تو وہ خزاں زدہ پودوں کی طرح مرجھا جاتے ہیں۔

دوسری طرف کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جن کو ڈگریاں یا سندات حاصل نہ ہوں گی مگر ان کا علم وفکر کسی نہ کسی شعبے میں فرسنگوں آگے ہوگا۔ یہ لوگ دنیائے تحقیق میں بھی ملیں گے دنیائے تخلیق میں بھی ملیں گے' ان میں سے اعلیٰ مقامات پر پہنچنے والے ایسے بھی ہوں گے جو معمولی درویشانہ زندگی کو اپنے لئے کافی سمجھتے ہوں گے اور کبھی دولت سمیٹنے کا ولولہ ان میں نہ اٹھے گا۔ وہ وسیع رابطوں سے بھی بے نیاز ہوں گے۔ جو آئے اس کے لئے چشم براہ' جو نہ آئے تو نہ خواہش نہ گلہ۔ ان کے اپنے اندر بڑی دنیائیں آباد ہوتی ہیں۔ ان سے بے شمار کردار' اشعار اور تحقیقی دریافتیں گفتگو کرتی ہیں۔ ان کی تحریریں ان کی تیمارداری کرتی ہیں' ان کی کہانیاں ان کے بازوؤں سے لپٹ کر گدگدی کرتی ہیں اور خوب ہنستی اور ہنساتی ہیں۔

صاحب تحقیق اور صاحب تخلیق کبھی تنہا نہیں ہوتے' وہ ساری کائنات میں اڑتے پھرتے ہیں اور ایک ایک ذرہ سے پیار کرتے اور ایک ایک کرن سے باتیں کرتے ہیں۔ غرضیکہ ہوس' دولت وشہرت اور سفلی خواہشات کی بلائیں ان کو چمٹ نہیں پاتیں۔

تعلیم کا ایک اہم مقصد ذی شعور آدمی کے اندر صحیح ذوق مطالعہ کو پروان چڑھانا بھی ہے تاکہ وہ ذہنی توانائی کے لحاظ سے ایک اعلیٰ قوت کا مالک ہو سکے اور اسے اتنی فکری روشنی حاصل ہو کہ وہ اپنے لئے بہترین مسلک زندگی متعین کر سکے اور خیر و شر کی تمیز اسے حاصل ہو' نیز وہ خواہشوں کا شور سنتے ہوئے ضمیر کی دھیمی سی آواز بھی سن سکے۔ اتنا کچھ ہو تو ایک اچھی شخصیت کا ہیولیٰ بن جاتا ہے اور ایسی شخصیت اپنے مطالعہ وتفکر کی راہیں خود سوچ سکتی ہے اور نکال لیتی ہے اور دوسروں کے مشوروں اور تجربوں سے استفادہ کرتی ہے۔ ملحدانہ فلسفے اور وحی والہام کی تعلیمات کو جانچ سکتی ہے۔

مروجہ تعلیم آج کے دور میں بھی ویسے ہی غلامانہ مزاج کے تقلید شعار' نقال اور دنیا پرست اور نفس پرست اور بے مقصد نوجوان تیار کر کر کے ان کی خاصی تعداد کو بے روزگاری کے گڑھے میں دھکیل رہی ہے۔ مروجہ تعلیمی فکر' نصابی کتب (بلا تنقید رٹا)' ذریعہ تعلیم (انگریزی) اور تعلیم گاہوں میں اساتذہ اور طلبہ کی مغرب پرستانہ ذہنیتوں کو ان کے پسندیدہ خالص مغربی یا ملغوبہ کلچر کی شہادت یہ ہے کہ ہم آزادی سے پہلے کے دور سے بھی زیادہ پستی میں چلے گئے ہیں۔ اس وقت قابلیت تو ہوتی تھی' اب تو امتحانات میں خیانت کا اتنا عمل دخل ہے کہ کسی گدھے کو بھی طوق زریں مل سکتا ہے بلکہ ہر گدھے کو۔

اندریں احوال میرا خیال ہے کہ اس نظام تعلیم کا رگ رگ میں اترا ہوا زہر نکالنے کے لئے صحیح مقاصد کے ساتھ پرافادیت مطالعہ کو ذریعہ بنانا چاہئے۔ اکیلے اکیلے بھی اور گروپ بن کر بھی۔

اسلامی نظام تعلیم' عقائد ونظریات

اسلامی نظام تعلیم طلبہ کے دل و دماغ کو ذیل کے نظریات و خیالات سے آراستہ کرتا ہے۔

❀ یہ دنیا ایک صاحب حکمت' صاحب جمال اور صاحب ارادہ واقتدار ہستی واحد کی تخلیق

کردہ ہے اور اس کے قوانین پر چل رہی ہے۔

❀ انسان کا جسمانی' ذہنی اور نفسیاتی ڈیزائن جس طرح بنایا گیا ہے وہ گواہ ہے کہ انسان اس طرح نہیں بنا کہ مادے کو کائناتی مکسر (Mixer) میں ڈال کر خوب بلویا اور گھمایا گیا ہو اور مادے کے اجزا آپ سے آپ مل جل کر حیوانات کا سلسلہ ارتقا بن گیا ہو اور اس شجرہ میں سے بھلا چنگا انسان برآمد ہو جائے۔ یہ انسان کا مادہ پرستانہ حیوانی تصور ہے' عقل کے نزدیک بس وہ ایک جانور ہے۔

❀ خدا کے تمام انبیا تابہ خاتم النبیینؐ نے یہ بتایا کہ آدمی اللہ کا خلیفہ و نائب ہے اور اس کے اندر تقسیم خیر و شر کا ایسا شعور اخلاقی رکھا گیا ہے جو حیوانوں میں نہیں ہوتا۔

❀ تمام انسان برابر ہیں' تمام احترام انسانیت کا حق رکھتے ہیں' تمام ایک دوسرے کے لئے حقوق و فرائض رکھتے ہیں' جن کی باہم ادائیگی اور ہمدردی و خیر سگالی سے تہذیب پروان چڑھتی ہے۔

❀ انسانوں کی دو بڑی قسمیں ہیں' اسلام کو ماننے والے اور اس کا انکار کرنے والے۔ اسلام کو ماننے والے خدا پرست ہی اس دنیا کو امن و عدل سے مالا مال کر سکتے ہیں۔

❀ نوجوانوں میں اپنی نعمت دین و ایمان اور علم قرآن' نیز حضور پاکؐ کی پیشوائی کا مبارک احساس موجود ہونا چاہئے۔

❀ ہمارا سرچشمۂ دین و تہذیب' ہمارے عقائد اور اصول اور باہمی رابطے ہیں۔ اپنی تہذیب کی علمبرداری کرنے والوں کو دوسروں کے دین و تہذیب کی نقالی نہیں کرنی چاہئے بلکہ خود اپنے تہذیبی اور دینی تشخص کا پرچم بلند کر کے دنیا تک اس کی نعمتوں اور روشنیوں کو پہنچانا چاہئے۔

❀ ہر دینی نظام اپنا اخلاق و کردار اور ہر تہذیب اپنی درخشاں اقدار رکھتی ہے بلکہ ایک تاریخ نشوونما پاتی ہے جس میں اعلیٰ درجے کے زریں ابواب بھی ہوتے ہیں اور چاند ستاروں کی طرح چمکنے والی شخصیتیں بھی۔ رزم خیر و شر کی اہم تاریخی داستانوں اور ان کے ہیروز (Heroes) کو جاننا اور سمجھنا چاہئے۔

مقصد نظام تعلیم

ہمارے نظام تعلیم کا مقصد ایک ایسے معاشرے کے لئے افراد کی تیاری ہے:

- جو اسلامی نظام حیات کو برپا کر کے عملاً یہ ثبوت دے سکے کہ انسانیت کے لئے امن' عدل اور اخوت کا بہترین نظام یہی ہے۔
- جو ہر قسم کی بدعنوانیوں سے پاک ہو۔
- جس کے تمام افراد میں اسلام کی علمبرداری کا انقلابی مشن اتنے مؤثر طریق سے کام کر رہا ہو کہ کوئی مفاد کوئی تعصب اور کوئی وجہ تفریق ان کی صف اتحاد میں رخنہ نہ ڈال سکے۔
- جس میں اسلام کے وسیع اساسی عقائد و مقاصد کے تحت مختلف گروہ اور مدارس فکر اپنے اختلافی نقطہ ہائے نظر کے باوجود اخوت کا مظاہرہ کر سکیں۔
- جس کا مقصد انسانیت کو نیکی کا پیغام دینا' ظلم اور بدی سے روکنا' اور امن سے بہرہ ور کرنا ہو۔
- جو اپنی مضبوط قوت جہاد سے ہر دشمن قوت کے جارحانہ عمل کا منہ توڑ جواب دے سکتا ہو۔

نظام تعلیم اور ہماری بنیادی اقدار

ملت پاکستان کا نظام تعلیم طے کرنے سے پہلے یہ سوال انتہائی اہم ہے کہ ایک مسلمان معاشرے کی بنیادی اقدار کیا ہیں۔ اس سوال کا دوٹوک جواب اول تو ہمارے سامنے پہلے دن سے ہونا چاہئے تھا' ورنہ کم سے کم آج تو مسئلہ تعلیم و دیگر مسائل پر سوچنے سے پہلے اسے طے کر لینا چاہئے۔

افسوس ہے کہ یہ سادہ سا سوال نہ تو اس وقت طے ہو سکا جب ''پاکستان کا مطلب کیا؟...... لا الہ الا اللہ'' کے نعروں سے فضائیں لرز رہی تھیں۔ پھر یہ اس وقت بھی ایک فیصلے تک نہ پہنچا جب کہ دستوریہ نے قرارداد مقاصد پاس کی۔

بنیادی طور پر زندگی کے دو ٹائپ ہیں: ایک ملحدانہ اور مادہ پرستانہ' دوسرا خدا پرستانہ اور اخلاق پسندانہ' دونوں صورتوں میں بنیادی اقدار مختلف ہوں گی۔ سوال یہ ہے کہ ہمیں کیسے انسان بنانا مطلوب ہے اور ان کے ذریعے کیسا معاشرہ تیار کرنا اور کیسا نظام اجتماعی چلانا ہے ہم کس طرز کی تہذیب[1] اضطراب زدہ انسانیت کے سامنے پاکستان کے ذریعے پیش کرنا چاہتے ہیں۔

اگر ہم مسلمان افراد' مسلمان معاشرہ' اسلامی عدل اجتماعی اور اسلامی تہذیب کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے نظام تعلیم کی بنیاد اسلامی شعائر واقدار پر رکھنا ہو گی۔

آج وطن عزیز میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ بنیادی اقدار کی مخالفت کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ خدا ہمیں ان اقدار (Values) کا تحفظ کرنے کی توفیق دے جن کے لئے دو صدیوں تک قومی جدوجہد جاری رہی ہے اور جن کے لئے تشکیل پاکستان کے وقت ہزارہا افراد نے جانوں' مالوں اور عصمتوں کی بھاری قربانیاں دی ہیں۔ خدا ہمیں فکری اور ثقافتی غلامی کے اس جال سے نکلنے کی توفیق دے جس کے بے شمار حلقوں نے ہمیں جکڑ رکھا ہے اور جس کی ڈور کا سرا بیرونی طاقتوں کے ہاتھ میں ہے۔

ایک مسلمان معاشرے کی اقدار بہت سی ہیں (جن کو یہاں بیان کرنا ممکن نہیں ہے) بنیادی اور سب سے بڑی قدر توحید ہے یعنی خدا کی ہستی کا صحیح شعور اور اس سے صحیح تعلق۔ دوسری اقدار محبت محمدیؐ اور حضور کی اطاعت ہے۔ باقی قدریں تو بہت ہیں' ایمان' تقویٰ' جہاد۔ جامع سیٹ وہ ہے جو سورۂ اسرائیل (آیت ۲۳ تا ۳۸) میں بیان ہوا ہے۔ یہاں میں

---

[1] تہذیب کس چیز کو کہتے ہیں؟ لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی قوم کی تہذیب نام ہے اس کے علوم و آداب' فنون لطیفہ' صنائع و بدائع' اطوار معاشرت' انداز تمدن اور طرز سیاست کا۔ مگر حقیقت میں یہ نفس تہذیب نہیں ہیں' تہذیب کے نتائج و مظاہر ہیں۔ تہذیب کی اصل نہیں ہیں' شجر تہذیب کے برگ و بار ہیں۔ کسی تہذیب کی قدر و قیمت ان ظاہری صورتوں اور نمائشی ملبوسات کی بنیاد پر متعین نہیں کی جا سکتی۔ ان سب کو چھوڑ کر ہمیں اس کی روح تک پہنچنا چاہئے اور اس کے اساسی اصول کا تجسس کرنا چاہئے۔ تہذیب جس چیز کا نام ہے اس کی تکوین پانچ عناصر سے ہوتی ہے۔ (۱) دنیوی زندگی کا تصور (۲) زندگی کا نصب العین (۳) اساسی عقائد و افکار (۴) تربیت افراد (۵) نظام اجتماعی۔ دنیا کی ہر تہذیب انہی پانچ عناصر سے بنی ہے' اور اسی طرح اسلامی تہذیب کی تکوین بھی انہی سے ہوئی ہے۔

[اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی ص ۹۔ ۱۱ از سید ابوالاعلیٰ مودودی]

صرف تین کا ذکر ایک آیت کے مطابق کرتا ہوں۔

الف۔ عدل، ب: احسان، ج: ایتائے ذوی القربیٰ

ہر کسی سے ہر معاملے میں انصاف۔ انصاف سے برتا مقام ہے احسان کا، دوسروں کے حق کے بغیر ان کو اشیاء یا خدمات بہم پہنچانا۔ اسے حسن سلوک کرنا بھی کہہ سکتے ہیں۔

تیسری چیز ذوی القربیٰ کے لیے انفاق کرنا یا ان کی ترجیحاً خدمت کرنا۔ ان کے لیے دعا کرنا۔

یہ اہل قرابت اصلاً تو گھر کے لوگ، یا قریبی رشتہ دار، اہل قبیلہ ہوتے ہیں۔ مگر پھر تدریجاً جو کوئی کسی بھی وجہ سے قرابت رکھتا ہو وہ بھی حسن سلوک اور خدمت کا مستحق ہے۔ مثلاً کوئی محب و خیر خواہ، کوئی پڑوسی، کوئی ہم سفر، کوئی کاروباری ہمسایہ وغیرہ۔

یہ تین قدریں اگر پہلی دو بنیادی قدروں کے ساتھ پوری طرح زندگی میں کام کریں تو فضا خوش گوار اور معاشرہ پاکیزہ ہو سکتا ہے۔

آزادی علم اور معلم و متعلّم

معلم کو سب سے بڑھ کر آزاد ضمیر اور آزادی دل و دماغ کی ضرورت ہے۔ ضمیر اسیر کے ساتھ کوئی شخص اچھا انسان ہی نہیں بن سکتا، کجا کہ وہ اچھا انسان گر بن سکے۔ طلبہ کو اگر درسگاہ میں غلامی کی بو محسوس ہو اور معلم کے بارے میں وہ تصور رکھتے ہوں کہ اس نے تنخواہ کے عوض اپنا ضمیر بیچ دیا ہے اور اس کا دل جبریت کی کسی سل کے نیچے دبا ہوا ہے تو نہ ان کے دلوں میں ایسے معلم کا احترام ہو سکتا ہے اور نہ وہ اس سے اچھے خیالات اور اچھا کردار حاصل کر سکتے ہیں۔

ہم اپنی تاریخ میں جب نظام تعلیم کی نشوونما کو دیکھتے ہیں تو سخت سے سخت سلاطین اور[1] بادشاہوں کے سائے میں بھی درسگاہوں کو ہر قسم کی سرکاری مداخلت سے آزاد پاتے ہیں اور

[1] یہ واقعہ سلطنت روم کے ایک فرماں روا سے تعلق رکھتا ہے۔ ''مولانا ابن خطیب ایک روز عید کی مبارک باد دینے ایوان سلطانی کو گئے۔ ان دنوں وہ خزانہ سلطنت کے وظیفہ خوار بھی تھے اور سو درہم یومیہ ان کو ملتے تھے۔ جب دربار کو چلے تو چند طلبہ ہم رکاب تھے۔ حضور سلطانی میں پہنچے تو سلطان نے ازراہ حسن اخلاق سات قدم بڑھ کر استقبال کیا۔ مولانا نے بجائے جھک کر آداب بجا لانے کے سلام کیا اور بجائے دست بوسی کے مصافحہ۔ ان کے ایک شاگرد کو استاد کا یہ خلاف آداب برتاؤ ناگوار گزرا ←

ان میں ہم حضرت امام مالک[1] حضرت امام ابوحنیفہؒ اور حضرت امام احمد بن حنبل (رحمہم اللہ اجمعین) جیسے مردان احرار کو معلم دیکھتے ہیں۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جنھوں نے نہ اپنی ذات کے لئے اور نہ اپنے تعلیمی اداروں کے لئے کوئی سرکاری گرانٹ قبول کی۔ حکومتوں کی طرف سے مالی امداد کی پیش کش کے باوجود انہوں نے بوریائے فقر پر بیٹھ کر فریضہ تعلیم ادا کرنے کا اہتمام اس لئے کیا کہ تعلیمی اداروں کی آزادی سلامت رہے۔ یہ دراصل دنیائے علم وفکر کو سلطنت کی دست برد سے بچانے کی ایک کوشش تھی' اور یہ علمی اور ذہنی آزادی کو بچانے کی ایک تدبیر تھی۔ چنانچہ ایسی ہی درسگاہوں سے فیض یاب ہو کر وہ محققین ومفکرین اور فقہاء وقضاۃ اٹھے جنھوں نے علم کی آزاد دنیائیں تعمیر کیں اور ان پر کسی کے جبر کی پرچھائیں نہ پڑنے دی۔ انہی آزاد درسگاہوں کا کرشمہ تھا کہ کم از کم جہان فکر زندہ ضمیر لوگوں کے ہاتھ میں رہا جنھوں نے مختلف علوم میں تفقہ اور اجتہاد کا جتنا کام بھی کیا ایمانداری سے کیا۔ اسی طرح یونان قدیم میں سقراط اور افلاطون جیسے حکما کو بالکل آزاد فضا میں معلمی کی مسند پر دیکھتے ہیں اور سقراط نے اپنی معلمانہ آزادی کے تحفظ ہی کے لئے جان کی قربانی دی تھی۔

درسگاہ اگر آزاد فضا سے محروم ہو جائے اور اس کے اندر نت بدلنے والے انتظامی حکمران وسیع اختیارات اور سخت قوانین کے بل پر تصرف کرنے لگیں' مکتب کے گرد پولیس کی سنگینوں کی چمک دکھائی دینے لگے اور معلمین ومتعلمین اپنے آپ کو خوف اور گھٹن میں مبتلا

← اور واپسی میں اس نے کہا کہ آخر سلطان فرماں روائے وقت ہیں' کچھ تو آپ کو جھکنا تھا۔ ابن خطیب نے فرمایا کہ آیا یہ فخر سلطان کے لیے کم ہے کہ ابن خطیب سا فاضل ان کے پاس گیا؟ اور میں خوب جانتا ہوں کہ سلطان اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں۔ (علمائے سلف ص ۶۶۔ ۶۷)

[1] ایک دفعہ ہارون الرشید اور شاہزادے امام مالک کے یہاں گئے۔ (غور کیجیے کہ خلیفہ وقت اور شہزادے ایک عالم کے دربار میں خود حاضر ہوئے) خلیفہ نے امام مالک سے حدیث سنانے کی فرمائش کی۔ امام ممدوح نے فرمایا کہ میں نے عرصے سے طریقہ قراءت چھوڑ دیا ہے۔ اب اور لوگ حدیث مجھ کو سناتے ہیں اور میں سنتا ہوں۔ ہارون الرشید نے کہا کہ بہتر ہے میں ہی سناؤں گا۔ مگر اول عام آدمیوں کو اپنی مجلس سے باہر کر دیجیے۔ امام مالک نے جواب میں ارشاد کیا کہ اگر خواص کی خاطر سے عوام محروم ہو جائیں گے تو خواص کو بھی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ یہ فرما کر اپنے ایک شاگرد ابن عیسیٰ کو حکم دیا کہ سبق شروع کریں چنانچہ ابن عیسیٰ نے فوراً سبق شروع کر دیا۔ اور خلیفہ کو خاموش رہنا پڑا۔ (علمائے سلف ص ۶۳)

محسوس کریں تو اس کے بعد ایک قوم کے اندر آزادانہ تفکر کی وہ صلاحیت مر جاتی ہے جس کے بل پر علم و تحقیق کی نئی نئی دنیائیں دریافت اور فتح کی جا سکتی ہیں۔ وہاں پھر علم کی آزادی باقی نہیں رہ سکتی، وہاں ضمیر کی روشنی میں سوچنے اور سوچ بچار کی نت نئی راہیں نکالنے کے تجربات کی جرأت کسی فرد میں باقی نہیں رہ سکتی۔ ایک آزاد قوم کے شایان شان وہی نظام تعلیم ہو سکتا ہے کہ جس کی کھلی فضا میں طلبہ باضمیر معلمین کی رہنمائی پا کر زندگی کے مسائل کو آزادی سے سوچیں، ان پر بحث و تمحیص کر سکیں، جو حالات ان کے سامنے ہوں ان پر تنقید کر سکیں اور اس طرح اچھے انسان، اچھے لیڈر اور اچھے شہری بننے کی تیاری کر سکیں۔

نظام تعلیم پر بنیادی پابندی ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ وہ بہ حیثیت مجموعی قوم کے نظریات و مقاصد سے ہم آہنگ ہو۔ یہ نظریات و مقاصد قوم کے تحریری یا غیر تحریری دستور کی اساس ہوتے ہیں اور نظام تعلیم کو ان کے مطابق رکھنے کے لئے قوم کے نمائندگان ہیئت مقننہ میں جا کر تعلیمی اداروں کا اصولی نقشہ کار طے کر سکتے ہیں اور ضروری ضوابط تیار کر سکتے ہیں مگر درسگاہوں کے اندرونی معاملات کو کارپردازان تعلیم اور معلمین کے سپرد کر دینا چاہئے۔ وہی یہ طے کریں کہ معلمین کے حدود کار کیا ہوں، طلبہ کے حقوق کہاں تک وسیع ہوں، معلمین و متعلمین کا باہمی رابطہ کس نہج پر قائم ہو اور درسگاہوں کی فضا کس نوعیت کی ہو۔ ان معاملات میں بیرونی مداخلت جتنی جتنی بڑھے گی، معلم اور منتظم دونوں گھٹن کا شکار ہو جائیں گے۔

میرے مطالعہ کے مطابق ہمارے ہاں درسگاہ کی داخلی آزادی اس معیار کے مطابق نہیں جیسی کہ ایک آزاد مملکت میں ہونی چاہئے بلکہ اس لحاظ سے ہم نے اصلاحات کے عنوان سے اب تک ترقی معکوس کی ہے۔ ان حالات میں سوائے اس کے کہ شاہین بچوں کو خاک بازی کا درس ملے، اور کیا بہتر نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ شاہین و عقاب پنجروں میں نہیں بنتے، آزاد فضاؤں میں بنتے ہیں۔

ہمیں دراصل مستقبل کے لئے ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے جو غیور و خوددار ہوں، جو اپنے ضمیر کی مشعل تھام کے چلیں اور جانتے بوجھتے کسی غلط بات پر آمنا وصدقنا کہنے کے لئے تیار نہ ہوں چاہے وہی بات کتنے ہی اونچے درجے کی شخصیت نے کہی ہو، جو منافقت کی سطح پر اتر کر کسی کی خوشامد کرنے پر تیار نہ ہوں، جو اپنی ترقی اور کامیابی کا راستہ اپنی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے زور سے نکالیں، کسی حال میں بھی سفارش اور رشوت سے کام نکالنے پر آمادہ نہ

ہوں' جو نہ صرف اپنے حقوق اور اخلاق کو بچانے کے لئے ظلم اور بدی کے خلاف لڑیں بلکہ پوری قوم اور معاشرے کی فلاح کے لئے بگاڑ پھیلانے والے عناصر کی مزاحمت کر سکیں۔ جو اپنی تہذیب اور اقدار و روایات کے ناقابل خرید پاسبان ہوں اور باہر کی کسی بھی انمل بے جوڑ ثقافت کے اثرات کی لہروں کا رخ پھیر سکیں۔

ایسے لوگ صرف آزادانہ جمہوری فضا رکھنے والے نظام تعلیم میں تیار ہو سکتے ہیں۔ پس درسگاہ کو آزاد کر دیجئے' علم کو آزاد کر دیجئے' معلم کو آزاد کر دیجئے اور متعلم کو بھی آزاد کر دیجئے۔ لیکن اپنی اقدار و روایات کی پابندی کے ساتھ۔

اسلامی نظام تعلیم کا تیار کردہ انسان

آج کے دور میں اسلامی نظام تعلیم کے تیار کردہ نوجوان کو درج ذیل صفات و اقدار سے مزین ہونا چاہیے۔

ا۔ بلحاظ نقطۂ نظر وعقیدہ

کائنات خدا کی بنائی ہوئی ہے جس کی شہادت اس کا نظم دے رہا ہے۔ اس کی پابندیٔ قانون' اس کا جمال اور اس کی ہر شے اور واقعہ کا بامقصد ہونا' نیز کائنات و حیات کی حرکت کا کم تر سے بہتر کی طرف بڑھنا' ان سارے حقائق سے ملتا ہے۔ اور یہی اس کا ثبوت بھی ہیں کہ خدا ایک' اور لاشریک ہے۔

جس خدا نے یہ کائنات بنائی اور اس میں حیات اور اس کی کامل شکل انسانیت کو ظہور دیا' یہ گواہی بھی دیتی ہے کہ نظام وجود کا امن و سلامتی سے چلنا صرف اس پر موقوف ہے کہ وہ تابع فرمان الٰہی ہو (یعنی مسلم اور اطاعت گزار) اس سے واضح طور پر یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ انسانی زندگی کی درستی و فلاح کا دار و مدار بھی انفرادی اور اجتماعی دونوں دائروں میں اس بات پر ہے کہ وہ خدا کے احکام' قوانین اور ہدایات کے سامنے مسلم حنیف بن کر جھک جائے۔

قدرت خداوندی کا نظام ہدایت یہ ہے کہ وہ جمادات کو تو صرف مختلف ضابطوں اور عوامل کے جابرانہ نفاذ سے چشم براہ رکھتی ہے' نباتات و حیوانات میں جبلی ہدایت کے ذریعے اپنا منشا جاری رکھتی ہے' لیکن انسان چونکہ ساری مخلوق سے مختلف احساسات' جذبات اور تخیل و فکر کا

ایک الگ شعوری پہلو رکھتا ہے لہٰذا اسے ہدایت بھی اس کی عقل کو وحی سے مخاطب کر کے دی جاتی ہے اور اس پہلو سے اس کا امتحان یہ ہے کہ آیا وہ عقل خود بیں کا غلام بن کے رہتا ہے یا وہ وحی کے نور سے استفادہ کرنے کے قابل بنتا ہے۔ وحی کی ہدایت کا ذریعہ انبیاء ہیں۔

امتحان میں کامیابی کی صورت میں عالم آخرت میں لامتناہی انعامات اور ناکامی کی صورت میں لامتناہی عقوبات پیش آتی ہیں۔ اس امتحان خیر و شر میں وہ اس لئے مبتلا ہے کہ وہ زمین پر خدا کا مقرر کردہ نائب ہے' یہاں اس کی کچھ لازمی ڈیوٹیاں ہیں' کچھ مہالک سے اسے بچ کے رہنا ہے' اپنی اور انسانوں کی بھلائی کے لئے کوشش کرنا ہے اور برائی' ظلم' فتنہ و فساد' قتل' فحش' فریب کاری' خیانت وغیرہ بلاؤں سے خود بچنا اور دوسروں کو بچانا ہے۔

۲۔ بلحاظ نصب العین

خود اپنے اوپر خدا کی مرضی اور قانون کو نافذ کرنے کے بعد یہ سعی کہ ایسے اور لوگ بھی ملیں یا دعوت دے کر تیار کیے جائیں' جو مناسب قوت بہم ہونے پر مل جل کر اس کی کوشش کریں کہ پورے نظام زندگی پر خدا کے قوانین اور اس کے دین کے تقاضے غالب آ جائیں۔

۳۔ بلحاظ ادب و شائستگی

اسلامی زندگی کے ابتدائی تقاضوں میں سے یہ ہے کہ بول' چال —— میل جول —— بزرگوں اور بچوں کے حقوق کا لحاظ' کھانے پینے' لباس پہننے' مکان' لباس اور جسم کی (سر سے پاؤں تک) پوری صفائی —— چیزوں کے استعمال میں سلیقہ' تولئے اور رومال کا استعمال' کھانسنے اور چھینکنے اور جماہی لینے کے آداب' تھوکنے میں احتیاط' گھر میں یا گلی یا سڑک پر کاغذ' چھلکے یا کوئی اور کوڑا پھینکنے سے اجتناب' پاس پڑوس یا رفقائے سیر و سفر کی تکلیف کا خیال' غلطی ہو جانے پر معافی مانگنا' کوئی دوسرا معافی مانگے تو معافی دے دینا' وغیرہ۔

۴۔ بلحاظ خدمات عمومی

(ا) اردگرد اپنے بسنے اور ملنے جلنے والے افراد کو تعلیم بالغاں بہم پہنچانا' طالب علموں کی تعلیمی مدد کر دینا' غربا کی مالی امداد' موت فوت اور شادی بیاہ کے موقعوں پر شریک ہونا۔ ان پڑھ لوگوں کو درخواستیں لکھ دینا' کسی مقام پر اسکول' اسپتال' ڈاک خانہ' بجلی'

پانی‘ سوئی گیس اور پکی سڑکوں کی ضرورت ہو تو دوسروں سے مل کر کوشش کرنا۔ بلکہ خود ان کو جمع کر کے کوئی مفید کام بتا کر حرکت دلانا۔

(ب) قومی سطح کے معاملات میں حصہ لینا۔ کوئی غلط صورت نمودار ہو تو اس کی اصلاح کے لئے زبان و قلم سے کام لینا۔ باہر سے کوئی ''شرارت'' اٹھے تو اس کے خلاف آواز اٹھانا اور اسلامی طرز کے اچھے عناصر کے ساتھ مل کر کام کرنا۔ یا الگ سے اگر ممکن ہو تو جو کچھ ہو سکے وہ کرنا۔ حملہ ہو تو سپاہیانہ شان سے اس کے مقابل میں ہر وہ کام کرنا جس کی ضرورت و اہلیت ہو۔ قوم کے اتحاد میں اگر کوئی رخنہ پڑتا ہے یا کوئی طاقت اس کی کوشش کرے‘ تو حالات کو درست کرنا‘ بڑے بڑے اہم معاملات و مسائل میں چاہے وہ بالکل قوم کے اندر سے اٹھیں یا باہر سے ان کا مقابلہ کر کے لوگوں کو مضبوط و مطمئن کرنا۔ قومی دستور کا تحفظ‘ اس کی اسلامی دفعات کا تحفظ‘ اور اس غرض سے دستور کے تقاضوں کو عمل میں لانے کے لیے دوسروں کے ساتھ مل کر پورا عوامی دباؤ ڈلوانا۔

(ج) اسی طرح ملت کی سطح پر جو دردناک واقعات ہو رہے ہیں اور جو جہادی کوششیں ہو رہی ہیں‘ نیز ہماری برادری کے جو بے شمار لوگ ملکوں ملکوں میں مظلومیت سے گزر رہے ہیں‘ ان کے لئے تحریر و تقریر سے‘ اجتماعات اور قراردادوں سے‘ بیانوں اور مضمونوں سے‘ فنڈز اور ادویہ اور دیگر سامان امداد سے ان کو مدد دینا چاہیے۔ ان کے لئے دعائیں مانگنی چاہئیں۔

ملت کو کمزور‘ پراگندہ اور غیر متحد رکھنے کے لئے جو تدابیر سامراج اور دوسرے مفاد پرستوں کی طرف سے مسلمانان عالم میں کی جا رہی ہیں ان کو غیر مؤثر بنانے کے لئے ضروری اقدامات کئے جائیں ان میں بھرپور حصہ لینا۔

(د) ہمارے ساتھ سب سے بڑا دائرہ کار انسانیت ہے۔ انسانیت من حیث المجموع اخلاقی قدروں سے محروم ہو گئی ہے اور اس کمزوری کی وجہ سے اس کی سائنسی ایجادیں اور مادی قوتیں اس کے قابو میں رہنے کی بجائے اس کے اوپر مسلط ہو گئی ہیں۔ اس کے نتیجے میں کرہ ارض اور انسانی برادری کے لئے شدید اسباب تباہی پیدا ہو رہے ہیں‘ بلکہ ہو گئے ہیں۔ ہمیں انسانیت کے اس فکری بحران کو دور کرنا ہے جس میں

اخلاقی قدروں کو در کنار رکھ کر مجرد عقل سے ہر گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔
بالفاظ دیگر انسانیت اس وقت پنجۂ الحاد اور دامِ مادیت میں جکڑی ہوئی ہے اس دور کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ انسانیت کو مادہ پرست اور ہوس پرست انسان کی غلامی سے نکالا جائے۔

۵۔ بلحاظ خود شعوری و خود شناسی

ہر تعلیم یافتہ نوجوان یہ شعور لے کے نکلے کہ وہ ساری دنیا کے لئے بھلائی کا پیغام رکھتا ہے اور اس نے موجودہ نقشۂ تہذیب کو انقلاب سے بدل دینا ہے۔ مادہ پرستانہ تہذیب کی جگہ خدا پرستانہ تہذیب کو ابھارنا ہے' کیونکہ سب کی بھلائی اسی میں ہے۔

اس کام کے لیے ہمارے نوجوانوں میں یہ خود شعوری ہونی چاہئے کہ ہم دنیا بھر سے مختلف سرمایہ ایمان و افکار اپنے پاس رکھتے ہیں۔ ان کی طبیعت کو ''زیستن اندر جہان دیگراں'' سازگار نہ ہو۔ یعنی وہ ایک نئی دنیا بنانے کے لئے پورا نقشۂ حیات اور اس کے لئے اصولوں' قدروں اور دلائل کا خزانہ رکھتے ہوں۔

ان کا ذہن اپنے مخصوص ایمان و شعور اور اصول تہذیب و تمدن سے مختلف نظریات اور کلچر کے غلام بننے پر تیار نہ ہوں۔ ان کے دلوں میں اغیار کی نقالی و تقلید کا غلامانہ رجحان نہ پایا جاتا ہو۔

صرف ایسے نوجوانوں میں وہ اٹھان' وہ ابھار اور وہ خود اعتمادی پیدا ہو سکتی ہے جس کے نتیجے میں ایک نئی انقلابی قوت دنیا میں ابھرے اور وہ موجودہ دورِ بحران سے انسانیت کو نجات دلا سکے۔

۶۔ بلحاظ عزائم

نئی دنیا بنانے والے یہ نوجوان وہ ہوں گے جن کا منتہائے نظر نہ دولت ہو گی' نہ تعیش پسندی۔ نہ ان کی نگاہ جاہ و منزلت کی چمک دمک میں الجھے گی بلکہ ان کے اندر یا تو شوق تحقیق ہو گا یا جذبۂ تخلیق' تیسری صورت یہ ہے کہ وہ سائنسی انکشافات اور ایجادات برائے خدمت انسانیت کا پروگرام لے کے کام کریں۔ علاوہ ازیں ان میں سے معلم' صحافی (اور اصحاب تخلیق میں سے ادیب و شاعر و تنقید نگار) قلم کی قوت سے وہ راستہ بنائیں جدھر اقدام کرنا ہے اور

رکاوٹوں اور مزاحمتوں کو ریزہ ریزہ کر دیں۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر' انجینئر' ہواباز' بحریہ کے نوجوان اور افسر' انتظامیہ کے افسر' سیاست میں قیادت کی صلاحیت رکھنے والے یہ سب بھی اپنی اپنی جگہ اپنے نصب العین (تعمیر دنیائے نو) کی خدمت کرنے والے ہوں گے۔

خلاصہ یہ کہ ہر شخص جو نظام تعلیم سے نکلے یہ شعور لے کے نکلے کہ میں ساری دنیا میں خدا پرستانہ انقلاب لا کر ایک اخلاقی کلچر پیدا کرنا چاہتا ہوں اور اس کام کے لئے میں ایک سپاہی کی طرح ہر اس محاذ سے کام کروں گا جس کے لئے میں اہل ہوں۔ خدا کا سپاہی' شاہد اور نقیب بننے سے بڑا مقام کیا ہو سکتا ہے' مگر اس کا صلہ آخرت میں ملے گا۔ دنیا میں گذر بسر (کفاف) کی زندگی کام کرنے والوں کے لیے بہت ہے۔

۷۔ بلحاظ قابلیت و شوق علم

ایک آئیڈیل طالب علم وہ ہے جو شوق علم سے سرمست ہو کر قابلیت کے بہترین مقام حاصل کرے۔ وہ یہ بنیادی نقطہ سمجھتا ہو کہ اصل چیز امتحان اور پرچے اور نمبر نہیں ہیں بلکہ اصل ضرورت یہ ہے کہ آپ دین کو' خدا اور رسولؐ کی تعلیمات کو جزء بہ جزء جانیں اور دوسری طرف فلسفۂ تاریخ' نفسیات' اجتماعیات' معاشیات' سیاسیات' جرم و قانون' سائنس (مختلف شعبے) نظریۂ ارتقا' سوشلزم' سرمایہ داری کی حقیقتیں جڑوں سے لے کر آخری کونپلوں —— تک جانتے ہوں۔ اور متعلقہ سوالات پر مستقلاً کاوش کرتے رہتے ہوں۔ محض سرسری معلومات پر اکتفا نہ کریں۔

مغربی علوم میں جن ایک دو علوم پر کام کرنا ہو ان کا گہرا مطالعہ کریں۔ مثلاً سال بھر میں بیس (۲۰) اعلیٰ درجے کی کتابیں پڑھیں۔ اسی طرح دینی علوم کی مجموعی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بطور تخصص دو ایک موضوعات کو خاص کر لیں۔ یہ صورت بہتر ہو گی کہ دونوں طرف تقریباً ایک سے علوم کو لیں اور ان کا تقابلی مطالعہ کریں۔ اس مطالعہ میں مغرب کے ملحدانہ اور عقل پرستانہ تصورات کی کمزوریوں پر ناقدانہ گرفت کریں۔

اگر ایسے دس طلبہ کا گروہ آپ ابھار لائیں جو مختلف موضوعات پر یورپی علوم پر تنقید و تبصرہ (بلاتعصب) کا حق ادا کرے تو تہلکہ مچ جائے گا۔ اور اگر ہر سال ایسے دس آدمی نکلیں

اور دوسرے تخلیقی شعبوں یا سائنسی دائروں میں کام کرنے والے بھی تو گویا آپ نے ''تھنک ٹینک'' بنانے کا کارخانہ کھول دیا۔

اگر ''عزائم'' کے باب کی تحریر آپ دیکھیں تو عقیدہ' مسلک اور نصب العین' اور خاص طور سے یہ آخری علمی معرکہ جنگ کا تصور خود بخود اپنے سانچے میں اس سپاہی کو ڈھالے گا جس کے کردار کی تشکیل پر ہم غور کر رہے ہیں۔

ایک کام اور کرنے کا سامنے ہے۔ اسلام کے بارے میں مستشرقین نے جو کچھ لکھا ہے' ایک ایک طالب علم ایک ایک مصنف کو لے کر اس کی کمزوریاں واضح کرے اور اسلام کے صحیح حقائق تفصیل سے سمجھائے۔

ایسے مختلف نوجوانوں کے کاموں کا ایک مجموعہ مغرب کے سامنے رکھ کر اسے آئینہ دکھایا جا سکے۔ اکثر صورتوں میں مغرب والوں کی زیادتیوں پر گرفت خود مغربی دانشوروں نے کی ہے۔

۸۔ بحیثیت داعی حق

یہ بنیادی سبق ہر وقت اس کو یاد رہے کہ وہ ''داعی حق'' ہے۔ خدائی ہدایت کے بنیادی امور کی تعلیم اپنے گھروں اور ماحول کے ایک ایک فرد تک پہنچانا وہ اپنی ذمہ داری سمجھتا ہو۔

آس پاس کوئی مصیبت آئے تو عوام الناس کو اس سے بچانے کے لئے قبل از وقت مشورے اور ہدایات دے اور مصیبت کے سر آ پڑنے پر ان کے ساتھ ہو کر اس کا مقابلہ کرے۔

نیکی کے کاموں میں تعاون کرے اور تعاون کی بہترین شکل سب لوگوں کے علم میں لائے۔

برائی کے کام نہ کرے نہ برائی کے کاموں میں تعاون کرے۔ جہاں تک ہو سکے بہترین اور خوش آئند طریقوں سے برائی کی روک تھام کی موثر صورتیں اختیار کرے۔

تمام لوگوں سے اخوت کا معاملہ کرے' الا یہ کہ کوئی کھلا ظالم یا مجرم ہو۔ ایسے لوگوں تک بھی اسلام کی پاکیزہ دعوت نرمی سے پہنچائی جائے۔

تعلیم نسواں اور اقبالؒ*

ہمارے ہاں یہ سوال تو معرکہ آرا بحثوں کا محرک رہا کہ عورتوں کو تعلیم دلائی جائے یا نہیں اور اس کا فیصلہ بھی ہو گیا لیکن اس سے اہم تر سوال نہ پوری طرح بحث و فکر کا موضوع بنا اور نہ اس کے بارے میں اجتماعی طور پر کوئی بات واضح ہو کر طے ہوئی۔ اقبالؒ نے اس اہم تر سوال کو ان چند الفاظ میں چھیڑا بھی اور اس کا مدلل جواب بھی دے دیا ہے۔

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ امومت
ہے حضرت انساں کے لیے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

اس کی رائے میں مغربی تہذیب کا نظام معاشرت ''مادریت کش'' واقع ہوا ہے۔ وہ عورت کو ''معشوق ہرجائی'' تو بناتا ہے، اسے ایک عفت مآب بیوی اور ماں نہیں بناتا۔ جدید دور کی مغربی عورت مادریت کی ذمہ داریوں سے گریزاں ہے۔ نفسیاتی لذات کی ایسی متوالی ہے کہ وہ ''ضبط تولید'' بلکہ بچہ کشی تک پر اتر آتی ہے...... اقبالؒ نے اس پر انتباہ دیا ہے کہ اگر حالات اسی رخ پر بڑھتے رہے تو آہستہ آہستہ نسل انسانی کا تسلسل ظہور ہی منقطع ہو جائے گا۔

اقبال کی نگاہ میں وہ تعلیم جو عورت کو مادریت کے فطری منصب سے غافل کر کے اسے ''نازن'' بناتی ہے۔ وہ بجائے خود تہذیب اور انسانیت اور نسائیت کے لیے ایک پیغام ہلاکت ہے۔ جو نظام تعلیم ''دین'' سے آزاد ہو کر عورت کی تربیت مادہ پرستانہ مغربی ڈھنگ سے کرتا ہے اس کا دیا ہوا علم و ہنر عشق و محبت کے ان پاکیزہ فطری جذبات کے لیے تباہ کن ہے جس

---

* ''افشاں'' نعیم صدیقی۔

کے ذریعے ''زوجین'' کے رشتہ ازدواج سے بہت سارے روابط محبت اپنے تار چھوڑتے ہیں اور پورے معاشرے کو مربوط کر دیتے ہیں۔

آج جس تعلیم کے لیے ہم اپنی بیٹیوں کو کالجوں اور مدرسوں کی تحویل میں دیتے ہیں وہ نتائج کے اعتبار سے جہالت سے بھی زیادہ مہلک ہے۔

تعلیم نسواں مساویانہ حق

تعلیم نسواں کے بارے میں مَیں (مؤلف) سرسید اور اکبرؒ اور آخر میں اقبالؒ اور مولانا مودودیؒ سے زیادہ متاثر ہوں۔ یعنی ایسی تعلیم نہ ہو کہ ''چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ'' اور نہ ایسی تعلیم ہو جو اس نقطۂ نظر سے ٹکرائے کہ

''فانوسِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں''

میرا خیال ہے کہ تعلیم خواتین کا مساویانہ حق ہے' ان کے لیے جداگانہ باپردہ تعلیم گاہیں مہیا کرنا کسی بھی اسلامی حکومت یا مسلم حکمراں کا لازمی فرض ہے۔ ان کے لیے مضامین کے نصاب مخصوص ہونے چاہئیں۔ ان پر یہ قدغن نہیں کہ وہ فلسفہ اور سائنس اور دیگر علوم نہ پڑھیں۔ (ایک سرسری سا نصابی خاکہ اسی کتاب کے مقالہ متعلقہ ''خواتین یونیورسٹی'' میں بھی دے چکا ہوں)

جہاں تک نوکریوں کا سوال ہے' اچھی خواتین کو اولاد کی بہتر تربیت اور آسائش اور ان کے اہم فطری تقاضوں پر (ملازمتوں کو) ترجیح نہیں دینی چاہیے' ناقص اولادیں جو اُٹھ رہی ہیں اُن کی وجہ سے اپنے معاشرے کا زوال بھی دیکھ لیجیے اور بیرونی معاشروں میں جرائم' جبر اور بہیمیت کے بڑھتے ہوئے رجحانات کو بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔

لیکن اندھی تقلیدِ فرنگ اور فرنگی معاشرت کو پھیلانے کی بیرونی سازش نے ہمیں سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی کہ کتنے ہی گھریلو کام اور خصوصاً جاپان کی طرز پر منی انڈسٹریز کا گھریلو انتظام کیا جا سکتا ہے۔ مگر ہمارے ذہنی جمود نے جو غلامی کا ورثہ ہے' ہمیں حقیقی ترقی کا کوئی اقدام نہیں کرنے دیا ـــــ پھر بھی خواتین اپنے کلینک کھول سکتی ہیں' عینک سازی یا آنکھ کے آپریشنوں کا کام خواتین کے لیے کر سکتی ہیں' ڈینٹل سرجن برائے خواتین بن سکتی ہیں۔ تعلیم گاہوں کو سنبھال سکتی ہیں۔ بڑے کارخانوں میں اپنے لیے الگ بیرکس یا کمروں کا مطالبہ کر

سکتی ہیں، مگر یہ سب بدرجۂ مجبوری، بعض اوقات قومی ضرورت کی وجہ سے کرنا پڑتا ہے۔

ورنہ عورت گھر کے عظیم الشان (Institution) ادارہ کی ڈائریکٹر ہے المرءة راعية علٰی بیت زوجه۔ ''راعية'' کا مناسب معنی ڈائریکٹر ہے، جہاں گوشت کے لوتھڑوں میں ایمان اور اخلاق اور مجلسی و کائناتی شعور کے ابتدائی انجکشن کیے جاتے ہیں، تب کام کے انسان تیار ہوتے ہیں۔ ورنہ یہ تعلیم مروجہ تو نئی جہالتوں میں غوتے دے کر جب نکالتی ہے تو ماحول ایک چھاپہ مار کی طرح اسے بھینچ کر غیر انسانی دنیا میں اغوا کر لے جاتا ہے۔ صرف عورت اس تباہی کا سد باب کر سکتی ہے ——

اور اسے اس غرض کے لیے تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔

تعلیم کا تہذیبی نظریہ

تعلیم کا آغاز جس شکل میں انسانیت کے اندر ہوا تھا وہ اس طرح تھا کہ ایک گھر میں جس طرح کی پیشہ وری چلتی تھی اس کے مطابق دنیوی زندگی گزارنے کا علم اسی گھر کی حدود کے اندر یا اس سے متعلق کسی دکان یا کسی ادارے کے اندر حاصل کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد جب اور نشوونما ہوئی تو دوسرے پہلو جب نشوونما پا کر اس کے برابر آئے تو یہ ہوا کہ مسجد' مکتب یا معبد یا کوئی دوسری صورت جن میں تھوڑی سی تعلیم عقائد کی یا نظریات کی یا عبادات کی وہ ساتھ ساتھ چلتی اور بسا اوقات یہ سب کچھ ایک گھر میں ہوتا لیکن آج علوم پھیل کر اتنی وسعت اختیار کر گئے ہیں کہ بڑے بڑے کالج اور یونیورسٹیاں اور علمی بحثیں اور تحقیقات یہ سب کچھ آپ کے سامنے ہو رہا ہے اور اس سارے کو سمیٹنا بڑا مشکل ہے۔ لیکن میں اس کو صرف دو نکات میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

تعلیم کا ایک تصور پورے کا پورا افادیت کا ہے یعنی مادی شعور' مادی زندگی کا جاننا' اس کے اندر اپنی جگہ بنانا اور اس سے استفادہ کرنا' قوتوں کو سمجھنا اور اشیاء کو سمجھنا۔ یہ مادی علم ہے جو آپ کو درکار ہوتا ہے گویا پہلے صرف پیشہ ورانہ علم ہوا کرتا تھا اب وہ پھیل کر بڑے وسیع علم تک پہنچ گیا ہے۔ سارے علم جمع ہو کر مادی شعور تک پہنچ گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انسان میں ہمیشہ ایک چیز موجود رہی ہے پہلے دن سے' وہ یہ ہے کہ وہ صرف آس پاس کی اشیاء کو دیکھ کر نہیں رہ جاتا کہ یہ اشیاء ہیں۔ یہ سورج یہ چاند یہ ستارے یہ پھول یہ درخت یہ ندیاں یہ پہاڑ' وہ صرف دیکھ کر ہی نہیں رہ جاتا بلکہ ان چیزوں کے خواص جاننے' ان کی قوتوں پر قابو پانے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے علاوہ یہ جاننے کی کوشش بھی کرتا ہے کہ یہ سارا کچھ کیا ہے۔ اور اس سارے کچھ کے اندر میں کیا ہوں؟ یہ زندگی کیا ہے' یہ وجود کیا ہے' جب اس کے اندر یہ سارا کچھ سوالوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو پھر اس کے اندر غلط سلط گمانوں پر مبنی جوابات اٹھتے ہیں۔ کچھ دوسرے لوگوں سے سنتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس کے سامنے کوئی

خدا کا بھیجا ہوا نمائندہ ایک واضح روشنی لے کر آتا ہے اور وہ یہ بتاتا ہے کہ زندگی اور وجود کی حقیقت کیا ہے۔ زندگی اور وجود کی یہ حقیقت جاننے سے ایک خاص نظریہ اور تصور پیدا ہوتا ہے۔ زندگی کے متعلق اس تصور سے جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں ان چیزوں کا تعلق مادیت' معاش اور صرف دفاع سے نہیں ہے۔ مثلاً آدمی میں ایک خاص طرح کا شعور خیر و شر پیدا ہونے لگتا ہے یہ چیز اچھی ہے یا بری ہے' یہ چیز مفید ہے یا مضر ہے' اس کے علاوہ یہ چیز جائز ہے یا ناجائز۔ کچھ قدریں ابھرتی ہیں کہ کون سی چیزیں زندگی میں ایسی ہیں جو بڑی اہم ہیں اور ان پر دوسری چیزوں کو قربان کر دینا چاہئے۔ کچھ شعار ابھرتے ہیں۔ کچھ عادات کچھ اطوار' اس کے ساتھ ساتھ اسی نظریئے سے اس کی جڑوں سے غذا لے کر شاخیں نکلتی ہیں' پھر وہ اشجار کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ بڑے بڑے ادارے وجود میں آتے ہیں۔ رابطے اور رویئے پیدا ہوتے ہیں' اور انسانوں کے درمیان یہ سارا جو پھیلاؤ بنتا چلا جاتا ہے اس پر نظر ڈالنے سے تہذیبی شعور پیدا ہوتا ہے۔

یہ دوسرا پہلو جو ہے اس میں بہت سارے علوم جمع ہو جاتے ہیں۔ کسی نے غلط طریق سے سوچا ہو یا صحیح طریق سے لیکن وہ ایک تہذیبی تصور ہو گا۔ ہمارا ایک خاص تہذیبی شعور ہے اور ہمارے نظام تعلیم میں جب بھی یہ موجود رہا ہے اور جب بھی اس نے کام کیا ہے اس کو آپ اسی نگاہ سے دیکھ لیں کہ اس نے ہمیشہ مادی شعور کے ساتھ ساتھ تہذیبی شعور کو اگلی نسلوں میں ودیعت کیا ہے۔ اپنا سارا پچھلا دور جب آپ دیکھیں گے تو یہ دیکھیں گے کہ یہ دونوں چیزیں اکٹھی چلی ہیں اور تہذیبی شعور ہی وہ چیز ہے جو کسی قوم یا ملت میں ایک اختصاصی اور امتیازی خودی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اس میں انا پیدا ہوتی ہے۔ اس کے اندر تحریک اٹھتی ہے۔ اس کے اندر جذبات ابھرتے ہیں۔ وہ مختلف چیزوں کو مقاصد بنا کر ان کے لئے کام کرنا چاہتا ہے اور اس دنیا میں دیکھتا ہے کہ چاروں طرف کچھ قوتیں کش مکش کر رہی ہیں۔ وہ ان سے کش مکش کرنا چاہتا ہے۔ وہ جامد چیز بن کر نہیں رہ جاتا' وہ کسی جگہ پر سر جھکا نہیں دیتا' بلکہ وہ اپنی انا کی بنیاد پر کھڑا ہو کر دنیا سے ایک لڑائی لڑتا ہے۔ محض مادی شعور انسان کو اس قابل نہیں بناتا ہے کہ وہ باطل یا اس کی تہذیب کو تباہ کرنے والی قوتوں کے خلاف کوئی حرکت کر سکے۔ مادی شعور یہ چیز نہیں پیدا کر سکتا لیکن تہذیبی شعور یہ چیز پیدا کرتا ہے اور ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ پہلے جب باہر کی غلامی کا دور آیا تو ہمارے نظام تعلیم میں سب سے پہلے یہ تہذیبی شعور

بالکل ختم کر دیا گیا۔ خاص طور پر ہمارے تہذیبی شعور کی بجائے ایک بیگانہ تہذیبی شعور حائل کر دیا گیا اور اسے مادی معلومات کے ساتھ ہمارے اوپر مسلط کر دیا گیا۔ اس کے ریکارڈ' حوالے اور دلائل موجود ہیں' اور آج بھی اگر کوئی کھوج لگائے تو جان سکتا ہے کہ یہ ارادتاً کیا گیا کہ ایک تہذیب کو ختم کرنا ہے اور دوسری کو یہاں غالب کرنا ہے۔ یعنی ایک تہذیبی جنگ تھی جو ہماری درسگاہوں میں لڑی گئی' اور اس تہذیبی جنگ میں ہم نے بری طرح سے زک اٹھائی ہے اور بڑے بڑے نقصانات اٹھائے ہیں۔ اگرچہ نظریاتی پختگی کے حامل ہمارے بعض افراد نے اس صورتحال کے اندر بھی اپنی تہذیب کو اور اپنی قدروں کو اونچا رکھنے کی کوشش کی ہے اور آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں اور اب بھی جو تھوڑا بہت رنگ نظر آتا ہے وہ انہی لوگوں کے دم قدم سے ہے جن میں تہذیبی شعور موجود ہے۔

اب تہذیبی شعور کی تعلیم محض درسگاہوں کی چار دیواریوں تک نہیں رہ گئی۔ وہ درسگاہیں جو بہت وسیع ہو گئی ہیں۔ جن میں ریسرچ کے ادارے ہیں' یہ تعلیم' تہذیبی تعلیم' پھیل کر سارے معاشرے میں ایک وسیع قسم کا مدرسہ' ایک وسیع یونیورسٹی قائم کر چکی ہے۔ بلکہ میں کہوں گا کہ عالمگیر حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ آپ گھر سے نکلتے ہیں تو آپ کے کانوں میں جو آوازیں آتی ہیں' وہ ریڈیو کی ہوں' ٹیلی ویژن کی ہوں یا سارے ذرائع ابلاغ جو کام کر رہے ہیں' آپ دیواروں پر نظر ڈالیں تو آپ اشتہارات دیکھیں گے یا آپ اخبار خریدیں تو اس کی سرخیاں پڑھ لیں یا اس کے اندر کا مواد آپ دیکھیں۔ اس کے اندر بھی آپ اشتہارات ہی پائیں گے۔ آپ جس محلے سے بھی گزریں گے دن بھر آپ یہی دیکھیں گے کہ یہ ایک تہذیبی حملہ ہے جو ہم پر مسلسل جاری ہے اور ہمیں اس کا شعور نہیں ہے۔ یہ حملہ کوئی سو سال سے ہمارے اوپر ہو رہا ہے اور ہم اسے برداشت کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ہماری امید یہ تھی کہ آزادی ملنے کے بعد ہم اپنے تہذیبی وجود کو' اپنے تہذیبی چہرے کو بحال کر سکیں گے۔ وہ خدوخال جو ٹوٹ گئے ہم انہیں از سرنو بحال کر سکیں گے' اگر اپنا چہرہ ہم اپنی تاریخ کے سامنے رکھ کر جائیں اور اپنا چہرہ ہم قرآن کے سامنے لے کر جائیں۔ جس آئینہ کا حوالہ آپ نے سنا ہے وہ تو بہت بڑا آئینہ ہے اس سے کم تر آئینہ تاریخ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی شکل دیکھیں تو آپ کو محسوس ہو گا کہ آپ کا تہذیبی چہرہ بالکل مسخ ہو گیا ہے۔ کان کی جگہ ناک اور ناک کی جگہ کان ہے' آنکھیں کہیں ہیں' دل دماغ کوئی کہاں ہے' اور کوئی ہے ہی نہیں یعنی سب کچھ درہم برہم کر دیا

گیا ہے' تو یہ جو تہذیبی تبدیلی اس وقت واقع ہوئی ہے یا آزادی کے بعد جو جذبہ ہم رکھتے تھے کہ ہم اس کو از سر نو دوبارہ بحال کر سکیں گے وہ نہیں ہو سکا۔ بلکہ بدقسمتی سے اس غلط اور باطل تہذیبی شعور کے ناز برداروں نے ہمارے اندر سے ایسی قوتیں پیدا کر دیں اور یہاں ایک ایسی نسل تیار کر کے چھوڑ دی جس نے یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ قوم کے اندر اس کے تہذیبی شعور کا ہر ذرہ اور شوشہ مٹا کر چھوڑنا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے آپ تمام چیزوں کو دیکھئے گا جو اثر انداز ہوتی ہیں' وہ تمام قوتیں جو تعلیم کا جزو بن گئی ہیں' وہ عالمی صورت اختیار کر گئی ہیں۔ میں کہتا ہوں ڈپلومیسی' ٹریڈ' قرضے' ناول' افسانے' ادب' آپ کے سامنے آنے والے ڈرامے' یہ فلم' ٹی وی اور ریڈیو سب کچھ آپ دیکھیں' بڑے بڑے شاندار اشتہارات اور سازشوں نے اس طرح چاروں طرف سے ہمیں گھیر لیا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ ہم ایک نئی غلامی میں مبتلا ہو گئے ہیں جو اس سے ہزار گنا سخت ہے۔ اس غلامی کے پہریدار جو اس جیل کے نگران ہیں وہ ہمارے بھائی اور بزرگ ہیں۔ وہ لوگ حکومتیں لے کر اور قانون کی رسی تھام کر اور مختلف چیزیں سنبھال کر اس کی نگرانی کے لئے کھڑے ہیں کہ یہ قوم کبھی اپنا تہذیبی چہرہ بحال نہ کر سکے اور جب تک یہ تہذیبی صورت بحال نہ ہو اور تہذیبی شعور کام نہ کرے آپ اس دنیا میں کوئی مقصد لے کر کبھی نہیں اٹھ سکتے۔ دنیا میں کوئی پیغام نہیں پہنچا سکتے۔

کوئی برتری آپ کی دنیا میں نہیں ہو سکتی اور آج تک نہیں ہوئی۔ جب تک آپ مادی شعور کے ساتھ اپنی تعلیم میں تہذیبی شعور کو شامل نہیں کرتے جو آپ کی اپنی تہذیب ہے اس وقت تک کوئی بھی اچھا نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا یہ جتنی کوششیں نظام تعلیم کو بدلنے کی اب تک کی گئی ہیں' وہ صرف یہ تھیں کہ ایک دینیات کا پیریڈ رکھ دیا جائے اور ایک معلم اسلامیات کا رکھ دیا جائے یا چند افراد اس میں داخل کر دیئے جائیں' لیکن اس سے کسی تہذیبی شعور کو پیدا کرنا ممکن نہیں۔ اگر کوئی کام تھوڑا بہت ہوا ہے تو یہ ذمہ دار اساتذہ کی خصوصی کوششوں کی وجہ سے ہوا ہے جنہوں نے اپنے فرض کو اپنے ضمیر کے مطابق پہچانا کہ اپنی قوم کو تباہ کرنے کے بجائے ہمارا فرض یہ ہے کہ ان میں زندگی کی کچھ بنیادیں باقی رہنی چاہئیں۔ ان کو تازہ رکھیں ورنہ جو کچھ نظام تعلیم تھا' جو اس کے نصابات اور مبادیات تھے' جو کچھ خاص سلسلہ بنایا گیا تھا وہ تو ایسا ہے کہ سب کچھ تباہ کر کے چھوڑنے والی بات ہے۔ چنانچہ اس تباہی کو آپ دیکھ رہے ہیں چاروں طرف کس قدر غلط چیزیں ہیں' آپ ان کو خاموشی سے دیکھنے کے سوا کچھ کر نہیں سکتے۔

کیونکہ یہاں تہذیبی غلامی مسلط ہے اور جو جتنے زیادہ تہذیبی غلام ہیں وہ اتنے ہی قد آور ہیں' مجھے تو صرف یہ پیغام پہنچانا ہے کہ آپ اپنے نظام تعلیم کو اگر بدل سکتے ہیں اور بدلنے کی کوئی صورت یا کوشش کر سکتے ہیں تو اس طور سے کریں کہ تعلیم صرف مادی معلومات کے مہیا کر دینے کا ذریعہ نہیں ہے یا وہ اس کی ذمہ دار نہیں بلکہ صحیح معنوں میں وہ ہے جو ہمارے تہذیبی شعور کو بھی برابر کا شامل کر کے' روح اور مقصد بنا کر نظام تعلیم میں شامل کر دے تب جا کر یہ نظام تعلیم وہ نتائج دے سکتا ہے جو مقصود و مطلوب ہیں۔

○

تہذیبی روح

میں جب ہر روز صدہا ایسے چہروں کو دیکھتا ہوں جن کی لوح پیشانی پر جلی خط میں لامقصدیت لکھی ہوئی ہوتی ہے' میں جب ماحول میں پریشان فکری' آوارہ نگاہی' تشدد پسندی' اشاعت جرم' تشکیک و بے یقینی' خوف و حزن اور یاس و قنوط کے رنگا رنگ مظاہر دیکھتا ہوں تو میرے اندر یہ سوال بار بار ابھرتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟

اس سوال کے جواب میں میرے سراپردۂ ذہن کے کسی تہ خانے کے گوشے سے میرا دبا ہوا معلمانہ ذوق' سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہتا ہے کہ ساری خرابی اس وجہ سے ہے کہ تعلیم بھٹکے ہوئے سورج کا پرتو بن کے رہ گئی ہے۔ اسی وجہ سے تمہارے گرد غیر صحت مند اور بے توازن شخصیتوں کا ہجوم روز بروز بڑھ رہا ہے۔ ان میں سے کوئی پیٹ کی مار کھا رہا ہے' کسی کا دماغ احساسات کی بھٹی میں پڑا کھول رہا ہے کسی کی نگاہوں کے تار بل کھا کھا کر ٹوٹ رہے ہیں' کسی کی موجِ نفس خود اس کی شاہ رگ کے لئے تلوار بن گئی ہے' کسی کے دل کے پرزے اڑ رہے ہیں اور کسی کے ضمیر کی سڑتی نعش کی سڑاند پھیل رہی ہے۔

آزادی سے سرفراز ہونے والی یہ قوم ابھی تک انسانیت کش سامراجی نظام تعلیم کی زنجیروں سے آزاد نہیں ہو سکی۔ یہ کام اگر بروقت ہو گیا ہوتا تو ہمارے کئی کروڑ افراد کی تگ و تاز حیات پوری تاریخ کے سمندر میں ایسا مد و جذر پیدا کر چکی ہوتی جس کی زد سے بڑی بڑی عالمی قوتوں کے سفینے بھی محفوظ نہ ہوتے۔

کسی معاشرہ کی مخصوص تہذیبی روح جس کے ہونے سے زندگی کی ساری ہماہمی ہے' جس کے فعال ہونے اور ابھر آنے سے قوت و ترقی کے سارے مراحل طے ہونے لگتے ہیں۔ اور جس کے دب جانے سے' افسردہ ہو جانے سے' جمود کا شکار ہو جانے سے زندگی کی آگ ٹھنڈی پڑ جاتی ہے' جوئے عمل تھم جاتی ہے' تخلیق کے دھارے منجمد ہونے لگتے ہیں' معنیٰ تازہ کے چشمے بند ہو جاتے ہیں ــــ اور ایک مایوسی' ایک بے بسی' ایک بددلی' ساری فضا پر کہر بن کر چھا جاتی ہے' اور اگر اس کا کوئی چارہ نہ ہو سکے تو یہ کہر گہرا' گاڑھا اور تاریک تر ہوتا چلا جاتا ہے' یہاں تک کہ ایک ایسی شب دیجور میں بدل جاتا ہے جس کی کوئی سحر ازل سے مقدر نہیں ہے۔

ہماری تہذیبی روح دور غلامی میں بری طرح دبا دی گئی اور کچل دی گئی مگر اس نے ہر مرحلے میں موثر مزاحمت دکھائی ہے' کیونکہ اس کے اندر ہماری امر خودی اور انمٹ انا کی توانائیاں حل تھیں' چنانچہ اس کے زور سے تحریک آزادی اور تحریک خلافت' تحریک پاکستان اور تحریک نظام اسلامی ہمارے یہاں برپا ہوئیں' اور یہ ان تمام خارجی نظریات اور بے گانہ ثقافتی رجحانات کے خلاف آج تک مسلسل زور کر رہی ہیں جنہیں زمانے نے معاشرہ پر ٹھونسے اور ٹھونسے رکھنے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں کی ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ سیاسی معنوں میں آزادی[1] حاصل ہو جانے کے بعد بھی ہماری

---

[1] آزادی صرف اس واقعہ کا نام نہیں کہ بیرونی سیاسی اقتدار کسی ملک سے رخصت ہو جائے۔ یہ تو آزادی کے سفر بلکہ جہاد آزادی کا نقطہ آغاز ہے۔ اصل آزادی یہ ہے کہ ایک قوم ان تمام فکری و ثقافتی اور اخلاقی و معاشرتی نظریات و عادات کی زنجیروں کو توڑ پھینکے جو سیاسی غلبے کے دوران آہستہ آہستہ کسی طاقت نے اس کے افراد کے دل و دماغ پر لپیٹ دی ہوں۔ سچی آزادی یہ ہے کہ ہمارے سیاسی ادارات' ہمارا تعلیمی نظام' ہماری اقتصادی جدوجہد' ہمارا قانونی ڈھانچہ اور ہمارا معاشرتی ماحول سبھی ہمارے ملی مزاج سے مطابقت اختیار کر لیں۔ جب تک زندگی کا نقشہ ہمارے عقائد و روایات سے ہم آہنگ نہیں ہو جاتا' اس وقت تک گویا ہم سفر آزادی کے ابتدائی مرحلوں میں ہیں۔ بلکہ اگر ان مرحلوں میں مستقلاً پھنس کر رہ جائیں تو گویا ہم نے اپنے اوپر ہنوز غلامی اوڑھ رکھی ہے اور زنجیریں بدن پر لپیٹ رکھی ہیں کیوں کہ ان زنجیروں سے ہمیں برسوں کے قرب خوگری کی وجہ سے پیار ہو گیا ہے۔ صیاد تو چلا گیا' مگر اس کے گھاس میں پھیلائے ہوئے جال جوں کے توں باقی ہیں اور ہم نے ان جالوں کے اندر ہی آشیانے بنا لئے ہیں۔ اسی حال میں ہم سمجھ رہے ہیں کہ ہم آزاد ہیں اور آزادی کے نغمے الاپتے اور جھنڈے لہراتے ہیں۔ ایسی دلچسپ قوم ساری تاریخ میں نہ ملے گی۔

تہذیبی روح بدستور بھاری بوجھ کے نیچے دبی کراہ رہی ہے۔ اتنے برس گزر گئے مگر جیسے کوئی غیر مرئی اور انجانی اور غیر اختیاری چٹان اس کے اوپر دھری ہے۔ یہ اپنا اظہار چاہتی ہے مگر اسے راستہ نہیں ملتا۔ یہ نمو کی بے پناہ قوت رکھنے والی بیل فضا میں کمند ڈال کر بلندیوں تک جانا اور اپنی نادر کونپلیں چھوڑنا چاہتی ہے مگر جیسے ہر جانب کوئی روک حائل ہے۔ یہ سخت جان بیل ناسازگار جبری حالات کی لمبی چوڑی بھاری چٹان کے نیچے ہی نیچے دور تک زمین میں رینگتی اور اپنے ظہور کا راستہ نکالتی ہے' مگر جدھر سے یہ اپنی کوئی کونپل کھلی فضا میں آ کر نکالتی ہے کوئی تخریبی طاقت اس کا رشتہ قطع کر دیتی ہے۔ کون سی طاقت؟ ــــــ جی' غالباً خود اپنے یہاں کی فصلِ بہاری کا کرشمہ ہے جو دست نازک میں موج نسیم سحری کی تلوار لے کر چپکے سے آتی ہے اور ہر صبح کے طلوع سے پہلے اس بیل کے ظہور یافتہ حصوں کا صفایا کر دیتی ہے۔

یوں گویا ہم اپنی ہی قوت حیات کو خود اپنے ہی ہاتھوں تباہ کرنے کے زریں کارنامہ میں محو ہیں۔ یوں کہیے کہ نشتر ہاتھ میں لے کر اپنی ہی رگ جاں سے کھیلا جا رہا ہے ؎

یہ اپنی وفا کا عالم ہے' اب ان کی جفا کو کیا کہیے
اک نشتر زہر آگیں رکھ کر نزدیک رگ جاں بھول گئے

ہمارے ہاں تہذیبی روح کی جلوہ گری کے لئے سب سے اہم اولین جلوہ گاہ مکتب ہو سکتا تھا مگر وہ آج تک مقصود خویش سے آگاہ نہیں ہے۔

اس روح حیات کو اپنے محیر العقول شعبدے دکھانے کا موقعہ ملتا تو ہمارا دستور ہی نہیں' ہمارا نظام تعلیم یکسر بدل گیا ہوتا۔ مضامین بدلتے' مواد اور اس کی ترتیب بدلتی' استاد کا ذہن و کردار بدلتا' طالب علم کا زاویہ نگاہ بدلتا اور ہمارا تعلیمی ماحول بالکل دوسرا ہوتا۔ یہ تہذیبی روح اگر اپنوں کی جفائے وفا نما کے ہاتھوں بار بار مجروح و بسمل نہ ہوئی ہوتی تو آج ہم اپنی بات کہنے کے لئے دوسروں کی زبان مستعار لینے پر مجبور نہ ہوتے۔ یہاں تو آفت یہ ہے کہ ''زبان میری ہے بات ان کی'' سے معاملہ آگے نکل کر ''بات بھی ان کی' زبان بھی ان کی'' تک جا پہنچا ہے۔ بیچ میں ہم یکسر غائب ہو گئے ہیں' ہماری ہستی دیکھتے دیکھتے کہیں گم ہو گئی ہے۔ اور اس اغوا کی زیادہ بڑی ذمہ داری نظام تعلیم پر ہے۔

تہذیبی غلامی کی سل کی گرانباری میں مسلسل اضافہ ہوا ہے' کمی نہیں ہوئی۔ کوئی ہے جو اس سل کو توڑ دے؟ ہلا دے؟ اپنی جگہ سے سرکا دے؟

کوئی بتاؤ کہ ایک قوم کی اکثریت اس سرے سے اس سرے تک کتنے ہی تغیرات کی طلب گار ہے مگر کچھ ہوتا ہواتا کیوں نہیں؟ کوئی بتاؤ کہ آخر کون ہے جو رکاٹ بن رہا ہے۔ ہم حرکت بھی کر رہے ہیں اور جمود ہے۔ ہم چل بھی رہے ہیں اور منزل کا نام و نشان نہیں؟ ہم محنت بھی کرتے ہیں مگر ترقی نہیں ہوتی' ہم کردار کے کھیت جوتتے ہیں مگر کوئی فصل نہیں اُگتی۔

اپنا ملک' اپنی سلطنت' اپنے حکمران' اپنی درس گاہیں' مگر قوم کی اپنی ہی تمنائیں ـــــ بڑی ہوں یا چھوٹی ـــــ بار بار پامال کیوں ہوتی ہیں؟ ہم بے بس کیوں ہیں؟ ہماری آواز بے اثر کیوں ہے؟ ہماری بڑی سے بڑی تعداد بے وزن کیوں ہے؟

یہ بہت سے ''کیوں'' ایک دوسرے میں ضم ہو کر ایک بھاری بھرکم ''کیوں' میں بدل جاتے ہیں' جس کا کوئی جواب نہیں ملتا' کوئی جواب دینے والا نہیں' کوئی جواب سوچنے والا نہیں اور یہی لا جواب سوال ہماری قومی زندگی کے سینے پر سل بن کر دھرا ہے۔ لیکن کیا ہمیشہ ہمارا یہی حال رہنا ہے' کیا حکومتیں اور قیادتیں اور نام نہاد ماہرین تعلیم اسی طرح ہمارا تذلیل آمیز مذاق اڑاتے رہیں گے۔

تہذیبی روح کا اظہار بغیر اس کے نہیں ہوسکتا کہ زندگی کا ڈھانچہ یہاں سے وہاں تک سب بدل جائے اور ان تمام بیگانہ عناصر کا قلع قمع ہو جائے جو اس کے اظہار میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

شکست خوردہ ذہن

ہم دور غلامی کی ماری ہوئی ایک ایسی قوم ہیں جس کے جوانوں کی خودی کو سامراجی تعلیم کے تیزاب میں ڈال کر یوں تباہ کیا گیا ہے جیسے سونے کے ہمالہ کو راکھ کے ڈھیر میں بدل دیا جائے۔ ہم لوگ انگریز پرست' مغرب پسند' ضمیر فروش' ملازم مزاج' فدویت کیش انسان تیار کرنے والے نظام تعلیم سے گزرے ہیں۔ بلکہ ابھی تک اسی کے چنگل میں گرفتار ہیں۔ اس نظام تعلیم کی ساخت میں کوئی بڑی تبدیلی اب تک نہیں ہوسکی۔ نتیجہ یہ کہ ہمارے ہاں اغیار کے لئے مرعوبیت زدہ تقلیدی و تائیدی ذہن نشو و نما پا رہا ہے۔[1] ہمارے کم شعور لوگ غیر شعوری طور

---

[1] اس مضمون کے لکھنے کے بعد اتنا وقت گزرا ہے کہ اب ''ذہن نشو و نما پا رہا ہے'' کی معنویت ختم ہو چکی ہے' اب تو کہنا چاہئے کہ ایسا ذہن پوری طرح نشو و نما پا چکا ہے' اور اس مشینری کی طرح ہے جو پگھل کر ایک خاص سانچے میں ڈھل چکی ہو' اور بالکل ٹھنڈی ہو کر انتہائی کرخت ہو چکی ہو۔

پر اور دانشور حضرات شعوری طور پر اس واہمہ پر ایمان محکم رکھتے ہیں کہ فکر و حکمت' اصول و آئین' اطوار و اقدار اور نظریات و مقاصد عطا کرنے والے تو دوسرے لوگ ہیں ہمارا کام یہ ہے کہ بھکاری بن کر کچھ بھیک اس در سے' اور کچھ خیرات اس بارگاہ سے حاصل کریں۔ ترقی کی منزل ملے گی تو اسی شیوہ گداگری کی راہ دراز طے کرنے سے ملے گی۔

اب تک تعلیم ''خودی شکن'' کے سحر میں مسحور ہو کر ہم نہایت اعلیٰ درجے کے احساس کمتری کے ساتھ اپنی فکر اور تہذیب اور دینی اقدار کو بیرونی نظریات کے ریلے میں پامال شدہ اور شکست خوردہ حالت میں دیکھتے رہے ہیں' اور اپنے لئے وجہ ننگ و عار سمجھتے آئے ہیں۔ اپنے محبوب و مقدس سرمایہ حیات سے نسبت کا احساس کچھ ایسا ناخوش گوار ہو گیا ہے جیسے ہم کسی جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں اور جہاں ضرورت پڑتی ہے ہم اپنی صفائی دینے کی پرزور کوشش کرتے ہیں اور جن پہلوؤں سے رستگاری ممکن نہیں ہوتی ان کے متعلق معذرت خواہانہ انداز گفتگو اختیار کرتے ہیں۔

○

خودی کی نشو و نما

کوئی ملت اگر نظریاتی اور تہذیبی لحاظ سے امتیازی وجود رکھتی ہو اور اس کا کوئی مخصوص نصب العین ہو تو قدرتی طور پر اس میں خودی نمودار ہو کر نشو و نما پاتی ہے۔ پھر نظریہ و مقصد کے لئے جتنی زیادہ جدوجہد کی جاتی ہے اور جتنی زیادہ قربانیاں دی جاتی ہیں' ملی خودی اتنی ہی قوی ہو جاتی ہے۔ تاریخ میں کچھ مزاحم عوامل ایسے ہوتے ہیں جو اس خودی کو کمزور کرنے اور تباہ کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ایک طرف اثباتی تدبیروں سے خودی کو مضبوط و توانا رکھا جائے اور دوسری طرف انسدادی طریقوں سے ضرر رساں امکانات کے دروازے بند کئے جائیں۔

حضور نبی اکرم ﷺ کی تعلیم ملت اسلامیہ کو خودی کی قوت سے مالا مال رکھنے کے لئے اثباتی اور انسدادی دونوں ہی پہلوؤں سے مضبوط اہتمام کرتی ہے۔

خودی کی نشو و نما کے لئے رسولؐ برحق نے مسلمانوں کے سامنے ایک بڑا اجتماعی نصب العین رکھا ہے اور ایک عظیم الشان منصب انہیں تفویض کیا ہے۔ قرآنی الفاظ میں آپ نے

فرمایا:

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر (آل عمران: ۱۰۶)

''تم لوگوں سے ایک ایسی امت تشکیل پانی چاہئے جس کے وابستگان تمام لوگوں کو خیر وفلاح کی دعوت دیں' نیکی کا حکم کریں اور برائی سے روکیں۔''

اس نصب العین کے شایان شان یہ منصب ان کے لئے مقرر کیا گیا کہ ایک مرکزی امت (امت وسط) بن کر ساری انسانیت کے سامنے ''شہداء علی الناس'' بن کر انھیں یعنی وہ کسی جزوی' محدود' علاقائی یا نسلی سطح پر رہنے کے بجائے بین الانسانی سطح پر کام کریں اور اپنے قول اور کردار کے مظاہرے سے سچائی اور نیکی کے گواہ یا نقیب بنیں۔

معلوم ہوا کہ حضورؐ کی تعلیم کے رو سے مسلمان ایک خصوصی گروہ ہیں جس کا مقصد پوری نوع انسانی کی صلاح وفلاح کے لئے کام کرنا ہے اور خدا پرستی اور راستی اور صالحیت کی دعوت پھیلا کر ہر قسم کے فساد اور بگاڑ کا قلع قمع کرنا ہے۔

اس تعلیم کا دیا ہوا ایمانی شعور تھا جس نے دور نبوت میں اسلام قبول کرنے والوں میں خودی کی وہ سپرٹ پیدا کی کہ انہوں نے تمام جرائم ترک کر دیئے' حرام کمائیاں چھوڑ دیں' ظلم اور استحصال کے طریقوں سے ہٹ گئے اور فحش اور ناشائستگی کی آلائشوں سے پاک ہو گئے۔ انہوں نے اپنی قوتیں حصول علم میں کھپا دیں' دنیا کے سامنے مساوات واخوت کا منظر پیش کیا' بڑوں اور چھوٹوں کے درمیان انصاف قائم کیا اور زندگی کے ہر پہلو کو حسن وخوبی سے بھر دیا۔

نبی اکرم ﷺ کی تیار کردہ جماعت نے نہ رومی و ایرانی تمدنوں کی شان وشوکت کے سامنے مرعوبیت دکھائی' نہ یہود ونصاریٰ کی بگڑی ہوئی مذہبیت سے کچھ اثر لیا اور نہ مشرکین کی جاہلی ثقافت کو اپنے اندر جاری رکھا۔ انہوں نے اغیار کی فکری وتہذیبی غلامی کی راہیں اپنے لئے پوری طرح بند کر لیں۔ چنانچہ ان کی ملی خودی اس نقطۂ عروج تک پہنچی کہ وہ وقت کی حکومتوں اور فوجی طاقتوں اور پرشکوہ تمدنوں کا طلسم توڑتے ہوئے اپنے وقت کی دنیا میں تیزی سے پھیل گئے۔ وہ ایران کے درباروں میں داخل ہوئے تو سادہ بدوی لباس میں' نیزے ہاتھوں میں لئے' خوش رنگ قالینوں کو روندتے ہوئے اپنا پیغام سنا آئے' وہ نجاشی کے دربار میں پہنچے تو ان کی خودی نے جرات وعزیمت کے ساتھ اپنا مقدمہ سچائی کے ساتھ پیش کیا' وہ

فاتح بن کر شام میں داخل ہوئے تو چھتوں پر بیٹھی ہوئی بے باک حسیناؤں کو انہوں نے ذرا سا خراج نگاہ بھی پیش نہ کیا۔

ان کے فرد فرد کو حضورؐ کی معرفت یہ حکم ملا تھا کہ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَآءَهُمْ (الشوریٰ:۱۵) یعنی جس طرح حکم دیا گیا ہے اس کے مطابق اپنے موقف پر ڈٹے رہو اور مخالفین و معترضین کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ان میں یہ جذبہ ودیعت کیا گیا کہ وہ دین حق کے انکار کرنے والوں کے لئے اشداء بن کر اپنے اندر سختی و مضبوطی پیدا کریں یعنی کسی کو ان پر اثر انداز ہونے' ان کے نظریات وعقائد میں خلل پیدا کرنے اور ان کے اندر انگلی دھنسانے کا کوئی موقع نہ ملے۔ مسلمانوں میں دوسروں کے لئے ایسی غلظت ہونی چاہئے کہ وہ ان کے اندر اپنی لابی پیدا نہ کر سکیں' اپنے آلہ ہائے کار نہ حاصل کر سکیں اور ان کے تہذیبی وجود کے خدوخال کو مسخ نہ کر سکیں۔ مسلمانوں کا یہ جذبہ اس اوج کمال تک پہنچا کہ انہوں نے یہ طے کر لیا کہ تمہارا دین تمہارے لئے' ہمارا دین ہمارے لئے' تمہارا معبود اور طریق عبادت الگ' ہمارا معبود اور طریق عبادت الگ' یہ رواداری کی بات نہ تھی بلکہ مغائرت و مفارقت کی بات تھی' یہ خودی کا اعلان تھا۔ اس اعلان کی تان سورۃ شوریٰ کی اس آیت پر ٹوٹتی ہے کہ:

لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ (الشوریٰ: ۱۵)

یعنی ہمارے تمہارے درمیان حجت و دلیل کی کوئی گنجائش باقی نہیں۔ ہمارے اور تمہارے درمیان ایک ایسی خلیج حائل ہے جسے پاٹا نہیں جا سکتا۔

یہ ہے ایمانی شعور و جذبات کی قوت جو کسی بھی سچے مسلم معاشرے کی خودی کو اغیار کی فکری تقلید اور تہذیبی غلامی کے خطرات سے بچاتی ہے۔

یہی ایمانی شعور و جذبہ تھا جس کے عروج کمال پر پہنچ کر نبی اکرمؐ نے اپنے چچا سے آ کر ملنے والے وفد مشرکین کی طرف سے سودا بازی کی کوشش کو ملیامیٹ کر دیا۔ آپ نے فرمایا:

> ''چچا! خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند لا کر رکھ دیں تب بھی میں اپنی سرگرمی سے باز نہیں آ سکتا۔ یہاں تک کہ یا تو میں اس میں کامیاب ہو جاؤں یا میری جان اسی میں کھپ جائے۔''

یہ جملہ اپنے ماحول میں اسلام کی عطا کردہ ایمانی خودیٔ کے انتہائی بلند مرتبے کا مظہر ہے۔ جب کوئی شخص یا گروہ بڑے سے بڑے مفاد کو قربان کر کے بڑے سے بڑے نقصان

کے سامنے اپنے عقیدہ و نصب العین سے سرشار ہو کر کھڑا ہو جائے تو یہ خودی کا مقام ارفع ہوتا ہے۔

حضورؐ کی لائی ہوئی کتابِ حکمت و ہدایت نے ایک اور خطرے کا سدباب کیا ہے۔ سورۃ الحجر کی آیت ۸۸ میں اور سورۃ طٰہٰ کی آیت ۱۳۱ میں کہا گیا ہے کہ تمہاری آنکھوں کو وہ دولت دنیا مرعوب نہ کرے جو ہم نے مخالفین کو دے رکھی ہے۔ سورۃ توبہ کی آیت ۵۵ اور آیت ۸۵ میں کہا گیا کہ ان لوگوں کی کثرت مال و اولاد تم کو دھوکے میں نہ ڈالے۔ اسی طرح سورۃ غافر/المومن کی آیت ۴ میں فرمایا کہ ملکوں اور شہروں میں ان کی چلت پھرت سے تمہیں کوئی مغالطہ نہ ہو۔

یعنی حق پر قائم رہ کر حق کے علم بردار بننے والے مسلم کو غیر مسلم افراد اور قوموں کی دولت اور ترقی اور ان کی سائنسی ایجادات' ان کے اسباب آسائش و آرائش اور ان کی تجارتی اور سفارتی تگ و تاز سے ذرا بھی مرعوب و مسحور نہ ہونا چاہئے۔ تب اسلام کی عطا کردہ ''خودی'' کو خطرات سے بچایا جا سکتا ہے۔

یہ چیز آج ایک تجربے کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے کہ مسلمان غیر مسلم قوموں کی سیاسی برتری' ان کی دولت' ان کے اسباب و وسائل' ان کی بین الاقوامی فتنہ آرائیوں' ان کے شاندار لٹریچر' ان کے ساحرانہ پروپیگنڈے' ان کے نظام تعلیم' ان کی تہذیب' ان کی رنگین ثقافت اور ان کے نظر فریب لباسوں اور فیشنوں سے اس درجہ مسحور و مرعوب ہوئے کہ اپنے دین سے ان کا اعتماد اٹھنے لگا اور دوسروں کے نظریوں اور فلسفوں کو انہوں نے حق سمجھ لیا۔ ملکوں ملکوں میں پیش آنے والے اس تلخ تجربے نے ہماری ملی خودی کو انتہائی مضمحل اور خستہ و درماندہ کر دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب خوشگوار ردعمل کا آغاز ہو چکا ہے۔

اب میں حضور ﷺ کی ان تعلیمات کا ذکر کرتا ہوں جو بہ نفس نفیس آپ نے مسلمانوں کو ایمانی نشو و نما کے تحفظ کے لئے دیں۔

① یہ بات تو خیر قرآن میں بھی بار بار کہی گئی ہے اور حضور ﷺ نے بھی جماعت کی تعلیم و تربیت میں اس کا اہتمام رکھا کہ مسلمان مشرکین' یہود اور نصاریٰ کے ساتھ ہر قسم کے دنیوی روابط رکھیں مگر ان پر اعتماد کر کے ان کو جگری دوست اور راز دار اور ہم پیالہ و ہم نوالہ ہرگز نہ بنائیں۔ کیونکہ ان کی رضامندی و خوشنودی کی صورت تو صرف ایک ہی

ہے وہ یہ کہ مسلمان ان کی ملتوں اور مسلکوں کی پیروی اختیار کر لیں۔

اسی قرآنی تلقین کے تحت معاشرتی اور ثقافتی معاملات میں مسلمانوں کو حضورؐ نے حکم دیا کہ وہ یہود و نصاریٰ سے مختلف انداز اختیار کریں (خالفوا الیہود والنصری) ان کی تقلید کرنے یا ان سے مشابہت اختیار کرنے سے بچیں۔ یہ حکم وضع قطع کے لئے خاص طور پر دیا گیا ہے۔ وضع قطع کا معاملہ سرسری نہیں بلکہ مخالف تہذیبیں بالعموم وضع قطع ہی کے سہارے تسلط کی راہ نکالتی ہیں۔

(۲) حضور ﷺ نے ایک طرف مشرکین کے فاسد مذہبی طریقوں سے مسلمانوں کو باز رہنے کا حکم دیا' مثلاً حج میں ننگے ہو کر طواف کرنا یا حج کی نیت سے گھر سے نکلنے کے بعد اگر کسی ضرورت سے واپس آنا پڑے تو گھر کے دروازے سے آنے کی بجائے دیوار پھاندنا یا کمرے میں سوراخ کر کے داخل ہونا وغیرہ۔ اسی طرح بعض قسم کے گوشت کے متعلق رواج یہ تھا کہ ان کو مرد کھا سکتے ہیں' عورتیں نہیں کھا سکتیں' یہ چیزیں حضورؐ نے ختم کرائیں۔ دوسری طرف آپ نے اہل کتاب کے غلط فقہی مسئلوں سے مسلمانوں کو نجات دلائی۔ مثلاً یہودیوں میں مسلسل چوبیس گھنٹے کا روزہ رائج تھا' اس طریقے کو ختم کر کے افطاری و سحری کے قواعد مقرر کئے۔ عورتوں کی ماہانہ تکلیف کے معاملے میں یہودیوں کا مذہبی طرز عمل یہ تھا کہ وہ ان کو گھر والوں سے الگ کر کے کسی کوٹھڑی میں بند کر دیتے اور کھانا اور برتن بھی الگ کر دیتے۔ حضورؐ نے اس فضول رسم کو ختم کیا۔

ان تبدیلیوں کا قدرتی اثر یہ ہوا کہ اہل کتاب جو مشرکین عرب کے مذہبی رہنما بنے ہوئے تھے' لوگ ان کی طرف رجوع کرتے تھے اور یہودی علماء ان کو مختلف معاملات میں فتوے دیا کرتے تھے' یہ مذہبی چودھراہٹ باقی نہ رہی۔ اب مسلمان معاملات زندگی میں دینی و اخلاقی رویے کے معلم بن گئے تھے۔ اور وہ ہر معاملے میں قرآن اور قرآن کو پیش کرنیوالے پیغمبر ﷺ سے حکم معلوم کرتے تھے۔

(۳) جاہلی دور سے خوشی منانے کے دو دن مقرر تھے جن میں لہو ولعب کا دور دورہ ہوتا تھا۔ رسول برحق ﷺ نے ان دو دنوں کو منسوخ کر کے عیدین کے دو نئے دن مقرر کئے اور تفریح اور خوشی کے ان دنوں کو ذکر' نماز' صدقے اور قربانی سے آراستہ کر کے اپنے

پیروؤں کو فضولیات سے دور کر دیا۔

(۴) عبادت گاہوں میں دوسرے مذاہب والوں نے لوگوں کو بلانے کے جو طریقے رائج کر رکھے تھے ان کو یک قلم ترک کر کے حضورؐ نے اذان کا ایک ایسا طریقہ رائج کیا جو تمام اقوام عالم میں اپنی مثال آپ ہے۔ اذان بلاوا بھی ہے اس میں تبلیغ کا پہلو بھی ہے اور روحِ عبادت بھی۔

(۵) میتوں کی تدفین کا نیا طریقہ اور قبر بنانے کا خاص رخ اور انداز مقرر کیا۔

(۶) نبی اکرم ﷺ نے اپنے پیروؤں کو ہر کام کے آغاز میں بسم اللہ پڑھنے کا ادب سکھایا اور سونے جاگنے' چلنے پھرنے' کھانے پینے' پیدائش اور موت' بیماری اور صحت ہر معاملے میں خدا سے تعلق جوڑنے کے لئے خاص خاص اذکار اور دعاؤں کی تعلیم دی۔

(۷) حضور ﷺ نے ملت اسلامیہ کو یہ بھی سکھایا کہ ان کی تہذیب داہنے ہاتھ کی تہذیب ہے۔ کوئی چیز لیتے یا دیتے ہوئے' مصافحہ کرتے ہوئے اور کھانا کھاتے یا پانی پیتے ہوئے داہنے ہاتھ کا استعمال کیا جائے۔ مجلس میں کھانے پینے کا سامان رکھا ہو تو داہنی طرف سے دور چلایا جائے۔

(۸) حضور ﷺ کی دی ہوئی تعلیم و تربیت کے زیر اثر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو نصیحت کی کہ وہ اہل عجم کے سے ناز و انداز اختیار نہ کریں' ان کے سے عیش و تنعم سے بچیں اور ان کے لباس کو اختیار نہ کریں۔ نیز فرمایا کہ زینت و آرائش کے لباس عورتوں کے لیے مخصوص رہنے دو۔

آخر میں میں حضور کی یہ تلقین سامنے رکھنا بہت ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر اسلام کسی دور میں اجنبی بن جائے کسی جگہ ظالم حکمران کا تسلط ہو' فتنہ دجال کا شدید دور آ جائے تو ان سارے سنگین حالات میں ایک سچا مسلمان نہ تو مخالف قوتوں سے دبے اور نہ بگاڑ میں مبتلا ہونے والی اکثریتوں سے مرعوب ہو بلکہ حق کے موقف پر ڈٹ جائے جس کی تعریف حضور ﷺ نے یہ کی ہے کہ:

(ما انا علیه و اصحابی)

''وہ طریقہ جس پر میں ہوں اور میرے رفقاء ہیں''

نیز فرمایا کہ میری سنت اور میرے خلفائے راشدین کی سنت کو دانتوں سے پکڑے

رکھو۔ مطلب یہ کہ انتہائی مشکل حالات میں بھی نہ تو مخالفوں کے افکار اور نظریات قبول کیے جائیں' نہ ان کے غلط معاشرتی و اخلاقی تصورات کو اپنایا جائے' نہ ان کے تہذیبی و ثقافتی اطوار کو اپنے اوپر مسلط ہونے دیا جائے بلکہ حضور ﷺ کے ودیعت کردہ عقائد اور تعلیم کردہ مسلک پر مضبوطی سے قائم رہنا چاہئے۔

یہ ہیں حضور ﷺ کی وہ چند ہدایات جو ہمیں اپنے ایمان و ملی خودی کے تحفظ کی شرائط بتاتی ہیں۔

تعلیمات نبوی کی اس روشنی میں آج ہمارا فرض یہ ہے کہ اول تو ہم اپنے آپ کو ویسی ہی امت وسط قرار دیں جو شہادت علی الناس کا فرض ادا کر سکے' جس کا نصب العین یہ ہو کہ دنیا بھر میں خیر و فلاح کی نقیب بنے گی' بھلائیوں کو غالب کرنے اور برائیوں کا انسداد کرنے کی جدوجہد کرے گی۔ نیز اس مقصد و منصب کے شایان شان ذہنیت اور کردار سے اپنے آپ کو آراستہ کریں۔ دوسری جانب یہ طے کریں کہ ہمیں دوسروں سے نظریات حیات مستعار لینے اور ان کی تہذیبی غلامی کرنے کے بجائے ایک نظام نو اور جہان نو کا پیغام پھیلانا ہے۔ اور ایک نئی تہذیب خود قائم کرنی ہے۔ الحاد اور مادہ پرستی کے علم برداروں سے ہماری لڑائی ہے۔ یہ تو شرمناک ہو گا کہ نبی اکرمؐ کے نقیبان ہدایت مخالف اسلام قوتوں کی سیاسی و علمی فکر' ان کے قوانین اور طور طریقوں' ان کے فنون اور کلچر اور ان کے علمی و اخباری پروپیگنڈے سے مرعوب ہو کر ہتھیار ڈال دیں۔

ہمیں یہ صورت واقعہ خوب اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ ہم پر نظریاتی' اقتصادی اور تہذیبی ہر لحاظ سے مادہ پرست قوتوں کا سخت حملہ ہے اور علوم' ادبیات' نصابی کتب' مستشرقین کی تحقیقات' فنون لطیفہ اور رنگین ثقافت کے کئی کئی محاذ کھلے ہوئے ہیں۔ ہماری خاصی بڑی تعداد شدید دباؤ میں ہے۔ مسلمان ممالک کے حکمران' بیوروکریسی کے کارپرداز' سیکولر سیاسی گروہ' ادبی دانشور اور اخبارات و دیگر ذرائع ابلاغ کے منصرم اس عالمی طوفان سے شکست خوردہ ہیں جو مادہ پرستانہ نظریات نے برپا کر رکھا ہے۔ ہمارے اندر اقوام غالب کی نقالی کرنے والے طبقات بہت غلبہ یافتہ ہیں۔ یہ ایک حالت جنگ ہے جس کا کوئی معرکہ بھی ملی خودی کے بغیر نہیں لڑا جا سکتا۔

آج ہمارے ملی وجود کا دارومدار اس پر ہے کہ ہم اپنی ایمانی خودی کا تحفظ کریں' اسے

مضبوط کریں اور اس کا علم ہاتھ میں لے کر علمی' سیاسی' معاشی' دفاعی اور ثقافتی محاذوں سے جہاد بقا وارتقا کا آغاز کریں۔ ذہنی طور پر دوسروں سے مفتوح ہونے والوں کے ہاتھوں یہ دنیا کبھی فتح نہیں ہوتی۔ اس کے فاتح وہی لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں کی تقلید اور نقالی سے آزاد ہوں۔

○

حقیقی آزادی اور تہذیبی وجود

تعلیم کا اصل دائرہ کار

سیاسی آزادی کا ظہور بڑا واقعہ ہے اور ایسا لمحہ جب کسی قوم پر آتا ہے تو وہ بڑی مسرت بھی محسوس کرتی ہے اور بالعموم اقوام ایسے ایام مسرت کی یاد سال بہ سال تازہ کرتی رہتی ہیں۔

مگر سیاسی آزادی کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ایک نمایاں غلامی کی قید سے نجات ملی' بند دروازے کھل گئے' اور کارواں کے سامنے ایک لمبا راستہ دور تک پھیل گیا۔ سیاسی آزادی ملنے کے بعد حقیقی اور مکمل آزادی کی لمبی جدوجہد سامنے آجاتی ہے۔ زندہ قوم وہی ہے جو سیاسی آزادی کے بعد کی ذمہ داریوں کو پہچانے' اور اپنے آپ کو منزل رس سمجھنے کے بجائے یہ خیال کرے کہ اصل منزل کے حصول کا سفر تو اب شروع ہو رہا ہے' پہلے تو راستہ ہی بند تھا۔ پوری آزادی کا پالینا' پھر اس آزادی کو ٹھیک طریق سے برتنا اور اس کی کماحقہ حفاظت کرنا یہ ایک جہاد در جہاد معرکہ ہے۔

جو قوم اس پیش افتادہ راز کو نہیں پا سکتی وہ آزادی کے بعد بلندیوں کی طرف ارتقا کرنے کے بجائے پستیوں کی طرف لڑھکنے لگتی ہے۔ انسانیت اپنے اچھے معیارات کھو دیتی ہے اور کھوتی ہی چلی جاتی ہے' معیار زندگی کی بڑھتی ہوئی ہوس چکر دیتی ہے اور ہر بار چکر تیز تر ہو جاتا ہے۔ لوگ آپس میں لڑتے ہیں' ہنگامہ پسند ہو جاتے ہیں ہر شخص خود غرضی کے ٹھرّے سے بدمست ہوا پھرتا ہے۔ جرائم کے طوفان اُمڈ پڑتے ہیں' تضادات جگہ جگہ بدنما طریق سے اپنے شیطانی سینگ نمایاں کر دیتے ہیں۔ خیانت کا کوڑھ اجتماعی زندگی کے عضو عضو تک پھیل جاتا ہے۔

میں یہ چاہتا ہوں کہ میری قوم (اس کے حکمران بھی اور اس کے عوام بھی) سیاسی

آزادی کے حصول کے بعد کی ذمہ داریوں کو خوب اچھی طرح سمجھے اور ان کو انجام دینے میں پورے انہماک سے لگ جائے۔

میں یہاں چند ایسی مطلوبہ آزادیوں کا ذکر کرتا ہوں جن کے حصول کی تمنائے بے تاب ہمارے اندر سیاسی آزادی کے حصول کے فوراً بعد پھیل کر چھا جانی چاہئے تھی۔

پہلی بات خوب اچھی طرح یہ سمجھ لینی چاہئے کہ ہم سب سے بڑھ کر اپنے دین کے لئے آزادی چاہتے ہیں۔ ہمارا دین ایک مسلم فرد' مسلم معاشرے اور مسلم ریاست سے جو جو کچھ مطالبے کرتا ہے ان کو بلا خوف لومتہ لائم پورا کرنے میں حکومت' قوم اور فرد کو لگ جانا چاہئے۔

ہمارے دین نے سیاست و معیشت' تعلیم اور دفاع' قضا اور رد مظالم' انسداد فواحش و منکرات' جرائم کی سزاؤں کے سلسلے میں جو جو کچھ احکام دیئے ہیں ان کے خلاف علمی حملوں اور تعلیمی حربوں اور پروپیگنڈے کے سحر کو توڑ دیا جائے اور جو جو کچھ ٹوٹے اس کی کوئی پروا نہ کی جائے۔ غلط علوم و افکار نے فضا یہ پیدا کر دی ہے کہ ہدایت قرآن اور حکمت رسالت کے خلاف طرح طرح کے اعتراضات کے ردے پہلے یونیورسٹیوں میں چڑھائے جاتے ہیں اور پھر مغربی لٹریچر اور جرائد اور ان کے چربے پیش کرنے والے ادارات ماحول میں مخالف اسلام شوشے اور سلوگن پھیلاتے رہتے ہیں۔ اس حالت میں محض جوش ایمانی سے کوئی اگر کچھ متفرق اور بے ترتیب اقدامات اسلامی تعلیمات کے مطابق کرے تو بھی کچھ تو معذرت خواہانہ ذہنیت کام کرتی رہتی ہے' اور کبھی مغرب ہی سے کوئی سند لے کر اس کا سہارا لیا جاتا ہے' کبھی اچھے خاصے اقدامات کی شکل بدل کر کچھ کی کچھ بنا دی جاتی ہے کہ اس سے اسلام کا حقیقی منشا پورا نہ ہو۔ بیوروکریسی اور طبقہ اعلیٰ کے سیکولر مزاج معترفین بڑی گہری چالوں سے ہر اسلامی امر میں ایسا پھیر پیدا کر دیتے ہیں کہ سیکولرازم کو آنچ نہ آئے۔ بلکہ الٹا اس کا قدم اسلام کی چھاؤں میں کچھ اور آگے بڑھ جائے۔

یوں ہمارا دین چاروں طرف سے نرغے میں ہے اور کوئی شخص یا گروہ اس کی خدمت کرنا بھی چاہتا ہے تو دوسری طرف کے لوگوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اسلام کا راگ الاپتے ہوئے وہ اس میں کوئی نہ کوئی رخنہ ڈال دیں۔

ابھی تک ہمارا دین پوری طرح آزاد نہیں ہوا۔

دین ہی کے سلسلہ گفتگو سے متعلق ایمان اور ایمانی اخلاق و اقدار کا مسئلہ بھی اہمیت رکھتا ہے۔ سرے سے یہ اعتقاد رکھنا کہ ہمارا پیدا کرنے والا ایک خدا ہے' ہم اس کی کائنات کی سلطنت میں رہتے ہیں اور اسی کا رزق ہماری تنخواہ ہے۔ یہاں اس نے ہمیں ایک ڈیوٹی پر مامور کیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ شر و فساد کی قوتوں کے خلاف انفرادی اور اجتماعی اور بین الاقوامی تمام سطحوں پر خیالات سے' اموال سے' طرز عمل سے' دعوت و تلقین سے' لٹریچر اور علم کی قوت سے' دولت کی مدد سے' تنظیم اور اتحاد کے ذریعے ایک جہاد برپا کریں۔ ادائے فرض کے لئے اس نے ہمیں ایک کتاب رہنما —— قرآن —— عطا کی اور مطلوبہ انسانی زندگی کا ایک نمونہ اور معیار مطلوب کی ایک سوسائٹی کا پورا نقشہ ہمیں فراہم کر دیا۔ پھر ہم کو متنبہ کیا کہ امیر' غریب' عالم' ان پڑھ' حاکم' رعیت سب کو موت کے دروازے سے گزر کر خدا کی بے لاگ عدالت میں اپنے کارنامۂ حیات کی روئیداد پیش کرنی ہے اور اس پر جزا یا سزا کا فیصلہ حاصل کرنا ہے۔

ان ایمانیات کو اختیار کرنے سے ایک خاص طرح کی زندگی بنتی ہے۔ مگر جہاں حالات یہ ہوں کہ تعلیم اور معاشرہ اور لٹریچر اور دوسرے عوامل مل جل کر ایمانیات ہی میں جان پیدا نہ ہونے دیں' بار باران کی بنیادیں ہلا دیں تو ہمیں ایمانی آزادی تو حاصل نہ ہوئی۔ ہم مغرب کو استادِ علوم مان کر اور علمبردار حقیقت قرار دے کر درسی کتابوں اور عام لٹریچر میں ایک فلسفہ ارتقاہی ایسا پڑھ کر جذب کر لیتے ہیں کہ اس کے بعد کسی شخص کا ایمان متذکرہ نقشے پر برقرار رہ ہی نہیں سکتا۔ پھر ہر مضمون و بحث میں ایسے سوال اٹھائے جاتے ہیں' ادب ایسے ایسے اشقلے چھوڑتا ہے کہ مسلمان کے عقائد پر تشکیک کی مسلسل سنگ باری ہوتی ہے اور بات یقین تک پہنچتی ہی نہیں۔ بکثرت نوجوان آپ کو بے یقینی اور انتشارِ خیال میں مبتلا ملیں گے۔ فلسفے اور سائنس دونوں کے راستے سے ان پر یہ دباؤ جاری رہتا ہے کہ اسلام کے عقائد کا اگر بالکل انکار نہ بھی کر سکیں تو کم سے کم اس کے متعلق مشکوک ہو جائیں اور ان کے اثرات دھندلے ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ حالتِ یقین کے بغیر ایمان کام نہیں کرتا اور ایمان کام نہ کرے تو فیصلہ کن طور پر شرح صدر سے نہ کوئی قدم آگے بڑھایا جا سکتا ہے نہ پیچھے ہٹایا جا سکتا ہے۔ بے

یقینی کے ایسے مریض ہر قسم کے مخالف اسلام نظریوں اور فلسفوں کے شکار بن جاتے ہیں' کیونکہ ادھر سارا کام کسی وقتی تصور حقیقت اور کسی اضافی یقین پر چل جاتا ہے۔

تفصیلی تجزیہ کرنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارا دین و ایمان خود ایسے مخالف رجحانات میں محصور ہے اور برابر ایسے حملوں کی زد میں رہتا ہے کہ اسے تھوڑی بہت جو کچھ بھی آبیاری ملتی ہے نماز' روزے' مسجدوں کے وعظ و درس اور بعض افراد یا گروہوں کی دعوت و تبلیغی مساعی اور بعض اہم دینی تقاریب سے ملتی ہے لیکن یہ سب کچھ ان انباروں سے بہت کم ہے جو ماحول نے ہمارے ایمانوں پر لاد رکھے ہیں۔

اور پھر ہم اپنی تہذیب کی آزادی بھی چاہتے ہیں جس پر آج کی ملحدانہ و مادہ پرستانہ تہذیب نے انگریزی دور تسلط میں غلبہ حاصل کرنے کا فاتحانہ آغاز کیا تھا اور آج اس نے قوم کے بہت سے روشن دماغوں میں اپنے تاریک گھونسلے بنا لئے ہیں۔

یہ تہذیب کہتی ہے کہ اصل چیز افادیت ہے۔ لہٰذا جس کسی نے کم سے کم صرف سے بڑی سے بڑی افادیت حاصل کر لی وہ کامران ہوا۔ یہ تہذیب کہتی ہے کہ اپنا فائدہ اٹھاؤ' جہاں سے بھی ممکن ہو اور جس بھی طریقے سے ممکن ہو۔ یہ تہذیب کہتی ہے کہ اصل متاع حیات دولت و اقتدار ہے۔ ہر شخص ان ہی کے پیچھے لگا ہے اور ہر شخص کو ان ہی کے لئے بازی لگانی چاہئے۔ یہ تہذیب کہتی ہے کہ مذہب' اخلاق' روحانیت سب بے معنی ہیں اور خدا کا کوئی ثبوت سائنس کے آلات سے نہیں ملا۔ لہٰذا ادھر سے منہ موڑ کر سیدھی طرح ایک حیوان کی سی زندگی گزارنی چاہئے۔ یہ تہذیب کہتی ہے کہ زن و مرد کا اختلاط آزادانہ ہونا چاہئے اور عورتوں کو دفتروں اور کارخانوں کے اندر زندگی کی تگ و تاز میں مردوں کے ساتھ دوش بدوش چلنے کے علاوہ پارکوں' شراب خانوں' رقص گھروں' فلمی سٹیجوں اور نائٹ کلبوں میں اپنے حسن کا دسترخوان کھول دینا چاہئے۔

یہ سارا تصور تہذیب ہماری تہذیب کا الٹ ہے۔ بدقسمتی سے مغربی تہذیب کی الٹی کھوپڑی ابھی تک ہمارے سروں پر لدی ہے۔ معاشرہ اور اس کے بہت سے ادارات اور علم و ادب کے شہ پارے مکڑوں کی طرح ہمارے اپنے تصور تہذیب کے خلاف جالے تن رہے ہیں۔

ہم اپنی موجودہ تہذیبی غلامی کے بندھن کو توڑ کر اپنی نئی دنیائے تہذیب تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔اس کے بغیر آزادی کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔

اور ہم اپنے حقوق کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔

ہمارے انسانی' اسلامی' سیاسی اور معاشی و تمدنی حقوق سارے کے سارے خود اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کئے ہیں' لہٰذا وہ ہمارے لئے صحیح معنوں میں غیر منفک حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ حقوق رسول اللہ ﷺ نے بہ حیثیت نمائندہ الٰہی بہ نفس نفیس ہمیں عنایت کئے۔ خلفائے راشدین نے ان کا احترام ملحوظ رکھا۔حتیٰ کہ غلاموں اور جانوروں اور اقلیتوں کے لئے جو حقوق من جانب اللہ متعین ہو گئے' پھر انہیں کوئی بدل نہ سکتا۔مگر جب سلاطین وملوک کا زمانہ آیا اور سیاست کا بگٹٹ عمل شروع ہوا تو ہمارے حقوق کی اضاعت شروع ہوئی اور چند صدیوں میں بہت کچھ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ کچھ نیک دل حکمرانوں نے بیچ بیچ میں کچھ ضائع شدہ حقوق کو بحال کرنے کی مبارک کوششیں بھی کیں۔مگر کھوئے ہوئے حقوق پورے کے پورے پھر ہمیں کبھی نہ مل سکے۔ اتنے بھی نہیں جتنے غیر مسلم معاشروں اور غیر اسلامی ریاستوں میں صحیح سلامت ہیں اور افسر اور سپہ سالار تو کیا وزیراعظم اور بادشاہ تک ان میں کمی نہیں لا سکتے۔ اضاعت حقوق کا دوسرا سنگین ترین دور انگریزی تسلط کا دور تھا۔عوام کی مرضی کے بغیر جبراً قائم ہونے اور چلنے والا یہ سامراج تو اپنی بقا کے لئے اس جرم پر مجبور تھا کہ لوگوں کو ان کے زیادہ سے زیادہ حقوق سے محروم کرے۔

لیکن آج جبکہ برطانوی سامراج ختم ہو چکا ہے' آزاد اسلامی ریاست قائم ہو چکی ہے آج بھی ہم ان حقوق کے بڑے حصے سے محروم ہیں جو ہمارے لئے عطیۂ خداوندی تھے اور جن کی حفاظت خدا کے محبوب رسولؐ نے خود کی اور سنت رسولؐ کے مطابق خلفائے راشدین نے ان حقوق میں کتر و بیونت کرنے کی جرأت نہیں کی۔ آج کون ہے جو رسولؐ اور خلفائے راشدین سے آگے بڑھ کر ان حقوق پر چھاپے مارنے کا حق رکھتا ہو۔کیا قرآن کو منسوخ کر دیا جائے گا۔کیا سنت رسولؐ پر قلم پھیر دیا جائے گا۔کیا خلفائے راشدین کے نمونے کا سارا وزن ختم کر دیا جائے گا؟ اللہ کے بندو! سوچو کہ تم کدھر جا رہے ہو۔؟

یہاں حقوق کو گنوانے کا سوال نہیں اس سلسلے میں خاصا کام ہو چکا ہے۔ اسلامی کونسل

اس کا جائزہ لے سکتی ہے اور پھر دوٹوک فیصلہ دے سکتی ہے کہ خدا کے عطا کردہ حقوق کون سے ہیں جن کو چھیڑا نہیں جانا چاہئے اور خدا کے رسولؐ کے واضح کردہ حقوق کون سے ہیں جن سے کسی دوسرے کو انحراف کی جسارت نہیں کرنی چاہئے

تو ہمارے حقوق فریاد کرتے ہیں کہ ان کو قید سے چھڑایا جائے!

ہمیں اپنے نظام تعلیم کی آزادی کی بھی فکر ہے

ہمارے ہاں تعلیم کا ایک خاص تصور ہے۔ تعلیم کے متعین مقاصد ہیں، تعلیم میں جو کچھ پڑھایا جانا چاہئے اس کے لئے رہنمائی موجود ہے۔ تعلیم سے جیسے انسان بنانا مطلوب ہے اس کے کرداری نقشے قرآن میں محفوظ ہیں۔ نصاب تعلیم میں اگر اسلامی عقائد و مقاصد سے ٹکراتے ہوئے نظریات اور بحثیں شامل ہوں تو ان کو اصل مرکزی حیثیت نہیں دی جا سکتی، ان کے متعلق صورت یہ اختیار کی جائے گی کہ اسلام سے ہٹ کر دوسری بنیادوں پر جو تعلیمی مواد پیدا کیا گیا ہے اس کا تعارف ایسی موثر اور مدلل تنقید کے ساتھ کر دیا جائے کہ دوطرفہ حقائق کا مطالعہ کرنے والا طالب علم یہ محسوس کرے کہ جس دین وتہذیب کا ترجمان اس کا تعلیمی سسٹم ہے وہ دوسروں سے برتر ہے اور دوسروں کی کمزوریاں یہ اور یہ ہیں۔

ہمارے نظام تعلیم میں یہ خرابی ہرگز نہیں ہونی چاہئے کہ وہ تعلیم کے دو الگ الگ دائرے اور سطحیں پیدا کرے اور ان سے الگ الگ طبقوں کے لوگ استفادہ کریں۔ اسلامی نظام تعلیم کے سکولوں میں مزدور کا بچہ وزیراعظم کے بچے کے ساتھ بیٹھ کر پڑھے گا۔ مساوات نماز ہی کی صف میں مطلوب نہیں، زندگی کے دوسرے دائروں میں بھی ہے۔ ہمارا نظام تعلیم عورتوں کو بے پردگی سکھا کر مخلوط معاشرہ کے لئے تیار کرنے والا ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔ مختصر یہ کہ فی الوقت ہمارے نظام تعلیم کا بڑا حصہ بھی عملی میدان سے باہر جکڑ بند پڑا ہے اور اس کے دست و پا کو بندھنوں سے نجات دلا کر درسگاہوں میں نہیں لایا گیا۔

مریضانہ ذہنیت

سامراجی نظام تعلیم کی پیدا کردہ اس مریضانہ ذہنیت نے ہمیں ایک آزاد قوم اور اپنی

تہذیب کے احیاء کا دعویٰ کرنے والی ملت کی حیثیت سے فکری طور پر دیوالیہ اور عملی پہلو سے ناکارہ بنا کے رکھ دیا ہے۔ تقریباً نصف صدی پر محیط عرصہ کی ناکارگی و نالائقی کا ریکارڈ زندگی کے دوسرے دائروں میں جو ہے سو ہے محض تعلیمی دائرے میں دیکھئے اور بتایئے کہ کیا اس مدت میں ہمارا اپنا کوئی تعلیمی شعور عملاً ظہور کر سکا؟ ہم دنیا کی نقالی چھوڑ کر اپنی درس گاہوں میں اپنی تہذیب کے احیاء کے لئے کوئی بھی بڑا تجربہ کر سکے؟ ہم معلم کے کردار کو بدل سکے؟ نصابی مواد کو کبھی اپنے عقیدوں کی چھلنیوں میں چھانا اور اپنی روایات و اقدار کے چھاجوں میں پھٹکا؟ ہم نے طالب علم کو درس خود شناسی دیا؟ ہم نے نئی نسلوں کے حافظے کے پلڑے میں علم جامد کو پورا بار ڈال دینے کی بجائے کیا ان کی ذہنی ترازو کے دوسرے پلڑے میں تدبر و تنقید کی صلاحیتوں کا وزن بھی برابر رکھا؟

ہماری درس گاہوں کا کارنامہ اس کے ماسوا کچھ نہیں ہے کہ ہر سال صد' خود ناآشنا' بے مقصد نوجوانوں کے ہاتھ میں ڈگریوں اور ڈپلوموں کا کاسۂ گدائی تھما کر باہر دھکیل دیتی ہیں کہ دربدر جا کر نوکری کی بھیک مانگتے پھریں اور روپے اور روٹی کے گرد طواف کرتے رہیں۔

حالات کا یہ قفس جس میں ہم پھنسے پڑے ہیں اس پر آزادی کا لیبل ہونے کے باوجود ہمیں آزادی کا ذائقہ چکھنا نصیب نہیں ہوا۔

کسی بیرونی حکومت کے تسلط سے نکلنے کے معنی تو صرف یہ ہوتے ہیں کہ آزادی کا بند راستہ کھل گیا اور اس راستے پر سفر شروع کرنے کا وقت آ گیا۔ مگر ہمیں سفر کرانے والوں نے مغالطے دے دے کر نجانے کن ٹیڑھے راستوں پر گھمایا پھرایا۔

حقیقی اور وسیع تصور آزادی یہ ہے کہ ایک ملت یا قوم اپنے تہذیبی وجود کو ابھار اور نکھار سکے۔ اپنی امتیازی ہستی کے ہر درخشاں پہلو کو دوسروں کے مقابلے میں نمایاں کر سکے' اپنے اصولوں کو برسر عمل لا سکے' اپنے تصورات کو حقیقت کا جامہ پہنا سکے' اپنے تاریخی خوابوں کی تعبیر پیش کر سکے — اور اس کی اس فطری نشوونما میں کوئی دوسری قوت کسی راستہ سے نہ حائل ہو اور نہ جبری و سازشی طریقوں سے اثر انداز ہو سکے۔

افسوس کہ ہم اپنے تہذیبی وجود یا بالفاظ دیگر اپنے محبوب نظام حیات کو نشوونما نہ دے سکے۔

ہمارا تہذیبی وجود جس کا مرکزی جوہر "لا الٰہ......" ہے، جس صورت حالات سے دوچار ہے وہ بڑی خوفناک اور عبرت انگیز ہے۔ کچھ یوں سمجھئے کہ جیسے کسی شخص پر کوئی دشمن جادو کر دے اور سحرزدگی میں اس کا تجربہ ایسا ہو جیسے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ہوں اور کوئی مسمریزم ماسٹر اسے ایسے کالے عمل کا شکار بنا دے کہ ہپناٹائز ہو کر اپنے خلاف آپ ہی جنگ آرا ہو جائے' وہ جس عقیدے کا اعلان کرے' عمل اس کے خلاف کرے۔ جس مقصد کو مقصد بتائے' اس کا اپنا کردار اسے تباہ کرنے والا ہو۔ جس منزل کو منزل مقصود قرار دے' سفر اس کے مقابل کی سمت میں کرے۔ جس دین کو دین کہے' اس کے ایک ایک جز کی خلاف ورزی کرے۔ جن طاقتوں کو دشمن یا مخالف جانتا ہو' انہی کے اشاروں پر ناچے' جس تعلیم کو ناپسند کرتا ہو' اسی کو اختیار کرے۔ جس تہذیب کو مخالفانہ تہذیب تسلیم کرتا ہو اسی کی پیروی کرے۔ جن کے طور طریقوں کو دنیا میں معاشرت کے لئے تباہ کن اور انسانی معیارات کے لئے ضرر رساں دیکھ رہا ہو' خود انہی کو بہ صد شوق اختیار کرے۔ جس زبان کو وہ ماضی کی غلامی کی یادگار مانتا ہو' اس کو اپنی قومی زبان کے بالمقابل اونچی مسند پر بٹھائے اور اپنی قومی زبان کو اس کے آگے باندی بنا کے کھڑا کرے۔ جو اقتصادی نظریات' اس کے دین کی ایک ایک بنیاد پر ضرب کاری لگاتے ہوں' ان کو سینے سے لگاتا پھرے۔

ہم دنیا کے چند بڑے مسمریزم ماسٹروں کے پیچھے چلے جا رہے ہیں اور نقالی اور تقلید اور احساس کمتری کی وادیاں اسی خود فریبی میں اچھل اچھل کر طے کر رہے ہیں کہ ہم ترقی کرنے جا رہے ہیں۔

حالانکہ ترقی صرف ان قوموں کو نصیب ہوئی ہے جو ذہن' ضمیر اور خودی کی پوری آزادی کے ساتھ اپنے امتیازی وجود کا شعور لے کر چلتی ہیں اور اپنے فلسفۂ حیات پر زندگی کا قصر اپنے ہی نقشے کے مطابق استوار کرتی ہیں۔

نقالوں کو ترقی کبھی نصیب نہیں ہوئی۔

اس تہذیبی جادو اور ڈپلومیٹک مسمریزم اور پروپیگنڈے کے ہپناٹزم کو توڑا جا سکتا ہے۔ مگر گھر کے باہر سے کام کرنے والوں تک معاملہ محدود نہیں رہا۔ ان کے مریدانِ صفا کیش خود ہمارے اندر موجود ہیں اور باہر والوں سے زیادہ سرگرمی سے وہ کام کر رہے ہیں۔ ان کا مفاد انہیں مجبور کرتا ہے کہ وہ قوم کی خودی' اس کی آزادی اور اس کے کردار کو تباہ کرتے رہیں۔ ورنہ

اگر عوام سامراجیت کی فکری اقتصادی، ڈپلومیٹک اور ثقافتی زنجیروں سے آزاد ہو جائیں تو پھر آزاد عوام اس فرسودہ نقشۂ احوال کو بدلے بغیر نہ رہیں گے جس کے برقرار رہنے سے ارباب دولت وجاہ کے طبقے کے مفاد سلامت ہیں۔ یہ طبقہ پوری قوم کے مفاد کو اپنے محدود مفاد پر مسلسل قربان کرتا چلا آ رہا؟

عالمی سامراجی قوتوں کے طلسم سے نکلنے کے لئے پہلے اس طبقے کا طلسم توڑنا ضروری ہے۔

حقائق تو بے شک بہت تلخ ہیں لیکن پھر بھی جن لوگوں کو اپنے نظام حیات سے محبت ہے اور اپنے تہذیبی وجود کی اہمیت کا احساس ہے ان کو مایوس نہیں ہونا چاہئے، وہ جس میدان میں بھی کام کر رہے ہیں چاہے معاشی میدان ہو، سیاسی میدان ہو یا تعلیمی میدان ہو انہیں اپنا کام جاری رکھنا چاہئے۔ خوش قسمتی سے عوام کی بہت بڑی تعداد میں پچھلی تقریباً نصف صدی کے تلخ تجربات نے ایک نیا شعور واحساس ابھار دیا ہے اور وہ صحت مند تبدیلی کے لئے بے چین ہیں۔ وہ اس حقیقی آزادی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں جس کا تصور سامنے رکھ کر انہوں نے تشکیل پاکستان کی جدوجہد کی اور جس کے روبعمل آنے کا انہیں انتظار ہے اور جس کے لئے وہ تشکیل پاکستان کے بعد لمبے عرصے سے دعا کر رہے ہیں۔

آج ضرورت ہے اس طرح کی ہمہ گیر تحریک کی جیسی تشکیل پاکستان کے لئے اٹھی تھی ___ آج یہ منظر پیدا ہونا چاہئے کہ بزرگ اور نوجوان اور طلبہ بسکٹ یا چنے تھیلوں میں ڈال کر محلوں اور دیہی بستیوں کی طرف نکل کھڑے ہوں اور ایک ایک دروازے پر دستک دیں اور ایک ایک فرد کو تہذیبی جنگ کی تباہ کاریوں سے آگاہ کریں جو دشمن نے ہر محاذ پر بھرپور انداز میں چھیڑ رکھی ہے صرف ایسی طوفانی تحریک ہی ان طاقتوں کا زور توڑ سکتی ہے جنہوں نے برسوں اس قوم کے کندھوں پر سواری کی ہے۔

جب تک پرانے صنم کدہ قیادت کے تمام اصنام کو توڑ کر ایک خدا کی خدائی کا علم بلند نہ کیا جائے گا ہم لوگ اس حقیقی آزادی سے محروم رہیں گے جس کے آنے کی علامت یہ ہوگی کہ ہمارا تہذیبی وجود ابھرے گا اور ہمارا اسلامی نظام حیات صبح درخشاں بن کر ظہور کرے گا۔

تخریبی طاقتوں کے خوفناک چیلنج کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے ہمارے پاس بہت

قلیل مدت باقی ہے۔

آج ہم آزاد ہیں لیکن مغرب نیو ورلڈ آرڈر لانا چاہتا ہے جس کے لئے اس کی طرف سے نظریاتی وثقافتی تسلط کی بھرپور کوشش جاری ہے۔

نظریاتی وثقافتی تسلط

موجودہ دور سابق ادوار سے بڑھ کر نظریاتی دور ہے اور اس دور میں ہر قوم کا نظریۂ حیات اور اس نظریہ پر مبنی سرمایۂ ثقافت ہی اس کا سرمایۂ حیات ہے' اور اسی حقیقت کے زیر اثر ہر بڑی عالمی طاقت جہاں بھی اثر انداز ہو کر اپنے مفاد کا راستہ بنانا چاہتی ہے وہ پہلے اپنا نظریاتی وثقافتی تسلط قائم کرتی ہے۔ امریکہ کی دوستی میں بھی یہی تجربہ ہمیں پیش آیا۔ امریکہ نے ہمارے اندر پورے زور سے اپنے افکار اور اپنی ثقافت کے لئے نفوذ کے راستے بنانے کی کوشش کی ہے۔

اس پہلو سے ہماری مظلومی عبرتناک ہے پہلے انگریزی حکومت نے ہماری دنیائے فکر و ثقافت پر اپنا ہل چلایا اور ہمیں سر نہ اٹھانے دیا' پھر انگریز ہی کے زیر سایہ ہندو امپریلزم نے ہمارے اوپر یورش کا آغاز کر دیا' ان دو بلاؤں سے نجات پا کر آزادی کی سرزمین پر آئے تو امریکہ کی دوستی نے صورت نادر اختیار کر لی اور یک بیک امریکی فلسفہ اور امریکی تہذیب کا طوفان یہاں امڈنے لگا۔ تاحال ہمارے اپنے فلسفۂ زندگی اور ہماری اپنی تہذیب کو سر اٹھانے کا موقع ہی نہیں ملا اور ہم نظریۂ پاکستان کو محض ایک ماورائی تصور کی طرح ذہنوں کی گود میں لئے بیٹھے ہیں۔ اب ہمیں اس تجربے سے سبق لے کر آئندہ اس غلطی کی تلافی کرنی چاہئے اور کسی بھی بیرونی فکر و تہذیب کے لئے ایوان زندگی کے دروازے چوپٹ نہیں کھول دینا چاہئیں۔ لیکن یہ تحفظ محض منفی اور دفاعی طرز فکر سے ممکن نہیں۔ ہمیں مثبت طور پر' واقعات و عمل کی دنیا میں اپنے نظریۂ حیات کو متمکن اور اپنی تہذیب وثقافت کو پوری طرح جلوہ گر کر دینا چاہئے۔ ہمیں ایمانی شعور' اپنی ملی انا اور اپنے نیشنل ٹائپ کو تمام آمیزشوں اور آلائشوں سے پاک کر کے دنیا کے سامنے رکھ دینا چاہئے کہ ہم یہ کچھ ہیں' یہ ہمارا مخصوص طرز فکر اور زاویہ نگاہ ہے۔ یہ ہماری اقدار اور پیمانے ہیں' مسائل زندگی کے لئے یہ اور یہ ہمارے حل ہیں۔ اور جسے ہماری طرف آنا ہو اور جس نے ہم سے دوستی کرنی ہو وہ ہمیں جان پہچان کر آئے اور ہم سے

اپنے وجود میں کسی ترمیم کا مطالبہ نہ کرے اور نہ کسی ہیر پھیر سے ہماری تنظیم و ترتیب حیات میں اثر انداز ہونے کی کوشش کرے۔

جب تک ہم اپنے نظریاتی و تہذیبی وجود کو مثبت طور پر نصب نہیں کر دیتے' خارجی اثرات سے اس کا کوئی تحفظ محض منفی تدبیروں سے ممکن نہیں ہے۔ مثبت پہلو کی ہماری اس کمزوری نے ہمیں اب تک اگر پریشان کیا ہے تو معقولیت کی راہ یہ ہے کہ اب اس کمزوری کو رفع کر کے آگے چلا جائے۔

قابل ذکر اور بھی پہلو ہیں۔ تاہم جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ سیاسی آزادی کے بعد مزید جن آزادیوں کے لئے داخلی طور پر جدوجہد کی ضرورت ہے' وہ ہنوز محتاج توجہ ہیں۔

تہذیب و تعلیم

جب بھی پاکستان میں نظام تعلیم کا سوال اٹھے گا' آپ کو یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ آپ دور حاضر کے علوم کس نقطۂ نظر کو پیش نظر رکھ کر اپنی نئی نسل تک پہنچانا چاہتے ہیں۔

ایک صورت یہ ہے کہ آج جو موضوعات فکر' جو مسائل اور قضیئے نئے پیدا ہو گئے ہیں ان کے متعلق اسلام کی ہدایت و رہنمائی کو اہتمام خاص سے اجاگر کیا جائے اور پھر جو نئے ادارے اور نئے معاملات تمدن جدید نے پیدا کر دیئے ہیں ان کے متعلق اسلامی اصولوں کو سامنے رکھ کر اجتہادی انداز سے نئے احکام اخذ کر کے منطبق کئے جائیں۔ نیز اسلامی تعلیمات کو نئی زبان میں نئی اصطلاحات کے ساتھ' نئے زور استدلال کے ساتھ اس انداز سے پیش کیا جائے کہ آج کا ذہن اسے سمجھ سکے اور اس کے قبول کے لئے دروازے کھول سکے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ دور حاضر نے جو علوم مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے مدون کر دیئے ہیں اور ان سے نتائج اخذ کر کے جو اصول وکلیات بنا دیئے ہیں' پھر جو ادارات کسی نقشے پر تشکیل پا کر چھا گئے ہیں' جو ثقافتی اسالیب اور مجلسی آداب اہل مغرب نے رائج کر دیئے ہیں' یہ سارا کچھ ہم جوں کا توں اپنے ہاں اٹھا لائیں۔

اس سلسلے میں ہماری گزارش ہے کہ کوئی بھی نظریۂ تعلیم جو کسی خاص نظریۂ حیات پر استوار ہوتا ہو اور جس کی بنیاد کسی ایسے نظام حیات پر ہو جو اپنی کوئی جداگانہ اور مستقل ہیئت رکھتا ہو تو وہ وقت اور عادت کے ساتھ صرف ہم آہنگی ہی پیدا نہیں کرتا کشمکش بھی کرتا ہے۔ اسلام کو آپ کتنا ہی آزادانہ اور وسیع بنا ڈالیں اس کو اپنا تشخص برقرار رکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ اصول و اقدار اور ان کے عملی تقاضوں کو اپنی اصل شکل میں بہرحال قائم رکھنا ہو گا۔ اس وجہ سے وہ عصر حاضر کی تہذیب سے جو بالکل ہی دوسرے نظریہ پر اٹھی ہے مختلف پہلوؤں سے ٹکرائے گا۔ عصر حاضر سے اسلام کو ہم آہنگ کرنے کا کوئی عمل ایسا نہیں جو اس معرکے سے پوری طرح مسلمانوں کو نجات دلا سکے۔

ہمارے ہاں ہر شعبۂ زندگی میں مغرب سے مرعوب زدہ عنصر یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں جس بھی چیز کا چلن ہو جائے اسے آگے بڑھ کے اطمینان سے اپنا لیا جائے۔ عصر حاضر جن ادارات کو سامنے لائے انہیں جوں کا توں قبول کر لیا جائے۔ وقت کی تہذیب جن علوم و افکار کو فضا میں جاری کر دے ان کے آگے سر جھکا دیا جائے اور پھر زمانے سے کہا جائے کہ یہ جو کچھ تو نے ہمیں از راہ کرم عطا فرمایا ہے اسی کا تو متلاشی ہمارا پیارا اسلام ہے۔ رجحان یہ ہے کہ اول تو کہیں کسی بڑے یا چھوٹے میدان میں سرے سے کوئی کشمکش پیدا ہی نہ ہو۔ پیدا ہو تو فوراً اپنا مورچہ اکھیڑ کر اتنا پیچھے ہٹا لیا جائے کہ امن و سلامتی قائم رہے بلکہ اب کوشش یہ ہے کہ سرے سے کہیں مورچہ بندی ہو ہی نہیں۔ زمانہ اسلام کو چیلنج دیتا رہے لیکن وہ خود زمانے کو چیلنج نہ دے۔ صحیح اور سچا اسلام بڑے آزادانہ اور وسیع مزاج کا ہے مگر اس کے جو اصول احکام' اقدار اور تقاضے غیر تغیر پذیر ہیں ان کو قائم رکھنے کے لئے وہ ذہنی' سیاسی اور ثقافتی دائروں میں پوری طرح معرکہ آرا ہوتا ہے' ان چیزوں کو وہ غیروں کی نگاہ سے تو کیا خود اپنے چہیتے مسلمانوں کے لئے بھی بدلنے پر تیار نہیں ہوتا۔ ان کے بارے میں وہ کوئی سودا اور کوئی سمجھوتا نہیں کر سکتا وہ وقت کے سانچے میں ڈھلنے کے بجائے وقت کو اپنے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ وہ زمین و آسمان مستعار کو جوں کا توں قبول کر لینے کے بجائے اپنی دنیا آپ بناتا ہے۔ وہ علوم اور ادارات اور ثقافت کی بھیک در در سے مانگنے کے بجائے اپنے علوم' اپنے ادارات اور اپنی ثقافت کی تعمیر خود کرتا ہے۔ اسلام کا یہی وہ تصور تھا جس کے تحت علامہ اقبال نے ''دور حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ'' کیا۔ افسوس ہے کہ اس اعلانِ جنگ کی لاج رکھنے کے بجائے ہمارا مغرب زدہ عنصر ''ہم آہنگی'' کے شکست آموز فلسفے پر زور دے رہا ہے!

کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست

ہم کو اگر بطور ایک آزاد قوم کے زندہ رہنا ہے تو ہمیں ایک تعلیمی انقلاب سے گزرنا پڑے گا۔

تعلیمی انقلاب

پاکستان کے نام پر کروڑوں افراد کا قافلہ اپنی تہذیبی بازیافت کے لئے نکلا تھا مگر آج اس قافلے کے افراد اپنی وہ تھوڑی سی پونجی بھی لٹوا چکے ہیں جو پیچھے سے انہیں بطور زاد سفر ملی

تھی۔ اگر دیانت وشعور کے ساتھ کوئی کارفرما قوت کام کرتی تو تعمیر فردا کے لئے اس کا اولین میدان کار نظام تعلیم ہوتا۔ پاکستان کے نام پر جو انقلاب مطلوب تھا اس کا پہلا قدم تعلیمی انقلاب ہی ہوسکتا تھا' مگر الٹا ہوا یہ کہ غلامی کے نظام تعلیم کی ایسی کڑی حفاظت کی گئی' گویا وہ کوئی مقدس میراث ہو۔

انقلاب تعلیم کو بپا کرنے میں کوتاہی کے جو سنگین نتائج ہم نے بھگتے ہیں سو بھگتے' اب تو تاریخ کے تباہ کن عوامل کی زد سے اپنے آپ کو نکالنے کے لئے جہاد واجتہاد کی جس قوت کی شدید ضرورت ہمیں درپیش ہے اس کا حصول نظام تعلیم کو فوری طور پر بدلے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہ امر امید افزا ہے کہ اساتذہ اور طلبہ دونوں کے حلقوں میں انقلاب تعلیم کی تمنا پائی جاتی ہے۔ یہ دونوں طاقتیں اگر درس گاہوں کی ملی زندگی کے جہان نو کی تاسیس کی مہم شروع کرنے کے لئے موثر پارٹ ادا کریں تو مخالف قوتیں ان کا راستہ زیادہ دیر تک روک نہ سکیں گی۔

تجدید واحیائے اسلام کا کام تعلیم کے حلقے سے لے کر پوری زندگی کے وسیع دائرے تک سرانجام دینے کے لئے ایمانی انقلابیت کی ضرورت ہے۔ یہ انقلابیت اگر آج موجود ہوتی تو طالب علم سے کہا جاتا کہ تم اسلامی انقلاب کے علمبردار اور خدا کے سپاہی ہو' تمہیں ساری دنیا کو اس پر تیار کرنا ہے کہ تمام قومیں اپنے اپنے یہاں اسلامی انقلاب برپا کریں۔

یہ نقطۂ نظر نہ صرف نظام تعلیم کو موثر بنا دے گا بلکہ نوجوان طلبہ کے دلوں کو ایسی حرکت و حرارت سے مالا مال کر دے گا کہ وہ اپنے آپ کو تبدیل کرنے میں بھی لگن دکھائے گا اور ساری انسانیت کو اسلام کے پاکیزہ' فلاحی اور تعمیری انقلاب کا راستہ دکھانے کی بھاری ذمہ داری کیلئے تیار بھی کرے گا۔

تعلیمی انقلاب کے لئے ایک واضح اور مستحکم تعلیمی نظریئے کی ضرورت ہے۔ اسلامی نظریہ تعلیم وہی ہے جس کے مطابق تشکیل پانے والا نظام تعلیم اپنے دوسرے تمام علوم کے درمیان سب سے بڑا موضوع خود ہمیں اور ہمارے امتیازی تہذیبی وجود کو قرار دے۔ تمام اشیاء اور قوتوں اور دنیا جہان کے فلسفوں اور نظریوں سے زیادہ بڑا اور زیادہ اہم نصاب تعلیم ہم خود ہیں' ہم بہ حیثیت انسان کے بھی اور ہم بہ حیثیت دینی وتہذیبی وحدت کے بھی!

اپنی ہستی کا علم اگر نہ ہو یا ناقص ہو تو تمام علوم غلط ہو جاتے ہیں اور یہ مرکزی علم اگر درست ہو تو پھر سارے علوم صحیح رخ پر پڑ جاتے ہیں۔

تعلیم کی ماہیت

تعلیم کی ماہیت یا تعریف یہ ہے کہ ایک نسل' دوسری نسل کو یا ماضی مستقبل کو' یا بڑی عمر کے لوگ چھوٹی عمر کے بچوں اور نوجوانوں کو ذہنی واخلاقی وراثت منتقل کرتے ہیں جس وراثت کا کچھ حصہ انہوں نے سابق نسل سے لیا ہوتا ہے اور کچھ حصہ اپنے تجربوں' مشاہدوں اور قیاسات اور ماورائے قیاس ذرائع سے حاصل کیا ہوتا ہے۔ اس وراثت کے دو بڑے حصے ہوتے ہیں:۔

(ا) ایک حصہ فنی' پیشہ ورانہ' ٹیکنیکل' سائنسی' ریاضیاتی' تجرباتی معلومات اور ان کے بل پر حاصل ہونے والے ایسے قیاسات جو قریب بالیقین ہوں۔

(ب) دوسرا حصہ اتنا ہی اہم بلکہ شاید زیادہ اہم یہ ہوتا ہے کہ انسان کی حقیقت' کائنات میں اس کا مقام' انسان اور انسان کے تعلقات' ان کے رویوں اور معاملوں' ان کے اداروں' ان کے تاریخی سفر کا ماحصل' خاندانوں' معاشروں اور قوموں یا ملتوں کی محکم روایات اور اخلاقی اقدار جن کے درخشاں رہنے سے کسی فرد یا قوم کا وجود محکم رہتا ہے اور جن کی موثر قوت اتنی خودی پیدا کر دیتی ہے کہ ایک خاص تہذیب رکھنے والی قوم کسی دوسری تہذیب کی علم بردار قوم کی تہذیب کا جؤا اپنے کندھے پر رکھنے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ بعض قومیں دوسری اقوام کی سیاسی غلامی کی اسیر رہنے کے بعد بھی جب آزاد ہوتی ہیں تو اپنی ہزار سالہ تہذیب اور ہزار سالہ تاریخ کے ماحصل کو اور اپنی دیرینہ روایات اور اقدار کو از سر نو زندہ کرنے میں لگ جاتی ہیں۔ جس طرح کوئی پرندہ پنجرے میں چند سال گزارنے کے بعد اگر رہا ہو جاتا ہے تو اپنی قدیم شاخ نشیمن کی طرف لپکتا ہے۔ اور وہاں از سر نو اسی طرح کا نشیمن تیار کرتا ہے جیسا کہ اس کے ذہن میں نقشہ موجود ہے۔ پھر وہ قفس میں جا کر رہنا پسند نہیں کرتا اور نہ قفس کی نقالی کر کے پنجرے کی شکل کا نشیمن تیار کرتا ہے۔ بلکہ اسے دور قفس کی ہر یاد اذیت دیتی ہے۔

اسے کہتے ہیں تہذیبی احیاء۔ ہر بااصول قوم' بامقصد قوم' تہذیب دار قوم' صاحب تاریخ قوم میں یہ جذبہ تہذیبی احیاء پایا جاتا ہے۔

تعلیم کی اس تعریف کے شعور میں مطالعہ حیوانات بھی ہماری خاصی مدد کرتا ہے۔
مرغیوں' چڑیوں اور بلیوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو نقل و حرکت' حصول غذا اور اس میں مفید و مضر کے امتیازات' خطرات کی پہچان اور بوقت ضرورت بھاگنے' چھپنے یا حریف سے جنگ آزما ہونے کی تعلیم دیتی ہیں' نیز انہیں ہر موقعہ کی مخصوص آوازوں اور حرکات سے آگاہ کرتی ہیں۔ بسا اوقات ان گھریلو جانداروں کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بچوں کے جبلی عوامل کو ایک خاص عملی نہج پر ڈالنے کے لئے ان کو بار بار مشق کراتے ہیں۔ تمام حیوانات میں یہ سلسلہ نسلاً بعد نسلاً یونہی چلا آ رہا ہے۔ ان کا ایک ہی تعلیمی "عملیہ" ہے' تعلیمی نظریہ کوئی نہیں۔
انسان کا معاملہ قدرے مختلف ہے کیوں کہ وہ نرا حیوان نہیں' کچھ اور بھی ہے۔ تعلیمی نقطہ نظر سے دیکھیں تو انسان کا تعلیمی عمل پانچ وجوہ سے وسیع تر اور بلند تر ہو جاتا ہے۔

1. انسانی زندگی کے ساتھ ایک تو حافظے کا عظیم الشان دفتر کام کرتا ہے جو اس کے اپنے اور اس سے پہلے کی نسلوں' اس کے ہم عصروں کے تجربات و معلومات کا مفصل ریکارڈ رکھتا ہے اور بوقت ضرورت ہر موضوع اور مسئلے کا فائل سامنے رکھ دیتا ہے۔ حافظے کی اس قوت نے انسان کو اس قابل بنایا کہ نہ صرف بہت سے افراد کے تجربات و معلومات کو اکٹھا کیا جا سکے' بلکہ گزشتہ تمام نسلوں کی میراث کو بھی سمیٹا جا سکے۔ حافظہ کی مدد کے لئے فن تحریر کی ایجاد نے کاغذ پر وسیع ریکارڈ جمع کرنے کا راستہ کھول دیا جس کی مدد سے انسانی دماغ کی قوت کئی گنا بڑھ گئی اور اب تو کمپیوٹر کا دور ہے۔
2. انسان کی دوسری برتری یہ ہے کہ اسے جو کچھ مواد تیار شدہ ملتا ہے۔ وہ فکر و تدبر اور تخلیق و ایجاد کی قوتوں سے کام لے کر اس میں اپنی طرف سے قطع و برید بھی کرتا ہے اور اضافہ بھی۔ ہر نسل کے بے شمار افراد سرمایہ علم اور سرمایہ تعلیم کو بڑھانے میں حصہ لیتے ہیں۔
3. انسان کی تیسری وجہ فوقیت یہ ہے کہ وہ ہر دور میں حاصل شدہ تجربات و معلومات کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔

زمانہ کوئی بھی ہو' معاشرہ کسی بھی سطح کا ہو۔ تعلیم کے دائرے کا پھیلاؤ کم ہو یا زیادہ' ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ذہن' جسم' ماحول اور اشیاء نیز اخلاقی قدروں اور سماجی رویوں اور امتیازی شعائر کے متعلق معلومات و تجربات کے انبار کو بھلے برے' کھوٹے کھرے' مفید و مضر اور صحیح اور غیر صحیح کی چھانٹی کئے بغیر ایک زمانے کے لوگ آپنے اخلاف کے حوالے کر دیں'

بلکہ اس فطری تقاضے کے تحت جس کے اثر سے ماں باپ اپنی اولاد کے متعلق یہ چاہتے ہیں کہ وہ ان کی کج فکریوں' غلطیوں اور کمزوریوں سے بچ کر زیادہ بہتر انسان ثابت ہوں' تعلیم کے عمل میں یہ ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ ناقص معلومات و تجربات' حقائق کے غلط تصورات اور انسانی اطوار کے ناپسندیدہ اجزاء کو چھانٹ کر بہترین مواد کو آئندہ نسلوں کے حوالے کیا جائے۔ اس طرح ہر نسل یا ہر دور کی طرف سے کوشش یہ ہوتی ہے کہ صرف اس سرمایہ علم کی آگے ترسیل کی جائے جو زیادہ سے زیادہ قرین حقیقت اور ذریعہ افادیت ہو۔ ورنہ اگر سارے رطب و یابس کو اکٹھا کر کے شروع سے منتقل کیا جاتا تو آج ہر طالب علم کے ساتھ نصابی کتب کا پورا انبار خر ہوتا اور کسی استاد کا دماغ تدریسی مواد کا گودام بننے کی وسعت نہ رکھتا۔

❹ انسان کی چوتھی وجہ فوقیت یہ ہے کہ معلومات و تجربات کو متفرق اور پراگندہ صورت میں منتقل نہیں کیا جاتا۔ بلکہ سارے مواد کو ایک خاص ترتیب سے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ترتیب جس مرکز کے گرد واقع ہوتی ہے' وہ کسی معاشرے کے عقیدے' مقصد اور انسان مطلوب کے تصور سے بنتا ہے۔ یہی تین چیزیں اس کسوٹی کی تشکیل بھی کرتی ہیں جس سے تعلیمی مواد کو پرکھ کر خس و خاشاک کو الگ کیا جاتا ہے۔ اور ذرات زر اور پارہ ہائے جواہر کو اگلی نسلوں کے سپرد کیا جاتا ہے۔

❺ انسانوں کے تعلیمی عمل کو جو پانچویں فوقیت حیوانات سے برتر بناتی ہے وہ یہ ہے کہ حیوانات کا محدود سا تعلیمی عمل حیات جسمانی اور اس کے مادی تقاضوں تک محدود ہے' اور اس میں بھی اصل محور حیوانی فرد (یا اس کے چھوٹے سے کنبے) کا وجود ہے۔ بخلاف اس کے تعلیم کا وسیع انسانی عمل جہاں نئی نسلوں کو حیات جسمانی کے مسائل اور تقاضوں کا شعور دلاتا ہے' وہاں فطری اخلاقی رجحان کے مقتضیٰ کے تحت تقسیم خیر و شر کا بھی ایک تصور اور ضابطہ فراہم کرتا ہے۔ کیوں کہ یہاں تعلیم کا محور تنہا فرد کی زندگی نہیں ہے' بلکہ اجتماعیت اور مدنیت میں رہ کر ایسے انداز سے جینے کی صلاحیت پیدا کی جاتی ہے کہ فرد دوسرے افراد کی بہبود میں بھی حصہ دار رہے اور معاشرے کی مجموعی ضروریات کو پورا کرنے میں بھی برابر کا شریک ہو' اور اپنے اس اجتماعی اخلاقی پارٹ کو ادا کرنے کے لئے وہ ذاتی مفاد اور آرام کی قربانیاں بھی دے۔ خلاصہ یہ

ہے کہ انسانی تعلیم خالصتاً معاشی تعلیم نہیں بلکہ وہ اخلاقی بھی ہے۔ حیوانی دنیا میں زندہ رہنے اور زندگی میں لطف اندوز ہونے سے آگے کوئی مقصد و غایت نہیں۔ مگر عالم انسانی میں زندہ رہنا اور زندہ رہنے کی مساعی کرنا ایک مبادیاتی شعبۂ وجود ہے۔ اصل چیز وہ مشن اور وہ نصب العین ہے جس کے ذریعے انسانی زندگی کو معانی حاصل ہوتے ہیں۔ یہاں جسم اور روح دونوں کی بقا و نشوونما بیک وقت مطلوب ہے۔ لہٰذا انسان کے تعلیمی عمل کا وسیع اور جامع تصور یہ ہوا کہ وہ مادی اور معاشی تجربات ہی کو نہیں بلکہ ان کے ساتھ مختلف نسلوں کے جمع شدہ اخلاقی' سماجی اور تہذیبی تجربات و معلومات کو بھی چھانٹ پرکھ کے بعد نئی نسلوں کی طرف منتقل کرنے کا ذریعہ ہے۔

تعلیم کا کام یہ ہے کہ ایک تو وہ معاشی' سائنسی' تکنیکی وغیرہ معلومات اگلی نسلوں کو منتقل کرے۔ اور ان کو یہ بھی داستان سنائے کہ ہر معاملے میں کس طرح ترقی ہوئی' فارمولے کس طرح بنے' نئی دریافتیں کس طرح ہوئیں تاکہ نئی نسلوں کو آگے بڑھنے کا راستہ بھی معلوم ہو جائے۔ جامد تعلیم نہیں بلکہ حرکت آموز تعلیم۔

تعلیم ماضی بعید میں

انسانی تعلیم کی یہی ماہیت ابتدا سے رہی ہے۔ پہلے اس عمل کا زیادہ تر حصہ گھروں کے دائروں میں تکمیل پاتا تھا' ماں کی گود اور باپ کا فیضان نظر ہی مدرسہ و مکتب ہوتا تھا۔ پھر یہ عمل قبیلے یا دیہی کمیونٹی تک وسیع ہو گیا۔ بعد میں جب انسانی معلومات اور تجربات کا پھیلاؤ بڑھ گیا تو باقاعدہ مکتب و مدرسہ کے ادارے وجود میں آئے اور اب جب کہ شاخ در شاخ علوم کی پہنائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ ہر شاخ بجائے خود چمن بداماں ہے' تعلیم کا عمل یونیورسٹیوں اور جامعات و کلیات کے بھاری بھرکم نظام کا منت کش ہو گیا ہے۔

آج کے معاش زدہ دور کی فکری عینک لگا کر دور رفتہ پر نظر ڈالیں تو یہ مغالطہ ہو سکتا ہے کہ تعلیم کے دائرے میں معاشی پہلو ہی اہم' وقیع اور غالب تھا۔[1] ماضی بعید کا ایک کسان' ایک

---

[1] آج کل تعلیم کا مستقل معاشی نظریہ وجود میں آ چکا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ساری تعلیم کا مرکزی مقصد انسان کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ کائناتی ماحول اور معاشرے کی فضا میں رہ کر اپنے لئے معاش حاصل کر سکے۔ ماضی بعید میں معاشی سرگرمیاں کاشت کاری' نوربافی' جانوروں کی گلہ بانی' ←

معمار ایک بڑھئی ایک آہن گر ایک کفش دوز ایک درزی اور ایک خاکروب اپنی اولاد کو اپنے مخصوص پیشے کی تربیت دیتا اور متعلقہ اوزاروں کا استعمال سکھاتا نظر آتا ہے۔ اسی طرح ہر ماں کے سایۂ شفقت میں اس کی بیٹیاں پکانے ریندھنے' جھاڑو بہارو اور سینے پرونے کے کام سیکھتی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن اس طرح کی رائے قائم کرتے ہوئے ہم تعلیم کے دوسرے حصے کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ہر زمانے میں ماں باپ اپنی اولادوں کو کسی نہ کسی درجے یا نوعیت کی اخلاقی وسماجی تربیت دیتے رہے ہیں اور تعلیم کے اس حصے کا عمل مسلسل صبح و شام جاری رہتا تھا۔ پیشے کی تعلیم تو صرف کام پر بیٹھنے کے اوقات سے مخصوص تھی۔ مگر اخلاقی وسماجی تعلیم ان اوقات میں بھی ساتھ ساتھ دی جاتی رہتی اور ان اوقات کے بعد بھی جاری رہتی۔

تہذیبی و اخلاقی تعلیم کے قدیم شواہد

قابل غور بات یہ ہے کہ ہر دور کے بچوں کو پرورش کرنے والی نسل نے یہ سکھایا کہ بڑوں سے بات کرو تو کیسے کرو' ہم جولیوں سے کس طرح مل کر رہو' مہمان یا کام کرنے کے لئے کوئی نووارد آئے تو اس کی تواضع کس طرح کرو' لین دین کے کیا اصول برتو' اپنے سے کمزور لوگوں کی کس طرح خدمت کرو' کن باتوں پر شرم یا غیرت کا ردعمل دکھاؤ' کن صورتوں میں لڑنے مرنے پر تیار ہو جاؤ' کن چیزوں کو لازم اور کن کو اپنے لئے غلط سمجھو' کھانے پینے اور سونے جاگنے میں کیا آداب ملحوظ رکھو' خدا یا دیوتاؤں (بت پرست معاشروں میں) اور مذہبی اکابر سے کیسا معمول رکھو' اپنے گھر یا خاندان کی کن روایات کی پاسداری کہاں تک کرو' اور کن مواقع پر اپنی خواہش' اپنے آرام اور اپنے فائدہ کو قربان کر دو یا کسی تکلیف یا نقصان کو خوشی سے گوارا کر لو۔

نسلوں سے جاری شدہ تعلیم مسلسل کا یہی وہ پہلو ہے جس نے انسان کو انسان بنایا' اس

← کفش دوزی' گل گری' آہن گری' معماری' خیاطی' حجامت' معالجہ وغیرہ کی نہایت سادہ شکلوں تک محدود تھیں' لیکن اس وقت بھی ان میں سے ہر کام تعلیم کا محتاج تھا۔ سیکھے جانے بغیر کوئی آدمی کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یعنی بے علم کے لئے روٹی کے دروازے بند تھے۔ اب تو ہر شعبہ زندگی میں کام کی نوعیت سنجیدہ ہو چکی ہے۔ ہر طرف مشینوں اور کیمیکلز کا دور ہے اور ہر معاشی سرگرمی میں معلومات اور لٹریچر اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ آج کے آدمی کو حصول معاش کے لئے برسوں تعلیم حاصل کرنا پڑتی ہے۔ مگر تہذیبی نظریہ یہ کہتا ہے کہ معاشی علوم کو بھی تہذیبی اور نظریاتی اور اخلاقی فریم میں فٹ ہونا چاہئے۔

کی زندگی کو اعلیٰ اوصاف اور درخشاں انداز سے مزین کیا یہاں تک کہ آج الحاد اور نفس پرستی کے مارے ہوئے معاشروں میں بھی بے لوث محبت اور مخلصانہ ایثار اور احترام انسانیت کی کچھ نہ کچھ مثالیں کہیں نہ کہیں اس طرح چمک اٹھتی ہیں جیسے کسی بے آب و گیاہ ریگزار میں ابرق کے ذرے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جناب اسمٰعیل علیہ السلام کو محض دوڑ دھوپ کرنے اور تعمیر کعبہ کے لئے گارا اٹھا اٹھا کر دینے کی تعلیم ہی نہیں دی تھی بلکہ آداب فرزندی بھی سکھائے تھے اور خود تعمیر کعبہ کے کام میں بھی وہ آداب فرزندی شامل تھے۔ ہر دور میں ہر باپ نے یہی چاہا ہے کہ اس کا بیٹا جسمانی و معاشرتی فلاح کے ساتھ روحانی و اخلاقی فلاح بھی حاصل کرے۔

حضرت ابراہیم نے کیسے اپنے فرزند کو تہذیبی معنوں میں آداب فرزندی سکھائے' اس کی ایک شہادت تو تعمیر کعبہ کے عمل میں باپ کے ساتھ بیٹے کا اطاعت شعارانہ حصہ ہے۔ وہ کوئی معاشی کام نہیں کر رہے بلکہ ایک مرکز توحید کی تعمیر کے ذریعے قیامت تک کے لئے اعلیٰ درجہ کی ایمانی' ثقافتی اور اخلاقی خدمت انجام دے رہے ہیں' جس کے سرچشمہ سے آنے والی نسلیں تا لحۂ آخرت سیراب ہوں گی۔ ورنہ معاش اگر اولیں اہمیت رکھتی تو باپ بیٹا دونوں شکار کرنے نکل جاتے اور سارا دن کھپا آتے۔ شاید کچھ کبوتر' تیتر اور اکا دکا ہرن بھی ان کے ہاتھ لگ جاتے مگر یہاں معاش سے بڑا کام درپیش تھا جس کے لئے فاقہ کشی بھی کی جا سکتی تھی۔

دوسرا واقعہ ایک سچے خواب کے اشارے کے تحت حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کا سامنے آیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بیٹے کو قربان کرنے کے لئے لے کے چلے تو رسی' چھری وغیرہ ان کے ساتھ تھی۔ والد نے بیٹے سے بہ طور استمالت پوچھا کہ مجھے خدا کی طرف سے ایسا اشارہ ہوا ہے اور میں تم کو قربان کرنے لے جا رہا ہوں۔ کیا خیال ہے؟ بیٹے نے کہا: سَتَجِدُنِيٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ [1] مجھے آپ صابر پائیں گے۔ اور بوقت ذبح پیشانی کے بل لیٹ گئے۔ نہ بھاگے' نہ جھگڑا کیا' نہ باپ کی پیغمبری کا انکار کیا۔ آج کل کی اولاد تو والدین کے خلاف محاذ آرا ہو جاتی ہے۔ گھر سے بھاگ جانے سے لے کر خودکشی تک بیٹے اور بیٹیاں کر گزرتی ہیں مگر سر اطاعت و تعاون خم نہیں کرتیں۔ تعمیر کعبہ کی مشہور دعا میں بھی سبق ہے کہ باپ بیٹا دونوں ایک پیغمبر معظم کی آمد اور امت مسلمہ کے برپا ہونے کی دعا کرتے ہیں۔

---

[1] الصّٰفّٰت۔ ملاحظہ ہو آیت ۱۰۲

حضرت یعقوب علیہ السلام بستر مرگ پر اپنے بچوں کے معاشی مستقبل سے بے نیاز ہو کر' ان سے صرف یہ سوال کرتے ہیں کہ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ[1] تم میرے بعد کس ہستی کے عبادت گزار اور کس کے دین کے پابند بن کے رہو گے یہ تھا بنیادی اور مرکزی سوال ایک پیغمبر کی نگاہ میں جو معلم بھی ہوتا ہے۔ حضرت لقمان اپنے بیٹے کو تفصیل سے اپنے اختیار کردہ (زیر الہام خداوندی) مسلک حق کی تعلیم دیتے ہیں۔ یہ شعر بھی اس بحث میں قابل توجہ ہیں کہ:

اپنے نور نظر سے کیا خوب
فرماتے ہیں حضرت نظامی
جائے کہ بزرگ بایدت بود
فرزندی من نہ داردت سود

دوسرا شعر جو فارسی میں ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر وہ مقام جہاں تمہیں ایک مرد عظیم یا بزرگ ہونا چاہئے' وہاں تمہیں میرا فرزند ہونا کوئی فائدہ نہ دے گا (جب کہ تم نے کوئی بلند مقام حاصل کرنے کی خود کوشش نہ کی ہو گی) یعنی علم اور کردار کے لحاظ سے اپنی تعمیر آپ کرو' ورنہ محض آبائی نسبت سے کام نہ چلے گا۔ اس شعر میں ایک سبق ہے جو جناب نظامی اپنے فرزند کو سکھاتے ہیں۔ اور اقبال یہ شعر اور اس کے ساتھ ایک لمبی نظم لکھ کر جاوید کو وہی تعلیم دے رہا ہے جس کا مفہوم ہم تہذیبی نظریئے سے متعین کرتے ہیں۔[2]

انبیاء علیہم السلام کی مثالوں کے علاوہ آپ اگر سقراط اور مہاتما بدھ اور کنفوشس اور زرتشت

---

[1] البقرہ۔ ملاحظہ ہو آیت ۱۳۳

[2] ہمارے ہاں اولاد کو باپ کی معلمانہ تلقین کی روشن مثال علامہ اقبال نے (جو پیغمبرانہ حکمت حیات کا علمبردار تھا) پیش کی ہے۔ نہ صرف وہ نظم جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے بلکہ جاوید نامہ کے آخر میں "سخنے بہ نژاد نو" کا بھی یہ مقصد ہے کہ جاوید کو تہذیبی پہلو سے درس حیات دیا جا رہا ہے۔ اس نظم میں یہی حقیقت سامنے آئے گی کہ حکیم الامت اپنے فرزند کے معاشی مستقبل کو اس کی ثانوی حیثیت کی وجہ سے ایک طرف رکھ کر' اس کے ایمانی' اور اخلاقی مستقبل کو سنوارنے کی فکر کرتے ہیں۔ اقبال جہاں اسلام کے تہذیبی نظام کے احیا کا علمبردار و نقیب ہے وہاں وہ اسلام کے تہذیبی نظریہ تعلیم کا بھی معلم ہے۔ اقبال کے یہ اشعار بھی جاوید اقبال سے تخاطب کے آئینہ دار ہیں۔

غارت گر دیں ہے یہ زمانہ' اس کی نہاد کافرانہ
جس گھر کا مگر چراغ ہے تو' ہے اس کا مزاج عارفانہ

کی تعلیمات وتلقینات کا جائزہ لیں تو سرسری نظر میں اندازہ ہو جائے گا کہ ایسی تمام شخصیتوں نے اپنے اپنے شعور وعرفان کے مطابق اپنی قوتیں روحانی و اخلاقی تعلیم کو عام کرنے میں کھپائیں۔ اور ایسے بزرگوں کی تعلیمات کو عموماً حکمت کا عنوان دیا گیا۔ یعنی ان کے عقیدے یا طریقے کتنے بھی مختلف ہوں ایسے لوگ انسان کو مادیت اور جہنم پرستی کے حیوانی رجحانات سے بلند تر دیکھنا چاہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ انسانی تعلیم کلیتہً معاش یا حیات جسمانی کے تقاضوں تک کبھی مخصوص و محدود نہیں رہی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ پورے زور سے اور غالب اہمیت کے ساتھ لازماً اخلاقی اور سماجی تقاضوں کی تربیت جاری رہی ہے۔ اوائل میں مدرسوں اور خانقاہوں کی طرز کے جو تعلیمی ادارے الگ سے نمودار ہوئے ان کا اصل محور انسانیت کی اخلاقی نشوونما کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ تاریخ کا وہ لمبا دور جس میں حصول معاش کا عمل سادہ تھا اور زیادہ تر انفرادی' جس میں اکتساب رزق کے لئے پیشوں کی تعلیم گھر گھر میں عام تھی اور نوخیز افراد آسانی سے معاشی جدوجہد میں حصہ لینے کی تیاری کر لیتے تھے' ہمارے تعلیمی اداروں نے معاش کو اپنا مستقل موضوع کبھی نہیں بنایا۔ یہ تو دورنو کے نظام اقتصادیات کی پیچیدگی' اکتساب رزق کے مشکل فنون اور پیدائش دولت بہ پیمانہ کبیر کے سرمائے کے بل پر قائم ہونے والے مشینی ادارات وغیرہ کی پیدا کردہ مشکلیں ہیں جنہوں نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ ہمارے تعلیمی نظام ہماری اولادوں کو کسب رزق کی مرد آزما مسابقت کے لئے تیار کریں اور اس سلسلے میں جو سائنسی یا ٹیکنالوجیکل تیاری ان کو کرانی ہے کرا دیں۔ مگر نظام تعلیم میں سائنسی شعبہ ہائے علوم کے ہونے کے معنی یہ نہیں کہ اب انسانیت کے بلند تر ایمانی' اخلاقی تقاضوں کو غیر ضروری قرار دے کر دائرہ تعلیم سے خارج کر دیا جائے۔ آج کا مادہ پرستانہ نقطہ نظر ہمیں اسی نہج پر لے جانا چاہتا ہے۔ مگر ایسا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے تعلیمی ادارات اولاد آدم کو انسان بنانے کے بجائے معاشی حیوان بنا بنا کر میدان میں لائیں۔ اس صورت میں قدروں کا بحران انسان کو سرمایہ و مشین کی غلامی اور اس سے پیدا شدہ پست فطرتی کے باعث جرائم' ناجائز نفع اندوزی' طاقت کے طلسم سے کمزور آزاری پر اتر آئے گا (بلکہ آج عملاً پوری دنیا میں یہی حالات پیدا

←

جو ہر میں ہو لا الہ تو کیا خوب' تعلیم ہو گو فرنگیانہ
ہر شاخ پہ اڑ چہک و لیکن' کر اپنی خودی میں آشیانہ

"اپنی خودی میں" کا یہاں مطلب ہے اپنے ایمان و اخلاق اور تہذیبی روایات میں۔

ہو چکے ہیں۔)

ان احوال کا صریحی نتیجہ یہ ہے کہ مارکیٹ میں کمرشل ازم (اخلاق سے آزاد) سیاست میں قوت کے معیار حق ہونے کا فارمولا' بین الاقوامی ڈپلومیسی میں ضرورت اور فائدہ کے ذریعے اصول پسندی کا خاتمہ' مرد و زن کے تعلق میں جنسی ہیجان کا اتنا دخل کہ حد سے گزری ہوئی عریانی اور عریاں جسموں کی ذرائع ابلاغ پر نمائش' نیز جنگ اور تفتیش جرائم میں انسانوں میں حیوانیت بلکہ بہیمانہ اور انتہائی ذلیل و رکیک اطوار بد کا روز افزوں پھیلاؤ' جھوٹ' خیانت' دھوکا بازی اور سیاسی اور ڈپلومیٹک ''گرہ کٹی'' کی وبائے عام —— یہ سب ثبوت ہیں اس بات کے کہ سماجی ارتقاء (Evolution) کا فلسفہ ناکامی کی ٹھوکر کھا کر اوندھے منہ گر چکا ہے اور کوئی اسے اٹھانے والا اور فسٹ ایڈ دینے والا نہیں ہے۔

صحت مند نظام تعلیم

یہاں تک پہنچنے کے بعد ایک اہم سوال سامنے آ جاتا ہے' جسے بالعموم نظر انداز کیا گیا ہے وہ یہ کہ' آیا ہمارے معاشی اور اخلاقی تجربات و معلومات کو پراگندہ اور بے ربط ہونا چاہئے' اور ان میں تضاد پائے جانے چاہئیں۔

وحدت نظام حیات ایک ایسا کلیہ ہے جسے توڑ کر اگر زندگی کو ایسے خانوں میں بانٹ دیا جائے اور ان خانوں میں متضاد عناصر بھر دیئے جائیں تو ایک دن یہ سارے خانے اس طرح ٹوٹتے ہیں کہ پوری زندگی کا خانہ خراب ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر زندگی کے سیاسی شعبے کو لادینیت کے حوالے کر دیں اور دوسری طرف ایک خانہ خدا پرستی اور مذہبیت کے لئے بھی مخصوص کر دیں' یا معاشی شعبے کو اخلاق سے آزاد کر دیں' اور اخلاقی شعبے کو معاشی تقاضوں سے بے نیاز رکھیں تو' زندگی میں ایسا داخلی تصادم پیدا ہو جائے گا جس کے نتیجے میں نہ ایک پہلو اپنے نقشے پر ٹھیک ٹھیک کام کر سکے گا نہ دوسرا پہلو صحیح سالم قائم رہے گا۔ بلکہ الٹا دماغوں میں متضاد افکار اور متضاد سوالات کے دنگل قائم ہو جائیں گے۔

پس کسی بھی صحت مند نظام تعلیم میں ایک طرف معاشی اور اخلاقی علوم کو واحد مرکز کے گرد اصول و مقصد کے تحت آپس میں ہم آہنگ ہونا چاہئے اور دوسری طرف ان دونوں دائروں میں شامل کردہ چھانٹے پرکھے ہوئے تجربات و معلومات کو بھی تضاد سے پاک ہونا

چاہئے۔ صرف اس صورت میں زیر تعلیم نسلوں کو بے ربطی افکار اور پراگندگی کردار سے بچا کر واحد فکر و عمل کی ضروری صفت سے آراستہ کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ وحدت فکر و عمل کے بغیر شخصیت و کردار کی شیرازہ بندی ممکن نہیں۔ پورے نظام تہذیب یا نظام حیات کی طرح نظام تعلیم کو بھی ایک سرسبز و شاداب درخت کی طرح مربوط اکائی ہونا چاہئے۔ جس کی چاہے کتنی ہی شاخیں اور برگ و بار ہوں' مگر ان سب کو ایک تنا اکٹھا کرنے والا اور ایک مخصوص ہیئت دینے والا ہو۔ تمام علوم اور تمام نصابات اور نصابی کتب طالب علم کو ایک ہی رخ پر لے جانے والے ہوں' نہ یہ کہ مذہب اس کا ایک ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچے' فلسفہ دوسرا ہاتھ پکڑ کر دوسری طرف اور سائنس اس کی ٹانگ کو گرفت میں لے کر تیسری طرف گھسیٹے۔ صحیح یہ ہے کہ پورا نظام تعلیم پورے انسان کو کسی ایک ہی راستہ پر کسی ایک ہی منزل تک لے جانے والا ہو۔

یہاں پہنچ کر تعلیم کی ماہیت کا تعین کرنے کے لئے ایک اور پہلو ہمارے سامنے نمایاں ہو گیا۔ یہ کہ تعلیم کا کام اگلی پچھلی نسلوں کے معاشی و اخلاقی تجربات و معلومات کو جمع کرنا بھی ہے' ان کو چھانٹنا پرکھنا بھی ہے اور ان کو کسی نہ کسی حکمت کی روشنی میں بعض اصول و مقاصد کے ذریعے ہم آہنگ کرنا بھی ہے۔ یہی وہ تصور ہے جس سے تعلیم کا تہذیبی نظریہ تشکیل پاتا ہے۔

تعلیمی وحدت کی اساس

چلتے چلتے اب ہم انتہائی فیصلہ کن مسئلے تک آ گئے۔

آخر وہ اساس کیا ہے جو اجزائے تعلیم میں وحدت پیدا کرنے کا ذریعہ ہو سکتی ہے وہ سامان وابستگی اور وسیلۂ ہم آہنگی کیا ہو جو تعلیم کے معاشی پہلو اور اخلاقی پہلو میں کسی طرح کا تضاد و افتراق نہ پیدا ہونے دے!

اس سوال پر مختلف انداز سے بحثیں اٹھائی جا سکتی ہیں اور مختلف جواب سامنے آ سکتے ہیں مگر ہم دلائل بحثوں کی وادیوں میں گھومے بغیر مثبت انداز سے اسلامی نقطۂ نظر کی طرف قدم بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسلام کا عقیدہ توحید جس کا ایک سرا وحدت الٰہ اور دوسرا سرا وحدت آدم ہے' اسے جب ہم طبعیات اور انسانیات پر منطبق کر کے اس کے منطقی نتائج تک پہنچتے ہیں تو ہمیں وحدت نظام کائنات' وحدت حیات' وحدت تاریخ اور وحدت شخصیت کا شعور حاصل ہوتا ہے۔

اسلام کے عقیدہ توحید کی روشنی میں پوری انسانی زندگی ایک ناقابل تقسیم اکائی ہے' نہ کہ رنگا رنگ پارچوں کی پیوند کاری سے بنی ہوئی گدڑی۔ انسانی فرد کی شخصیت اور معاشرے کی اجتماعیت کے شعور واحد کے ساتھ جب ہم پیش نظر مسئلے پر غور کرتے ہیں تو اس نتیجے تک پہنچے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا کہ زندگی کی اساسیات اور اس کے حقائق عظیم کے متعلق ایک ایسی جامع بنیادی حکمت کے ہم محتاج ہیں جو ٹھوس معتقدات اور مقاصد کو متعین کر کے ہمارے تجربات و معلومات کی شیرازہ بندی کر سکے۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ تعلیم کا سرمایہ محض متفرق قسم کی طبعی' معاشی' اخلاقی اور سماجی معلومات ہی نہیں' بلکہ وہ معتقدات و مقاصد بھی ہیں جن سے اساسی حکمتِ حیات ترکیب پاتی ہے۔ مادی و معاشی علوم' اخلاقی و سماجی علوم اور ان کو ہم آہنگ کرنے والی اساسی حکمت' یہ تینوں عناصر مل کر تہذیبی نظریے پر استوار ہونے والے نظام تعلیم کی تشکیل کرتے ہیں۔

لاگ لپیٹ اور کسی ہچکچاہٹ کے بغیر مجھے یہ کہنا ہے کہ ایک ایسی جامع اساس حکمت جو کائنات کی صحیح توجیہ بھی کر سکے' انسانی زندگی کو معنی و مقصد بھی دے سکے' تاریخی مد و جذر میں کارفرما قوانین کی نشاندہی بھی کر سکے' انسانیت کو وحدت فکر و عمل سے بھی مالا مال کر سکے' صرف اسلام ہی کی بارگاہ سے مل سکتی ہے۔ اسلام اس لحاظ سے حد درجہ جامع' مکمل اور اطمینان بخش ہے کہ وہ ایک ہی اساس حکمت پر مبنی' اور اس کے ذریعے مربوط شدہ' معاشی' اخلاقی' سماجی اور تہذیبی حقائق کا مرتب مجموعہ فراہم کرتا ہے۔ وہ معتقدات دیتا ہے' مقاصد دیتا ہے' نقطۂ نظر دیتا ہے' خیر و شر کا پیمانہ دیتا ہے' ہر شعبہ حیات کے لئے اصول دیتا ہے اور ہر میدان عمل کے لئے حدود معین کرتا ہے۔ اسلام کی اساسی حکمت کے اجزا میں نہ کوئی تضاد پایا جاتا ہے' نہ تصادم۔ بنا بریں اسلام کی اساسی حکمت ہی عملی زندگی میں بھی اور نظام تعلیم میں بھی وحدت و ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے بہترین ذریعہ ہے۔

ہم چیلنج کر کے کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں اور کہیں بھی مرکزی حقیقت کا ایسا تصور نہ ملے گا جس پر چار فلسفی بھی جمع ہو سکیں اور پچاس سال تک بھی اسے بطور حقیقت قطعیہ کے لیا جا سکے۔ ایسا تصور جو کائنات کے وجود اور نظام کی توجیہہ کر سکے' انسانیت کے مقام اور مرتبے کا شعور دلا سکے' فرد اور اجتماعیت کو مربوط کر سکے۔ دین اور دنیا کو ایک ہی کلیے کے تحت جمع کر سکے' انسان کو کائناتی جبریت' جبلی جبریت' تاریخی جبریت' نفسیاتی جبریت اور اخلاقی جبریت کی جدید علمی

زنجیروں سے آزاد کرا کے صاحب خودی' صاحب ارادہ اور صاحب ایمان' خلیفۃ اللہ کا مقام دلا سکے۔ جدید علم نے تو جبریت در جبریت کے تصورات کے زور سے اسے ایک حقیر تنکا بنا دیا ہے کہ کبھی وہ ہواؤں کے ساتھ اُڑے یا بگولوں کے ساتھ گھومے اور کبھی زمین پر پڑا ہوا پامال ہوتا رہے اور پھر اسے جگہ دی بھی جائے تو حیوانی برادری میں دی جائے کہ بن مانس تمہارا باپ تھا اور بندر تمہارے چچا زاد ہیں' کوئی اور ماموں ہے' وغیرہ۔ ہمارے نزدیک یہ پورا فلسفہ و نظریہ جس پر موجودہ تہذیبی تصور کھڑا ہے اور جس کے مطابق نظام تعلیم بنتے ہیں' اتنا گھٹیا' اتنا گندہ اور اتنا پر تضاد ہے کہ اس کے کل کے کل کو مسترد کر کے ہمیں اپنے تصور کائنات' اپنے مرتبہ انسانیت اور اپنے اصول اجتماعیت کے تحت نئے عقیدوں اور مقاصد کے ساتھ مقابلے کے میدان میں آنا چاہئے۔

اسلامی نظام حیات

معاشی و اخلاقی تجربات کو جب اسلام کے اساسی معتقدات و مقاصد پر استوار کیا جاتا ہے تو اس سے ایک خاص طرح کا نظام حیات نمودار ہوتا ہے۔ ایک امتیازی نوعیت کی تہذیب تشکیل پاتی ہے' خاص وضع کے تمدنی رابطے اور ادارے نشوونما پاتے ہیں۔ اور معتقدات' تہذیبی وتمدنی تجربات اور معلومات کے اس تہذیبی سانچے میں ایک خاص ہیئت و کردار کا انسان ڈھلتا ہے۔

بلکہ عمومی حیثیت سے دنیا کے ہر معاشرے کے اقنوم ثلاثہ یہی ہوتے ہیں (چاہے اساسی معتقدات و مقاصد غلط ہوں یا درست) اور انہی سے اس کا وہ تعلیمی سانچہ بنتا ہے جو اس کی ضرورت کے انسان تیار کرتا ہے۔

پس تعلیم فی الحقیقت کسی مکمل تہذیبی نظام کو دوسری نسلوں تک منتقل کرنے کا وسیع عمل ہے۔ جس میں یہ اہتمام کیا جاتا ہے کہ آئندہ نسلیں اپنے امتیازی تہذیبی وجود کو سمجھیں اسے اپنائیں' اس کے سانچے میں افکار و کردار کو ڈھالیں' اس کی حفاظت کریں' اور اسے ایسے نہج پر نشوونما دیں کہ ان کے تہذیبی وجود کے امتیازات پوری طرح محفوظ برقرار رہیں۔ محض ترقی ہی نہ کی جائے بلکہ ایسے طریق سے کی جائے کہ وہ انسانی ترقی ہو اور انسان انسان ہی رہیں' گھوڑے' گدھے یا بیل نہ بن جائیں۔ ہم اس ترقی کے فریب پر بجز پاگل پن کے کس طرح

راضی رہ سکتے ہیں کہ ترقی تو ہو جائے لیکن اس قیمت پر کہ ہم انسان کے بجائے اژدھا یا گدھ یا بگلا بن جائیں۔

ہمیں متعین طور پر معلوم ہونا چاہئے کہ انسان کی انسانیت کے علامات و خواص کیا ہیں جن کو کسی حال میں نہیں بدلنا چاہئے۔ وہ کیا چیزیں ہیں جو انسانیت کی نقیض ہیں۔ یہ ترقی اگر معاملے کو الٹ پلٹ دے تو یہ اجتماعی تشکیل کے رواجی اصطلاحی نام کے مطابق تہذیب ہی رہے گی مگر وہ تہذیب نہیں ہو گی بلکہ تہذیب کی بھٹکی ہوئی بدروح چڑیل ہو گی۔ تہذیب اسی طرح کا پاکیزہ اور محترم لفظ ہے جیسے لفظ انسان۔ نیز تعلیم جس تہذیبی نظام کو آگے منتقل کرتی ہے اسی کے سانچے میں اس کو چلانے اور نشوونما دینے والے انسانوں کو ڈھالتی ہے۔

ایک مخصوص تہذیبی نظام کو اگلی نسلوں کی طرف اس انداز سے منتقل کرنا کہ وہ اسے ایک برتر نظام کی حیثیت میں اپنائیں اور اپنے خیالات اور کردار کو اس کے سانچے میں ڈھال کر اس کی حفاظت اور ترقی کے ذمہ دار بنیں' یہ ہے جامع مفہوم میں غایت تعلیم۔

اب سوال یہ ہے کہ معاشی دریافتوں اور اخلاقی رویوں اور اجتماعی رابطوں یا سائنسی علوم اور انسانیات کے ماحصل کو مربوط کر کے اپنے مخصوص تہذیبی نظام کا سروسامان کرنے کے لئے اساسی حکمت حیات اسلام نے کیا دی ہے؟

اسلام کی اساسی حکمت حیات پر گفتگو کا سفر شروع کرنے سے پہلے ذرا ہمیں راستے کی رکاوٹیں دور کرنے کے لئے انسانی علم پر ایک ناقدانہ نظر ڈالنی ہو گی۔

زندگی کے عظیم تر حقائق (جن کو کلیتہً نظر انداز کر کے عمل کا ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا جا سکتا ہے) کا حال یہ ہے کہ ان کا بہت چھوٹا سا حصہ انسان کے حسی و عقلی علم کی حدود میں واقع ہے' بقیہ بہت بڑا حصہ دائرہ غیب میں ہے' جہاں عقل انسانی کا براہ راست گزر نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے پانی میں تیرتے ہوئے تودہ ہائے برف کا دسواں حصہ سطح سے اوپر ہوتا ہے' بقیہ زیر سطح۔ خدا کی ہستی' اس کی صفات' اس کے اقتدار اور اس کے حقوق یا نظام تقدیر و مشیت اور تاریخ کے پس منظر میں کام کرتے ہوئے پیچیدہ رموز میں یا عالم آخرت کے اثبات اور اس کے تفصیلی حقائق یا سلسلہ نبوت و الہام کے متعلق محض چند دھندلی جھلکیاں اور مبہم اشارات اور انعکاسات حسی و قیاسی علم کے پردے پر دکھائی دیتے ہیں اور ان کی مدد سے ان حقائق کے مخفی پہلوؤں کا کسی قدر اندازہ عقل کر سکتی ہے۔

مگر عقل انسانی بھی عجب مشکل میں ہے اس کی دسترس میں مادی کائنات کا جو عالم شہود آیا ہے' اس کے مختلف دائروں میں صدہا اسرار کو سمجھنے کے لئے وہ ایک طرف سائنس سے مدد لیتی ہے' دوسری طرف فلسفے سے۔ سائنس ایک اتھاہ صحرا میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا مسافر ہے جو حقیقت کی ایک گرہ کھولتا ہے تو فوراً دوسری سامنے آ جاتی ہے مگر ڈور کا سرا کبھی بھی دکھائی نہیں دے پاتا۔ دوسرے اس کا دائرہ عمل صرف جہان مادہ ہے اور اس کی اشکال اور اس کے عناصر کی تراکیب اور اشیاء کی صفات و عمال کی دریافت تک محدود ہے۔ اس کی ساخت ہی مادیت تک محدود ہے۔ جیسے ہمارے کان الٹرا ساؤنڈ ویوز کو نہیں سن سکتے۔ اسی طرح ہمارا وژن (Vision) محدود ہے۔ طریقہ ایک تو یہ ہے کہ سرے سے اپنی قوتوں کی زد سے ماورا کسی چیز کا قطعی انکار کر دیا جائے یا مختلف طریقوں سے سعی و دریافت کو جاری رکھیں۔ مغربی عقل پرستوں نے محدود عقلیت کی زد سے باہر کے حقائق کا اندھا دھند انکار کر دیا۔

سائنس عظیم اساسی حقائق کے متعلق جب انسان کو کسی فیصلے پر پہنچائے بغیر چھوڑ دیتی ہے۔ بلکہ یہ کہہ کر الگ ہو جاتی ہے کہ مادے کی حدود سے آگے بڑھنا میرا منصب نہیں ہے تو پھر فلسفہ انسان کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ فلسفہ سائنس ہی کی فراہم کردہ محدود مادی معلومات کو اپنی لیبارٹری میں لے جا کر تھوڑے سے ریاضیاتی اور زیادہ تر قیاسی استدلال سے کام لے کر کچھ نتائج اخذ کر کے دیتا ہے' اور یہ نتائج جب مختلف فراست خانوں میں بحث و جدل کی خراد پر چڑھائے جاتے ہیں تو نہایت متضاد تصورات نمودار ہوتے ہیں جو انسان کو اور بھی زیادہ چکر میں ڈال دیتے ہیں۔ پھر فلسفے میں بھی سائنس والی کمزوری موجود ہے۔ وہ بھی اپنے آپ کو تلاش حقیقت کے لئے بھٹک بھٹک کر اور ٹھوکریں کھا کر چلنے والا مسافر قرار دیتا ہے۔ بلکہ تاریخ فلسفہ پر نگاہ ڈالیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ انسان ایک طفلک نادان کی طرح مختلف چیزوں پر ہاتھ ڈالتا ہے اور جس پر توجہ مرتکز ہو جاتی ہے اسی کو عین مطلوب قرار دے لیتا ہے۔ پھر اس سے اکتا کر اسے پھینک دیتا ہے اور کوئی دوسری چیز اٹھا لیتا ہے۔

فلسفے کی پوری تاریخ کا ماحصل یہ ہے کہ وہ صحرائے تجسس میں چشمۂ حقیقت تک پہنچنے کی خواہش کے ساتھ بار بار کسی سراب کی چمک دمک کی طرف لپکتا ہے۔ پھر جب تھک تھکا کر ہانپتا ہوا اس تک پہنچتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اتنے عرصے تک جسے چشمۂ حقیقت سمجھا تھا وہ تو سراب نکلا۔ اب یہ تشنگی زدہ مسافر چاروں طرف نظر دوڑا کر ایک بار پھر کوشش کرنے کے لئے

تیار ہو جاتا ہے اور پھر کسی نئے سراب کی چمک دمک اسے کھینچ لیتی ہے۔ فلسفہ ایک سراب سے دوسرے سراب تک مسافر عقل کی دوڑ دھوپ کی داستان درد کے سوا کچھ نہیں۔

بہر حال سائنس اور فلسفہ دونوں مل کر حیات و کائنات کی اساسی حقیقت کے متعلق لا ادری' کی ایک منزل سے لا ادری ہی کی دوسری منزل تک سفر کرتے ہوئے انسان کو صرف ظنیات فراہم کرتے ہیں۔ وہ انسانی عقل کو مجبوری و بے چارگی کا احساس دلا کر اس پر آمادہ کرتے ہیں کہ کسی غیر یقینی قیاسی امر کو عارضی طور پر حقیقت فرض کر لے اور اسی سے علم کے اساسی خلاء کو پر کرے۔ پھر جب معاملہ ذرا آگے بڑھ کر کسی نئے غیر یقینی قیاسی امر تک پہنچتا ہے تو عقل اس پر تیار ہو جاتی ہے کہ اب ایک نئے مفروضے سے حقیقت کا کام لے۔

یعنی تمام غیر اسلامی نظام ہائے علم و فکر میں اساسی حقائق کے علم و شعور اور معتقدات و مقاصد کے ایمان کی جگہ مفروضات و ظنیات رکھ کر خلاء پر کر لیا جاتا ہے۔ اور انسان کو اس غیر عقلی مسلک کے اختیار کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے کہ وہ مفروضات اور ظنیات ہی کو ٹھوس حقائق قرار دے کر کام چلائے۔[1]

اس طرح سے غیر اسلامی نظام ہائے افکار و علوم اور ان کے مزاج کے مطابق تعلیمی نظام ایک شرابی کی طرح بہکے بھٹکے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔

---

[1] ماہر نفسیات میگڈوگل [Mc Dougall] لکھتا ہے "انسانی فطرت کے متعلق ہماری عدم واقفیت نے آج تک تمام اجتماعی علوم کی نشو و نما کو روک رکھا ہے۔ یہ علوم ہمارے زمانے کی ایک ایسی ضرورت کا درجہ رکھتے ہیں جن کے لئے دنیا چلا رہی ہے' ان کے بغیر ہماری تہذیب زوال بلکہ فنا کے شدید خطرہ سے دو چار ہے' میرا ادعا یہ ہے کہ اپنی تہذیب کے ترازو کو برابر رکھنے کے لئے ہمیں انسان کی فطرت اور سوسائٹی کے متعلق اس سے بہت زیادہ علم (ایک منظم علم) کی ضرورت ہے جو ہمیں اس وقت حاصل ہے" (اسلامی تعلیم: چند نظریاتی مباحث)

ذاتی طور پر مجھے اندیشہ ہے کہ جس قسم کے علم کی ضرورت کا اظہار میگڈوگل نے کیا ہے۔ تو اس کا ایک آرزومندانہ تصور تو اسے ہے۔ مگر وہ نہیں جان سکا کہ ایسا علم کہاں سے اور کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی اسلامی علم کے امتیازی حقائق کا حوالہ دے تو صدیوں کے تعصبات کے پہاڑ سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں جن پر ہمارے ناقص عقلیات کی بخ دبیز تہ جمی رہتی ہے جو کبھی پگھلتی ہی نہیں۔ جو قومیں تعصبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہوں وہ تو خاص طور پر عقلی علم کی کسی نئی کونپل کو مرضی کے مطابق موڑ دیں گی۔ اور اس کی بہت سی عملی مثالیں موجود ہیں۔

بخلاف ان کے اسلام نے موجودہ سرمایہ علم میں عظیم اساسی حقائق کے خلا کو پر کرنے کے لئے' انسانی عقل کی نارسائی اور علم کی محدودیت کی تلافی الہامی علم کے ایک ایسے ذریعے سے کی ہے جو حقائق کے وسیع ترغیبی پہلوؤں کے متعلق واحد ذریعہ معلومات ہے۔

انسان کی حسی اور قیاسی علم کی کوتاہی کو پورا کرنے کے لئے الہامی علم کی مدد لئے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ غیر ممکن ہے کہ آپ وہ حقائق حاصل کئے بغیر زندگی کے کسی بھی معاملے میں کوئی قطعی حکم لگا سکیں یا کوئی دیرپا اصول یا مستقل اخلاقی قدریں وجود میں لا سکیں۔ اخلاقی قدریں یہ نہیں ہوتیں کہ کچھ وقت کے سیاسی و معاشی مفاد کے تحت آپ بعض امور طے کر لیں۔

ہم اپنی پچھلی بات کو یوں دوہراتے ہیں کہ ملحد یا مشرک قوموں کے بخلاف' کائنات و حیات اور تاریخ انسانی کے متعلق ہمارا شعور پیغمبروں کے عطا کردہ علم وحی پر مبنی ہے جو حقائق کے وسیع ترغیبی پہلوؤں کے متعلق واحد ذریعہ معلومات ہے' جس کی صداقت کا بڑا ٹسٹ (Test) یہ ہے کہ مختلف زمانوں اور حالات میں آنے والے تمام انبیاء نے بنیادی حقیقتوں کا ایک ہی تصور دیا ہے۔ ان میں ریب (شک) بھی نہیں پایا جاتا اور ان میں اختلاف بھی نہیں پایا جاتا' پھر راستی اور امانت اور بے لوث تعلیم و تلقین کے لحاظ سے بھی' اور انسانیت کی بھلائی کے لئے قربانیاں دینے کے لحاظ سے بھی' جملہ انبیاء کی شخصیتیں ایسی درخشاں ہیں کہ ان کی بات پر ایمان لائے بغیر چارہ ہی نہیں رہتا۔ ان حضرات نے پوری بے لوثی سے انسانی تعلیم کا کام کیا' کسی نے کوئی معاوضہ نہیں لیا' کوئی نذر نیاز مقرر نہیں کی' رہن سہن اور کھانے پہناوے کے لحاظ سے فقرا و مساکین کے درجے پر زندگیاں گزاریں' محل نہیں بنائے' ٹھاٹھ باٹھ کے لباس اور عبائیں' قبائیں استعمال نہیں کیں' عہدے اور القاب اور سلامیاں اور طبقاتی علیحدگی یا معیار زندگی کی وجہ سے عوام سے دوری اختیار نہیں کی' خاندان والوں کے لئے کوئی خاص حقوق مقرر نہیں کرائے' نہ کبھی کبر و غرور کا انداز اختیار کیا۔ ان کی زندگی کی چادر پر کسی فسق و فجور کا داغ نہ تھا۔ پھر وہ ایک دوسرے کی تائید و ہمرنگی اور ہم خیالی کا دعویٰ کرتے تھے' کسی طرح کا اختلاف یا باہمی استخفاف نہیں تھا۔ پھر ایک خاص بات یہ کہ انہوں نے اپنے اعلان کردہ علم غیب' اس کے حقائق اور اس کے پیغام میں کبھی کوئی رد و بدل نہیں کیا' کسی فرد یا گروہ کی حمایت حاصل کرنے یا اس کی مخالفت اور ظالمانہ روش سے بچنے کے لئے کبھی لہجہ نہیں بدلا۔ اپنے پیغام

اور اپنی تعلیم کے مخالفین کی زیادتیوں کو صبر سے برداشت کیا۔ ان کے کام کو روکنے یا ان پر ایمان لانے والوں کو ہراساں کرنے کے لئے اگر ان سے زبردستی کی جنگ کی گئی تو انہوں نے منہ توڑ جواب دیا' مگر جنگ میں بھی اخلاقی اصولوں کو مضبوطی سے قائم کیا اور ان کی سختی سے پابندی کی۔ کسی مخالف نقطۂ نظر والے فرد یا گروہ سے "کچھ لو کچھ دو" کے محاورے کے مطابق کوئی ظاہری یا خفیہ سمجھوتہ نہیں کیا۔

غیبی علوم کے معلموں کے اس کردار کے مقابل میں اعلیٰ درجے کے عقل پرستوں' فلسفہ طرازوں اور ماہرین سائنس کے کسی ایک دور کے چار آدمیوں میں یہ اوصاف دکھا دو۔ اگر نہ دکھا سکو تو پھر شریف معقول انسانوں کی طرح مانو کہ علم وحی سے استفادہ کئے بغیر نہ کوئی آدمی شریف آدمی بن سکتا ہے نہ کوئی سچی تہذیب رونما ہو سکتی ہے۔

اتنا ہی نہیں جملہ کائنات کی حسی آیات و مظاہر اور تاریخ انسانی کے حوادث و واقعات ان کی تعلیمات کے فریم میں درست بیٹھتے ہیں۔ نیز کسی بھی دور میں ان کو تسلیم کرنے والے افراد کے کرداروں کی بلندی ان کی صداقت پر ایک عظیم شہادت ہے۔

اسلام نے ساری زندگی اور کائنات کو اپنے دائرے میں سمیٹ لینے والے اساسی حقائق کو واضح کر کے انسانی عقل کی نارسائی اور علم کی محدودیت کی تلافی الہامی علم کے ذریعے سے کی ہے۔ انسان کی حسی اور قیاسی علم کی کوتاہی کو پورا کرنے کے لئے الہامی علم کی مدد لئے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔

کیونکہ حسی علم اور قیاسی استدلال کے بعد عقل کے سامنے انسانی بہبود کے لئے نہایت ضروری علم کا جو بڑا دائرہ اس شکل میں سامنے آتا ہے کہ اس کی نگاہِ رسا اس کے اندر جا ہی نہیں سکتی اور وہ اس طرح بے بس ہو کر کھڑی ہو جاتی ہے جیسے کوئی شخص پیچھے سے دوڑتے دوڑتے آئے اور یکا یک سامنے سمندر آ جائے جسے پار کرنے کے لئے کشتی بھی نہ ہو۔ گویا عقل کے سامنے ایک بھاری چیلنج آ جاتا ہے جسے قبول کرنے میں اپنے آپ کو عاجز پا کر وہ شکست تسلیم کر لیتی ہے۔ یہ شکست خوردہ عقل پھر اس[1] منطق پر آ جاتی ہے کہ انسانی ذمہ داری وہیں تک ہے جہاں تک اس کی عقل کام کر سکے۔

---

[1] یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے ایک طفلک نادان جو اپنی پلنگڑی سے اتر نہ سکتا ہو وہ یہ ضابطہ بنا لے کہ موجودات ارضی کا دائرہ اس کی پلنگڑی تک محدود ہے۔ اس کے علاوہ کہیں کچھ ہونے کے ←

لہٰذا اگر علم کے فوق العقلی مراحل کچھ پائے جاتے بھی ہوں تو عدم استطاعت کی وجہ سے ہم ان کو دریافت نہیں کر سکتے۔ اندریں صورت ہمیں حیات و کائنات کا مفہوم' انسان کا مقام' فرد و اجتماع کا تعلق' اخلاق و قانون کا مفہوم' حقوق و فرائض کا تعین اپنے اسی تھوڑے سے علم کی بنا پر کرنا ہو گا جو حسی اور قیاسی ذرائع سے حاصل ہے۔ یعنی زندگی میں جہاں جہاں اصل حقیقت (جو فوق الاحساس اور فوق الحواس بھی ہو سکتی ہے) کی ضرورت پڑتی ہے' وہاں بھی ہم اپنے محدود حسی و قیاسی علم کو استعمال کر کے کام چلائیں گے۔ یعنی ہوائی جہاز کے لئے اگر اس کے اصل پہیے مہیا نہیں ہیں تو ہم سائیکل کے پہیے فٹ کر لیں گے۔؟

مختصر یہ کہ مغرب کی جدید تہذیب و فکر جس کی مرعوبیت میں ہم مرے جا رہے ہیں' وہ حد درجہ ناقص علم کی پٹڑی پر حیات انسانی کی گاڑی کو چلا رہی ہے۔

اس ناقص علم کی وجہ سے نظام تعلیم بھی اتنا ہی ناقص ہے اور اس کے تشکیل کردہ ذہن و کردار بھی اتنے ہی پست ہیں۔

الہامی علم کی قدر و قیمت

یہ ہم واضح کر چکے کہ حقیقت عظمیٰ اور اس کے ضروری پہلوؤں کا تعلق ایسے دوائر سے ہے جہاں عقل قدم نہیں رکھ سکتی ہے اور اس کے سامنے بے بسی کا ایک پردہ تنا ہوا ہے' مگر اس پردے سے بار بار انبیاء و رسل نے آ کر جو حتمی معلومات مہیا کی ہیں وہ ایسی خصوصیات رکھتی ہیں کہ خود عقل کے لئے[1] مکمل طور پر اطمینان بخش ہیں۔ مثلاً:

← شک میں پڑنے سے بہتر یہ ہے کہ سرے سے یہ اصول قطعی طے کر دیا جائے کہ پلنگڑی سے باہر کچھ ہو ہی نہیں سکتا یا جیسے کنوئیں کا مینڈک اس پر دلائل کے انبار لگا دے کہ کنویں کے باہر صرف عدم یا خلا ہے۔

[1] عقل حقیقت کو دو طرح سے سمجھتی اور قبول کرتی ہے۔ ایک یہ کہ کسی چیز یا امر کو خود اس نے دریافت کیا ہو یعنی تجربہ یا واضح مشاہدہ سے کسی جذباتی یا جانب دارانہ عنصر کی مداخلت کے بغیر اخذ کیا ہو' اور نفسیات انسانی' معاشرہ انسانی اور تاریخ انسانی کی شہادت اس پر حاصل ہو۔ عقل حقیقت کے کسی پہلو کو ایک اور طریق سے بھی سمجھتی ہے۔ وہ یہ کہ اس قدوم سے جو دائرہ غیب بالاتر ہے اس کے بارے میں اگر کسی معتمد و مستند غیبی حقائق بیان کرنے والے کسی داعی و معلم کے وسیلے سے ملنے والی معلومات کو عقل اپنے معقول و متداول معیارات کے لحاظ سے صحیح پائے یا انسانی حیات و فطرت' نظام ←

- الہامی علم کسی دائرے میں عقل کی حاصل کردہ ''حتمی'' معلومات سے نہیں ٹکراتا۔ (ظنی قسم کی خرافات مراد نہیں)
- الہامی علم سے کائنات' زندگی' وجود انسانی اور تاریخ کی ایسی صحیح ترین توجیہ سامنے آتی ہے کہ جو ان اشارات' آیات اور انعکاسات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے جن کو عقل حیرت سے دیکھ کر طرح طرح کی متضاد قیاس آرائیاں کرتی چلی آ رہی ہے۔
- الہامی علم مادی اور غیبی حقائق یا حسی اور غیر حسی صداقتوں کو ایک ہی تصویر کے ایسے دو رخ بنا کر ہمارے سامنے رکھتا ہے کہ ایک کے بغیر دوسرے کی تکمیل نہیں ہوتی۔
- الہامی علم انسان کے معاشی وجود اور اس کی اخلاقی ہستی کو ایک دوسرے کے ساتھ سازگار کر دیتا ہے۔
- الہامی علم بہ حیثیت ایک معیار اور کسوٹی کے ہمیں اپنے تجربات و معلومات کو صحیح طور پر پرکھنے کے قابل بناتا ہے۔
- الہامی علم کی فراہم کردہ اعتقادی اساس پر مرتب شدہ تجربات و معلومات کی روشنی میں جو نظام تہذیب و تمدن وجود میں آتا ہے وہ تاریخ میں ہمیشہ انسانیت کے لئے باعث عدل و رحمت ثابت ہوتا رہا ہے۔
- الہامی علم انسانوں میں بہترین نہج پر مختلف تمدنی و سماجی رابطے قائم کرتا اور زندگی کے مختلف ادارات کی نہایت اعلیٰ صورت میں تعمیر و تنظیم کرتا ہے۔
- الہامی علم اپنے سانچے میں ایسے انسان کامیابی سے ڈھالتا ہے جو فکری لحاظ سے صحت مند' عملی لحاظ سے حنیف اور یک رنگ ہوں' جو اپنے نظام تہذیب سے محبت کرتے ہوں' اس کے محافظ بن سکیں نہایت مضبوط اخلاقی پیکر ہوں اور تہذیب کو نشو و نما دینے میں اپنی پوری قوتیں صرف کر ڈالیں' بلکہ قربانیاں دیں۔

آخری بات یہ کہ خداوند کائنات کی بارگاہ سے پاک باز و بے لوث پیغمبروں کے ذریعے لائے ہوئے الہامی علم میں ایسا تقدس پایا جاتا ہے کہ چاہے قانون کا دائرہ ہو یا اخلاق

← کائنات' تاریخی نوامیس اور بین الاقوامی مسلمہ (ماضی سے حال تک) اخلاقی اقدار سے ہم آہنگ

- دیکھئے' نیز ان معلومات کے ذریعے معاشرت و تہذیب کے مسائل کا صحیح تجزیہ ہوتا ہو اور مختلف قضیوں کا اطمینان بخش حل نکلتا ہو' تو ان کو عقل تسلیم کرے۔ ایسے فوق العقلی ذریعہ علم کو علم وحی کہتے ہیں اور اس کے پیش کرنے والوں کو انبیاء و رسل۔ پس درحقیقت علم وحی بھی عقلی علم کی کمی کو پورا کرتا ہے۔

کا' عبادات کا ہو یا سیاست ومعیشت کا تمام اصول وحدود میں ایک خصوصی اہتمام پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے جھوٹ' بددیانتی اور ضمیر فروشی اور منافقت کے خطرات کے دروازے کسی بھی سچی مسلم سوسائٹی میں بند رہتے ہیں۔ حکمران اور عوام' امرا وغربا' زردار اور محنت کار' تاجر اور گاہک' جج اور ملزم' استاد اور شاگرد' والدین اور استاد اور شوہر اور بیوی کے درمیان تقارب اور توازن اور باہمی خیر خواہی کا نظام پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ سب کی مشترک فکر یہ ہوتی ہے کہ ہم ایک دین یا تہذیب کے مساوی المرتبہ مشعل بردار اور نقیب ہیں۔ ایک کسان یا ایک موچی یا ایک جولاہا یا کارخانے کا مزدور اور سرمایہ دار یہ ایمان رکھتے ہیں کہ ہم سب ایک ہی مشن کے فروغ کے لئے اپنے حصے کا کام کر رہے ہیں اور ہم سب ایک ہی فوج کے سپاہی اور آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ غیر اسلامی یا غیر الہامی نظریات واعتقاد' مساوات کے نام پر تصادم اور کشمکش پیدا کرتے ہیں مگر الہامی علم وحکمت سارے انسانوں کو محبت واخوت کی ایسی صف میں کھڑا کرتے ہیں جیسی نماز کی صف ہوتی ہے۔ لیکن انسانی عقلی علوم اور عقلی قوانین کا یہ حال ہے کہ پیرو کاروں کے نمائندے روز ہی انہیں بدلتے رہتے ہیں اور ہر بار ان کو ناقص اور غلط قرار دے کر ان کی درستی کی جاتی ہے جبکہ کچھ عرصہ بعد وہ پھر بدل دیئے جاتے ہیں ایسے خود ساختہ قوانین کے لئے احساس تقدس یا احترام نہیں پایا جا سکتا حالانکہ اسلام میں یہ حال ہے کہ مسلمان مرد وزن تنہائی میں بھی کسی جرم کا تصور نہیں کر سکتے' خوف خدا اور محاسبہ آخرت کا ایسا دباؤ ہر امر ونہی کے ساتھ لگا ہے کہ دانستہ تو کجا' سہواً یا اضطراری یا اجتہادی طور پر بھی غلطی کرنے والا احساس ہوتے ہی لرزتا ہے' رو رو کے خدا سے توبہ کرتا ہے۔ انسانوں کا کوئی مالی یا بدنی معاملہ بدلے کا ہو تو خود جا کر کہتا ہے کہ مجھ سے بدلہ لے لو۔ اس کے لئے حضورؐ نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ اور جس کے خلاف زیادتی ہوئی تھی اسے کہتے ہیں کہ مجھے مارو یا بدلہ لو۔ کیا انسانی ساخت کے بنتے ٹوٹتے بنتے نظریاتی اور قانونی کھلونوں کے یہ اثرات دکھائے جا سکتے ہیں۔

اظہار داشگاف

پھر کیوں نہ صاف صاف طریق سے اپنی بات بلند آہنگی سے کہی جائے کہ ملت اسلامیہ سے وابستہ لوگ کائنات وحیات کا خدا پرستانہ اعتقاد رکھتے ہیں' ہم تمام نظریات وافکار کی آخری کسوٹی علم وحی کو مانتے ہیں' ہم خدا کے رسولوں کے اسوہ کو انسانی کرداروں کے لئے

معیار سمجھتے ہیں' ہم حق و باطل اور خیر و شر کی ایک خاص تقسیم کے قائل ہیں' ہم پائیدار اخلاقی بنیادوں کے مطابق انسان مطلوب کا خاکہ سامنے رکھتے ہیں۔ ہماری نگاہ میں انسانی مراتب اور رابطوں اور باہمی حقوق و فرائض' جرائم وتعزیرات اور قوانین کا ایک متعین ومخصوص معاشرتی ڈھانچہ وقعت رکھتا ہے' ہم دولت و مساویانہ حقوق کی حفاظت کرنے کے ساتھ ساتھ گھر کے ادارے کو مستحکم رکھنے کے لئے خاتون خانہ کو گھر کی کارپرداز مینیجر اور مرد کو ادارے کی لیڈرشپ پر فائز کرتے ہیں۔ اسی طرح جنگ وصلح کی حدود' مجلسی آداب وشعائر' روایات و علامات اور مخصوص قسم کا ذوق جمال و زیبائی ہمارے تہذیبی سرمائے کے لازمی اجزا ہیں۔ ہمارے اساسی عقائد کے مطابق جو خدا پرستانہ تہذیب نمودار ہوتی ہے' اس میں ایک خاص نہج کی ہیئت اجتماعیہ جگہ پاسکتی ہے۔

اس تہذیبی نقشے کے مطابق حضور خاتم النبیین ﷺ نے ایک معیاری معاشرہ قائم کیا' ایک مکمل ریاست کی تشکیل کی اور اس کی ضروریات کے مطابق موزوں ترین تعلیمی عمل کا آغاز کیا۔ یہ سلسلہ حضور ﷺ کے بعد خلفائے راشدین کے دور میں بخوبی چلتا رہا' یہاں تک کہ یہودی مجوسی سازش نے آخری تین خلفاء کو یکے بعد دیگرے شہید کیا اور ابتدائی مسلم معاشرے کو فتنہ وتفرقہ سے بھر دیا۔ رہی سہی کسر حادثہ کربلا نے پوری کر دی۔ لیکن بہ ایں ہمہ بعد کے ادوار میں بھی جب سلطنت کا نقشہ بدل گیا۔ ملت کا نظامِ تعلیم علماء ومفکرین کے قبضے میں رہا اور انہوں نے سلطنت کو اس میں مداخلت کرنے سے باز رکھنے کے لئے بڑی قربانیاں دیں۔ ملت کے علماء ومفکرین کے ذریعے چلنے والے آزاد نظام تعلیم نے بنیادی تہذیبی شعور کو نسلاً بعد نسل منتقل کرنے کا حق ادا کر دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ یونانی افکار' عجمی تہذیب' تاتاری بربریت اور ہندی یوگیوں اور تیاگیوں کے تفلسف (Philosophization) کے مختلف حملوں کے باوجود ملت اسلامیہ میں ہر مرحلہ میں تجدیدی تحریکات اور احیائے اسلام کے جذبات ابھر کر کار فرما ہوئے۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ سرزمین برصغیر پر بھی تحریک مجددیؒ کے زیر اثر دور عالمگیر میں اسلامی نظام تہذیب وتعلیم بہت بڑی حد تک جلوہ گر ہوا۔ اور آج بھی ان مساعی کے اثرات آگے چل رہے ہیں۔

بعد ازاں فرائضی تحریک' عظیم الشان تحریک مجاہدین' اور پھر معرکہ ۱۸۵۷' پھر تحریک خلافت نے پچھلے سلسلہ سعی وجہد کو جاری رکھا۔ پچھلے کاموں کے اثرات کے تحت بعد میں وہی

موروثی جذبہ مگر کافی تعدی و اخلاقی اہتمام اور اسلامی نظام جماعت کے خطوط معینہ کی پابندی کئے بغیر ایک نئی سیاسی وجذباتی شکل میں ظہور پذیر ہوا اور ہندوؤں کے مستقل مخالف مسلم رویئے کے علاوہ کشمکش آزادی کے دور میں ان سیہ کاریوں اور اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوششوں اور انگریزی اقتدار جابرانہ سے تقرب کے مسلسل ادوار (خصوصاً تحریک آزادی کے زمانے میں) نے مسلمانوں کو سیکولر اسٹیٹ اور اس میں ہندو عظیم اکثریت کے تحت مستقل اقلیت بن کر ایک قوم کی شکل میں رہنے کو گوارا نہ کیا اور لادینیت کے خلاف اسلامیت (پاکستان کا مطلب کیا' لا الہ الا اللہ) اور ہندوؤں کے ساتھ قومیت واحدہ میں ایک فرقہ بن کر رہنے کے بجائے اپنے آپ کو جداگانہ مسلم قومیت قرار دیا اور اپنے لئے آزادی سے اپنے عقیدوں اور اوضاع و اطوار اسلامی سے اپنی حکومت چلانے کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا اور بالآخر ایک جداگانہ ریاست حاصل کر لی۔ ریاست کا جغرافی ڈھانچہ تو مل گیا اور قومیت اسلامی کی قبائے افتخار بھی۔ مگر اسلام غائب رہا اور آج تک ہماری اسلامی قلمرو پرچم ستارہ و ہلال اٹھائے ہوئے سیکولرازم کے جادۂ وفاداری پر چل رہی ہے۔ اس طرح متاع دین و دانش کے لٹنے کے اسباب کو یہاں بیان کرنا ہمیں بہت دور لے جائے گا مگر یہ بات بدیہی ہے کہ نظام تعلیم کو اسلامی سانچے میں ڈھالے بغیر کام نہ چلے گا۔

خلاصہ گفتگو یہ ہوا کہ اسلامی نظریہ علم کی رو سے صرف حسی مشاہدات' مادی تجربات اور قیاسی افکار کے مہیا کردہ ظنیات و مفروضات زندگی کے لئے ضامن صحت و ہدایت نہیں بن سکتے' بلکہ الہام ایک ایسا بالاتر ذریعہ علم ہے جو ہمارے حسی و قیاسی علم کی کوتاہیوں کی تلافی بھی کرتا ہے اور ہمارے تجربات و معلومات کو بہترین ربط و ترتیب دینے کے لئے یقینیات پر مشتمل اساس حکمت بھی فراہم کرتا ہے اور وہی ہمارے عقلی علوم کی ماہیت کے لئے بہترین کسوٹی بھی ہے۔

اسلامی نظام فکر و علم اور اسلامی نظام تعلیم مادی دنیا میں ہمارے معاشی اور سائنسی تجربات و معلومات اور سماجی رابطوں اور تمدنی اداروں کے متعلق رجحانات کو چھانٹنے' پرکھنے اور ترتیب دینے کے لئے الہامی علم کے مہیا کردہ اساسی معتقدات و مقاصد کی روشنی میں سامنے لاتا ہے۔

نظام تعلیم کا بنیادی فرض

اب جب کہ تعلیم کا مقصد چند معتقدات و مقاصد کی اساس پر مرتب شدہ تجربات و معلومات کو منتقل کرنے کا دوسرا نام ہے تو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم دراصل کسی مخصوص نظام تہذیب کو بطور میراث آئندہ نسلوں کے حوالے کرنے سے عبارت ہے۔

کوئی نظام تعلیم محض بے ربط افکار' محض متفرق معلومات اور محض بے جوڑ تجربات کا ذخیرہ نئی نسل کی طرف منتقل نہیں کرتا' بلکہ مختلف اجزاء وعناصر مل کر جس نظام تہذیب کو ترتیب دیتے ہیں' تعلیم اسی نظام تہذیب کی دی جاتی ہے۔

یہی ہر قوم اور ہر معاشرے میں (بلا استثنا) قدر مشترک ملے گی کہ وہ اپنے نظام تعلیم کے ذریعے اپنی اولادوں کو اپنے مخصوص نظریات حیات' اپنے مخصوص تصورات حقیقت' اپنی پسندیدہ اخلاقی اقدار' اپنی تاریخی روایات' اپنے امتیازی آداب وشعائر' اپنی خاص انداز کی تقسیم خیر وشر اور انسانی کرداروں میں تفریق خوب وزشت' اپنے قبول کردہ انسانی رابطوں کے خاص انداز' اور اپنے تمدنی اداروں کی جداگانہ حقیقت اوران کو چلانے کے خصوصی اسلوب کی نہ صرف ذہنی لحاظ سے تعلیم دے' بلکہ تمام امکانی طریقوں سے ان کی عملی تربیت دینے کا انتظام بھی کرے۔

تعلیم تہذیب کے وسیع تصور کے تحت تمام نصابی علوم اوران میں جمع کردہ معلومات کو اپنی اپنی جگہ ملنی چاہئے' مگر تمام علوم کی تعلیم میں غالب تصور اس خاص تہذیب کی تعلیم کو حاصل ہونا چاہئے جسے ایک معاشرہ لے کے چل رہا ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ باہر سے حاصل شدہ معلومات کو اپنی تہذیب کی ٹرے میں سجا کے طالب علم تک پہنچانا چاہئے۔

تعلیم کے اس تہذیبی تصور کو اگر سامنے رکھیں تو نظام تعلیم کا یہ فرض ہے کہ جس نظام تہذیب کے لئے کام کر رہا ہے اس کی برتری کا احساس نئی نسلوں میں پیدا کرے' ان میں اس کے لئے محبت واحترام کے جذبات اور ایثار کے داعیہ کو ابھارے۔ وہ انہیں اس کی پاسبانی کے لئے تیار کرے کہ کوئی دوسری تہذیب معاشرے پر علمی' تعلیمی' نصابی' ثقافتی یا سیاسی راستوں سے حملہ آور نہ ہو اور بیرونی تہذیبوں کے متضاد اجزاء کو اپنی تہذیب میں گھس کر جگہ نہ پکڑنے دے۔ کسی دوسرے نظام فکر وتہذیب کی مرعوبیت اور تقلید کے روگ سے اپنی نوخیز قوت کو بچانا

کسی بھی زندہ قوم کے نظام تعلیم کا ایک لازمی فریضہ ہے۔ مرعوبیت و تقلید کے بجائے ہمیشہ مزاحمت اور تنقید کی فعال قوت موجود ہونی چاہیئے۔

کہنے کا منشا یہ نہیں کہ اگر کوئی باطل نظام حیات اور کوئی فاسد نظام تہذیب پیچھے سے ہمارے ذہنوں پر لاد دیا گیا ہو تو ہم مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا کہہ کر اندھا دھند خود بھی اس کے لئے جان مارتے رہیں' اور اپنی اولادوں کو بھی اس کے حفظ و بقا کے لئے مر مٹنے کی دعوت دیں۔ یہ الگ بات ہے کہ عملاً دنیا میں ہوتا ایسا ہی ہے کہ باطل اور فاسد نظاموں کو جو قومیں لے کے چل رہی ہیں (کیونکہ وہ نظام حق تک نہیں پہنچ سکیں) وہ نادانی اور تن آسانی کی وجہ سے خود بھی اپنی قوتیں انہیں کے لئے خرچ کرتی ہیں اور اولادوں کو بھی انہی کی آبیاری کے لئے تیار کرتی ہیں۔ لیکن جس گروہ انسانی پر حقیقت عظمیٰ واضح ہو کر سچائی کی قدروں کو روشن کر دے اس میں بنیادی فکری و تہذیبی انقلاب آ جاتا ہے۔

ہم خوش قسمتی سے ایک ایسی قوم ہیں جس کو زندگی کی محکم ترین اساسی حکمت نصیب ہوئی ہم نہایت غیر متزلزل معتقدات و مقاصد سے بہرہ ور ہیں' اور ان کی بنیاد پر دنیا جہان کی عقول کے تجربی و قیاسی ماحصل کو بہترین صورت میں مرتب کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاس واضح حدود حلال و حرام ہیں' قطعی قسم کے پیمانہ ہائے خیر و شر ہیں' روشن اخلاق ہیں' محکم روایات ہیں' گویا نظامِ آداب و شعائر سے پورا سلسلہ روابط ہے' تمدن کے جملہ ادارات بہترین حقیقت کے ساتھ ہمیں میسر ہوئے ہیں' اور ہمارا یہ تہذیبی سانچہ جب بھی مکمل طور پر استعمال میں آیا ہے اس میں سے بہترین انسان ڈھل کر نکلے۔

ایسا نظام حق اپنے حصے میں رکھتے ہوئے ہم دوسروں کے شؤن و اطوار کو بچگانہ مرعوبیت سے کیوں دیکھیں جس سے کام لے کر بنی اسرائیل نے خاصی تربیت کے باوجود حضرت موسیٰؑ سے درخواست کی تھی کہ ہمارے لئے بھی ویسے ہی بت بنا دیجئے جیسے دوسروں کے ہاں ہم دیکھ رہے ہیں۔ بخلاف اس کے ہمارے اندر اپنے امتیازی تہذیبی وجود کے صحیح شعور کے ساتھ اس کے تحفظ کا جذبہ شدید موجود ہونا چاہئے اور بیرونی اثرات کے لئے ہمارے اندر اور ہماری نسلوں کے اندر نہایت موثر قوت مزاحمت کارفرما ہونی چاہئے۔ دوسروں کی معلومات اور تجربات میں جتنا کچھ جز و صداقت ملے اسے اپنی اساسی حکمت کی کسوٹی پر پرکھ کر

۱؎ الاعراف ـــ ۱۳۸

ضرور اخذ کرنا چاہئے مگر اسے اپنے اندر ٹھیک اس انداز سے جذب کرنا چاہیے جیسے گلاب کا پودا کھاد کا رس تو جذب کرتا ہے لیکن ایک خوش رنگ پھول کی شکل اختیار کر کے نکہت پاش کرتا ہے۔ نہ یہ کہ شاخ کے اوپر جب کونپل پھوٹے تو کھاد کا ایک بدبودار غلولہ نمودار ہو جائے۔

تضاد کی دراڑیں

اسلامی تعلیم جب اسلامی تہذیب کی تعلیم قرار پائی تو لازم آتا ہے کہ انحطاط اور انحراف کے مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے جو کوڑا کباڑ ہم نے تاریخ کے لمبے سفر میں اپنے پشتارے میں جمع کر لیا ہے اسے اسلامی تہذیب سے متضاد قرار دے کر الگ کر دیں۔ یہ بھاری کام معاشرے کی عملی زندگی میں تو لمبی محنتوں کے بعد انجام پا سکتا ہے' لیکن سب سے پہلے ہم اپنے نظام تعلیم میں پورے زور سے شروع کر سکتے ہیں یعنی افکار یا کردار کی سطح پر ہماری تہذیب میں تضاد کی دراڑیں نہیں ہونی چاہئیں۔

ایسی ناسازگار اور ناخوشگوار آمیزشوں کے لئے اس وقت موقع پیدا ہوتا ہے جب اپنی بنیادی فکر' اپنے شعور اور اپنی تہذیب سے دوری پیدا ہو جاتی ہے' اور ہمارا تہذیبی استحکام باہر اثر انداز ہونے کے بجائے باہر سے اثرات بلاشعور قبول کرنے لگتا ہے۔ گویا کچھ چیزیں زبردستی داخل ہوتی ہیں۔ اس طرح قدروں اور روایتوں کے علاوہ بہت سی رسمیں نمودار ہو جاتی ہیں جن کے لئے کوئی دلیل یا منطق نہیں ہوتی۔ ایسے حالات اس وقت بھی ہوتے ہیں جب دولت و حکومت دنیا اور شان و شوکت ظاہری کا جادو ذہنوں پر سوار ہو' اور اس وقت بھی مواقع پیدا ہوتے ہیں جب غلامی اور نکبت و ادبار' بے وطنی اور مصیبت زدگی کا عالم طاری ہو۔

ہماری تہذیب چونکہ ایمانی و شعوری تہذیب ہے' اس لئے ایک تو وہ دوسرے گروہوں سے تہذیبی شعائر میں مشابہت کو اپنے لئے مہلک سمجھتی ہے' دوسرے بیرونی اثرات سے جو خود رو چیزیں پیدا ہونے لگتی ہیں ان کو اس طرح محسوس کرتی ہے جیسے آنکھ میں مٹی پڑ جائے یا بدن پر پھنسیاں نکل آئیں' سو ایسی ہر خلاف مزاج چیز کو وہ بدعت قرار دیتی ہے۔ تشبہ اور بدعت کی ممانعت خود اس تہذیب کے قافلہ سالار پیغمبرؐ نے فرمائی ہے۔ لہٰذا ہمیں جب بھی سنبھلنے کا موقع ملے تو اپنی تہذیب کو مکروہ آمیزشوں سے پاک کرنے کی فکر کرنی چاہئے۔

بدقسمتی سے اسلامی تعلیم کا صحیح اور جامع تہذیبی تصور عرصہ دراز سے گم ہے۔ نتیجہ یہ کہ

ہمارے ہاں جب کبھی اسلامی تہذیب کی بات چلی تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کچھ سوچا گیا کہ دینیات یا اسلامیات کا ایک پیریڈ ہونا چاہئے اور اس کے لئے درسگاہوں میں اساتذہ مقرر ہونے چاہئیں۔ اس کے معنی ہیں کہ آپ تعلیم تو کسی اور ہی نظام تہذیب کی دیتے ہوئے اس کے ساتھ معمولی سا اسلامی پیوند لگانا چاہتے ہیں۔ یہ پیوند کاری اس مقصد کے لئے بے کار ہے جو اسلامی تعلیم کے مطالبے میں پنہاں ہے۔ اس غلط تجربے کی ایک واضح علامت یہ ہے کہ سب سے کم وقیع پیریڈ اسلامیات کا ہوتا ہے اور سب سے کم مرتبہ معلم اسلامیات کو حاصل ہوتا ہے۔

ناگزیر ہے کہ آپ اسلام کو اساسی حکمت حیات کے طور پر نظام تعلیم میں ایسی اہم ترین جگہ دیں کہ تمام کے تمام نصابی علوم کو اسی حکمت حیات کے سانچے میں ڈھلنا پڑے اور تمام کے تمام اساتذہ اپنے اپنے نصابی دائرے میں تعلیم دیتے ہوئے اصلاً اسی حکمت حیات کے متعلم ہوں، اور چاہے وہ کسی بھی موضوع پر دنیا کی فراہم کردہ معلومات متعلمین کے سامنے رکھیں، انہیں ان کا ناقدانہ جائزہ لے کر اپنے تہذیبی تقاضوں اور اپنی اسلامی حکمت حیات کے تحت صحیح اجزا کو قبول اور غلط اجزاء کو مسترد کرنے کی تربیت دیں۔

تعلیم اور مذہب و ثقافت

ہمارے ہاں ثقافت' کلچر اور آرٹ کا بڑا چرچا ہے۔ ثقافتی سرگرمیاں بھی زور پر ہیں اور پھر علمی دائروں میں بھی اس موضوع کو خوب اچھالا جا رہا ہے ہم اسلامی آئیڈیالوجی کے تحت مسئلہ ثقافت کو خاص اہمیت کے ساتھ زیر غور لاتے ہیں۔ ہمارے دل میں بھی کہنے کی کچھ باتیں ہیں۔[1]

ثقافت (کلچر) کیا ہے؟

تہذیب' تمدن' ثقافت' کلچر وغیرہ اصطلاحات میں بڑا التباس معانی پایا جاتا ہے اور ان کو مختلف لوگوں نے مختلف وقتوں میں متعدد معنوں میں استعمال کیا ہے۔ لیکن آج کل ثقافت (کلچر) کا جو مفہوم متعین ہوتا جا رہا ہے اس کے دائرے میں اجتماعی زندگی کے وہ تمام خارجی مظاہر آتے ہیں جن میں کسی قوم کی تمدنی شخصیت اپنے آپ کو نمایاں کرتی ہے۔ ایک قوم کے اندر رائج رسوم' تقاریب' مجلسی آداب' عمارات کا طرز' لباس کا نقشہ' آرائش کے اسالیب' فرنیچر اور ظروف کی امتیازی ہیئتیں' کھیلوں اور تفریحات کا رنگ ڈھنگ' فنون لطیفہ کا خاص نہج اور ایسی ہی دوسری چیزیں مل جل کر اس قوم کی ثقافت کہلاتی ہیں۔ اس معنی میں ثقافت لازمی طور پر کسی قوم کے نظریات و معتقدات' اس کے اخلاقی رجحانات اور اس کے ذوقِ جمالیات کی آئینہ دار ہوتی ہے اور اس کی پوری تاریخ کا عکس اپنے اندر رکھتی ہے۔

ثقافت کے نشوونما میں جو قوت محرکہ بہت ہی مثبت حصہ ادا کرتی ہے وہ انسانی فطرت کا ایک نہایت براق جوہر ہے۔ اسے ''ذوق جمال'' کا عنوان دیا جاتا ہے۔ تخلیق وایجاد کی قوتوں کو اس جوہر سے بہت بڑی مدد حاصل رہتی ہے۔ اسی ذوق جمال کی مشعل ہاتھ میں لے کر تمدن وتہذیب کے قافلے مسرت واطمینان کی طلب میں محنت کی کٹھن وادیاں طے کرتے چلے

---

1 چراغِ راہ فروری ۱۹۵۷ء

آ رہے ہیں۔ یہ ذوق جمال ''ضرورت'' کو کسی ایک مقام پر رکنے نہیں دیتا بلکہ اس کا عجیب طلسماتی عمل ہے کہ منزل آگے ہی آگے بھاگتی چلی جا رہی ہے۔ مثلاً آج جو طرز تعمیر ہمیں بہت ہی مرغوب ہے' دس برس کے بعد طبیعتیں اس سے اچاٹ ہونے لگیں گی اور ذوق جمال اسے ایک نیا رنگ دے دے گا۔ آج جس لباس کو پہن کر ہم ذہنی تسکین پاتے ہیں کل وہی مذاق کا ہدف بن جائے گا اسی طرح آداب و رسوم' تفریحات اور فنون لطیفہ میں تغیر و تبدل جاری ہے۔ دراصل ذوق جمال کا مصرف یہ ہے کہ زندگی میں حسن' خوبی' آراستگی' دلچسپی اور نکھار پیدا ہو اور اس پہلو سے وہ ہر آن پیش قدمی کرتی رہے۔

لیکن کسی قوم کا ذوق جمال بہرحال اس کے نظریات و معتقدات' اس کے ضابطۂ حیات' اس کے اخلاقی رجحانات اور اس کی تاریخ سے بے نیاز' اور بے تعلق ہو کر کام نہیں کرتا بلکہ وہ اس کی اجتماعی شخصیت کے زیر اثر رہتا ہے۔ اگر کسی قوم کا ذوق جمال اس کی ملی شخصیت سے آزاد ہو تو سمجھنا چاہئے کہ اس کا شیرازہ درحقیقت درہم برہم ہو رہا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ آئندہ کیا شکل اختیار کرنے والی ہے۔ پس کسی قوم کے ثقافتی لباس میں ذوق جمال کا مظاہرہ بھی ناگزیر ہے۔ لیکن یہ ذوق جمال بھی اس کی ملی شخصیت کے بالکل مطابق ہونا چاہئے۔

ذوق جمال اپنا مکمل ترین مظاہرہ فنون لطیفہ کے پیرائے میں کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی قوم کے فنون لطیفہ اس کے افراد کے لئے ذوق جمال کی تربیت کا موثر ترین ذریعہ ہوتے ہیں اور فنون لطیفہ ثقافت کو آراستہ پیراستہ کرنے اور اس میں حسن اور نکھار پیدا کرنے میں بہت بڑا حصہ لیتے ہیں۔ چنانچہ ثقافت کا سب سے بڑا شعبہ یہی فنون لطیفہ قرار پاتے ہیں۔

ان ساری باتوں کو جمع کر لیا جائے تو پھر کہنا چاہئے کہ انسان کی ہر ہیئت اجتماعیہ کے لئے جس طرح یہ ضروری ہے کہ اس کا نظریہ و اعتقاد اپنا ہو' اس کا ضابطہ حیات اپنا ہو' اس کا اخلاقی مزاج اپنا ہو اور اس کا ذوق جمال اپنا ہو' اسی طرح یہ بھی ایک منطقی نتیجہ کے طور پر لازم ہے کہ اس کا ثقافتی لباس بھی بالکل اپنا ہو۔ وہ لباس اس کے اپنے ہی قامت پر تراشا گیا ہو' اس کے اپنے ہی ذہن کا ترجمان ہو' اس کے اپنے ہی ذوق کا آئینہ دار ہو اور اس کی اپنی ہی اخلاقی حدود کا پابند ہو' ورنہ لباس مستعار ایک مضحکہ بن کر رہ جائے گا۔ اگر ایک بچہ بڑے بوڑھوں کا فرغل پہن لے' اگر ایک مرد عورتوں کی طرح جمپر غرارہ زیب بدن کر لے۔ اگر ایک پولیس مین جوگیوں یا پادریوں کے روپ میں آئے' اگر ایک شریف آدمی غنڈوں اور شہدوں کا

سا پیرایہ اختیار کرے تو شخصیت اور لباس کا یہ بے جوڑ پن جس طرح مقام خندہ یا موقع ماتم ہو گا اسی طرح کسی قوم کا اپنی ملی شخصیت سے متضاد کوئی ثقافتی لباس پہن لینا کسی کے لئے ہنسی کا محرک ہوگا، کسی کے لئے رنج و غم کا!

ملت پاکستان کو سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اسے ثقافتی لباس کسی سے مستعار نہیں لینا ہے بلکہ اپنے ذہن، اپنے قد و قامت، اپنے اخلاقی مرتبے اور اپنے ذوق جمال کے مطابق خود قطع کرنا ہے۔

پاکستانی ثقافت کیا ہے؟*

پاکستانی ثقافت کا تعین کرنے سے پہلے خود اس سوال کا جواب مطلوب ہے کہ ''پاکستان کیا ہے؟''

پاکستان ایک زیر تعمیر ریاست اور ایک زیر تعمیر معاشرہ ہے۔ وہ ایک ہیئت مجہول سے ایک ہیت مطلوب کی طرف حرکت کے عالم میں ہے۔ اس لئے اس کی ثقافت بھی ایک زیر تدوین ثقافت ہے۔ دوسرے لفظوں میں پاکستانی ثقافت پردہ مستقبل میں ہے۔ اس کا ہم ایک ذہنی تصور رکھتے ہیں، لیکن عالم واقعہ میں وہ تعین کے سانچے میں ابھی نہیں ڈھلی۔ وہ ایک مرتبہ ہے کہ جس کے حصول کے لئے ہم نے چند برس ہوئے آغاز سفر کیا تھا اور ہنوز منزل اول میں ہیں۔ ایک تعمیر کا ہیولیٰ تو ہماری چشم تصور میں ہے لیکن ابھی تاریخ کی سرزمین پر اس کی اساس تک عملاً نہیں رکھی جا سکی۔

ثقافت کے اس عالم مطلوب سے اگر صرف نظر کر لیا جائے اور عالم واقعہ میں پوچھا جائے کہ اس وقت کی پاکستانی ثقافت کیا ہے تو سوال ہمیں ایک عجیب پریشان خیالی میں ڈال دیتا ہے۔ ہم لاجواب سے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جس قوم کا اپنا نظریہ حیات کہیں برسر عمل نہ ہو، جس کے ضابطہ حیات کا تذکرہ صرف کتاب آئین کے صفحات کی زینت ہو، جس کی اپنی کوئی قومی زبان نہ ہو، جس کا اپنا کوئی ملی لباس نہ ہو، جس کے تمدن میں اپنی امتیازی قدریں کہیں جلوہ گر نہ ہوں، جس کے ذوق جمال کے اظہار کا اپنا کوئی نہج نہ ہو، آخر اس کی ثقافت کیا ہو

---

* برکت علی ہال۔ لاہور میں منعقد مجلس مذاکرہ ''پاکستانی ثقافت کیا ہے'' میں پیش کردہ۔ مؤلف کے خیالات۔ ۱۹۵۷ء

گی۔؟

درحقیقت اس وقت ہم قومی حیثیت سے اپنے عالم باطن میں بری طرح الجھے ہوئے ہیں۔نظریہ کے معاملے میں الجھے ہوئے' ضابطہ حیات کے معاملہ میں الجھے ہوئے ہیں' ذوق جمال کے معاملہ میں بھی الجھے ہوئے ہیں ـــــ نتیجہ یہ کہ ثقافت کی بحث میں بھی الجھے ہوئے ہیں۔

ہمارے ہاں ثقافت کے دو متوازی دھارے بہ یک دم بہہ رہے ہیں۔ پاکستان میں دو کلچر پائے جاتے ہیں اور بدقسمتی سے ان میں کوئی بھی وہ پاکستانی کلچر نہیں ہے جس کے ہم طالب ہیں' یہاں طبقہ اعلیٰ کا کلچر جدا ہے اور طبقہ عوام کی ثقافت جدا' شہری تمدن کسی اور طرف چلا جا رہا ہے اور دیہی آبادی کی معاشرت کا طرز دوسرا ہے۔ کچھ یک بام و دو ہوا کا سا معاملہ ہے طبقہ اعلیٰ کی ثقافت لباس مستعار ہے اور طبقہ عوام کی ثقافت ایک ایسی قدیم' میلی اور بوسیدہ گدڑی ہے جس میں کہیں ٹاٹ کے ٹکڑے لگے ہیں اور کہیں مخمل کے پیوند بھی ہیں۔ مختلف مذاہب' معاشرتوں اور تمدنوں کے اچھے اور برے اثرات کی ایک عجیب کھچڑی سی ہے جو تاریخ کی دیگ میں پکی ہے اور اب چھینکے پر رکھی رکھی بس گئی ہے۔ اس عوامی ثقافت میں اسلام کے بہت سے قابل قدر آثار و نقوش باقی ہیں مگر وہ دوسرے اجنبی عناصر کے ساتھ گڈ مڈ ہو گئے ہیں۔ پھر یہ کہ اس عوامی ثقافت کی نشو و نما کئی قرنوں سے رکی پڑی ہے اور جمود نے اسے بوسیدہ کر دیا ہے۔ اب یہ ثقافت طبقہ اعلیٰ کی ثقافت مستعار کے حملے کی زد میں ہے اور اس میں اتنی سکت نہیں کہ یہ اس حملے کو روک سکے۔

پاکستانی ثقافت دراصل ایک بالکل ہی تیسری چیز ہے وہ کوئی ایسی چیز نہیں جو اتفاقاً از خود نمودار ہو جائے اور آٹومیٹک طریق سے پروان چڑھتی جائے بلکہ ہم اسے بالارادہ قائم کریں گے تو وہ قائم ہو گی اور پروان چڑھائیں گے تو وہ پروان چڑھے گی۔ اس کی فکری اساس ہمیں اپنے مرکزی چشمہ حیات ـــــ قرآن ـــــ سے ملے گی اور اس کی تعمیر کے لئے بہت سارا ضروری مسالہ ہمیں اپنی عظیم الشان تاریخ کے کونے کونے سے جمع کرنا ہو گا۔ جو جبرالٹر سے لے کر ہانگ کانگ تک اور سمرنا سے لے کر سماٹرا تک بکھرا ہوا ہے۔ بڑی چھانٹ پرکھ سے بہترین مسالہ اخذ کرنے کے بعد اسے دور حاضر کی ضرورتوں کے مطابق اور اپنے ماضی کے مقابلے میں آگے نکل جانے والے ذوق جمال کی مناسبت سے نئی ترتیب دینی ہو

گی۔نئی ترتیب دیتے ہوئے ہمیں آفاقی وسعت قلب ونظر کے ساتھ دنیا کی دوسری اقوام کے تجربات سے فائدہ اٹھانا ہوگا۔لیکن فائدہ اٹھانا ہوگا ـــــ نہ کہ نقالی!

ثقافت کے نشو ونما کے لئے تحدیدات

ثقافت من حیث المجموع' اور فنون لطیفہ بالا امتیاز' اور اس سے بڑھ کر ذوق جمال غیر معمولی اختصاص کے ساتھ ـــــ کیا زندگی کی آخری کار فرما طاقت ہے اور اس پر کوئی تحدیدات نہیں لگائی جاسکتیں یا وہ کسی دوسرے اہم تر عنصر کے تابع ہے اور بنابریں اس پر حدود وقیود عائد ہونی چاہئیں۔

اس سوال کا جواب درحقیقت اوپر کی بحث میں آ چکا ہے۔زندگی کی اصل کار فرما طاقت کسی قوم کی ''نظریاتی روح'' ہے جو ایک خاص طرح کے شعورِ حقیقت اور ایک خاص طرز کے اخلاقی تصورات پر مشتمل ہوتی ہے۔اجتماعی زندگی میں جو کچھ بھی پایا جاتا ہے وہ اسی روح کے تابع اور اسی کے تقاضوں میں محدود ہوتا ہے۔بنابریں ناگزیر ہے کہ ہماری ثقافت ہمارے معاشرے کی روح کے مطابق ہو اور اس کی مقرر کردہ حدوں کی پابندی کرتے ہوئے ارتقاء پذیر ہو۔

اور امر واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی ہر قوم کے اندر جس طرح قانون اور تعلیم اور معیشت کے لئے ضروری حد بندیاں پائی جاتی ہیں' ذوق جمال اور فنون لطیفہ اور مجموعی طور پر ثقافت کے لئے بھی تحدیدات موجود ہوتی ہیں۔یہ نہ ہوں تو وہی ہوتا ہے کہ:۔

''موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں!''

ثقافت کے بے تکے نشو ونما میں بڑے بھاری خطرات ومہالک کو کام کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ تاریخ میں ہمارے سامنے جتنی بھی تباہ شدہ قوموں کی عبرت ناک داستانیں موجود ہیں وہ سب کی سب ثقافتی لحاظ سے مروجہ اصطلاح کے مطابق معیاری حد تک ترقی یافتہ تھیں اور بیشتر کے ہاں ثقافت ہی کے چور دروازوں سے تباہی نے نقب لگائی تھی۔تفریح' لذتیت اور جمال پرستی کے راستے جس آسانی سے قوموں کی اجل اپنے لشکر تمدن کے قلعے میں داخل کر لیتی ہے ویسی آسانی اور کسی راستے میں نہیں پائی جاتی۔اس لئے ایک باشعور قوم کے لئے اشد ضروری ہے وہ ثقافت کے نشو ونما پر کڑی نظر رکھے اور اس کے صحیح جادۂ ارتقا کے ہر دو جانب مضبوط حدوں کے پتھر گاڑ دے۔ورنہ جونہی ذرا آنکھ چوکی پوری زندگی

فساد کا شکار ہوئی!

یہاں ہم چند خطرات و مہالک کا تذکرہ کرتے ہیں جن سے ثقافت کو بچانے کی ہر ممکن تدبیر اول روز سے بر سر عمل رہنی چاہئے۔ خصوصاً ایک قوم کے سربراہ کاروں کی ذمہ داری اس معاملہ میں درجہ اول کی ہے۔

۱) سب سے بڑا طوفان ہلاکت جو اقوام عالم کے نظام ثقافت میں اٹھتا رہا ہے اور جس کے ہاتھوں بڑی تباہیاں وارد ہوئی ہیں وہ جنسیت کا طوفان ہے۔ جنسیت کا طوفان اول اول فنون لطیفہ کے سرچشموں سے اٹھتا ہے۔ شعر و افسانہ اور رقص و موسیقی کی رنگینیوں کا جامہ اوڑھ کر قوموں کو کھا جانے والا یہ شیطان زندگی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ ادب میں فحاشی و عریانی روز افزوں رفتار سے نمودار ہونے لگتی ہے' تفریحات کے دائرے میں سخافت اور شہد پن بڑھتا ہے' معاشرت میں مخلوط مجلسی زندگی فروغ پاتی ہے' عوام میں بدنظری و بدقراری پھیلنے لگتی ہے' یہاں تک کہ ہر طرف بدکاری اور زنا کی وبا پھوٹ پڑتی ہے۔

حال ہی میں پروفیسر سارو کن کی ایک تازہ تصنیف کا اخباروں میں تعارف کرایا گیا ہے جس کا ماحصل بحث ہی یہ ہے کہ جدید مغربی تمدن ہر پہلو سے جنسی ہیجان کا شکار ہوتا جا رہا ہے اور آرٹ' کلچر اور ادب سب پر اس کے اثرات بدنمایاں ہیں۔ پروفیسر موصوف نے درحقیقت یہ انتباہ دینا چاہا ہے کہ اگر ثقافت کو اس فتنے سے بچانے کی کوئی تدبیر نہ کی گئی تو روم اور یونان کی تہذیبوں کی طرح موجودہ مغربی تہذیب بھی تباہی کا شکار ہو جائے گی۔

آج ہم خود اپنے تمدنی احوال کا مشاہدہ کر کے پروفیسر سارو کن کے اندیشے کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ مغربی ثقافت جس رفتار سے پھیل رہی ہے اسی رفتار سے بدنگاہی' آوارگی' عورتوں سے چھیڑ چھاڑ' زنا بالجبر اور اغوا کی وارداتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ پچھلے دنوں پے در پے واقع ہونے والے دردناک حوادث کا اخباروں میں چرچا رہا ہے وہ ہماری آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہیں۔ اس موقع پر اقبالؒ کا ایک شعر یاد آ گیا جسے ذرا سے تصرف کے ساتھ پڑھیے ؎

یہ تحفہ آیا ہے مغرب سے ایشیا کے لئے
مئے و قمار و ہجومِ زنانِ بازاری

پاکستان جو اسلامی تہذیب کا علم لے کے نمودار ہوا ہے، کاش کہ اس کے کارفرماؤں پر یہ حقیقت واضح ہوتی کہ اسلام نے ثقافت کو فتنہ جنسیت سے بچانے کا کڑا اہتمام کیا ہے۔ اس کی ایک اہم ترین تہذیبی قدر ''حیا'' ہے۔ یہی حیا جب عملی شکل اختیار کرتی ہے تو پردہ کا وہ نظام وجود میں آتا ہے جو مرد و عورت کو دو الگ الگ دائرہ ہائے عمل میں رکھتا ہے۔ یہ قدر ادب اور فنون لطیفہ میں فحاشی و عریانی کی روک تھام کا ذریعہ بن سکتی ہے اور یہی قدر تفریحات اور تقاریب میں ہمارے شرف و وقار کی پاسبانی کر سکتی ہے۔ یہ ایک روک ہے جو جنسیت کے طوفان کو امڈنے نہیں دیتی۔ پاکستانی ثقافت وہی ہو سکتی ہے جس میں دل و نظر کے لئے یہ روک موجود رہے۔

ب ثقافت کے دروازے سے داخل ہونے والا دوسرا خطرہ اسراف کا خطرہ ہے۔ یعنی ایک قوم اگر آرائش، تکلف و تصنع، تفریحات اور فنون لطیفہ میں انہماک بڑھا لیتی ہے تو اس کے ہاں دولت کے غیر تعمیری مصارف پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ ثقافتی سرگرمیاں قومی معیشت کی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانے لگتی ہیں۔ ثقافتی معیار کے اونچا ہو جانے پر جب افراد کی آمدنیاں کوتاہ ثابت ہوتی ہیں تو لوگ ناجائز طریقوں سے کمائی بڑھانے اور مصارف کو پورا کرنے پر اتر آتے ہیں۔ گویا اسراف آتا ہے تو خیانت کے شیطان کو بھی ساتھ لاتا ہے۔ خود ہمارا معاشرہ آج اسی شیطان کی تگ و تاز سے نالاں ہے اور کوئی راہ نجات نہیں مل رہی۔ اسی خطرے سے بچانے کے لئے اسلام نے ''لہو'' میں انہماک سے روکا ہے اور اسراف کو تمدنی جرم قرار دیا ہے۔

ج انسانی زندگی فرض اور خواہش کی ایک دوامی کش مکش پر مشتمل ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ افراد نے بھی اور اقوام نے بھی ہمیشہ بازی اس صورت میں ہری ہے جب کہ ''خواہش'' نے ان کو اپنے پنجوں میں دبوچ لیا ہے۔ بدقسمتی سے ثقافتی سرگرمیوں کو جب کبھی اپنی حدوں سے آگے نکلنے کا موقع ملا ہے تو انہوں نے خواہش کے ہاتھ مضبوط کر کے انسان کو ادائے فرض کے پہلو سے کمزور کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے ضرورت ہے کہ ثقافت کی کڑی نگرانی کی جائے کہ وہ انسان کو خواہشات میں مگن کر کے اسے اس کے بے حساب فرائض سے غافل نہ کر دے۔

اسی حقیقت کو دوسرے لفظوں میں یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ زندگی کی تعمیری اور تفریحی

سرگرمیوں میں صحیح تناسب ہونا چاہئے۔ یہ صحیح تناسب جوں ہی مٹا' معاشرہ تعیش میں پڑ جائے گا۔ مثلاً ہم اہل پاکستان کے سامنے تعمیری کام کی ذمہ داریوں کا میدان بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔ ہمیں سائنس' معیشت اور دفاع کے پہلوؤں سے ان تھک جذبے کے ساتھ برسوں کام کرنا ہوگا۔ تب ہم اس دور کے لحاظ سے زندگی اور آزادی کو برقرار رکھنے کے قابل ہوسکیں گے۔ ہمارے سامنے فرائض کا جو لمبا تسلسل رکھا ہے وہ تفریح اور لذتیت کی بہت ہی تھوڑی سی گنجائش دیتا ہے۔ ایک قوم ہے جس کے لال فاقوں مر رہے ہیں اور جو غلے جیسے ابتدائی مسئلہ کو حل نہیں کر پائی۔ جس کے ہزاروں افراد روز بیماریوں کی چڑیلوں کا لقمہ بن رہے ہیں اور وہ ان کی چارہ گری کا سامان نہیں کر سکتی۔ جس کی سرزمین کا ایک لازمی حصہ اغیار کے قبضہ میں ہے' اور جس کی سرحدیں محفوظ نہیں ہیں۔ جس کی کثیر آبادی جہالت کی تاریکی میں پڑی ہے' ایسی قوم میں مغربی ثقافت کے چونچلے اور ایک عیاشانہ زندگی کے ٹھاٹھ باٹھ ایک عبرت انگیز مذاق ہیں۔ اس قوم کے ایک طبقے کا اسی قوم کی دولت کے بل پر کلبوں میں بیٹھ کر شرابیں پینا اور جوا کھیلنا' بال روموں میں آرکسٹرا کی تانوں کے ساتھ ناچنا' اس کی بیگمات کا نت نئے فیشنوں کی نمائش کرتے پھرنا' اپنی آئندہ نسلوں کو موسیقی اور ایکٹنگ کی تعلیم دلانا ــــ اور اس ہنگامۂ تعیش کا نام ثقافت رکھنا بڑی ٹریجڈی ہے۔ بالکل وہی کیفیت کہ رہنا جھونپڑوں میں' خواب محلوں کے! بالکل وہی صورت کہ گھر میں بھونی بھانگ نہیں' ٹھاٹھ نوابوں کے سے!

ہمارے ہاں کے یہ تعیش جو ہماری تعمیری سرگرمیوں سے بہت آگے بڑھ گیا ہے ایک طرح کا ثقافتی چٹورپن ہے۔ مغرب کے شکر پارہ فروش ہمارے اس چٹورپن کو مختلف طریقوں سے بڑھا رہے ہیں اور بھولے بھالے بچوں کی طرح ہمیں شکر پاروں پر بہلا پھسلا کر ہمیں ہماری اصل متاع حیات سے محروم کر رہے ہیں۔

تعمیر اور تفریح میں جو عدم توازن ہماری موجودہ ثقافت میں پیدا ہوگیا ہے' اسے بروقت روکنے کی ضرورت ہے۔

۵ ثقافت کے راستے سے اقوام غیر کے ذہنی غلبہ کا خطرہ بھی نہایت آسانی سے وارد ہوتا ہے۔ چاہئے تو یہ کہ ثقافت ایک قوم کی اپنی ملی خودی کی پاسبان ہو۔ اور اس کے اندر بیرونی اثرات کو گھسنے کے کھلے راستے نہ ملیں۔ لیکن اگر ذرا بھی تغافل سے کام لیا جائے تو فکری اور سیاسی اور معاشی اثرات کے مقابلے میں ثقافتی اثرات زیادہ آسانی

سے اندر گھس آتے ہیں۔ یہ بیرونی اثرات آہستہ آہستہ سرے سے ذہن ہی کو بدل ڈالتے ہیں اور ضابطہ حیات اور نظریہ تک کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دنوں مغربی اقوام اپنے استیلاء کو باقی رکھنے کے لئے سب سے زیادہ زور اسی پر دے رہی ہیں کہ کسی طرح ایشیائی اور مسلم اقوام کے اندر ان کی ثقافت کے عساکر گھس جائیں اور اپنی مستقل جگہ پیدا کر لیں۔ پاکستان پر بھی یہ ثقافتی تاخت بڑے زوروں سے ہو رہی ہے اور اس پر بھاری رقمیں صرف کی جا رہی ہیں اور درجہ اول کے ماہرین کی خدمات سے استفادہ کیا جا رہا ہے۔ ہمارے گھر کے پاسبانوں کا حال یہ ہے کہ اس یورش سے ہمارا بچاؤ کرنے کے بجائے خود ہی بیرونی اثرات کے عساکر کے لئے رہنما اور آلہ کار بن کر کام کر رہے ہیں۔

اس وقت پوری کی پوری مغربی ثقافت بلا کسی ادنیٰ ترمیم کے ہمارے اوپر لادی جا رہی ہے۔ گویا ایک اجنبی لباس ہے جسے بغیر کسی قطع و برید کے ہمارے قامت پر سجایا جا رہا ہے۔ یہ لباس ہمارے ملی تشخص کا ترجمان نہیں بلکہ اس کے متضاد ہے۔ اسے کچھ مدت پہننے کے بعد ہمارے اندر وہی ذہن و کردار پیدا ہو جائے گا جس کی ترجمانی یہ ثقافتی لباس کرتا ہے' اور وہ پیدا ہو رہا ہے۔

اس ثقافتی خطرے کا استیصال کرنے کے لئے اسلام نے ہمیں دوسری قوموں کی نقالی سے روک دیا ہے مشہور حدیث من تشبه بقوم منهم کا اصل منشا یہی ہے کہ ایک قوم جب ثقافتی دائرے میں دوسری قوم کی نقالی پر اتر آتی ہے تو اس کی خودی' اس کا ذہن' کردار اور اس کی پوری ملی شخصیت چکنا چور ہو جاتی ہے اور بالکل دوسری شخصیت پیدا ہو جاتی ہے۔

پاکستان میں صحیح معنوں میں اسلامی ثقافت کو ظہور دینے کے لئے یہ کڑا اہتمام ہونا چاہئے کہ ہمارے اندر سے وہی کچھ ابھرے جس کا تقاضا ہماری ملی فطرت کرتی ہو اور باہر سے وہی کچھ لیا جائے جو اس کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو یا مطابقت اختیار کر سکے۔ کسی اجنبی ثقافت کو مصنوعی طور پر باہر سے ٹھونسنا سرے سے غلط ہے۔ قومی زندگی کا حال ایک پودے کا سا ہے جس کے نظریئے کی جڑ اگر سرسبز رہے اور جس کے ضابطہ حیات کا تنا اگر استوار رہے تو اس پر ازخود اس کی فطرت کے مطابق برگ و بار آنے لگتے ہیں۔ ہم اپنی ملی زندگی کے درخت کی جڑ کو سیراب کرنے کے بجائے اگر محض اس کی ٹہنیوں پر دوسرے درختوں کی پتیاں کونپلیں لا لا کر

باندھتے رہے تو نہ وہ پتیاں اور کونپلیں سرسبز رہ سکیں گی نہ وہ درخت ہی صلاحیت نمو سے بہرہ ور رہ سکے گا۔

ایک تحریکی' ایک انقلابی عمل کی ضرورت

ایک قوم جو زوال اور غلامی کے چکروں سے خستہ حال ہو کر نکلی ہو' از سر نو زندگی و قوت حاصل کرنے اور اپنی امتیازی ثقافت کو تعمیر کرنے کے لئے ایک تحریکی و انقلابی عمل کی محتاج ہے۔ اس کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ اپنے اس نظریہ و اعتقاد کے جام سے سرشار ہو کر اٹھے جس نے اسے ایک خاص قومی تشخص دیا ہے' اپنے سرمایۂ اقدار و روایات کو اپنی روح حیات افروز بنائے اور شعوری اور ارادی طور پر اپنی مخصوص تمدنی ہیئت کے احیاء کے لئے جانفشانیاں کرے۔ وہ اپنی ثقافت کو پہچانے اور اس کے جو اجزاء برقرار رہ گئے ہوں ان کی سختی سے حفاظت کرتے ہوئے ضائع شدہ اجزاء کو دوبارہ بحال کرے اور باہر سے کسی متضاد عنصر کو دخل انداز نہ ہونے دے۔ ہمارے اندر قومی سطح پر ایک نئی رو اٹھ جائے اور بچہ بچہ اس میں سرمست و بیخود ہو جائے کہ ہم ایک مسلم قوم ہیں اور فکر' نظام زندگی اور ذوق جمال کے لحاظ سے دوسری قوموں سے بالکل الگ ایک مستقل تشخص رکھتے ہیں۔ یہ انقلابی شعور اگر ایک رو کی طرح جاری و ساری نہ ہو جائے تو پاکستان کی ثقافت مطلوبہ کبھی نشوونما نہیں پا سکتی۔

اس تحریکی و انقلابی شعور کا اولین دائرہ عمل علم و فکر کا میدان ہے ہمیں علمی حیثیت سے اپنے اوپر یہ واضح کرنا ہے کہ اسلامی ثقافت کی فکری بنیادیں کیا ہیں پھر گہری نظر سے جائزہ لینا ہے کہ ہمارا تاریخی سرمایہ ثقافت کیا ہے اور اس میں سے کتنا حصہ قابل قدر ہے۔ جسے نامطلوب کوڑے سے الگ کر کے ساتھ لینا ہے۔ ماضی کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے حال پر بھی ناقدانہ نگاہ ڈال کر یہ دیکھنا ہے کہ آج ہمارے ثقافتی کباڑ خانے میں کیا کچھ بھرا پڑا ہے۔ اس میں ہمارا اپنا اور ہمارے مزاج کا اور ہماری ضرورت کا قیمتی مواد کتنا ہے اور اس گودام میں اپنوں اور پرایوں نے جو جو کچھ فضولیات لا لا کے زبردستی بھر دی ہیں' نیز زمانے کی ہوا کے جھونکوں نے خس و خاشاک کے جو ڈھیر لگا دیئے ہیں ان کی تطہیر کیسے ممکن ہے۔ ہمارے حرم ثقافت میں نہ جانے کس کس نے اپنی پسند کے کیا کیا اصنام لا کے نصب کر دیئے ہیں اور

اب جب کہ ہر صنم باطل کی پرستش اور پاسبانی ہو رہی ہے' اس حرم کو کیسے اپنی اصل حالت پر بحال کیا جا سکتا ہے۔ پھر علمی دائرے ہی میں یہ بحث بھی بڑے ٹھنڈے دل سے طے کرنی ہے کہ مغربی ثقافت سے ہمارا طرز معاملہ کیا ہونا چاہئے' کیا ہم اس کے سامنے مفتوح ہو کر پڑے رہیں اور سر تسلیم و رضا خم کر دیں اور اپنا قومی تشخص اس کی بھینٹ چڑھا دیں؟ یا ہم اپنی زندگی کے قلعے پر ملی غیرت و حمیت کو پاسبان بنا کے کھڑا کریں جو تنقید کی دور بینوں اور خورد بینوں سے ہر بیرونی فکر اور ثقافتی عنصر کا جائزہ لے اور کسی ایسے اثر کو اندر داخل نہ ہونے دے جو ہمارے قومی تشخص کے لئے تباہ کن ہو۔

ہمارے تحریکی اور انقلابی شعور کا دوسرا دائرہ عمل نظام تعلیم و تربیت ہے۔ اپنی ثقافت کے بارے میں ہم جو جو کچھ علمی حیثیت سے طے کرتے جائیں ان سارے فیصلوں کو ہمیں اپنے نظام تعلیم و تربیت میں سمو دینا چاہئے۔ انہی فیصلوں کے مطابق ہمیں اپنی موجودہ اور آئندہ نسلوں کے دل و دماغ' ان کے جمالیاتی ذوق اور ان کے ثقافتی مزاج کو ڈھالنا چاہئے۔

ہمارے مدرسوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں' ہمارے علمی و ادبی اداروں' ہمارے اخبارات اور ہمارے لٹریچر' ہماری فلموں اور ریڈیائی پروگراموں' ہماری مجالس اور رسوم' ہمارے محکمہ ہائے تعلقات عامہ اور سرکاری تقاریب' ہمارے دفاتر اور محکمہ جاتی مراکز' ہمارے نظام امداد باہمی اور دیہی ترقی کی رضا کارانہ تنظیموں اور ہماری سیاسی' مذہبی اور سوشل جماعتوں' غرضیکہ معاشرے کے مجموعی نظام تعلیم و تربیت کو اس مقصد کے لئے متحرک ہو جانا چاہئے کہ یہاں اسلامی اصولوں پر ہماری اپنی ہی ایک ثقافت پروان چڑھے گی اور جو جو کچھ اس اپنی ثقافت سے متصادم اور متغائر محسوس ہو گا اس کی یہاں کوئی جگہ نہ ہو گی۔ ہمیں باہر سے لوگوں کو بلوا کر اور اپنے سماجی وفود کو بھیج کر دنیا کے سامنے صرف اپنی اسلامی ثقافت کا مظاہرہ کرنا ہو گا اور کسی ثقافت مستعار کو اپنی طرف سے فخریہ پیش کرنے کی بے حمیتی کو کبھی دوہرانا نہیں ہو گا۔

لیکن اس تحریکی و انقلابی شعور کے ساتھ ایک نئے دور ثقافت کا افتتاح کرنے میں ہمارا مغرب زدہ طبقہ ملکی اقتدار کی مدد سے بری طرح حائل ہے اور وہ پورے نظام تعلیم و تربیت پر قابض ہو کر اسے دوسری ہی طرح استعمال کر رہا ہے۔ وہ اعلیٰ دماغوں کو خرید خرید کر اسلامی اصول ثقافت کو شکست دینے اور مغربی ثقافت کو غالب کرنے کے لئے علمی میدان میں بھی

ڈال رہا ہے۔ وہ ایسی ناپاک ثقافتی سرگرمیوں کا طوفان اٹھائے ہوئے ہے جن کے ذریعے تھوڑی ہی مدت میں اسلامی ثقافت کے بچے کھچے آثار ملیامیٹ ہو جائیں اور دلوں میں ان کے لئے جو تڑپ باقی رہ گئی ہے وہ بھی ختم ہو جائے۔

ایسے عالم میں پاکستان کی مطلوبہ اسلامی ثقافت کا احیاء بغیر سیاسی تغیر کے قطعاً ممکن نہیں۔ تحریکی و انقلابی شعور کے ساتھ ایک ایسے سیاسی تغیر کی ضرورت ہے جس کے نتیجے میں مغرب زدہ طبقے کا زور ٹوٹ جائے اور معاشرے کی باگ ڈور پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے۔ بس ہمارا ثقافتی احیاء درحقیقت سیاسی احیاء کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ جدوجہد علمی و فکری اور سیاسی و انتخابی میدان میں بیک دم جاری رہنی چاہیئے۔

یعنی جس ثقافتی انقلاب کی ہمیں ضرورت ہے وہ محض چند مجالس کے انعقاد چند اداریوں کی اشاعت اور چند خطبات کے نشر کے نتیجے میں نمودار ہونے کا نہیں! —— بلکہ اس کے لئے ایک ہمہ جہتی کش مکش کی ضرورت ہے جو ایک طرف نظریہ اسلامی کو ذہنوں میں راسخ کرے دوسری طرف ملک میں عملاً اسلامی ضابطہ و نظام کو برپا کرنے کی تگ و دو جاری رکھے اور تیسری طرف قوم کے اندر اسلامی ثقافتی شعور کو بیدار کر کے اسلامی اقدار و روایات کا تحفظ و احیاء کرے اور متضاد ثقافتی عناصر سے معاشرے کے پاک کرنے کی تدابیر بھی عمل میں لائے۔

ہمارا ثقافتی رخ [1]

سوال یہ ہے کہ آخر ہمارا ثقافتی رخ ہے کیا؟ اس مسئلہ پر ہم بار بار الجھتے کیوں ہیں؟ ہم اپنا راستہ پہچانتے کیوں نہیں؟ کیوں اپنی ماہیت ہم پر واضح نہیں ہو رہی؟

آیئے ذرا اس ثقافت کی گتھی کو سلجھائیں۔

بعض قومیں اتفاقی طور پر وجود میں آتی ہیں۔ ایک یا زیادہ نسلوں کے لوگ ایک خاص جغرافیائی ماحول میں اکٹھے ہو کر جب ایک مشترک تاریخ سے گزرتے ہیں تو وہ اتفاقی طور پر ایک قوم بن جاتے ہیں اور ان کی تہذیب و ثقافت بھی اتفاقی سلسلہ اثر و تاثر اور لین دین کے ایک غیر شعوری عمل سے بنتی ہے۔ وہ جیسی کچھ بھی بن جائے اور اس میں جو کچھ بھی تبدیلیاں حالات کے ساتھ ساتھ آتی رہیں سب کچھ اتفاقی ساخت کی قوموں کے ہاں مقبول ہے۔

---

[1] سیارہ۔ مارچ ۱۹۶۳ء

مگر ہم اس طرح کی اتفاقی قوم نہیں ہیں ہم ایک خاص تصور زندگی کو اپنا کر ایک خاص زاویہ نظر سے حقائق کا مطالعہ کرنے کی وجہ سے جمع ہوئے ہیں۔ ہمارا رشتہ فکری اور اعتقادی ہے۔ ہماری کچھ نظریاتی جڑیں ہیں۔ ہماری ایک تاریخ ہے۔ جو عظیم اور ناقابل فراموش واقعات سے بھری پڑی ہے۔ یہ تاریخ ہمارے اپنے اور بیرونی تصورات کے تصادم سے بنی ہے' اس میں مد و جزر آتے رہتے ہیں' اس کی موجوں کی کشاکش نے درخشاں شخصیتوں کے گہرہائے آبدار پالے ہیں۔ اس صدیوں لمبی تاریخ میں کچھ چیزوں سے ہم نے مسلسل محبت کی ہے اور کچھ چیزوں کو ہم نے متواتر نفرت و حقارت سے دیکھا ہے۔ ہماری ایک پسند و ناپسند ہے' غلط اور صحیح میں امتیاز کرنے کے لئے ہماری کچھ کسوٹیاں ہیں۔ قدروں کو جانچنے کے لئے ہمارے کچھ مستقل پیمانے ہیں۔ کرداروں کا وزن معین کرنے کے لئے ہمارے خاص ترازو اور باٹ ہیں اور ہمارے ہاں انسانی شخصیت کے حسن و قبح کے مخصوص تصورات ہیں جن کے تحت ہم بعض چیزوں سے محروم ہو کر بے چین ہو جاتے ہیں اور یہ بے چینی صدیوں تک ساتھ چلتی ہے اور اسی طرح بعض چیزوں میں مبتلا ہونے پر ہم شرمندگی و ندامت محسوس کرتے ہیں اور یہ احساس بھی سائے کی طرح ہمارے ساتھ ساتھ لگا رہتا ہے۔

پس ہم اس زندہ درخت کی طرح ہیں جس پر آپ باہر سے اگر ٹہنیاں اور پتے لا کر باندھ دیں تو وہ کبھی اس سے وابستہ ہو کر سرسبز نہیں ہو سکتے اور اس درخت کا سرمایہ بہار نہیں بن سکتے۔ اس درخت سے میل وہی چیز کھا سکتی ہے جو زمین میں جذب ہو کر اس کی جڑوں کی چھلنیوں سے چھن کر اس کے اندر سے ہوتی ہوئی اس کی کونپلوں میں نمودار ہو۔ لیکن بدقسمتی سے ایک خون ناآشنا طبقہ باہر ہی باہر سے ایک اجنبی اور ناسازگار ثقافت کو مصنوعی طریقوں سے اس درخت پر مڑھنا چاہتا ہے۔ اندر سے اس درخت کی فطرت اس خلاف فطرت عمل کو قبول کرنے سے ابا کرتی ہے۔ نتیجہ اضطراب ہے!

ثقافت جیسے مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے ایک خوفناک تضاد کا ازالہ کرنے کی ضرورت ہے۔ تضاد یہ ہے کہ لوگ ایک طرف ''اسلام' اسلام'' بھی پکارتے ہیں' دوسری طرف وہ ایسی چیزوں کو قومی زندگی میں پھیلانا چاہتے ہیں جو اسلام نہیں ہیں اور اسلام میں کھپنے کی نہیں ہیں۔ بس یہیں سے ثقافت کا مسئلہ الجھ جاتا ہے۔ بجائے اس کے کہ تضاد کی اس الجھن کو صاف کیا جائے مغرب زدہ عنصر اس روگ کو تعلیم گاہوں میں پھیلا دینا چاہتا ہے۔ حالانکہ تعلیمی ادارے

وہ ابتدائی مقام ہیں جہاں سے کسی اصلاحی عمل اور کسی تعمیری حرکت کا آغاز کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ سرچشمہ ہاولیں بھی گدلا کر دیا جائے تو پھر خیر وخوبی کا آغاز ہو گا کدھر سے!

کیوں نہ صاف دلی کے ساتھ یہ لوگ پورے معاملے کو پھر سوچیں۔ قوم کو اگر مغربی رنگ میں رنگنا ہے تو پھر بچے بچے کا ذہنی تعلق اسلامی معتقدات وتصورات سے، صدیوں کی تاریخ سے اور اس پسند وناپسند سے کاٹئے جو پوری طرح رچی بسی ہے۔ یہ نہیں تو پھر ہمیشہ ذہنی تصادم جاری رہے گا اور ''ایک قدم آگے، دو قدم پیچھے'' کا تجربہ دہرایا جاتا رہے گا۔

ہماری ثقافت صرف وہ ہو سکتی ہے جو ہمارے نظریات کے مطابق ہو، جس کی جڑیں ہماری تاریخ میں اتری ہوں، جس کا ہر جز ہمارے تصورِ اخلاق وشائستگی کے سانچے میں ڈھل سکے اور جس میں بیرونی عناصر کو ''خذ ما صفا'' کی چھلنی سے چھان کر اور ''دع ما کدر'' کے چھاج سے پھٹک کر شامل کیا جائے۔

تہذیبی وجود کا شعور و استحفاظ *

جب سے ہمارے ہاں تعلیم کو نظریہ اسلامی پر ڈھالنے' اور نظام تعلیم کو مخالف اسلام نظریات کے تسلط سے نجات دلانے کی گفتگو چھڑی ہے' ایک گروہِ دانشوراں کو یہ اندیشہ یا مغالطہ لاحق ہو رہا ہے کہ شاید مقصود سوویٹ یا اشتراکی طرز کے کسی ایسے جبری نظام تعلیم کا قیام ہے جس کی حدود میں آنے والے ذہنوں کو سوائے ایک فلسفہ و تہذیب کے دنیا کی کسی دوسری فکر کی اور کسی دوسرے نظام حیات کی ہوا بھی نہ لگنے دی جائے۔

میرا خیال ہے کہ اسلامی نظام کا شعوری' سائنٹیفک' جامع اور وسیع تصور رکھنے والوں کے پیش نظر ایک تعلیمی قفس تیار کرنا ہرگز نہیں ہے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ آیا ہمارے اسلامی یا ملی یا پاکستانی نظام تعلیم کا کوئی مقصد ہونا چاہئے یا نہیں؟ اگر مقصد ہونا چاہئے تو اس کی رو سے یہ بھی طے کرنا ہوگا کہ ہمیں کن اوصاف کے انسان تیار کرنا مطلوب ہیں۔ نظام تعلیم اور اس کی نصابی کتب اور اس کے معلموں کی محنتیں ساری کی ساری اسی محور پر گھومیں گی۔

دوسری شکل یہ ہے کہ ہم نظام تعلیم کو لامقصدیت کی اساس پر کھڑا کریں کہ طرح طرح کے متصادم افکار و مقاصد کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہمارے طلبہ جو شکل چاہیں اختیار کر جائیں۔ ہر کوئی ایک الگ فکر کا حامل ہو' ہر کسی کا تہذیبی تصور دوسرا ہو' ہر کسی کے کردار کی تشکیل کا انداز مختلف ہو' اور ہر کوئی اپنی سرگرمیوں کا جداگانہ رخ متعین کرے۔

آزادی افکار کے خوبصورت نام سے اس طرح کی پریشانی نظر اور انتشار فکر کے مواقع دنیا کے کسی بھی نظام تعلیم میں فراہم نہیں کیے جاتے' حتیٰ کہ مغرب کا مکتب بھی اپنی مخصوص تہذیب کے مطابق ذہنوں کو تیار کرنے کے لئے کام کرتا ہے اور وہ اپنے تہذیبی افکار و اقدار کو ذہنوں میں راسخ کرتا ہے۔ یہ سب کچھ طلبہ کو کسی تعلیمی قفس میں رکھے بغیر اور بظاہر مطالعہ و تفکر

---

* ۔۔۔ کے عشرے میں تحریر کیا گیا۔

کی آزادانہ فضا کو برقرار رکھ کر کیا جاتا ہے۔

سو مجھے توقع ہے کہ کسی بھی دانشور کو ایسی بے سروپا تعلیم مطلوب نہیں جس کی اساس کسی نظریئے پر نہ ہو' جس میں کوئی تصور تہذیب روح بن کر کام نہ کرے' اور جس کے عمل سے انسانیت کا کوئی خاص متعین ہیولیٰ طلبہ میں پیدا ہی نہ ہونے پائے۔

مثلاً آپ کہتے ہیں کہ سالمیت پاکستان کا تحفظ ہونا چاہیئے اور ہمیں اپنے مخصوص قومی شعور کو نشوونما دینا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ ان تقاضوں کے مطابق نصابی مواد تیار ہو گا۔ اب کیا تعلیمی بے قیدی کے داعیئے سے آپ یہ پسند کریں گے کہ نظام تعلیم سے نوجوانوں کی ایسی کھیپ بھی نکلے جو سالمیت پاکستان کے خلاف علاقائی اور لسانی تعصبات کی علمبردار ہو یا جو ملک کو بھارت سے از سر نو ملا کے اکھنڈ بھارت کی واحد عظیم سلطنت کے وجود کو پسند کرے یا واحد پاکستانی قومیت کو چار یا پانچ قومیتوں میں تقسیم کرنے کے لئے کام کرے۔ پھر کیا ایسے تخریبی اور منفی رجحانات کے لئے بھی آپ درمیان میں جگہ نکالیں گے اور ہر طرز تصور کو برابر کا موقع دیں گے کہ طالب علم کو تمام خطوط پر سوچنا چاہیئے۔

کیا انہیں آپ خدا پرستی کا درس دینے کے ساتھ ساتھ انکار خدا کے فلسفوں کو بھی پرزور اور مؤثر طریقہ سے پیش کریں گے؟ کیا حضورؐ کی رسالت اور قرآن کے الہامی کتاب ہدایت ہونے کی تلقین کرتے ہوئے رسالت اور الہامی ہدایت کے تصور کے خلاف ملحدانہ نظریات بھی برابر برابر کے زور سے آپ ان کے سامنے لائیں گے۔؟ انہیں شراب کی حرمت کا پیغام سنانے کے پہلو بہ پہلو شراب کے متعلق پرکشش قسم کا ترغیبی مواد بھی فراہم کریں گے؟ کیا حیا داری کے اصول سکھانے والے اداروں کو یہ بھی کرنا چاہیئے کہ انسانی جسم کو عریاں کر کے اس کے تمام اعضا کے اسرار و معارف سے بھی آگاہ کریں۔؟

کیا لوگ اپنے گھر میں اپنے بچوں کی تربیت اس طرح کرتے ہیں کہ وہ انہیں اس حد تک آزادانہ تجربوں کا موقع دیں کہ وہ محلّہ کے جواریوں میں بھی بیٹھیں' بھنگڑ خانے کے افیونیوں سے افیون کے کرشمے بھی سنیں اور جیب تراش سے مل کر اس فن لطیف کا تجربہ بھی کر ڈالیں۔؟

یعنی سوال یہ ہے کہ کیا ایسی تعلیم ایک تعلیم تضادات نہ ہو گی اور تضادات انسانی نفسیات و کردار کو بگاڑنے کا سب سے بڑا باعث ہیں اور اسے منفی اور تخریبی راستوں پر ڈالنے

کا موثر ذریعہ ہیں۔ ملی خطوط پر تعلیم کا تجربہ شروع کرتے ہوئے ہمیں چند اشارات کو ضرور سامنے رکھنا چاہئے۔

❶ ہم دور غلامی کی ماری ہوئی ایک قوم ہیں جس کو انگریز پرست' مغرب پسند' اور ملازم مزاج کے انسان تیار کرنے والے نظام تعلیم سے گزرنا پڑا ہے۔ اس نظام تعلیم نے جس کی ساخت میں کوئی بڑی تبدیلی اب تک نہیں ہو سکی' ہمارے ہاں اغیار کے لئے ایک مرعوبیت پسند تقلیدی تائیدی ذہن پیدا کر دیا ہے اسے اب خود شناس اور اغیار کا ناقد بنانے کے اہم کام کو اصول و مقاصد تعلیم کے تعین' نصاب تعلیم کی ترتیب اور تعلیم کی تربیت میں سختی سے ملحوظ رکھنا پڑے گا۔

❷ اب تک ہم اپنی فکر اور تہذیب اور دینی اقدار کو بیرونی نظریات کے ریلے میں پامال شدہ اور شکست خوردہ حالت میں دیکھتے رہے ہیں اور اپنے اس سرمایۂ حیات کے متعلق ہمارے اندر احساس کمتری کا مرض بری طرح جڑ پکڑ چکا ہے۔ اب نئے نظام تعلیم کے لئے لازم ہے کہ وہ اس حالت کو بدلے' ہمارے اندر اپنی فکر سے محبت' اپنی تہذیب پر اعتماد' اور اپنے دین کی علمبرداری کا جذبہ دے اور ہمیں احساس کمتری اور طلسم مرعوبیت سے نکالے۔

اس تبدیلی کے لئے ہم موجودہ تعلیمی فضا کو جوں کا توں برقرار نہیں رکھ سکتے' اور نہ تعلیمی فضا میں اپنے نظریۂ حیات اور اپنے نظام تہذیب کے ساتھ دوسرے ہر نظریئے اور ہر تہذیب کو برابر کا مقام دے سکتے ہیں۔

❸ ایک اہم مسئلہ اپنے فکری اور تہذیبی وجود کے شعور کے ساتھ اس کے استحفاظ کا مسئلہ ہے۔ کوئی تہذیب ایسے افراد کے ہاتھوں سے نہیں چل سکتی جس کے ماننے والے اتنی کشادہ دلی اور رواداری رکھتے ہوں کہ ان کی فکر و تہذیب کے خلاف حملہ آور قوتیں خیالات اور عمل کے دائروں میں بھرپور اقدامات کر کے ان کے قومی وجود اور نیشنل ٹائپ کو کاری ضربیں لگاتی رہیں اور وہ ہنسی خوشی سے یہ تماشا دیکھتے رہیں۔

فرد کے جذبۂ تحفظ ذات کی طرح زندہ و باشعور ملتوں کے اندر جذبہ تحفظ وجود ملی بھی برسر عمل رہتا ہے اور جب وہ نہ رہے تو وہ یا تو دوسروں میں تحلیل ہو جاتی ہیں یا دوسروں کی مفتوح ہو جاتی ہیں۔ اسی جذبہ تحفظ کو ابن خلدون نے ''عصبیت'' کی اصطلاح سے موسوم کیا ہے۔ ابن خلدون کی یہ اصطلاح عصبیت جاہلیہ یا تعصب سے بالکل مختلف ہے۔ ہم اسے

تہذیبی استحفاظ کا عنوان دے رہے ہیں۔ اصطلاح جو بھی پسند کی جائے' ہمارے ملی نظام تعلیم میں یہ خوبی ہونی چاہئے کہ وہ جن طلبہ کو تربیت دے وہ اپنے فکری اور تہذیبی استحفاظ کا فریضہ ادا کر سکیں نیز ان میں اس لازمہ حیات کے نشوونما پانے میں جو تعلیمی مواد ضرر رساں ہو اسے نصابات میں جگہ نہ دی جائے۔

۴ اسلام سے وابستگی رکھنے والے وسیع الخیال دانشور غالباً جو کچھ چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ طلبہ کو دنیا کے علوم و افکار کے تقابلی مطالعہ کا موقع ملے اور اشتراکیت کی طرح کے تعلیمی قفس میں بند کر کے ان پر طوطے کی طرح جبراً ایک خاص طرز فکر ٹھونسا نہ جائے۔

اس بات سے ہم بھی متفق ہیں۔

اچھا مسلمان بننے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کفر سے بھی واقف ہو۔ آپ نظریہ اسلامی کے ساتھ نظریہ اشتراکیت کو بھی طلبہ کے سامنے لائیے۔ آپ اسلامی شورائیت کے ساتھ نازیت اور فسطائیت کو بھی پیش کیجئے۔ آپ اسلام کی کفالت پسندانہ معیشت کے نظام عدل و احسان کے بالمقابل سرمایہ دارانہ اقتصادیات بھی پڑھایئے۔ آپ حیادارانہ اور پردہ دارانہ معاشرت کے بالمقابل مغرب کی مخلوط' جنسیت زدہ اور خانہ ویران معاشرت کی تصویر بھی ضرور رکھئے۔

مگر اس تقابلی مطالعہ کا بھی بامقصد تعلیم میں ایک خاص انداز ہوگا۔ اہتمام یہ کہ آپ کو طے کر کے چلنا ہوگا کہ آپ اثباتی طور پر سکھانا کیا چاہتے ہیں۔ اگر اسلام سکھانا چاہتے ہیں تو پھر اس کی صداقت و افادیت کے مؤثر ترین دلائل دینے کے بعد' تقابلی مطالعہ کے لیے جن دوسرے نظریات و تصورات کو لائیں ان پر پرزور دلائل ہی سے تنقید کر کے ان کی کمزوریوں اور خرابیوں سے طلبہ کو آگاہ کریں۔ یعنی تعلیم کے مثبت مقصد' اور اس کے منفی مواد کو الگ الگ حیثیت دینی ہوگی' ان کو برابر نہیں رکھا جا سکتا۔

۵ رواداری کا اصول بھی ایک ایسا اصول ہے جس کی کوئی بے ڈھنگی تعبیر ایک بامقصد نظام تعلیم میں نہیں چل سکتی۔

آخر جو نظام تعلیم اس بنیاد پر قائم ہو کہ اسلام دنیا کا وہ دینِ برحق اور وہ صحیح نظام تہذیب ہے جو انسانیت کو دوستی' عدل' اخوت اور امن سے مالا مال کر سکتا ہے تو پھر رواداری کا اصول ہمیں اس خیال کو اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتا کہ اسلام اور غیر اسلام دونوں یکساں

ہیں' اسلام کے مطابق زندگی کی تشکیل اور مخالف اسلام نظریات پر زندگی کی تشکیل ایک جیسے اچھے نتائج دے سکتے ہیں' بلکہ کسی مخالف اسلام صورت میں زیادہ بڑے پیمانے کی فلاح و سعادت حاصل ہوسکتی ہے۔

نظام تعلیم میں طالب علم ایک آزادانہ ریسرچ ورک کے لئے نہیں آ رہا کہ وہ استادوں کی رنگا رنگ باتیں سن کر اور کتابوں میں متضاد باتیں پڑھ کر اپنے لئے کوئی خاص فکر و مقصد طے کرے گا کہ اسے ایک مسلمان معاشرے کو نشو و نما دینے والا مسلم کارکن بننا ہے یا اس معاشرے کو توڑ پھوڑ کر کوئی اور معاشرہ پیدا کرنا ہے۔

جی نہیں یہ ایک مسلمان ملت کا نظام تعلیم ہے۔ اس کا مقصد اسلامی معاشرے کے لئے کارکن اور انسانیت کے لئے داعیان صلاح و فلاح تیار کرنا ہے۔ رواداری کا غیر اصولی تصور فی الحقیقت ان مخالف اسلام قوتوں کے حق میں مفید ہے جو یہ چاہتی ہیں کہ جس غلط طرز فکر اور جن فاسد اخلاقی رجحانات کو ہمارے اندر داخل کرنا ہے ان کے مقابلے میں ہماری کوئی قوت استحفاظ مزاحمت نہ کرے۔

تعلیم و مطالعہ اور علم و ادب میں ہم نے اس رواداری کا جو لمبا تجربہ کیا ہے' اس کے نتیجے میں پیدا شدہ رجال کار کو دیکھ لیجئے کہ اب تک کا حاصل کیا ہے۔ کتنی شخصیتیں ہمارے نظام تعلیم اور رائج الوقت لٹریچر سے اسلامی تہذیب کی علم برداری اور نظریہ پاکستان کے فروغ کے لئے موثر کام کرنے والی ابھریں؟ اور کتنے لوگ ہیں جو اسلام اور سالمیت پاکستان اور وحدت ملت کو تباہ کرنے والے پیدا ہوئے؟ اور پھر نظام تعلیم کا وہ ماحصل بھی دیکھ لیجئے جو عملی بحران کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

پس اب پچھلے ناکام اور تلخ تجربے کو چھوڑ کر از سر نو ایک واضح راہ عمل اختیار کئے بغیر چارہ نہیں۔

❻ اشتراکی تعلیمی قفس کے تجربے کی مثال یہاں یوں چسپاں نہیں ہوسکتی کہ ہمارے طالب علم کو نہ صرف نصابی کتب میں تقابلی مطالعہ کرنا ہے' بلکہ اسے لائبریریوں اور لٹریچر کے عام ماحول میں سب کچھ پڑھنے کی آزادی رہے گی۔ البتہ امتحانات میں اسے اسی مثبت طرز فکر کا مظاہرہ کرنا ہوگا جس کے لئے نظام تعلیم کام کرے گا۔[1]

---

[1] آخر انگریزی دور کا یہ تجربہ بھی تو ہمارے سامنے ہے کہ نصابی کتب میں انگریزی سلطنت کی عظمت ←

اگر ایک قوم تنخواہ دار استادوں کو اس غرض کے لئے مامور کرتی ہے کہ عوامی یا اکثریتی رجحانات کے مطابق طلبہ کو کچھ خاص مثبت خطوط پر تعلیم دیں (اور منفی پہلو سامنے لائیں بھی تو تنقید و تردید کے لئے) تو ایسے حالات میں ان مثبت خطوط سے اختلاف اور انحراف کرنے اور کسی منفی نقطۂ نظر کو اپنے ضمیر کی آواز کی حیثیت سے مثبت بنا کر پیش کرنے والے استادوں میں شرافتِ انسانی کا قلیل سا جوہر بھی موجود ہو تو ان کو مستعفی ہو جانا چاہیے۔ جو شخص پاکستانیت کے خلاف ہو' جو شخص اسلام کو دین برحق یا تہذیب عادلانہ ہی نہ مانتا ہو اور جس شخص کے ذہن میں کوئی دوسرا نظریہ و نظام بسا ہوا ہو' اس کا ایک ایسی قوم کے نظام تعلیم میں کیا کام جس نے اپنے مثبت خطوط اس کے ضمیر کے رجحانات کے خلاف مرتب کئے ہوں۔

آخر پاکستان کے تعلیمی ادارے ایک کھلی چراگاہ تو نہیں ہیں کہ جس نظریے کا حامل اور جس تہذیب کا علمبردار جب چاہے اس چراگاہ میں داخل ہو کر سبزہ و گیاہ پر بھی منہ مارے پھر وہاں شکار بھی کھیلے۔

کیا ایک فوج میں یہ عمل جاری رکھا جا سکتا ہے کہ ایک افسر سپاہیوں کو تلقین کرے کہ تمہیں فلاں سمت میں پیش قدمی کرنی ہے اور دوسرا کہے کہ نہیں تمہیں بالکل الٹی سمت میں جانا ہوگا' ایک کہے کہ تمہیں دشمن کے دستے سے ٹکر لینی ہے اور دوسرا کہے کہ صلح کرنی ہے۔

سوال یہ ہے کہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے فکری اور تہذیبی معرکے کے لئے آپ نوجوان

← اور انگریزی حکومت کی برکات کے مضمون پڑھائے جاتے تھے۔ مگر تعلیم یافتہ نوجوان کے لئے انگریزوں کی مخالفت پر لکھے ہوئے لٹریچر کے مطالعہ کا موقع بھی حاصل تھا' وہ دنیا کی باغیانہ تحریکوں کے حالات بھی پڑھتا تھا اور حصول آزدی کی جدوجہد کے راستوں کا علم بھی حاصل کرتا تھا۔

اس سب کچھ کے باوجود انگریزی نظام تعلیم نے اپنے متعین مثبت مقصد کو بخوبی حاصل کیا ــــــ انگریزی حکومت کو اپنے تئیں اقتدار چلانے کے لئے نہایت اچھے پرزے ملتے رہے۔ وہ سیاسی کشمکش کو ایک خاص ڈھنگ اور رفتار سے نہ صرف چلانے کے لئے اپنی پسند کے افراد کی کثیر تعداد میدان میں لاتی رہی' وہ ہر طبقے اور ہر درجے کے مخبر اور ایجنٹ بھی حاصل کرنے میں کامیاب رہی' ایک ایسی بیورو کریسی اسے میسر تھی جس کے کارکن دین' ایمان' ضمیر' حب وطن وغیرہ ساری چیزوں سے خالی ہو کر یا ان کو گھر میں چھوڑ کر کامل وفاداری سے اپنا فرض ادا کرتے تھے' اس نے ایسی پولیس اور عدلیہ تشکیل کر لی جنھوں نے مخالف حکومت اور آزادی طلب عناصر کو پوری بے رحمی سے کچلا۔

نسل کی جس فوج کو تیار کرنے چلے ہیں اس کے جذبوں کو یہ آزادی کیسے دی جا سکتی ہے کہ ان میں ایک کا درس ایک طرح کا ہو اور دوسرے کی تلقین اس کے برعکس ہو۔

یہی صورت کتابوں اور نصابی مواد کے بعض حصوں کی بھی ہو سکتی ہے یعنی اگر کچھ مواد تعلیم کے معین کردہ مثبت اصول و مقاصد سے صاف طور پر ٹکراتا ہو' ان کی تردید کرتا ہو' ان کے خلاف باغیانہ یا انحرافی رجحان پیدا کرتا ہو' اور اس میں مثبت قسم کا زور استدلال اور پروپیگنڈے کا جادو شامل کیا گیا ہو تو وہ لازماً اسی قابل ہے کہ اسے نصابی کتب سے خارج کر دیا جائے۔ نصابی کتب میں مخالف نظریات کو سنجیدہ و محتاط طریقے سے لانا ہو گا اور ان کو مثبت تعلیمی مقام پر نہیں بلکہ منفی مرتبے پر رکھنا ہو گا تاکہ طالب علم کو یہ شعور حاصل ہو کہ یہ اور یہ نظریات اس کے فکری و اعتقادی وجود اور اس کی تہذیبی ہستی اور اس کے دینی نظام کے خلاف حملہ آور قوتیں ہیں۔

آج کی دنیا جس میں ہم رہتے ہیں نظریاتی تصادم کی دنیا ہے اور بدقسمتی سے ہر نظریئے کے پیچھے غیر مرئی سیاسی سامراج کی منحوس قوت پائی جاتی ہے۔ اندریں حالات کسی قوم کے طلبہ کا بیرونی نظریات کا شکار ہو جانا محض ایک ذہنی واقعہ نہیں بلکہ ایک سیاسی حادثہ سمجھا جاتا ہے۔ ایسے نظریاتی تصادم میں کسی زندہ و باشعور قوم کا نظام تعلیم غیر جانبدار اور بے حس نہیں ہو سکتا کہ قوم کے بچوں کو کسی فکری نشہ میں مبتلا کر کے جس کا جی چاہے اغوا کر کے لے جائے کسی پر ان کی حفاظت کی ذمہ داری نہیں ہے۔

۵ عرصہ دراز سے ایک چیز ہمارے لئے اجنبی ہو گئی ہے وہ یہ کہ آدمی کے اعتقادات' اس کے اخلاقیات' اس کے خطبات' اس کے ادبیات' اس کا کاروبار ایسے ہم آہنگ ہوں کہ ان سارے پہلوؤں میں ایک ہی شخصیت جلوہ گر ہو۔

ہمارے ہاں بکھری ہوئی شخصیتیں پائی جاتی ہیں ایک ہی آدمی کے ہاں ٹکراتے ہوئے خیالات پائے جاتے ہیں۔ اس کے اعمال اس کے خیالات کے نقیض ہوتے ہیں۔ اس کی لسانی اور علمی تعلیمات آزاد کبوتروں کی طرح اڑتی پھرتی ہیں۔ اس کے کاروبار کا نہج اس کے اعتقادی و اخلاقی تصورت سے بالکل الٹ ہوتا ہے۔

اس حالت مرض کے ہم ایسے عادی ہیں کہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمیں اس سے محروم کر دیا جائے۔ کوئی ایسی کوشش جو ہماری پارہ پارہ شخصیتوں کو توحید و حنیفیت کے رشتے میں پرونے

والی ہو وہ ہمارے لئے اتنی ہی شاق ہے جتنی کہ کسی کا اپنے آپ کو مر کر دوبارہ زندہ ہونے کے لئے پیش کرنا۔

لیکن بڑا مسئلہ یہ ہے کہ دشمنوں میں گھری ہوئی ایک قوم کی حیثیت میں ہمیں اپنی نازک ترین پوزیشن کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کیا ہم ٹوٹی پھوٹی شخصیتوں کا بار گراں اٹھائے پھرنے والے افراد کے بل پر معرکہ حیات سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں؟ میرا جواب ہے کہ نہیں' اور ہرگز نہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ غیر متعصب قسم کے معقول دانشوران کرام میری تائید نہ کریں۔

معرکہ حیات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہمارا ناگزیر اقدام یہی ہے کہ ہم اپنے افراد کو مربوط و منضبط شخصیتوں سے آراستہ کریں۔ اس عمل کا زیادہ سے زیادہ حصہ نظام تعلیم کو ادا کرنا ہے۔

اگر نظام تعلیم کو یہ فریضہ ادا کرنا ہے تو اس کی تشکیل کسی ایسے ثقافتی پروگرام کی طرح تو نہیں ہو سکتی جس میں کسی گانے والے نے اپنی پسند کا نغمہ سنا دیا اور کسی تھرکنے والی نے اپنا بہترین ناچ پیش کر دیا' اور کسی گروہ نے کوئی ڈرامہ دکھا دیا اور سامعین نے ہر پروگرام کے خاتمے پر تالیاں بجا دیں۔

خدا کرے کہ ان اشارات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو گئی ہو کہ ہمارا مجوزہ اسلامی نظام تعلیم نہ تو اشتراکیوں کی طرح کا بند قفس ہے اور نہ ایک کھلا کلب یا چڑیا گھر۔ اس میں معقول پابندی بھی ہے اور معقول آزادی بھی۔ نہ پابندی نامعقول ہے اور نہ آزادی نامعقول قسم کی ہے۔

فکری و تہذیبی جنگ

دنیا میں کبھی کوئی نظام تعلیم ایسا نہیں پایا گیا جو کائنات و حیات کے متعلق کچھ اساسی معتقدات نہ رکھتا ہو۔ اسی طرح ہر قوم کے سامنے کوئی نہ کوئی مقصد وجود ہوتا ہے' خواہ وہ لوٹ مار ہو یا نوع انسانی کی خدمت۔ اور ان دو بنیادی حقیقتوں کا لازمہ انسان مطلوب کا ایک تصور ہے۔ ہر قوم اپنے نظام تعلیم کے ذریعے ساری معلومات اور سارے تجربات کو نہ صرف اپنے اس بنیادی سرمایہ شعور کے گرد مرتب کرتی ہے۔ بلکہ وہ اس بنیادی سرمایہ شعور کو تعلیمی عمل میں بنیادی اہمیت دیتی ہے۔

اسی بنیادی سرمایہ شعور سے ہر معاشرے کا کلچر بنتا ہے اور اسی کے مطابق اس کی ساری تہذیب تشکیل پاتی ہے۔ اس کلچر یا تہذیب کو تعلیم کے ذریعے ہر نسل دوسری نسل کی طرف بڑی احتیاط اور بڑی سرگرمی سے منتقل کرتی ہے۔ اسی تہذیب کے مطابق اس کی اجتماعیت بنتی ہے' اسی کے مطابق اس کا نیشنل ٹائپ بنتا ہے' اسی کے مطابق اس کا نظام اقدار' اس کا سلسلہ اطوار اور اس کا تصور کردار نمودار ہوتا ہے۔ پس اگر وہ اپنے امتیازی تہذیبی شعور کو آئندہ نسلوں تک پہنچانے میں کوتاہی کرے تو اس کا نتیجہ بجز اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ اخلاف اپنے تہذیبی وجود کو کھو بیٹھیں' اپنا مقصد حیات گم کر دیں' اپنے تصور کردار سے محروم ہو جائیں' اپنے معتقدات کی عمل انگیز روح کو ضائع کر دیں اور اپنی اجتماعیت کی شکست و ریخت کا تماشا کریں۔

پس میں جس تہذیبی نظریہ تعلیم پر گفتگو کر رہا ہوں' اس کے لحاظ سے اولیت اس امر کو حاصل ہے کہ پورے نظام تعلیم میں اس تہذیبی شعور اور تجربے کو اولیت اور غلبہ حاصل ہونا چاہئے جس کے بل پر کوئی قوم قائم ہے اور جس کی تحریک ہی سے وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو کر مزاحم قوتوں کے ہر چیلنج کا جواب دینے کے قابل ہوتی ہے۔

تہذیبی نظریہ تعلیم پر غور کرتے ہوئے ہمیں خود اپنے بارے میں سوچنا چاہئے کہ ہمارا امتیازی تہذیبی وجود کیا ہے' کیسے بنتا ہے اور اس کی بنا کیا ہے؟

کسی نظام تہذیب کی تعلیم کے معنی یہ ہیں کہ ہم اسے قبول کرنے، اسے چلانے اور اس کے امتیازی وجود کو بیرونی اثرات سے بچانے والے ایسے کارکن تیار کر رہے ہیں، جنہیں آگے چل کر سیاسی، معاشرتی، فلسفیانہ، نفسیاتی، کاروباری، قانونی، ثقافتی، سفارتی، عملی، ادبی، صحافیانہ نیز سائنسی اور تکنیکی اور دوسرے مختلف شعبوں میں اس کے لئے کام کرنا ہے۔ نظام تعلیم کی یہ نوعیت کسی ایسے نظام تعلیم سے یکسر مختلف ہے جو کسی چلتی ہوئی حکومت کے لئے افسر اور کلرک پیدا کرنے کے لئے وجود میں آیا ہو اور دفتری وانتظامی ذمہ داریوں کے علاوہ شہریوں کو عام قسم کی پیشہ ورانہ یا ٹیکنیکی معلومات مہیا کر دے۔ اسلام کے جامع تہذیبی نظام کی تعلیم کا کام اتنے پر بس نہیں کرتا کہ زیر تعلیم افراد کے دماغوں میں معلومات کے انبار بھر دیئے جائیں، بلکہ سوچنے سمجھنے اور ناقدانہ نظر سے کام لینے والے متحرک دماغ تیار کرنے کے ساتھ ساتھ ایک موثر نظام تربیت کے ذریعے علمی کردار بھی نشو ونما پانے چاہئیں۔ ورنہ اگر محض چند تحریری پرچوں پر مشتمل رٹی رٹائی معلومات کے بل پر مقررہ امتحانات پاس کرا دینا نظام تعلیم کا معمول رہا تو اس ڈگر پر چلنے سے ہم صدیوں میں بھی اسلامی نظام تعلیم کے مقاصد کو نہیں پا سکتے۔ بلکہ عام مروجہ علمی معیارات تعلیم کو بھی حاصل نہیں کر سکتے۔

تہذیبی ونظریاتی کشمکش

ان چند گزارشات کو عرض کرنے سے مدعا یہ ہے کہ مسئلہ تعلیم پر سوچنے والے حضرات اور خصوصاً اسلامی تعلیم کو رائج کرنے کی راہیں تلاش کرنے والے اصحاب پہلے تعلیم کے تصور کو درست شکل میں سامنے رکھیں اور اس درست تصور کی روشنی میں مسئلہ تعلیم پر غور وخوض فرمائیں اور خاص طور پر ملحوظ رکھیں کہ ہمارا معاشرہ پرسکون حالت میں نہیں ہے بلکہ ایک تہذیبی ونظریاتی کشمکش سے دو چار ہے۔ ایک طرف سامراجی فکر وتہذیب ہے جسے دور غلامی میں ہم پر جبراً ٹھونسا گیا، تعلیمی اور قانونی ذرائع کے ساتھ ساتھ بہت موثر قسم کے معاشی ومعاشرتی فوائد رکھنے والے موثرات استعمال کئے گئے اور مزید براں سرکار رسی اور قرب حکومت اور سیاسی فائدے اٹھانے کے لئے بھی بیرونی فکر وتہذیب (اور زبان ومعاشرت) کو موثر وسیلہ بنا دیا گیا اور اب جب کہ تمام اداروں اور خیالات کے سرچشموں اور روز مرہ کے اطوار میں بے شمار ناموافق چیزیں گھس چکی ہیں اور ان کے لئے ذہن اتنے ہموار ہو چکے ہیں کہ ان کے حق میں

لڑنے مرنے والا ایک ایسا طبقہ ہم سے ابھر آیا ہے جو عہدوں' نوکریوں اور ابلاغ کے ذرائع پر دوسروں سے زیادہ اثر رکھتا ہے اور باہر سے داخل ہو کر مسلط ہونے والی تہذیب کے خلاف آواز اٹھانے والوں کو رجعت پسندی اور ملائیت اور ترقی دشمن کی گالیاں دیتا ہے۔

اس طبقے کی پشت پر نہ صرف عالمی پروپیگنڈا' مروجہ علوم' مغربی صحافت' تعلیمی ادارے اور تعلیمی نظام بلکہ عام علمی وادبی تصانیف' وہاں سے تربیت پا کر آنے والے اساتذہ' وہاں کے ثقافتی وفوذ اور بے شمار دوسرے بھی۔ بلکہ اب ایک نیا سامراج قرضوں اور اسلحہ اور ماہرین کے ذریعے کمزور قوموں کو مسخر کرنے نکلا ہے۔ اس سامراج نے نہ صرف ہماری منڈیوں پر' بلکہ ہمارے بجٹوں پر' قیمتوں اور ٹیکس کے نظام پر' پبلک سیکٹر سے اٹھا کر مختلف صنعتوں اور ذمہ داریوں کو پرائیویٹ سیکٹر میں لا پھینکنے پر' حکومتوں کے بنوانے تڑوانے پر' خارجہ پالیسی کی تشکیل پر اتنا گہرا اثر حاصل کر لیا ہے کہ ہمارے گزشتہ دور غلامی برطانیہ سے بدتر قسم کا غیر مرئی دور غلامی ہے جس کو عوام تو جانتے ہی نہیں' ہمارے بڑے بڑے سیاست کے ماہرین اور اخباروں کے ادارتی اور غیر ادارتی کالم بھرنے والے حضرات بلکہ شاید بہت سے معلمین تک بھی آگہی نہیں رکھتے ہیں۔ اسی جدید سامراج نے ہمارے ہاں نقشۂ تعلیم اتنا بدل دیا ہے کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کو ایک طرف حکومتی دائروں سے نکال کر پرائیویٹ دائرے میں ڈال دیا ہے' دوسری طرف ہر ادارے کو خود مختار (نصاب' امتحانات اور اساتذہ کے تقرر اور مالی انتظامات وغیرہ کے متعلق) بنا کر تعلیم کو اس طرح لامرکزیت (Decentralization) کا شکار بنا کر ہماری نظریاتی اور تہذیبی جڑیں کاٹ ڈالی ہیں کہ اتنا بڑا واقعہ ہو گیا اور ملک میں کسی کو پتہ ہی نہیں۔ جن کو سب سے پہلے پتہ ہو سکتا تھا وہ تو تھے ہی دوسری طرف کے آدمی جو بظاہر ہمارے یہاں پیدا ہوئے اور ہمارے ملک میں ہمارے حصے کے رزق پانی سے پلے بڑھے اور ہمارے بیسیوں اداروں نے ان کو نشوونما دینے میں حصہ لیا۔ ان کا حال تو اس لڑکی کا سا ہے جو پیدا ایک ماں کے پیٹ سے ہوئی ہے' پلتی ایک باپ کی شفقت کے سائے میں ہے' خدمات بھائیوں اور بہنوں کی وصول کرتی ہے' اور جب وہ فیصلے کی عمر پہنچتی ہے تو وہ ماں باپ اور بھائی بہنوں کو ایک طرف پھینک کر ''خدمت عامہ'' پر اتر آتی ہے۔

اس لمبی بحث کا مطلب یہ ہے کہ ہم تہذیبی کشمکش کی حالت میں ہیں۔ ہم جب اپنی تہذیب کے لئے کام کرنا چاہیں تو تعاون نہیں ملتا اور اپنی قوت جمع کر کے قدم اٹھائیں تو ہزار

سدِ سکندری راہ میں حائل۔ گویا بات کھلی فضا اور درست موسم کی نہیں ہے بلکہ بہت خوفناک طوفان باد و باراں و برق کے اندر سے ہمیں اپنا جہاز اڑا کے نکالنا ہے۔ ہم اپنی تعمیر نو اپنی بنیادوں پر کرنا چاہتے ہیں اور یہ ایسا بڑا گناہ ہے کہ مشرق سے مغرب تک کی دنیا ہماری مخالف ہو جائے گی۔

ہم ایک جنگاہ میں کھڑے ہیں

دنیا کوئی سکون کی جگہ نہیں' حرکت اور کشمکش کا میدان ہے۔ یہ متضاد اور متصادم طاقتوں کا ایک اکھاڑا ہے' پوری تاریخ حق و باطل یا خیر و شر کی قوتوں کی رزم گاہ ہے۔ یہاں جامد رہ کر زندہ رہنا ممکن نہیں' یہاں قوموں کا سو جانا موت کی نیند بن جاتا ہے' یہاں کوئی طاقت تماشائی بن کے بیٹھ نہیں سکتی۔ ورنہ روندی جائے گی۔ اس جنگاہ میں دوسروں کے سہارے اور دوسروں کے اسلحہ سے اپنے وجود اور اپنی تہذیب اور اپنے حقوق کی حفاظت نہیں کی جا سکتی۔ یہاں جو آگے بڑھ سکے' بڑھ جائے ورنہ اس مسابقت میں تیز رفتار طاقتیں یا تو کچل کر گزر جائیں گی' یا وہ مخالف تہذیب کا نام و نشان مٹا دیں گی یا وہ کمزور اور سست گام راہ گیروں کو اپنی سواری بنا لیں گی۔ سچ کہا اقبال نے ۔

یہ کاروان ہستی ہے تیز گام ایسا
قومیں کچل گئی ہیں' جس کی رواروی میں

تاریخ کی جنگاہ میں لڑ کر شکست کھانا بھی شکست ہے' اور اپنے وجود اور حقوق اور نظریات اور ترقی کے لئے لڑنے سے گریز اور معرکوں سے پرہیز بھی شکست ہے۔ ہر باطل طاقت سے مصالحت اور ظالم کے سامنے سرافگندگی اور ہر دشمن عیار سے دوستی اور ہر نظریہ و تہذیب سے سازگاری کی عادت بھی قوموں کے وجود کے لئے تباہ کن ہوتی ہے۔

زندگی کی اس جنگاہ میں اتر جانے والوں کے لئے دو چیزیں بے حد خطرناک ہیں ایک اپنے ملی وجود کا عدم احساس' شعور خویشتن سے محرومی' اپنی امتیازی ہستی سے تغافل' نیز اپنی صلابت وجود ختم کر کے پگھلا ہوا سیال موم بن جانا جو ہر سانچے میں ڈھل سکے۔

اب شعبہ تعلیم میں کرنے کا سب سے اہم کام یہ ہے کہ ہم اپنے طلبہ کو:۔

❀ ملی و تہذیبی وجود کے شعور سے آراستہ کریں۔

- بیرونی مخالفانہ اثرات (فکری اور ثقافتی) کے لئے ان میں صلابت اور مزاحمت کی قوت پیدا کریں۔
- ان میں یہ احساس پیدا کریں کہ زندہ رہنے' اپنے ملی و تہذیبی وجود کو محفوظ اور توانا بنانے' ترقی کرنے' سامراجی قوتوں سے عہدہ برا ہونے اور مختلف مسائل کو حل کرنے کرانے کے لئے ہمیں ایک عظیم قوت بن کر رہنا ہے' اور اگر ہم اپنے آپ کو ضائع نہ کریں تو ہم ایک عظیم قوت ہیں اور عظیم تر بن سکتے ہیں۔

ہم قوت کا ایک سمندر ہیں جس کی موجیں ابھی خوابیدہ ہیں' ہم نئی نسل کو ایسی تعلیم و تربیت دیں جو ان کو بیدار اور متحرک کر کے ایک طوفان میں بدل دے۔

علمی امامت

متذکرہ بحث کو لکھتے ہوئے میرے اندر یہ اندیشہ ابھرا کہ شاید ہماری قوم جراثیم غیر پرستی کے حملے کی زد میں آ کر ایسے خوفناک مقام تک جا پہنچی ہے کہ ذہنی مرعوبیت اور فکری غلامی کا تپ دق تیسرے درجے میں جا پہنچا ہے اس حالت تک پہنچی ہوئی قوم اپنے اوپر بھروسہ نہیں کر سکتی۔ اور اپنے مسائل کا جواب اپنے اندر سے برآمد نہیں کر سکتی۔ اپنی فکری ضرورتیں تک اپنے گھر میں پوری نہیں کر سکتی بلکہ وہ غیر بینی اور غیر پرستی کی عادت سے مجبور ہو کر ہمیشہ باہر کے کرداروں کو دیکھتی اور باہر کی آوازوں کو سنتی ہے۔ سرمایہ داری کا غلبہ ہوا تو ہم اس کے فدائی تھے۔ ہٹلر کو عروج ہوا تو نازی ازم پر قرآن کی اصطلاحیں چسپاں کرنے لگے۔ سوشلزم کا دور دورہ ہوا تو جھٹ سے ہم نے آگے بڑھ کر اسلام کا لیبل اس کے ماتھے پر لگا کر فیصلہ کر لیا کہ ہمارا جادہ فلاح ونجات یہی ہے۔ ان تجربات کو دیکھ کر اندیشہ ہوتا ہے کہ کل کلاں کو جاپان کا شنٹو ازم یا بہائیوں کا مضحکہ خیز مذہب' یا خالصہ ازم یا بدھ ازم یا ناننگا ازم یا مردم خور قبیلوں کا ملحدانہ ومشرکانہ طرز حیات ہمارے آس پاس زور پکڑے تو ہمارے دانشور فوراً یہاں سیمینار اس کے حق میں منعقد کریں' صحافی اخباروں کے خوب صورت رنگین اور مصور نمبر نکال کر تجوریاں بھریں' سیاسی لیڈر ''نعرہ پارٹیاں'' ساتھ لے کر جلوس نکلوا دیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ہمارے رہنمائی کرنے والے تمام پیش رو طبقے تحویل قبلہ کر لیں گے اور قوم سے کہیں گے کہ (نعوذ باللہ) قرآن تو اسی کام کے لئے اترا تھا' نبی پاک ﷺ اسی غرض سے مبعوث ہوئے تھے۔ باقی سب کہانیاں ہیں۔ اور اگر دو چار مولوی بھی ہم نوا ہو گئے تو ان کو سٹیجوں پر لا کر روشن خیالی کے تمغے دیئے جائیں گے (چاہے وہ خیالی تمغے ہوں) اور جو روایتی علماء اور ائمہ مخالفت کریں گے' کہیں گے کہ یہ کھٹ ملا ہیں' اجتہاد کا دروازہ مقفل کر کے کنجیاں گم کر بیٹھے ہیں' یہ رجعت پسند ہیں' ہماری ترقی میں رکاوٹ ہیں۔ دنیا کی ساری قومیں ترقی کر گئیں کیونکہ وہاں ملا نہیں تھے' ہم صرف اس لئے پیچھے رہ گئے کہ یہاں ملاؤں کی کتنی ہی رجمنٹیں ہیں اور چھاؤنیاں ہیں۔

خیر اس جملہ معترضہ سے قطع نظر ہمارا معاشرہ اپنی تہذیب سے اور اپنی تہذیب کی محبت سے اتنا دور ہٹایا جا چکا ہے کہ اگر خدا نہ کرے (اور ہزار بار اس سے درخواست نجات) کہ اگر کبھی عارضی طور پر بھی بھارتی ہندو ہمارے کسی علاقے میں گھس آئیں تو وہ بت خانے کھول دیں گے اور مسلمانوں کو کھینچ لے جائیں گے' یہ کہہ کر کہ میاں جی یہ بت ہمارے خدا نہیں ہیں' خدا تو صرف پرماتما ہے۔ یہ محض ہمارے خیالات و جذبات کی علامات ہیں' جسے آپ لوگ غزلوں میں کنایات واستعارات کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ آیئے اندر چلئے۔ کڑاہ پرشاد بھی کھایئے۔ اور بھیڑ بھاڑ کے ساتھ کوئی وزیر صاحب اور کوئی فلسفی صاحب اور کوئی شاعر صاحب بھی گھس سکتے ہیں۔ اور پھر دشمن سرکاری اہتمام سے چاندی اور سنگ مرمر سے بنے ہوئے ننھے ننھے بت یہ کہہ کر تحفوں کے طور پر بانٹیں گے کہ صاحب آپ کے ڈرائنگ روم کی کارنس کے لئے اچھا شوپیس ہے۔ ان سے پیپر ویٹ کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ ایسے تو پہلے بھی آپ کے ہاں ہوں گے۔ اس کا نام بت پرستی نہیں۔ پھر وہ اعلان کریں گے کہ ہمیں سری کرشن کی ایک بڑے سائز کی تصویر یا مجسمے کی ضرورت ہے۔ تمام آرٹسٹوں کو مقابلہ کی دعوت ہے۔ ہر شریک ہونے والے کو دس ہزار روپے اور اول دوم آنے والوں کو ایک لاکھ اور پچاس ہزار کے انعامات دیئے جائیں گے۔ پھر دیکھئے کہ مقررہ تاریخ کو کسی ہال میں کیا سماں ہوتا ہے۔

بچو اور بچاؤ

تہذیبی نظریہ حیات اور تہذیبی نظریۂ تعلیم یہ کہتا ہے کہ ہم اس حال زار سے نکلیں اور فکری' اخلاقی اور تہذیبی لحاظ سے ایک آزاد قوم بن کر کھڑے ہوں۔

ہمارے یہاں تو سبق اندوز قسم کی بصیرت بھی اتنی کمزور ہے کہ ذہین طبقے یہ تک بھی نہ دیکھ سکے کہ ہمارا پڑوسی بھارت تقسیم سے پہلے تعلیم کے میدان میں کتنا کام کر گیا ہے۔ اشترا کی روس نے اپنے نظریات اور نظام حیات کی ضروریات کے مطابق فوراً نظام تعلیم تیار کیا جس میں افغانستان اور پاکستان کے طلبہ بھی تفصیلی مشاہدات کر کے آئے ہیں کہ کسی بھی سطح کی تعلیم شروع کرانے سے پہلے تمام طلبہ کے لئے کمیونزم اور روس کے متعلق ایک کورس مکمل کرنا لازمی تھا۔ ہم لوگ اسرائیلیوں سے بھی نہ سیکھ سکے کہ انہوں نے مردہ عبرانی زبان کو زندہ کر کے اپنے مذہبی اور صیہونی تصورات کے ساتھ یونیورسٹی کھڑی کر دی۔ یہاں تو اردو زبان کو کوئی منہ

لگانے پر تیار نہیں کیا کہ عربی اور اسلام۔

القصہ! ہمیں تو ایسی یونیورسٹیاں اور کالج درکار ہیں جن سے پڑھ کر نکلنے والے نوجوان اسلامی انقلاب (کمیونسٹک مفہوم کے ساتھ نہیں) کے سپاہی بن کے نکلیں۔ وہ اپنے دین اور اپنے نظریات وتصورات' اپنی تہذیب کے اطوار واقدار کی برتری کا یقین رکھتے ہوئے دنیا بھر کی اقوام کے سامنے ان کے نقیب بنیں۔ اور اپنے تہذیبی تصورات کی بنیاد پر جہاں ان کو موقع حاصل ہو وہاں ایک نئی دنیائے راستی وانصاف تعمیر کر کے دکھائیں۔ یہ اصل مطلوب اگر حاصل ہو تو علم ماحول اور علم اشیاء کا جو ذخیرہ جہاں سے بھی ملے از خود اپنی جگہ پر نصب ہو جائے گا۔ لیکن اگر تہذیبی شعور اور ملی خودی ہی زندہ وتوانا نہ ہو تو آپ اس کی کمر سے اگر سائنس یا ٹیکنالوجی کی تلوار باندھ بھی دیں تو آخر بقاء وارتقاء کا جہاد کیسے عمل میں آ جائے گا۔ خالی سائنس اور ٹیکنالوجی تو محض بے مقصد خدمت گزار افراد فراہم کرتی ہے جنہیں کسی بھی قوم اور کسی بھی تہذیب کی گاڑی میں قلی بنا کے جوتا جا سکتا ہے۔

ہمیں فیصلہ کر لینا چاہئے کہ ہمارا مقصد محض اسلامیات پڑھنے سے پورا نہیں ہو سکتا۔ خواہ اسے ہر مضمون میں شامل کر دیا جائے بلکہ اسلامی نظام تعلیم وہ ہو گا جو غیر اسلامی اور مادہ پرستانہ تہذیبوں کے افکار ونظریات کے خلاف نوجوانوں کو ایمانی جہاد لڑنے کے قابل بنا سکے اور انہیں اسلام کے مکمل تہذیبی شعور سے مسلح کر سکے۔

مشعل برداران انسانیت

دنیا میں وہ گروہ ہمیشہ بے وزن اور بے وقعت رہتے ہیں جن کا مقصد محض زندہ رہنا ہوتا ہے۔ ان کے پاس کوئی ایسا سرمایۂ خیر وفلاح نہیں ہوتا جسے وہ انسانیت تک پہنچانے کا جذبۂ بے تاب رکھتے ہوں۔ اور جس کے مالک ہونے پر فخر کریں اور یہ احساس ان کے لئے ذریعہ قوت بنے۔ ہم ایسی بے معنی قوم نہیں ہیں۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے پاس لازوال صداقتوں کا ایک خزانہ قرآن کا تفویض کردہ ہے۔ ہمارے سرمایۂ حیات میں وہ اصول عدل شامل ہیں جو انتہا پسندانہ نظریات کی ستم ظریفیوں سے انسان کو نجات دلا سکتے ہیں' ہم وہ میزان لے کر آئے ہیں جو فرد اور معاشرہ کی زندگی اور عالمی رابطوں کو صحیح توازن دے سکتی ہے۔ ہم ''امت وسط'' اور ''شہداء علی الناس'' ہونے کے منصب جلیلہ کا جب شعور حاصل

کرتے ہیں اور اپنے آپ کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذمہ دار محسوس کرتے ہیں تو ہمارا اپنے اوپر اعتماد بڑھ جاتا ہے۔ یہ شعور اور اعتماد ہمیں ایک مضبوط طاقت بنانے کا وسیلہ ہے اور اگر اسی شعور اور اعتماد میں مزید گہرائی اور وزن پیدا کیا جائے اور عملی سرگرمیوں سے اس کو تقویت دی جائے تو ہماری خودی مستحکم ہو سکتی ہے اور ہماری ذہنی و فکری اور روحانی و اخلاقی قوت دسیوں گنا زیادہ ہو سکتی ہے۔

اگر ہم اپنی نئی نسل کو خیر و فلاح کی راہوں پر قافلہ انسانیت کے آگے مشعل بردار بنا کر متحرک کر دیں تو ایک ایسی قوت کا سیلِ بے پناہ زمین پر نمودار ہو سکتا ہے جو تشدد' جبریت اور خوف کے مارے ہوئے انسانوں کو حسین تر اور پاکیزہ تر زندگی سے بہرہ ور کر سکے۔ ہمارے نظام تعلیم کو نئی نسل کے دل میں یہ بات جاگزیں کرنا ہوگی کہ ہم فکری بھکاری اور تہذیبی گداگر نہیں ہیں کہ احساس کمتری کا شکار ہو کر پڑے رہیں۔ ہم تو خود لازوال خزائنِ فکر و تہذیب کے امانت دار ہیں اور دست سخاوت سے ان کو دوسروں کی جھولیوں میں ڈالنے والے ہیں۔ مادی ترقیوں سے بہرہ ور قومیں ایمان اور اخلاق اور امن کے جس فقر و فاقہ میں مبتلا ہیں اس سے صرف ہم ہی ان کو نجات دلا سکتے ہیں۔

تاریخ کی جنگاہ میں فتح مندانہ اقدام کے لئے اس شعور و قوت کے سوا کوئی ذریعہ نہیں۔

تحریک تجدید تعلیم

چھوٹے چھوٹے مسائل میں الجھے ہوئے تعلیمی دانش وروں کا پورا احترام کرتے ہوئے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آج تک کسی نے یہ نہیں سوچا کہ اپنے ایک عظیم اور صحت مند تہذیبی نظریہ فکر و عمل سے آراستہ ہوتے ہوئے پاکستان کو پوری دنیا میں اپنی علمی (اور تعلیمی) امامت یا لیڈر شپ کا علم بلند کرنا چاہئے۔ سیاسی جماعتوں کی طرح جھنڈے لہرانے اور نعرے اچھالنے کی صورت میں نہیں' خاموش محنت و پتہ ماری سے۔

آج کی تاریخ میں مختلف نظریات کی لہریں بری طرح ٹکرا رہی ہیں۔ دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں نے ہر طرف ثقافتی یلغار (تہذیبوں کی جنگ) شروع کر رکھی ہے۔ ان حالات میں کوئی ایسی قوم ابھر نہیں سکتی جو دوسروں کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو اور خود ایک نئے فکری انقلاب

کا آوازہ بلند نہ کر سکے۔ آج کسی بھی معاشرے کا زندہ رہنا اور ترقی کرنا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ وہ دنیا میں علمی امامت (یا فکری قیادت) کا مرتبہ حاصل کرے۔ جب تک کوئی قوم علمی امامت کی باگ ڈور نہیں سنبھال لیتی اس کا دنیا کے اندر کوئی مقام نہیں۔ اصل بڑی قوت علمی امامت کی ہے جس کی باگ ڈور آج الحاد پسند مغربی دانش وروں کے ہاتھ میں ہے ہمارے دلوں اور دماغوں پر بلکہ رہن سہن اور پسند و ناپسند پر انہی کا سکہ جاری ہے۔

بالکل ابتدائی دور پاکستان سے علمی امامت کے حصول کیلئے تحریک تجدید تعلیم کا کام شروع ہو جانا چاہیئے تھا۔ اس اہم کام کو انجام دینے کے لئے دو اسکیمیں میرے مدنظر رہی ہیں:۔

اولاً یہ کہ تحقیقی کام شروع کیا جائے اور مختلف شعبہ ہائے علوم میں ملحدانہ اور مادہ پرستانہ نقطۂ نظر کے ابطال کے ساتھ خدا پرستانہ نظریات کی بنیادوں پر علوم اور تحقیقات کو استوار کیا جائے۔

کام کی ایک شاخ یہ ہے کہ اسلامی شعور و تہذیب و تعلیم کو ذہن میں کسوٹی کی حیثیت سے رکھ کر کچھ نوجوان تمام مغربی علوم انسانیات (Humanities) اور علوم اشیاء وقویٰ کا دو تین سال میں گہرا مطالعہ کر کے ان کی کج فکریوں اور عملی لغزشوں پر نہایت مدلل طریق سے تنقید لکھیں۔ اولاً وہ خود مغربی حوالوں سے تردید کریں' پھر اسلامی نصوص و تعبیرات سے نہایت ہی خوبصورت انداز بیان میں اپنی دلکش تراکیب و اصطلاحات ایجاد کر کے تنقیدی بحثیں کریں اور مغربی دانش وروں کو جھنجھوڑیں۔

کام کی دوسری شاخ یہ ہے کہ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوانوں کا ایک گروپ اپنے تہذیبی اور دینی حقائق کی روشنی میں اسلام کے خلاف لکھنے والے متقدمین کی غلط بیانیوں اور فضول الزامات اور غلط فہمیوں کو بڑے ہنستے مسکراتے انداز میں اور خوبصورت زبان میں ایسے مسحورانہ ڈھنگ سے لکھے کہ مغرب چونک جائے۔

کام کی تیسری شاخ یہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ' برصغیر کی تاریخ' عالم اسلام کی تاریخ پر کچھ محققین گہری ریسرچ کر کے ان زیادتیوں اور غلط بیانیوں اور تحریف فی التاریخ کے ہتھکنڈوں پر گرفت کریں جن کی زد مسلمانوں پر پڑتی ہے۔

ڈاکٹر سید عبد اللہ مرحوم نے اس سلسلے میں ایک تجویز مرتب کی تھی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ

''مغربی معاشرتی علوم (نفسیات' سوشیالوجی' معاشیات' سیاسیات' تاریخ اور سائنسی فلسفہ) کے چند ایسے مقامی ماہرین کو ڈھونڈ نکالنا چاہئے جو مغربی تہذیب کی روح کے سراپا زہر ہونے پر یقین رکھتے ہوں۔ بنا بریں جدید اخوان الصفا کا کام صرف مغرب کی معاشرتی فکر پر بمباری ہو۔ ان کی اندر کی دنیا اس قابل نہیں کہ اسے منہ لگایا جائے الا بقدر ضرورت۔ جدید مغربی ذہن کی تعمیر کرنے والی بڑی بڑی چند ادبی شخصیتیں' مثلاً مفکر نطشے کے بعد ناول نگار کافکا' ناول نگار دستوفسکی' وجودی فلسفی کامیو اور سارتر (Sartre) اور برطانوی فلسفی برٹنڈ رسل ہمارے مد نظر رہیں تو مناسب ہوگا۔ ڈی ایچ لارنس' ہیمنگوے وغیرہ کا کچھ اثر ہے مگر زوال پذیر ہے۔ تاہم مغربی ذہن جدید کے اساطین یہی ہیں۔''

اسی کے ساتھ مارکسزم (Marxism) اسٹالن ازم اور لینن ازم کے علاوہ اس میدان کے پورے ٹھوس لٹریچر اور تاریخ نظام سوویت (روس میں) سخت ناقدانہ جائزہ لے کر حقیقت کو نتھارا جائے۔ خیال رہے کہ مارکسزم کا بنیادی فلسفہ غیر فطری حسین تصورات پر کھڑا ہے' ان کو پوری طرح واضح کیا جائے۔

ڈاکٹر صاحب نے خوب گرفت کی ہے کہ ''یہ حضرات اپنی قوم کو کس قسم کے انسان سے روشناس کراتے ہیں۔ پاگل' حد درجہ جذباتی' جنونی' لایعنی' احمق' وہم کے مارے ہوئے مریض' نیکی سے بیزار' تخریب کار' سچائی کا نام لے کر انسان سے دشمنی کرنے والے اور مغربی ادب کا فرزانہ گروہ خود اس حکمت پر شرمندہ ہے۔''

مزید چند الفاظ:

''مغرب کا معاشی فکر اپنے تضادات کے ہاتھوں شکست و ریخت کا شکار ہے۔ مغرب کا سیاسی فکر انتشار میں مبتلا ہے۔ طرز ملک داری نہ جمہوری ہے' نہ فاشی صرف بدمعاشی''

ڈاکٹر صاحب سخت نشتر چبھوتے ہوئے کہتے ہیں کہ:۔

''ہمارے ملک کا غلام ابن آزاد اسی پر مٹا ہوا ہے۔ زیادہ کیا لکھوں۔ مغرب کا دیو زخمی ہو چکا ہے۔ اب کہاں ہیں اہل ایمان کہ ایک ضرب ید اللٰھی سے اس کا خاتمہ کر

دیں۔[1]

افسوس کے عرصہ رفتہ کے لحاظ سے بہت ہی حقیر پیمانے پر کام ہو سکا۔ اس پہلو سے پسماندگی اور فرومائیگی کا حال بڑا زبوں ہے۔ اعلیٰ درجے کے تحقیقی اور تخلیقی کارناموں کا بازار سرد پڑا ہے۔[2] سارے پیش رو جہاں تک مختلف نظریات و مباحث کو اسلامی بنیادوں پر استوار کر گئے تھے اور جتنا کچھ تنقیدی شعور وہ مغرب کے جدید علوم کے متعلق دے گئے تھے' زیادہ تر اسی سرمائے کو کافی سمجھ کر کام چلایا گیا۔

میرا خیال ہے کہ ابھی تک ہم نے فلسفہ و نفسیات' تاریخ' سوشیالوجی اور نظریہ ارتقا جیسے مسائل پر اکا دکا معمولی مضامین کے سوا کوئی ایسا ٹھوس کام نہیں کیا کہ دنیا کا کوئی شخص کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے اس سے بے نیاز ہو کر قابل اعتماد اور وقیع تحقیقی کام نہ کر سکے۔ ایسی صدہا کتب اور ان سے متعلق منعقد ہونے والے سیمیناروں اور کانفرنسوں اور مباحثوں اور مساعی خط و کتابت (ملکی اور بین الاقوامی دائروں میں) اور تنقیدی اور وضاحتی مقالات کی عالمی جرائد میں اشاعت کا ایک لمبا سلسلہ آہستہ آہستہ علمی امامت کا رخ ہماری طرف بدل سکتا ہے۔ مگر اس کا کوئی خاص اہتمام اور کوئی خاص تفکر ہمارے ہاں کبھی نہیں پایا گیا۔ پڑھنے لکھنے کے خاموش اور خشک کام جو گوشۂ تنہائی میں خون دل جلا جلا کر انجام پاتے ہیں' ان کے لئے اس مطالعہ گریز معاشرے میں ٹھوس علمی خدمات کی انجام دہی کے لئے جس قسم کے درویشان خدا مست چاہئیں وہ نایاب ہیں۔

اب انقلاب امامت علمی کے سلسلے کی دوسری اسکیم کو لیجئے۔ اعلیٰ درجہ کی معیاری درس گاہیں قائم کی جائیں جن میں استاد دوران خطاب (Lecture) کچھ ایسی چیزیں بھی سکھا دیں جو اسلامی ذہن بنانے والی ہوں اور ایسی عملی تربیت بھی دیتے رہیں جس سے کردار تعمیر ہوں۔ پاکستان بننے کے بعد اگر ایسی درس گاہیں قائم ہو جاتیں تو اب تک سینکڑوں فکری مشعل بردار

---

[1] ڈاکٹر سید عبداللہ کے پانچ خطوط۔ قومی زبان۔ ستمبر ۱۹۹۰

[2] رابطہ عالم اسلامی اور دنیائے اسلام کی مختلف ممالک میں قائم ریسرچ اکیڈیمیز نے اچھا خاصا کام کیا ہے۔ علاوہ ازیں خالص دینی موضوعات (تفسیر' حدیث' فقہ اور سیرت) پر ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد' اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان اور بھارتی مسلمانوں کی اقلیت کے اداروں نے بھی خدمات انجام دی ہیں۔ لیکن جو نظریات تہذیب والحاد کے ستون ہیں ان کے متعلق وقیع کام کا خلاء ہے۔

معاشرے میں ایک انقلابی ذہن کے ساتھ پھیل چکے ہوتے۔ اب بھی وقت ہے کہ مغربی لادینی نظریات کے خلاف ہمیں مضبوط تعلیمی محاذ ضرور قائم کرنا چاہئے اور تعلیمی امامت کے حصول کے لئے ایسے ادارے قائم کرنے چاہئیں جن کی نقشہ بندی اور نگرانی ایسے لوگ کریں جو اصلاً علم اور تعلیم کو پیش نظر رکھیں اور تعلیمی کام میں انقلابی اسپرٹ ضرور داخل کر دیں۔

علاوہ ازیں ایسی ریسرچ اکیڈیمیز قائم کی جائیں جہاں کالجوں کے فارغ التحصیل نوجوانوں کو ایک یا دو سال ماہرین کی سرپرستی میں رکھ کر ان کے اندر انقلابی اسپرٹ[1] پیدا کی جائے ' دینی علم' عربی زبان اور ذوق تحقیق کی صلاحیتیں نکھاری جائیں تاکہ وہ علمی تحقیق' تعلیم' علمی اداروں' پارلیمانی سیاست کے لئے کارآمد بن سکیں۔

اس میدان کار میں ہمارا ایک مختصر سا علمی گروپ اگر قلب اور میمنہ اور میسرہ قائم کر کے صف آرا ہو جائے تو ذہنی فضا بدل سکتی ہے مگر اس کے لئے ایسے جنونی لوگ درکار ہیں کہ دولت اور معیار زندگی کی کشمکش اور جاہ و حشم کی بازاری سیاست سے اپنے آپ کو الگ رکھ کر فکری اور تہذیبی کارزار میں اپنا فرض ادا کرنے کے لئے وقف کر سکیں اور اپنے نفس کی خواہشات کو اپنے اوپر سواری نہ کرنے دیں۔

افسوس کہ اس پہلو سے پسماندگی اور فرومائیگی کا حال بڑا زبوں ہے۔ اعلیٰ درجے کے تحقیقی اور تخلیقی کارناموں کا بازار سرد پڑا ہے۔

حالانکہ یہ میدان اگر کوئی قوم سر نہ کر سکے تو پھر وہ کسی بھی میدان میں اپنا سر ابھار نہیں سکتی۔ بلکہ فکری اور معاشی اور ثقافتی غلامی کی وجہ سے اس کی زندگی کا جوہر بری طرح تباہ ہوتا ہے۔

پس تہذیبی نظریۂ تعلیم ہی وہ بہترین محرک ہے جو تحقیق و تخلیق کے اعلیٰ کارناموں کے لئے اکساہٹ پیدا کر کے نوجوان قوتوں کو آگے لائے جو علمی امامت یا فکری لیڈر شپ کا تاج

---

[1] مارکسی ذہن کے ایک فاضل استاد سے ایک مرتبہ کسی نے کہا کہ تم حقیری تنخواہ پر اسلامیہ کالج میں پروفیسری کیوں کر رہے ہو (اس زمانہ میں محکمہ تعلیم کی تنخواہوں کا معیار کم تھا اور پرائیویٹ اداروں کا اور بھی کم) تو انہوں نے جواب دیا کہ میرے کام کا اتنا صلہ میرے لئے بہت ہے کہ میں ہر سال دو چار نوجوانوں کو ذہنی طور پر یہاں سے تیار کر کے معاشرے میں بھجواتا ہوں۔ یہ ہوتی ہے انقلابی اسپرٹ۔

اپنی قوم کے سر پر رکھ سکیں۔

اغیار کے نظریات وتہذیبی تصورات جن کی جڑیں دل و دماغ میں گہری نہیں اتر سکتیں' وہ کبھی علمی امامت کے حصول کا ذریعہ نہیں بن سکتے۔ بلکہ علمی وفکری وثقافتی غلامی کا ذریعہ بنتے ہیں۔

اس جانکاہ سفر ترقی کے لئے ہمارا زادراہ تہذیبی نظریہ علم ونظریہ تعلیم ہے۔

حصہ دوم

پاکستانی نظام تعلیم

تہذیبی کشمکش اور سر سیدؒ

سرزمین ہند پر برطانوی سامراج کی یلغار کو روکنے کے لئے دو بڑی تحریکیں اٹھیں' ایک تحریک مجاہدین ۱۸۲۶ء' دوسرا انقلاب ۱۸۵۷ء۔ اول الذکر تحریک گہری جڑیں رکھنے والی اور ایک ٹھوس منصوبے کے تحت کام کرنے والی تحریک تھی۔ موخر الذکر کا ظہور بجھی بجھی قوتِ مزاحمت کی بارود کے یکایک پھٹ جانے سے ہوا۔ دونوں برطانوی یلغار کو نہ روک سکیں۔ پلاسی کی لڑائی (۱۷۵۷ء) سے جو ٹریجڈی شروع ہوئی تھی وہ ۱۸۵۷ء تک' ایک صدی میں تکمیل کو پہنچ گئی۔ خاص طور پر مسلمانوں پر نووارد فاتحین کا قہر ٹوٹ پڑا' کیونکہ ہر تحریک مزاحمت کی روح رواں وہ تھے۔ ایک اس وجہ سے کہ ان کا دین اس میں مانع تھا کہ وہ کسی کافرانہ نظام کے تحت زندگی بسر کرنے کے لئے خوشی خوشی تیار ہو جائیں' دوسرے اس وجہ سے کہ ملک کی زمام کار انہی کے ہاتھ میں تھی اور انہیں تخت سے اتار کر زنجیریں پہنائی جا رہی تھیں۔ ملک کے ہندوؤں کے لئے چونکہ صرف فرماں رواؤں کی تبدیلی کا مسئلہ تھا اس وجہ سے انہوں نے بڑی آسانی سے نئے حکمرانوں کے دربار میں مقام اعتبار حاصل کر لیا۔ انگریز نے سیاسی قوت اپنے ہاتھ میں لے لی اور ہندوؤں کو اپنی سرپرستی میں تعلیم' ملازمتوں اور کاروباری دائروں میں نشوونما پانے کے مواقع فراہم کئے اور دوسری طرف مسلمانوں کو دارورسن کی چکی میں پیسا جانے لگا۔

سیاسی جدوجہد کی بھرپور شکست کے بعد جب کوئی نئی راہ عمل باقی نہ رہی اور نہ جذبات مزاحمت کو متحرک کرنے کا کوئی موقع برطانوی استبداد نے باقی چھوڑا تو مسلمان ذہنی شکست کے خوفناک بحران سے دوچار ہو گئے۔ ۱۸۷۰ء تک حالات کا قافلہ جہاں تک پہنچا' اس کی روئداد سفر اپنے خاص نقطۂ نظر سے ولیم ہنٹر نے اپنی مشہور کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' (Our Indian Musalmans) میں پیش کر دی ہے۔

سرسید کی شخصیت

قومی شکست کے اس دور میں جبکہ مسلمان سیاسی و ذہنی قیادت کے خلا سے دوچار تھے سرسید کی شخصیت ابھری اور ایک بادل کی طرح چھا گئی۔ انہوں نے مذہبی و معاشرتی مسائل پر مضامین' کتب' رسالہ تہذیب الاخلاق کی اشاعت کے علاوہ' مناظرانہ بحثوں میں بھی تحریری حصہ لیا' اور منصف کی حیثیت سے ملازمت کرتے ہوئے تعلیم کے فروغ کے لئے مدرسے (۱۸۵۹ء میں بمقام مراد آباد اور ۱۸۶۴ء میں بمقام غازی پور) قائم کئے' نیز مغربی علوم کی ترویج کے لئے سائنٹیفک سوسائٹی (Scientific Society) غازی پور کا آغاز ۱۸۶۳ء میں کیا۔ یہاں تک ابتدائی مرحلہ کار میں سرسید نے ہندو مسلم کے امتیاز کے بغیر معاشرے کو نئے حالات کے سانچے میں ڈھالنے کا کام کیا' لیکن بیچ میں انہیں قیام بنارس کے دوران کچھ تلخ واقعات و حقائق کا تجربہ ہوا۔ بنارس کے سربرآوردہ ہندوؤں نے اس بات کے لئے جدوجہد شروع کرنے کا فیصلہ کیا کہ سرکاری عدالتوں میں اردو زبان اور فارسی رسم الخط کو ختم کرا کے اس کے بجائے بھاشا زبان جاری کرائی جائے جس کا رسم الخط دیوناگری ہو۔

یہ ۱۸۶۷ء کا واقعہ ہے جس میں کام کرنے والی ہندو ذہنیت اور جس کے دوررس ممکنات و مضمرات کا شعور ہوتے ہی سرسید اس فیصلے پر پہنچ گئے کہ ہندو مسلمانوں کا بہ طور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے مشترک کوشش کرنا محال ہے۔ یہی موقع ہے جبکہ انہوں نے اپنے آپ کو ''مسلمانوں کی ترقی'' کے لئے وقف کر دیا۔ ۱۸۶۹ء میں وہ ولایت گئے' اکتوبر ۱۸۷۰ء میں واپس آئے' دسمبر ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق کا اجرا کیا' اسی زمانے میں انہوں نے ''کمیٹی خواستگار ترقی مسلمانان'' قائم کی جس کے ذریعے فیصلہ کیا گیا کہ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک کالج کھولا جائے چنانچہ ''محمڈن کالج فنڈ کمیٹی'' قائم ہو گئی۔ ۱۸۷۳ء میں ان کے بیٹے سید محمود نے کالج کی مکمل اسکیم مرتب کر کے پیش کی' اور اسکیم کے نقطۂ آغاز کے طور پر ۱۸۷۵ء میں ایم اے او ہائی اسکول بمقام علی گڑھ قائم ہوا اور ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن کے ہاتھوں کالج کا افتتاح ہوا۔

سرسید کی اہمیت

سرسید سے ہمیں ہزار اختلاف ہوں' مگر ان کی شخصیت اس لحاظ سے تاریخ میں بڑی

اہمیت رکھتی ہے کہ وہ یاس انگیز قومی شکست کے دور کے لیڈر ہیں اور شکست کے محاذ پر کھڑے ہونا بجائے خود بڑی بات ہے۔ لیکن شکست کا یہ لیڈر جو شکست کے حالات سے قوم کو نکال کر ترقی کی راہ طے کراتے ہوئے ایک نئی فتح تک پہنچانا چاہتا تھا اس لحاظ سے بے حد قابل رحم ہے کہ اپنا نصب العین حاصل نہ کر سکا اور کالج کے درخت سے اکیس سالہ دور آبیاری میں جن ثمرات کی امیدیں اس نے باندھی تھیں تاریخی ریکارڈ گواہ ہے کہ ان کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے سرسید کے آخری دور پر دل شکستگی کی گہری پرچھائیں دکھائی دیتی ہے۔

سرسید کالج کے ذریعے ترقی کی مہم کے لئے نئے مردان کار اس تصور کے مطابق پیدا کرنا چاہتے تھے کہ "فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا' نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں' اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر" سرسید کا یہ خواب پوری طرح پریشان ہو گیا' کیونکہ علی گڑھ کے پیدا کردہ رجال چند مستثنیات کو چھوڑ کر ملازمتوں اور مادی مفاد کی ہوس اور یورپ کی تقلید میں اس بری طرح بہ گئے کہ نہ وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کو (کم سے کم اپنی ہی عملی زندگیوں میں سہی) کلمہ علیا بنانے کے لئے کچھ کر سکے' نہ فلسفہ اور سائنس کے میدانوں میں انہوں نے کوئی جھنڈے گاڑے' نہ قوم میں اخلاقی علو پیدا کرنے کے لحاظ سے ان کا کوئی نمایاں پارٹ ہے اور نہ سیاسی میدان میں انگریز کا مقابلہ اور ہندو قوم کی مسابقت کرنے کے لئے وہ گہرا تدبر اور مضبوط کردار رکھنے والی قیادت فراہم کر سکے۔ حیرت ہے کہ قدیم طرز کی درس گاہوں میں چٹائیوں پر تعلیم پانے والوں نے مذہب' علوم اور سیاست کے سارے میدانوں میں نہایت قد آور شخصیات خاصی تعداد میں پیش کی ہیں جن کی خدمات کے ہم شرمندۂ احسان ہیں۔

سرسید جس کہانی کے ہیرو تھے' وہ کتنی بڑی ٹریجڈی ہے۔

علی گڑھ اور تہذیبی شکست

اس ٹریجڈی کا نہایت تفصیل سے تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے' مگر ہم یہاں اجمالاً اپنی رائے بیان کرنا چاہتے ہیں سرسید نے برطانوی سامراج کے تسلط کو ایک سیاسی حادثے کی حیثیت میں سامنے رکھ کر مسلمانوں کو اس کی لپیٹ میں آ کر تباہ ہونے سے بچانے کی' اور نئے حالات میں ان کو بہتر جگہ دلوانے کی جو کوشش کی' اس میں وہ اس تہذیبی یلغار میں نادانستہ طور

پر حریف کے آلہ کار بن گئے۔ نادانستگی کی یہ حد ہے کہ وہ اپنے تعلیمی لائحہ عمل، اپنے علم الکلام اور اپنی سیاسی حکمت عملی میں ان طریقوں کو اختیار کرتے ہوئے جو قوم کو تہذیبی غلامی میں مبتلا کرنے والے تھے، اپنی ترقی کی مہم سے یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ لا الہ الا اللہ پر قائم ہونے والی تہذیب جگمگا اٹھے گی۔ انہوں نے قوم میں مغرب کے لئے حد سے زیادہ مرعوبیت پیدا کر دی، انہوں نے فکری اور معاشرتی دونوں پہلوؤں سے تقلید فرنگ کو ترقی کی راہ قرار دیا، انہوں نے نئے طریق تفسیر اور علم کلام کے ذریعے مسلمہ دینی معتقدات اور متفق علیہ ضوابط و اقدار کو مغربی ذوقیات، رجحانات اور اعتراضات کی روشنی میں چھیل چھال دیا، انہوں نے علمی لحاظ سے حسی عقلیت (نیچریت) اور سیاسی و اقتصادی لحاظ سے مادی مفاد کو پہلی بار مسلمانوں میں رواج دیا۔ ان وجوہ سے ان کی مساعی کا منطقی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ مسلمان تہذیبی محاذ پر زیادہ خطرناک قسم کی شکست کھا جائیں۔ سرسید کے جہانِ افکار کا اگر خورد بینی تدبر سے تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اندر سے ان کے دل و دماغ نئی قوت کے سامنے مفتوح ہو چکے تھے مگر اپنی باطنی شکست کا شعور نہ رکھنے کی وجہ سے ان کا انداز کار ایسا تھا گویا کہ وہ کوئی جنگ لڑنے چلے ہیں اور حملہ آور طاقت کو زک دے کر رہیں گے مگر مفتوح دل و دماغ کے ساتھ کوئی فاتحانہ کارنامہ قابل تصور نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ علی گڑھ تحریک کے فروغ کے ساتھ ساتھ ہماری تہذیبی شکست کی تیزی سے تکمیل ہوتی چلی گئی۔ مذہب کے بارے میں جن الجھنوں کا آغاز ہوا ان کے نتیجے میں الحاد نمودار ہوا، فکری لحاظ سے مخالف اسلام نظریات کے لئے دروازے کھل گئے، اقتصادی لحاظ سے ہر ممکن طریقے سے مفاد سمیٹنے کی بڑھتی ہوئی تو نس نے پہلے جاگیرداری اور پھر سرمایہ داری کو بدترین صورتوں میں نشوونما دی۔ معاشرتی لحاظ سے جو عمل انحطاط انگریزی زبان بولنے، انگریزی لباس پہننے اور انگریزی رہن سہن اختیار کرنے سے شروع ہوا، آگے چل کر وہ بے پردگی، ثقافتی تحول اور خاندان کے بزرگوں اور خوردوں میں کشمکش پر منتج ہوا، مذہبی لحاظ سے علم کلام میں تجدد کے جو بیج بوئے گئے تھے بعد میں ان سے قادیانیت اور انکار حدیث کے فتنوں کا ظہور ہوا۔ مسلمانیت اور مغربیت جیسے متضاد عناصر کو جمع کرنے کی وجہ سے سب سے بڑی بیماری جو قوم میں تسلسل سے پھیلتی چلی گئی وہ آج ہمہ گیر منافقت کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ خواص و عوام کی اکثریت کی سرگرمیاں اپنے خود غرضانہ مفاد کے محور پر گھومتی ہیں سیاسی اور مذہبی قائدین کے قول و فعل

میں فاصلے بڑھ گئے ہیں' ہر ہاتھی کھانے کے دانت الگ اور دکھانے کے دانت الگ رکھتا ہے۔ تقریروں اور بیانوں میں اسلامی اصطلاحات اور ملی سلوگن نگینوں کی طرح جڑے ہوتے ہیں مگر عملی تگ و تاز میں اسلامی اصولوں اور ملی مقاصد کو دھڑلے سے پامال کیا جاتا ہے۔ سیاست عوام کو بے وقوف بنانے کے فن پر مبنی ہے' کاروبار سے لے کر حرفت تک کے سارے دائروں میں اسلامی اخلاقیات کی تباہی کا عمل خود مسلمانوں کے ہاتھوں سے جاری ہے۔

مگر اس ساری گفتگو میں ہمیں اس بات کی راہ جواز نہیں ملی کہ ہم سرسید کی نیت پر کوئی شبہ کریں۔ وہ اعلیٰ مذہبی ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے پکے مذہبی آدمی تھے' وہ قابلیت سے مالا مال تھے' ان میں قومی خدمت کا جذبہ تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کی ترقی کے لئے بڑی دوڑ دھوپ کی۔ ساری گڑبڑ قوم کے مرض کی تشخیص کرنے اور نسخہ علاج تجویز کرنے میں ہوئی۔

مسلمانوں کی تہذیبی ہستی

اس لمبی' مگر حقیقت کے اعتبار سے مختصر تمہید کے ساتھ مجھے یہ کہنا ہے کہ برطانوی سامراج کی یلغار جس تہذیبی تصادم کو لے کر آئی اور جس کی کاری ضرب مسلمانوں پر پڑی اس کی وجہ سے بعد میں مسلمانوں کی تباہ ہوتی تہذیبی ہستی کو بچانے کا مسئلہ شاید ان کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا۔ اس سے پہلے سرزمین ہند کی تاریخ میں مسلمانوں کی تہذیبی ہستی کو دور اکبری میں ہندو تہذیب کے درباری نفوذ سے سنگین خطرہ پیش آیا تھا جس کی مزاحمت کے لئے حضرت مجدد الف ثانی ؒ میدان میں آئے اور اپنی مہم میں کامیاب رہے۔ لیکن اس دور کے محدود حملے کے مقابلے میں برطانوی دور کا تہذیبی حملہ نہایت وسیع قسم کا تھا۔ پھر سابق حملہ محکوم قوم کی طرف سے تھا۔ اور اب جو حملہ درپیش تھا اس کی کمان مسلمانوں کو سیاسی شکست دے کر حکمران بننے والی قوم کے ہاتھوں میں تھی۔ تحریک مجاہدین کے علم بردار اس حملے کو روکنے کے لئے موزوں ثابت ہو سکتے تھے مگر وہ تحریک کچل دی گئی اس کے بعد کاش کہ ہمارے ہاں کوئی ایسی شخصیت اٹھتی جس کی صحیح ذہنی رہنمائی سے قوم مغرب پرستانہ نقطۂ نگاہ سے بچ کر ناقدانہ انداز سے جدید علوم اور سیاسی و معاشرتی تجربات سے خذ ما صفا کے کلیے کے مطابق استفادہ کرتی' مگر اپنے تہذیبی وجود اور دینی تشخص اور نیشنل ٹائپ کے تحفظ کے لئے ایک ایک انچ پر جنگ آزما ہوتی۔ مگر الٹا ہوا یہ کہ سیاسی شکست کے بعد تہذیبی شکست کا دروازہ کھلا اور جب یہ شکست اچھی طرح اپنی برکات

پھیلا چکی تو اس کے چنگل سے مسلمانوں کو نجات دلانے کے لئے وہ بھرپور فکری' معاشرتی اور سیاسی تحریک اٹھی جسے برپا کرنے کا سہرا مولانا مودودیؒ کے سر ہے۔

○

سر سیدؒ کا تعلیمی کارنامہ *

علامہ اقبال کا تبصرہ

سر سید کے تعلیمی کارنامہ کے متعلق علامہ اقبالؒ کے خیالات:

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ
تخم دیگر بکف آریم و بکاریم زنو
کانچہ کشتیم ز خجلت نتواں کرد درو
(بانگ درا)

فارسی شعر جس پر علامہ نے تضمین لکھی ہے ملا عرشی کا ہے' شعر کا مختصر ترجمہ کچھ یوں ہے۔ "چلو اب کوئی دوسرا بیج حاصل کریں اور از سر نو کاشت کریں' کیونکہ جو کچھ ہم نے بویا تھا (اور فصل تیار ہے) اسے تو ہم مارے ندامت کے کاٹ بھی نہیں سکتے۔" کیا شعر ہے گویا معانی کی ایک پوری یونیورسٹی ہے۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے دور حاضر کے خاتم الائمہ حضرت علامہ اقبال کا نقطۂ نظر' آپ سر سید کو لئے بیٹھے رہیں' اور سر سید کے بعد وسیع تر ذہن اور عظیم تر فکر لانے والا حکیم الامت تو

* ۹۰ کی دہائی کے شروع میں ایک وزیر صاحب کا مضمون اخبارات میں شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے ارادہ ظاہر کیا تھا کہ ہمیں سر سید والی لڑائی ایک بار پھر لڑنی پڑے گی۔ اس کے جواب میں "سر سید بخلاف سر سید" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا گیا تھا۔ یہ اقتباس اسی مضمون سے لیا گیا ہے۔

دور حاضر کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہوا اٹھا' اب آپ پیروی مغرب والا قدیم مسلک پسند کرتے ہیں یا مغربی فکر و تہذیب سے استیز والا۔ تقلید یا معرکہ آرائی!

مطلب یہ نہیں کہ آپ مغرب کے جدید علوم یا ٹیکنالوجی سے نفرت کرنے لگیں۔ جنگ تو صرف ملحدانہ نقطۂ نظر کے خلاف ہے جس میں سائنسی اور ٹیکنالوجیکل علوم کو بھی گوندھ دیا گیا۔ اس طرح ہمارے لئے "معجون فلک سیر" تیار کر دی گئی ہے جس کی نشہ آور خوراک لینے کے بعد آدمی اپنے آپ کو ثقافت کی ہفت رنگی دھنک کی پینگ پر بیٹھا جھلارے لیتا محسوس کرتا ہے۔

متذکرہ اشعار سے پہلے علامہ محترم نے طلبہ علی گڑھ کالج سے خطابِ منظوم میں فرمایا کہ ؎

طائر زیرِدام کے نالے تو سن چکے ہو تم
یہ بھی سنو کہ نالۂ طائرِ بام اور ہے

طائر زیرِدام اور طائرِ بام کون لوگ ہیں! کچھ سوچیے علامہ کا پیغام اس شعر میں ہے کہ ؎

جذبِ حرم سے ہے فروغ ' انجمن حجاز کا
اس کا مقام اور ہے' اس کا نظام اور ہے

یعنی مقام و نظام وہ نہیں جس پر تمہاری نگاہیں مرتکز کرا دی گئی ہیں۔ بالِ جبریل کا ایک ذرا سا اشارہ بڑا اہم ہے۔ شعر ہے ؎

مردِ درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصاب زر و سیم

یہاں زکوٰۃ والا نصاب بھی مراد لے سکتے ہیں' مگر زیادہ اہم نصاب تعلیم ہے جو معاش اور ملازمتوں کے حصول کے لئے کامیاب ہونے والوں کو ڈگریوں کی شکل میں تعویذ مہیا کر دے۔ اس وقت (اور پہلے بھی) امامانِ تعلیم اور پالیسی سازوں اور نصاب تجویز کرنیوالوں نے معاش' روپے' ملازمتوں اور عہدوں کے محور پر ہی اس کو گھمایا ہے۔

یہی حال علی گڑھ کا تھا اور یہ ذہنیت نمایاں طور پر وہاں کام کرتی تھی جس کا ذکر ہو چکا ہے۔

اقبال سے اور بھی استفادہ کریں ؎

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیب حاضر میں
بھڑک اٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تنِ خاکی

نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے
یہ رعنائی' یہ بیداری' یہ آزادی' یہ بے باکی
حیات تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت' خود فروشی' ناشکیبائی' ہوسناکی

(بانگ درا)

اور سنئے:

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف۔

(بال جبریل)

علی گڑھ کی فضا

شیخ محمد اکرام مورخ کی رصد گاہ میں بیٹھ کر ماضی کا مطالعہ کرتے ہوئے اظہار تاثر کرتے ہیں کہ:

"اگر ان لوگوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے جن کے ملحد' مذہب مخالف اور منکرِ خدا ہونے کا شہرہ ہے تو بھی ـــــ علی گڑھ کی فضا کے اندر ہی اندر ایک عام ایمانی کمزوری اور روحانی کم ہمتی کا سراغ ملے گا ـــــ وہاں کے قابل اور ذہین اساتذہ اور تیز ہونہار طلبہ کی باتیں سنیں اور ان کے ذہنی رجحانات کا تجزیہ کریں تو احساس ہوگا کہ ـــــ ان کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ آپ انہیں کسی طرح دقیانوسی اور قدامت پسند مسلمان نہ سمجھ لیں۔"

(موج کوثر ص ۱۵۶۔۱۵۷)

اس کیفیت کو اکبر الہ آبادی نے شعر میں منعکس کیا ہے ۔

جو پوچھا مجھ سے دورِ چرخ نے کیا تو مسلماں ہے؟
میں گھبرایا کہ اس دریافت میں کیا راز پنہاں ہے
کروں اقرار تو شاید یہ بے مہری کرے مجھ پر
اگر انکار کرتا ہوں تو خوفِ قہرِ یزداں ہے
بالآخر کہہ دیا میں نے کہ مسلم تو ہے یہ بندہ
و لیکن مولوی ہرگز نہیں ہے' خانساماں ہے

داد دیجئے لفظ خانساماں کی۔ یعنی خادم آپ کے دستر خوان پر لحم خنزیر اور شراب ناب پیش کر سکتا ہے۔ تو اکبر نے یہ دیکھا کہ خانساماؤں کی پوری قوم تیار ہو رہی ہے۔ اس طنزیہ شاعری کی حقیقت بیانی سے اندازہ کیجئے کہ انگریز نے مسلمانوں کو دینی ماضی سے کاٹ دینے کی کیسی موثر اسکیم اختیار کی۔

سرسید کے ایک مداح ایس ڈبلیو بلنٹ (S.W.Blunt) نے تحسینی طور پر کہا:

''سرسید نے علی گڑھ مسلم کالج کو انگلش یونیورسٹی کی بنیادوں پر تعمیر کرنے اور مسلم طلبہ کو خالص انگریزی تعلیم دینے کی کوشش میں نہ صرف انہیں کم تر جنونی بنا دیا بلکہ کمتر مخلص مسلمان بھی بنا دیا۔''

لفظ ''جنونی'' بھی مغربی ٹکسال کی ایک گالی ہے۔ سرمستان ایمان مسلموں کے لئے بلنٹ نے مخلص مسلمان کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

کیا قابل فخر سرٹیفکیٹ ہے کہ علی گڑھ نے مسلم طلبہ کو ''کم تر مخلص مسلمان'' بنا دیا ہے۔ (بالفاظ دیگر اس تحسین میں منافقت کی گالی بھی کم بخت نے شامل کر دی ہے)

بلنٹ کے مزید ارشادات ملاحظہ فرمائیے:۔

''میں نے ہمیشہ ان کے ساتھ بات کرتے ہوئے جبر سے کام لیا ہے اس لئے کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ ان سے ''متقی'' مسلمانوں کا سا معاملہ کیا جائے ـــــ وہ جب بات کرتے ہیں تو ان کا لہجہ معذرت خواہانہ ہوتا ہے اس قدر معذرت خواہانہ جیسا کہہ رہے ہیں کہ ہم اتنے کافر نہیں جتنا کہ تم نے فرض کر لیا ہے۔''

شیخ اکرام کا مطالعہ و تجزیہ یہ ہے کہ:

''ایک پست درجے کی مادیت اور معیشت پرستی پیدا ہوگئی جو نہ صرف طلبہ کی مذہبی ترقی اور روحانی تربیت کے لئے ناسازگار تھی بلکہ جس نے ان کی دنیوی ترقی پر بھی اثر ڈالا۔''

(موج کوثر از شیخ محمد اکرام۔ ص ۱۴۷)

سرسید کے تیار کردہ شاہکاروں کے متعلق شیخ صاحب کہتے ہیں:۔

''نہ ارادے بلند' نہ ان کے اندر علم کا شوق' محنت اور مستعدی تھی اور نہ قربانی و ایثار کا جذبہ تھا' نہ ان میں ارادے کی پختگی پائی جاتی تھی' نہ ایمان کامل۔ حقیقی یا خیالی ضروریات نے

ان کے مطمع نظر کو محدود کر دیا اور روحانی کمزوری سے کیریکٹر پست ہو گئے۔"

(موج کوثر ص ۔ ۱۴۷)

اسی سلسلے میں مولانا حالی نے کہا تھا کہ:۔

"۲۶ برس کے تجربے سے ان کو (یعنی سر سید کو) اس قدر ضرور معلوم ہو گیا ہو گا کہ انگریزی زبان میں بھی ایسی تعلیم ہو سکتی ہے جو دیسی زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ نکمی، فضول اور اعلیٰ لیاقت پیدا کرنے سے قاصر ہو۔" (موج کوثر ص ۲۲۸)

علامہ شبلی جو علی گڑھ میں پروفیسر تھے' لہٰذا حالات کے چشم دید گواہ۔ انہوں نے ایک خط میں لکھا:

"انگریزی خواں قوم (مراد گروہ) نہایت مہمل فرقہ ہے۔ مذہب کو جانے دو' خیالات کی وسعت' سچی آزادی' بلند ہمتی' ترقی کا جوش برائے نام نہیں —— بس خالی کوٹ پتلونوں کی نمائش گاہ ہے۔"

علامہ اقبال ایک خط (بنام سید سلیمان ندوی) میں لکھتے ہیں:۔

"مگر میں یہ دیکھتا ہوں کہ اسلامی ممالک میں عوام اور تعلیم یافتہ لوگ دونوں طبقے علوم اسلامیہ سے بے خبر ہیں۔ اس بے خبری سے آپ کی اصطلاح میں یورپ کے "معنوی استیلاء" (یعنی فکری بالادستی) کا اندیشہ ہے جس کا سدباب ضروری ہے —— کیا عجب کے اسلامی ہند کی آئندہ نسلوں کی نگاہوں میں ندوہ' علی گڑھ سے زیادہ مفید ثابت ہو۔"

[اقبال سید سلیمان ندوی کی نظر میں ص ۱۸۸۔ اختر راہی]

اب آخر میں خود سر سید کی بھی سنئے ۔ ۱۸۹۰ء کے ایک مکتوب میں یوں اظہار کیا ہے:۔

"تعجب یہ ہے کہ جو تعلیم پاتے جاتے ہیں اور جن سے قومی بھلائی کی امید تھی وہ خود شیطان اور بدترین قوم ہوتے جاتے ہیں۔" (موج کوثر ص ۲۲۸)

علی گڑھ کی تعلیم

ایک نگاہ عمیق و وسیع ڈال کر اگر جامع طور پر دیکھا جائے کہ علی گڑھ کی تعلیم نے علمی' معاشرتی اور معاشی رویئے کیا پیدا کئے تو وہ بہت واضح ہیں۔ (۱) قول و فعل میں تضاد اور اسلام کے بارے میں مداہنت بلکہ لاپرواہی اور بے تعلقی' (۲) دوں ہمتی اتنی کہ اگر کسی نے اسلام کا

کام کرنا بھی چاہا تو یہ احتیاط برتی کہ اسلام کا نام کہیں سامنے نہ آئے ـــــ لوگوں میں نکو بن جانے سے لے کر تھانے میں رپٹ درج ہونے کا اندیشہ تھا' (۳) مغربی فکر اور مغربی تہذیب سے مرعوبیت اور مسحوریت (بلا جرأت اختلاف وتنقید) ادھر کے کسی اصول یا روایت و قدر کا انکار' (۴) مادہ پرستی اور دنیا پرستی۔

ایسے علی گڑھ کے شاخسار میں الحاد' لادینیت اور کمیونزم اور ترقی پسندی نے خوب اپنے گھونسلے بنائے اور انڈوں بچوں کی پرورش کی۔ جو اسلام سے وابستہ رہے بھی وہ مسلمانی بلا اسلام اور ایمان بلاعمل اور سیاست و معاش بلا اخلاق اور تحریک بلا منصوبہ مستقبل' مجہول روش کے لوگ تھے (کچھ لوگ مستثنیٰ بھی ہو سکتے ہیں)۔

یہ تھا علی گڑھ جس نے تحریک پاکستان کو سپاہی فراہم کیے جن میں ملحد اور کمیونسٹ اور اسلام بلاعلم کے علمبردار بھی بڑی اکثریت کے ساتھ شامل ہوئے۔

اقبال معلم خودی

اقبال ترجمان حقیقت تھا' حکیم نکتہ داں تھا' دانائے راز تھا' معلم خودی تھا' معرکہ آموز عشق تھا' رجز خوانِ جنگاہِ حیات تھا' ذہنی انقلاب کا نقیب تھا' اس کی شاعری چمن زار تخیل میں نسیم سحری کی طرح موج خرام ناز تھی۔

○

اقبال دورِ رواں کے سب سے بڑے معرکے کے لئے ہر صاحب دل کو اور قریبی رابطے کی وجہ سے ملت کے ہر نوجوان کو پکارتا ہے۔ وہ سب سے بڑا معرکہ مادیت و روحانیت کا ہے یا کہیے کہ مادہ پرستی اور خدا پرستی کا۔ (جسے اقبالؒ نے معرکہ روح و بدن کہا ہے)۔ وہ تہذیب مغرب کا تجزیہ کر کے دکھاتا ہے کہ یہ سب مادہ پرستانہ نقطہ نظر کا طلسم ہے اور دوسری طرف وہ اسلام کو اسی حیثیت سے نمایاں کرتا ہے کہ وہ ایک خدا پرستانہ نظام تہذیب ہے۔ وہ خود مادہ پرستی کے خلاف عرصہ پیکار میں کھڑا ہے اور جہاں جہاں تک اس کی آواز جاتی ہے وہ ہر کسی کو اس معرکے کے لئے پکارتا ہے کہ جہاں سے جو کوئی سچی خدا پرستی کی قوت لے کر اٹھ سکتا ہو اٹھے۔

میدان جنگ بڑا وسیع ہے علوم اور خیالات کا دائرہ ہے' تعلیم کا حلقہ ہے' لٹریچر کی دنیا ہے' صحافت اور دوسرے ذرائع ابلاغ ہیں' ادب اور ثقافت ہے' گھریلو زندگی اور نظام معاشرت ہے' سیاسی اقتدار اور عدالتی نظام ہے' وغیرہ۔ وہ ان سارے میدانوں میں یہ چاہتا ہے کہ خدا پرستوں کی قوتیں مادہ پرستانہ تہذیب کی فتنہ سامانیوں اور فکری تباہ کاریوں اور اخلاق سوزیوں کے خلاف برسرِ عمل ہو جائیں' بلکہ اقبال کا یہ فکری پس منظر سمجھ میں آ جائے تو پھر اندازہ کرنا مشکل نہیں رہتا کہ کس غرض کے لئے وہ ایک الگ خطۂ زمین اس ملت کے لئے حاصل کرنا چاہتا تھا جس کے اسلامی رجحانات میں اگر آفاقی روح اور بین الانسانی خدمت کا جذبہ ابھار دیا جائے تو وہ ایک بنیادی اور بڑے جہانی انقلاب کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

○

کوئی قوم اپنے امتیازی وجود کو جانے بغیر اور اس کے تحفظ کا جذبۂ بیتاب پیدا کئے بغیر تاریخ میں کوئی اہم معرکہ نہیں لڑ سکتی۔ اس کی ساری قوت عمل اس کے نظریہ و نصب العین پر مدار رکھتی ہے۔ اقبال نے ہمارے سامنے ہمارے مخصوص نظریۂ حیات اور ہمارے نصب العین کو اجاگر کیا' اور ہمیں یہ احساس دلایا کہ ہم دنیا بھر کی قوموں اور عالمی طاقتوں سے مختلف ایک امتیازی قوت ہیں' ہمیں فکری برتری حاصل ہے' ہمارے اخلاقی تصورات بلند تر ہیں' ہمارے نظام تہذیب کا معیار بلند ہے۔ ہمارے اقتصادی توازن کا خاکہ بہترین ہے۔ صرف خود ناشعوری اور کوتاہ عملی اور کشمکش ہستی سے گریز کی عادت نے ہمیں شاہین کے مقام سے گرا کر ممولوں کی صفوں میں لا ڈالا ہے۔

○

جاوید نامے کے آخری باب یعنی ''سخنے بہ نژادِ نو'' میں اسلام کے اخلاقی تصورات خاصے اجاگر ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ نظم نظام تعلیم کی رہنمائی کرتی ہے کہ ہم (ملت اسلامیہ) کو کیسے انسان اور کیسے نوجوان درکار ہیں؟ اقبال نے بڑی خوبصورتی سے اسلامی نظام تعلیم کے لئے خطوط رہنمائی (Guide Lines) طے کر کے ہمارے سامنے رکھے ہیں۔

○

ہر چند کہ مسئلہ تعلیم پر اقبال کے نظریات اور اصول بہت بڑے وسیع پیمانے پر اس کی نثری اور منظوم تحریروں میں پھیلے ہوئے ہیں' اور اصل کام یہ ہے کہ ان چیزوں کو سمیٹ کر نہایت خوبصورتی سے واضح کیا جائے کہ اقبال نظام تعلیم کے لئے کیا نظریات دیتے ہیں' وہ کیسا نظریہ حیات و کائنات اور کیسا تصور انسان ہمارے سامنے رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک غایت تعلیم کیا ہے۔ وہ اسلامی تصور تعلیم اور جدید مادہ پرستانہ تصور تعلیم کے تضاد کو کس طرح نمایاں کرتے ہیں میرے سامنے بعض متفرق اشعار آ گئے۔

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا
زناری برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا صدف گہر سے خالی
ہے اس کا طلسم سب خیالی

علم را برتن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

نشستم بانکویان فرنگی
ازاں بے نور تر روزے نہ دیدم

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لاالہ الا اللہ

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے' اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر!

علم میں عزت بھی ہے' دولت بھی ہے' لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

الہ آباد کی تقریر میں تعلیمی وتہذیبی ادارات قائم کرنے کی دعوت' پھر چودھری نیاز علی خاں اور مولانا مودودی کے ساتھ مل کر یہ اسکیم کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو شہروں سے دور رکھ کر ان کی علم اور اخلاق میں خصوصی تربیت کی جائے۔ مدعا یہ تھا کہ الحاد اور مخالفت اسلام کا جو سیلاب امڈا چلا آ رہا ہے اس کی روک تھام ہو سکے۔

○

اقبال کی نگاہ ہمیشہ اپنے نوجوانوں پر رہی ہے کیونکہ اس کا انسان مطلوب اپنے ہیولیٰ کے لئے نوجوانوں ہی سے پیکر لے سکتا ہے مگر نوجوانوں کا حال کیا تھا؟

نوجواناں تشنہ لب' خالی ایاغ
شستہ رو' تاریک جاں' روشن دماغ

کم نگاہ و بے یقین و ناامید
چشم شاں اندر جہاں چیزے ندید
ناکساں منکر ز خود مومن بہ غیر
خشت بند از خاک شاں معمار دیر

پیاسے بھی ہیں اور پیالے بھی خالی ہیں۔ چہرے خوب اجلے' مگر ان چہروں کے پیچھے روحیں بالکل تاریک۔ روحیں تاریک مگر بظاہر اپنی گفتگوؤں میں بڑے روشن دماغ! حقیقتوں کو سمجھنے میں کمزور' اعتماد سے محروم' کسی اصول حق پر جم کر کام کرنے کے بجائے نتائج کے بارے میں مایوسانہ ذہنیت' اپنے ہاں کے ہر اصول کے بارے میں انکار اور شک اور اغیار کی تہذیب کے ہر جزو پر ایمان!۔ نتیجہ یہ کہ ان کی مٹی سے معمار دیر اینٹیں بنا رہا ہے لیکن یہ مٹی تعمیر حرم کے کام آنے کی نہیں۔؟

نوجوان یوں بھی تہذیب مغرب کے عالم گیر غلبہ سے مسحور تھے ہی' لیکن ''نظام تعلیم'' نے بگاڑ کی تکمیل کر دی۔ ''مکتب'' یعنی نظام تعلیم (جواب تک جوں کا توں چل رہا ہے) کا کارنامہ یہ ہے کہ:

نور فطرت راز جانہا پاک شست
یک گل رعنا ز شاخ او نہ رست

فطرت اپنی طرف سے جو ابتدائی نور دے کر انسان کو بھیجتی ہے اسے مزید روشن کرنے کے بجائے نظام تعلیم نے ہمارے نوجوانوں کو اندر سے بالکل دھو ڈالا۔ پھر کیسے یہ ممکن تھا کہ اس نظام تعلیم کے چمن میں ایک ''گل رعنا'' بھی پیدا ہو سکتا ___ وہی !اقبال کا انسان مطلوب!

وہاں تو بچہ شاہین کو بط کے آداب و روایات سکھانے کی مہم جاری ہے۔

شدید ضرورت ہے کہ صحت مند ذہن کے محقق اور دانش ور اقبالؒ کے کلام' فن اور فلسفے اور نظریہ و غایت پر اتنا ٹھوس اور مثبت کام کریں کہ وہی ٹھوس مثبت کام ملت اور خصوصاً اس کے نوجوانوں پر چھا جائے۔

ابوالاعلیٰ مودودیؒ ـــــــ ''انقلاب تعلیم'' کے علمبردار

کسی قوم کی حقیقی آزادی کا نقطۂ آغاز دراصل باہر کے مسلط کردہ نظریات و تصورات کے سلاسل و اغلال سے اس کے ایمان و فکر کا آزاد ہونا ہے۔ بیرونی سیاسی استیلا کے خاتمے اور کسی سامراج سے نجات پا لینے سے تو محض اس امر کا موقع پیدا ہوتا ہے کہ آزادی کی سمت میں گامزن ہونے والی قوم خارجی مداخلت کے اندیشے سے فارغ ہو کر اپنے جہان افکار کو تعمیر کر سکے۔ اپنے قومی تشخص کو مخصوص تہذیبی خدوخال کے ساتھ تاریخی حوادث کے اس ملبے سے نکال کر اور گرد و غبار سے پاک کر کے از سرنو استوار کر سکے جس کے تودے کے تودے سامراجی یلغار کے نتیجے میں معاشرے کے ہر گوشے میں نمودار ہو جایا کرتے ہیں۔ ہم لوگوں کو اللہ کے فضل و کرم سے برطانوی شہنشاہیت اور اس کے سائے میں پل پوس کر ہمیں دبوچ لینے کی تیاری کرنے والے برہمنی مہاجنی سامراج سے نجات پائے آج ایک طویل عرصہ ہو گیا ہے لیکن افسوس کہ اب تک ہمارے معاشرے کے افق سے ایمان و فکر کا خورشید زندگی افروز طلوع نہیں ہوا۔ ابھی ہم حقیقی آزادی کے اس نقطۂ آغاز تک پہنچنے کے لئے نت نئے راہزنوں کا دامن تھام کر خوف اور محرومیوں کی وادی میں ٹاک ٹوئیے مارتے پھرتے ہیں۔ ہماری پچاس سالہ داستان آزادی کتنی دکھ بھری ہے! اس مدت میں ہمارے سروں سے کبھی خون کی موجیں گزر گئیں اور کبھی آگ کی لہریں۔ یہاں تک کہ ہمارا نوتشکیل یافتہ وطن دولخت ہو کر رہ گیا۔

دراصل ایمان و فکر کو کسی بھی نقشے پر نشوونما دینے میں کسی قوم کے نظام تعلیم کو بہت ہی مؤثر دخل حاصل ہوتا ہے۔ نظام تعلیم ہی نئی نسلوں کو کسی بلند نصب العین کی طرف پرواز کرنے کے لئے فکر و حکمت کے بال و پر دیتا ہے' مگر ہماری مصیبت یہ ہوئی کہ ہم آزادی کے کئی عشرے گزار کر بھی' رخصت ہو جانے والی سامراجی قوت کے بنائے ہوئے اسی تعلیمی قفس میں گرفتار ہیں' جس کی شان یہی رہی ہے کہ وہ نہ بال و پر اگنے دیتا ہے اور نہ ذوق پرواز ہی سے اپنے پروردگان کو بہرہ مند ہونے دیتا ہے۔ یہ قفس تعلیم نہ جانے کیوں ایسی مقدس میراث قرار

پا گیا ہے کہ اس میں اب تک معمولی قسم کے رد و بدل سے آگے بڑھ کر کسی حکمران قوت نے یہ سوچنے تک کی جرات نہیں کی کہ اس قفس کو توڑ کر ملت کا ایک آزاد نشیمن وجود میں لایا جائے۔ دوسرے لفظوں میں ہم تعلیمی غلامی سے نجات پانے کے قابل نہیں ہو سکے۔

قومی زندگی میں نظام تعلیم کی وہی حیثیت ہے جو فرد کے لئے اس کے دماغ کی ہوتی ہے۔ اگر دماغ کسی ساحر کی ساحری اور کسی سامری کے طلسم کا شکار ہو جائے تو فرد کی ساری حرکات وسکنات اسی کی منشاء کے مطابق نمودار ہوں گی' خواہ وہ اپنی جگہ یہ سمجھتا رہے کہ وہ اپنی آزاد سوچ بچار سے ہر اقدام کر رہا ہے۔ اگر اس کے اپنے دینی' ملی اور خاندانی رجحانات کے خلاف متضاد قسم کے تہذیبی افکار و تصورات اس کے دماغ میں فاتحانہ شان سے گھس کر مستقل محاذ آرائی کی کیفیت پیدا کر دیں تو اس اصول و روایات میں سے کچھ موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں اور کچھ زخمی اور اپاہج ہو کے رہ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں پراگندگی افکار اور ذہنی انتشار کے روگ سے کوئی بچاؤ نہیں ہے۔ ایسے ہی تضادات کے غیر مختتم تصادم کی وجہ سے بسا اوقات دماغ بالکل ہی چل جاتا ہے اور پھر جسم و اعضا کی تمام حرکات لایعنی بلکہ تخریبی ہو کے رہ جاتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اگر ایک قوم کا نظام تعلیم فساد و اختلال کی کسی بھی خاص صورت کا شکار ہو جائے تو اس قوم کی تمام سیاسی' معاشی اور ثقافتی سرگرمیوں میں بگاڑ اور ضرر پیدا ہو جاتا ہے۔

بدقسمتی سے ہم جس نظام تعلیم سے دوچار ہیں وہ ہمارے قومی وجود اور تہذیبی تشخص سے غیر ہم آہنگ اور ہر لحظہ برسر تصادم ہے۔ نتیجہ یہ کہ معاشرے کے کسی بھی شعبے کی کل سیدھی نہیں اور جو پہلے کچھ سیدھی تھی بھی' وہ بھی روز بروز ٹیڑھی ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن کارفرما قوتوں نے کبھی تعلیم کے بنیادی مسئلے پر صحیح طور پر توجہ ہی نہیں دی۔

ہماری متذکرہ بنیادی قومی کوتاہی کے نتائج بد کی فصل ہمارے چاروں طرف لہلہا رہی ہے۔ ذہنی بانجھ پن' لامقصدیت' جعل سازی' خیانت' ضمیر فروشی' ناشائستگی' قانون شکنی' بے ضابطگی' ہوس پرستی اور فحش پسندی کے روگ کتنے عام ہیں۔ اخلاقی کوڑھ میں اضافے کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہر شخص کام کے بغیر یا قلیل وقت میں کم کام کر کے جلد سے جلد بہت کچھ حاصل کر لینے کے درپے ہے۔ انفرادی اور قومی آمدنیوں کی افزائش سے پہلے معیار زندگی کو اونچا کرتے چلے جانے کا ماحصل اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جائز و ناجائز کی تمیز اٹھ

جائے۔ حد یہ ہے کہ لوگ قوم کو بے وقوف بنا کر اور قومی مفاد کو بیچ کر ذاتی زندگی کی جنتیں آراستہ کرتے ہیں۔ یہ خرابی احوال تعلیم کی توسیع کے ساتھ ساتھ تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس وجہ سے اس کی زیادہ تر ذمہ داری نظام تعلیم کے سر جاتی ہے۔ الغرض مدعا یہ ہے کہ مسئلہ تعلیم کسی قوم کا بے حد اہم اور بالکل اولیں مسئلہ ہے اور اس پر توجہ نہ دی جائے تو سارا معاشرہ چوپٹ ہو کر رہ جاتا ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے تعلیمی افکار پر تحقیقی کام

ہماری تاریخ میں اپنے وقت کے حالات کو ملحوظ رکھ کر سر سید ایک تعلیمی اسکیم لے کر اٹھے تھے' لیکن اس اسکیم کا جو وقتی مقصد تھا وہ اپنے اچھے اور برے پہلوؤں کے ساتھ حاصل ہو چکا اور اب دور آزادی میں ایک آزاد مسلم ریاست کے لئے وہ اسکیم ذرہ بھر کارآمد نہیں رہی۔

اس برصغیر میں آزادی ملنے سے کچھ عرصہ پہلے صحیح مسلم زاویۂ نگاہ سے پہلی بار ایک مکمل تعلیمی انقلاب کی آواز اٹھی۔ یہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی آواز تھی۔ صرف آواز ہی نہیں اٹھی' بلکہ آہستہ آہستہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں ایک جامع حکمت تعلیم' اس پر عمل پیرا ہونے کی اسکیم اور اس کے لئے خاکۂ نصاب وغیرہ مسائل پر اتنا مواد ہمارے سامنے رکھ دیا کہ اگر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور کوئی کام نہ کرتے تو یہی ایک کارنامہ انہیں ہماری تاریخ کی ایک عظیم شخصیت بنانے کے لئے کافی تھا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ماضی سے لے کر حال تک پھیلی ہوئی اس صف رجال میں سے ہیں جس کے ہر فرد کا سانحہ یہ ہے کہ اس کے سرچشمہ علم سے استفادہ کرنے والے مخلصین کے مقابلے میں اس پر کیچڑ پھینکنے والوں کا انبوہ ہمیشہ کثیر التعداد رہا ہے۔ دراصل زمانہ ہر اس شخص سے انتقام لیتا ہے جو اس کے دھارے کا رخ بدلنے کی سعی کرے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے انقلابی سعی نہ صرف تعلیم کے دائرے میں کی بلکہ دینی شعور و حکمت کے دائرے میں اور دستور وقانون کے دائرے میں بھی پر زور طریق سے جاری رکھی۔ اتنے بڑے جرم کی کچھ تو پاداش ہونی چاہیے! مگر معاندین و حسود کے اٹھائے ہوئے طوفانوں کے درمیان قوم کے ذہین عناصر آہستہ آہستہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے پیغام کے حسین خد و خال کو پہچاننے لگے اور ان کے افکار سے استفادہ کرنے والوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔

ہر نظامِ تعلیم کسی تہذیب کا خادم ہوتا ہے

سب سے پہلے ہمیں یہاں (پاکستان میں) نشو و نما پائی ہوئی تاریخ کی وسعتوں میں تعلیمی انقلاب کے داعی کی حیثیت کو متشخص کر لینا چاہیے۔ اس طرح ان کے افکار و اصطلاحات کو سمجھنا سہل تر ہو جائے گا۔

اصل میں مولانا مودودی مسلمانوں کے خلاف مغرب کی ملحدانہ و نفس پرستانہ تہذیب کی بڑھتی ہوئی فتوحات کے دور میں اٹھے اور انہوں نے اس انسانیت کش اور اسلام دشمن تہذیب کی مزاحمت کا مجاہدانہ عزم باندھا اور کچلی پسی ہوئی مسلمان قوم کے اندر سے بیدار دل' زندہ ضمیر اور محکم ایمان افراد کی بچی کھچی تعداد کو اپنی دردمندانہ پکار سے اٹھا کر ایک محاذ پر لا کھڑا کیا۔

کوئی شخص جو اپنی تہذیب کے احیاء اور بیرونی تہذیب کی مزاحمت کے لئے اٹھا ہو' وہ اگر نظامِ تعلیم کے مسئلے سے تعرض نہ کرے تو اس کا شعور کیسے قابلِ اعتماد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مولانا نے جہاں اعتقادی' اخلاقی' سیاسی' اقتصادی اور معاشرتی موضوعات کو نئے انداز سے چھیڑا' وہاں انہوں نے مروجہ نظامِ تعلیم کو اپنی شدید تنقید کا ہدف بنایا اور اسلامی حکمتِ تعلیم کے خطوط اچھی طرح اجاگر کیے۔ اس سلسلے میں بنیادی کام تو حصولِ آزادی اور تشکیلِ پاکستان سے پہلے ہی ہو چکا تھا' مگر پاکستان چونکہ بھاری مسلم اکثریت کی مملکت بنا اور اس کو اسلام کے نام پر استوار کیا گیا' اس وجہ سے تعلیم کی بحث کو مولانا مودودیؒ نے اور بھی زور سے آگے بڑھایا' یہاں تک کہ اب اسلامی نظامِ تعلیم کا مکمل تصور ان کے آئینہ افکار میں صاف دکھائی دیتا ہے۔

متذکرہ سطور کی تائید میں مولانا مودودی کے چند الفاظ یہاں درج کر رہا ہوں جس سے صاف عیاں ہے کہ مولانا مسئلہ تعلیم کو تہذیبی زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں:

''ہر یونیورسٹی کسی کلچر کی خادم ہوتی ہے۔ ایسی مجرد تعلیم جو ہر رنگ اور ہر صورت سے خالی ہو' نہ آج تک دنیا کی کسی درس گاہ میں دی گئی ہے نہ آج دی جا رہی ہے۔ ہر درس گاہ کی تعلیم ایک خاص رنگ اور ایک خاص صورت میں ہوتی ہے اور اس رنگ و صورت کا انتخاب پورے غور و فکر کے بعد اس مخصوص کلچر کی مناسبت سے کیا جاتا ہے جس کی خدمت وہ کرنا چاہتی

ہے۔

اس موضوع پر میرا موجودہ مطالعہ اتنا وسیع تو نہیں کہ حتمی طور پر دعویٰ کر سکوں کہ تعلیم کو ہمارے یہاں مولانا سے پہلے کسی شخص نے اس واضح سائنٹیفک نظر سے نہیں دیکھا اور تعلیم اور تہذیب (یا کلچر) ربط باہم کو یوں نمایاں نہیں کیا۔ مگر پھر بھی مولانا کا نقطۂ نظر بڑا ممیز سا ہے۔ کچھ اقتباس اور:

''ترقی علم وتمدن کے موجب فلاح یا موجب ہلاکت ہونے کا تمام تر انحصار اس تہذیب پر ہے جس کے زیراثر علوم وفنون اور تمدن وحضارت کا ارتقاء ہوتا ہے۔ ارتقاء کا راستہ انسانی مساعی کا مقصد اور حاصل شدہ قوتوں کا مصرف متعین کرنے والی چیز دراصل تہذیب ہے۔'' (تنقیحات۔ص ۹۳)

''حقیقت میں تعلیم کا مسئلہ ایک مملکت کے بنیادی مسائل میں سے ہے۔ اس کے سربراہ کاروں کو سب سے پہلے اس کی فکر ہونی چاہئے۔'' (تعلیمات ص ۴۴)

''اب اگر ہم اپنی ایک کلچر رکھتے ہیں' ہم ایک ایسی قوم ہیں جس کے اپنے کچھ عقائد ہیں' جس کا اپنا نظریہ زندگی ہے' جس کا اپنا ایک نصب العین ہے' جو اپنی زندگی کے کچھ اصول رکھتی ہے تو لازماً ہمیں اپنی نئی نسلوں کو اس غرض کے لئے تیار کرنا چاہئے کہ وہ ہماری اس کلچر کو نہ صرف یہ کہ زندہ رکھیں بلکہ آگے انہی بنیادوں پر اسے ترقی دیں جس پر ہماری یہ کلچر قائم ہے ــــ مجھے کوئی قوم ایسی معلوم نہیں جس نے اپنا نظام تعلیم خالص معروضی بنیادوں پر قائم کیا ہو اور اپنی نسلوں کو بے رنگ تعلیم دینے کی کوشش کی ہو۔ اسی طرح مجھے ایسی بھی کوئی قوم معلوم نہیں ہے جو دوسروں سے ان کا نظام تعلیم جوں کا توں لے لیتی ہو اور اپنی تہذیب کا کوئی رنگ اس میں شامل کئے بغیر اسی سانچے میں اپنی نئی نسلوں کو ڈھالتی چلی جاتی ہو۔'' (تعلیمات۔ص ۴۲)

مولانا مودودی نے ''تعلیمات'' میں وہ چار وجوہ بیان کئے ہیں جن کی بنا پر وہ ''انقلاب تعلیم'' کو لازم گردانتے ہیں۔ یہاں ہم وجوہ درج نہیں کر رہے' بس واضح یہ کرنا مقصود ہے کہ انقلاب تعلیم کی اصطلاح بھی خود موصوف کی وضع کردہ ہے اور ان کے تعلیمی افکار میں اس اصطلاح کا مفہوم مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔

نہایت اہم گفتگو وہ ہے جو مولانا نے نظام تعلیم کی بحث میں اسلام اور سائنس کے باہمی تعلق کے بارے میں کی ہے۔ اس سے تعلیمی انقلاب کا وہ تصور اور اجاگر ہو جاتا ہے جس

کے علمبردار مولانا مودودی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

''بہت سے لوگ اس خیال کو سن کر بڑے پریشان ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سائنس کا آخر اسلام سے کیا تعلق' حالانکہ ان کے سامنے روس کی مثال موجود ہے جو سوویت سائنس کا قائل ہے ـــــ کوئی کمیونسٹ اپنے اشتراکی معاشرے کے افراد کو بورژوا سائنس اور بورژوا فلسفہ و تاریخ اور سیاسیات وغیرہ پڑھانا پسند نہیں کرتا۔ یہ ان سب علوم کو مارکسزم کے رنگ میں رنگ کر پڑھاتا ہے' تاکہ اشتراکی سائنس دان اور اشتراکی ماہرین علوم پیدا ہوں۔ بورژوا نقطۂ نظر سے مرتب کئے ہوئے علوم کو پڑھا کر کوئی اشتراکی معاشرہ نہیں بن سکتا۔

یہ کہنا کہ سائنس تو ایک عالمگیر چیز ہے اس کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں' فی الواقع بڑی ناسمجھی کی بات ہے۔ سائنس میں ایک چیز تو ہے وہ حقائق (Facts) اور قوانین فطرت (Natural Laws) جو تجربے اور مشاہدے سے انسان کے علم میں آتے ہیں۔ یہ بلاشبہ عالمگیر ہیں۔ دوسری چیز ہے' وہ ذہن جو ان حقائق اور معلومات کو مرتب کر کے ان پر نظریات قائم کرتا ہے اور وہ زبان جس میں وہ ان کو بیان کرتا ہے۔ یہ چیز عالمگیر نہیں ہے' بلکہ اس میں ہر تہذیب کے پیروؤں کا اسلوب الگ الگ ہے اور فطرتاً الگ ہونا چاہئے۔ ہم اس دوسری چیز کو بدلنا چاہتے ہیں نہ کہ پہلی چیز کو۔'' (تعلیمات ص ص ۲۲۸' ۲۲۹)

سائنس کے دائرے میں تجربات و مشاہدات حواس کے ساتھ مفروضات و قیاس مل کر کام کرتے ہیں۔ سائنس کے ایک ایک ذرۂ حقیقت کے گرد بالعموم پورا ایک جہان مفروضات تعمیر ہو جاتا ہے اور اصطلاح عام میں یہ سب کچھ سائنس کہلاتا ہے۔ مولانا نے ایک مثال دے کر مدعا کو واضح تر کر دیا ہے:

''مثال کے طور پر دیکھئے' یہ ایک سائنٹیفک حقیقت ہے کہ دنیا کی تمام دوسری چیزیں تو سرد ہو کر سکڑتی چلی جاتی ہیں مگر اس کے برعکس پانی جب سرد ہوتے ہوئے جمنے کے قریب پہنچتا ہے تو پھیل جاتا ہے اور برف بن کر ہلکا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے برف سطح آب پر تیرنے لگتی ہے۔ یہ ایک امر واقعہ ہے۔ اب ایک شخص اس چیز کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ پانی کی یہ خاصیت ہے اور واقعتاً ایسا ہوا کرتا ہے۔ دوسرا شخص اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ خدا نے اپنی حکمت و ربوبیت سے پانی میں یہ خصوصیت اس لئے رکھی ہے کہ دریاؤں اور تالابوں اور سمندروں میں جاندار مخلوق باقی رہ سکے! ـــــ دیکھئے ایک ہی امر واقعہ کو دو شخص

اپنے اپنے طرز فکر کے مطابق دو مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں اور ہر ایک کا بیان پڑھنے سے آدمی کے ذہن پر دو مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں ــــ ایک طریقے سے اگر سائنس کو پڑھا جائے تو اس سے ایک مادہ پرست سائنس دان تیار ہوگا اور دوسرے طریقے سے وہی سائنس پڑھائی جائے تو ایک مسلمان سائنس دان تیار ہو جائے گا۔"

(تعلیمات ص ۲۳۹۔۲۴۱)

مروجہ سائنس جن بنیادی تصورات پر کھڑی ہے ان سے زیادہ غیر عقلی تصور شاید ہی کوئی ہو کہ سائنس جہان مادی کے ایک ایک ذرے پر "قانون" کی کارفرمائی کا دعویٰ کرتی ہے' لیکن اتنے وسیع و بے پایاں عقلی قانونی نظام کے بارے میں وہ یہ رائے رکھتی ہے کہ اس سارے عقلی نظام قانون نے غیر عقلی "اتفاق" سے جنم لیا ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ جہاں قانون ہے وہاں تمہیں کسی حکیم و علیم قانون ساز کے وجود کو ماننا ہوگا اور قانون کے صحیح طور پر مسلسل چلتے رہنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ قانون ساز قانون کو چلانے کے لئے قوت و اقتدار بھی رکھتا ہے' لیکن مادہ پرستوں کی مرتب کردہ سائنس کی اتنی بڑی عقلی حماقت کو نظام تعلیم کے واسطے سے ہم مسلمانوں نے بلا کسی رد و کد کے قبول کر لیا ہے۔

تعلیمی انقلاب کے داعی نے سائنس کی تعلیم کے بارے میں کلمۂ تکمیل کے طور پر کہا ہے کہ:

"حقیقت یہ ہے کہ سائنس کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو انسانوں کے دل میں ایمان کو گہری جڑوں سے راسخ کر دینے والا نہ ہو۔ فزکس' بیالوجی' فزیالوجی' اناٹومی' اسٹرانومی' غرض جس علم کو بھی آپ دیکھیں اس میں ایسے ایسے حقائق سامنے آتے ہیں جو انسان کو پکا اور سچا مومن بنا دینے کے لئے کافی ہیں ــــ یہی وہ آیات ہیں جن کی طرف قرآن بار بار توجہ دلاتا ہے' مگر صرف اس وجہ سے کہ کافر سائنس دان نے ان حقائق کو اپنے نقطۂ نظر سے مرتب اور بیان کیا ہے' ان کو پڑھ کر آدمی الٹا مادہ پرست اور ملحد بنتا ہے اور خدا کے تصور پر ہنستا اور اس کا مذاق اڑاتا ہے ــــ ہم بے خدا سائنس اور بے خدا فلسفہ اور اجتماعی علوم پڑھا کر خدا پرست انسان تیار نہیں کر سکتے۔" (تعلیمات ص ۲۴۱)

زیر تحقیق انقلابی نظریۂ تعلیم اسلامی فکر کو پورے مضامین و نصابات پر جس طرح غالب و مسلط کر دینا چاہتا ہے اس کا اندازہ سائنس کے متعلق متذکرہ اقتباس سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

نظام تعلیم اور مسئلہ قیادت و امامت

مولانا مودودیؒ نے ستمبر ۱۹۳۴ء میں لکھا تھا کہ "دنیا گویا ایک ریل گاڑی ہے جس کو فکر و تحقیق کا انجن چلا رہا ہے۔" (تنقیحات۔ص ۲۳)

جنوری ۱۹۴۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں انجمن اتحاد طلبہ کے سامنے جو خطبہ مولانا نے پڑھا' اس میں فرمایا کہ "امامت کا دامن ہمیشہ علم سے وابستہ رہے گا۔" (تعلیمات ص ۱۶۸)

دنیائے انسانیت کی امامت یا قیادت (Leadership) کے اسی تصور کی بنا پر اسلامی یونیورسٹی کا خاکہ مرتب کرتے ہوئے مولانا نے مقصد تعلیم یہ قرار دیا کہ "وہ ایسے صالح علماء تیار کرے جو اس دور جدید میں ٹھیک ٹھیک دین حق کے مطابق دنیا کی رہنمائی کرنے کے قابل ہوں۔" (تعلیمات ص ۱۶۸)

اگر میں یہ کہوں تو شاید بات غلط نہ ہوگی کہ تعلیم و امامت کے اسی تعلق کی بنا پر ۱۹۴۴ء میں دارالاسلام پٹھان کوٹ کی مجلس تعلیمی کے سامنے مولانا نے صراحت سے کہا تھا کہ:۔

"اس وقت ہمارے ملک میں جتنے نظام ہائے تعلیم رائج ہیں' ان میں سے کوئی بھی اس مقصد کے لئے آدمی تیار نہیں کرتا جو ہمارے پیش نظر ہے ـــــ ہمیں صرف یہی نہیں کرنا ہے کہ نوخیز نسلوں کو علمی اور ذہنی تربیت کا انتظام اپنے نصب العین کے مطابق کریں بلکہ اس کے ساتھ ان کی اخلاقی اور عملی تربیت کا بندوبست بھی کرنا ہے۔" (تعلیمات ص ۱۰۴)

یہاں بات اصل تصور سے کسی قدر محدود شکل میں سامنے آتی ہے۔ اس کی وجہ بھی سن لیجئے۔

"اس وقت ہم کسی ملک کے انتظام کا چارج نہیں لے رہے ہیں کہ ہمیں اپنے نظام تعلیم میں ان ضرورتوں کے لئے آدمی تیار کرنے ہوں جو ایک ملک کے تمدن کی پوری مشینری کو چلانے میں پیش آتی ہیں۔ ہمارے سامنے اس وقت صرف ایک کام ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں اخلاقی' فکری اور عمرانی انقلاب برپا کرنے کے لئے موزوں لیڈر اور کارکن تیار کریں۔" (تعلیمات ص ۱۰۵)

بہرحال مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جس انقلابی دعوت تعلیم کو لے کر اٹھے' اس کی رُو سے

علم و تعلیم اور امامت و قیادت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جو قوم تعلیم اور علم و تحقیق میں آگے بڑھتی ہے' وہی دوسروں کے لئے پیش رو بنتی ہے اور اسی کی تقلید کی جانے لگتی ہے۔ علم اسے اس فکری و ذہنی استیلا اور سیاسی و اقتصادی فوقیت کا راستہ بنا کے دیتا ہے۔

اس خاص بحث کے لئے تنقیحات (از مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ) کے بیشتر مضامین خصوصاً اس کے پہلے مقالے ''ہماری ذہنی غلامی اور اس کے اسباب'' سے بہت مفید مواد اخذ کیا جا سکتا ہے۔

تعلیم اور امامت کے تعلق کو سامنے رکھ کر نظام تعلیم پر سوچنے کے لحاظ سے بھی مولانا بڑی حد تک منفرد مقام رکھتے ہیں اور پھر اس تعلق کی وضاحت بھی انہوں نے اپنی تحریروں میں بڑے زور بیان سے کی ہے۔

''علم برائے امامت عالم'' کے اس نظریئے کے فریم میں تعلیم کے متعلق ان کا انقلابی فکر نصب ہوا ہے' اور اس کلیے کی روشنی میں ان کے مختصر سے اس فقرے کا مدعا سمجھ میں آ سکتا ہے کہ:

''اسلام میں ایک نشاۃ جدید (Rennaissance) کی ضرورت ہے۔''

''پرانے اسلامی مفکرین و محققین کا سرمایہ اب کام نہیں دے سکتا ـــــ علم و عمل کے میدان میں وہی رہنمائی کر سکتا ہے جو دنیا کو آگے کی جانب چلائے' نہ کہ پیچھے کی جانب۔ لہٰذا اب اگر اسلام دوبارہ دنیا کا رہنما بن سکتا ہے تو اس کی بس یہی ایک صورت ہے کہ مسلمانوں میں ایسے مفکر اور محقق پیدا ہوں جو فکر و نظر اور تحقیق و انکشاف کی قوت سے ان بنیادوں کو ڈھا دیں جس پر مغربی تہذیب کی عمارت قائم ہے۔'' (تنقیحات ص ۲۲' ۲۳)

اتنا بڑا معرکہ ہے مولانا کے سامنے' وہ عالمگیر تسلط رکھنے والی مغربی تہذیب کی عمارت کی بنیادیں ڈھا دینا چاہتے ہیں اور اس کے لئے علم و تحقیق اور نظام تعلیم کی قوت کو بر سر عمل لانا چاہتے ہیں۔

مسلم تعلیم گاہوں کا ناقدانہ جائزہ

مولانا مودودی کے انقلابی فکر کو سمجھنے میں ہمیں وہ تنقیدی تحریریں بہت مدد دیتی ہیں جو جدید اور قدیم ہر دو قسم کی قائم شدہ مسلم تعلیم گاہوں کی اسکیموں کے اساسی تصورات کا احتساب

کرتی ہیں۔ کسی ڈھانچے کے اندر جامد ذہن کے لوگ تو سکون سے چلتی رو میں بہتے رہتے ہیں اور کسی ڈھانچے کے اندر بعض پسندیدہ اجزاء دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔ پھر کچھ مصلحین ہوتے ہیں جو اساسیات کو چھیڑے بغیر تفصیلی مظاہر میں دو چار تبدیلیوں کے لئے کوشش کرتے ہیں' لیکن انقلابی ذہن کا آدمی اساسیات اور ڈھانچے کی مجموعی حیثیت کی غلط ساخت پر گرفت کرتا ہے اور اس میں تبدیلی کی دعوت دیتا ہے۔ جدید و قدیم دونوں قسم کی مسلم تعلیم گاہوں اور ان کی تعلیمی اسکیموں پر مولانا مودودی نے اسی حیثیت سے ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے۔

علی گڑھ یونیورسٹی کا قیام جن امنگوں اور آرزوؤں کے ساتھ کیا گیا تھا' ان کے لحاظ سے دیکھیں تو یہ تعلیمی مرکز بڑی تاریخی اہمیت کا حامل تھا اور اس کے داعی اول سر سید احمد خاں کے حصے میں یہ کریڈٹ ضرور جاتا ہے کہ وہ مسلم قوم کے ایک خوفناک دور شکست میں فکری لیڈر بن کر ابھرے اور ڈوبتی قوم کو بچانے کے لئے جو کچھ بھی ان کی سمجھ میں آیا اس کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ ان کی مساعی کی قیمت وقتی اور فوری بلکہ اضطراری تدبیر کے لحاظ سے جو ہے سو ہے مگر ان کی اسکیم نے آگے چل کر کچھ اچھے نتائج کے ساتھ جو بہت سے برے نتائج پیدا کئے ان کا احساس خود سر سید احمد خاں کو بھی ہو گیا تھا مگر اب جو دریا بہہ نکلا تھا اس کا رخ بدلنا ان کے بس میں نہ تھا اور نہ ان کے بعد مضطرب ہو کر اصلاحات کرنے والے کوئی موثر اقدام کر سکے۔ خرابی خود اسکیم کے اندر ایسی تھی کہ اس کے سانچے میں ڈھل کر مسلم تہذیب کی علمبرداری کرنے والے اور مغربی تہذیب کے مقاصد کا مقابلہ کرنیوالے دل و دماغ پیدا نہ ہو سکتے تھے۔ وہ صرف ابتدائی دور تھا جس کے جذباتی ماحول میں چند قابل قدر نمایاں شخصیتیں ابھریں۔ اس کے بعد مسلم قوم پرستوں سے لے کر ملحدوں اور کمیونسٹوں تک کی کھیپیں تیار ہونے لگیں۔ "مسلم بلا اسلام" یا "افرنگ پرست مسلم" کا نیا کردار بھی اس "اسلامی" ادارے نے ڈھالنا شروع کر دیا۔ اور یہ کردار مسلمانوں کے پیش رو طبقوں میں آج بھی نمایاں دکھائی دیتا ہے اور اس کے کارناموں کے برگ و بار زندگی کے ہر شعبے میں پھیلے ہوئے ملتے ہیں۔ مولانا کا مطالعہ احوال یہ تھا کہ یہ سب کچھ اتفاقی حادثے کے طور پر نہیں ہو رہا بلکہ علی گڑھ کی تعلیمی اسکیم سے اسی کی توقع کی جا سکتی ہے۔

علی گڑھ کا نظام تعلیم

آیئے خود مولانا کے الفاظ کے آئینے میں حقیقت کا انعکاس دیکھیں:

''......علی گڑھ سے جو تعلیمی تحریک اٹھی تھی اس کا وقتی مقصد یہ تھا کہ مسلمان اس نئے دور کی ضرورت کے لحاظ سے اپنی دنیا درست کرنے کے قابل ہو جائیں ـــــ اس وقت اس سے زیادہ کچھ کرنے کا شاید موقع نہ تھا۔ اس وقت اتنی مہلت نہ تھی کہ غور و تفکر کے بعد کوئی ایسی محکم تعلیمی پالیسی متعین کی جاتی جو نقصانات سے پاک اور فوائد سے لبریز ہوتی ـــــ مسلمانوں کو اس طرز تعلیم کی طرف دھکیل دیا گیا جو ملک میں رائج ہو چکا تھا اور خطرات سے بچنے کے لئے کچھ تھوڑا سا عنصر اسلامی تعلیم و تربیت کا بھی رکھ دیا گیا جس کو جدید تعلیم اور جدید تربیت کے ساتھ کوئی مناسبت نہ تھی ـــــ اس تحریک نے ہماری دنیا تو ضرور بنا دی مگر جتنی دنیا بنائی اس سے زیادہ ہمارے دین کو بگاڑ دیا ـــــ اس نے ہم میں کالے فرنگی پیدا کئے ـــــ اس نے ہماری قوم کے طبقہ علیا اور طبقہ متوسط کو جو دراصل قوم کے اعضائے رئیسہ ہیں' باطنی اور ظاہری دونوں حیثیتوں سے یورپ کی مادی تہذیب کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ صرف اتنے معاوضے پر کہ چند عہدے' چند خطاب' چند کرسیاں ایسے لوگوں کو مل جائیں جن کے نام مسلمانوں سے ملتے جلتے ہوں ـــــ سوال یہ ہے کہ کیا اب دائماً ہماری یہی تعلیمی پالیسی ہونی چاہئے۔ اگر یہی ہماری دائمی پالیسی ہے تو اس کے لئے علی گڑھ کی کوئی ضرورت اب باقی نہیں رہی۔ ہندوستان کے ہر بڑے مقام پر ایک علی گڑھ موجود ہے۔'' (تعلیمات ص ص ۱۸'۱۹)

اس تعلیمی پالیسی میں خرابی کی وجہ کیا ہے اس پر مولانا کی رائے سنئے:

''......آپ ان کو (یعنی نئی نسلوں کو) وہ فلسفہ پڑھاتے ہیں جو کائنات کے مسئلے کو خدا کے بغیر حل کرنا چاہتا ہے۔ آپ ان کو وہ سائنس پڑھاتے ہیں جو معقولات سے منحرف اور محسوسات کا غلام ہے۔ آپ ان کو تاریخ' سیاسیات' معاشیات' قانون اور تمام علوم عمرانیہ کی وہ تعلیم دیتے ہیں جو اپنے اصول سے لے کر فروع تک اور نظریات سے لے کر عملیات تک اسلام کے نظریات اور اصول عمرانیہ سے یکسر مختلف ہے ـــــ اس کے بعد کس بناء پر آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ ان کی نظر اسلامی نظر ہو گی' ان کی سیرت اسلامی سیرت ہو گی' ان کی زندگی اسلامی زندگی ہو گی! قدیم طرز پر قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم اس نئی تعلیم کے ساتھ بے جوڑ

ہے۔۔۔۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے فرنگی سٹیمر میں پرانے بادبان محض نمائش کے لئے لگا دیئے جائیں، مگران بادبانوں سے فرنگی سٹیمر قیامت تک اسلامی سٹیمر نہ بنے گا۔"
(تعلیمات۔ص ۱۹، ۲۰)

مزید چند سطور:

"اس وقت مسلم یونیورسٹی میں جو طریق تعلیم رائج ہے، وہ تعلیم جدید اور اسلامی تعلیم کی ایک ایسی آمیزش پر مشتمل ہے جس میں کوئی امتزاج اور کوئی ہم آہنگی نہیں۔۔۔۔ یہ دونوں عنصر نہ صرف ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کی مزاحمت کر کے طلبہ کے ذہن کو دو مخالف سمتوں کی طرف کھینچتے ہیں۔" (تعلیمات ص ۲۵)

"میری نظر میں مسلم یونیورسٹی کی دینی و دنیاوی تعلیم بہ حیثیت مجموعی بالکل وہی ہے کہ آپ ایک شخص کو از سرتاپا غیر مسلم بناتے ہیں پھر اس کی بغل میں دینیات کی چند کتابوں کا ایک بستہ دے دیتے ہیں۔۔۔۔ اگر آپ ان حالات اور اس طرز تعلیم کو بعینہٖ جاری رکھیں۔۔۔۔ تو اس کا حاصل صرف یہ ہو گا کہ فرنگیت اور اسلامیات کی کشمکش زیادہ شدید ہو جائے گی اور ہر طالب علم کا دماغ ایک رزم گاہ بن جائے گا۔" (تعلیمات ص ص ۲۷، ۲۸)

ندوہ کا نظام تعلیم

۵ جنوری ۱۹۴۱ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے مولانا نے اس تعلیمی ادارے کی اسکیم پر بھی ایک تنقیدی نگاہ ڈالی۔ فرمایا:

"لوگ اس گمان میں ہیں کہ پرانی تعلیم میں خرابی صرف اتنی ہے کہ نصاب بہت پرانا ہو گیا ہے اور اس میں بعض علوم کا عنصر بعض علوم سے کم یا زیادہ ہے اور جدید زمانہ کے بعض علوم اس میں شامل نہیں۔ اس لئے اصلاح کی ساری بحث اس حد تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے کہ کچھ کتابوں کو نصاب سے خارج کر کے دوسری کتابوں کو داخل کر دیا جائے ۔۔۔۔ اور بہت زیادہ روشن خیالی پر جو لوگ اتر آتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ صاحب ہر مولوی کو میٹرک تک انگریزی پڑھا کر نکالو تاکہ کم از کم تار پڑھنے اور لکھنے کے قابل تو ہو جائے ۔۔۔۔ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ پہلے سے کچھ زیادہ کامیاب قسم کے مولوی پیدا ہو جائیں جو کچھ جرمنی اور امریکہ کی باتیں بھی کرنے لگیں۔ اس ذرا سی اصلاح

کا نتیجہ یہ کبھی نہیں نکل سکتا کہ دنیا کی امامت و قیادت کی باگیں علماء اسلام کے ہاتھ میں آ جائیں۔" (تعلیمات ص ص ٦٦، ٦٧)

مولانا کے نزدیک اس تعلیم کا متوقع ماحصل بس یہ ہے کہ:

"آپ گھٹیا قسم کے نہ سہی، بڑھیا قسم کے مقتدی بن جائیں، امامت بہرحال آپ کو نہیں مل سکتی۔ اس وقت تک جتنی اصلاحی تجاویز میری نظر سے گزری ہیں وہ سب کی سب بہتر مقتدی بنانے والی ہیں، امام بنانے والی کوئی تجویز ابھی تک سوچی نہیں گئی۔"

(تعلیمات ص ۷۳)

عام قسم کے اسلامی کالج

انگریزی نظام تعلیم پر کام کرنے کے لئے جو اسلامی کالج قائم ہوتے رہے ان پر مولانا کی تنقید نسبتاً زیادہ سخت انداز میں سامنے آتی ہے اور اس تنقید میں ان کا ذوق انقلابیت خوب نمایاں ہے۔ ایک ایسے ہی کالج کے جلسہ تقسیم اسناد کا جو زلزلہ افگن خطبہ مولانا نے دیا اس کے چند جملے پیش ہیں:

"دراصل میں آپ کی اس مادر علمی کو اور مخصوص طور پر اسی کو نہیں بلکہ ایسی تمام ماڈرن تعلیم کو درس گاہ کے بجائے قتل گاہ سمجھتا ہوں، اور میرے نزدیک آپ فی الواقع یہاں قتل کئے جاتے رہے ہیں، اور یہ ڈگریاں جو آپ کو ملنے والی ہیں یہ دراصل موت کے صداقت نامے (Death Certificates) ہیں جو قاتل کی طرف سے آپ کو اس وقت دیئے جا رہے ہیں، جب کہ وہ اپنی حد تک اس بات کا اطمینان کر چکا ہے کہ اس نے آپ کی گردن کا تسمہ تک لگا رہنے نہیں دیا ہے ـــــ میری مثال اس شخص کی سی ہے جو اپنے بھائی بندوں کا قتل عام ہو چکنے کے بعد لاشوں کے ڈھیر میں یہ ڈھونڈتا پھرتا ہو کہ کہاں کوئی سخت جان بسمل ابھی سانس لے رہا ہے۔" (تعلیمات۔ص ۵۲، ۵۴)

"ہر قوم کے بچے دراصل اس کے مستقبل کا محضر ہوتے ہیں۔ قدرت کی طرف سے یہ محضر ایک سادہ لوح کی شکل میں آتا ہے اور قوم کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ خود اس پر اپنے مستقبل کا فیصلہ لکھے۔ ہم وہ دیوالیہ قوم ہیں جو اس محضر پر اپنے مستقبل کا فیصلہ خود لکھنے کے بجائے اسے دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں کہ وہ اس پر جو چاہیں ثبت کر دیں، خواہ وہ ہماری

اپنی موت ہی کا فتویٰ کیوں نہ ہو۔" (تعلیمات۔ص ۵۸)

اس نظام تعلیم کا یہ مایوس کن پہلو ہے کہ وہ کوئی مقصد طلبہ کو نہیں دیتا' اس کی طرف مولانا نے خصوصی توجہ دی ہے:

"مجھے بکثرت ایسے نوجوانوں سے ملنے کا موقع ملتا ہے جو اعلیٰ تعلیم پا رہے ہیں' یا تازہ تازہ فارغ ہوتے ہیں ـــــ مگر میری مایوسی کی انتہا نہیں رہتی جب میں دیکھتا ہوں کہ مشکل سے ہزاروں میں سے کوئی ایک ایسا ملتا ہے جو اپنے سامنے زندگی کا مقصد رکھتا ہو ـــــ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی یہ حالت دیکھ کر میرا سر چکرانے لگتا ہے۔ میں حیران ہو کر سوچنے لگتا ہوں کہ اس نظام تعلیم کو کس نام سے یاد کروں جو پندرہ بیس سال کی مسلسل دماغی تربیت کے بعد بھی انسان کو اس قابل نہیں بناتا کہ وہ اپنی قوتوں اور قابلیتوں کا کوئی مصرف اور اپنی کوششوں کا کوئی مقصود متعین کر سکے ـــــ یہ انسانیت کو بنانے والی تعلیم ہے یا اس کو قتل کرنے والی؟"

(تعلیمات ص ص ۵۹' ۶۰)

اور اسلامی نقطۂ نگاہ سے:

"کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ موجودہ نظام تعلیم میں ملت اسلام کے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کے لئے جو انتظام کیا جاتا ہے وہ دراصل ان کو اس ملت کی پیشوائی کے لئے نہیں بلکہ غارت گری کے لئے تیار کرتا ہے۔" (تعلیمات ص ۶۲)

مثبت دعوت

مولانا مودودی نے ایک صحیح اسلامی نظام تعلیم کے سلسلے میں متعدد اہم چیزیں تحریر کی ہیں' ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ یہاں اجمال سے ان کا مرکزی نقطۂ نظر عرض کیا جاتا ہے۔

"......اگر فی الواقع ہم ایک اسلامی نظام تعلیم قائم کرنا چاہتے ہیں تو محض مرمتیں اور داغ دوزیاں کرنے سے کام نہیں چل سکتا بلکہ اس کے لئے ایک انقلابی قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔

درحقیقت اب یہ ناگزیر ہو چکا ہے کہ وہ دونوں نظام تعلیم ختم کر دیئے جائیں جو اب تک ہمارے ہاں رائج رہے ہیں۔ پرانا مذہبی نظام تعلیم بھی ختم کیا جائے اور یہ موجودہ نظام تعلیم بھی جو انگریز کی رہنمائی میں قائم ہوا تھا۔ ان دونوں کی جگہ ہمیں ایک نیا نظام تعلیم بنانا

چاہیے جو ان کے نقائص سے پاک ہو اور ہماری ان ضرورتوں کو پورا کر سکے جو ہمیں ایک مسلمان قوم، ایک آزاد قوم اور ایک ترقی کی خواہش مند قوم کی حیثیت سے اس وقت لاحق ہیں۔"
(تعلیمات ص ۵۸)

انقلاب تعلیم کا یہ پیغام دیتے ہوئے مولانا نے ایک سے زیادہ مقالات میں مطلوبہ اسلامی نظام تعلیم کا خاکہ اور اس کے اساسی اصول واضح کیے ہیں۔ مزید تفاصیل کوئی دیکھنا چاہے تو اصل مقالات ومباحث میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

ہمارے تہذیبی وجود کا دشمن نظام تعلیم *

موجودہ نظام تعلیم ایک ایسی ٹوپی ہے جو ہمارے سر کے ناپ کے مطابق نہیں بنائی گئی ہے بلکہ یہ تنگ تکلیفی ٹوپی سر پر رکھ کر ہتھوڑے کی ضربوں سے فٹ کر دی گئی ہے اور وقتاً فوقتاً فٹ کی جاتی رہتی ہے۔ اس کے کبھی ایک کونے کو بدلنے کے لئے اور کبھی دوسرے زاویئے کو درست کرنے کے لئے ٹھکا ٹھک ہوتی رہتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ جن کیلوں سے یہ ہمارے سروں پر مستقلاً نصب کر دی گئی ہے وہ کھوپڑی میں اتر کر اپنی جگہ بنا چکی ہیں اور اب ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ اسے الگ کر کے کوئی دوسرا بندوبست کیا جا سکتا ہے کیونکہ ذرا سی جنبش بھی درد پیدا کرتی ہے۔ یہ ٹوپی جو غلامی میں ہمارے سروں پر ٹھونسی گئی تھی آزادی میں اس کی پکڑ اور سخت ہو گئی ہے۔

مندرجہ بالا اشارے کا ترجمہ یہ ہے کہ اس نظام تعلیم کو ہمارے نظریہ حیات' ہمارے ملی نصب العین' ہمارے بنیادی تصور پاکستان' ہمارے شعور اخلاق' ہماری معاشرتی قدروں اور ہماری تہذیب سے بلکہ لسانی ذوق وضرورت اور آزادی قوم کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں۔ الٹا یہ نظام تعلیم ان سارے تقاضا ہائے عواملِ ملت کو پاؤں تلے پامال کرتا ہے اور ہماری ہر قیمتی چیز کا مذاق اڑا اڑا کر اس نے ہمیں احساس کمتری میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس نے ہماری خودی کو مردہ' ہمارے ضمیروں کو سن اور ہمارے سروں کو دوسروں کے سامنے خم کر دیا ہے۔ اب ہماری خاصی بڑی تعداد کو جس میں دانشور اور معلم اور صحافی اور ادیب اور لیڈر اور وزیر بھی شامل ہیں' ہر وہ بگاڑ اور اذیت اور بے جوڑ پن ضروری معلوم ہوتا ہے جو اس نظام نے پیدا کر دیا ہے۔ اب اس کے محافظین اور پہرہ دار اور سنتری بھی خود ہمارے گھروں میں مسلمان ماؤں کی گودوں میں اور مسلمان باپوں کے سایۂ شفقت میں پرورش پا کر ڈیوٹیاں سنبھالے ہوئے ہیں۔

اب تو اصلاح تعلیم اور تبدیلئ تعلیم کے جو تجربے ہوتے ہیں' وہ بھی اس قدر کہ مشین کا

---

* ترجمان القرآن جلد ۱۱۰ عدد ۵

ایک کیل ادھر سے نکال کر ادھر ڈال دیا۔ یا کسی پرزے کی جگہ ذرا مختلف ساخت کا کوئی اور پرزہ ڈال دیا۔ مشین وہی میکالوی ہے یہ تو اتنا بھی گوارا نہیں کرتی کہ ہماری قومی زبان اردو ذریعہ تعلیم بن سکے۔

موجودہ نظام تعلیم کی بڑی خامی یہ ہے کہ اس نے اسلام کے تصورِ انسان کو تو بالکل در خور اعتنا ہی نہیں سمجھا' مزید ستم یہ کہ پاکستان کے لئے اس کے نظریئے کے مطابق انسان مطلوب کا تصور بھی اختیار نہیں کیا کہ جس کو تعلیم کا محور و مقصد بنا کر سارے پہلوؤں کو سوچا جائے۔

یہ نظام نوجوانوں کو اپنے دینی یا تہذیبی وجود کے امتیازی اور جداگانہ تشخص کا شعور دلا کر ان میں امنگیں بیدار نہیں کرتا کہ وہ انسانیت کے سامنے زندگی کے زیادہ اونچے اور پاکیزہ تصورات اور کردار کے نمونے لے کر جائیں اور بصد فخر اپنی متاع ملی کو پیش کر کے اس پر اثر انداز ہوں۔ اس طرح نوجوانوں کا تعاون ایک بہترین معاشرت و تہذیب کی تشکیل کے لئے حاصل کیا جائے۔

یہ نظام ہماری نسلوں کو یہ تربیت نہیں دیتا کہ وہ اپنے ایمان اور اپنے ضمیر کے مطابق بہترین اصولوں اور قدروں اور روایتوں کو پروان چڑھائیں' ان کے چراغوں کو روشن کریں اور ان قیمتی ورثوں کے تحفظ کے لئے انہیں اگر دولت اور ہوسناکی اور بے حیائی اور جاہلی عصبیتوں کی چومکھی لڑائی میں اپنا مجاہدانہ کردار ادا کرنا پڑے تو وہ بصد مسرت لپک لپک کر اور اچھل اچھل کر اسے ادا کریں۔

وہ خود اپنے معاشرے میں مشنری اور معلم اور مصلح اور انقلابی بن کر کام کریں اور اس میں راستی اور بھلائی کی ایک رو چلا دیں۔ مگر آج وہ فلموں اور آڈیو وڈیو کیسٹوں' عریاں تصویروں' کیمرہ بازی اور سیاسی دائروں میں ناچ کود کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ دلیل سے بات کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے' دلیل سن کر اس سے اثر نہیں لیتے۔ اختلافات وجہ تشدد و تصادم بن جاتے ہیں۔ ان کو خیانت اور اسمگلنگ اور جرائم کے روگ اپنا شکار بناتے ہیں۔ گھروں' گلیوں اور سڑکوں پر گندگی ہے' جہاں کہیں ذرا بھیڑ ہو تو دھکم پیل اور شور شرابا بڑھ جاتا ہے ان سارے وجوہ سے ذہنوں میں اضطراب اور اعصاب میں تناؤ ہے' جس کے نتیجے میں قسم قسم کی پیچیدہ بیماریاں انسان کا مقدر بن گئی ہیں۔

یہ عجیب تعلیم ہے جس کے سائے میں آزادی کے بعد اتنا طویل گزارنے پر بھی ہم حالت خوف میں مبتلا ہیں اور کئی قسموں کے خوف آسیب بن کر ہر فرد پر سوار ہیں۔

موجودہ نظام تعلیم نے قوم کو ذہنی طور پر طبقاتی جزیروں میں تقسیم کر دیا ہے۔ آج ایک سے زیادہ تعلیمی سسٹم اور معیارات ہیں' انگریزی والے اسکول اور اردو والے اسکول' حاکم و مقتدر طبقے کے بچوں کے لئے درس گاہیں اور عوام کے لئے درس گاہیں' ملکی مراکز تعلیم اور غیر ملکی مشنری مراکز تعلیم سب یہاں بیک وقت چل رہے ہیں۔

غیر صحت مندانہ نظام تعلیم

نظام تعلیم کا ایک بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ نئی نسلوں کو ایک مشن یا مقصد حیات سے مالا مال کرے اور وہ مشن یا مقصد حیات وہی ہونا چاہئے جس کے لئے کسی قوم کا وجود قائم ہوا ہو یا جس کا علم لہرا کر اس نے تاریخ کے معرکے لڑے ہوں۔ ہمارا موجودہ نظام تعلیم اپنے پروردہ نوجوانوں کو اعلیٰ اور تابناک مشن تو کجا' سرے سے کوئی مشن نہیں دیتا۔ نئی نسل کے افراد کو ودیعت کرنے کے لئے کوئی ایسا مقصد اس کے پاس ہے ہی نہیں جس سے سرشار ہو کر وہ زندگی کی رزم گاہ میں بڑے سے بڑے خطرے مول لے سکیں' اپنے ذاتی مفاد کی قربانیاں دے سکیں' فاقے کاٹ سکیں' دار و رسن کو لبیک کہہ سکیں اور جہاں بھی اس مقصد کا تقاضا ہو وہ خاک و خون میں لوٹ سکیں۔

موجودہ نظام تعلیم سے سوائے ذاتی مفاد اور ذاتی عروج کے اور کوئی مشن یا مقصد ہاتھ نہیں آتا۔ ہماری درس گاہیں سولہ سولہ اور بیس بیس برس تک پرورش فکر و نظر کرنے کے بعد جو آدمی تیار کر کے دے رہی ہیں اس کا کل سرمایہ دولت و عشرت کے ارمان اور عہدہ و جاہ کی حسرتیں ہیں۔ کسی کے پاس (الا ماشاء اللہ) سچائی کی علمبرداری کا منہج نہیں' فرض کی پابندی کا احساس نہیں' قوم کی فلاح و بہبود کا کوئی ارمان نہیں' خلق خدا کی معرفت کا ولولہ نہیں' کوئی اخلاقی قدروں کی سربلندی کا داعیہ نہیں' انسانیت کو دینے کے لئے کوئی پیغام نہیں' خود اپنے آپ کو اچھا انسان بنانے کا رجحان نہیں حتیٰ کہ محض علمی قابلیت کا زینہ بلند حاصل کرنا بھی اب مطلوب نہیں رہا بلکہ اصل چیز ڈگری اور سند بن گئی ہے۔ اور ڈگری اور سند بھی فقط اس حیثیت میں کہ وہ

جنتِ دولت و عشرت تک پہنچانے میں داخلہ کا پاس بن سکتی ہے۔

اعلیٰ اور درخشاں مشن کے نگاہوں سے ہٹ جانے کے بعد جب ذاتی مفاد ہی اعلیٰ ترین نصب العین رہ جائے تو پھر حرص و ہوس کی رہنمائی میں چلنے والا آدمی کسی اخلاقی پابندی کا احترام نہیں کر سکتا۔ ذاتی مفاد کے مشن بن جانے کا نتیجہ یہ ہے کہ جائز و ناجائز اور نیک و بد کی تمیز اٹھتی جا رہی ہے۔ رشوت' خیانت اور دیگر جرائم کے دروازے زیادہ سے زیادہ کشادہ ہو رہے ہیں۔ معاشرہ اخلاقی زوال کی طرف لڑھک رہا ہے۔

آج وقت ہے کہ کارپردازان تعلیم صحیح سوچ بچار سے کام لیں اور نظام تعلیم کو ایسی شکل دیں کہ وہ طلبہ کو ایک مشترکہ نصب العین اور مشن دے سکے۔ ایک ایسا مشن جو وزیر اور چپڑاسی' ایک کارخانہ دار اور مزدور' ایک افسر اور ایک ملازم' ایک دکاندار اور ایک کلرک' ایک وکیل اور ایک مدرس کے کردار میں یکساں کام کر سکے۔ جو ہر مرد و عورت کی مشترک متاع ہو' جو نسلوں اور علاقوں اور بولیوں کے اختلافات سے بالاتر ہو کر تمام افراد ملت کے لئے رشتۂ اخوت بن جائے۔ جو دماغوں کو حرکت میں لائے اور عالم خیال میں مدوجزر پیدا کرے' جو جسموں کو محنت و مشقت کے لئے تیار کرے' جو فرد فرد میں قربانی و ایثار کا جذبہ ابھار دے۔

ہمارے نظام تعلیم کا فرض واضح ہے۔ وہ نئی نسلوں کو اس مشن اور نصب العین کے لئے تیار کرے کہ وہ سچائی کا وہی پیغام اور عدل کا وہی نظام ساری دنیا تک پہنچانے کا وسیلہ بنیں جس کا نام اسلام ہے۔

کسی بھی قوم کے نظام تعلیم کی ایک لازمی خوبی یہ ہونی چاہئے کہ وہ مستقبل اور ماضی کے درمیان ربط تسلسل قائم رکھے اور نئی پود کو پچھلی نسلوں کا سچا جانشین و وارث بنائے۔

مگر ہمارا موجودہ نظام تعلیم مستقبل کا رشتہ ماضی سے کاٹنے کا باعث بنا ہے اور اس نے نئی نسلوں کو پچھلی نسلوں کے خلاف باغیانہ راستہ اختیار کرنے کے لئے تیار کیا ہے۔ درسگاہیں نئی نسلوں کو یہ شعور نہیں دلا سکیں کہ ان کا اپنا اصل سرمایۂ تہذیب و ثقافت کیا ہے؟ کون سے عقیدے' کون سے نظریات و تصورات' کون سے اصول' کون سی اخلاقیات' کون سی روایات' کون سے آداب' کون سی اقدار' کون سے شعائر اور کون سے اطوار ہیں جس کے بہم ہونے سے ان کا قومی و ملی وجود بنتا ہے۔ حیات اجتماعی کا وہ اساسی جوہر کیا ہے جس کو کسی حالت میں

انہیں ضائع نہیں ہونے دینا ہے بلکہ دانتوں سے پکڑے رکھنا ہے۔ ان کا امتیازی رنگ کیا ہے اور ان کا نیشنل ٹائپ کس قسم کا ہے جس سے وہ کسی حال میں الگ نہیں ہو سکتے۔ باہر سے جو بھی نئے افکار' تجربات اور ثقافتی اثرات لئے جائیں گے ان کو لازماً اوپر سے قائم چلتے آنے والے ملی وجود سے ہم آہنگ کر کے لینا ہو گا اور انہیں اپنے عقائد و روایات کے سانچے میں ڈھالنا ہو گا۔ جو چیزیں ہمارے سانچے میں ڈھلنے اور ہمارے رجحانات سے ہم آہنگ ہونے پر تیار نہ ہوں گی ان کو اٹھا کے پھینک دینا ہو گا۔ بصورت دیگر وہ مرکزی جوہر برباد ہو جائے گا جس سے ہمارا قومی وجود عبارت ہے۔ اور بدقسمتی سے اس کی بربادی کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے اور اس بربادی میں بہت بڑا حصہ ہمارے نظام تعلیم کا ہے۔ جس نے غلامی میں بھی اپنے ایسے ہی کرشمے دکھائے اور اب آزادی کے دور میں بھی اس کی یہی کرامات سامنے آ رہی ہیں۔

تہذیبی تسلسل کو یکے بعد دیگرے مختلف نسلوں میں قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارا نظام تعلیم قومی و ملی تاریخ کو بہت بڑی اہمیت دے جس کے حوادث سے ہم گزر کر آ رہے ہیں۔ وہ تاریخ کو بادشاہوں کے تذکروں اور جنگ و جدل کی داستانوں کی شکل میں لینے کے بجائے اسے ہمارے تہذیبی تسلسل کے ریکارڈ کی حیثیت سے لے۔ وہ اسے ایک رزم گاہِ خیر و شر کا رنگ دے کر دیکھے اور دکھائے جس میں دنیا کی ایک عظیم الشان ملت نے اپنے اصول و مقاصد کی خاطر قدم قدم پر فکری اور اخلاقی اور سیاسی لحاظ سے معرکے لڑے ہیں اور ہزار بار زخم کھانے اور لہولہان ہونے کے باوجود اس نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ وہ گر گر کے اٹھی ہے اور مر مر کر زندہ ہوتی رہی ہے۔ تیرہ صدیوں کی اس لمبی کشمکش میں اس نے اپنے وجود —— اپنے امتیازی وجود —— کو تحلیل نہیں ہونے دیا بلکہ اسے پابرجا رکھا ہے۔ بیرونی حملوں اور داخلی فتنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ اپنے جس بھی اصول و مقاصد سے بچھڑ گئی ہے ان کی بازیافت کا جذبہ اس کے ہاں کبھی کم نہیں ہوا۔ اس کا دور حیات نظام عدل کی جس بیم و درخشاں سے شروع ہوا تھا' اتھاہ تاریکیوں میں گھر کر اسی صبح کے ظہور کا سروسامان کرنے کی اس نے بار بار فکر کی ہے۔ وہ کسی بھی انجام سے دوچار ہوئی ہو' اس کا رشتہ اس کے حسین آغاز سے کبھی نہیں ٹوٹا۔

اس معرکہ تاریخ میں اس کے اندر سے بڑی بڑی اولوالعزم شخصیتیں ابھری ہیں۔ جنہوں

نے علم کے چراغ بھی روشن کئے' جنہوں نے جہانبانی کے نئے نئے تجربے بھی کئے' جنہوں نے اخلاق و کردار کی زریں مثالیں بھی چھوڑیں اور جنہوں نے جہاد کے میدانوں میں بھی شجاعت کا قابل رشک معیار قائم کیا اور بہ حیثیت مجموعی بعد میں آنے والوں کے لئے فکر و عمل کی قابل فخر میراث چھوڑی۔

جو نظام تعلیم ہمیں ہماری اولوالعزم شخصیتوں سے وابستہ نہیں کرتا اور ان کی میراث فکر و عمل پانے کے قابل نہیں بناتا اور جو نظام تعلیم ہم میں اپنے اصول و مقاصد کے لئے پیچھے سے چلی آنے والی کشمکش کو جاری رکھنے کی صلاحیت پیدا نہیں کرتا اور نتیجتاً ہمارے اندر فکری و تہذیبی تسلسل کو قائم رکھنے میں مد نہیں ہوتا وہ گویا ہمارے ملی وجود کے لئے ایک گھن ہے اور اس کی دی ہوئی تعلیم کا تیزاب تو آہنی خودی کو بھی مٹی کے ڈھیر میں بدل دے گا۔ ہمارے موجودہ نظام تعلیم کی شان یہی ہے۔

موجودہ نظام تعلیم نوجوانوں کو صرف اپنے ماضی اور اپنے اسلاف سے بیگانہ ہی نہیں کر رہا بلکہ ان سے متنفر کر رہا ہے۔ وہ اپنی تاریخ کے متعلق انکے اندر احساس کمتری ابھار رہا ہے۔ وہ انہیں اپنے اعاظم و اکابر کا نکتہ چین ہی نہیں بنا رہا بلکہ ان کے خلاف تحقیر کا رجحان ان کے اندر ابھار رہا ہے۔ وہ گویا ایک درخت کی شاخوں کا تعلق اس کی جڑوں سے کاٹ رہا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ دوسروں کی ذہنی غلامی کرنے کے لئے ان کے دل و دماغ اس حد تک ہموار ہو چکے ہیں کہ اس فعل شنیع پر الٹا وہ فخر محسوس کرتے ہیں۔ آج حال یہ ہے کہ دوسروں کے وجود اہم محسوس ہوتے ہیں مگر اپنا وجود اہم محسوس نہیں ہوتا' بلکہ اپنا وجود تو سرے سے محسوس ہی نہیں ہوتا۔

یہ نظام تعلیم غیر بینی سکھاتا ہے' خود شناسی کی صلاحیت پیدا نہیں کرتا۔ اور تعلیم کا شاید پہلا اور اصل کام خود شناسی پیدا کرنا ہے۔ نوجوان عنصر کو اس کے ذریعے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کون ہیں' کیا ہیں' ان کی راہ عمل کیا ہے' وہ کس نصب العین کے لئے زندہ ہیں' ان کے اندر کیا صلاحیتیں ہیں اور ان کا صحیح تصرف کیا ہے۔ یہ نہیں تو پھر کتابوں کے گٹھڑ لاد دینے اور لمبی لمبی عبارتیں رٹ لینے کا نام تعلیم نہیں ہے۔

موجودہ تعلیم کے غیر صحت مندانہ اور ناسازگار ہونے کی اس سے بڑھ کر دلیل کیا ہو گی کہ وہ ویسے اعلیٰ تخلیقی دماغ اور ویسی صاحب کردار شخصیتیں اتنی تعداد میں بھی فراہم کر کے نہیں

دے سکا جتنی غلامی کے دور میں سامنے آتی رہی ہیں۔ کوئی مولانا محمد علی' کوئی ڈاکٹر انصاری' کوئی غلام السیدین' کوئی ظفر علی خان اور کوئی اقبال اس کی آغوش میں پرورش نہیں پا سکا۔ ہم کتنے بڑے قحط الرجال سے دوچار ہیں۔

ہمارا نظام تعلیم ہمارے لئے ذریعہ خود شناسی ہونا چاہئے۔ اور اسے پچھلی' موجودہ اور آئندہ نسلوں کے درمیان فکری اور تہذیبی رابطہ مضبوط کرنے کا وسیلہ بننا چاہئے۔

تعلیم ـــــ جنس تجارت

ہماری قوم ایک غریب قوم ہے اور اس کی ۸۰ فیصد آبادی دیہات میں بکھری پڑی ہے جس کے پاس اقتصادی لحاظ سے نہایت ہی محدود وسائل ہیں۔ ایسی غریب قوم کے اندر اگر تعلیم کو ایک جنس تجارت بنا دیا جائے اور اس کا نرخ بھی خوب چڑھا ہوا ہو تو نتیجہ اس کے سوا کیا نکلے گا کہ تعلیمی ترقی کی راہیں صرف مختصر سے خوش حال طبقہ کے لئے کشادہ ہوں اور غریب خاندانوں کے بچے محرومی کا شکار ہو کے رہ جائیں۔

آج اگر آپ مختلف مدارج کی فیس داخلہ' امتحانات کی فیسوں' نصابی کتب کی قیمتوں اور سٹیشنری کے مصارف کا پورا حساب لگائیں تو اندازہ ہو گا کہ کسی بچے کو گریجویٹ کرانا والدین کے لئے کوہ بیتوں میں سے جوئے شیر نکال کے لانے سے کم نہیں۔ کسی غریب گھر کے دو چار بچوں کا اچھے معیار تک تعلیم حاصل کر لینا سرے سے خارج از امکان ہے۔

اسلام نے جس طرز کی فلاحی ریاست[1] کا تصور ہمیں دیا ہے اس کا معاملہ شہریوں سے اس انداز پر ہوتا ہے جیسا والدین اپنی اولاد سے رکھتے ہیں۔ جس طرح بچوں کو گھریلو حد تک تعلیم و تہذیب سے آراستہ کرنا ماں باپ پر فرض ہے اسی طرح آگے کی وسیع منازل کے لئے ریاست کا فرض ہے کہ وہ شہریوں کی اولادوں کی ذہنی و اخلاقی نشو و نما کا بندوبست کرے۔ جس طرح پدریت و مادریت اولاد کی تربیت کی قیمت میں کوئی فیس وصول نہیں کرتی اسی طرح

---

[1] فلاحی ریاست کا اسلام کا ایک مخصوص تصور ہے جس کے مطابق یہ تصور کرنا بھی مشکل ہے کہ تعلیم اور انصاف ایسی چیزیں ہیں جن کی کوئی فیس یا قیمت ہو سکتی ہے۔ یہ دونوں کھلی خدمت کی چیزیں ہیں اور اسلامی فلاحی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ قوم کے لئے مہیا کریں۔ [مؤلف]

اسلام کی فلاحی مملکت بھی قیمتاً تعلیم نہیں بیچ سکتی۔ یہ تو ریاست کا اپنا کام ہے کہ وہ اپنے نظریہ اساسی اور اپنے نصب العین کی علمبرداری کے لئے سپاہی تیار کر رہی ہے۔

لیکن ہم اصول تدریج کو قبول کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر "مفت تعلیم" کے معیار تک ہم فوراً نہیں پہنچ سکتے تو کم سے کم ہمیں پہلا قدم "سستی تعلیم" کے رخ پر اٹھا دینا چاہئے اور موجودہ مصارف تعلیم میں ۵۰ فیصد کمی کر دینی چاہئے۔ اس کے ساتھ ساتھ بجٹ میں ایسی بھاری رقوم مخصوص کرنی چاہئیں جن سے غریب خاندانوں کے بچوں کے لئے اتنے وظائف کا انتظام کیا جا سکے کہ کوئی بچہ محض غربت کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم سے محروم نہ رہ جائے۔ ان وظائف کی مالیت اتنی ہو کہ نصابی کتب اور دوسرے تعلیمی مصارف کا بار طلبہ بآسانی اٹھا سکیں۔ کالجوں اور سکولوں کی لائبریریوں میں نصابی کتب کا ذخیرہ بڑی مقدار میں موجود رہنا چاہئے۔

اگر کوئی ریاست واقعی فلاحی ریاست ہو اور جمہوری اسلوب پر چلے تو پولیس اور سی آئی ڈی اور سنسر اور دوسرے انتظامی محکموں کے مصارف میں کمی کر کے تعلیم کی مد میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح وہ رقوم جو نام نہاد ثقافتی تقریبوں اور وفود اور مختلف استقبالوں اور ضیافتوں وغیرہ پر صرف کی جاتی ہیں ان کو اگر تعلیم جیسے بنیادی تعمیری کام کے لئے مخصوص کر دیا جائے تو لاکھوں بچوں اور ان سے متعلق خاندانوں کا مستقبل سنور سکتا ہے۔

آخر یہ کیا تک ہے کہ جہاں تعلیم جیسی بنیادی ضرورت پوری نہ کی جا رہی ہو وہاں آرٹ اور کلچر کے رقص و سرود کے فروغ اور فیملی پلاننگ کی ترویج کے لئے بھاری رقوم مختص کی جائیں۔ ہمارا نظام تعلیم اس ضروری اصلاح کا بہت ہی شدید طور پر محتاج ہے کہ تعلیم ایسی جنس نہ ہو جسے نہایت مہنگے داموں صرف امرا کی اولادیں خرید سکیں۔

ہمارے نظریات و عقائد اور نظام تعلیم *

آدمی کے معاملات کی نوعیت کا دارو مدار ان نظریات و عقائد پر ہوتا ہے جو اس کے نفس میں رچ بس جائیں۔ کسی نظریئے کا ذہن میں رچ بس جانا ہی اسلام کی اصطلاح میں ایمان کہلاتا ہے۔ آدمی اگر اپنے آپ کو کسی خدا کا بندہ سمجھتا ہو اور اس کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ اور اس کی طرف سے اپنے آپ کو اخلاقی حدود کا پابند تسلیم کرتا ہو تو اس کا رویہ ایک طرح کا ہوتا ہے اور ایسا نہ ہو تو اس کا رویہ دوسرا ہوتا ہے۔ یہ دنیا کی جانی پہچانی حقیقت ہے کہ خدا پرستی اور آخرت کے احتساب کا احساس اور کسی مذہب کے ضابطہ اخلاقی کے احترام نے ہمیشہ انسانی اخلاق میں بلندی پیدا کی ہے۔ خاص طور پر اسلام کی تاریخ اس بارے میں ایک مکمل ترین تجربہ ہمارے سامنے لاتی ہے کہ اس کے عقائد نے دو چار افراد کو نہیں بلکہ ایک معاشرے کے معاشرے کو صالح بنا دیا۔

لیکن ہمارے ہاں صدیوں سے معاشرہ جس تاریخی عمل سے گزر رہا ہے وہ ذہنوں کو اسلامی عقائد سے اکھیڑ کر مادہ پرستانہ نظریات پر استوار کر رہا ہے۔ یہ وہ بنیادی فساد ہے کہ جس کی وجہ سے اخلاقی اصولوں کی گرفت روز بروز ڈھیلی ہو رہی ہے اور لوگ تیزی سے مفاد پرست اور خواہش پرست بن رہے ہیں۔

دوسری بڑی چیز جو سیرتیں بناتی ہے وہ زندگیوں کا مقصد ہوتا ہے۔ افراد کی زندگیوں کا مقصد اور قوم کی زندگی کا مقصد! اگر کسی قوم اور اس کے افراد کے سامنے کوئی بلند انسانیت گیر مقصد ہوتا ہے تو اخلاق کا معیار خود بخود بلند ہو جاتا ہے لیکن اگر کوئی ایسا مقصد کارفرما نہیں ہوتا تو پھر خواہشات ہی سب سے بڑا مقصد بن جاتی ہیں اور جہاں خواہشات ہی سب سے بڑا مقصد ہوں وہاں فضا رشوت' خیانت اور بد دیانتی کے لئے ساز گار ہونی ہی چاہئے۔

آپ کسی بڑے سے بڑے ذمہ دار پاکستانی اور کسی عامی سے عامی شہری سے یہ پوچھ کر

* چراغ راہ: نومبر ۱۹۵۲ء

دیکھئے کہ تمہارا مقصد زندگی کیا ہے؟ تو اول تو وہ سوچتا رہ جائے گا اور فی البدیہہ کوئی جواب نہ دے سکے گا اور اگر وہ کوئی جواب دے گا تو بالعموم اپنے سیاسی لیڈروں کے رٹائے ہوئے کسی مقبول عام فقرے کو دہرا دے گا۔ بغیر یہ جانے ہوئے کہ اس فقرے کا کوئی اثر اس کے ذہن میں موجود ہے یا نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ خواہشات سے بڑا کوئی مقصد نہ کسی ''بڑے میاں'' کے سامنے ہے' نہ کسی ''چھوٹے میاں'' کے سامنے!

عقائد و نظریات اور اخلاق اور مقصد کے پہلو سے یہ حالت جو پوری طرح چھا چکی ہے اس میں دوسرے بہت سے عوامل کے ساتھ ہمارے نظام تعلیم و تربیت کا نہایت ہی اہم اور موثر ترین حصہ ہے۔ ہمارا نظام تعلیم اپنے سانچے میں جو انسان ڈھال کر دیتا چلا آ رہا ہے اس کا نظریۂ زندگی خالص حیوانی اور مادہ پرستانہ ہے' اس کے سامنے اگر کوئی نظریہ اخلاق ہے تو وہ افادیت کا ہے۔ اس کا اگر کوئی مقصد زندگی ہے تو بس نوکری' عہدہ' روپیہ' کوٹھی' کار' سیر و تفریح' ریڈیو سیٹ' صوفہ سیٹ وغیرہ ہے۔ بس خواہشات کے ان کھلونوں پر ساری زندگی لگا دی جاتی ہے۔ قدرتی طور پر اس نظام تعلیم سے نفع پرست اور خیانت کار کارکن اور شہری حاصل ہوتے ہیں۔

اب اگر اس وقت معاشرتی برائیوں کا سدباب ہمیں مطلوب ہو تو ہمیں پورے نظام تعلیم کو ایسے نقشے پر استوار کرنا ہو گا کہ اس کا ہر مضمون ہر درجے میں اپنے زیر اثر طلبا کے اندر یہ ذہنیت ابھارنے والا ہو کہ تم ایک خدا کے بندے ہو' تم اس کے حدود کے پابند ہو۔ تم اس کے دین کے علمبردار بنا کر اٹھائے گئے ہو' تم اس کے سامنے جواب دہ ہو۔ پھر ہمارے نظام تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ وہ طلبا کو نہ صرف اسلامی اخلاق کی تعلیم بلکہ عملی تربیت دے کر نکالے۔ پھر ہمارے نظام تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ ہماری نئی نسلوں کو وہ اونچا مقصد زندگی دے جس کے لئے قرآن نازل ہوا۔ وہ ان میں یہ شعور ابھارے کہ تم ساری دنیا کے لئے اخلاقی معلم بنائے گئے ہو' تم انسانیت کے ضابطۂ اخلاق کے مشعل بردار ہو اور تم بدی کے خلاف لڑنے والے نیکی کے سپاہی ہو! تم کو اقوام عالم کا امام بنایا گیا ہے تمہاری قوم معروف کی دعوت دینے اور منکر کا استیصال کرنے پر مامور کی گئی ہے اور تمہاری مملکت کرہ ارض کے ایک ایک متنفس کو غیر الٰہی اقتداروں سے نجات دلانے اور الٰہی اقتدار کی برکات سے بہرہ ور کرنے

کے لئے وجود میں آئی ہے' تم کو قوم اپنی خواہشات کی عبادت میں زندگی گزارنے کے لئے تیار نہیں کر رہی بلکہ تم سے پوری انسانیت کی فلاح کا کام لینے کے لئے تیار کر رہی ہے۔ جوں جوں یہ شعور نئی پود میں ابھرے گا بندگی نفس کے محرکات کمزور ہوتے جائیں گے اور فتنہ رشوت و خیانت کی جڑیں سیرتوں سے اکھڑتی جائیں گی۔

تعلیم سے گزرنے کے بعد جن طلبا کو حکومت کی ملازمت کرنا ہو ان کو ایسی تربیت گاہوں سے گزارنا چاہیے جہاں پوری طرح اسلامی ماحول چھایا ہوا ہو اور اس پاکیزہ ماحول میں ان کے اندر یہ حس بیدار کی جائے کہ تم ایک اسلامی مملکت کے پرزے بننے والے ہو۔ یہ مملکت دنیا کا ایک مقدس ادارہ ہے اور اس ادارے کا جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک واجب الاحترام امانت ہے جس کا ایک حصہ تمہاری تحویل میں رہے گا۔ تم محض پیٹ بھرنے کے لئے اس خدمت کے لئے تیار نہیں کئے جا رہے بلکہ یہ کام اللہ تعالیٰ کی عبادت کے جذبے سے کیا جانے والا ہے۔ تم صرف اپنے افسروں کے سامنے ہی جواب دہ نہیں ہو گے بلکہ براہ راست اپنے رب کے سامنے بھی جواب دہ ہو' جس کی سی آئی ڈی ہمہ وقت تمہارے ساتھ ہے اور اپنے وقت اور قوئ اور سرکاری املاک کو جس جس طرح تم استعمال کرو گے اس کا ریکارڈ رکھ رہی ہے۔

اس طرح جن افسروں کو کسی خاص ٹریننگ کورس سے گزارا جائے ان میں بھی مسلمان کا سا احساس ذمہ داری بیدار کیا جائے کہ تم عنقریب اس اسلامی مملکت کے کسی شعبے کے انچارج بننے والے ہو' تم پبلک کے مفاد کے نگہبان قرار پانے والے ہو اور تمہارے سپرد بڑی بڑی امانتیں ہونے والی ہیں جن کے بارے میں قوم کے سامنے بھی جواب دہ ہو اور اللہ کے سامنے بھی! اس لئے یہ نہ سمجھو کہ یہ کوئی پھولوں کی سیج ہے یہ کانٹوں کا بستر ہے۔ تمہیں ریاست اور دین اور پبلک کے مفاد کے لئے اپنے مفاد اور آرام اور خواہشات کو قربان کرنا ہو گا تب تم اپنے فرض میں پورے اترو گے۔

غلط نظام تعلیم اور ہمارے ادیب*

جس تعلیم نے ہمارے موجودہ ادیبوں کو گود میں پالا وہ ان کو سرے سے روح تخلیق نہیں دے سکی (تخلیق سے مراد افسانوں اور غزلوں کی تخلیق نہیں، بلکہ فکر و معنی کی تخلیق) اس نے فقط روح تقلید دی ہے! جس لٹریچر کا بیگانہ دودھ ان کو پلایا گیا تھا اس نے ان کو شعور خویشتن دیا ہی نہیں اس نے اپنی روایات و اقدار سے ان کا تعلق جڑنے ہی نہیں دیا۔ پہلے وہ انگریزی ادبیات کا ترجمہ کرتے رہے پھر ایک گروہ نے اشتراکی ادبیات کے سرمایہ پر تکیہ کیا۔ کچھ دن تو یہ کاروبار خوب چمکا، لیکن جلد ہی بازار سرد پڑنے لگا۔ ادیب کا قلم کولہو کا بیل بن کر ایک چھوٹے سے دائرے میں گھومنے لگا اس کی گھنٹی برابر بجتی رہی مگر خالی گھومنے سے کیا ہوتا ہے تلوں سے تیل نکلنا بند ہو گیا۔ دوسرے ماحول کے ساز کی تانیں اپنے سماج کی دھڑکنوں کا ساتھ نہ دے سکیں۔

ایک غلط نظام تعلیم کے تیار کردہ ادیب کے پاس بکھرے ہوئے جذبات و حسیات ہیں، جن کو جوڑنے والا کوئی نظریاتی رابطہ نہیں۔ ان میں خیر و شر کی تمیز کرنے والا کوئی پیمانہ نہیں سارے انسانی ادبیات میں سے مشترک روشن قدروں کی چھانٹ پرکھ کرنے والی کوئی کسوٹی نہیں۔ وہ خود کھویا کھویا سا ہے وہ کسی کو کیا سہارا دے گا۔ قدامت اور جدت، مشرقیت اور مغربیت، جمہوریت اور اشتراکیت، مادیت اور انسانیت کی مختلف رویں ٹکرا رہی ہیں اور وہ اس کشمکش میں نہ خود اپنے لئے کوئی مضبوط موقف رکھتا ہے، نہ عوام کو کسی اصولی محاذ پر جما سکتا ہے۔ قوت ارادی، قوت ایمانی کا اس میں فقدان ہے اور وہ مضبوط کردار کے ساتھ کسی فتنۂ قلب ونظر کے سامنے قدم نہیں جما سکا۔ کسی چلتی رو کی مزاحمت نہیں کر سکا۔ کسی سچائی کو منوانے کے لئے لمبی جنگ نہیں لڑ سکا۔ حالیؔ اور اقبالؒ جس مستحکم نظریاتی شعور، جس مقصدی زور اور جس قوت کردار کے ساتھ حالات پر اثر انداز ہوئے تھے اس کی مثال آج کہیں نہیں ملتی۔ ورنہ اگر

---

* ہفت روزہ شہاب ۲۴ جنوری ۱۹۶۰ء

ادیب کے پلے اپنا کوئی سرمایہ فکر ہوتا تو وہ ہر شر اور ہر نامطلوب حالت کے خلاف ایک کشمکش اٹھا دیتا وہ خارجی حالات کے مقابلے میں انسان کی داخلی قوتوں کو متحرک کر دیتا وہ آہستہ آہستہ اپنے عوام کے اندر ایک نئے انسان کی پرورش کرتا جاتا۔

تعلیم کی تشکیل نو —

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں *

جب کوئی قوم تعمیر نو کے مرحلے میں داخل ہوتو دستور اساسی کی تدوین کے ساتھ اس کی اولین توجہ جس شعبہ کار کی طرف جانی چاہئے وہ اس کا نظام تعلیم ہے۔ نظریہ پاکستان کے مطابق ہم زندگی میں کوئی بھی کامیاب موثر اور دیرپا تبدیلی نہیں لا سکتے' نہ کوئی دستور و قانون چل سکتا ہے اور نہ اقتصادیات میں انصاف اور دفاع میں استحکام آ سکتا ہے جب تک کہ نظام تعلیم اس مقصد کے لئے روشن دماغ' بیدار دل اور خوش کردار لیڈرز' کارکن اور شہری تیار کر کے دینے کی ذمہ داری پوری نہ کرے۔ بدقسمتی سے ہمارا نظام تعلیم دور غلامی ہی کے ڈھانچے کے ساتھ چل رہا ہے جس کی جزوی تبدیلیاں (قطع نظر اس سے کہ ان میں سے کون سی مفید ہے' اور کون سی مضر اور کون سی رجعت پسندی کی حیثیت رکھتی ہے) اس کی مقصدی روح کو ہرگز بہتر نہیں بنا سکیں۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اب تک جن بدلتے ہاتھوں نے مملکت کو چلایا ہے وہ نئی نسل کو ایک اچھا پاکستان تعمیر کر کے تفویض کرتے اور نژاد نو پر اس میراث کو صرف حسین تر اور مضبوط تر بنانے کی ذمہ داری ہوتی۔ مگر مقام افسوس ہے کہ برسوں بیت گئے اور ا[illegible] یہ کا مستحق شعبہ بھی اسلامی تصورات اور قومی ضروریات کے مطابق ترتیب نو نہیں پ[illegible]ے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہمارے تصور حیات و کائنات اور ہمارے شعار و اقدار کے خلاف جو نظام تعلیم دور غلامی کی بنیادوں پر نشوونما پا گیا ہے' اسے کس طرح تبدیل کیا جا سکتا ہے؟ اس بحث میں جو مشورے دیئے گئے ہیں ان کی ضرورت سب سے زیادہ حکومت کو ہے' پھر کار پردازان تعلیم کو اور پھر دانش وروں کو۔

ہمارا نظام تعلیم مکمل تبدیلی چاہتا ہے' اور جلد از جلد چاہتا ہے مگر یہ کام اتنا بڑا ہے' اور اس

* یہ مضمون ۱۹۷۲ء میں تحریر کیا گیا۔

میں مشکلات اور مزاحمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ پہاڑ کاٹ کاٹ کر ایک ایک قدم آگے بڑھنا ہے میں یقین رکھتا ہوں انشاء اللہ وہ وقت جلد آنے والا ہے جب کہ ہماری درس گاہیں ایسے مردان کار کو میدان میں لانے لگیں گی جو نہ صرف اپنے ملک میں اسلامی نظام کو پوری مہارت سے چلانے والے ہوں گے بلکہ وہ پوری دنیائے انسانیت کی تاریکیوں میں نورانی انقلاب کا پیغام پہنچانے کے لئے شعاعیں بن کر پھیل جائیں گے۔

کسی ملک کے نظام تعلیم کو بنیادی نظریہ و مقصد کے لحاظ سے تبدیل کر دینا کچھ اس طرح کا عمل نہیں ہے کہ ایک ریلوائی نے کانٹا بدل دیا اور گاڑی ایک لائن سے گزرنے کے بجائے دوسری لائن پر چلی گئی' اور اس ذرا سی تبدیلی سے بسا اوقات اس کی منزل مقصود ہی بدل جاتی ہے۔ نظام تعلیم کی تبدیلی ایک انقلابی عمل ہے اور اس کے کئی مسائل ہیں۔

تعلیمی نصب العین کا تعین

اس عمل کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ آپ کے سامنے یہ بات متعین اور واضح ہو کہ آپ موجودہ نظام تعلیم کو کیوں ناپسند کرتے ہیں اور اس کی جگہ دوسرا نظام تعلیم کن خواص کے ساتھ لانا چاہتے ہیں یہ سوال بھی شاید کافی نہیں۔ عملی اقدام کے لئے مرکزی نکتہ یہ طے کرنا ہے کہ آپ اپنے ہاں کس قسم کا انسان چاہتے ہیں۔ کیسے حکام؟ کیسے لیڈر؟ کیسے افسر؟ کیسے ؟ کیسے ڈاکٹر؟ کیسے انجینئر؟ کیسے صنعت کار؟ کیسے تاجر؟ کیسے معلم؟ کیسے صحافی؟ کیسے ادیب؟ کیسے جج؟ کیسے سپاہی؟ اور کیسے شہری۔ اور فی الجملہ یہ کہ مختلف فرائض ادا کرنے والوں کے مخصوص کردار سے قطع نظر' قوم کے تمام افراد میں آپ مشترک ذہنیت کیسی چاہتے ہیں اور مشترک کردار کس طرح کا تشکیل دینا چاہتے ہیں۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ آپ کے نظام تعلیم کا نصب العین کیا ہوگا۔

یہ مسئلہ اگر واضح نہ ہو تو اسلامی تعلیم کے نعرے اور مقالے اور وزیروں اور سیکرٹریوں کے خطابات' بورڈوں اور کمیٹیوں کے فیصلے اور اخباروں کے اداریئے وغیرہ سب ہوائی باتیں ہوں گی۔

خوشی کی بات ہے کہ ملک بھر میں نظام تعلیم کی تبدیلی کا تقاضا پھیل گیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض تلخ تجربات نے ملک کے کارپردازوں کو بھی مسئلہ تعلیم میں قومی و اجتماعی فکر کو قبول

کرنے کا احساس پیدا کیا ہے۔ مگر ساتھ ہی مجھے سخت تشویش ہے کہ عملی کام کرنے والے حلقوں میں متفرق ہوائی باتوں کے علاوہ ابھی کچھ ٹھوس مسالہ موجود نہیں ملتا ہے۔ انجینئر بڑے نیک جذبے سے مسجد بنانے چلے ہیں (اور یہ مبارک جذبہ بہر حال کچھ نہ کچھ نتائج خیر دے گا) مگر فی الحال یہ کسی کو معلوم نہیں کہ مسجد کی عمارت کے خواص اور امتیازات کیا ہوتے ہیں اور اس میں کن کن ضروریات کا اہتمام کرنا ہوتا ہے۔ کوئی اگر پیش نظر کارِ عظیم کے نقیبوں اور ماہرین سے پوچھے کہ آپ کیا کیا کچھ' کیسے کیسے چاہتے ہیں تو میرا اندازہ یہ ہے کہ ''بتائے نہ بنے'' والی صورت پیش آئے گی۔

ایک تہذیب کی بجائے دوسری تہذیب

نظام تعلیم کی تبدیلی دراصل کسی قوم کا ایک تہذیب کی طرف چلتے ہوئے سماجی نظام کا راستہ چھوڑ کر کسی دوسرے طرز کی تہذیب کے رخ پر لے جانے والی رہ گزر کو اختیار کرنے کا نام ہے۔ محض نظریہ نظریہ کی رٹ لگانے سے کوئی متعین بات سامنے نہیں آتی اور نہ تعلیمی انقلاب کا تصور پیدا ہوگا۔ شاید صحیح صورت یہ ہے کہ مشیت نے ناخوشگوار حالات کے کوڑے لگا لگا کر ہمیں اس پر چار و ناچار آمادہ کر دیا ہے کہ ہم تعلیم کے وہ خطوط اختیار کریں جنہیں از روئے ایمان اور بربنائے شعور و دلائل' بہ تقاضائے وجود ملی رضا کارانہ شان سے اختیار کرنا چاہئے تھا اور حائل ہونے والے عوامل ——— خواہ پورا زمانہ اور عالمگیر قوتوں کے جبر و مکر کا لمبا چوڑا سلسلہ کیوں نہ ہو —— اور مزاحم قوتوں کے خلاف جارحانہ جذبے سے لڑ جانا چاہئے تھا۔ یہ صحیح ہے تو پھر دو راستے ہیں ''طوعاً'' کا راستہ اور ''کرھاً'' کا راستہ —— یعنی اپنے ذوق و شوق سے یا بادل ناخواستہ ——— غالباً بالکل بادل ناخواستہ والی صورت تو اب نہیں ہے۔ کیونکہ حالات کے کچوکوں ہی سے سہی' بہت سے اصحاب کو یہ بات یاد آ گئی ہے کہ ہم کچھ مسلمان بھی ہیں' اور ہماری کوئی شے اسلام بھی ہے' جسے نسیان و بے نیازی کے کباڑ خانے سے نکال کر مصیبت کے وقت میں جب بھی بہ طور تلوار یا ڈھال کے استعمال کیا جاتا ہے تو وہ اچھا خاصا بچاؤ کر دکھاتی ہے' بلکہ غیر ممکن کو ممکن کر دینے کے معجزے اس سے صادر ہوتے ہیں' لہٰذا کچھ اس کا خیال بھی رکھنا چاہئے۔

لیکن ذوق و شوق والی وہ صورت بھی تو نہیں جو انقلابی رو ابھار دیتی ہے' جو ایک

عاشقانہ جنون پیدا کر دیتی ہے اور عاشقانہ جنون کے قحط کو جب میں دیکھتا ہوں تو پریشانی ہوتی ہے کہ تعلیمی تبدیلی کا کھیل ڈھل مل یقینی کے عالم میں کامیابی سے کھیلا بھی جا سکے گا۔

میں صرف یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ نظام تعلیم کو بنیادی یا نظریاتی حیثیت سے تبدیل کرنے یا اس کا رخ ایک تہذیب سے دوسری تہذیب کی طرف موڑنے کے لئے ابتدائی اہم ترین ضرورتوں میں سے ایک یہ ہے کہ شعوری جنون انقلاب کارفرما ہو۔ اولاً اس مرکزی ذمہ دار قوت میں جو نظام تعلیم کی تبدیلی کا فیصلہ کرنے اور اس فیصلے کی تعمیل کرانے پر قادر ہے۔ ثانیاً اس قوت میں جو مناصب پر بیٹھ کر تبدیلی کا طریقہ اور اس کے خطوط سوچے گی۔ ثالثاً اس قوت میں جو مجوزہ نقشے پر نصابات کو ڈھالے گی۔ رابعاً اس قوت میں جو نئے نقشے اور نئے نصابات کے مطابق (بلکہ ان کی کمی کو پورا کرتے ہوئے) زیر تعلیم نسل کے دل ودماغ کی تشکیل نو کرے گی۔

یہ ابتدائی اور اشد اہم ضرورت کہاں تک پوری ہو چکی ہے یا ہو سکتی ہے۔ میں اسے ایک سوال کی شکل میں چھوڑے دے رہا ہوں۔ اس کا جواب دینا ان قوتوں کا کام ہے جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔

اسلام کا واشگاف دعویٰ

نظریۂ پاکستان بڑا اہم کلمہ یا طغریٰ ہے، اور ہم سب اسے استعمال کرتے ہیں، لیکن اس کی ایجاد اور اس کے استعمال میں ہماری ایک ذہنی کمزوری کام کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم سیدھی سیدھی طرح اسلام کی بات اس زور وشور سے کرنے کی ہمت نہیں رکھتے جس زور وشور سے مغرب کا آدمی سیکولرازم کو اور دوسرے محاذ کا کوئی فرد اشتراکیت کو پیش کرتا ہے۔ ہم اسلام کو کچھ ''لکا چھپا'' کر (معاف کیجئے گا کہ لفظ ''لکا'' میں نے پنجابی سے لیا ہے) کچھ لپیٹ لپاٹ کر محفل زندگی میں لانا چاہتے ہیں کہ اس کی آمد پر کسی کو پتہ نہ چل جائے کہ آنے والا اسلام ہے۔ بلکہ اب تو مجھے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ خود نظریۂ اسلامی کا استعمال بھی اسلام کی اسلامیت کو ذرا ہلکا کرنے کے لئے کام دیتا ہے۔

اپنے مطلوب دین یا نظام تہذیب کے لئے احساس کہتری کے سرمائے سے آغاز کار اپنے مقصد کو آپ نقصان پہنچاتا ہے۔

کچھ کرنا ہے تو کھل کر کیجئے۔ جو بات کہنی ہے اسے دو ٹوک طریق سے کہئے تاکہ ساری قوم کو پتہ چل جائے کہ کیا ہونے والا ہے۔ موافق عنصر میں نئی حرکت پیدا ہو' اور مخالف عناصر کو ایک فیصلہ کن چیلنج سے دوچار کر دیا جائے۔

خطرات کو مردانہ وار انگیز کئے بغیر (جن میں عالمی سطح کے خطرات بھی شامل ہیں) کوئی بڑا کارنامہ کسی بھی شعبے میں نہیں کیا جا سکتا۔ اگر مخالف قوتوں سے سمجھوتے ہی کرنے ہوں تو پھر موجودہ نظام تعلیم بھی تو ایک سمجھوتہ ہی ہے اور اچھا خاصا کامیاب سمجھوتہ ہے۔

ہاں تو مدعائے کلام یہ ہے کہ نظام تعلیم میں اسلامی اصول و مقاصد کے مطابق تبدیلی لانے کے لئے ضروری ہے کہ آپ صاف طور پر کہیں اور اسی طرز پر سوچیں کہ ہمیں یہاں اسلام کو عملاً کارفرما کرنا ہے۔ اسلام کی بات کیجئے اور واشگاف دعوے سے کیجئے۔

پیوند کاری کافی نہیں

اوپر کی گزارش کی روشنی میں یہ نکتہ از خود واضح ہو جاتا ہے کہ نظام تعلیم میں ٹھوس اور موثر اساسی تبدیلی جو نئے دماغ اور نئے کردار پیدا کر سکے' محض جزوی تغیرات اور پیوند کاری[1] کے عمل سے واقع نہیں ہو سکتی۔ ہمیں ایک مضحکہ انگیز گدڑی نہیں چاہئے' ردائے آبرو چاہئے۔

اسلامی تعلیم کے نام پر آج تک جو کچھ ہوا ہے' اسی پیوند کاری کے سہل اور بے ضرر

---

[1] ماضی میں کچھ مسلمان دانش وروں نے اسلامی نظام تعلیم کی اصلاح کی یہ صورت نکالی کہ اس کے نصاب میں اجنبی افکار سے مستعار لی ہوئی چیزوں کی پیوند کاری کر دی جائے۔ سرسید احمد خان اور محمد عبدہ اسی طرز فکر کی حامل شخصیتیں ہیں۔ اسی انداز فکر پر عمل کرتے ہوئے جمال عبدالناصر نے مضبوط اسلامی قلعہ (جامعۃ الازہر) کو ۱۹۶۱ء میں ایک جدید یونیورسٹی میں تبدیل کر دیا۔ اس تجدیدی فکر کی پوری عمارت اس مفروضہ پر قائم کی گئی تھی کہ نام نہاد "جدید علوم" بے ضرر ہیں اور امت مسلمہ کی تقویت کا باعث۔ اس نقطہ پر کم ہی توجہ دی گئی کہ اجنبی ادبیات' معاشرتی علوم اور سائنسی علوم وغیرہ زندگی' کائنات اور تاریخ کے ایک منضبط نظریہ کے مختلف پہلو ہیں جو اسلام کے لئے قطعاً بیگانہ ہے۔ یہ لوگ اس لطیف مگر لازمی تعلق کو شاید ہی سمجھ سکے ہوں جو ان علوم کے طریقہ ہائے تنظیم اور نظریہ ہائے صداقت اور علم کو اجنبی دنیا کے نظام اقدار کے ساتھ مربوط کرتا ہے۔ اسی سبب سے ان کے اصلاحی کارنامے کچھ مثبت نتائج پیدا نہ کر سکے۔

"علم کی اسلامی تشکیل" از اسماعیل الراجی الفاروقی شہید [ترجمان القرآن مارچ ۱۹۸۹ء]

طریقہ سے ہوا۔ دینیات کی ایک کتاب لگا دی گئی' اسلامیات کے لئے ایک استاد رکھ دیا گیا۔ خدا کا نام کتابوں کے صفحات میں کہیں کہیں درج ہونے لگا' قرآن کی چند آیات' حضور ﷺ کے چند ارشادات اور سیرت و تاریخ کے چند واقعات بھی طالب علم کے دماغ کے ایک چھوٹے سے خانے میں داخل کئے جانے لگے۔

حالانکہ اصل مسئلہ اس پورے مزاج کا ہے جس پر موجودہ نظام تعلیم مبنی ہے۔ اس نظام تعلیم کی اساس و روح مادہ پرستی ہے۔ اس کے ہر مضمون کی تشکیل لادینی اور انکار آخرت کے عکاس نظریوں پر رکھی گئی ہے۔ اس کے ایک ایک رگ و ریشے میں مغربی تہذیب کے رجحانات حل کئے ہوئے ہیں۔ اس کے پیچھے وہ نظریہ علم کام کر رہا ہے جو سرے سے وحی والہام کو ذریعہ ہدایت شمار ہی نہیں کرتا۔ اس کے علوم انسانیت اور ادبیات میں ''افادی اخلاق کا تصور'' بلکہ اب تو ''لا اخلاقی اخلاقیات'' کا ایک نیا فلسفہ جذب ہے۔ انگریزی ادب' اور انگریزی ادب کے مزاج پر تیار شدہ اردو ادب میں بھی جنسی بے راہ روی کے داعی موجود ہیں۔ اس کے سیاسی و عمرانی علوم میں دنیا کے سارے مذاہب کے ساتھ اسلام کو بھی ایک مذہب کے طور پر رکھ کر پورے سلسلۂ مذاہب کو انسانوں کے من گھڑت رواجوں پر مشتمل قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علمِ معیشت میں سود اور آبادی اور قدر زائد اور تقسیم دولت کے مخصوص نظریات حل کئے ہوئے ہیں۔ اس کے اندر وہ فنون لطیفہ شامل ہیں جن کی روح لذتیت اور جن کا مزاج بدن پرستی اور جن کا رنگ خاص جنس زدگی ہے۔ اس کے سائنسی علوم کی اساس نظریہ ارتقاء پر ہے اس سارے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر آپ چند اسلامی باتوں کے گملے اگر رکھ دیں تو اس سے کتنا بڑا فرق واقع ہو سکے گا۔

پس اولین اہم کاموں میں سے ایک یہ ہے کہ نصابی مواد میں پیوند کاری کے تصور کو ترک کر دیا جائے اور ہر مضمون کے علمی ڈھانچے اور نصابی کتب کو بالکل نئے نقشے پر نئی روح اور نئے مزاج کے ساتھ مرتب کیا جائے۔ میرا منشا یہ واضح کر دینا ہے کہ نظام تعلیم کے مجموعی ڈھانچے کو برقرار رکھتے ہوئے جو انتظامی' نصابی یا دوسری قسم کی تبدیلیاں ہمیشہ کی جاتی رہتی ہیں' ان سے پورے تعلیمی ڈھانچے اور اس کی روح کی تبدیلی بالکل مختلف نوعیت رکھتی ہے۔ یہ کسی میٹنگ کی قراردادوں سے اور ماہرین تعلیمات کے کسی بورڈ کی اکیڈیمک بحثوں سے تشکیل نہیں پا سکتی۔

مردانِ کار کی قومی تعلیمی کونسل

جو لوگ نئی نسلوں کو اسلام سکھانے کا —— بلکہ میرے مزاج کی صحیح اصطلاح کے مطابق اسلام کی انقلابی تحریک کا سپاہی بنانے کا پروگرام لے کر چلیں وہ پہلے اپنی جگہ اپنے دل کی خلوت میں بیٹھ کر یہ طے کرلیں کہ انہیں واقعی اسلام چاہئے؟ سچ مچ کا اسلام چاہئے؟ اور ویسا اسلام چاہئے جیسا خدا کے آخری نبیؐ نے پہلے اپنی ذات میں اور پھر ایک منظم معاشرے کی شکل میں پیش فرمایا ہے۔

اگر اس کا جواب خدانخواستہ نفی میں ہو تو یہ امر محل نظر ہے کہ اسلام سے آزاد رہنے یا بھاگنے کی خواہاں نسل، جس کی عادات بری طرح بگڑ چکی ہیں اور جس کے مشاغل اسفل کنکھجوروں کی طرح اس کے دل و دماغ کو چمٹے ہوئے ہیں اور جو' پنے آپ کو محسوس حد تک بدلنے پر قادر نہیں ہے۔ کیا نوخیز نسل کو سچ مچ کا اسلام ودیعت کر بھی سکے گی؟ میں کسی پر کوئی بات چسپاں کیے بغیر کہوں گا کہ جس عمل و اقدام پر بے یقینی کی پرچھائیں پڑ رہی ہو وہ مشکل ہی سے نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔

تقاضا یہ نہیں کہ موجودہ نسل کا کارفرما عنصر سارے کا سارا آناً فاناً بدل جائے، بلکہ مدعا یہ ہے کہ تعلیمی انقلاب کا کام ایسے اشخاص کے ذریعے آغاز کیا جائے جن کے اندر برسوں کی سوچی سمجھی رائے پر مبنی ایمان محکم اور کردار پائدار موجود ہو۔

کوئی ہرج نہ ہوگا اگر موجودہ متند قسم کے تعلیمی ماہرین اور سرکاری افسران پر سارا انحصار کرنے کے بجائے باہر سے ایسے مفکرین کو میدان میں لایا جائے جن میں صحیح رخ پر سوچنے کی اور موثر تدابیر اختیار کرنے اور ان میں عمل کا رنگ بھرنے کے لئے تجاویز فراہم کرنے کی صلاحیتیں موجود ہوں۔ اور ایسے لوگ اس معاشرے میں اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ اس قسم کے ۵، ۷ یا ۱۵ اصحاب پر مشتمل ایک قومی تعلیمی کونسل قائم کر دینی چاہئے اور ان خادمانِ ملت کی تنظیم کو تین سال (یا زیادہ) کے لئے خصوصی اختیارات تفویض کر دینے چاہئیں۔ ہمیں کام کا آغاز کرنے سے پہلے یہ بات طے کرلینی چاہئے کہ ہمیں اپنے لئے ایک خداپرستانہ تہذیب کا درس دینے والا نظامِ تعلیم درکار ہے جو ایسے افراد تیار کرے۔

- جو دنیا بھر کے سامنے راستی، عدل، احسان، جمہوریت، حیا، امن اور انسانی فلاح کے نقیب بن کر کھڑے ہوں۔

- جو الحاد اور مادہ پرستی منافقت اور خیانت نیز ظلم اور جبریت کے خلاف علمی اور اخلاقی اسلحہ سے معرکہ آرا ہو سکیں۔
- جو ایمانی و شعوری لحاظ سے اسلام کو دین برحق اور اپنے لئے اور انسانیت کے لئے بہترین نظام تہذیب تسلیم کرتے ہوں۔
- جو خدا کو اپنے لئے حاکم و فرماں روا، ہدایت کی روشنی بہم پہنچانے والا اور زندگی کی فلاح کے قوانین مقرر کرنے کا واحد مستحق یقین کریں۔
- جو حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا نمائندہ مجاز، انسانیت کا بہترین نمونہ و معیار، زندگی کے تہذیبی سفر کا قائد اعلیٰ اور تمام علوم اور سرگرمیوں میں رہنمائی کا سرچشمہ تسلیم کریں۔
- جو قرآن پاک کو (اس تشریح اور عملی نمونہ تعمیل کے ساتھ جسے قرآن کے متعین کندہ پیغمبر نے پیش کیا) زندگی بھر کے لئے گائیڈ بک یا کتاب رہنما کی حیثیت سے پیش نظر رکھیں۔
- جن کے قول و فعل اور ان کے تیار کردہ علوم اور ان کی اجتماعی ادارات میں کوئی تضاد نہ ہو۔
- جو علوم و فنون کی وادیوں میں پیش قدمی کو اپنا فریضہ سمجھیں اور پوری تندہی سے کوشش کریں کہ وہ جلد از جلد اپنی قوم کو اقوام عالم میں علمی برتری کے مقام پر لے آئیں گے۔
- جو سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے خدا کے طبعی قوانین کا فہم و شعور حاصل کر کے، خدا کی کائنات کی اشیاء اور قوتوں سے کام لیں اور اس طرح کے حاصل شدہ مادی وسائل کو خدا کی امانت سمجھ کر خدا ہی کے اخلاقی قوانین کے تحت اسلامی تہذیب کے عروج اور انسانیت کی بھلائی کے لئے استعمال کریں۔
- جو خدمت انسانیت کو اصول بنا کر زندگی بسر کریں، اور ایک طرف دوسرے افراد کی مدد بھلائی اور ترقی میں رضا کارانہ حصہ لیں، اور دوسری طرف اپنی ساری قوتیں اسلامی ریاست اور معاشرے کی قوت بڑھانے اور اس کے ماحول کو سنوارنے میں صرف کر دیں۔

آہستہ آہستہ ایک ایسی قوم تیار ہو جائے جو دنیا کی تمام اقوام سے اتنی مختلف ہو کہ اسے دیکھتے ہی ہر کوئی یہ محسوس کر لے کہ یہ جداگانہ قسم کے لوگ ہیں اور ان کے افکار و کردار کے

روشن اور پاکیزہ راستے بقیہ لوگوں سے جدا ہیں۔

دوسرے لفظوں میں ہمارے نئے نظام تعلیم کو دراصل پوری اسلامی تہذیب کو جلوہ گر کرنے کا ذریعہ ہونا چاہئے نہ کہ اس کے محض انفرادی مذہب و اخلاق کے محدود تصورات کی ایک ندی کو مخالف اسلام تہذیب کے فاسد علوم کے بہتے ہوئے طوفانی دریا میں شامل کر کے مطمئن ہو جانا چاہئے کہ اسلام کا کام بھی ہو گیا۔

نصابات میں اسلام کو سمونے کا عمل

انتہائی پیچیدہ مسئلہ نئے تعلیمی نظام کے نصاب میں اسلامی فکر و حکمت کی تنفیذ و تحلیل کرنے اور ترکیب دینے کا ہے۔

عام طور پر سوچنے والے اس سے زیادہ کچھ نہیں سوچ سکتے کہ کورسوں میں خدا اور رسولؐ کا نام آئے' اسلام کا ذکر ہوتا رہے' کچھ آیات اور احکام بیان ہو جائیں مگر کسی تہذیبی فکر اور شعور زندگی کو نظام تعلیم کی روح بنانا بہت مشکل ہے جس کا ایک چھوٹا جزو وہ چیزیں بھی ہیں جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے۔

مثلاً مادہ پرستانہ علم میں ـــــ سوائے سطحی نگارشات کے ـــــ آپ سے یوں کبھی نہیں کہا جائے گا کہ خدا کو نہ مانو اور مذہب کو ترک کر دو۔ بلکہ کائنات یا زندگی یا تاریخ یا سماجیات کو پیش اس طرح کیا جائے گا کہ پر زور طرز استدلال و فکر کا ایک مخصوص نہج آپ کو غیر شعوری طور پر مرتبین علوم کے نتیجے تک پہنچا دے گا۔

جنسی آزادی' تعداد ازدواج' خاندانی منصوبہ بندی' سیکولر سیاست' افادی اخلاق' انسان کے حیوانی تصور کے تحت خواہشات کی بڑھتی ہوئی اہمیت' ترقی نسواں کے عنوان سے مخلوط و بے پردہ (اور بے عصمت و حیا) معاشرت' فنون لطیفہ اور ثقافتی ترقی کے خوبصورت نام سے بیہودگیوں کے جواز' رواداری اور وسیع المشربی کی اپیل پر ترک اصول و اقدار' کبھی وطنیت اور کبھی قومیت کے حوالے سے اور کبھی بین الاقوامی تعاون کے واسطے سے اپنے فکری امتیازات اور تہذیبی تخصیصات سے انقطاع کے اتنے گوناگوں عوامل جدید علوم' نصابات' رسائل اور پراپیگنڈے کے دائروں میں پھیلے ہوئے ہیں کہ جن کی دماغی خوراکیں متواتر لیتے لیتے آدمی

کی کایا کلپ ہو جاتی ہے۔[1]

اب اگر ہمیں اس مؤثر نہج پر کام کرنا ہو تو مروجہ علوم اور نصابات کے مہیا کردہ تجربات سے استفادہ کرنا ہوگا۔ نصابات میں مخالف اسلام نوعیت کے ترکیب یافتہ مواد کی نشاندہی کرنی ہوگی اور پھر علوم کو از سرنو مرتب کرتے ہوئے انہیں اسی طرز پر اپنی فکر اور اپنی تہذیبی قدروں سے ترکیب یافتہ کرنا ہوگا۔

ایک مسئلہ اصطلاحات کا ہے۔ ہر تہذیب کے علوم کی چند خاص ترجمان و نمائندہ اصطلاحات ہوتی ہیں جن کے ساتھ بے شمار تصورات مل جل کر ایک سرطانی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور پھر ایسی کئی اصطلاحات کے ریشے دور تک پھیل کر ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ہیں۔ ان کو آپس میں کاٹ کر ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

ایسی نمائندہ اصطلاحات کو پہچان کر نصابات سے باہر پھینک دینا چاہیے اور اپنی ضرورت کی ایسی اصطلاحات وضع کرنی چاہئیں جو ہمارے تہذیبی تقاضوں کی نمائندگی کر سکیں۔

ہمارے سامنے یہ بحثیں لائی جاتی رہی ہیں کہ سائنس میں، ریاضی میں اور ٹیکنیکل علوم میں ہم آخر کیسے اسلامی رنگ پیدا کر سکتے ہیں۔ افسوس ہے کہ میں یہاں اس بسیط موضوع پر سوائے اس کے کچھ عرض نہیں کروں گا کہ اسلامی فکر و حکمت میں اگر ہمہ گیری اور جامعیت ہے (اور یقیناً ہے) تو وہ ہر میدان میں اپنی جگہ بنا سکتی ہے۔ مسئلہ فقط اتنا ہے کہ ایک مسلم قوم اگر اپنے اقتصادی وجود کا اظہار کرنے کا فیصلہ کر لے تو وہ ہر مقام پر اس طرح نمایاں ہوگی کہ ساری دنیا میں اسے پہچانا جائے کہ یہ ایک مسلم قوم جلوہ گر ہوئی ہے۔

مجبوری ہے کہ میں اس مسئلے کو تشنہ چھوڑ رہا ہوں۔[2]

---

[1] یہاں میں ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں ایک فلم ہے جس کا نام ہے "دھرتی میری ماں" اس نام میں پوری نظریاتی تبلیغ چھپی ہوئی ہے اور خدا پرستانہ تصور حیات اور اسلامی نظریہ قومیت و وطن کو یہ الفاظ بھرپور ضرب لگاتے ہیں۔ پوری فلم نہ جانے کیا کیا ستم ڈھائے گی لیکن یہ محض ایک فلم کا نام ہے کسی لکچر کا عنوان نہیں اور کسی وعظ کا موضوع نہیں ...... اس مثال سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نظریاتی نظام تعلیم یا ایک خاص تہذیب کے آئینہ دار علوم کس طرح کام کرتے ہیں۔

[2] سائنس اور اس سے متعلقہ علوم کے متعلق صرف ایک اصولی بات کو میں یہاں پر زور طریق سے کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ باقی ساری باتیں سائنس کی تعریف کو بدل کر سوچی جائیں۔ سائنس نام ہے ان علوم کا جو مشاہداتی اور تجرباتی بنیادوں پر تفکر کی راہیں کھول کر خدا کی پیدا کردہ مادی کائنات کی قوتوں ←

معیاری مرکزی نصاب

کرنے کا بہت ضروری کام یہ ہے کہ ہمارے ہاں ایک مستقل مرکزی مضمون ''ہمارا نظام تہذیب'' یا ''ملت اسلام کی اساسی حکمت حیات'' (مختصر کرنے کے لئے ''نصاب ملت اسلامیہ'' یا ''علم تحریک اسلامی'' یا ''مطالعہ نظام اسلامی'' یا ''بنیادی حکمت حیات'' کہہ لیجئے) تیار کیا جائے۔ جو نرسری کے درجے سے لے کر پی ایچ ڈی تک' بلکہ مختلف قسم کے ٹیکنیکل علوم خواہ وہ ڈاکٹری' انجینئرنگ اور ہوا بازی ہوں' خواہ نرسنگ' ڈرائیونگ اور بزنس' ٹیکسٹائل اور مینجمنٹ ہوں' خواہ وہ فوج' پولیس یا ریلوے یا پوسٹ آفس کی تربیت گاہیں ہوں —— کے ساتھ بھی اسے اول درجے کا لازمی مضمون قرار دے کر شامل نصاب کیا جائے۔

بنیادی نصاب ایسا ہونا چاہیئے جو طالب علم میں یہ احساس پیدا کر دے کہ وہ ایک عظیم ترین تحریک فلاح انسانیت کی علمبردار قوت کا جانشین ہے' وہ ایک ذی مرتبہ قوم کی تہذیبی وراثت کا امانت دار ہے' وہ دنیا کو امن و انصاف کا درس دینے کے لئے تیاری کر رہا ہے۔ اسے بدی اور ظلم کی قوتوں کے خلاف جہاد آرا ہونا ہے۔ وہ جہالت کے مقابلے میں علم اور بے یقینی کے مقابلے میں ایمان کا پیغام دینے والا ہے۔ اسے اور اس کے پیشروؤں کو مختلف تاریخی ادوار کے حوادث سے پیدا شدہ نتائج نے بری طرح پیس ڈالا ہے' مگر وہ ایک مقدس تہذیب کے ایسے بیج لے کر نکلا ہے جنہیں مشکلات سے لڑ کر وہ کاشت کرے گا' اور مشکلات سے لڑ کر ان کی پرورش کرے گا۔ وہ ایسی مادہ پرست سامراجی عالمی قوتوں کے درمیان گھرا ہوا ہے جو اسلام سے متعصبانہ عناد رکھنے کی وجہ سے اس بات کی مخالف ہیں کہ دنیا میں کہیں بھی مسلمان سچے مسلمان بن کر اٹھیں' اور کوئی بھی قوم اسلامی نظام حیات کو عملاً قائم کرنے کی جرات کرے۔ وہ ان مشکلات سے آگاہ ہے اور یہ مجنونانہ حوصلہ رکھتا ہے کہ وہ مخالفتوں کے پہاڑ کاٹ کر راستہ نکالے گا۔

← اور اشیاء کو کام میں لانے کے لئے ان نوامیس الٰہی اور قوانین قدرت کی دریافت کی مساعی کا ایک لمبا سلسلہ ہیں جن کا شعور ہی ہمیں مادی اشیاء اور قوتوں سے استفادہ کرنے کے قابل بناتا ہے۔ اور سائنسی دریافتوں کی پیش قدمی کرتے ہوئے خدا کی وہ ''آیات'' اس کی ''سنت'' اور ''امر'' تک پہنچنے میں مدد دیتی ہیں جو انفس و آفاق میں پھیلی ہوئی ہیں۔ سائنس کی یہ تعریف اگر نصابات کو مرتب کرتے ہوئے معلوماتی مواد میں جذب کر دی جائے تو سائنسی علوم مسلم روح سے آراستہ ہو سکتے ہیں۔

بنیادی نصاب کا مطالعہ اس پر واضح کر دے کہ خود اس کے معاشرے میں منافقین' مفاد پرستوں اور تضاد پسندوں کی بہت سی مضبوط قوتیں اسلام کے خلاف کام کر رہی ہیں اور ان کی پشت پناہی سے اسلام کو نقصان پہنچانے اور ماحول کو بگاڑنے والے طرح طرح کے فتنے —— سیاسی' مذہبی' اقتصادی' ثقافتی اور تفریحی —— برپا ہوتے رہتے ہیں۔

بنیادی نصاب اس میں یہ یقین پیدا کرے کہ اسے دوسروں کی علمی اور مادی ترقیوں سے مرعوب ہوئے بغیر' دوسروں کا بھکاری بنے بغیر اور دوسروں کا آسرا لئے بغیر اپنے ہاں علمی پس منظر کے ساتھ ایمانی و اخلاقی اور مادی و معاشی ترقی کی مہم خود سر کرنی ہے۔ بنیادی نصاب ایسا ہونا چاہئے جو طلبہ میں یہ اسپرٹ پیدا کرے کہ وہ ساری دنیا کی خدمت و فلاح کے لئے خدا کی طرف سے "آن ڈیوٹی" ہیں۔ ان کا نظام حیات سب سے زیادہ پاکیزہ و عادلانہ ہے اور اس کی سربلندی ان کی پوری زندگی کا عظیم ترین نصب العین ہے' جس کے لئے وہ ساری صلاحیتیں استعمال کریں گے اور ہر طرح کی قربانیاں دیں گے۔

بات تفصیل طلب ہے۔ اجمالاً میں یہ کہوں گا کہ اس بنیادی ملی نصاب میں مختلف تعلیمی مدارج کا لحاظ رکھتے ہوئے ہمیں عقائد' اخلاقیات' عبادات' قرآنی قوانین' سنت کے احکام بھی لانے ہیں' اور اپنا مخصوص فلسفہ حیات' نظریہ توحید' نظریہ کائنات' نظریہ انسان' نظریہ اخلاق' نظریہ تاریخ اور دوسرے مختلف نظریات بھی پیش کرنے ہیں۔ ہمیں تاریخ میں کشمکش خیر و شر کی داستان کے ایک حصے میں آدمؑ سے آنحضور ﷺ تک اور دوسرے حصے میں آنحضور ﷺ کے بعد تحریک اسلامی کے مدوجزر کی روئداد کے اہم ابواب کو طالب علم تک پہنچانا ہے۔ پھر اس سلسلے میں ہمیں اس کے سامنے اپنی تاریخی روایات اور اخلاقی اقدار کے ساتھ ساتھ مثالی شخصیتوں کے جذبہ انگیز علمی' سیاسی اور مجاہدانہ کارنامے بھی رکھنے ہیں۔ عالم اسلام کے احوال و مسائل اور اسلامی ملکوں کی احیائی تحریکوں میں اور اتحاد کی مساعی کے متعلق بھی پورا مواد پیش کرنا ہوگا۔

مجھے ایک ضروری اشارہ یہاں بیان کر دینا چاہئے۔ وہ یہ کہ چونکہ ہمارے طلبہ کی ایک بڑی تعداد پرائمری سے آگے نہیں جاتی اور ایک بڑی تعداد مڈل اور میٹرک کے مرحلوں میں تعلیمی میدان چھوڑ دیتی ہے اس لئے بنیادی نصاب اس طور پر مرتب کیا جائے کہ پرائمری تک کی تعلیم پانے والا بچہ بھی مطلوبہ خیالات' جذبات' معلومات اور اخلاق کا وہ کم سے کم ضروری

حصہ لے کر مکتب سے نکلے جو اسے آگے چل کر ایک ''مسلم'' کی زندگی بسر کرنے کے لئے روشنی دیتا رہے۔ پھر آگے مڈل اور میٹرک تک کے مدارج میں ہم طلبہ کے دل و دماغ کو بنیادی نصاب کا اتنا سرمایہ دے دیں کہ وہ اس کو اسلامی تہذیب کا نقیب بن کر زندگی گزارنے میں مدد دے' جو اس میں اپنے دین و تہذیب کا مزید علم حاصل کرنے کا شوق ابھار دے۔

میرے نزدیک مجوزہ تعلیمی تبدیلی کا نصابی دائرے میں سب سے اہم قدم یہی ہے اور اس بنیادی نصاب کی تیاری کے لئے بہت ہی خاص قسم کے جذبہ دار اور ذی شعور اصحاب کی خدمات کی ضرورت ہے۔

تعلیمی مسئلے پر سرکاری اور غیر سرکاری دائروں میں سوچنے والوں کو زیادہ سے زیادہ کاوش اس بنیادی نصاب کے موضوع پر کرنی چاہئے۔ یہ کام اگر ٹھیک سے ہو جائے تو پھر بقیہ اقدامات سہل ہو جائیں گے۔

یہی بنیادی نصاب ایسا معیار ہو گا جسے سامنے رکھ کر اندازہ کیا جا سکے گا کہ ہمارے بقیہ سلسلہ ہائے نصاب کے کیا اجزا درست ہیں اور کیا غلط۔ کن چیزوں کو ترک کر دینا چاہئے اور کن کو باقی رکھنا چاہئے اور کن کو از سر نو تیار کرنا چاہئے۔

عبوری مرحلے کی نصابات

کسی خاص تہذیب کی نشوونما کے لئے جب نظام تعلیم کو تیار کیا جاتا ہے تو پھر نصاب میں قطع و برید کے بجائے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ پورا نصاب از سر نو مرتب کیا جائے۔ یہ کام ہمیں کرنا ہو گا اور اس کا آغاز ابھی سے کر دینا چاہئے۔

لیکن ایک مسئلہ عبوری مرحلے کا ہے جب کہ ابتدائے کار تو نئے خطوط پر کریں' مگر ہمارے پاس جملہ نصابی کتب تیار نہ ہوں۔ ان کے لئے وقت چاہئے۔ اور ہمیں موجودہ سرمایہ کتب سے کام لینا پڑے گا۔

عبوری مرحلے کے لئے حسب ذیل کام کئے جائیں۔

❶ نچلے مدارج کا معاملہ درکنار رکھتے ہوئے' بالائی مدارج پر یہ اہتمام کیا جائے کہ ہر مضمون کے متعلق اردو میں (عربی' فارسی سے ترجمہ بھی کرایا جا سکتا ہے) جو معیاری کتابیں اور مقالات نصابی ضروریات کے مطابق دستیاب ہوں ان کو نصاب کا جزو بنا

دیا جائے۔

- متداول علوم کی مروجہ نصابی کتب (جن کو فوری طور پر بدلا نہ جا سکے) کے ساتھ ایک تنقیدی حصہ شامل کیا جائے۔ جو کتابیں یہیں شائع ہوتی ہیں ان کے تمام اسباق کے ساتھ تنقیدی حصہ شامل کیا جا سکتا ہے۔ بیرونی کتب کے لئے تنقیدی حصہ الگ مرتب کیا جا سکتا ہے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اسباق کے آخر میں دیئے جانے والے سوالات میں مختلف واقعات اور شخصیتوں اور اقوال اور ادبی نگارشات پر بھی اپنے تہذیبی نقطۂ نظر سے طلبہ کو تنقید کرنا سکھایا جائے اور ان میں یہ ملکہ ہو کہ وہ کسی امر میں یہ نشاندہی کر سکیں کہ اچھائیوں کے ساتھ کیا خرابی کہاں پائی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں بھی اب تک کے فراہم شدہ مسودہ سے ضروری فائدہ اٹھایا جائے۔ لازم آتا ہے کہ امتحانی پرچوں کے سوالات کا ایک حصہ بھی تنقیدی نصاب پر مبنی ہونا چاہئے۔

اس طریقے سے طالب علم کے ذہن سے مغربی علوم کی مرعوبیت ختم ہو گی۔ اس کے اندر بیرونی نظریات کے لئے مزاحمت پیدا ہو گی۔ اس میں تنقید اور جانچ پرکھ کی صلاحیت ابھرے گی اور اس کے دل میں اپنے دین و تہذیب کے اصول و عقائد اور علوم وفنون کے لئے ایک طرح کا اعتماد پیدا ہو گا۔

- ہر علم کے دائرے میں ماضی میں مسلمانوں نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں ان پر مشتمل ایک جامع مضمون نصابی کتب کے آغاز میں شامل کیا جائے اور اس کے مندرجات پر بھی امتحانی سوالات دیئے جائیں۔

- کسی علم کے متعلق قرآن و حدیث میں جو رہنمائی موجود ہو وہ متعلقہ مضامین و مباحث میں لازماً شامل کی جائے۔ خلفائے راشدین اور ائمہ فقہا اور علمائے سلف کے اقوال بھی سامنے لائے جائیں۔ یہ کام اگر انقلابی جذبے سے کیا جائے اور اس کے لئے موزوں ترین افراد کی صلاحیتیں حاصل کر لی جائیں تو میں سمجھتا ہوں کہ اسے ایک سال کے اندر اندر ہو جانا چاہئے۔

اس کے بعد بڑا کام وہ ہے کہ پورے نصابات اپنے مدون کردہ ہوں اور اپنے اصول و مقاصد پر مبنی ہوں۔ اگر التوا کی دیرینہ پالیسی نہ کام کرنے لگے تو لگن رکھنے والی ایک ٹیم اس مرحلے کو تین سال میں پورا کر سکتی ہے۔

- ۵ صبح کی اسمبلی (اجتماع) کو اسلامی ذہن و سیرت کی تعمیر کے لئے خاص طور پر استعمال کیا جائے اور نماز کا جو وقت اوقات تعلیم میں آتا ہو اس میں تمام اساتذہ و طلبہ کی حاضری لازم ہو (یہ ضرورت صرف عبوری دور ہی تک محدود نہیں)۔
- ۶ وقتاً فوقتاً مفکرین علوم اسلامی، فضلائے تاریخ و مدنیات اسلام کو مدعو کر کے خصوصی لکچر دلوائے جائیں۔
- ۷ اسلامی موضوعات (مثلاً جہاد، سیرت النبیؐ، رمضان، حج، زکوٰۃ) پر خاص تعلیمی پروجیکٹ بنا کر ان کے لئے ایک ایک ہفتہ خاص کر دیا جائے۔

نصابی بورڈوں اور کمیٹیوں کی مشکل

اب ذرا ایک نظر بورڈوں اور کمیٹیوں کے طریق کار پر بھی!

ہمارے ہاں کا طریقہ کار جیسا کچھ کہ اس کے مطابق کام یہاں ہو رہا ہے کہ اوپر سے پہلے تو یہ عندیہ آیا کہ سالمیت پاکستان کے لئے (اخلاقی بہبود اور اخروی فلاح کا مذکور نہیں) نظام تعلیم کو اسلامی رنگ دیا جائے۔ پھر نیچے کی طرف اتھارٹیز نے غالباً کوئی سرکلر یا ہدایت نامہ جاری کر دیا ہو گا کہ آئندہ نصابات میں اسلام کا ذکر ہو۔ کچھ آیات و احادیث درج ہوں۔ کچھ اخلاقی نصائح اور تاریخی واقعات شامل ہوں۔ آخر میں معاملہ نصابی کمیٹیوں اور بورڈوں کے سامنے آتا ہے۔

اول تو یہ بورڈ اور کمیٹیاں متفرق ذہن کے اساتذہ پر مشتمل ہیں۔ ان میں بیورو کریسی کے میتھڈ پر "لیس سر" کہہ کر تعمیل ارشاد کرنے والے حضرات کی تعداد زیادہ ہو گی، جو صرف یہ چاہیں گے کہ کن طریقوں سے افسران بالا کو مطمئن کر سکتے ہیں۔ کچھ لوگ یہ چاہتے ہوں گے کہ نظام تعلیم کو اسلامی رنگ دینا چاہئے مگر خاص اس مسئلے پر نہ ان کی کوئی گہری سوچ بچار ہے نہ تفصیلی مطالعہ۔ اور پھر اسلامی رنگ کا مطلب ہر کسی کے ذہن میں مختلف ہے اور اسلامی رنگ دینے کی عملی تجویزیں جدا جدا قسم کی ہوتی ہیں جن میں سے کم پر اتفاق رائے ہو سکتا ہے۔

جہاں تک میرا اندازہ ہے ان کمیٹیوں اور بورڈوں کے شرکاء میں سے اچھے جذبات و عزائم رکھنے والے لوگ بھی ہمہ تن استفسار بنے ہوئے ہیں۔ سوچتے رہتے ہیں کہ کرنا کیا ہے اور کس طرح اور کہاں سے کام شروع کیا جائے۔ سب لوگ ایک دھندلی فضا میں ہیں اور دھندلی فضا میں

سوچنے والے لوگ کوئی بڑا ٹھوس کام انجام دے کر موثر نتائج پیدا نہیں کر سکتے۔

چاہئے یہ تھا کہ پہلے ایک قومی تعلیمی کونسل تشکیل پاتی۔ وہ ایک ایسی کتاب رہنمائی یا ایک ایسی مفصل رپورٹ تیار کر دیتی جس کو سامنے رکھ کر تعلیمی نصابی بورڈ اور کمیٹیاں کام کرتیں۔

پھر ستم یہ ہے کہ نصابی کتب کے لکھنے کا پروگرام کچھ اس طرح ہے کہ ایک ہی کتاب کے مختلف نوٹ لکھنے کی ذمہ داری مختلف اساتذہ پر تقسیم کر دی گئی ہے۔ ان میں کوئی ایک کسی طرح سوچتا ہے' دوسرا کسی اور طرح سوچتا ہے۔ ایک کے نزدیک ایک خاص چیز اہم ہے' دوسرے کے نزدیک وہ لایعنی ہے اور کوئی دوسری اہم ہے۔

میرے خیال میں جامع تعلیمی انقلاب کے لئے کام کرنے کا یہ سلیقہ کسی طرح قابل تائید نہیں۔

اسلامی نظام تعلیم کے لئے استاد کی اہمیت

نظام تعلیم نصابات ہی کا نام نہیں اس کا دوسرا اہم بلکہ زیادہ اہم ستون استاد ہے۔ استاد اگر تعلیم کو نئے خطوط پر لے چلنے کے لئے خود ایک گہری اسپرٹ اور ایک آتش پنہاں اپنے سینے میں نہیں رکھتا' اگر وہ نصاب کے اجمال کی تفصیل طلبہ کو مہیا نہیں کر سکتا' اگر وہ مقصد کو پیش نظر رکھ کر خلا کو پر نہیں کر سکتا اور نصاب کی کوتاہیوں کی تلافی نہیں کر سکتا' اگر اس کا پورا کردار اس تہذیب کا نمائندہ ہی نہیں ہے جس کے لئے نظام تعلیم کو حرکت میں لایا جا رہا ہے تو ایسے استاد کے ذریعے تبدیلی تعلیم کا مقصد ہاتھ نہیں آ سکتا۔ بلا کسی جذبہ تنقید کے اور بلا کسی کا احترام کم کئے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے موجودہ اساتذہ کی ایک بھاری تعداد زندگی کے دوسرے میدانوں کی طرف پیش قدمی کرنے میں ناکام ہونے کے بعد بادل ناخواستہ معلمی کو اختیار کرتی ہے اور ان کی نگاہ میں معلمی ایسا ہی ایک پیشہ ہے جیسے کسی جلد ساز' کسی بنیئے' کسی کاتب' کسی ڈرائیور کا پیشہ۔

اور وہ بھی ایک بڑی تعداد ہے جس کا نہ وسیع مطالعہ ہے نہ جس کی توجہ طلبہ کی ذہنی نشوونما پر ہے۔ نہ جس کی نگاہ ان کے کردار کے بننے بگڑنے پر ہے اور نہ جسے قومی و ملی نفع و ضرر کے عظیم مسائل سے واسطہ ہے۔

رہے مسلمان قسم کے اساتذہ تو وہ زیادہ تر مخالفانہ ماحول میں دبے سکڑے ہوئے سے رہتے ہیں۔ ان کا کردار یا تو ان کی محدود مذہبیت یا تضاد آمیز شخصیت یا علمی پسماندگی کی وجہ سے کبھی موثر طاقت نہیں ہوتا۔ اس میں خاصا دخل اس حیثیت کو بھی حاصل ہے جو موجودہ نظام تعلیم مذہب اور اہل مذہب کو دیتا ہے۔

تعلیمی انقلاب کے لئے مشینوں[1] کی نہیں مشنری جذبے کی ضرورت ہے۔ تخلیقی دماغ کی ضرورت ہے۔ نت نئی سوچ بچار اور مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بہتر سے بہتر تجربوں کی ضرورت ہے۔

سوال یہ ہے کہ کون سا حکم نامہ اور سرکلر اور کمیٹیوں اور بورڈوں کا فیصلہ ہمارے معلم کو انقلابی مشن کی دولت سے مالا مال کر سکتا ہے۔

اور اگر یہ نہیں ـــــ تو پھر بابا سب کہانیاں ہیں۔

مدعائے گفتگو یہ نہیں کہ ہم مایوس ہو کر بیٹھ رہیں' بلکہ اس مقصد کے لئے تدابیر کا سوچنا ضروری ہے۔ راقم کی رائے میں موجودہ اساتذہ کے سلسلے میں ذیل کی تدابیر پر غور کیا جانا چاہئے۔

۱۔ ایک حلف نامہ یا ڈیکلریشن کے ذریعے ایسے اساتذہ کو ممیّز کر لینا چاہئے جو مجوزہ تعلیمی انقلاب کے تقاضے پورے کرنے کے لئے تیار ہوں اور اس مقصد کے لئے اپنی ذات کی تعمیر نو کرنے کی مہم شروع کر سکیں۔

۲۔ جو لوگ واضح طور پر اپنے اعتقادات ونظریات کی بنا پر اس تعلیمی انقلاب کے مخالف ہوں یا اس کا ساتھ نہ دے سکیں ان کو سیدھی طرح فارغ کر دیا جائے۔

۳۔ مختلف ڈویژنوں میں مختلف سطحوں کے اساتذہ کے ایسے ریفریشر کورسز رکھے جائیں جن میں سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں سے منتخب کردہ ممتاز شخصیتیں اس کارِ عظیم کی

---

[1] تہذیب مغرب کا سب سے بڑا عیب یہی ہے کہ وہ انسان کو انسان نہیں چھوڑتی بلکہ مشین بنا دیتی ہے۔ کچھ مشینیں عہدے اور وزارتیں چلاتی ہیں' کچھ مشینیں تعلیم وتربیت کے مناصب پر نصب ہو جاتی ہیں' کچھ مشینیں صنعت وکاروبار کی زمام سنبھالتی ہیں اور کچھ مشینیں دو وقت کی روٹی حاصل کرنے کے لئے کسی کولھو میں جت جاتی ہیں۔ جدید گھرانوں کا حال بھی یہ ہے کہ باپ مشین' ماں مشین' بیٹا مشین' بیٹی مشین' نوکر مشین...... اور انسان گم۔

انجام دہی کے لئے ان کی رہنمائی کریں۔

۴۔ ایک ٹیچرز ہینڈ بک اور ایک پروفیسرز ہینڈ بک تیار کی جائے' اور اس کے لئے قومی تعلیمی کونسل (بشرطیکہ وہ قائم ہو) کے متعین کردہ خطوط سامنے رکھے جائیں۔ دونوں کی ہینڈ بکس کے ایک حصے میں عام اصولی رہنمائی دی جائے اور پورے زور سے یہ بتایا جائے کہ خدا کے تمام انبیاء معلم بنا کر بھیجے گئے تھے۔ معلم ہی معمار قوم ہوتا ہے اور اگر معلم اپنا فریضہ صحیح طور پر ادا نہ کرے تو قوم طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ دوسرے حصے میں مختلف نصابی مضامین کے سلسلے میں نشانات راہ واضح کئے جائیں۔

۵۔ ہر سطح کے اساتذہ کے لئے ڈائری رکھنا لازمی قرار دیا جائے جس میں مختلف مضامین سے متعلق دوسرے اندراجات کے ساتھ علی الخصوص یہ نوٹ کیا جاتا رہے کہ اسلامی فکر کو واضح کرنے کے لئے کیا کام کیا گیا ہے؟ کیا مشکلات پیش آئیں؟ کیا نئے سوالات سامنے آئے؟ اور کن الجھنوں کا کیا حل نکالا گیا؟

لیکن ڈائری سسٹم جبھی سودمند ہو سکتا ہے کہ ڈائریوں کا معائنہ کرنے کا انتظام ہو۔ ہر پرنسپل اور ہر ہیڈ ماسٹر اس کے لئے موثر صورت نکالے۔

۶۔ اسٹاف میٹنگ کے دوسرے مروجہ مقاصد کے مقابلے میں اب اس مسئلے کو ترجیح دی جائے کہ بنیادی نصاب پڑھانے کے لئے اور عام نصابات کے سلسلے میں اسلامی تعلیم دینے کے لئے کیا کام کس رفتار اور کن طریقوں سے کیا گیا۔ ان امور پر باقاعدہ غور و بحث ہو اور متفقہ شورائی فیصلوں کے مطابق تجربات کئے جائیں۔

افسران معائنہ جن درسگاہوں میں جائیں وہاں ڈائریوں میں سے چند صفحات ضرور دیکھیں۔

۷۔ ہر استاد کے متعلق افسر ادارہ ایک رپورٹ تیار کرے کہ اس نے تعلیمی انقلاب کے سلسلے میں کیا پارٹ ادا کیا ہے۔

۸۔ اساتذہ کی ترقیوں کا دارو مدار ان کی ڈائریوں (نمبر ۵) اور ان کے کام کی رپورٹوں (نمبر ۷) پر ہونا چاہئے۔

۹۔ پرنسپلوں' ہیڈ ماسٹروں اور ایک ایک مضمون کے معلموں کی علاقہ وار کانفرنسیں سال

میں دو یا تین بار منعقد ہونی چاہئیں' جہاں تعلیمی انقلاب کا موضوع مرکزی حیثیت سے زیر بحث لایا جائے۔

۱۰۔ اساتذہ کے ایسے سہ ماہی اور ماہانہ رسائل کا اجراء کیا جائے جن میں اسلامی تعلیمی انقلاب کے سلسلے میں ماہرانہ مقالات کے ذریعے رہنمائی بہم پہنچائی جائے۔

۱۱۔ بنیادی نصاب اور دیگر نصابات میں اسلامی نقطۂ نظر سے معلّمی کا فریضہ بہتر طور پر انجام دینے والے اساتذہ کو انعامات' تمغے' خصوصی ترقیاں یا اعزازی سرٹیفکیٹ دیئے جانے چاہئیں۔

۱۲۔ اس کے برعکس صورت میں اگر استاد کا رویہ اسلامی خطوط پر تعلیمی انقلاب کے کام میں مضر ثابت ہو تو ترقی روکنے اور تنزلی کرنے سے لے کر برطرفی تک کی کارروائی کی جانی چاہئے' خصوصاً اگر استاد کی طرف سے مخالف اسلام نظریات کی حمایت کرنا (نہ کہ محض زیر بحث لانا) یا اسلامی تصورات و احکام کی تضحیک کرنا ثابت ہو جائے تو اسے بطور سزا ہر قسم کے مفاد سے محروم کر کے برطرف کر دینا چاہئے۔ اگر ریاست کے لئے تخریبی عمل ناقابل برداشت ہے تو نظام تعلیم بھی تخریبی عمل کا روادار نہیں ہو سکتا۔

اس قسم کی تدابیر سے ہم موجودہ اساتذہ کو مجوزہ تعلیمی انقلاب کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید بنا سکتے ہیں۔

تربیت اساتذہ کا نیا نظام

ہر نظام تعلیم کی کامیابی کے لئے بنیادی اہمیت تعلیمی تربیت کے اداروں (Training Institutions) کو حاصل ہوتی ہے' اور تعلیمی انقلاب کا جب بھی کوئی قوم پروگرام بنائے تو اسے فوری اقدامات میں تربیت اساتذہ کے نئے اداروں کے قیام کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔

اس سلسلے میں چند اشارات پیش خدمت ہیں۔

۱۔ معلّمی کے مقدس فریضہ (نہ کہ پیشہ) کی ادائیگی کے لئے افراد کے انتخاب میں صرف یہی ملحوظ نہ رکھا جائے کہ ان کے پاس تعلیمی سند کیا ہے بلکہ کسی مناسب مشینری کے ذریعے ان کے خاندانی ماحول اور تعلیمی دور میں ان کے کردار کی تفصیلی رپورٹیں حاصل کی جائیں۔ انٹرویو میں یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ ان میں دین وملت

کے لئے کام کرنے کی خصوصی لگن ہے یا نہیں اور وہ معلمانہ مشنری اسپرٹ ان کے اندر نشوونما پا سکے گی یا نہیں۔

خاص طور پر اس حقیقت کی ٹوہ لگائی جائے کہ معلمی کی لائن پر آنے والے لوگوں میں ایسے لوگ تو نہیں ہیں جو دوسرے میدانوں میں داخلے کا راستہ نہ پا کر یا کسی شعبے سے ناکام ہو کر ادھر آ رہے ہیں ایسے لوگ تعلیمی انقلاب کے کام میں موثر حصہ ادا نہیں کر سکتے۔[1]

معلمی کے امیدواروں کے دینی شعور، تہذیب اسلامی اور نظام اسلامی کے متعلق ان کی معلومات، تاریخ کے بارے میں ان کے مطالعہ اور عالم اسلام کے حالات اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کام کرنے والی تحریکات کے متعلق ان کی آگاہی کا جائزہ لینا اشد ضروری ہے۔

یہ دیکھنا بھی اہم ہوگا کہ امیدوار معلم ذہنی لحاظ سے صحت مند اور جذباتی ساخت کے لحاظ سے متوازن ہے۔

۲۔ بڑا مسئلہ تعلیمی تربیت کے لئے نصابی کتب کا ہے۔ اسلامی نظام تعلیم کے اساتذہ کو قرآن کی حکمت حیات، حدیث کے احکام، اسلامی نظام حیات کے مختلف شعبوں کے اصول و مقاصد، تاریخ ملت میں اسلام و جاہلیت کی کشمکش پر عبور ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اس تیاری کے بغیر مقصد حاصل نہ ہو سکے گا۔

تعلیم گاہوں میں جو لازمی نصاب یا مرکزی مضمون پڑھایا جانے والا ہے اس کے مواد اور اس کے طریقہ تعلیم سے ہر استاد کو لازمی طور پر واقف ہونا چاہئے۔

فن تعلیم اور فلسفہ تعلیم پر مروجہ جدید مغربی کتب میں سے منتخب چیزیں ضرور پڑھائی جائیں اور دوسری اقوام کے تعلیمی نظریات اور تجربوں سے زیر تربیت اساتذہ کا واقف ہونا ضروری ہے لیکن ان چیزوں کے ساتھ تنقیدی نصاب کا ہونا ضروری ہے۔ خاص طور پر سرمایہ دارانہ و اشتراکی تعلیمی تجربات اور جرمنی کے نازی تجربات کو خوب اچھی طرح کھنگالا جائے۔

زیادہ توجہ قرآنی حکمت علم، حضور ﷺ کے تعلیمی تجربے اور بے شمار مسلمان ائمہ و

---

[1] متذکرہ خطوط کے مطابق معلموں کے انتخاب کے لئے ایک کڑا معیار رکھتے ہوئے یہ اہتمام کرنا ضروری ہے کہ بلحاظ مالی مفاد اور بلحاظ سرکاری اور سماجی مرتبے (Status) کے استاد کو دوسرے دائروں کے لوگوں سے اگر زیادہ بلند نہیں تو برابر کا مقام حاصل ہونا چاہئے۔

مفکرین کے وسیع تصنیفی کاموں میں سے تعلیم کے متعلق ان کے مفصل تصورات چھانٹ کر مرتب کیے جائیں۔ یہ گویا تعلیمی تربیت گاہوں کا بہت اہم مضمون ہوگا۔

اسی کے ساتھ مسلمانوں کی صدیوں کی تعلیمی سرگرمیوں اور ان کے تعلیمی اداروں کے نشو و ارتقا کی روائیداد مرتب کی جائے۔ نیز بڑی بڑی معلم شخصیتوں اور ان کے کام کا تعارف کرایا جائے۔

۳۔ فکری اور نظری تعلیم کے ساتھ اساتذہ کی ایک ضرورت ان کے اندر معلمانہ کردار کو نشو و نما دینا ہے۔

یعنی جیسے نقشے پر ہم طلبہ کو اٹھانا چاہتے ہیں ویسے نقشے پر پہلے معلم ڈھل کر تیار ہو جائیں۔

نئے نظام تعلیم سے ماحول کا تضاد

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ کسی معاشرہ کو بدلنے میں سب سے موثر حصہ نظام تعلیم کا ہوتا ہے اور کام کا آغاز جب بھی کیا جائے گا تو سب سے زیادہ توجہ تعلیم پر ہی دی جائے گی۔

لیکن تعلیم کا کوئی سا بھی نقشہ تجویز کرتے ہوئے نہ بھولئے کہ فی الحقیقت پورا ماحول ایک درس گاہ ہوتا ہے اور ایک بچہ یا نوجوان کچھ سبق گھر سے سیکھتا ہے' کچھ محلے سے' کچھ بازار سے' کچھ دوستوں سے' کچھ فلموں سے' کچھ ریڈیو سے' کچھ ٹیلیویژن سے' کچھ سیاسی و معاشی سرگرمیوں سے۔ پس یہ صورت بے حد عجب ہو گی کہ درس گاہ کی چار دیواری میں تو اسے زندگی کا ایک خاص نہج سکھایا جائے لیکن جب وہ اس چار دیواری سے باہر کے وسیع مدرسے یا کالج میں قدم رکھے تو وہاں سولہ گھنٹے اسے بالکل دوسرے نہج کی تعلیم مل رہی ہو۔ اس تضاد کے زیر اثر دوغلے ذہن ہی نہیں پیدا ہوتے بلکہ عملی زندگی کے وسیع تر دائرے کی ٹھوس حقیقتیں درس گاہ کے کتابی علم اور استاد کے لیکچروں کی تنسیخ کر دیتی ہیں۔

جہاں باپ ہر طرح کی کمائی سمیٹنے کی فکر میں ہو' جہاں ماں کو بن سنور کر مخلوط تقاریب میں جلوہ گر ہونا ہو' جہاں محلے میں گندگی پھیلی ہو' جہاں بچے ہی نہیں بڑے بھی ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے ہوں' جہاں فحش گانے نشر ہو رہے ہوں' جہاں رشوت کا باقاعدہ کاروبار ہوتا ہو' جہاں فلموں میں جنس اور جرائم کا طوفان برپا ہو' جہاں فلمی اشتہاروں کے ذریعے دیواروں

اور اخباروں کے صفحات پر بے حیائی رقصاں ہو' جہاں روپے کے مقابلے میں شریف آدمی کی قیمت کم ہو' جہاں اخباروں میں قتل اور اغوا کی خبریں آ رہی ہوں' جہاں زنانہ کالجوں اور لڑکیوں کے اسکولوں کے سامنے آوارہ نوجوان منڈلاتے پھرتے ہوں' جہاں سڑکوں پر ٹرکوں کی قطاریں لوٹی جا رہی ہوں' جہاں ہسپتالوں کے دروازوں پر داخلے سے محروم مریض ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے ہوں' جہاں لیڈر لوگ اسٹیج سے تشدد کی دھمکیاں دیتے ہوں' جہاں ایک دوسرے کے جلسوں جلوسوں پر حملے ہوتے ہوں' جہاں مذہبی اکابر منبر و محراب سے شرعی جنگ کے مورچے لگائے ہوئے ہوں' جہاں نالائق لڑکے امتحان گاہوں میں نقل مار کر کے اور ممتحوں کو سفارش اور رشوت سے رام کر کے درجہ اول میں پاس ہوتے ہوں اور محنتی طلبہ اگر فیل ہونے سے بچ بھی جائیں تو تیسرے درجے میں کامیابی حاصل کریں' جہاں ملازمتوں کے انٹرویوز تک میں دخل اندازی ہوتی ہو' جہاں پٹواری اور کلرک لوگ ایک شریف شہری کو ناکوں چنے چبوا سکتے ہوں' وہاں آپ طلبہ کو سارا قرآن حفظ کرا دیجئے اور استاد کے ذریعے سعدی اور غزالی کی تعلیمات پر لکچر دلوا دیجئے' زیادہ سے زیادہ اتنا ہی حاصل ہو گا کہ محب اسلام خاندانوں کے طبعاً شرافت پسند بچے تھوڑی بہت تعداد میں کچھ اچھے خیالات اور اچھے اخلاق سے آراستہ ہو سکیں گے۔ بہ حیثیت مجموعی نتیجہ بہت زیادہ وقیع نہیں ہو گا۔

پس ماحول کی بڑی تعلیم گاہ میں بھی تبدیلیوں کا کم سے کم ایسا محسوس آغاز ہو جانا چاہئے کہ بچے یہ جان لیں کہ آئندہ اس ملک میں قدر و قیمت کس ذہن و کردار کی ہونی ہے۔

ہر شعبے میں تبدیلی کا کچھ نہ کچھ آغاز ہونا ضروری ہے۔ سب سے پہلے ملت کے کار پرداز حکام اور لیڈروں کو اپنا طرز عمل بدل کر نئی نسل کے سامنے آنا چاہئے۔ پھر ہر دائرے اور شعبے میں بڑی بڑی خرابیوں اور غیر اسلامی حرکات کے خلاف فوری اور سنگین کارروائی کا آغاز ہو جانا چاہئے۔

سیاسی فضا کو صاف ستھرا بنانے اور اقتصادی ناہمواری کو دور کرنے کے لئے واضح اقدامات ہونے چاہئیں۔

خواندگی کے لحاظ سے ناسازگار ماحول

ماحول اور نظام تعلیم کی ہم آہنگی میں ایک اور صورت حال بھی حائل ہے۔ وہ یہ کہ

ہمارے ہاں عام خواندگی کا تناسب اتنا کم ہے کہ ہم اپنی قوم کو ان پڑھ کہہ سکتے ہیں۔ گویا معاشرے کا مجموعی ماحول غیر تعلیمی ہے۔ ایسے غیر تعلیمی ماحول کے سمندر میں ایک انقلابی نظام تعلیم کا جزیرہ بنانے کی کوشش بڑا بہادرانہ اقدام تو ہے' مگر مدبرانہ نہیں۔ پس یہ ضروری ہے کہ معاشرے کے غیر تعلیمی ماحول کو تیزی سے بدل ڈالا جائے اور جہادِ خواندگی کا آغاز کیا جائے۔ اس سلسلے میں بعض تجاویز قابل غور ہیں۔ مثلاً۔

۱۔ ایک جامع منصوبہ ایسا بنایا جائے جس کے تحت پوری قوم کو پانچ سات سال کے اندر خواندگی کے معیار پر پہنچا دیا جائے۔

۲۔ طلبہ کے لئے لازم کر دیا جائے کہ وہ میٹرک اور اس سے اوپر کے مدارج کی سندات (اور ڈگریاں) حاصل کرنے کے لئے جہاد خواندگی میں ایک خاص مقررہ حصہ ادا کریں۔ یہ کام چاہے وہ دوران تعلیم میں کریں' چاہے چھٹیوں میں اور چاہیں تو امتحانات کے بعد کے فارغ وقفے میں۔

۳۔ اساتذہ اور سرکاری ملازمین سے اگر رضا کارانہ کام لیا جائے تو بہتر' ورنہ ترغیب و تحریص کے لئے اشخاص کی اس تعداد پر ایک قلیل سا اضافی معاوضہ ادا کر دیا جائے کہ جن کی خواندگی کی تکمیل کا وہ لوگ ذریعہ بنیں۔

۴۔ تمام بے روزگار تعلیم یافتہ لوگوں کو مذکورہ معاوضہ اسکیم کے تحت اس مہم میں لگا دیا جائے کہ باقاعدہ کام ملنے تک وہ دس' بیس' پچاس افراد کو ہر سہ ماہی میں خواندہ بنانے کا کام کرتے رہیں۔

۵۔ ان پڑھ چوکیداروں اور چپڑاسیوں' ہرکاروں اور کارخانوں کے مزدوروں کے متعلق یہ صورت پیدا کی جائے کہ خواندگی کا مرحلہ طے کر لینے کی صورت میں ان کی تنخواہ میں ماہانہ معقول اضافہ ہو جائے گا۔

۶۔ درآمدی برآمدی لائسنسوں کے حصول' پاسپورٹ کے حصول' ڈرائیونگ یا اسلحہ کے لائسنسوں کے حصول روٹ پرمٹ کے حصول اور اسی طرح کی بعض صورتوں میں ایک خاص مہلت کے بعد کے لئے لازم کر دیا جائے کہ ایسا کوئی بھی استحقاق صرف اس شخص کو مل سکے گا جو خواندگی کا مرحلہ طے کر چکا ہو گا۔

۷۔ چند سال کی اعلان کردہ مہلت (مثلاً ۵ سال) کے بعد فوج یا پولیس' ریلوے یا ڈاک

خانے کے محکمے میں بھی اس درجے کے ملازمین بغیر خواندگی کے نہ لئے جائیں جن کے لئے فی الوقت ان پڑھ لوگ لئے جاتے ہیں۔

۸۔ ملازمین کے لئے تمام مقابلوں اور انٹرویوز میں امیدواروں کو اس تعداد افراد کے لحاظ سے نمبر دیئے جائیں جنھیں انہوں نے خواندگی کا مرحلہ طے کرایا ہو۔

۹۔ ایسی تمام مساجد جہاں کہ ائمہ نوشت و خواند سکھانے کے قابل ہوں ان کے لئے زیر تعلیم بالغوں کے لحاظ سے ایک خاص وظیفہ مقرر کیا جائے۔ یا خواندگی کا مرحلہ پورا کرنے والوں کی تعداد کے مطابق یک مشت انعام دیا جائے۔

۱۰۔ خواندگی کا منصوبہ مختصر اور سادہ ہو اور اہم قسم کی روز مرہ ضرورتوں کو پورا کرنے کے قابل بنا دے۔ مناسب ہو گا کہ خواندگی کا نصاب اتنا ہو کہ تین ماہ تک گھنٹہ دو گھنٹہ کا وقت صرف کر کے آدمی معمولی نوشت و خواند' سرسری حساب اور ضروری دینی معلومات حاصل کر لے۔

۱۱۔ علاوہ اس کے کہ اکثر مساجد کو تعلیم بالغاں کا مرکز بنا دیا جائے۔ مزید اسکول یا ادارے بھی اس کام کے لئے کھلنے چاہئیں۔

۱۲۔ خواندگی کا مرحلہ طے کرنے والے بالغوں کو ترقی کی راہ پر چلنے کے لئے مستقل ذہنی غذا کا انتظام یوں کیا جائے:

(ا) موٹے رسم الخط اور آسان زبان میں ایک مصور و رنگین و مختصر سا ماہانہ یا ہفت روزہ اخبار حکومت یا محکمہ تعلیم کی طرف سے جاری ہو جو تمام خواندگی یافتہ افراد کو مفت بھجوایا جاتا رہے۔

(ب) چھوٹے چھوٹے پمفلٹ (جن میں خاص معلومات' تاریخی واقعات' دینی اصول' تاریخی شخصیتوں' آسان نظموں' دلچسپ کہانیوں' ملکی حالات' عالمی واقعات پر مختصر آسان مواد دیا جائے) خواندہ بالغوں کو بھجوائے جاتے رہیں۔

(ج) سرکاری موٹر گاڑیاں بالغوں کے لئے لٹریچر لے کر گشتی (Mobile) لائبریریوں کی حیثیت سے دیہاتی علاقوں میں پہنچیں۔

ایسے طریقوں سے اگر زور دار مہم چلائی جائے تو ہم ان پڑھ معاشرے کے ماحول کو بہت جلد اس سطح تک لا سکتے ہیں کہ اس میں اسلامی خطوط پر ایک انقلاب انگیز نظام تعلیم

کامیابی سے چلایا جا سکے۔

طلبہ کی تحریک خدمت ملت

طلبہ میں نیا کردار پیدا کرنے' ان میں خدمت عوام کا جذبہ بڑھانے اور ان کے دل و دماغ کو ایک انقلابی رو سے آراستہ کرنے کے لئے اسکاؤٹنگ کی طرز کی ایک تحریک کی ضرورت ہے۔

مروجہ اسکاؤٹنگ تحریک نوجوانوں کو مغرب کی فوقیت کے آگے جھکا دیتی ہے' بیرونی لیڈرشپ (اور اس کے ساتھ شخصیت پرستی) تسلط پاتی ہے۔ نیز اپنے دین سے کوئی خاص ربط پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے یہاں ایک ایسی تحریک کی ضرورت ہے جس کا نہ صرف ڈھانچہ اور نقشہ نئے طرز کا ہو بلکہ نام بھی مختلف ہو اور وہ ہماری اپنی تاریخ سے اور اپنے ہاں کی عظیم شخصیتوں سے جذبہ کار (Inspiration) حاصل کرے۔

جہاں تک نام کا تعلق ہے ''رضا کاران ملت'' (Millat Volunteers) ''جیش سبز'' (Green Guards)' مسلم سپاہ خدمت (Muslim Service soldiers)' نوجوان مسلم خدمت گاران (Young Muslim Service Workers)' خدائی رضا کاران (Volunteers of God) وغیرہ جیسی تراکیب پر غور کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام ناموں کے ساتھ تحریک (Movement) کا لفظ بھی رائج ہونا چاہئے تاکہ حرکت و عمل کا ایک جذبہ ابھارا جا سکے۔

ایسی تحریک کا خاکہ بنانے کے لئے چند اشارات عرض ہیں:

(۱) اس کے حلف وفاداری میں اولین وفاداری خدا اور رسولؐ سے وابستہ کی جانی چاہئے۔ اور رضا کار خدمت یہ اقرار کرے کہ وہ بہ حیثیت مسلم خدمت خلق اور خدمت ملت کا فریضہ ادا کرے گا۔ حلف کا دوسرا ضروری جزو یہ ہونا چاہئے کہ وہ ملت کے مفاد کو (جس کے تحت وطن کی سالمیت وغیرہ از خود شامل ہے) ہر دوسری چیز سے بالاتر رکھے گا۔ اور تیسرا جز وحکمران سے وفاداری کے بجائے یہ ہونا چاہئے کہ وہ لا اینڈ آرڈر کا پابند رہے گا اور اس کی حفاظت کرے گا۔

(۲) خدمت خلق کے جو کام تحریک کے ذریعے ہونے چاہئیں ان میں معذوروں کی مدد'

غریبوں سے تعاون‘ مسافروں کی خدمت‘ بالغوں کی تعلیم‘ حفظان صحت کے اصولوں کی تبلیغ‘ زرعی ترقی کے لئے کسانوں کی رہنمائی‘ ان پڑھ لوگوں کی دفتری کاموں میں مدد اور ان کے لئے فارم پُر کرنا یا درخواستیں لکھ کر دینا‘ ضرورت مندوں کے لئے کھانے یا مالی مدد کا انتظام کرنا‘ مریضوں کو مفت ایڈ دینا اور ہسپتالوں تک پہنچانا‘ خواتین اور چھوٹے بچوں کو خطرات میں تحفظ بہم پہنچانا اور انہی جیسی خدمات شامل ہونی چاہئیں۔ گاؤں یا محلے میں فلاح عامہ کے کاموں کے لئے اجتماعی سرگرمیوں کا سلسلہ جاری کرنا‘ سوشل خرابیوں کے خلاف مہم چلانا‘ گلیاں پختہ کرنا‘ نالیاں بنوانا‘ گندگی کے ڈھیر اٹھوانا‘ سرکاری ادارات سے عوام کو ہر ممکن مدد دلوانا وغیرہ بھی اسی طرح کے کام ہیں جو نوجوان طلبہ کی رضا کارانہ تحریک کو کرنے چاہئیں۔ گاؤں اور محلوں میں کرنے کے ان کاموں میں نہایت خصوصی اہمیت مسجدوں کو صاف ستھرا رکھنے اور ان میں جملہ ضروریات پورا کرنے کو دی جائے۔ کام کا ایک بڑا شعبہ یہ ہے کہ معاشرے میں تنظیم پیدا کرنے کے لئے رضا کار تحریک کے کارکن مدد کریں۔ وہ جہاں ہوں‘ بس سٹاپوں اور دفتروں کے سامنے قطار بندی کرنے کی تربیت دیں۔ ٹریفک کے اصولوں کی پابندی کی تلقین کریں۔ بسوں کے اڈوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر ہڑبونگ کی روک تھام کریں۔ جرائم کی روک تھام میں وہ پولیس کے معاون ہوں اور جنگی حالات میں وہ فوج کے ساتھ مل کر مورچوں پر بھی کام کریں اور شہری دفاع کے لئے سرگرم عمل ہوں۔

لاکھوں نوجوانوں کی فوج کی فوج اگر انقلابی جذبے کے ساتھ نکل کھڑی ہو تو دیکھتے دیکھتے ہماری قوم اور ہمارا ملک کہیں سے کہیں جا پہنچے۔ اس تحریک کا بہت بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ آج نوجوانوں میں بے راہ روی اور آوارگی کا طوفان اٹھ رہا ہے یہ ان کی صلاحیتوں کے تعمیری رخ پر لگ جانے کی صورت میں بالکل ختم ہو جائے گا۔

(۳) کسی بھی تحریک خدمت کا اصل الاصول تو یہ ہونا چاہئے کہ وہ محبت اور پیار سے عوام میں کام کرے اور ان کی بھلائی میں حصہ لے کر ان کے دلوں میں جگہ بنائے لیکن ایک بگڑے ہوئے معاشرے میں بسا اوقات مشکل پیش آ سکتی ہے۔ مثلاً وہ قطار بندی (Queue) کی کوشش کریں یا ٹریفک رولز کی پابندی کی تاکید کریں یا

خواتین کو چھیڑنے والے غنڈوں کو باز رکھنا چاہیں تو بعید نہیں کہ کسی ناخوشگوار صورت کا سامنا کرنا پڑے۔ یا کم سے کم ان کا مذاق اڑا کر ان کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ ایسی صورت کے لئے ایک خاص معیار تربیت سے گزرے ہوئے قابل اعتماد افراد تحریک کو یہ مقام حاصل ہونا چاہئے کہ اگر وہ کسی مزاحم اور مخالف اصلاح شہری کے خلاف اگر اپنے بااختیار مرکز یا پولیس یا کسی اور بااختیار ادارے یا افسر سے شکایت کریں تو اس شکایت کا فوری طور پر سخت نوٹس لیا جائے۔ بعض صورتوں میں (مثلاً غنڈہ عناصر کی زیادتیوں کی روک تھام کے لئے) انہیں اپنی تنظیمی طاقت کو موقع پر استعمال کرنے کا حق دیا جائے۔

(۴) مسلم تحریک رضا کاران کے لئے ایک ایسی ہینڈ بک تیار کی جائے جس میں قرآن و حدیث کے دلائل سے خدمت خلق کو عبادت کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ خدمت خلق اور فلاح معاشرہ کے لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم' خلفائے راشدین اور تاریخ اسلام کی درخشاں شخصیتوں کے کارناموں اور قربانیوں کا ریکارڈ ان کے سامنے لایا جائے۔ تربیت کے دوران میں بھی اور ان کی مختلف تقریبوں اور اجتماعات میں اس کا خیال رکھا جائے کہ ان کی تحریک کا پورا مزاج اسلامی ہو۔

طلبہ اس تحریک کے زیر اہتمام جو کام کریں ان کا ریکارڈ رکھا جائے اور یہ ان کے کردار کی تعمیر کا ایک اہم حصہ ہو اس کے لئے ان کو خصوصی سرٹیفکیٹ اور تمغے دیئے جائیں اور انہیں نمبر بھی دیئے جائیں جو ان کے تعلیمی نمبروں کے ساتھ شامل ہوں۔

مخلوط تعلیم کا انسداد

اسلامی نظام تعلیم کی طرف اقدام کرتے ہوئے مخلوط تعلیم کو قطعی اور فوری طور پر ختم کر دینا ضروری ہے مغربی پروپیگنڈے اور یہودیوں کی فکری سازش نے اسے ترقی کا عنوان دے دیا ہے اور اس کے خلاف چلنے والوں کو ذہنی دنیا کی عدالت میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔

مگر سیدھی بات یہ ہے کہ مخلوط تعلیم کا سسٹم فی نفسہ مغربی نظریہ حیات' نظریہ جنس' نظریہ ازدواج' نظریہ معاشرت اور نظریہ اخلاق کا منطقی مظہر ہے۔ محض مخلوط تعلیم کی موجودگی بے شمار

اسلامی تصورات کی جڑیں کاٹنے کے لئے کافی ہے اور اسلامی فکر و کردار کی نشوونما میں حائل۔ مخلوط تعلیم اور مخلوط سوسائٹی کے کچھ لازمی برگ و بار ہیں۔ ان کے خلاف پورا زور لگا کر بھی کچھ عرصے کے لئے ان کو کسی قدر کم کیا جاسکتا ہے، مگر نہ تو ان کو ختم کیا جاسکتا ہے اور نہ دیر تک ان کی روک تھام کا سلسلہ جاری رہ سکتا ہے۔ جو پودا آپ کاشت کرتے ہیں، اس پر فطری طور سے جیسے پھل پھول لگنے چاہئیں وہ ضرور لگیں گے۔

اصل سوال یہ ہے کہ آیا مخلوط تعلیم کو روکا جاسکتا ہے؟ کتنے دل دردمند اہل قوت میں ایسے ہیں جو اس خلاف اسلام تجربے کو دیکھ کر تڑپتے ہیں اور ان میں اتنی ہمت ہو کہ وہ اس سیلِ بلا کو روکنے کے لئے کوئی موثر جرأت مندانہ اقدام کرسکیں؟ ہمارے معاشرے میں چاروں طرف منافقین پھیلے ہوئے ہیں جو اسلام کا نام لے لے کر مغرب کی ملحدانہ تہذیب اور ہوس پرستانہ ثقافت کے لئے راستہ بنا رہے ہیں۔ تھوڑے بہت اصحاب کی احتجاجی فریادیں تو اس سیلِ بلا کو روک نہیں سکتیں۔

پھر مخلوط تعلیم بھی مجرد ایک خرابی نہیں جو معاشرے میں آ گھسی ہو بلکہ خرابیوں کا پورا ایک لشکر ہے جو نوبہ نو فتوحات کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اور ہر خرابی کا تعلق کئی دوسری خرابیوں سے ہے۔

اس لشکر کا مقابلہ کرنے کے لئے ایمان راسخ، فکر صالح اور اخلاق محکم کی ضرورت ہے۔ کیا یہ قوتیں ہمارے ہاں اس درجے اور پیمانے کی ہیں کہ وہ کچھ کر کے دکھا سکیں؟ یا کیا ہم نے ان قوتوں کو پیدا کرنے کے لئے بھرپور کام کیا ہے؟ اگر نہیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ خدا کے دین کے لئے قائم ہونے والی ریاست میں کل اور کیا کچھ ہوگا۔

اس معاملے میں بھی ہمیں اس بات سے قطع نظر کر کے کہ "دنیا کیا کہے گی" (کم بخت انسانیت کے تباہ کاروں کی "دنیا" کوئی خدا تو نہیں) سیدھی طرح یہ دوٹوک فیصلہ کرنا چاہئے کہ آیا ہمیں ہر دوسری چیز کے مقابلے میں مخلوط تعلیم زیادہ عزیز ہے اور اس کے مضمرات اور مفسدات کو پھلنے پھولنے دینا ہے۔ یہاں تک کہ بے نکاح زوجیت اور حرام اولادوں وغیرہ تک کی منازل ترقی تک ضرور پہنچنا ہے۔ یا ہمیں پاک دل و نگاہ رکھنے والے نوجوانوں اور خواتین کے ذریعے صاف ستھری اسلامی معاشرت کی تشکیل کے لئے تحفظ عصمت و حیا کی اسلامی راہ اختیار کرنی ہے۔[1]

---

[1] پردے کے اسلامی اصولوں کی بنیاد پر غیر مخلوط معاشرت اور جداگانہ تعلیمی انتظام برائے خواتین کا ←

اگر پہلی صورت ہو تو پھر اسلام کے دلکش راگ تضاد کے سازوں پر الاپنے کا مشغلہ ختم کر دینا چاہئے اور اگر دوسری صورت ہو تو پھر اسلام جس چیز کو اپنے راستے سے ہٹا دینا چاہتا ہے اسے ہٹا لیجئے۔ خواہ دنیا کی عظیم ترین قومیں کتنا ہی چیخا کریں۔ اور یونان و روما کی پروردہ فاسد تہذیب کی رندی و ہوسنا کی کتنا ہی سر پٹخے۔ کام کرنے والوں کے لئے بات اصولاً طے ہو تو پھر عملی تدابیر کا مشکل مسئلہ سامنے آتا ہے۔ مگر کوئی مشکل سد راہ نہیں ہو سکتی ہے۔ آیئے چند اہم اقدامات پر غور کریں۔

(۱) معیاری طور پر تو ضرورت اس بات کی ہوگی کہ جامعات نسواں الگ سے قائم ہوں۔ طالبات کے الگ کالج اور اسکول ہوں۔ اور ان میں ان کی ضرورت کا لحاظ رکھا جائے۔ ان جامعات (خواتین یونیورسٹیوں) میں خواتین محض نصابی معلومات ہی نہ جمع کریں بلکہ اسلامی ذہن و کردار سے آراستہ ہوں تاکہ وہ جب جامعات سے تعلیم پا کر نکلیں تو ایک طرف تو وہ گھروں میں اسلامی معاشرت کو نشو و نما دے سکیں' دوسری طرف اگر انہیں اسلامی نظام کے تحت کوئی اجتماعی خدمت انجام دینی ہو تو وہ پردے کے اہتمام کے ساتھ حسن و خوبی سے انجام دے سکیں۔

(۲) عبوری دور کے لئے فوری طور پر حسب ذیل امور پر غور و خوض ہونا چاہئے۔

(ا) کم سے کم ہر شہر میں طالبات کے لئے جداگانہ اسکول اور کالج موجود ہوں۔

(ب) بھاری عمارات کے مصارف بچانے کے لئے یہ صورت اختیار کی جائے کہ مخلوط تعلیم کے موجودہ اداروں کو دو میقاتی (ڈبل شفٹ) سسٹم پر چلایا جائے۔ یعنی صبح کا وقت طالبات کے لئے ہو اور شام کا وقت طلبہ کے لئے۔

← تخیل مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے تحریکی رفیقوں نے مسلسل پیش کیا ہے۔ ایک ہی مقصد کے لئے جہاں ایک طرف خواتین کو انفرادی طور پر قانون حجاب کی پابندی کی دعوت دی جاتی تھی وہاں دوسری طرف نگاہ اجتماعی ادارات پر بھی تھی جو قوم میں بے پردہ یا باپردہ معاشرت پھیلانے کا ذریعہ بن سکتے تھے۔ مخلوط تعلیم کا پارٹ بے پردگی کو فروغ دینے میں بہت موثر رہا ہے۔ پھر اس کے ساتھ مخلوط کلچرل شو' ان سارے عوامل نے مل جل کر ایک طوفان ہمارے معاشرے میں اٹھا دیا ہے۔ اصلاح کا عمل پورے کا پورا یکبارگی بعض دائروں میں چل جاتا ہے' مگر بعض بگاڑ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے خلاف تدریجاً ایک ایک قدم آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ اسی نقطہ نظر سے ہمارے حلقوں میں عرصہ سے ''اسلامی خواتین یونیورسٹی'' کے قیام کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔

(ج) جہاں کہیں کسی خاص مجبوری کے تحت کچھ مدت کے لئے طالبات کو طلبہ کی درسگاہوں میں جانا پڑے وہاں کمروں میں پارٹیشن یا پردے آویزاں کرنے کا انتظام ہو۔ طالبات کے لئے آمد و رفت کے دروازے الگ رکھے جائیں۔ کیفے ٹیریا اور لائبریریوں میں پوری طرح الگ پردہ دارانہ نشست کے انتظامات ہوں اور کھیل کے لئے بھی جداگانہ محفوظ میدان ہوں۔ ضمناً یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مخلوط تعلیم کا انسداد صرف اس معاشرے میں ہوسکتا ہے جہاں ''مردوں کے دوش بدوش'' والے نفس فریب فلسفے کے مخصوص کرشمے نہ پھیل رہے ہوں مثلاً

- سرکاری سطح پر کسی قسم کی کوئی تقریب مخلوطی طرز پر نہ منائی جائے۔
- کلچرل، تفریحی اور فنون لطیفہ وغیرہ کی مجالس مخلوطی نہ ہوں۔
- سرکاری افسران پرائیویٹ دائرے میں بھی مخلوط سوشل مجالس اور تقاریب منعقد کرنے کے مجاز نہ ہوں۔
- سرکاری افسروں کے لئے تو متذکرہ مجالس یا تقاریب میں صدارت وغیرہ کرنا تو کجا شرکت تک ممنوع ہونی چاہئے۔
- کوئی اسلامی معاشرہ ہرگز اس پر تیار نہیں ہوسکتا کہ وہ دفتروں میں افسروں کی تواضع کے لئے سیکرٹری لڑکیاں مہیا کرے، سفر کرنے والوں کے لئے قوم کی بچیوں کو سامان تفریح بنائے۔ ہسپتالوں میں نیم مریض لوگوں کی آنکھیں شاداب رکھنے کے لئے اس متاع عزیز کو استعمال کرائے۔ دکانوں پر جب اہل مال و منال خریدار بن کر جائیں تو نسوانی حسن ان کی تفریح طبع کے لئے موجود ہو۔ اور ہوٹلوں میں داخل ہوں تو مسکراہٹوں سے دل بہلانے سے لے کر ساقی گری کرنے تک تیار ہوں اور اگر کوئی نام نہاد اسلامی معاشرہ یہ سب کچھ کرتا ہو تو کرے۔ اسلام نسائی پیکروں کو ایسے گھٹیا استعمال کے لئے کبھی تیار نہیں کرسکتا۔
- ہماری بہنوں اور بیٹیوں کو کسی بھی موقع پر غیر ملکی مہمانوں کے استقبال کے لئے استعمال نہیں ہونا چاہئے۔[1] بلکہ خود ملکی افسروں کے اسفل جذبات کی پرورش کے لئے

---

[1] نام نہاد ترقی نے تو معاملہ یہاں تک پہنچا دیا ہے کہ حکومتیں بیرونی مہمانوں کی جنسی ضیافت کے لئے بھی اسی طرح لڑکیاں فراہم کرتی ہیں جیسے دسترخوان پر مرغی اور مچھلی۔

ان کے سامنے بچیوں کی پریڈیں نہیں کرائی جانی چاہئیں۔

○ سخت ترین قانون کے ذریعے اس امر کی ممانعت کی جائے کہ عورتوں کی تصاویر کو ہمارے سرمایہ دار اپنے کاروبار کے فروغ کے لئے اشتہار بازی میں استعمال نہیں کریں گے۔

یہ اقدامات اگر کوئی قوت انقلابی جرات سے نہیں کر سکتی تو وہ اسلام کی کوئی موثر خدمت کبھی انجام نہیں دے سکتی۔ اور نہ اس کے زیر سایہ اسلامی نظام تعلیم پنپ سکتا ہے۔

قومی زبان ذریعۂ تعلیم

ایک آزاد اسلامی ملت کے شایان شان نظام تعلیم اغیار کی زبان کے سہارے پروان نہیں چڑھ سکتا۔ غیر زبان کا جس نظام تعلیم پر تسلط ہو' وہ کبھی نئی نسلوں کے لئے خود شعوری کا ذریعہ نہیں بن سکتا اور نہ اس کے سائے میں قومی غیرت اور تہذیبی حمیت پیدا ہو سکتی ہے۔
بغیر کسی تاخیر کے انگریزی زبان کی یہ حیثیت ختم کر دی جائے کہ وہ ذریعہ تعلیم و امتحان ہو۔ آخر حیدر آباد[1] میں آج سے کئی سال پہلے یہ تجربہ کامیاب ہو چکا ہے کہ اردو میں اعلیٰ

---

[1] عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں تیس سال تک ادب' سائنس' معاشیات' قانون' طب اور جملہ نظری و تجربی علوم کی تعلیم اردو کے ذریعے کامیابی سے دی جاتی رہی۔ سب سے زیادہ مشکل مسئلہ ڈاکٹری تعلیم کا تھا لیکن عثمانیہ یونیورسٹی کے تحت ایم بی بی ایس کے درجوں میں بھی اردو ہی کے ذریعے سے تعلیم دی جاتی تھی اور لندن کے رائل کالج آف سرجنز (Royal College of Surgeons) کے ایک وفد نے جامعہ عثمانیہ کی ڈاکٹری تعلیم کا معیار جانچنے اور جدید فن طب پر اردو کی کتابیں معائنہ کرنے کے بعد اپنے کالج کی مجلس اعلا کو یہ رپورٹ دی کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے تحت ڈاکٹری تعلیم کا معقول اور تسلی بخش انتظام ہے۔ اور پھر وفد کی اس رپورٹ کی بنا پر انگلستان کے سب سے بڑے طبی ادارے نے بھی جامعہ عثمانیہ کی ڈاکٹری کی ڈگریوں کو تسلیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ غیر منقسم ہندوستان کی فیڈرل کورٹ کے سابق چیف جسٹس سامارس گوائرے نے بھی غیر مبہم لفظوں میں یہ شہادت دی تھی کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ طبیعات' ریاضی اور حیوانیات جیسے مشکل مضامین میں بھی امتیاز حاصل کرتے تھے۔ سائنس کی طرح معاشیات کو بھی ایک مشکل مضمون سمجھا جاتا ہے۔ اور اس مضمون میں بھی عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ کے جوابات کا معیار ملک کی دوسری یونیورسٹیوں کے طلبہ کے معیار سے نسبتاً بہتر رہا۔ مشہور ماہر اقتصادیات ڈاکٹر انور اقبال قریشی نے شعبہ معاشیات کے اساتذہ کی کانفرنس منعقدہ لاہور (۱۹۴۰ء) ←

مراتب کی تعلیم حاصل کرنے والوں نے عملاً قابلیت کے ثبوت دیئے ہیں۔ اردو میں نصابی کتب کی تدوین کا کام تیزی سے کیا جائے' دوسری زبانوں سے علمی ذخائر کو اردو میں منتقل کرنے کے لئے ترجمے کے ادارے قائم کئے جائیں۔ لغت اصطلاحات علمیہ فراہم کی جائے (اور یہ کام بڑی حد تک ہو بھی رہا ہے) لیکن اگر کچھ مضامین میں انگریزی کتابیں پڑھائی بھی جائیں تو ان پر لیکچر اردو میں ہوں۔ طلبہ اردو میں نوٹس تیار کریں اور امتحانات بہر حال اردو میں ہوں۔

انگریزی کو بہ حیثیت ذریعہ تعلیم ہونے کے قطعی طور پر ختم کر دیا جائے۔

بے شمار دوسرے ممالک ہمارے سامنے ایسے موجود ہیں جو اپنی زبانوں میں اونچے سے اونچے علوم کی تعلیم دے رہے ہیں۔ سائنسی میدانوں میں عملاً کام کر رہے ہیں

ترکی' ایران' روس اور چین یا کوئی بھی دوسرا ترقی کرتا ہوا ملک دیکھ لیجئے ہر جگہ قومی زبانوں میں کام ہو رہا ہے خاص طور پر جاپان ایک معیاری مثال کے طور پر ہمارے سامنے موجود ہے جہاں کے متعلق میرے ایک فاضل دوست (جنہوں نے کئی سال وہاں رہ کر کام کیا) نے بتایا کہ آج اگر کوئی شخص صرف جاپانی زبان سیکھ لے تو دنیا بھر کے سارے علم اور ادبیات کی کنجی اسے مل جائے گی اور وہ جاننے کی ہر چیز جان سکے گا۔ آخر ہم پاکستانی ایسا نہیں کر سکتے؟ میرے خیال میں تو تعلیمی انقلاب کا ایک محسوس نقطۂ آغاز ذریعۂ تعلیم کی تبدیلی ہے۔

عربی زبان کی اہمیت

اسلامی تعلیمی انقلاب کے لئے عربی زبان کو بھی اہمیت دیئے بغیر چارہ نہیں۔ جب تک ہم اپنے دینی خزانہ ہائے علم و حکمت کی کنجیاں مہیا نہ کر لیں' یہ ممکن نہیں ہے کہ اسلامی مقاصد کے لئے کوئی بڑا کام ہو سکے۔

اس کی ایک آسان صورت یہ ہے کہ آپ قومی زبان کے ساتھ ساتھ عربی زبان کو بھی لازم کر دیجئے۔

لسانی گروپ چاہیں تو اوپر کی تعلیمی سطحوں پر مغربی زبانوں (انگریزی' فرانسیسی' جرمن'

← میں فرمایا کہ وہ تین سال تک جامعہ عثمانیہ کے شعبہ معاشیات کے مسئلہ زر' بینک اور سکہ کے ممتحن رہے اور انہوں نے طلبہ کے جوابات کا معیار اچھا پایا۔

(بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق ''اردو یونیورسٹی وقت کا اہم تقاضا'')

روسی، چینی وغیرہ) میں سے کوئی ایک اور اپنے ہاں سے فارسی یا کسی دوسرے مسلم ملک کی کوئی زبان (جیسے یوگنڈی یا ملائی یا سواحلی وغیرہ) لے سکتے ہیں۔

دوسرے گروپوں کے لئے تعلیم کی بالائی سطحوں پر مڈل کے بعد انگریزی کو اس لئے شامل کر سکتے ہیں کہ یہ زبان پہلے سے مروج رہ چکی ہے۔ اس میں بیشتر جدید علمی لٹریچر موجود ہے اور اس سے موجودہ مراحل میں کامل انقطاع ممکن نہیں ہے۔

باقی لسانیات کو نظام تعلیم میں جیسے بھی سمویا جائے اس سے زیادہ بحث نہیں۔ لیکن عربی کو بہرحال خاص اہمیت دینی چاہئے۔

نظام تعلیم میں غریبوں کا خصوصی لحاظ

اسلامی نظام حیات میں ایک تو تعلیم پھیلانا ریاست کے اساسی فرائض میں سے ہے اور یہ معاشرہ کی فلاحی خدمات میں شامل ہے اس لئے یہ مال تجارت نہیں ہے کہ جو جتنی زیادہ گراں قیمت ادا کر سکے وہ اتنا ہی زیادہ اور بہتر حصہ پائے۔ دوسرے ہماری تہذیب امیر و غریب سب کو ایک صفِ اخوت میں کھڑا کرتی ہے اور ترقی کے لئے سب کو مساویانہ مواقع دیتی ہے۔ اس لئے اسلامی نظام تعلیم وہی ہو سکتا ہے جس میں غریب خاندانوں کے بچوں کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یا فنی تربیت حاصل کرنے میں ان کی غریبی حائل نہ ہو سکے۔

پس ایک تو یہ اقدام کیا جائے کہ ایک خاص حصہ آمدنی (افراد خاندان کو ملحوظ رکھتے ہوئے) سے نیچے کے خاندانوں کے بچوں کو پہلے مڈل تک اور پھر میٹرک تک بالکل مفت تعلیم دی جائے بلکہ ایسے بچے جو کتابوں اور اسٹیشنری وغیرہ کے مصارف بھی نہ اٹھا سکتے ہوں ان کی یہ ضروریات بھی حکومت تعلیمی ٹیکسوں سے پوری کرے۔

دوسرا اقدام یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے دائرے میں بھی داخلے بلحاظ استعداد و قابلیت (Merit) ہوں اور ہر وہ طالب علم جس کے خاندان کی آمدنی کی سطح خوش حالی کی حد سے کم ہو اسے تعلیمی مصارف کے بار سے آزاد رہ کر پڑھنے دیا جائے۔

اس طرح کا نظام تعلیم ایک خاص مفاد یافتہ طبقے کے تسلط اور اس کے غرور بے جا اور اس کے ظالمانہ رویوں کو ختم کر دے گا اور غریب طبقوں میں خوشحال عنصر کے خلاف جو طبقاتی نفرت بڑھ رہی ہے وہ رک جائے گی۔ غریب گھرانوں کی اولادیں تعلیم کے دروازے سے

خوشحالی کے ایوان میں داخل ہو کر دولت مندوں کے شانہ بشانہ جا کھڑی ہوں گی۔ گویا تعلیم کو ہم اقتصادی تبدیلی کیلئے بھی موثر ذریعہ بنا سکتے ہیں۔

غیر ملکی تعلیمی اداروں کا مسئلہ

ایک طرف ہماری قومی درس گاہیں ہیں جن میں مقصد کی روح سرے سے کارفرما نہیں' مشنری اسپرٹ نہیں' اپنی آئیڈیالوجی کی قندیل روشن نہیں ـــــ تعلیمی معیار پست' کام بیگاری طرز کا' اخلاقی تصور غائب' نظم ڈھیلا ـــــ دوسری طرف غیر قومی ادارات (کانونٹ مشن سکولز) کا معیار اور رنگ! اونچا طبقہ جس کی اولادوں کو قیادت کرنی ہے اس کا مرجع یہی غیر قومی درسگاہیں ہیں۔ یہ ادارے ہمارے درمیان کام کر کے ہمارے مستقبل کے لیڈروں کو اپنی مرضی کے مطابق تیار کر رہے ہیں۔ یہ بچے جو دھندلے مذہبی پس منظر' گم کردہ قومی شعور' مغربی رنگ ثقافت اور غیر زبان کی غلامی کے ساتھ پروان چڑھیں گے' ان کے ہاتھوں کل کا پاکستان تعمیر ہوگا۔ آج جو بُعد ملت کے عوام اور اس کے لیڈروں میں ہے وہ پچیس برس بعد کئی گنا بڑھ جائے گا۔

ان اداروں میں جدھر جاؤ' عیسیٰ اور مریم کے مجسمے اور انجیل کے کلمات آنکھوں کے سامنے آتے ہیں' نصابی مواد میں بائبل کی تعلیمات کا رنگ' اور وہ نہیں تو کم از کم مغربی تمدن کا رنگ پوری طرح گھلا ہوا ہے۔ اسی ذہنی ماحول میں جو بچہ اپنے کچے انفعالی ذہن کے ساتھ متواتر چند برس رہ کر نکلے گا اس میں اسلامیت تو کیا' محض قومیت کی بو باس بھی باقی نہ رہے گی۔

یہ غیر ملکی مشنری ادارے صرف تعلیمی یا دیگر خدمات ہی انجام نہیں دیتے بلکہ وہ پورے معاشرے کو مغرب کی گندی ثقافت کی غلامی میں مبتلا کرنے اور نئی پود کو اسلامی اخلاق و اقدار سے محروم کرنے میں پوری طرح سرگرم عمل ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کو دینی و تہذیبی شکست دینے کے لئے ایک سوچا سمجھا منصوبہ ہے جس پر علی الاعلان زور شور سے عمل ہو رہا ہے۔ ہمارے نقطۂ نظر سے یہ آہستہ آہستہ اثر کرنے والی ذہنی و اخلاقی زہر خورانی ہے۔

پاکستان میں اگر ایک بار یہ طے ہو جاتا ہے کہ ہمیں اسلامی تہذیب کا احیاء کرنا ہے۔

اور یہی نظام تعلیم کا نصب العین ہو گا کہ اس تہذیبی احیاء کے لیڈر' مفکر اور کارکن تیار کرے تو پھر ہمیں ایسے تعلیمی اداروں کے بارے میں کوئی موثر فیصلہ کن قدم اٹھانا ہو گا جو غیر اسلامی فکر و تہذیب کے مراکز ہیں۔ فوری طور پر ملکی پرائیویٹ اور غیر ملکی مشنری تعلیمی اداروں میں مندرجہ ذیل اصلاحات ہونی چاہئیں۔

(ا) ان پر پابندی لگائی جائے کہ وہ نہ تو بیرونی نصاب اور نصابی کتب استعمال کریں گے اور نہ ان کا نظام امتحان بیرونی نظام سے متعلق ہو گا۔ انہیں نصابی کتب لازمی طور پر پاکستانی ماحول' یہاں کے دستور' ہماری معیاری دینی و معاشرتی تہذیب اور ہماری پرانی اور نئی شخصیتوں کو سامنے رکھ کر لکھوانی ہوں گی۔ نام' لباس' مناظر' پھول' درخت سب پاکستان کے استعمال ہوں گے۔

(ب) اگر وہ اپنی درسگاہوں کو خاص اپنے عیسائی بچوں کے لئے چلائیں تو اپنے دستور و مقاصد وغیرہ کی باقاعدہ رجسٹری کرائیں' استادوں کو اس معیار کے مطابق مقرر کریں جو حکومت نے مقرر کیا ہے۔ جو نصابی خاکے تیار کریں وہ حکومت سے منظور کرائیں (یا یونیورسٹی اور محکمہ تعلیم سے) پھر جب کتابیں لکھوائیں تو ان کو منظور کرائیں۔

(ج) وہ یہ اہتمام بھی کریں کہ فیسیں اتنی زیادہ نہ رکھیں کہ تعلیم فروشی کا باقاعدہ ایک کاروبار وجود میں آ جائے جس سے غریب لوگ فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ تعلیمی مصارف ایسے ہونے چاہئیں کہ اوسط درجے کے تمام شہریوں کی اولادیں فائدہ اٹھا سکیں۔

(د) یہ بھی ضروری ہو گا کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو دس برس کی عمر کے بعد مخلوط سوسائٹی کی صورت میں نہ رکھا جائے' بلکہ ان کی تعلیم' کھیل' تفریح اور امتحانات کے لئے جداگانہ (پردہ دارانہ انتظامات) کیئے جائیں۔

(ر) پاکستان میں کام کرتے ہوئے ضروری ہے کہ مسلم بچوں کے لئے تعلیمی مواد کم سے کم وہ ضرور ہو جو حکومت کے نظام تعلیم میں مختلف درجوں کے لئے مقرر ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ان کے دینی تصورات و اطوار کو نصابوں میں جگہ دی جائے۔ ساتھ ہی تمام مذہبی اقلیتوں کو سامنے رکھتے ہوئے کسی طرح کے فرقہ وارانہ احساسات نہ پیدا ہونے چاہئیں۔

(س) اگر مشنری ادارے عیسائیت کی تبلیغ علی الخصوص کرنا چاہیں اور بائیبل پڑھانا چاہیں تو

پھر ان کو یہ اجازت نہ ہونی چاہئے کہ وہ مسلمانوں یا کسی دوسرے مذہب کے پیروؤں کو داخل کر سکیں۔ پھر ان کے سکول خالص عیسائی بچوں کے لئے ہوں گے۔

نئے نظام امتحانات کی ضرورت

موجودہ نظام امتحانات اسلامی نظام تعلیم کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ اس نے ایسی بدعنوانیاں پیدا کر دی ہیں کہ وہ اسلامی اخلاقیات کے لئے تباہ کن ہے۔

جدید تجربات کے مطابق پروجیکٹ سسٹم اختیار کیا جائے اور طالب علم کا سال بھر کا کام ہی اس کی کامیابی یا ناکامی کے لئے فیصلہ کن ہو۔

تعلیمی انقلاب —— ممکنہ طریقہ*

نظام تعلیم میں تبدیلی یا کسی اور شعبۂ زندگی میں تبدیلی اس طرح نہیں لائی جا سکتی کہ ایک آدھ جزیرہ کو متعین کر لیا جائے جس میں تبدیلی لائی جاتی ہے اور باقی تمام دائرۂ زندگی کا سلسلہ پہلے ہی کی طرح چلتا رہے۔ تبدیلی جب بھی آئے گی تو وہ ایک ہمہ گیر تبدیلی کی حیثیت میں آئے گی جس کی زد میں ہر شعبہ آئے گا۔ جس کے زیر اثر ہر ادارہ آئے گا اور زندگی کے سارے ادارے مل کر کام کریں گے۔ جب تک تبدیلی کا یہ تصور ذہن میں راسخ نہ کیا جائے اس وقت تک آپ نظام تعلیم میں کوئی جامع تبدیلی نہیں لا سکتے' بلکہ زندگی کے کسی دوسرے گوشہ اور کسی دوسرے دائرے میں بھی تبدیلی نہیں لا سکتے۔ اصل میں مجھے یہاں تبدیلی کی بجائے انقلاب کا لفظ استعمال کرنا چاہیے تھا۔ لیکن میں نے اس لفظ کو اس لیے استعمال نہیں کیا کہ دور جدید کی مادہ پرستانہ تحریکوں نے اس لفظ کی عزت کو اتنا غارت کر دیا ہے اور اس کا مفہوم اتنا مسخ کر دیا ہے کہ انقلاب کا تصور آتے ہی اس کے کارکنوں کا یہ نقشہ سامنے آتا ہے کہ جیسے بال پھیلے ہوئے ہیں' منہ سے جھاگ اڑا جا رہا ہے اور وہ جدھر قدم اٹھاتے ہیں ادھر آگ لگتی جا رہی ہے اور جدھر ان کی پیش دستی ہوتی ہے اس طرف لاشیں تڑپتی نظر آتی ہیں' خون کے دریا بہتے نظر آتے ہیں۔ یہ تصورِ انقلاب ہمارے دورِ مادہ پرستی کا پیدا کردہ ہے۔

فی الحقیقت اسلام سب سے بڑا انقلاب ہے اور اس کا تصور انقلاب سب سے عظیم تصور انقلاب ہے' لیکن وہ ایک تعمیری انقلاب ہے۔ وہ خون خرابوں کے راستوں سے آگے بڑھنے کے بجائے ایک تعمیری طریق سے اور معلمانہ تبدیلی سے اور فلاحی و اصلاحی تصور کے ساتھ زندگی کے ایک ایک گوشہ پر نہایت گہرے اثرات ڈالتا ہے۔ انقلاب کے اصل اصطلاحی معنی ہی یہ ہیں کہ تبدیلی ایک جزوی تبدیلی نہ ہو بلکہ ایک ہمہ گیر تبدیلی ہو۔ عام تبدیلی کے مقابلہ میں ہمہ گیر اور جامع تبدیلی کو واضح کرنے کے لیے یہ ایک خاص اصطلاح تھی جس کو اس

* ماخذ تقریر۔ تعلیمی کانفرنس' منعقدہ دسمبر ۱۹۷۹ء فیصل آڈیٹوریم۔ جامعہ پنجاب' لاہور

دور کے جذباتی ہیجانات میں مبتلا انقلابیوں نے غارت کر دیا۔

میں یہ کہتا ہوں کہ تبدیلی سے میری مراد اس طرح کا جامع انقلاب ہے جو اسی وقت آتا ہے جب سارے گوشہ ہائے زندگی متوازن طور پر ایک سمت میں نشوونما پاتے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہمارے ہاں کمی اور کوتاہی یہی رہی ہے کہ کبھی کوئی تبدیلی مقصود ہوئی تو باقی زندگی کے تمام شعبوں سے لاتعلق رہتے ہوئے اس پر توجہ دی جاتی ہے' کبھی کوئی تبدیلی ہم نے تعلیم میں سوچی تو اس تبدیلی کا کوئی تعلق باقی زندگی سے نہ تھا۔ لیکن آئندہ اگر ہم کو یہ کام کرنا ہے تو پہلے ہی قدم پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ تبدیلی یا انقلاب کا ہمارا تصور کیا ہے۔ اس وقت یہ بات ہو رہی ہے کہ تعلیم میں تبدیلی آنی چاہیے۔ مگر صحیح نتائج حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ تبدیلی ہمہ گیر تبدیلی کی صورت میں آئے جو ہر شعبۂ حیات اور ہر شعبۂ تمدن میں اثر انداز ہو۔

دوسری بات جو مجھے نہایت اختصار سے کہنی ہے' کہ تبدیلی جب بھی ہمہ گیر شکل میں کسی معاشرے میں آتی ہے تو یہ ممکن ہے کہ وہ اس کے کسی خاص گوشہ اور شعبہ میں' نمایاں تغیر کی شکل میں نمودار ہو۔ خاص طور پر جہاں جہاں غلط طور طریق اور بگڑے ہوئے احوال بہت نمایاں ہوں وہاں ان حالات کو تیز رفتاری سے بدلنے یا ان کی توڑ پھوڑ کرنے کا انداز اوسط درجے کی تبدیلی سے مختلف ہوتا ہے۔ ورنہ بہت سے سلاسل و اغلال ایسے ہوتے ہیں کہ انسانی فرد اور معاشرے اپنی جکڑ بندی سے نکلنے ہی نہیں دیتے اور نرم روی اور ملائمت سے اگر برسوں تک بھی کام لیا جائے تو وہ ہرگز اپنے اسیروں کو نہیں چھوڑتے۔ ایسی صورت میں ایک زوردار جھٹکے سے ان کو الگ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ تبدیلی انقلابی ذہن اور سوچ کی مرہونِ منت ہے۔

وضاحت کے لیے میں یہ بات کہوں گا کہ انقلابی ذہن وہ ہوتا ہے جو ناقابل اصلاح غلط طور طریقوں کو توڑنے کے لیے حکیمانہ جنون سے کام لے سکتا ہے۔ اس کی مثال میں آپ کو تاریخ سے دیتا ہوں۔ کہ جب سیدنا حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز خلافت کی بیعت لینے کے بعد نکلے تو حکومت کا معمول جیسے تھا اس کے مطابق بہترین شاہی سواری آراستہ پیراستہ سامنے لا کر کھڑی کر دی گئی اور بتایا گیا کہ یہ سواری آپ کے لیے ہے۔ مگر آپ نے یہ کہہ کر اس پر سوار ہونے سے انکار کر دیا کہ میرے لیے میرا خچر کافی ہے۔ جس وقت ان کے آگے ایک نیزہ

بردار محافظ کے طور پر چلا تو انہوں نے کہا کہ مجھے کسی نیزہ بردار کی ضرورت نہیں ہے۔ ان سے کہا گیا کہ آپ شاہی محل میں چلیں تو انہوں نے کہا کہ میرے لیے میرا جھونپڑا بہت اچھا ہے۔ یہ ہے سچا انقلابی ذہن یا انقلابی تصور کہ جہاں جائے گا' جہاں قدم رکھے گا اور جو عمل کرے گا اس سے وہ انقلاب پھوٹ پھوٹ کر بہتا نظر آئے گا جس کا ظہور مطلوب ہوتا ہے۔

انقلابی ذہن ان روایات اور اغلال کو جو کسی بھی میدان میں مسلط کیے گئے ہوں توڑ دیتا ہے۔ پھر وہ اپنے مقصد پر عزائم اس طرح مرتکز رکھتا ہے کہ ادھر اُدھر کے پیچ وخم میں نہیں الجھتا بلکہ سیدھا اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہے۔ جو کام اسے کرنا ہوتا ہے اسے انجام دیتا ہے اور جب اسے مشکلیں اور رکاوٹیں پیش آتی ہیں تو وہ تخلیقی ذہن کے ساتھ نئے نئے راستے نکالتا ہے۔ کبھی چٹانوں کے اندر سے راستہ نکالتا ہے' کبھی وہ چٹانوں کے اوپر سے چھلانگ کر جاتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ میرا مقصود کہاں واقع ہے' اور اس کے لیے کس طرح پیش قدمی کرنی ہے۔

جب تک انقلابی ذہن حقیقت میں کارفرما نہ ہو تو انقلابی تبدیلی یا ہمہ گیر تبدیلی کچھ قراردادوں' کچھ امنگوں اور کچھ اپیلوں کے ذریعہ کبھی واقع نہیں ہوا کرتی۔ ہمارے ہاں ستم ظریفی یہ رہی ہے کہ تبدیلی کا عمل جب کبھی شروع کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے تو ہر میدان میں ڈگریوں اور عہدوں سے آراستہ افراد کو تلاش کیا جاتا ہے کہ وہ کہاں کہاں پائے جاتے ہیں اور ان کو پکارا جاتا ہے کہ آیئے اور اس تبدیلی کے لیے منصوبہ بتایئے اور اسے عملی جامہ پہنایئے۔ میں اس کی ایک مثال دوں!___ پچھلے دنوں نہایت اچھی نیت ومقاصد سے اسلام آباد میں ابھی جو تعلیمی کانفرنس (۱۹۷۹ء) بلائی گئی اس میں تعلیمی تبدیلی کے لیے ایسے ایسے لوگ شریک ہوئے جو نہ صرف اسلام کے مقاصد اور اصولوں پر ایمان نہیں رکھتے' بلکہ وہ ان کے لیے سخت مخالف ومزاحم قوت کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ان میں ایسے ایسے لوگ شامل تھے جنہوں نے اسٹیج پر آ کر اسلام کی مدح وثنا میں وہ وہ نکتے چھانٹے کہ آپ سن کر دنگ رہ جائیں لیکن انہی لوگوں نے کونوں میں بیٹھ کر اس ساری کارروائی کا مذاق اُڑایا جو اس کانفرنس میں ہو رہی تھی۔ اس طرح کے لوگ جمع کر کے اگر آپ یہ چاہیں کہ کوئی بڑی تبدیلی یا ہمہ گیر تبدیلی اس میدان میں ہو جائے' تو ایسا ہونا تاریخ کی شہادت کی روشنی میں ممکن نہیں ہے۔

میں ان سب حضرات کی عزت کرتا ہوں جو اس ملک کو چلا رہے ہیں' لیکن ان میں

بے شمار لوگ ایسے بھرے پڑے ہیں جن کی ساری سوچ بچار اس محور کے گرد گھومتی ہے کہ کس طرح زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں' کسی عہدہ پر کس طرح پہنچا جا سکتا ہے اور اپنی پیش روی کے لیے کسی مقام سے کسی کو کیسے ہٹایا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کی نگاہیں یہاں تک بھی جاتی ہیں کہ کس ضیافت میں' کس تقریب میں اور کانفرنس میں کون سا اعزاز دیا جاتا ہے' اور اسے کسی نہ کسی طرح حاصل کرنا چاہیے۔ اس ذہنیت کے ساتھ لوگ اگر چاہیں کہ وہ کوئی انقلابی کام کر دکھائیں گے' تو یہ کبھی ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے وہ بے لوث لوگ چاہئیں کہ جو اپنی ہر ذاتی خواہش اور دلچسپی کو ایک طرف ڈال کر اپنے صحیح مقصد کے لیے خدمت انجام دیں۔ مفاد پرستی کو چھوڑ کر ہی کوئی اہم کام کیا جا سکتا ہے۔

اصلاح و تغیر کی بہترین صورت یہ ہے کہ کم سے کم تبدیلی کی باگ ڈور کسی ایسے فرد کے ہاتھ میں ہو جو اس طرح کا سوچنے والا ہو جس طرح کا سوچنے والا تبدیلی کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ پھر تمام لوگوں کی مہارتیں اور صلاحیتیں اس کے ذریعے سے کام کریں۔ چاہے یہ پالیسی بنانے کا مرحلہ ہو' چاہے یہ درسی کتب لکھنے کا مرحلہ ہو یا اساتذہ کو منتخب کرنے کا مرحلہ۔ ہر مرحلہ میں تبدیلی کا تصور اپنے ہاں کسی ایسے عنصر سے آپ کو حاصل کرنا چاہیے جس نے اس مقصد کے لیے برسوں سوچا ہو اور اس مقصد کے لیے قربانیاں دی ہوں اور تکلیفیں اٹھائی ہوں۔ ایسے لوگوں میں سے آپ کو وہ گائیڈ ملیں گے جو صحیح طور پر دکھائیں کہ تبدیلی کا راستہ کیا ہے۔ یہ کسی کتاب میں لکھا لکھایا موجود نہیں ہے' یہ بنا بنایا کوئی نقشہ اور منصوبہ نہیں ہے بلکہ ہر مرحلے میں اور ہر قدم پر سوچ بچار کے لیے تخلیقی عمل سے کام لینا ہوتا ہے۔ اور بار بار سوچنا ہوتا ہے کہ کب اس کام کو کیسے کیا جائے۔

ایک بڑی ضرورت ہمارے ہاں یہ ہے کہ ہمہ گیر تبدیلی کے تصور کے ساتھ تبدیلی کے لیے جس جس شعبہ میں اس کو عمل میں لانا ہو' انقلابی ذہن کو تلاش کیجیے' کہ وہ اس کو گائیڈ کرے' کدھر سے قافلہ ہو کر کدھر کو جائے گا۔ محض ٹیکنیکل ماہرین یا بیوروکریٹ افسر اور محض ڈگریوں سے آراستہ و پیراستہ شخصیتیں آپ کو یہ کام کبھی بھی کر کے نہیں دے سکتیں۔ ان لوگوں میں ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ خواہ ان میں اسلام کو جاننے والے کچھ لوگ موجود بھی ہوں وہیں ان کے ساتھ ایک کثیر تعداد ہے جو چار و ناچار اسلام کے لفظ کو تو قبول کرتے ہیں مگر وہ چاہتے ہیں کہ

اسلام کو کسی نہ کسی طرح سے سیکولر اسلام[1] بنا کر پیش کیا جائے۔ یہ دنیا میں تضاد کا ایک دلچسپ تجربہ ہے وہ سیکولر اسلام جو تھوڑا بہت شراب کی بھی اجازت دیتا ہو' سود کے نظام کی بھی گنجائش دیتا ہو' کچھ ڈانسنگ کے لیے بھی موقع دیتا ہو اور کئی قسم کے تعیشات اور لوٹ مار اور رشوت جیسی چیزوں کے لیے بھی تھوڑے تھوڑے راستے بنا کر دیتا ہو۔ بھلا مانس سا اسلام اور شریف سا اسلام ان کو ہضم نہیں ہوتا۔

غرضیکہ بیان کردہ دو طرح کے عناصر کی کشمکش جب کام کرنے لگتی ہے تو تبدیلی کے عمل میں اس کا نتیجہ الٹا برا ہوتا ہے کہ تبدیلی کبھی صحیح طور پر عمل میں آ ہی نہیں سکتی۔ ایک ایک بات پر الجھنیں پیدا ہوتی ہیں اور ان الجھنوں کو صاف کرنے کی بے شمار کوششوں کے بعد جو نتیجہ نکلتا

---

[1] ابوالاثر حفیظ جالندھری اپنے مضمون ''قومی ترانے کا افسانہ'' میں رقم طراز ہیں ''ترانہ کمیٹی کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ دو سو سے زیادہ نظمیں دھنوں کے بغیر سامنے رکھ دی گئیں...... بتایا گیا کہ ان نظموں اور ان دھنوں میں کوئی ایک بھی کسی صورت میں پاکستان کے لیے قابل قبول نہیں نظر آئی۔ سید ذوالفقار علی بخاری صاحب نے بولنے میں پہل کی۔ فرمایا پاکستان کا ترانہ ہرگز ہرگز ہمارے ملک میں نہیں بن سکتا۔ یورپ' انگلستان یا امریکہ میں بنوانا پڑے گا۔ ذوالفقار کی تیزی گفتار پر سب ان کا منہ تکنے لگے۔ میں نے بھی تعجب سے ان پر نگاہ ڈالی۔ وہ اپنی پرانی مسکراہٹ مسکرائے۔ سردار نشتر ہنسے۔ فرمایا: ''بھئی خوب اسلامی پاکستان کا ترانہ ہے لیکن بنائیں گے انگلستان اور امریکہ!'' دوسرے ارکان بھی ہنسے۔ آخر تھوڑی گفتگو کے بعد ؏

قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

اب جلد جلد یہ متفقہ طور پر طے ہوا کہ پاکستان کا ترانہ اردو میں ہوگا۔ اور یہ کام اب محض اکیلے حفیظ جالندھری کے ذمے ہے کہ الفاظ اور دھن جس طرح کی چاہے تخلیق کرکے جلد از جلد پیش کرے۔ میں اس وقت تک قطعاً خاموش بیٹھا تھا۔ اب مجھے پوچھنا پڑا کہ حضور...... یہ ضرور واضح فرما دیں کہ پاکستان اور ملت پاکستان کا نظریہ حیات کیا ہے۔ یہ رہنمائی آپ فرما دیجیے تو میں انشاء اللہ اس کمیٹی کے مطلوب مقصود کی منزل تک پہنچنے کی جان و دل سے کوشش کروں گا۔

یہ سوال پھر مزید بحث کا موضوع بنا۔ میں حیرت زدہ تھا کہ مقصود دلوں میں واضح ہو تو ہو مگر کسی بزرگ کی زبان میری مدد نہ کر سکی۔ آخر بڑی رد و قدح کے بعد جس میں میں نے بھی حصہ لیا فیصلہ یہ ہوا کہ یہ سوچنا بھی میرا ہی کام ہے۔ البتہ قید لگا دی گئی کہ لازماً ترانہ اسلامی ہو۔ لیکن اس میں اللہ اور محمد کا نام' اسلام' جہاد' شہادت کے الفاظ نہ ہوں۔ (ماہنامہ افکار کراچی ''حفیظ نمبر'' اگست ۱۹۶۳)

ہے وہ بہت ہی مایوس کن ہوتا ہے۔

تعلیم کی تبدیلی اس کے بغیر ممکن نہیں کہ آپ مقصد تعلیم کو پہلے متعین کریں۔ مقصد تعلیم اس سوال کے جواب میں متعین ہوتا ہے کہ آپ کو کیسا انسان درکار ہے۔ جس وقت آپ اس انسان کا نقشہ صحیح طور پر مرتب کر لیں گے' اس کا پورا حلیہ اور ڈھانچہ سامنے رکھ لیں گے' اس وقت آپ کو ہر وہ چیز سمجھ میں آ جائے گی جو نظام تعلیم کو بدلنے کے لیے ضروری ہے۔ اگر ایسا کوئی نقشہ آپ کو معلوم ہو تو سامنے رکھیے' واضح نہ ہو تو قرآن سے پوچھیے' حدیث کا مطالعہ کیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآن و حدیث میں یہ نقشہ نہ صرف یہ کہ جا بجا پھیلا ہوا ہے بلکہ بعض جگہ یکجا تفصیل (Concentrated) تحریری طور پر موجود ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ بنی اسرائیل کے آغاز میں آپ چودہ نکات[1] پائیں گے۔ ان چودہ نکات کے اوپر انسانی کردار اور

---

[1] سورہ بنی اسرائیل میں دیے گئے چودہ نکات درج ذیل ہیں:

۱۔ صرف اللہ کی بندگی کی جائے اور اقتدار اعلیٰ میں اس کے ساتھ کسی کی شرکت نہ تسلیم کی جائے۔

۲۔ تمدن میں خاندان کی اہمیت ملحوظ رکھی جائے' اولاد والدین کی فرماں بردار و خدمت گزار ہو اور رشتہ دار ایک دوسرے کے ہمدرد و مددگار ہوں۔

۳۔ سوسائٹی میں جو لوگ غریب یا معذور ہوں یا اپنے وطن سے باہر مدد کے محتاج ہوں وہ بے وسیلہ نہ چھوڑ دیے جائیں۔

۴۔ دولت کو فضول ضائع نہ کیا جائے۔ جو مالدار اپنے روپے کو برے طریقہ سے خرچ کرتے ہیں وہ شیطان کے بھائی ہیں۔

۵۔ لوگ اپنے خرچ کو اعتدال پر رکھیں' نہ بخل کر کے دولت کو روکیں اور نہ فضول خرچی کر کے اپنے لیے اور دوسرے کے لیے مشکلات پیدا کریں۔

۶۔ رزق کی تقسیم کا قدرتی انتظام جو خدا نے کیا ہے انسان اس میں اپنے مصنوعی طریقوں سے خلل نہ ڈالے خدا اپنے انتظام کی مصلحتوں کو زیادہ بہتر جانتا ہے۔

۷۔ معاشی مشکلات کے خوف سے لوگ اپنی نسل کی افزائش نہ روکیں جس طرح موجودہ نسلوں کے رزق کا انتظام خدا نے کیا ہے آنے والی نسلوں کے لیے بھی وہی انتظام کرے گا۔

۸۔ خواہش نفس کو پورا کرنے کے لیے زنا کا راستہ برا راستہ ہے لہٰذا نہ صرف زنا سے پرہیز کیا جائے بلکہ اس کے قریب جانے والے اسباب کا دروازہ بھی بند ہونا چاہیے۔

←

تمدن کے نقشہ کو اگر ڈھال دیا جائے تو لازمی طور پر وہ اسلام کی شکل اختیار کر لے گا۔ اگر وہی چودہ چیزیں آپ اپنے نظام تعلیم کی بنیاد بنا لیں کہ ان خوبیوں اور صلاحیتوں کے ساتھ آراستہ انسان ہمیں چاہیے' تو یوں سمجھئے کہ آپ نے اپنی تبدیلی کا راستہ پا لیا۔

اگر لارڈ میکالے کا نظام تعلیم یہ بات طے کرنے کے بعد کہ ہمیں ایسے کلرک' انتظامی مشین کے ایسے پرزے چاہئیں جو ہندوستانی دماغ کے ساتھ انگریزی مقاصد کو سوچتے ہوں' اور یہ نظامِ تعلیم یہاں نہایت کامیابی کے ساتھ چل چکا ہے' نتائج دکھا چکا ہے اور آج بھی دکھا رہا ہے' تو آپ بتایئے کہ آپ اس طرح سے اپنے نقطۂ نظر سے' مطلوبہ انسان کا تصور واضح طور پر سامنے رکھ کر اپنا نقشۂ تعلیم سوچیں تو کیوں وہ نظام تعلیم آپ کو اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح نتیجہ نہیں دے گا' جس کے لیے آپ نے یہ ساری تبدیلی سوچی۔

میرا خیال ہے کہ اب تک ہمارے ہاں ایک بڑی کمی یہ رہی ہے کہ ہم نے اپنے مقصد تعلیم کو اس شکل میں متعین نہیں کیا ہے کہ ہمیں کس طرح کا انسان درکار ہے مگر اللہ کا شکر ہے کہ اب بعض اصحاب کے عالمِ افکار میں اس کا آغاز ہو چکا ہے۔ اگر یہ عمل جلد از جلد صحیح شکل میں تکمیل پا جائے تو انشاء اللہ یہی مقصد آپ کے ہاں پالیسیاں بناتے ہوئے بھی' نصاب لکھتے ہوئے بھی' اساتذہ کا انتخاب کرتے ہوئے بھی' اور ان کو تربیت دیتے ہوئے بھی' نیز امتحانات

←

۹۔ انسانی جان کی حرمت خدا نے قائم کی ہے لہٰذا خدا کے مقرر کردہ قانون کے سوا کسی دوسری بنیاد پر آدمی کا خون نہ بہایا جائے' نہ کوئی اپنی جان دے نہ دوسرے کی جان لے۔

۱۰۔ یتیموں کے مال کی حفاظت کی جائے' جب تک وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہوں ان کے حقوق کو ضائع ہونے سے بچایا جائے۔

۱۱۔ عہد و پیمان کو پورا کیا جائے' انسان اپنے معاہدات کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

۱۲۔ تجارتی معاملات میں ناپ تول ٹھیک ٹھیک راستی پر ہونا چاہیے۔ اوزان اور پیمانے صحیح رکھے جائیں۔

۱۳۔ جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو اس کی پیروی نہ کرو' وہم اور گمان پر نہ چلو' کیونکہ آدمی کو اپنی تمام قوتوں کے متعلق خدا کے سامنے جواب دہی کرنی ہے کہ اس نے انہیں کس طرح استعمال کیا ہے۔

۱۴۔ نخوت اور تکبر کے ساتھ نہ چلو' غرور کی چال سے نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو نہ پہاڑوں سے اونچے ہو سکتے ہو۔

لیتے ہوئے بھی فیصلہ کن معیار ثابت ہوگا۔ اس معیار پر ہر چیز پرکھی جا سکے گی۔ ہر چیز کی قدر مقرر کی جا سکے گی۔ یہی مقصد بتائے گا کہ تعلیم کے لیے کس طرح کے لوگ چاہئیں۔

آخری چیز نصابی مواد ہے۔ اس وقت تک ہم نے جو تجربے نصابی مواد کے بارے میں کیے ہیں وہ یہ ہیں کہ نصابی مواد کا شجرۂ نسب دورِ غلامی سے ہو کر سامراجی مغرب سے جا ملتا ہے' اور وہ جوں کا توں برقرار ہے۔ ہم نے صرف یہ کیا کہ پہلے قدم پر ہم نے اسلامیات کا مضمون بھی اس نصاب میں ڈال دیا۔ پھر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد یہ محسوس ہوا کہ کچھ بات بنی نہیں' تو پھر ہم نے یہ سوچا کہ نصابی مواد کے اندر ہر مضمون کے تحت بھی اسلام کا کچھ مواد شامل کرنا چاہیے۔ بظاہر یہ بہت اچھی بات ہے' بڑی قابل قدر علامت ہے لیکن اس سے بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔

اس نصابی مواد کا جب آپ جائزہ لیتے ہیں تو آپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ رائج الوقت پورے علوم جو مغرب نے تیار کیے ہیں اور جن کا عکس ہماری نصابی کتب میں پایا جاتا ہے اُن پورے علوم میں ایک مخصوص بنیادی فکر شامل ہے' کہ یہ کائنات کسی خدا کے بنائے بغیر بنی ہے اور کسی خدا کے چلائے بغیر چل رہی ہے۔ آپ اس کے ہر شعبۂ علم کے نیچے بھی اور سطح پر بھی یہ چیز پائیں گے۔ پھر ان سارے علوم کے اندر جو تصورِ انسان سمویا ہوا ہے وہ حیوانی تصورِ انسان ہے' یعنی یہ فلسفہ کہ حیوانات پھلتے پھولتے چلے گئے اور انہی میں سے ہوتے ہوتے انسان بھی نمودار ہو گیا۔ اور جس طرح ہم حیوانات کے معاملات کو ڈیل (Deal) کرتے ہیں اسے بھی کرنا ہوگا۔ اس کے لیے اخلاقی تصورات وغیرہ اضافی چیزیں ہیں۔ یہ تو ایک حیوان ہے' جس کی ضرورتیں ہیں' اس کی زندگی اور آسائش کے کچھ تقاضے ہیں جو پورے ہونے چاہئیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی برتر چیز سوچنے کی نہیں ہے۔ بس آدمی کو لذت اور آرام حاصل کرنا چاہیے' زیادہ سے زیادہ نفع کمانا چاہیے' اور زندگی کی دوڑ میں دوسروں کو پچھاڑ کر اور پیچھے دھکیل کر آگے بڑھتے چلے جانا چاہیے۔ یہی کمال (حیوانیت) ہے۔

یہ تصور ہمارے علوم اور نصابی مواد میں رچا بسا ہے' آج تک کوئی ایسا شخص دائرہ تعلیم میں نہیں پیدا ہوا جس نے اس نظریۂ ارتقاء کے اوپر کوئی تنقیدی حملہ کیا ہو۔ اور یہ خطرناک چیز ہے جو ہمارے کورس میں شامل ہے' یہ آپ کے دین کی ایک ایک جڑ کو نوچ کر رکھ دیتی ہے۔

اسی طرح میں یہ دیکھتا ہوں کہ یہاں بعض معلومات دینے' اور پھیلانے والے ذرائع دھڑا دھڑ معاشرے پر اثر انداز ہو رہے ہیں اور وہ یہ نہیں سوچ سکتے کہ معلومات کے ساتھ یہ کونسا زہر ہے جسے وہ اپنی قوم میں پھیلا رہے ہیں۔

نظام تعلیم میں خاص طور پر یہ زہر رچا بسا موجود ہے۔ پھر اس میں وہ تصورِ تاریخ رچا بسا ہے جو مغربی فکر پر مبنی ہے اور جو تاریخ کے ہر ٹکڑے کو دوسرے ٹکڑے سے الگ کر دیتا ہے۔ ہر دور کو سابقہ ادوار سے الگ کر کے دکھاتا ہے' گویا ہر دور کے الگ قوانین ہیں اور ہر دور کا ایک الگ دائرہ ہے' حالانکہ ہمیں قرآن نے یہ سکھایا تھا کہ ایک ہی خدائی نظام کے تحت سارا نظام چل رہا ہے۔ ہر دور میں عروج و زوال اقوام کے ایک ہی اصول کام کرتے ہیں۔ خدا کے تاریخی قوانین میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اس کے خلاف تاریخ کا ایک باطل تصور ہے' جو ہمارے نظامِ تعلیم میں سمویا ہوا ہے۔

اسی طرح اجتماعیت کا تصور ہے یعنی وہ جغرافیائی تصورِ قومیت اور وطنی تصور' اور نسلی تصور' اور لسانی تصور جس کے خلاف آپ نے تحریکِ پاکستان میں ایک لڑائی لڑی تھی۔ وہ تصور آپ کے سارے کورسز میں اور سارے علوم میں اور لائبریریوں میں موجود ہے' جلوہ گر ہے۔ یعنی غلط اور باطل علمی تصورات سے ترتیب پایا ہوا وہ سارا ماحول جس میں آپ پڑھنے پڑھانے کے کام کر رہے ہیں۔ پھر:-

کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

تو اس نصابی مواد کو آپ دیکھیں' اس نفسیاتی جبریت اور بے بسی کو دیکھیے جس کے تمام کام اور معیار پر بحث کیے بغیر میں یہ کہوں گا کہ موجودہ علم النفس نے انسان کو یہاں پہنچا دیا ہے کہ اس سے جو کچھ صادر ہوتا ہے' مختلف اثر انداز ہونے والی چیزوں کے تحت وہ ایک مسمریزم ہے' اس کی کارکردگی میں اس کا کچھ دخل نہیں ہے۔ یہ از خود واقع ہوتا ہے اور ہو رہا ہے۔

یہاں سے پھر اخلاقی تصور کی جڑ کٹ رہی ہے' یعنی آپ کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ میں نے پچھلے دنوں ایک مضمون لکھا' ایک فاضل دوست کے حق میں شاید کچھ گستاخی بھی ہو گی' جنہوں نے علامہ اقبالؒ کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ بتایا کہ نفسیاتی طور پر علامہ اقبالؒ نے یہ جو سارا اسلام' اسلام پکارا ہے' یہ کچھ تاریخی مراحل تھے اور کچھ ان کے ذاتی احوال تھے' جن کے نتیجے

سے یہ پیدا ہوا۔ میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ علامہ اقبالؒ ایک کمپیوٹر تھے جن کو جس طرح سے چھیڑ دیا گیا تھا' حالات کے تحت اُسی طرح کے جوابات ان کے ہاں سے برآمد ہوئے' گویا ان کا اپنا کوئی فیصلہ شامل نہیں تھا کہ مجھے یہ کرنا ہے یا یہ نہیں کرنا۔ تو یہ کہ موجودہ نفسیات کس طرح کے تباہ کن اثرات اہلِ اسلام کے لیے رکھتی ہے۔ یہ سارے علوم جن پر بحث کرنے کا موقع نہیں ہے' میں سرسری اشارات میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں' یہ ساری چیزیں ہماری نصابی کتب میں شامل ہوں اور اس کے ساتھ ہم سمجھتے ہیں کہ تھوڑا سا کچھ سیرت کے واقعات' کچھ تاریخ اسلام' کچھ اور اشیاء ملا کر ہم نظام تعلیم کو اسلامی بنا لے جائیں گے۔ میرے خیال میں ایسا ہونا بہت مشکل ہے۔ اس کے مفید اثرات ہو سکتے ہیں' لیکن مفید ہونے کے ساتھ ساتھ زیادہ خطرہ یہ ہے کہ یہ بہت مضر ثابت ہوں گے۔ کیونکہ ایک طرف تو نصاب کا اصل مواد ہے' اس کے ساتھ آپ کا یہ پیوند کردہ جزوی اسلامی مواد بہرصورت ٹکرائے گا۔ یہ دونوں جوڑ نہیں کھا سکیں گے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ پورے نظام اور نصاب میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے اصل لوازم کیا ہیں ان کا انتظام ہونا چاہیے۔ اس کے بعد سب کچھ حاصل ہو سکتا ہے جس کو آپ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور بڑی قلیل مدت میں ہو سکتا ہے۔

اگر وقت پر شعور و احساس سے کام نہ لیا گیا اور نظام تعلیم کے پیچیدہ امراض کی تشخیص نہ کی جا سکی تو یہ ایسا دق و سل ہے بلکہ کینسر کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے امکاناتِ علاج ختم ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق دے کہ قوم کو حیاتِ نو سے مالا مال کرنے کے لیے اپنے نظام تعلیم کی درستی کا انقلابی فریضہ ادا کرنے میں محو ہو جائیں' اور جس کے دائرے میں جو فرض آتا ہو وہ اسے جان مار کر ادا کرے۔

تحفظ پاکستان اور عمل تعلیم *

میرا اصل موضوع گفتگو تعلیمی نصاب کا موضوع ہے' مگر میں شروع میں یہ احساس دلانا چاہتا ہوں کہ ہم کن حالات سے گزرتے چلے آ رہے ہیں اور اب کہاں کھڑے ہیں۔ اس گفتگو سے میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ نظام تعلیم کی ذمہ داری کتنی بھاری اور معلم کے حصے میں فرض کا کتنا بوجھ ہے' جسے جہالتوں اور ظالمانہ حالات اور بے ہنگم نظریات و جذبات کے خلاف جنگ لڑنے کے لئے ہم نصاب کا اسلحہ فراہم کرتے ہیں۔

سیاسی غلامی جب رخصت ہوتی ہے تو کسی قوم اور اس کے سیاسی' مذہبی اور تعلیمی لیڈروں کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ جانے والی شہنشاہیت کے زندانوں کو ڈھا کر اور مخالف نظریات اور ثقافتی قدروں کی زنجیریں توڑ کر نئی آزاد زندگی کا نیا راستہ اپنے ملی عقیدوں' اصولوں اور قدروں کے مطابق بنائیں۔ بلکہ صحیح تر الفاظ میں تعمیر نو کے اس کام میں نظام تعلیم پیش روی اور رہبری کا کام کرتا ہے۔

مگر ہماری بدنصیبی کا نقشہ ایسا الٹا بنا ہے کہ ہمارے ہاں تہہ بہ تہہ غلامی کی تاریکیاں پھیلی ہوئی ہیں اور تاریکی کی چٹانوں کے نیچے ہم پس رہے ہیں۔ مگر ہمارا نظام تعلیم اس بدترین غلامی سے نکالنے کے بجائے الٹا غلام سازی کا ایسا کالا جادو ہم پر کر رہا ہے کہ ہم تاریکیوں سے پیار کرتے کرتے مر جائیں گے اور نہ کہیں ہمارا جنازہ اٹھے گا اور نہ مزار بنے گا۔ ہمارا نظام تعلیم ہمارے غلامی کے زخم ہائے دل و جگر کا مرہم بننے کے بجائے الٹا قسائی کا چھرا ثابت ہو رہا ہے اور ہمارے اندر انسانیت' خودی' ایمان اور اخلاق کے پہلو رکھنے والی جو تھوڑی بہت روح باقی ہے اسے گھٹنوں تلے دبا کر اس کی گردن کاٹتا ہے۔ جب ہماری روحیں پوری طرح بے حس و حرکت ہو جاتی ہیں تو یہ نظام تعلیم ہمارے ہاتھوں میں سندیں اور ڈگریاں پکڑا کر اس حقیقت کی

---

* انجمن فاضلین ادارہ تعلیم و تحقیق جامعہ پنجاب لاہور کے زیر اہتمام دو روزہ سیمینار ''تحفظ پاکستان اور عمل تعلیم'' کے دوسرے اجلاس میں خطاب بطور مہمان خصوصی۔ (مجلہ: تعلیمات ستمبر اکتوبر ۱۹۸۸)

تصدیق کرتا ہے کہ یہ فقط زندہ لاشیں ہیں۔ یہاں زندگی کی اہم ترین خدمات کے لئے وہ لاشیں بہترین سمجھی جاتی ہیں اور بہت پسند کی جاتی ہیں جن میں ایمان وخودی اور غیرت وحمیت کی کبھی کوئی خفیف سی جنبش بھی نہ ہو۔

اس لمبی حکایت کا اجمال یہ ہے کہ دنیا کی سپر پاورز کے سائے میں ہمارے ارباب اقتدار' ہمارے جاگیردار' ہمارے لادینیت پسند دانش ور مل جل کر ناقابل شکست جبر وآمریت کی ایک دیوار بنائے ہوئے ہیں جس پر کبھی مارشل لاء کا بورڈ لگ جاتا ہے اور کبھی جمہوریت کا! ان قوتوں کے طفیل مغربی علوم ونظریات کی زنجیریں قوم کو لپٹی ہوئی ہیں۔ ثقافت کی زنجیریں ہیں' عالمی سفارتی چالبازیوں اور پروپیگنڈا کے جادو کی زنجیریں ہیں' قرضوں کی زنجیریں ہیں' بھیک میں مانگ مانگ کر لئے ہوئے اسلحہ کی زنجیریں ہیں' ہماری تعلیم گاہوں پر میکالے کا منحوس آسیبی سایہ بدستور قائم ہے۔ ہماری درآمد وبرآمد کی مارکیٹ پر غیروں کا پورا تسلط ہے۔ کارخانوں' کھیتوں اور نہروں اور کھالوں پر دوسروں کا تسلط ہے۔ بجلی پانی کی شرحوں اور ٹیکس کے نظام پر ان کی مرضی نافذ ہے۔ پھر ستم یہ کہ ہماری اپنی قومی زبان کو پچھاڑ کر اس کے سینے پر دورِ غلامی کے حکمرانوں کی زبان چڑھی بیٹھی ہے اور آج تک ہم اس ظلم کو نہیں روک سکے' ہم اپنے دین کو نافذ نہیں کر سکے' ہم نظام تعلیم کو نہیں بدل سکے' ہم غریبوں کے دکھوں کا مداوا نہیں کر سکے' ہم ملک کو امن وامان اور باہمی اتحاد کے حالات مہیا نہیں کر سکے۔

اب میری گزارش یہ ہے کہ اگر کارپردازان تعلیم یا پاکستان کے اساتذہ یا انجمن فاضلین کے رفقاء سچ مچ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے نئی تعلیمی زندگی شروع کرنا چاہتے ہیں تو چند نکات سامنے رکھئے اور نصاب بناتے اور کورس کی کتب لکھواتے وقت ان کا خیال رکھئے۔

۱۔ آئندہ کے لئے کسی جھجک اور کسی احساس کمتری کے احساس کے بغیر واضح طور پر طے کر لیجئے کہ پاکستان ایک بھاری مسلم اکثریت کا ملک ہے اور آپ مسلمان تعلیمی دانش ور یا معلم ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ تعلیم اور نصاب کو اسلامی عقائد ومقاصد کے مطابق ترتیب دیا جائے۔

۲۔ اس سلسلے میں ملک کے ایک نامور دانش ور نے (جو ایک یونیورسٹی چلانے کی تیاریوں میں ہے) صاف صاف کہا ہے کہ کئی سالوں کی محنتوں اور مطالبوں اور کمیشنوں کا ماحاصل بس اتنا ہے کہ اسلام کے نام پر ایک پیریڈ رکھ دیا گیا ہے۔ ان کے خیال کے

مطابق عیسائی مذہب کی طرح اسلام سے یہ طرز معاملہ سیکولرازم کی اسپرٹ پر مبنی ہے' جس کی وجہ سے لادینیت کا پودا جڑیں پکڑ رہا ہے اور مضبوط ہو رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلامی پروسس اسی وقت ممکن ہو گا جب اول دن سے آخر دن تک اسلام کو نظام تعلیم کا مرکزی تصور' ایک محور' ایک سنٹرل پوائنٹ بنا کر چلیں گے۔

۳۔ مسلم بن کر جینے اور سوچنے اور تعلیمی نظام یا نصاب کی تشکیل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم لوگ اپنے عقیدوں' اپنے اصول و مقاصد' اپنے بزرگوں' اپنی تاریخ' اپنی تہذیب' اپنے قانون' دنیا پر پڑنے والے اپنے اثرات' اور اب ان اثرات کے دھندلا جانے پر مسلمانوں پر پڑنے والے بُرے اثرات سب کا علم رکھتے ہوں اور یہی علم ہم طلبہ میں منتقل کرنے کے لئے نصاب تیار کر سکیں۔

۴۔ ہمارے موجودہ معاشرے میں دلیل کا وقار ختم ہو گیا ہے۔ ہر کوئی دوسروں کی رائے سنے بغیر اپنے خیالات پر ڈٹ کر دوسروں سے لڑائی کرتا رہتا ہے۔ اس طرح کج بحثی' طنز و تضحیک جیسے عناصر بڑھ گئے ہیں اور بے جا حمایت اور بے جا مخالفت کے طوفان اکثر اٹھتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ ذرائع ابلاغ کے ادارے ریفری کا مقام چھوڑ کر جانبداری پر اتر آتے ہیں بلکہ کبھی خود بھی کھیل کے میدان میں اتر کر کبھی بلا سنبھال لیتے ہیں' کبھی گیند۔ اس سے گروہ بندیاں پیدا ہو گئی ہیں' دھڑے بن گئے ہیں اور مکالمے اور ڈائیلاگ اور تبادلۂ خیال کا مقصد فوت ہو گیا ہے۔ بلکہ بات بات پر تشدد بھی نمودار ہوتا ہے۔

تعلیم کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دلیل کو سیاست' مذہب' معاشرت' ذرائع ابلاغ وغیرہ سب میں اہمیت دے۔ دلیل کے احترام کے ساتھ اختلاف کا صحت مند اسلوب بھی سکھانا چاہئے۔ میرے ایک صاحب قلم دوست ہیں' میں ان سے اکثر اختلاف کرتا رہتا ہوں مگر جب اختلافی گفتگو کے لئے جاتا ہوں تو پہلے خوب ہنسی مذاق ہوتا ہے۔ پھر میں ان سے کہتا ہوں کہ میں اختلاف کی بات کرنے آیا ہوں مگر ہم اس کے بعد بھی ویسے ہی دوست رہیں گے جیسے اب ہیں۔

۵۔ علمی ذوق کی بہت بڑی تباہی ہمارے ہاں واقع ہوئی ہے کچھ تو دولت اور معیار زندگی کی مجنونانہ دوڑ' کچھ تفریحات کی کثرت' کچھ نئی ثقافت کے چونچلے' پھر ٹیلی ویژن کا

انسان کو کئی کئی گھنٹے اپنے ساتھ چپکائے رکھنا۔ ان سب چیزوں نے دماغوں میں ایسا انتشار بھر دیا ہے کہ لوگ کہاں اب رومی کے اشعار یا فلک پیما اور مختار کے نثر پاروں پر توجہ کو مرتکز کر سکیں۔

سفر کرتے ہوئے میں نے نہیں دیکھا کہ کوئی شخص اچھے معیار کی کوئی علمی کتاب پڑھ رہا ہو۔ قریب ترین علمی دوستوں میں کبھی کوئی علمی گفتگو نہیں سنی۔ جو سوالات مجھے روزانہ کئی کئی خطوط میں موصول ہوتے ہیں ان میں علمی سطح کی کوئی چیز شاذ ہی ہوتی ہے۔ پھر اہل علم و تحقیق کا احترام جس تیزی سے کم ہو رہا ہے وہ بھی وجہ خرابی ہے۔ اس ذوق کو اگر تازہ نہ کیا گیا تو پاکستان پر ترقی کی راہیں کبھی نہ کھلیں گی۔

۶۔ حصول رزق کا صحیح راستہ محنت ہے جس پر ایک ایک قدم آگے بڑھا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ آدمی کی معاشی زندگی کی تشکیل ہوتی ہے مگر اس دور میں خود نفسیات کے شدید دباؤ' آسائش و آرائش کی نت نئی ایجادات' دولت کی بے پایاں ہوس اور معیار زندگی کی مسابقت نے اکثر لوگوں میں چھلانگ لگا کر اونچے سے اونچے زینے پر پہنچنے کا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ اس کا ذریعہ چاہے رشوت ہو' چاہے چوری اور ڈاکہ' چاہے ضمیر فروشی یا قوم فروشی۔

اچھے نظام تعلیم کا کام ہے کہ وہ محنت سے تدریجی طور پر حاصل کردہ رزق پر صبر و قناعت کرنے اور حدود حلال و حرام کے علاوہ ملکی قوانین و قواعد اور انسانی اقدار کی پابندی اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ آدمی کو یہ احساس ہونا چاہئے کہ اصل چیز میں ہوں' باقی سب چیزیں خادم' سارے سامان کھلونے ہیں ورنہ اگر اشیا بت بن جائیں تو تشدد اور جرائم کو فروغ ملتا ہے۔

۷۔ دنیا میں ایک کردار ہوتا ہے جو دنیا سے ہر وقت زیادہ سے زیادہ لیتا ہے۔ دوسرا وہ جو جتنا لیتا ہے کم سے کم اتنا واپس بھی کرتا ہے اور تیسرا وہ جو لیتا کم سے کم ہے اور لوٹاتا زیادہ سے زیادہ ہے۔ تیسرا کردار اول درجے کا ہے۔ اس کا اصل مشن خدمت ہوتا ہے۔ افراد کی خدمت' گھر کی' جانوروں کی' محلے کی' ملک و قوم کی اور ساری انسانیت کی۔ ہمارے نظام تعلیم اور نصاب کو یہ خوبی لازماً طالب علم کو ودیعت کرنی چاہئے۔

۸۔ آٹھویں چیز شائستگی ہے جو معاشرے سے عنقا ہو رہی ہے۔ آواز ایک خاص حد سے

اونچی نہ نکالی جائے' اپنے گھر کے ہنگاموں سے پڑوسیوں کو اذیت نہ دی جائے' زبان پر کرخت الفاظ نہ لائے جائیں۔ کسی سے کندھا بھی چھو جائے تو معذرت کرنا اور کوئی معافی مانگے تو اسے معاف کر دینا ضروری ہے۔

ان اشارات کے بعد میں عرض کروں گا کہ آپ نصاب میں اپنے بنیادی اصولوں اور مقاصد کو شامل کرنے اور اب تک کے بیان شدہ نکات کا خیال رکھنے کے علاوہ چند اہم چیزوں کو ملحوظ رکھیں۔

۱۔ تاریخ کا مضمون قوموں کی زندگی اور ترقی کے لئے بہت اہم ہوتا ہے اور یہ وہ مضمون ہے جس کے زریں قطعات خود قرآن اور حدیث میں موجود ہیں اور بتایا گیا ہے کہ تاریخ میں بھی سنت اللہ یا قوانین الٰہی کام کرتے ہیں اور خیر و شر کی دو قوتیں آپس میں ٹکراتی رہتی ہیں۔ بدقسمتی سے ہم تاریخ نگاری میں پسپا ہو گئے' ہماری تاریخ دوسروں نے لکھی' دشمنوں نے لکھی اور ہمارے ملی چہرے کو' تہذیبی خدو خال کو جس طرح چاہا بگاڑا۔ پاکستان بننے کے بعد دو چار کتابوں سے زیادہ مجھے تاریخ کے موضوع پر اہم کتابیں نظر نہیں آئیں۔ اس میں نظام تعلیم کی کوتاہی کو دخل ہے۔ اس نے تاریخ کو غیر اہم موضوع قرار دے دیا' اور کورسز[1] میں سرسری انداز سے کچھ باتیں آئیں۔ وہ بھی اس انداز سے کہ تاریخ کے طلبہ و طالبات کی نگاہوں میں ایک خشک اور مشکل موضوع بن گیا اور نئی نسل اس سے کنی کاٹنے لگی۔ اس کوتاہی کی تلافی اب ہونی چاہئے۔

۲۔ معاشرے کے وہ تمام مسائل جن کا تعلق بے مقصد رسموں اور رائج شدہ غلط مشاغل سے ہے ان کو مدنظر رکھا جائے۔ وہ تمام دینی ذمہ داریاں جو عملاً پیش آتی ہیں ان کے بارے میں صحیح معلومات و مقاصد واضح ہونے چاہئیں۔ روزمرہ زندگی میں بچے کو جو ادارات اور عمارتیں دیکھنے کا موقع ملتا ہے اور جن عبادات اور صدقات وغیرہ

---

[1] خصوصاً معاشرتی علوم (اور اس اصطلاح کے معنی چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے سمجھنا ممکن نہیں) میں بہت سی متفرق معلومات کی ایک غیر متوازن سی کھچڑی بن گئی ہے۔ اس موضوع کو پھر چھانٹا پرکھا جائے۔ اور تاریخ کو صحیح اہمیت معاشرتی علوم میں بھی اور انگریزی اور اردو کے لسانی و ادبی نصاب میں بھی دی جائے۔

کے سلسلے اس کے سامنے ہوتے ہیں ان سے اسے آگاہ رکھا جائے۔ معاشرے میں مغربی اثرات سے جو روحانی' اخلاقی خرابیاں واقع ہوئی ہیں ان کی ایک جھلک دکھاتے ہوئے ان کا مقابلہ کرنے اور اسلامی قدروں کو غالب کرنے کا درس ان کو دیا جائے۔

۳۔ جن لکھنے والوں کی تحریریں یا اقتباس لئے جائیں ان کی جانچ پرکھ اس انداز سے ہونی چاہئے کہ یہ مسلم زاویہ نگاہ سے بات پیش کرنے والے ہیں۔ اگر کسی اور طبع کے آدمی کی کوئی چیز اپنانی پڑے تو مختصراً اس کا تعارف کرا دیا جائے بغیر اس کے کہ اس پر کوئی حملہ ہو۔ بس یہ سمجھ لینا چاہئے کہ نصاب کوئی پارلیمنٹ نہیں ہے جہاں سب کی نمائندگی ضروری ہو بلکہ صرف ان تحریروں کو اس میں شامل کیا جائے جو صحیح اسلامی اساس پر قائم ہوں یا اس سے منحرف نہ ہوں۔

۴۔ ہر مضمون اور درجے کی نصابی کتاب کے لئے مواد تجویز کرتے ہوئے اور خطوط ترتیب معین کرتے ہوئے تمام اسباق کے متعلق ہدایات مرتب کر دینی چاہئیں کہ کس موضوع میں کیا کیا نہیں آنا چاہئے اور کن امور میں احتیاط ضروری ہے۔

۵۔ نصاب کی تیاری' درسی کتب کی تدوین اور بعد ازاں ان کے مطابق تعلیم کا مرحلہ ایسے اساتذہ کے ذریعے طے ہونا چاہئے جن کو ان مقاصد کے لئے تربیت دی گئی ہو اور انہیں اصولوں اور مقاصد کا پورا شعور ہونا چاہئے ورنہ محض کاروباری طریق سے ناشرین نے کتابیں لکھوائیں اور ملازمانہ حیثیت سے پڑھائی گئیں تو مقصد غارت ہو جائے گا۔

اسلامی تشکیل تعلیم *

(ذیل کا سوال نامہ جناب اشفاق احمد صاحب ڈائریکٹر اردو سائنس بورڈ کے مراسلاتی خط کے ساتھ موصول ہوا اور اصرار تھا ضرور اور جلد جواب دیا جائے۔)

سوال نامہ کمیشن برائے اسلامی تشکیل تعلیم:

مکرمی و محترمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

نفاذ شریعت آرڈی ننس ۱۹۸۸ء کے تحت نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل کے لئے ایک مستقل کمیشن قائم ہو چکا ہے اور یکم اگست ۱۹۸۸ء سے اپنے کام میں مشغول ہے۔

ابتدائی غور و خوض کے بعد منجملہ دیگر مسائل کے مندرجہ ذیل نکات خاص طور پر زیر بحث آئے ہیں:

۱۔ اسلامی شعائر و اقدار اور نظریہ پاکستان کا تحفظ۔

۲۔ تعلیمی نظام میں اسلامی اخوت و مساوات کے اصول کا عملی نفاذ اور ملک میں رائج مختلف اور متعدد نظام ہائے تعلیم کا جواز یا عدم جواز۔

۳۔ نصابات اور نصابی کتابوں کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا۔

۴۔ معیار تعلیم کی بلندی۔

۵۔ دینی مدارس میں معاشرتی و سائنسی علوم کو شامل نصاب کرنے کی ضرورت۔

۶۔ اسلامی نظام تعلیم میں طلباء اور اساتذہ کی تنظیموں کا جواز۔

ان نکات کے علاوہ کسی مزید پہلو کی نشاندہی فرما سکیں تو اسے بھی زیر غور لایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کی رائے اور عملی تجاویز ہمارے کام میں مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

---

* ماہنامہ ترجمان القرآن' دسمبر ۱۹۸۸ء

میں ممنون ہوں گا اگر آپ اس خط کے جواب میں توقف نہ فرمائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ ۱۵/ اکتوبر ۱۹۸۸ء تک ہمیں آپ کا جواب موصول ہو جائے۔

فقط مخلص

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی

(صدر نشین کمیشن)

سوالنامے کے جوابات

محترمی و مکرمی ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی صاحب! صدر نشین کمیشن برائے اسلامی تشکیل جدید السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ جیسے مخلص بزرگ کی طرف سے میرے نام سوالنامہ تعلیمی کا اجرا عزت افزائی ہے۔ شکریہ عرض کرتا ہوں۔

سوال نامے کے جوابات سے پہلے کچھ تمہیدی گزارشات!

جب سے پاکستان بنا ہے' اسلامی تعلیم' اسلامی قانون' اسلامی اقتصادیات اور دوسرے ضمنی مباحث کے متعلق بارہا سوالنامے جاری ہوئے اور بارہا دل لگا کر جواب لکھے مگر پرنالہ وہیں رہا۔ اب آپ نے پکارا تو کثیر ارباب علم وفضل اور اصحاب تجربہ وعہدہ کے ساتھ میں بھی اپنی طالب علمانہ اور درویشانہ استعداد کے ساتھ حاضر ہوں۔

جو کام ہمارا ہے وہ ہم کرتے رہیں گے

دوسری پیچیدگی یہ سامنے ہے کہ بگڑی ہوئی جمہوریتوں کے ہاتھوں لحاظ داریوں اور ووٹر نوازیوں کی وجہ سے بہت سے ایسے کارنامے نمودار ہوتے رہتے ہیں کہ جب مارشل لا وارد ہو جاتا ہے تو وہ ان کارناموں کے ساتھ بعض اچھی چیزوں کا بھی صفایا کر دیتا ہے۔ اسی طرح مارشل لاء کے دور میں جو بھی برے اور اچھے کام ہوتے ہیں جمہوریت ان پر جھاڑو پھیر دیتی ہے۔ آپ کا کمیشن جمہوری دور سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر صدر پاکستان مرحوم کی طرف سے اسمبلیاں برطرف کر دینے کے بعد بذریعہ آرڈی ننس قائم ہوا ہے۔ کچھ معلوم نہیں کہ آنے والی منتخب پارلیمنٹ اس کے ساتھ اور اس کی خدمات کے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔

خیر یہ سب کچھ اللہ کے سپرد' کمیشن اچھے مقصد کے لئے قائم ہوا ہے اور آپ کی صدارت میں جو خطوط کاوش اس کی طرف سے سامنے آئے ہیں وہ مبارک ہیں۔ لہٰذا آپ

سے تعاون کرنا ضروری ہے۔

سوال نمبر (۱)

میں اس سوال کی تائید کرتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ملت پاکستان کا نظام تعلیم طے کرنے سے پہلے ایک سوال انتہائی اہم ہے اور اس کا دوٹوک جواب اول تو ہمارے سامنے پہلے دن سے ہونا چاہئے تھا ورنہ کم سے کم آج تو مسئلہ تعلیم (و دیگر مسائل) پر سوچنے سے پہلے اسے طے کر لینا چاہیے۔

افسوس ہے کہ یہ سادہ سا سوال نہ تو اس وقت طے ہو سکا جب ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ'' کے نعروں سے فضائیں لرز رہی تھیں۔ پھر یہ اس وقت بھی ایک فیصلے تک نہ پہنچا جب کہ دستور یہ نے قرارداد مقاصد پاس کی' گزشتہ مارشل لا دور میں اسلامائزیشن کے سلسلۂ عمل کے درمیان بھی یہ موقع پیدا نہ ہوا کہ ہمارا مسئلہ نمبر ون حل ہو جائے۔ اب آپ کے سوال نامے نے میری توجہ پھر اس کی طرف مبذول کر دی ہے۔

بنیادی طور پر زندگی کے دو ٹائپ ہیں ایک ملحدانہ اور مادہ پرستانہ' دوسرا خدا پرستانہ اور اخلاق پسندانہ۔ سوال یہ ہے کہ ہمیں کیسے انسان بنانا مطلوب ہے اور ان کے ذریعے کیسا معاشرہ تیار کرنا اور کیسا نظام اجتماعی چلانا ہے۔ ہم کس طرز کی تہذیب اضطراب زدہ انسانیت کے سامنے پاکستان کے ذریعے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم مسلمان افراد' مسلمان معاشرہ' اسلامی عدل اجتماعی اور اسلامی تہذیب کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو اس فیصلے کی مدد سے نظام تعلیم کا ڈھانچہ اور اس کی روح اور اس کی ساری ضروریات حاصل ہو سکتی ہیں' اور ہر مشکل کا حل نکل سکتا ہے۔

سوال نامے کے الفاظ ''اسلامی شعائر و اقدار اور نظریۂ پاکستان'' کے الفاظ میں یقیناً اصل مدعا موجود ہے۔ لیکن اس طرح کے خوبصورت الفاظ مریضان گریز کو اس بات کا موقع دیتے ہیں کہ وہ کچھ لفظوں سے کام چلائیں مگر اصل مقصد کو سر نہ اٹھانے دیں۔ الفاظ و اصطلاحات کے اسی کھیل نے ہمارے چالیس برس برباد کر دیئے۔ طرح طرح کے تجربے' بار بار بدلتے نصاب اور نصابی کتابیں اور نتیجہ انتشار اور ایک لایعنی پن' جو ہر طرف طاری ہے۔

میرا خیال ہے کہ بات ذرا کھلے الفاظ میں اور صاف اسلوب سے کہنی چاہئے۔

سوال نمبر (۲)

اس سوال کا جواب ''مسائل تعلیم'' کے تحت بعنوان ''طبقاتی نظام تعلیم'' درج کیا گیا ہے۔ (ادارہ)

سوال نمبر (۳)

نصابات اور نصابی کتابوں کے متعلق پہلے کئی بار اہل علم کے مشوروں اور ماہرین تعلیم کی آرا کی روشنی میں نقشہ ہائے کار بنے۔ ان کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ نیز بڑی بڑی عالمی' اسلامی اور دینی یونیورسٹیوں اور ان کے ماتحت تعلیمی بورڈوں سے نصابات حاصل کر کے ان کا جائزہ لیا جائے۔

نصاب مرتب کرتے ہوئے ہر سطح کے لحاظ سے دو باتیں طے کرنی ہوں گی۔

ایک یہ کہ آج تک کے فلسفوں' علوم انسانی اور علوم تجربی کے فراہم کردہ سرمایۂ دانش سے کیا کیا کچھ درجہ بدرجہ لینا ہے۔

دوسرے یہ کہ ان علوم پر نوجوانان پاکستان کی خودی اور ان کے ایمان کی گرفت کو مضبوط رکھنے کے لئے عقاید' افکار' احکام اور علمی و اجتہادی کاموں' نیز اپنی مادی اور تجربی ترقیات سے کتنا کچھ شامل کرنا ہے۔

یہ نازک کام اس طرح ہونا چاہئے کہ دو الگ الگ علمی دھارے نوجوانوں کے ذہنوں میں نہ بہنے لگیں۔ ایک دینی اور ایک دنیوی (یا لادینی) اور اس طرح بھی نہیں ہونا چاہئے کہ دونوں علوم یعنی ایک الہامی علم ہدایت اور دوسرے قیاسی' حواسی اور تجرباتی علم کو آپس میں ٹکرا دیا جائے۔ اور مستقلاً ہر ذہن میں ایک الجھاؤ پیدا کر دیا جائے۔ یا ایسے الگ الگ گروہ اٹھ کھڑے ہوں جو برسر کشمکش رہیں' مگر اسلام ہی کے برتر مقاصد کے لئے تعاون نہ کر سکیں۔

اب ہمیں الگ الگ طالب علموں کے گروہ جمع کر کے کسی کو مذہبی عالم اور کسی کو سائنس دان اور ڈاکٹر اور انجینئر بنانے کا طریقہ ترک کر دینا چاہئے (ہو سکتا ہے کہ اس نقشہ کے ادل بدل میں چند سال لگ جائیں کیونکہ دو طرفہ ذہنوں اور ان کی قیادتوں میں اعتماد ہو جانا چاہئے)۔ ہم چاہتے ہیں کہ مسلمان مفسر اور مسلمان قانون دان اور مسلمان قاضی کی طرح مسلمان ڈاکٹر اور مسلمان انجینئر اور مسلمان ماہرین جوہری توانائی اور مسلمان کمپیوٹر ایکسپرٹ یا

مسلمان خلا باز ہم ایک ہی نظام تعلیم سے حاصل کریں۔ یہ سب لوگ ایک ہی خدا پرستانہ اخلاقی اسپرٹ اور فلاح انسانیت کے ایک ہی نصب العین سے سرشار ہوں۔ شاید یہ وحدانی سسٹم تشکیل پانے میں کچھ وقت لے گا۔

جہاں تک نصابی کتابوں کا تعلق ہے' اس تصور کے ساتھ تیار کی جائیں کہ ہمیں خدا کی زمین پر' خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے' اس کے تفویض کردہ فرائض کو' اس کی ہدایات کے مطابق ایک امتحان کی طرح انجام دینا ہے۔ یہ پس منظر جس بھی مضمون کے ساتھ' ادنیٰ یا اعلیٰ درجوں میں کام کرے گا اس مضمون میں روح پیدا ہو جائے گی۔ ایک رکشہ چلانے والا' ایک مزدور' میزائیل چھوڑنے والا ایک فوجی' معلومات کے نئے نئے شکار کرنے والا ایک خلانورد یہ جذبہ رکھے گا کہ میں اللہ تعالیٰ کی مرضی پوری کر رہا ہوں لہٰذا یہ مقام عبادت ہے۔

ہمیں چاہئے کہ ہر مضمون کے لئے پہلے موجود اور مروج کتابوں پر نظر ڈالیں۔ مثلاً نفسیات کے بارے میں آپ ولیم جیمز' فرائیڈ' ینگ' ایڈلر' برٹرینڈ رسل وغیرہ بے شمار مفکرین کی کتابیں (اور ان کے ضروری حصے یا خلاصے) سامنے رکھیں۔ ادھر سے آپ نفسیاتی احوال کے متعلق قرآن کی آیات (مع مختلف مفسرین کی تفسیروں کے مباحث کے) حضورؐ پاک کی خاص خاص احادیث (اور ان کی شروح) کو سامنے رکھیں۔ پھر مولف اخلاق جلالی اور تصانیف امام غزالی و دیگر علمی و تحقیقی تصانیف کو سامنے رکھیں' علاوہ ازیں دور حاضر میں جن مسلم اہل فکر نے مغربی نفسیات پر تنقید کرتے ہوئے اسلامی نقطہ نظر سے کوئی کتاب یا مقالہ لکھا ہو وہ بھی جمع کر لیں۔ پھر آپ کے نظام تعلیم کے لئے نصابی کتابیں لکھنے والے ان دو طرفہ معلومات کو اس طرح جمع کریں کہ اسلامی حکمت نفسیات غالب رہے۔ مثلاً جدید نفسیات ہمیں ہر طرف سے گھیر گھار کر نفسیاتی جبریت کے کلیہ تک لے آتی ہے' جس میں انسان جکڑا ہوا ہے۔ مگر اسلامی نفسیات یہ بتاتی ہے کہ نفس میں کام کرنے والی قوتوں کے تانے بانے کو توڑ کر جب چاہے انسان خودی اور قوت ارادی کے زور سے آزاد ہو سکتا ہے' ہاں اگر وہ اس حالت پر راضی ہو کر (تن بہ تقدیر) پڑا رہے تو پھر نفسیاتی قوتیں مختلف قسم کے جالے...... مثلاً عادت کا جالا' اس کے گرد لپیٹتی رہتی ہے۔ اس کے باوجود اسلامی تصور یہ ہے کہ انسان کی خودی انتہائی زبردست چیز ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کی قوت ارادی اور قوت فیصلہ جب ایک بار اگ آتی ہے تو پھر اگر اس کے اوپر سل بھی رکھی ہو تو وہ سل کو بھی چیر کر باہر آ جاتی ہے۔

اس طرح تمام علوم میں کوشش کی جاسکتی ہے۔

ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ بڑی کلاسوں میں بعض موضوعات پر منتخب تصنیف شدہ معیاری کتابیں اور بعض صورتوں میں قومیت' اقتصادیات' بنکنگ بلا سود' اسلامی قانون وغیرہ کے متعلق ملک بھر کے اچھے اچھے مقالات کے مجموعے مرتب کر لئے جائیں۔ عالم اسلام کے دوسرے لوگوں کی کاوشوں کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔

کچھ پہلو ایسے ہوں گے اور مسائل آئیں گے جن کے لئے استاد یا لیکچرر کو بطور خود لیکچر یا سبق تیار کرنا ہوگا

اس قسم کے عبوری تجرباتی دور کے بعد مستقل نصابی کتابیں ہر سطح پر اور ہر علم کے لئے فراہم ہو جائیں گی۔ اس کے لئے ملک بھر کے مفکرین و مصنفین کو اچھے معاوضوں پر مقرر کردہ مقاصد اور خاکوں کے مطابق کتابیں لکھنے کے لئے تیار کیا جاسکتا ہے۔

سوال نمبر (۴)

دراصل یہ سوال کیا' سارا ہی سوال نامہ ایک کتاب لکھنے کا متقاضی ہے اور مختصر بھی لکھا جائے تو سوچنے کے لئے خاصا وقت چاہئے۔ اس سوال کے تحت میں صرف پانچ چیزوں کا ذکر کروں گا۔

۱۔ درس گاہ اور گھر کا رابطہ: استاد جو کچھ بچوں کو یا بڑے طالب علموں کو سکھانا چاہتا ہو' علمی سطح پر یا اخلاقی و سماجی سطح پر' اس سے وہ متعلقہ گھروں کو آگاہ رکھے کہ وہ اپنے ماحول کو اسکے تعلیمی پروگرام سے ہم آہنگ رکھیں اور گھر کا ادارہ کوئی تضادات اور مزاحمتیں نہ رکھتا ہو'

۲۔ ملک کے ذرائع ابلاغ جو پورے معاشرے میں ایک خاص طرز فکر' ایک خاص معاشرتی معیار اور ایک خاص تہذیب و ثقافت پھیلا رہے ہوتے ہیں' ان کو حکومت تعلیم کی اسکیم سے ہم آہنگی اختیار کرنے کا پابند کرے۔ طلبہ اور نوجوانوں کے لئے جو نظریہ' نصب العین اور اخلاقی قدریں اور خدمت انسانیت کے مقاصد قومی تعلیم کے لئے طے کئے گئے ہیں ان سے کوئی ادارہ انحراف نہ کرے اور ان سے ٹکراؤ پیدا کرنے والا مواد نہ لائے۔

۳۔ استاد کو تعلیمی ترقی کا اصل ضامن قرار دے کر اسے پوری پوری اہمیت دی جائے۔ اس پیشے میں آنے والوں کی صرف تعلیمی استعداد ہی کو نہ دیکھا جائے بلکہ ان کے خاندانی ماحول کی چھان بین کی جائے کہ آیا پہلے سے وہ فروغ علم اور خدمت انسانیت کے ماحول سے متعلق چلے آ رہے ہیں یا نہیں۔ ان کے معیار اخلاق و شائستگی کا اندازہ لگایا جائے۔ پھر ان کو بہت اعلیٰ درجے کی تربیت دی جائے اور معاشرے میں ان کو اعلیٰ مقام اعتبار دیا جائے۔ نفسیاتی طور پر ان کو حلیم اور محبت کیش اور مدبر ہونا چاہیئے۔

اساتذہ کے اجلاس' اساتذہ کے سیمینار' اساتذہ کے ریفریشر کورسز صرف اس مقصد کے لئے ہوں کہ توسیع تعلیم کے ساتھ ساتھ معیار تعلیم اور مقصد تعلیم کا حصول کیسے ہو' اور مختلف مدارج اور مختلف مضامین سے متعلق اساتذہ اپنی ذمہ داریاں کیسے پوری کریں۔

ہر سال دو سال بعد وہ خاص تعلیمی امتحانات اسی طرح پاس کریں جیسے فوج کے سپاہی اور افسران درجہ بدرجہ پاس کرتے اور آگے بڑھتے رہتے ہیں۔[1]

۴۔ امتحانات سمسٹر سسٹم کے تحت ہی لئے جائیں' البتہ اس سسٹم کے کمزور رخنوں کو بند کر دیا جائے۔

۵۔ تعلیمی ترقی کی رفتار بڑھانے اور اخلاق سدھارنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ مخلوط تعلیم کا قطعی اور فوری انسداد کر دیا جائے۔

سوال نمبر (۵)

میرا خیال ہے کہ اس سوال کا جواب نمبر ۳ کے جواب میں آ گیا ہے۔

سوال نمبر (۶)

فوری رائے قائم کرتے ہوئے اچھے اچھے مفکرین تک یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تعلیم گاہوں میں اساتذہ یا طلبہ کی تنظیمیں نہ ہونی چاہئیں۔ بلکہ بہت سی خرابیوں کا علاج ہی اس کو سمجھتے ہیں کہ اساتذہ کی تنظیمیں اور طلبہ کی یونینیں نہ رہیں۔ حالانکہ اس منفی تجربے کا نتیجہ بدتر نکلا ہے۔ مگر نتائج کا کبھی کسی وزیر یا ماہر تعلیم نے اندازہ ہی نہیں لگایا۔

---

[1] اس طریقے سے ان کو جدید ترین معلومات و تجربات سے آگاہ رکھا جائے۔

یہ فارمولا اگر درست ہوتا تو ملک کے تمام شعبوں کو یونینوں اور تنظیموں اور تحریکوں سے خالی کر دینا چاہئے تھا۔

قابل غور بات یہ ہے کہ جس معاشرے کی ساخت یہ ہو کہ کچھ لوگ دوسروں کے حقوق چھینتے ہوں اور کچھ دوسرے مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے حقوق کے لئے آواز اٹھائیں' وہاں تنظیموں کو آپ کیسے روک سکتے ہیں جو آواز اٹھانے کا ذریعہ ہیں اور جن کے ذریعے کسی اقدام کے حق میں یا اس کے خلاف اندازہ ہوتا ہے کہ کتنی قوت ادھر پائی جاتی ہے۔

جہاں رشوتیں اور سفارشیں اور جانب داریاں بڑھ گئی ہوں اور اس کی وجہ سے استادوں اور طالب علموں میں سے کچھ کو ناجائز فائدہ پہنچایا جائے اور کچھ کو بے جا تکلیف میں ڈالا جائے وہاں اگر تنظیمی قوت کو ضبط و نظم کے ساتھ کوئی اخلاقی مطالبہ نہ کرنے دیں گے یا رد کر دیں گے تو چاہے آپ تنظیم کو توڑ دیں فضا کو پرسکون اور پرامن نہیں بنا سکتے۔

پھر دوسرا بھاری قضیہ نظریاتی رابطوں اور ان کی وجہ سے تعصباتی حمایتوں اور مخالفتوں کا ہے۔ اس قضیے میں یونیورسٹی کے حکام' پروفیسر اور طلبا سب کسی نہ کسی حد تک شریک ہوتے ہیں پھر اس معاملے میں زیادہ غور طلب حقیقت یہ ہے کہ بائیں بازو کی قوتیں بہت پہلے سے زندگی کے ہر دائرے میں ــــ ٹیلی ویژن' ریڈیو' اخبارات' محکمہ جاتی دفتروں اور درسگاہوں میں ــــ اپنے آدمیوں یا حامیوں کو منظم کر کے ان کی سرپرستی کرتی چلی آ رہی ہیں جب تک یہ یک طرفہ عمل جاری تھا اور ان کا واسطہ زیادہ سے زیادہ لادینی قسم کی یا زیادہ سے زیادہ قوم پرستانہ تنظیموں سے تھا تو امن تھا اور یونین ازم کے خلاف کبھی کوئی آواز نہیں اٹھی۔ لیکن جونہی یک طرفہ جارحیت کے خلاف اسلام پسند طلبہ اسلامی نظام تعلیم کی آواز کو لے کر میدان میں آئے معاملہ بگڑ گیا۔

اس کا صحیح علاج یہ ہے کہ اگر حکومت غیر جانب دار رہنے کا فیصلہ کرے اور یونیورسٹی کے حکام ناجائز حمایتیں اور مخالفتیں چھوڑ دیں تو پوری محنت اس ماحول کو پیدا کرنے میں صرف کی جائے کہ اختلافات کے معاملہ میں کیا رویہ ہونا چاہئے۔ استاد اس رویئے کا عملی مظاہرہ کریں اور طلبہ سے اس پر عمل کرائیں۔

اب تنظیموں کے دائرہ کار کو لیجئے۔ کوئی تنظیم اگر اسلامی تعلیمات کو پھیلاتی ہے یا نئے طلبہ کو مدد دیتی ہے یا درسگاہوں کو رقص و سرود کی اخلاق سوز سرگرمیوں سے پاک رکھنے کا

مطالبہ کرتی ہے' یا ملکی ماحول کے اخلاقی بگاڑ کے خلاف غیر سیاسی طور پر آواز اٹھاتی ہے تو ایسا کرنا جائز ہی نہیں بہت ضروری ہے۔ اسی طرح انتخابات کے زمانے میں اس کے ارکان ووٹ دے سکتے ہیں۔ کسی بھی شخص یا جماعت کی حمایت یا مخالفت کر سکتے ہیں۔ بس اس سے زیادہ سیاسیات ملکی میں ان کا کوئی کام نہیں۔ رہا دین کی دعوت اور تعلیم کو پھیلانے کا کام سواسے وہ اپنے معاشرے میں کھلم کھلا کر سکتے ہیں اور دینی لحاظ سے جن بھی افراد یا جماعتوں سے چاہیں استفادہ اور رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

اسی طرح اساتذہ کی ایسی تنظیمیں جو اسلامی فلسفہ تعلیم' مسلم ماہرین تعلیم کے افکار اور تعلیمی مباحث و مسائل پر رہنمائی مہیا کرتی ہوں' اساتذہ اور طلبہ کو اسلامی نظریہ تعلیم کے تحت رہنمائی دیتی ہوں' وہ تو بہت بڑا اثاثہ ہیں۔ ناجائز یہ بھی نہیں کہ کسی استاد کی بے جا حمایت و مخالفت کے متعلق یا طلبہ پر ہونے والی کسی زیادتی کے متعلق یا تعلیمی پالیسی کی کسی حکومت کی غلطی کی طرف یا استادوں کے حقوق کی طرف وہ توجہ دلائیں۔

جہاں جمہوری نظام ہوگا وہاں یونینیں اور تنظیمیں تو ہر شعبے میں ہوں گی۔ ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ انہیں اسلامی فکر و اخلاق کے چینل میں رہنے پر آمادہ کریں۔

یقین جانئے کہ اسلامی نظام تعلیم کم سے کم تعلیمی ایڈمنسٹریشن میں اپنی نشوونما کے لئے دیانت اور شرافت کا جو رنگ چاہتا ہے' وہ اگر پیدا کر لیا جائے تو پھر تعلیم گاہوں میں کوئی تصادم باقی نہیں رہ سکتا۔ یہ رنگ جب پھیلے گا تو استادوں اور طلبہ سب کی روحوں پر چھا جائے گا اور یہ کام نہ ہو سکے تو آپ یونینیں توڑیں یا بنوائیں' کبھی پرسکون تعلیمی ماحول پیدا نہ ہوگا اور نہ اسلامی نظام تعلیم کی نشوونما ہو سکے گی۔

پس میں ان گزارشات کے ساتھ اپنی معروضات کو ختم کرتا ہوں اور معذرت چاہتا ہوں کہ بات مجمل نہ رہ سکی۔

پاکستان کے لئے ابتدائی تعلیم کا خاکہ *

گزشتہ ماہ میں چند ایسے اصحاب سے ملاقات ہوئی جن کے ذریعہ صوبہ مغربی پنجاب میں نافذ ہونے والے نصاب دینیات سے مجملاً تعارف ہوا۔ اگر حکومت کی طرف سے خاکہ نصاب مطبوعہ شکل میں مل سکتا تو ہم بالتفصیل اس پر اظہار خیال کر سکتے۔ لیکن اس وقت جو چند اشارات سامنے ہیں ان پر مجملاً گفتگو کرنا ہی ممکن ہے۔

زیر غور نصاب دینیات کے متعلق قیاس یہ ہے کہ وہ حسب ذیل صفات کے ساتھ سامنے آئے گا:

1. تعلیم و تربیت کا اصل جوہر نماز مترجم' قرآن ناظرہ اور ادعیہ واذکار کی قسم کی چیزیں ہوں گی۔
2. دین کو ایک نظام حیات کی حیثیت سے پیش نہیں کیا جائے گا بلکہ انفرادی مذہب کے طور پر اس کا تعارف کرایا جائے گا۔
3. جہاد وغیرہ کا موضوع نصاب سے بالکل خارج رکھا جائے گا۔
4. اخلاقیات اسلام کو بہ حیثیت ایک سسٹم کے نہیں بلکہ ان کے بعض اجزاء کو منتشر طور پر سامنے لایا جائے گا۔
5. اس امر کا شاید کوئی اہتمام نہ ہوگا کہ دین کی اہم اصطلاحات کا مفہوم آٹھ سال کی تعلیم میں طلبا کو معلوم ہو سکے' یہاں تک کہ اسلام' کفر' نفاق' شرک' فسق وغیرہ کا فرق بھی شاید ہی اس نصاب میں واضح ہو۔
6. یہ التزام بھی خارج از بحث ہوگا کہ دینیات کی تعلیم سے دوسرے تعلیمی مضامین کے جو اجزاء متصادم ہوتے ہوں ان کو دینیات کے ڈھب پر بدل دیا جائے۔

دراصل یہ اشارات کوئی خاص انکشاف نہیں ہیں جس طرز پر دین کے موضوع پر

* یہ مضمون پچاس کے عشرے میں لکھا گیا تھا۔

ہمارے ارباب تعلیمات غور کرنے کے عادی ہیں اس کے پیش نظر ہر بالغ آدمی آنیوالے نصاب دینیات کے متعلق کامیاب پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ اگر واقعتہً کوئی نصاب دینیات مذکورہ بالا امور کی روشنی میں مرتب کیا گیا تو اس کے متعلق ہماری رائے یہ ہے کہ وہ مقصد کے لحاظ سے بالکل ناکارہ ہوگا۔ اس طرح کا کوئی خاکہ اگر زیر غور ہے تو وہ یقیناً تعلیم دینیات کی ان مروجہ کتب سے بھی ہمیں پیچھے لے جاتا ہے جو اپنے اندر بہت سی کوتاہیاں رکھتی ہیں۔ ایسے کسی خاکے پر بنے ہوئے نصاب کے تحت تعلیم حاصل کرنے والا طالب علم آٹھ سال کے بعد اپنے دماغ میں اسلام کے متعلق نہایت گھٹیا تصورات لے کر زندگی کی جنگاہ افکار میں آئے گا۔ اس جنگاہ میں وہ جمہوریت اور اشتراکیت کو تو بہ حیثیت نظام زندگی کے مرتب شکل میں دیکھے گا۔ لیکن ان کے مقابلہ میں اس کے پاس جو اسلام ہوگا وہ پوجا کے چند رسوم اور دعاؤں اور جاپوں کے چند منتشر قواعد اور اخلاقیات کے چند بے ربط اصولوں کے سوا اور کچھ نہ ہوگا پس بہ حیثیت مسلم کے اس کا شکست کھا جانا یقینی ہے بلکہ دینیات کی ایسی گھٹیا تعلیم کے ساتھ جب اس کو سائنس اور فلسفہ' نفسیات اور طبعیات' سیات اور معاشیات کو غیر دینی مضامین کی حیثیت سے پورے دلائل کے ساتھ پڑھایا جائے گا تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ ہی نہیں ہوگا کہ وہ اسکول اور کالج سے کھلا ملحد یا کم از کم اسلام کے متعلق مشکک ہو کر نکلے۔ پھر یہ مسئلہ بھی قابل غور ہے کہ اگر پاکستان کو اسلامی نظام کا قیام عمل میں لانا ہے اور اسے اسکولوں اور کالجوں میں اس نظام کے لئے کارکنوں کی تربیت کرنی ہے تو اس مقصد کے لئے اس طرح کا نصاب بالکل بے کار بلکہ بہت نقصان دہ ہے۔ ایسی تعلیم دینیات تو اس حکومت کے اختیار کرنے کی چیز ہے جو بہ ظاہر دین کی سرپرست بن کر دین کو ختم کرنا چاہتی ہو۔ مذکورہ بالا خاکے کے مطابق تعلیم دینیات دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے نوجوان طلبا اس کے خلاف بغاوت کریں گے اور شاید چند سال بعد اس شئے زائد کو ختم کرانے کے لئے وہ خود ایجی ٹیشن کرتے نظر آئیں۔

پاکستان میں اسلامیات کی تعلیم کے متعلق حسب ذیل اشارات قابل لحاظ ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے علماء دین اور ماہرین تعلیم ان پر غور فرمائیں' اور تعلیم دینیات کا وہ ڈھنگ اختیار کریں جو مفید نتائج دے سکے۔

اشارہ اوّل

تعلیم کے پورے سسٹم میں کسی پہلو سے بھی کوئی تغیر پیدا کرنے سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ہمارا قومی اور ریاستی نصب العین (Goal) کیا ہے؟ ہمیں کیسا نظام یہاں چلانا ہے اور اس کے لئے کیسا ماحول اور کیسے کارکن مطلوب ہیں؟ نصب العین کی منزل جب متعین ہو جائے گی تو قافلۂ تعلیمات کے لئے صحیح سمت سفر متعین کرنا ممکن ہو جائے گا۔ یہ ایک عجیب حرکت ہے کہ دستوری نصب العین کا تصفیہ معرض التوا میں پڑا ہوا ہے اور نظام تعلیم میں تغیرات پہلے سے رونما کئے جا رہے ہیں۔

اگر پاکستان کا دستوری نصب العین نظام اسلامی کا احیاء و فروغ قرار دیا جائے تو پھر تعلیم کی ذمہ داریاں متعین ہو جاتی ہیں کہ اسے بہترین قسم کے مسلمان پیدا کر کے دینے ہیں جو فکری حیثیت سے بھی مسلم ہوں اور عملی حیثیت سے بھی مسلم ہوں۔ اسے اسلامی نظام کے لئے صدر، وزیراعظم اور مجلس شوریٰ اور گورنر اور دوسرے کارکن اور شہری مہیا کرنے ہیں۔ اس نصب العین کا مطالبہ یہ ہو گا کہ اسلام فکر و عمل کے جتنے تقاضے رکھتا ہے وہ سارے کے سارے پاکستان کے طلبا کے سامنے آنے چاہئیں۔ ان سے جو چیز بھی متصادم ہوتی ہو اسے اگر معلومات کی توسیع اور تقابلی و تحقیقی مطالعہ کے لئے سامنے لانا ہو تو کڑی تنقید کے ساتھ لانا ہے ورنہ اسے پاکستان کے نظام تعلیمات سے کلیتہً خارج ہو جانا چاہئے۔

اس نصب العین کا ایک واضح تقاضا یہ بھی ہے کہ اسلام کے اصولوں' عقائد اور قواعد و ضوابط' روایات و شعار اور اخلاق و قانون کی صحت اور افادیت اور فوقیت و برتری کا کامل یقین ساتھ لے کر طلبا مدارس اور کالجوں سے نکلیں اور اپنے دین اور نظام اسلامی کے حق میں ان کے ساتھ اتنے قابل اعتماد اسلحہ استدلال ہوں کہ کسی غیر اسلامی نظام کو مرعوبیت کی نگاہ سے نہ دیکھیں۔ نیز ان میں ایسا جان دار جذبہ موجود ہونا چاہئے کہ وہ اپنے اصول و نظام کو دنیا کے گوشے گوشے میں قائم کر دکھانے کے لئے اجتماعی سرگرمیوں میں پورا پورا حصہ ادا کر سکیں۔

بہ خلاف اس کے اگر خدانخواستہ پاکستان میں غیر اسلامی نظام کے قیام کا فیصلہ ہو جائے تو پھر ہمارے نظام تعلیم کے لئے صحیح روش یہ ہے کہ وہ تعلیم دینیات کی کوئی گنجائش اپنے اندر نکالنے سے قطعی انکار کر دے تاکہ لادینیت خوب اچھی طرح پروان چڑھے اور کفر و دین

کی کشمکش سے طلبا کے ذہن آزاد ہو کر یکسو ہو جائیں اور غیر اسلامی نظام کے لئے بہترین رضا کار ثابت ہو سکیں۔ لیکن اگر لادینی حکومت دینیات کی سرپرستی کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہی ہو تو پھر مذکورہ بالا خطوط پر بنا ہوا تعلیم دینیات کا خاکہ یقیناً ایسا ہے کہ دین سے آئندہ نسل کی دلچسپیوں کو ختم کر سکے یہ خاکہ دین کے وقار اور اس کے رہے سہے احترام کو ختم کرنے کے لئے بہت کارگر ہو سکتا ہے۔

اشارہ دوم

نظام تعلیم کے عنان برداروں کو یہ بات بھی اول قدم پر طے کر لینی چاہئے کہ اسلام میں مذہب انفرادی معاملہ ہے یا اجتماعی؟ اور اسلام پوری زندگی پر محیط ہوتا ہے یا اس کا ایک جزو بن کر رہتا ہے؟ پھر اگر اسلام کو خود اس کی اپنی منشاء کے مطابق پوری زندگی کا دین تسلیم کیا جائے تو نظام تعلیم ایسا اختیار کرنا پڑے گا کہ جس میں سے دین و دنیا کی تفریق کا ذرا سا تصور بھی طلباء اخذ نہ کر سکیں اور نہ انہیں یہ شبہ لاحق ہو سکے کہ اسلام کسی دوسرے نظام کا جزو بن کر ـــــ یا غیر اسلام سے اشتراک کر کے بھی رہ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جمہوری ممالک میں نصاب جمہوریت عام نصاب سے الگ نہیں ہے کہ اس کا ٹیچر اور پیریڈ جداگانہ ہو۔ اور اسی طرح روس میں اشتراکیت کے نصاب کو دوسرے مضامین سے جداگانہ نہیں قرار دیا گیا کہ بقیہ نظام تعلیم کے ساتھ اشتراکیت کی تعلیم کا ایک ٹکڑا الگ ہے۔ کیونکہ کسی اصولی نظام زندگی کی تعلیم کا یہ طریقہ ہے ہی نہیں۔

ہمارے لئے ناگزیر ہے کہ ہم تمام مضامین میں تعلیم دینیات کو سمو کر پورے نظام تعلیم کو دینی بنا دیں۔ ہمارے یہاں فلسفہ پڑھایا جائے تو وہ اسلامی فلسفہ ہونا چاہئے' ریاضی سکھائی جائے تو اس میں دینی ضروریات کو پورا کرنے کا اہتمام ہونا چاہئے' طبیعات کی تعلیم دی جائے تو طبیعات سے دین نے جو جو استدلال کئے ہیں اور کائنات کے طبعی نظام کے متعلق جو اہم قوانین بیان کئے ہیں وہ اس میں واضح ہونے چاہئیں' تاریخ بیان کی جائے تو اس فلسفہ رزم خیر وشر اور حکمت فنا و بقائے اقوام اور تاریخ میں ان اسلامی اصولوں کی کارفرمائی کے اثبات کے لئے بیان کی جائے جنہیں اسلام نے پیش کیا ہے۔ سیاست پیش کی جائے تو وہ اسلامی سیاست ہو اور معاشیات بیان کی جائے تو وہ اسلامی معاشیات ہو۔ اور یہ امر نصاب تعلیم کے

ہر گوشے میں ملحوظ رہے کہ طلباء میں ہمیں غیر اسلامی اصول و نظم پر تنقید کرنے اور خالص عقلی طریق پر اسلام کی فوقیت کو محسوس کرنے کی قوتیں ابھارنی ہیں۔

دین و دنیا کی تفریق کے خطرناک تصور کا سدباب کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ ہم تعلیم دینیات کا کوئی جداگانہ پیریڈ' جداگانہ ٹیچر اور جداگانہ نصاب مقرر کرنے سے پوری طرح اجتناب کریں۔ پوری تعلیم کو تعلیم دینیات ہونا چاہئے یعنی دنیاوی امور سے متعلق دین کے مطالبات ہر شعبے میں واضح طور پر سامنے لانے چاہئیں۔ ہمارے ہر پروفیسر اور ٹیچر کو معلم اسلامیات ہونا چاہئے اور ہمارے ہر پیریڈ کو دینیات کا پیریڈ ہونا چاہئے۔

اسلام نظام تعلیم کے لئے وہ سانچہ ہو جس میں ہمارے جملہ علوم و فنون کے نصاب ڈھل جائیں۔ جہاں تک اسلام کے بنیادی حقائق اور اساسی عبادت اور دوسرے مرکزی مسائل کا تعلق ہے وہ زبان دانی کے نصاب میں جذب کر دیئے جانے چاہئیں۔

اشارہ سوم

اسلام ایک عملی تحریک اور ایک اخلاقی نظام ہے۔ لہٰذا اس کی تعلیم کے لئے یہ کافی نہیں کہ چند کتابیں سات آٹھ سال میں طلبا کو پڑھا دی جائیں' بلکہ کتابی تعلیم سے زیادہ یہاں ''فیضان نظر'' کی ضرورت ہے اور دماغ میں معلومات کا نگارخانہ سجانے کے مقابلہ میں یہاں عملی زندگی کی تعمیر و تربیت کو ترجیح حاصل ہے۔ خود مدینہ کے مدرسۂ نبوی میں قرآن کی کتابی تعلیم کو ساتھ کے ساتھ عملی پیرایہ میں ڈھالا جاتا تھا اور ''اصحاب صفہ'' قرآن پڑھ کر نہیں بلکہ قرآن کے سانچے میں ڈھل کر اس مدرسہ سے نکلے تھے۔ جبھی وہ اسلامی نظام کو چلانے کے لئے صحیح کارکن اور ساری نوع انسانی کو اس کی تعلیم دینے کے لئے کامیاب معلم بن سکے تھے۔ پس آج بھی اگر ہمیں اسلامی نظام کو چلانے اور دنیا کو تعلیم اسلام دینے کے لئے مسلمان کارکن درکار ہیں تو کتابی تعلیم سے کچھ زائد انتظامات کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ انتظامات حسب ذیل ہیں۔

① ہمارے مدرسوں اور کالجوں کے ماحول کو ہر پہلو سے اسلامی ہونا چاہئے اور ان کی فضا کو غیر اسلامی اثرات سے پوری طرح پاک کر دینا چاہئے' تاکہ جو طلبا اس ماحول میں چند سال گزاریں ان کی ذہنیتیں اور سیرتیں خود بہ خود اسلام کے ڈھب پر بدل

جائیں۔ ہمارے تعلیمی ماحول کی ساری دلچسپیوں اور سرگرمیوں اور مصروفیتوں کی روح اسلام کو ہونا چاہئے۔ یہاں کی گفتگوئیں' یہاں کی مجالس' یہاں کے کھیل' یہاں کے مباحثے' یہاں کی نشست و برخاست' یہاں کے باہمی روابط' یہاں کے آداب و رسوم' یہاں کی تقسیم اوقات' سبھی کی روح اسلام ہو اور سبھی اسلام کے تقاضوں کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہوں۔ دوسرے لفظوں میں تعلیمی ماحول ایک ایسے فطری سانچے کی حیثیت اختیار کرے جس میں قرآن کے نقشے اور اسوۂ نبویؐ کے نمونے کا مطلوبہ انسان ہی ڈھل سکے۔

(۴) ہمارے نئے نظام تعلیم میں تعلیمی ماحول اور نصاب کے علاوہ اول درجہ کی اہمیت ٹیچر کی شخصیت کو حاصل ہے۔ ہماری کتاب اگر مسلم ہو لیکن ٹیچر مسلم ہونے کا عملی نمونہ نہ ہو تو تنہا کتاب ضرورت کے مسلم پیدا کر کے نہیں دے سکتی۔ نئے نظام تعلیم کے اساتذہ کو اپنے اندر اسلامی مقاصد کے مطابق ایک ایسی شخصیت پرورش کر کے مدرسے اور کالج میں داخل ہونا چاہئے جو طلبا کے ذہنوں اور سیرتوں پر اپنا پرتو ڈال کر ان کی تعمیر جدید کر سکے۔ کتاب سے طلبا معلومات حاصل کریں اور ٹیچر سے ''معمولات''۔ ایک طرف ان کا فکر غذا حاصل کرے اور دوسری طرف سے ان کا عمل تقویت پائے۔ ان دو ضروریات کو پورا کئے بغیر اگر محض کتابوں میں اسلام کو داخل کر دیا جائے تو اسلام کا ''قول'' تو طلبا میں پیدا ہو سکتا ہے اسلام کا ''عمل'' پیدا نہیں ہو سکتا۔ نری کتابی تعلیم شاعری سکھا سکتی ہے' انقلابی کارکن پیدا نہیں کر سکتی اور ہمیں انقلابی جذبات رکھنے والے عملی کارکنوں کی ضرورت ہے۔

آخر میں ہم مختلف مضامین کے (حصہ مڈل) کے وہ اصولیات (Principles) عرض کرتے ہیں جن پر ان کو مرتب کرنے سے ہر مضمون دنیوی رہتے ہوئے دینیات کا مضمون بن سکتا ہے اور اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ دینیات کے لئے الگ سے کوئی کتاب' پیریڈ اور ٹیچر مقرر کیا جائے۔

(۱) شہریت (Civics)

ہماری تعلیم میں اس مضمون کی اہمیت بہت زیادہ مرکزی ہو گی اور اس کا مقصد یہ ہو گا کہ وہ اسلامی اصولوں پر سوسائٹی کے اندر افراد کے مختلف روابط اور ان کی گوناگوں حیثیتوں

کے مطابق ان کی ذمہ داریاں متعین کرے۔ ایک مسلم معاشرہ کا جزو بن کر ایک فرد مسلم کو زندگی گزارنے کے لئے اسلام کے اعتقادی' اخلاقی اور قانونی تقاضے پوری طرح معلوم ہونے چاہئیں اور اس قرآن کے پیش کردہ شہری کے معیاری نمونہ کا تفصیلی علم ہونا چاہئے جس کے مطابق اسے اپنی سیرت تعمیر کرنی ہے۔ خصوصیت سے حسب ذیل انسانی روابط کی ذمہ داریاں اسلامی اصولوں پر واضح ہو جانی چاہئیں۔

- خاندانی نظام کے داخلی تعلقات کا فرق مراتب نیز ذوی القربیٰ کے حقوق'
- محلے' شہر' ملک اور انسانیت کے مقابل میں ایک فرد مسلم کا مقام اور "حقوق جار" کی تفصیل۔
- ایک مسلم اور دوسرے مسلم کے عمومی تعلقات کی اسلامی بنیادیں۔
- اسلامی حکومت کے کارکن کی حیثیت میں عائد ہونے والے فرائض۔
- اسلامی حکومت کے مناصب اعلیٰ کی ذمہ داریوں کی نزاکت۔
- اسلامی حکومت سے لازمی تعاون کی مختلف نوعیتیں۔
- کارخانہ دار اور مزدور' زمیندار اور مزارع اور آقا اور ملازم کے باہمی حقوق و فرائض۔
- مرد و عورت کے تعلقات کی فطری حدود۔
- ثروت و غربت کا مقام۔
- اسلامی سوسائٹی اور جمہوری و اشتراکی سوسائٹی میں وجہ اختلاف۔ نیز سرمایہ دارانہ معیشت سے تخالف۔

علاوہ بریں اسی شہریت (Civics) کے مضمون میں اسلامی نظام حکومت و سیاست کے مختلف پہلوؤں کو طلباء پر واضح کر دینا چاہئے کہ حکومت کا مقصد کیا ہے؟ اس میں پولیس اور عدالت کا مقام کیا ہے؟ اس کی فوج کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ اس کا نظام تعلیم و اشاعت کن طریقوں پر چلتا ہے' اس کے مالیات کن اصولوں پر کام کرتے ہیں؟ وغیرہ۔

پھر طلبا کو شہریت کے ذریعے یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ ان کے روزمرہ کے معاملات کا تعلق حکومت کے کن کن شعبوں سے کس افسر یا رکن کے ذریعے کن کن طریقوں سے قائم ہے۔ اور ان کو معمولی اور غیر معمولی ضروریات کے لئے کدھر رجوع کرنا چاہئے؟

اس سارے کورس میں خوب اچھی طرح نمایاں کیا جائے کہ اسلامی عقائد اور اسلامی

عبادات اور اسلامی قواعد اخلاق مسلم سوسائٹی کے روابط پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اور جملہ مباحث میں قرآن وحدیث اور دورِ خلافتِ راشدہ کی نظیروں کو رہنمائی کے لئے سامنے لایا جائے۔

ان اشارات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہماری دینیاتی تعلیم کے لئے سب سے زیادہ اہم مضمون یہی ہوگا۔

۲۔ مطالعہ نظام فطرت (Study Of Nature)

اس ایک جامع عنوان کے تحت علم کیمیا (مع طبعی جغرافیہ) حفظان صحت (جسم انسانی کے نظم' افعال الاعضاء اور صحت ومرض کے احوال کا مطالعہ) علم حیوانات کے مبادیات اور علم نباتات کا ابتدائی مطالعہ (خصوصیت سے زراعت و باغبانی کے پہلو بھی شامل ہیں ان میں سے کچھ عام معلومات کی چیزیں زبان دانی کے نصاب میں جا ملیں گی) لیکن علم کیمیا' طبعی جغرافیہ اور حفظان صحت مستقل اختیاری مضامین کی حیثیت سے جیسے آج رائج ہیں آئندہ بھی رہیں گے۔ ان جملہ مضامین کے نصاب اور طرز تعلیم میں جن اصولوں کو مدنظر رکھنا ہے وہ یہ ہیں:

(ا: یہ دکھانا ہے کہ کائنات ایک صاحب شعور اور صاحب ارادہ ہستی کی تخلیق ہے' ڈیزائننگ' پلاننگ' کلرنگ اور پیکنگ کے جو حیرت انگیز آرٹ اس میں کام کر رہے ہیں وہ ایک آرٹسٹ کا کرشمہ ہیں۔ علاوہ بریں پورا نظام ریاضیاتی' جیومیٹریکل اور منطقی ہے۔

ب: یہ دکھانا ہے کہ پوری کائنات بہ حیثیت مجموعی بھی اور جزءً جزءً بھی اپنے خالق کے سامنے "مسلم" (مطیع فرمان) کی حیثیت رکھتی ہے۔ حتیٰ کہ جسم انسانی بھی بلحاظ جسم اس کا مسلم ہے' لہٰذا انسان کے لئے اس کائنات میں اپنے خالق کے سامنے مسلم ہو کے رہنے کا رویہ بہترین رویہ ہے۔

ج: یہ واضح کرنا ہے کہ کائنات کے ہر شعبے میں "سنت الٰہی" (خدا کا قانون) نافذ العمل ہے اور ہر چیز اس کی حکومت میں جکڑی ہوئی ہے۔ پس یہاں انسان کے لئے بھی خدا کا قانون معلوم کر کے اس کی پیروی کرنا واحد ذریعہ ارتقا ہے۔

د: اس حقیقت کو نمایاں کرنا ہے کہ نظام فطرت میں حکمت اور مقصدیت کارفرما ہے۔

ر: قرآن کے سارے استدلال کو ان مضامین کے مباحث میں سمو دینا جو اس نے اسلام کے عقلی اثبات کے لئے نظام فطرت کے مظاہر کی بنیاد پر کیا ہے۔

شہریت کے بعد اس مضمون کی اہمیت بھی اول درجہ کی ہو گی۔

(۳) تاریخ (History)

تاریخ کا مضمون ہمیں موجودہ صورت سے زیادہ وسیع کرنا ہے اس کے شعبے حسب ذیل ہوں گے۔

ا: تاریخ اسلام۔ از آدمؑ تا نبی ﷺ (مجمل)

ب: تاریخ اسلام۔ (۱) دور نبوت (۲) دور خلافت راشدہ (۳) دور شاہی (۴) مسلمان ہندوستان میں۔

ج: ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ (۱) ہندوستان مسلمانوں سے پہلے (۲) مسلمانوں کی آمد براہ بحیرہ عرب (۳) مسلمانوں کی آمد براہ درہ خیبر (۴) مسلمان انگریزی استبداد کے پنجے میں (۵) آزادی کی جدوجہد (۶) ظہور پاکستان

د: تاریخ عالم (مجمل) (۱) قرون مظلمہ (۲) قرون وسطیٰ (۳) قرون جدید (۴) پاپائیت کا ردعمل الحاد کی شکل میں (۵) جمہوریت کا ظہور اور ارتقا (۶) سرمایہ داری اور امپیریلزم (۷) اشتراکیت کا ظہور (۸) دنیا کا ہمہ گیر اختلال (۹) جمعیت اقوام متحدہ کی ناکامی (۱۰) دنیا میں اسلامی نظام کی ضرورت۔

تاریخ کی نصابی کتب میں حسب ذیل امور قابل لحاظ ہوں گے

ا: یہ واضح کرنا کہ تاریخ، اسلام و جاہلیت کی دو قوتوں کی کش مکش کی جولانگاہ ہے۔

ب: یہ واضح کرنا کہ اقوام کے فنا و بقا کا راز ہر ملک اور ہر زمانہ میں اخلاقی ارتقاء و انحطاط میں مضمر ہے۔

ج: یہ واضح کرنا کہ طبعی پہلو (وسائل تمدن) کے لحاظ سے ارتقاء مسلسل ہے، لیکن اخلاقی پہلو سے کبھی ارتقاء ہوتا ہے، کبھی انحطاط! اور اس کے لئے انسانی توجہ اور اہتمام کی خاص اہمیت ہے۔

د: یہ واضح کرنا کہ خدا کا قانون رحمت وعذاب کس طرح کام کرتا ہے؟

ر: یہ واضح کرنا کہ اخلاق کی اچھی اقدار ہمیشہ سے اچھی ہیں اور بری اقدار ہمیشہ سے بری چلی آ رہی ہیں۔

س: یہ واضح کرنا کہ تاریخ اسلام اور تاریخ مسلمین میں کیا فرق ہے۔

ان ساری وضاحتوں کی بنیاد قرآن وحدیث کے صحیح استدلال پر قائم ہونی چاہئے اور اقوام عالم کی تاریخ پر جس طرح قرآن نے بحث کی ہے اسی کو تاریخ بیانی کا معیار بنانا چاہئے۔

(۴) ریاضیات (Mathematics)

ریاضیات (حساب' جیومیٹری' الجبرا) کو ہمیں عملی زندگی کی روزمرہ کی ضروریات کے پیش نظر مڈل کے نصاب میں لینا ہے۔ حتی الوسع ابتدائی تعلیم میں سے نظری ریاضی کو خارج کر دینا چاہئے تا کہ طالب علم پر ناروا بار نہ پڑے۔ لیکن ایک حد تک اس کا لحاظ رکھنا ہے کہ ریاضی کی تعلیم بچے کے دماغی اعصاب کو چست کرے اور اسے راست فکری (Straight Thinking) کا ہنر سکھا دے۔ بہرحال خانگی حسابات' کاروباری حسابات اور دفتری حسابات ابتدائی حد تک طالب علم کے علم میں آ جانے چاہئیں۔ ریاضی کے نصاب میں حسب ذیل تبدیلیاں ناگزیر طور پر کی جانی چاہئیں۔

ا: سود اور کاروبار کے ان پہلوؤں سے تعلق رکھنے والے حصے خارج از نصاب کر دیئے جائیں جن کو اسلام نے ہر مسلم کے لئے حرام ٹھہرایا ہے۔ لیکن جب تک ہمارے معاشرہ میں سے سود بالکل ختم نہیں ہو جاتا اور اس سلسلے کے حسابات کی تعلیم دینا ضروری ہے تو سوالات کو اس طرح مرتب کرنا ہوگا کہ سود کی حرمت واضح ہو اور طلباء میں اس کے لئے ایک نفرت ابھر آئے۔

ب: سوالات کی عبارت میں اس کا خاص طور پر اہتمام ہو کہ طالب علم کو دینی حقائق و احساسات کے قریب لانا ہے خصوصاً کاروباری مسائل سے تعلق رکھنے والے سوالات میں اسلام نے کاروبار کے جو اخلاقی احکام دیئے ہیں ان کا تعارف ہو جانا چاہئے۔

ج: زکوٰۃ' عشر اور تقسیم وراثت کی پوری ریاضی (نئی اصلاحات کے ساتھ مرتب کر کے)

مڈل کے اندر سکھا دینا لازم ہے۔

ہ: ہر شعبۂ حسابات کے آغاز میں ایک دیباچہ لکھ کر اس سے تعلق رکھنے والے احکام فقہ کو بیان کر دیا جائے تاکہ طالب علم عملی زندگی میں ان احکام کے اتباع کے قابل ہو جائے۔ نیز موجودہ معاشرے میں لین دین اور کاروبار کے رائج شدہ غلط طریقوں کی مضرت کو اس حد تک اسے ذہن نشین کرا دیا جائے کہ وہ ان سے نفرت کرنے لگے۔

(۵) جغرافیہ (Geography)

جغرافیہ طالب علم کو دنیائے انسانیت سے تعلق دلانے کے لئے پڑھایا جائے گا۔ اس کا ایک مدعا یہ ہے کہ سفر اور تجارت میں سہولتیں پیدا ہوں۔ دوسرے یہ کہ دنیا کے سیاسی و معاشی احوال کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ جغرافیہ میں جن دینی امور کا لحاظ رکھنا ہے وہ یہ ہیں:

ا: جغرافیہ طالب علم میں انسانیت گیر وسعت نظر پیدا کر کے اور انہیں دریاؤں اور پہاڑوں کی حد بندیوں سے بالاتر ہو کر وحدت نوع کا تصور دلائے کہ پوری انسانیت ایک کنبہ ہے اور ایک خالق کی مخلوق ہے۔

ب: جغرافیہ یہ واضح کرے کہ طبعی اثرات کے تحت رنگ و نسل کے امتیازات و اختلافات اقوام عالم میں پیدا ہو گئے ہیں ان سے وحدت انسانیت میں کوئی فرق نہیں آتا اور ہر جغرافیائی ماحول میں انسان کے خیر و شر کے محرکات اور اس کے اعمال کے نتائج اور اس کی ضروریات مادی و اخلاقی ایک ہی رہتی ہیں اور ہر حال میں اس کی فلاح ایک ہی قسم کے اصولوں پر مضمر ہے۔

ج: جغرافیہ اقوام ماضیہ، اقوام مغرب اور ملت مسلمہ کی پوری تاریخ کے واقعات کا مظاہرہ کرنے والے جغرافی پردۂ نمائش (Screen) کو طلبا کے سامنے لائے اور تاریخی حقائق کو سمجھنے کے لئے ان کا جغرافی ماحول پیش کرے۔

د: جغرافیہ دنیا کے ہر گوشے سے مختلف ذرائع سفر کے لحاظ سے سفر حج کی تفصیلات طلبا کے سامنے لائے۔

ہ: جغرافیہ موجودہ دنیا کے مسلم ممالک کی جغرافی پوزیشن پاکستانی طلبا پر واضح کرنے کے بعد ان میں وحدت عالم اسلامی کے امکانات کا احساس پیدا کرے۔

(۶) زبان وادب (Language and Literature)

زبان دانی کے کورس میں سے ہر وہ چیز ہمیں خارج کر دینی ہے جو اسلامی معتقدات اور اخلاقی اصولوں کے خلاف پڑتی ہو اور اس میں ان دینی حقائق کو جذب کر دینا ہے جو بنیادی اہمیت رکھتے ہیں اور جن کے لئے دوسرے مضامین میں جگہ نہیں پیدا کی جا سکتی۔

اس کے ساتھ یہ اہتمام بھی کرنا ہے کہ اردو ادب میں اسلامی اقدار اور غیر اسلامی اقدار کے نشو و ارتقا اور باہمی تصادم کو طالب علم پر واضح کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے تاریخ ادب کو بھی مختلف ادوار میں تقسیم کر دینا چاہئے۔ اور شعراء اور ادیبوں کی بھی تین صفیں ہر دور میں بنا دینی چاہئیں۔ ایک وہ جو اسلام کش رجحانات کے علمبردار تھے' دوسرے وہ جو خالص اسلام کی نمائندگی کرنے والے تھے' تیسرے وہ جو بین بین تھے۔ طالب علم کو یہ بات خوب اچھی طرح محسوس کرا دی جائے کہ ادب کے جملہ اسالیب فکری جنگ کے اسلحہ ہیں اور محض اسلحہ کا بہتر اور شاندار ہونا کوئی قابل قدر شے نہیں ہے بلکہ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ان اسلحہ سے کن اصولوں کی حمایت میں ادیبوں نے جنگ لڑی۔ اسی سلسلہ میں طالب علم پر زبان و قلم کے استعمال کے متعلق بہ حیثیت مسلم کے وہ تمام ذمہ داریاں واضح ہو جانی چاہئیں جو اسلام کی طرف سے اس پر عائد ہوتی ہیں۔

(۷) دینیات (عملی)

دینیات کا مضمون محض عملی (قطعاً غیر کتابی) مضمون کی حیثیت سے شامل تعلیم ہو گا اور اس کا مدعا یہ ہو گا طہارت' نماز اور دوسری عبادات اور آداب و شعائر اسلامی کی تربیت ماحول اور ٹیچر کے ذریعے سے از خود ہوتی جائے۔ اس عملی مضمون میں طالب علم کے پاس ہونے کے لئے اس کے عملی ریکارڈ کا درست ہونا لازمی ہو گا۔

(۸) عربی زبان دانی

طالب علم کو تیسری جماعت سے (محض زبانی بول چال کی مدد سے) عربی زبان دانی کی تعلیم دینے کا آغاز کر دیا جائے اور اس کی کتابی تعلیم چوتھے سال سے باقاعدہ شروع ہو جائے۔ یہاں تک کہ پانچویں اور چھٹے سال میں وہ ابتدائی بول چال اور نوشت و خواند' ترجمے

اور گریمر کی استعداد بہم پہنچا لے۔ عربی کی تعلیم اس وجہ سے لازمی قرار دی جائے کہ دین کے سرچشمے سے استفادہ کرنے کے لئے یہ ہر مسلمان کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ مڈل سے فارغ ہونے کے بعد طالب علم میں یہ استعداد ہو کہ وہ عربی کتب' رسائل اور اخبارات سے (لغت کی مدد کے ساتھ) معمولی استفادہ کر سکے۔

(۹) قرآن

عربی کی تعلیم کو لازمی مضمون کی حیثیت سے لینے کا مدعا یہ ہے کہ قرآن ناظرہ کی تعلیم سے قرآن فہمی کے ذوق میں جو جمود واقع ہو جاتا ہے اس سے طالب علم کو بچایا جائے۔ وہ اول روز سے ہی قرآن کو سمجھ کر پڑھے اور عمل کرنے کے لئے پڑھے۔ چوتھے' پانچویں اور چھٹے درجہ کے عربی نصاب میں قرآن کی نماز میں پڑھی جانے والی سورتیں اور معروف آیات سمیٹ لی جانی چاہئیں۔ ساتویں اور آٹھویں درجے میں پورا قرآن شرح ترجمہ کے ساتھ پڑھا دیا جائے۔ خصوصیت سے سورہ بقرہ' انفال' توبہ' بنی اسرائیل اور سورہ حجرات نسبتاً زیادہ تفصیل سے ذہن نشین کرائی جائیں۔ کیونکہ ان سورتوں میں دین کے اہم ترین بنیادی امور مختلف پہلوؤں سے واضح کئے گئے ہیں۔ قرآن کی تعلیم میں امور ذیل ملحوظ رہیں۔

ا: طالب علم کو محسوس ہو کہ وہ خود مخاطب ہے اور وہ اندازہ کر سکے کہ قرآن اس سے کیا چاہتا ہے۔

ب: اس میں ایمان پیدا ہو کہ فلاح صرف اتباع قرآن میں ہے اور ترک قرآن میں تباہی ہے۔

ج: اسے یہ شعور ہو جائے کہ قرآن کس نقشے کے انسان بنانا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں انسانی کردار کے اچھے اور برے جو صفاتی اور تمثیلی خاکے قرآن نے پیش کئے ہیں' ان کا طالب علم کو مطالعہ کرا دینا چاہئے۔

د: اسے یہ تصور ہو کہ قرآن کی جو قدر و قیمت چودہ سو سال پہلے تھی وہی آج بھی ہے۔

ہ: وہ قرآن کو ہر پہلو سے معیار فکر و عمل تسلیم کرے۔

و: اسے قرآن کی بے مثل ادبیت کے ساتھ ساتھ اس کے حسن نظم کا ابتدائی حد تک اندازہ ہو جانا چاہئے۔

(۱۰) حدیث (مع سیرت نبوی ﷺ)

ساتویں اور آٹھویں درجے سے پہلے صرف عربی کورس میں سادہ اخلاقی احادیث کو لیا جائے جو مسلم کردار کے پسندیدہ اور ناپسندیدہ پہلوؤں کو واضح کرتی ہیں۔ اور ان درجوں میں ایسی احادیث کا ایک مجموعہ مطالعہ کرایا جائے جن سے اسلامی عقائد' عبادات اور عام معاملات کے متعلق ضروری معلومات اور احکام اخذ ہوتے ہوں۔ اس مجموعہ میں صرف وہ احادیث لی جائیں جن کی صحت علماء متقدمین کے سارے معیاروں کے لحاظ سے یقین کے درجے کو پہنچتی ہوں۔

سیرت نبویؐ کو قرآن اور احادیث کی روشنی میں اس طرح مرتب کر کے لایا جائے کہ طالب علم رسول اللہ ﷺ کا مقام تاریخ انسانیت اور تاریخ اسلام میں سمجھ سکے' نیز وہ اسوۂ نبوی ﷺ کو اپنی سیرت کی تعمیر کے سانچے کے طور پر قبول کرے۔ سیرت نبویؐ کا مطالعہ کراتے ہوئے طالب علم کو اس کا یہ مقصد ذہن نشین کرا دینا چاہئے کہ یہ وہ انسان ہے جس کی عملی زندگی میں فلاح اور نجات کا راستہ ہمیں حاصل ہوتا ہے اور اس کو چھوڑ کر مسلم زندگی کو صحیح بنیادوں پر تعمیر ہی نہیں کر سکتے۔ دوسرے لفظوں میں ہماری اولادوں کے ذہن اس قابل ہو جائیں کہ وہ حضورؐ کو اپنا مستقل اور واحد قائد حیات تسلیم کر لیں۔ کسی دوسرے فلسفی اور انقلابی کو ظاہری کامیابی اور شہرت و مقبولیت کے باوجود اپنے لئے رہنمائی کا سرچشمہ نہ مانیں۔ اس سلسلے میں ختم نبوت کا اصولی عقیدہ ذہن نشین کرانا ضروری ہے۔ حضورؐ کے بعد تمام علماء اور قائدین کو صرف اس بنا پر قبول کیا جا سکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو حضورؐ کی قیادت اعلیٰ کے تحت جمع کریں۔

(۱۱) فقہ

ابتدائی چار درجوں میں فقہ کے ان احکام کی زبانی تعلیم دی جانی چاہئے جن سے بالعموم سابقہ پڑتا ہے۔ پانچویں درجے سے ایسی کتب نصاب اختیار کی جائیں جن میں عبادات اور روز مرہ کے معاملات کے بارے میں فقہی احکام مرتب کر کے بیان کئے گئے ہوں۔ نیز فقہ کی وہ عام اصطلاحات واضح کی گئی ہوں جن سے ایک عامی مسلمان کو سابقہ پڑ سکتا ہے۔

(۱۲) استعمال قویٰ (عملی)

یہ کوئی مستقل مضمون نہیں' بلکہ ہر مضمون کے اندر بھی اس کا مقام ہے اور نصابی مضامین کی حدود سے باہر بھی اس کے لئے پہنائی موجود ہے۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ ذہن اور جسم کے اعضاء کو استعمال کرنے میں ہر طالب علم کو اتنی مہارت مختلف پہلوؤں سے ہونی چاہئے کہ وہ زندگی کے میدان میں داخل ہو کر ابتدائی ضروریات حاصل کر سکے اور اپنے معاشی و اخلاقی مقاصد کے لیے راستہ بنا سکے۔

تعلیم دینیات کا یہ سرسری خاکہ جو عرض کیا گیا ہے یہ وحدانی (Unitarian) کلّیت پسند (Totalitarion) اور عملی نظریہ تعلیم کے تحت مرتب کیا گیا ہے اور اس نظریہ سے ہٹ کر اگر کوئی خاکہ تعلیم دینیات کے لئے اختیار کیا جائے تو اس سے ہمیں وہ مطلوبہ نتائج کبھی حاصل نہیں ہو سکتے جو اسلامی نظام کو چلانے کے لئے ہمارے پیش نظر ہیں۔

یہاں بحث صرف ابتدائی تعلیم (حصہ مڈل تک) کے متعلق کی گئی ہے اور بالائی منازل کی تعلیم علیحدہ بحث کی محتاج ہے۔

اسی خاکے کو ذرا سا پھیلا کر میٹرک تک کے لئے موزوں بنایا جا سکتا ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی (۱۹۶۹)*

حکومت کی پیش کردہ تعلیمی پالیسی (رپورٹ) اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ پہلی بار یہ جذبہ متحرک ہوا ہے کہ دور غلامی کے نظام تعلیم کو (جس میں کچھ سطحی و جزوی تبدیلیاں کی گئی تھیں) بنیادی طور پر بدل کر اس کی تشکیل نو کی جائے۔ اور بڑی بات یہ کہ اس تشکیل نو کے خاکے میں اسلامی نظریۂ حیات کو بھی خاص اہمیت دی گئی ہے۔

چاہیے تو یہ تھا کہ اس پر تفصیلی اظہار خیال کرتا لیکن مصروفیات کی وجہ سے چند نکات اجمالاً پیش کیے دے رہا ہوں۔

❶ اس طرح کی پالیسیاں جو بنیادی تبدیلیاں لانے کے لئے ہوں' ان کو دفتری رپورٹوں کی طرح مرتب کرنا کافی نہیں ہوتا' بلکہ ان میں ایک طرح کی روحِ انقلاب یا ایک بھرپور عزمِ تغیر کو جلوہ گر ہونا چاہیے۔

ایسی انقلابی روح تقاضا کرتی ہے کہ یہ بات واضح طور پر پیش کی جائے کہ ہمیں کیسا انسان بنانا مطلوب ہے' اس کا نصب العین کیا ہو گا' وہ کیسے ذہن کا مالک ہو گا اور اسے کس کردار کے ساتھ لیڈر' افسر' کارکن' صناع' معلم' وکیل' ڈاکٹر' انجینئر' تاجر' مزدور' کسان یا شہری کا پارٹ ادا کرنا ہے۔

یہ مثبت اصولی بات بھی طے ہو جانی چاہیے کہ ایک نظریۂ حیات اور نظام تہذیب کے علمبرداروں کی حیثیت سے ہمیں باہر سے کیا کس حد تک قبول کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے —— بلکہ کیا کیا کچھ ہمیں پوری تحدی سے مسترد کر دینا ہے۔

نئے نظام تعلیم کو اپنے پروردہ ہر فرد کے دل و دماغ میں یہ امر راسخ کرنے کے قابل ہونا چاہئے کہ وہ اس بگڑی ہوئی دنیا کے فاسد نظریات کے بالمقابل راستی اور نیکی کے نظام کا علمبردار ہے' اور اسے ساری زندگی اور ساری قوتوں کو اسی حیثیت سے استعمال کرنا ہے۔

---

* سیارہ اکتوبر ۱۹۶۹ء

◆ اسلام کوئی مذہب نہیں' بلکہ پورے نظام حیات کا نقشہ ہے اس لئے اسے محض ایک مضمون کی شکل نہیں دی جاسکتی' اگرچہ اس کے متعلق اختصاصی مضمون بھی رکھا جاسکتا ہے۔ اسلام کو ہمیں پورے نصابی سلسلوں میں پھیلا دینا چاہئے اور پہلے درجہ سے لے کر بلند ترین درجے تک بلکہ اعلیٰ قسم کے ٹیکنیکل علوم کے ساتھ بھی اور تربیتی اداروں میں بھی اسلام کے بنیادی فلسفہ حیات اور حکمت تہذیب کو شامل نصاب کرنا چاہئے۔

◆ مغربی فلسفہ حیات کی بنیاد پر ترتیب دیئے ہوئے نصابات کو قطعاً برطرف کر کے اسلامی معتقدات اور اسلامی حکمت کی بنیادوں پر نئے نصابات مرتب ہونے چاہئیں۔

◆ عبوری دور میں ہمیں چند اہم کام ضرور کرنے چاہئیں۔

أ: انسانیات و عمرانیات (Humanities) کی حد تک ہر درجے میں ہر درسی کتاب اور مضمون کے ساتھ ایک تنقیدی حصہ لکھوا کر شامل کرنا چاہئے۔ اور اسی کے مطابق امتحانی پرچوں میں سوالات آنے چاہئیں کہ فلاں نظریئے پر' فلاں شخص کے افکار پر فلاں کتاب پر ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے اظہار کرو۔

ب: ایسے تمام علوم کے متعلق اب تک جو کچھ سرمایہ کتب و مقالات ہمارے پاس موجود ہے' اس کا انتخاب کر کے مختلف مدارج کے لئے مجموعے تیار کرا لئے جائیں۔

ج: ہر علم و موضوع پر ایسی ٹھوس اور معیاری کتابیں اور مجموعہ ہائے مقالات شاملِ نصاب کیے جائیں جو ہمارے اپنے مفکرین اور علماء اور دانش وروں نے اسلامی بنیادوں پر لکھے ہیں۔

د: مغربی ادبیات پڑھاتے ہوئے ایک تو ایسی چیزیں منتخب کی جائیں جن میں جنسی گندگی اور الحاد و مادہ پرستی کے عناصر نہ ہوں۔ دوسرے ان کو پڑھانے کا انداز وہ ہو جو ہمارے عربی مدارس میں عرب کی جاہلی شاعری کے پڑھانے کا رہا ہے۔ صدیوں سے جاہلی شاعری میں خلاف اسلام معیار کی چیزیں پڑھائی جاتی ہیں مگر اس سے کبھی فسادِ اخلاق پیدا نہیں ہوا۔ اس کے وجوہ دو تھے۔

ایک یہ کہ مجموعی سلسلہ نصابات (جس میں قرآن و حدیث کا غلبہ تھا) میں یہ حصہ بہت کمزور ہوتا تھا۔ دوسرے استاد کی شخصیت اور تعلیمی ماحول کی پاکیزگی طلبہ کو اس کے برے

اثرات سے محفوظ رکھتی تھی۔

ل: سائنسی علوم کے پڑھانے میں سب سے پہلا اہتمام یہ ضروری ہے کہ سائنس کے ساتھ جو ملحدانہ فلسفہ ممزوج ہوتا ہے' اسے چھانٹ کر الگ کر دیا جائے۔ اور اس کی جگہ اسلامی اعتقاد و حکمت کو اس میں جذب کیا جائے۔ سائنس کی ہر کتاب میں نہ صرف یہ کہ ایک مقدمہ میں سائنس کی حیثیت (علم اشیاء) اور اس کے ذریعے قوانین الٰہی کی دریافت کی وضاحت کی جائے' بلکہ ثابت شدہ سائنسی قوانین (نہ کہ محض Theories) کو خدا کے قوانین کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔

علاوہ ازیں طالب علم کو یہ معلومات بھی دی جائیں کہ کسی بھی طبعی یا تکنیکی علم کے دائرے میں نبی اکرم ﷺ سے لے کر بعد کے مسلمانوں تک نے اپنے اپنے حالات زمانہ کے لحاظ سے کیا حصہ ادا کیا اور علمی تحقیق و تدوین کے کیا کارنامے انجام پائے۔ تاکہ طالب علم یہ تصور لے کے نکلے کہ اس چراغ کے اصل جلانے والے ہم تھے اور اب پھر ہمیں اس کو روشن تر کرنا ہے۔

سائنس (تسخیر مادہ) کے ساتھ اخلاقی تقاضوں کو ہم آہنگ رکھنے کے لئے ہمارے نظام تعلیم کو نئی نسلوں کا ذہن تیار کرنا چاہیے۔

۵ ایک نیا مضمون ہمارے ہاں پاکستان' نظریۂ پاکستان' تحریک پاکستان اور تاریخ پاکستان پر مشتمل ہونا چاہیے تاکہ نئی پود اس کشمکش کے اسباب اور اس میں دی گئی قربانیوں سے واقف ہو جسے اس کے اسلاف نے برسوں جاری رکھ کر ایک آزاد سلطنت کو حاصل کیا اور اس آزاد سلطنت کا بنیادی مقصد ان کے سامنے متعین ہو۔

۶ کسی مخصوص نظریہ پر استوار شدہ ایک بامقصد نظام تعلیم کے لئے سب سے ضروری چیز اس کے تقاضوں پر پورا اترنے والا استاد ہے۔ دراصل استاد (پرائمری مدرس سے لے کر یونیورسٹی وائس چانسلر تک) نظام تعلیم کی گاڑی کا ڈرائیور ہوتا ہے وہ جس منزل کی طرف چاہے اسے لے جائے۔

پس نئے نظام تعلیم میں اس کے نظریہ و مقصد کے مطابق استادوں کے انتخاب اور ان کی تربیت کا اہتمام شدید ضروری ہے۔

استادوں کی بھرتی کے وقت چھان بین ہونی چاہئے کہ وہ ذہنی طور پر فرومایہ اور اخلاقی لحاظ سے ناقابل اعتماد شخصیت تو نہیں رکھتا۔ اور پھر اسے اسلامی نظام تعلیم کو چلانے کے لئے فکری اور عملی دونوں طرح کی تربیت دی جانی چاہئے۔ موجودہ بگڑے ہوئے مخلوط ماحول کے لحاظ سے شاید یہ امر مناسب ہوگا کہ:

استادوں کی بھرتی اور ان کے تقرر کے وقت ان سے اسلام' نظریہ پاکستان اور نظام تعلیم کے مقاصد سے رشتہ وفا رکھنے کا باقاعدہ تحریری حلف لیا جائے۔

استادوں کا مرتبہ بلند تر کرنے کے لئے ان پر زیادہ خرچ کیا جائے اور انہیں پریشان حالی اور ذہنی انتشار سے نکالا جائے۔

۷ نئے نظام تعلیم کو نئی پود کی تربیت میں سب سے زیادہ زور نظم وضبط اور شائستگی —— اور سلیقے اور آداب کے ساتھ ہر عمل کو انجام دینے پر صرف کرنا چاہیئے' کیونکہ ان صفات کے بغیر اسلامی زندگی ممکن نہیں۔

۸ نئے نظام تعلیم کو ہمیں مغرب کی فاسد تہذیب و ثقافت کی پرچھائیں سے بچانا چاہئے۔ اور اس سلسلے کا اولین قدم یہ ہے کہ مخلوط تعلیم کا قطعی طور پر انسداد کر دیا جائے۔ خواتین کے لئے الگ یونیورسٹیوں' الگ کالجوں اور الگ نصابات کا انتظام کیا جائے۔ اور جہاں کہیں فوری طور پر یہ انتظام نہ ہو سکے' درسگاہوں کی عمارات کو ڈبل شفٹ کے اصول پر ایک وقت مردوں کے لئے اور ایک وقت خواتین کے لئے استعمال کیا جائے۔

۹ قومی زبانوں کے مسئلے میں تعصبات کا تصور کرتے ہوئے کچھ کہنا بڑا مشکل ہے' مگر محض سیاسی ضرورتوں[1] سے اگر ہم نے نئی نسلوں کے لئے مشکلات پیدا کر دیں تو بعد

---

[1] بدقسمتی سے زبان کے مسئلے کو ایک جانب کے چند لیڈروں نے اپنا سیاسی پرچم بنا کر عوام میں بار بار ایسے جذباتی ہیجان پیدا کئے ہیں کہ ان کی قائم کردہ فضا میں صحت مندانہ طرز فکر سے کام لینا ممکن نہیں رہا۔

کوئی دوسرا بڑا مسئلہ ہو' یا زبان کا مسئلہ' ہمارے لئے معیار فیصلہ حسب ذیل مقاصد سے ترتیب یافتہ ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ کونسا راستہ ایسا ہے جو اسلامی نظریہ حیات کے فروغ و استحکام کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ کونسی صورت ایسی ہے جس میں پاکستان کی وحدت و سالمیت اور اس کے عوام میں رشتہ اخوت کی مضبوطی کی ضمانت ملتی ہے۔ خصوصاً دونوں صوبوں کا باہم وابستہ ہونا کس تدبیر سے ممکن ←

میں نتائج تکلیف دہ ہوں گے' متوازن اور متوسط حل یہ ہے کہ:

ا) مشرقی پاکستان کے اردو پڑھنے والے اور مغربی پاکستان کے بنگلہ پڑھنے والے طلبہ کو ترغیبی وظائف دیئے جائیں مگر دو قومی زبانوں کو پڑھنا لازم نہ کیا جائے۔

← ہے۔

ابتدائی دور کے قائدین ملک (خواہ وہ ایک صوبے کے ہوں یا دوسرے صوبے کے) نے انہی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر زبان کے مسئلے میں ایک واضح راستہ اختیار کیا تھا اور شروع کا ایک دور لسانی جھگڑے کی آلودگیوں سے پاک رہا ہے۔ بعد کے ناخوشگوار حالات نے اولین دور قیادت کے فیصلوں کو ختم کر کے ہمیں ایسی جگہ پہنچایا کہ دونوں زبانوں کو قومی زبانیں قرار دیا جائے۔ یہاں تک بھی بات رہتی تو خیر ایک بات تھی۔ اب سیاسی دباؤ کے تحت ہمارے دماغ یہ راستہ اختیار کر رہے ہیں کہ ایک طرف سب کو اردو لازمی قرار دے کر پڑھائی جائے! دوسری طرف بنگلہ!

عملی تجربے سے دو چار ہونے کے چند برس بعد لیڈروں کو صحیح اندازہ ہوگا کہ ہم نے اپنے بچوں کو ایک طرف دوہرا بار ڈال کر زیادتی کی ہے (اور اس کے کچھ نتائج بھی ہوں گے) اور دوسری طرف ہم نے ملت کی دینی زبان عربی کا راستہ اور زیادہ تنگ کر دیا ہے۔

پس اگر زبانوں کا مسئلہ نئی پیچیدہ صورت حال کے تحت نئی شکل میں حل کرنا ضروری تھا تو اس کی بہترین صورت یہ تھی کہ ہم تین زبانوں کی فہرست ——— اردو' بنگلہ' عربی میں سے دونوں صوبوں کے طلبہ کے لئے اپنی پسند کے مطابق کوئی سی دو زبانیں لینے کو لازمی قرار دے دیتے ——— انگریزی زبان کو چند دوسری بیرونی زبانوں کے ساتھ رکھ کر ہم لسانیات وادبیات کے طلبہ کو کسی ایک زبان کے انتخاب کا حق دیتے۔

اس کے ساتھ اگر تعمیری ذہن کے ساتھ ملکی وحدت کو پیش نظر رکھ کر اردو اور بنگلہ ہر دو زبانوں کے لئے نسخ یا نستعلیق رسم الخط مشترک کر دیا جائے تو دونوں زبانوں کا سیکھنا آسان ہو جاتا اور ان کا آپس میں تبادلہ الفاظ بھی از خود بڑھ جاتا۔ نیز پاکستانی بنگلہ بھارتی بنگلہ کے تسلط سے آزاد ہو جاتی اور اس کا رشتہ رسم الخط کے ذریعے مسلم ممالک سے بھی جڑ جاتا۔

ایک مسئلہ یہ حل طلب ہے کہ بنگلہ زبان کے بعد بالکل منطقی طور پر اب دوسری علاقائی زبانوں کے جھنڈے بھی بلند ہو رہے ہیں۔ اس لئے مزید ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں کہ ہماری واحد غیر علاقائی زبان کے لئے سرے سے کوئی جگہ ہی نہ رہے اس بارے میں تعلیمی مفکرین کو وقت سے پہلے سوچنا چاہیئے۔

ب: صرف وہ لوگ جنہیں سرکاری ملازمت کرنی ہو ان کے لئے چھ ماہ کا ایک اختصاصی کورس دونوں صوبوں میں دوسرے صوبے کی زبان کا مقرر کر دیا جائے۔

ج: دفتری فارمولے اور عدالتی کاغذوں اور ڈاک اور ریل کے ٹکٹوں اور سائن بورڈوں وغیرہ پر اندراجات دونوں زبانوں میں ہوا کریں۔

اس وقت اجمال کے ساتھ یہی چند قلم برداشتہ نکات پیش کئے جا رہے ہیں اور اس سے زیادہ کی شاید ضرورت بھی نہیں کیونکہ سب لکھنے والوں نے لکھا ہے۔ بڑا مشکل ہے کہ کمیٹی کا ایک ایک شخص اس سارے مواد کو پڑھ سکے اور تلخیص کردہ نوٹ بغیر استدلال کے ان کے حوالے کئے گئے' تو اس سے بات نہ بنے گی۔

تیسرا تعلیمی کمیشن*

تعلیم کی بنیادی مشکل یہ ہے کہ ہمارے ہاں اسے کماحقہ اہمیت حاصل نہیں ہو سکی۔ کئی برس تک تو یہ موضوع بالکل ہی کسمپرسی کا شکار رہا' حالانکہ احیائے تہذیب اسلامی کے جس انقلابی جذبے سے پاکستان وجود میں آیا تھا اس کا فطری اور منطقی اقتضا یہ تھا کہ دستور مملکت کے بعد سب سے زیادہ اہمیت نظام تعلیم کو دی جاتی۔ دور غلامی کا تعلیمی ڈھانچہ بلاتاخیر توڑ دیا جاتا اور ایک آزاد قوم' اور اپنا ایک مخصوص نظریۂ زندگی رکھنے والی قوم کی حیثیت سے جلد از جلد اس کے نظام تعلیم کو از سرنو استوار کر لیا جاتا۔ تعمیر نو کا پروگرام رکھنے والی انقلاب پسند قوتیں ہمیشہ اپنی اولیں اور بھرپور توجہ تعلیم ہی پر صرف کرتی ہیں' کیونکہ درس گاہیں ہی کسی تصور حیات کے مطابق تہذیب کو پھیلانے کے لئے ذہین اور فعال انسان فراہم کرتی ہیں۔ اور اس اعتبار سے قوموں کی تقدیر فردا کے فیصلے درس گاہوں ہی میں ہوتے ہیں۔

لیکن آج تک کسی نے مطلقاً اس موضوع پر توجہ ہی نہیں کی' حالانکہ دینی' سیاسی' تعلیمی اور ادبی وصحافتی حلقے نظام تعلیم کو تبدیل کرانے کے لئے بے چینی سے آواز اٹھائے ہوئے ہیں' حتیٰ کہ خود طلبہ کی نہایت منظم طاقت نے بھی اس اہم قومی مطالبے کے ساتھ اپنی صدائے مضطرب کو شامل کر دیا ہے۔

اور پھر جب مارشل لاء کے دور (۱۹۷۷ء) میں نظام تعلیم کی قسمت اس حد تک جاگی کہ اسے زیر غور لایا گیا تو جب بھی کچھ جزوی اور ضمنی مسائل کا حل نکالنے کی فکر کی گئی (قطع نظر اس سے کہ یہ حل کامیاب رہے یا ناکام!) اصل بڑا مسئلہ پھر بھی نظر انداز ہی رہا۔ ہر طرف سے مناسب مشورے دیئے جانے کے باوجود نظام تعلیم کا مکمل ڈھانچہ تبدیل کر کے اسے اسلامی اور قومی ضرورتوں کے مطابق نئی بنیادوں پر استوار کرنے' اسے ایک واضح مقصد دینے' اسے ایک آزاد قوم کے شایان شان بنانے کی ذمہ داریاں نہ تو پہلے کمیشن نے رپورٹ کی حد

* ۷۰ کی دہائی میں تحریر کردہ ایک مضمون کے اقتباسات

تک پوری کیں اور نہ موجودہ حکومت نے اس اہم فرض کے دیرینہ قرض کو ادا کرنے کا کوئی اقدام کیا۔ پس یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ نظام تعلیم اب تک مناسب توجہ حاصل نہیں کر سکا اور اس کے اہم ترین مسائل کوئی اہمیت نہیں پا سکے۔[1]

نظام تعلیم کی کم اہمیتی پر یہ حقیقت بھی خود ایک روشن دلیل ہے کہ قومی خزانے میں سے اس مد کو بہت کم حصہ ملتا رہا ہے۔ ہمارے بجٹ کا برائے نام حصہ تعلیم پر صرف ہوتا ہے اور اس کا سالانہ اضافہ انتظامیہ اور پولیس وغیرہ کی مدات سے بہت کم ہے۔

نظام تعلیم کی کم اہمیتی پر یہ حقیقت بھی ایک دلیل ہے کہ معاشرے میں سرکاری اداروں کے ذریعے مختلف فنی خدمات انجام دینے والے عناصر میں سے استادوں ہی کا طبقہ اپنے معاشی اور سماجی اور سرکاری مرتبے کے لحاظ سے سب سے پیچھے ہے جس تناسب سے کسی معاشرہ میں استاد کو مرتبہ دیا جاتا ہے اسی کے مطابق تعلیم کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

افسوس ہے کہ پہلے دو کمیشنوں کی کارگزاریوں اور سفارشات سے بھی تعلیم کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہو سکی جو اسے حاصل ہونی چاہئے۔ بظاہر تیسرے کمیشن کا دائرہ کار بھی اسے اس کا مجاز نہیں کرتا کہ وہ تعلیم کو کما حقہ اہمیت دے اور دلا سکے۔

لیکن تعلیمی دائرے میں کرنے کا عظیم الشان کام اس وقت تک کسی حکومت یا اس کے قائم کردہ کمیشن کے ہاتھوں انجام نہ پائے گا جب تک تعلیم کو معاشرہ کی تعمیر نو کے لئے درجہ اول

---

[1] ''زبانی حد تک تو ہم نے تعلیم کی برکتوں کے بہت ڈھول پیٹے ہیں مگر عملاً تعلیم ہماری فہرست ترجیحات کے شاید آخر میں کہیں درج پائی جائے گی۔ مجھے ایک ادارے کے متعلق واقعہ یاد آ رہا ہے کہ جب اس کی گرانٹ کے کاغذات متعلقہ افسر کے سامنے پیش کئے گئے تو افسر نے پوچھا کہ یہ ادارہ کرتا کیا ہے۔ انہیں بتایا گیا کہ پرانے اساتذہ یعنی غالبؔ' مومنؔ' میرؔ وغیرہ کے دواوین اور تذکرے وغیرہ چھاپتا ہے اور سر سید احمد خاں اور محمود شیرانی اور مولوی محمد شفیع کے سے اکابر کے ملفوظات محفوظ کرتا ہے۔ افسر نے فرمایا' یہ لوگ مدت ہوئی مر مرا گئے اب ان کی کتابیں چھاپنا بالکل بے معنی ہے۔ اس ادارے سے کہو کہ آج کی بات کرے' تب تک اس کی گرانٹ روک لی جائے گی اور گرانٹ سال بھر کے لئے واقعی روک لی گئی۔ سو علم و ادب کے ساتھ یہ افسر شاہانہ سلوک کیا جاتا ہے تو تعلیم میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ اسے ترجیحات کی فہرست میں نمایاں مقام حاصل ہو۔''

'' گلستان کی شرح خواندگی۔ ایک جائزہ'' از احمد ندیم قاسمی (آموز گار ماہنامہ جولائی ۱۹۹۰ء)

کی اہمیت نہ دی جائے گی اور نظام تعلیم کی مکمل تبدیلی کا عزم نہ پیدا کر لیا جائے گا۔

نظام تعلیم کے بڑے مسائل کا صحیح حل تلاش کرنے اور اسے جامہ عمل پہنانے میں دوسری بڑی رکاوٹ وہ تضاد ہے جو قوم کے مجموعی ذہن اور اس کے کارفرما طبقے کے طرز فکر میں پایا جاتا ہے۔ معاشرہ کا اجتماعی رجحان اور قوم کے دانشور طبقوں کا نقطہ نگاہ یہ چاہتا ہے کہ ہمارا نظام تعلیم اپنے اسلامی تصورات کے مطابق سرتا پا تبدیل کر دیا جائے جو تحریک پاکستان کی روح رواں تھے۔

یہ ایک عجیب صورت ہے کہ قوم کی مانگ کچھ اور ہو اور کرنے والے کام کچھ اور کرتے رہیں۔ مطالبہ ہو تعلیم کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کا' اور کارفرما طاقت اسے لے چلے مغربی نقشے پر' لوگ برسوں کی ناکام تمناؤں کے بعد یہ مژدہ سنیں کہ اب کچھ کام ہونے والا ہے' پھر وہ غور سے دیکھیں کہ کام کس نہج سے کیا جاتا ہے' اور جب کچھ ہو چکے تو وہ یہ دیکھ کر بددل ہو جائیں کہ وہ تو کچھ اور ہو گیا' اور پھر مایوسی کی دھند ہر طرف چھا جائے۔

اس طرح تو بہت کچھ ہو کر بھی کچھ نہیں ہونا۔ خدا کرے کہ کم از کم یہ تیسرا کمیشن حکمران پارٹی کو تضاد کی الجھن سے آگاہ کرے اور پرزور مشورہ دے کہ وہ معاشرہ کی اجتماعی رو کو سمجھنے اور اس کا ساتھ دینے کی کوشش کریں۔ جب تک حکمران طاقت کا ذہن اس اجتماعی روح سے ہم آہنگ نہ ہو جائے' جزوی مسائل کی کتر بیونت بار بار ہوتے رہنے پر بھی وہ بے چینی رفع نہ ہو گی جو نظام تعلیم کے بارے میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔

کسی تعلیمی کمیشن کی صحیح رپورٹ وہ ہو گی جس کا خیر مقدم قوم اپنے اجتماعی ضمیر کے اطمینان کے ساتھ کرے اور جب اسے حکومت جامہ عمل پہنائے تو معاشرہ کی اجتماعی روح احسنت و مرحبا پکار اٹھے۔

آخر یہ مشغلہ کب تک چلے گا کہ قوم گندم مانگے اور آپ اس کی جھولی میں جو ڈال دیں' وہ اس پر شاکی ہو تو پھر آپ جو کے بجائے جوار عنایت فرما دیں' وہ پھر حسرت سے آپ کا منہ دیکھے تو آپ جوار واپس لیکر باجرہ تقسیم کرنے لگیں۔ وہ متواتر گندم مانگ رہی ہے' خدارا اب سوال گندم جواب چنا کے چکر سے اسے نکالئے اور گندم کی ضرورت کو گندم ہی سے پورا کیجئے۔ اپنی ہی قوم کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے سے کیا فائدہ!

کوئی بھی تعلیمی کمیشن رائے عام اور ذہین طبقوں کی صحیح ترجمانی کے قابل نہیں ہو سکتا اور

نہ اسے بے لاگ مشورہ حاصل ہو سکتا ہے جب تک کہ تعلیم اور طلبہ کے مسائل پر ہر کسی کو کھل کر بات کرنے کا موقع نہ فراہم کر دیا جائے۔ مسائل تعلیم کو آخر کب تک ''علاقہ ممنوعہ'' بنائے رکھیں گے۔ موجودہ گھٹن کو ختم ہونا چاہئے تا کہ کھلی فضا میں معاشرے کے مختلف عناصر کھلے دل سے اظہار خیال کر سکیں۔ خوف اور بے اعتمادی کی فضا سوچنے کے لئے موزوں نہیں ہوا کرتی۔ خوف اور بے اعتمادی کو برطرف کر کے سوچئے اور سب کو سوچنے میں شریک کیجئے۔

اس کے ساتھ طالب علم کے علمی کردار (اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق) کا ریکارڈ رکھا جائے اور اس کی خاص خدمات یا کارناموں کا بھی اندراج ہو اور اس کی غلط کاریوں کا بھی۔ کردار کے اس ریکارڈ پر نمبر دیئے جائیں اور ان کو محسوب کر کے اس کی کامیابی و ناکامی کا فیصلہ کیا جائے۔ حاضریاں' پابندی وقت' اساتذہ کے لئے احترام و اطاعت' درسگاہ کے نظم و نسق کی پابندی' خدمت خلق' طلبہ سے برادرانہ رابطہ اور ان سے تعاون' کلاس روم میں شائستہ رویہ اور انداز گفتگو' انفاق فی سبیل اللہ' جھگڑالو پن سے پرہیز' فحش گوئی اور تکلیف دہ مذاق سے اجتناب' والدین سے صحیح طرز عمل' فضول خرچی سے پرہیز' سادگی کی روش' مطالعہ کی عادت' لائبریریوں کی کتب سے فائدہ اٹھانے کا معمول' فلم بینی اور آوارہ گردی سے اپنا تحفظ وغیرہ کے لحاظ سے طالب علم کی جانچ ہونی چاہئے۔

اس جائزے میں بعض اساتذہ (موجودہ ماحول کو دیکھتے ہوئے) کچھ نہ کچھ زیادتی یا بے جا حمایت کر سکتے ہیں مگر چونکہ طالب علم کا کام اور اس کا ریکارڈ کھلا ہوا سامنے موجود رہے گا۔ اس لئے بوقت ضرورت اعتراض اٹھایا جا سکتا ہے۔ معاملہ پرنسپل یا ہیڈ ماسٹر تک جا سکتا ہے۔ کردار کے ریکارڈ کے متعلق یہ ضروری ہونا چاہئے کہ کوئی مخالفانہ ریمارک پرنسپل یا ہیڈ ماسٹر کی اطلاع کے بغیر نہ دیا جائے۔

تعلیمی پالیسی ۱۹۷۸ء*

معاشرے کو اسلام کی بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے اول درجے کی اہمیت نظام تعلیم کی تبدیلی کو حاصل ہے۔

مگر ہر دوسرے دائرے کی تبدیلی کی طرح نظام تعلیم کی تبدیلی کے بھی کچھ خاص مسائل ہیں جو خصوصی توجہ چاہتے ہیں۔

پہلا مسئلہ بڑا اصولی قسم کا ہے وہ یہ کہ ایک صورت جزوی ترمیمات اور تبدیلیوں کی ہوتی ہے۔ اور ایسا اکثر ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس کے لئے کسی بڑے اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دوسری صورت پورے نظام کو نئی بنیادوں پر از سر نو استوار کرنے کی ہے۔ یہ ایک بھاری اور وسیع کام ہے اور اسے انجام دینے کے لئے بہت سی ضروریات ہیں جن کو اگر صحیح طور سے پورا نہ کیا جائے تو منزل مراد نہیں ملتی۔

ہماری مشکل یہ ہے کہ ہمارے سامنے تبدیلی کا پروگرام تو بنیادی اور جامع قسم کا ہے' مگر مردان کار زیادہ تر ایسے ہیں جو جزوی رد و بدل کے لئے موزوں ہیں۔

ایسے احوال میں جو کام ہوتا ہے اس میں طرح طرح کی الجھنیں موجود رہتی ہیں اور معاشرے میں وہ اطمینان پیدا نہیں ہوتا جس کے لئے سارا کام کیا جاتا ہے۔

اب تک تعلیم کے دائرے میں جو کچھ ہوا ہے اس کی قوت محرکہ ہمارے ان مفکرین کی کاوشیں ہیں جنہوں نے اسلامی نظام تعلیم کی امنگ پیدا کی ہے۔ پڑھے لکھے حلقوں کو انہوں نے دلائل سے قائل کیا ہے اور عام لوگوں میں ایک جذباتی طلب نمودار ہوئی ہے۔ مفکرین کے کام کو اہل صحافت' ارباب سیاست' اور اصحاب خطابت نے آگے بڑھایا اور تعلیمی تبدیلی کے مطالبے کو عوامی دائروں تک پہنچایا۔ قدرتی بات تھی کہ جوں جوں نظام اسلامی کے لئے تحریک بڑھتی جائے' ساتھ کے ساتھ نظام تعلیم کی تبدیلی کی خواہش بھی زور پکڑے۔ چنانچہ

---

* ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۷۸ء

۱۹۷۷ء میں اٹھنے والی قومی اتحاد کی طوفانی تحریک کے ابھار کے بعد تعلیمی انقلاب کا جذبہ عام ہو گیا۔ آج سیاسی جماعتیں' مذہبی گروہ' اساتذہ کے حلقے اور طلباء کی تنظیمیں اور اخبارات و جرائد کا بیشتر حصہ اسلامی نظام تعلیم کو جلوہ گر دیکھنے کے لئے بے چین ہیں۔

یہ دباؤ خاصی حد تک پہلے بھی موجود تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ دور ایوبی میں ایک نئی تعلیمی پالیسی بنی' مگر وہ عملاً بے اثر ثابت ہوئی۔ پھر ایک نئی پالیسی بھٹو صاحب کے دور میں نمودار ہوئی اور اس کے مطابق نصابات کی تدوین بھی ہوئی' مگر وہ نہایت ناقص اور ناقابل اطمینان تھی۔ اب پھر ایک پالیسی بن کر سامنے آئی ہے جس میں اگرچہ بعض پہلو بہت خوش آئند ہیں۔ اور پہلے کے مقابلے میں اسلام کے حق میں ایسی صراحتیں اس میں آ گئی ہیں جن کی مثال پہلے کی پالیسیوں میں نہیں ملتی۔ سابق پالیسیوں میں اسلام کی بات کرتے ہوئے اسلام سے گریز کی ذہنیت کارفرما تھی اور صرف پالیسی کی سطح کو خوشنما بنانے کے لئے اسلامی رنگ کی وارنش استعمال کی جاتی تھی۔ اب کے اسلام سے گریز کی وہ صورت نہیں ہے۔

مثلاً تعلیم کے مقاصد یا غایات کے متعلق جو اولین کلمات کہے گئے ہیں وہ خاصے قابل تحسین ہیں۔ صاف طور پر کہا گیا ہے کہ ہمارے تعلیمی مقاصد کو ہمارے ایمان و عقیدے (یعنی دین) کے مطابق ہونا چاہئے۔ نیز قومی نظریات اور امنگوں سے ہم آہنگ ہونا چاہئے اس اصول کے تحت نقشہ کار بہت ممیّز اور بدیہی ہونا چاہئے۔ اور اسے جرات مندی اور نیتوں کی صفائی کے ساتھ تشکیل دیا جانا چاہئے تاکہ ملک کی تعلیمی مساعی کو ایک مضبوط اور جاندار بنیاد فراہم ہو سکے۔ ملک کے باشندوں' خصوصاً طلباء کے قلوب و اذہان میں اسلام کے لئے ایک گہری اور پائیدار وفاداری پیدا کی جا سکے' اور مسلم قومیت کا ایک زندہ شعور ان میں کارفرما ہو۔ ہر طالب علم میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ وہ دنیا بھر میں پھیلی ہوئی امت مسلمہ کا ایک حصہ ہے جس کے طرز فکر میں وحدت پیدا کرنے کے لئے اسے اپنا حصہ ادا کرنا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ پوری دنیا میں دعوت اسلامی کو پھیلانے کا ذریعہ بنے۔ ان میں قرآن و سنت کے تقاضوں کے مطابق اخلاق و کردار کو نشوونما دی جائے اور قول و عمل کے درمیان فاصلوں اور خلیجوں کو پاٹ کر ان میں ایسا ولولۂ عمل پیدا کیا جائے جس کی توقع سچے مسلمان سے کی جاتی ہے۔ ان میں ایسی قابلیت و صلاحیت پیدا کی جائے کہ سماجی' قدرتی اور پیدا آور قوتوں کا موثر انضباط اسلام کے نظام اقدار کے مطابق کر سکیں۔

تعلیمی مقاصد کا یہ ملخص میں نے اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ یہ پچھلی تمام کوششوں سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

انقلابی داعیہ

مقاصد کے بیان میں اگر کوئی کمی ہے تو یہ ہے کہ اس میں ویسا انقلابی داعیہ کارفرما نہیں جس کا تقاضا اسلام کی صحیح تعبیر کرتی ہے اور جس کی مثال دور حاضر میں ایک مخالف اسلام تحریک یعنی اشتراکیت میں پائی جاتی ہے۔

اشتراکی پالیسیاں خواہ مزدوروں اور کسانوں سے متعلق ہوں' سائنس دانوں اور مصنفوں سے متعلق ہوں' سپاہیوں اور انجینئروں سے متعلق ہوں' یا تعلیم اور نشریات سے متعلق ہوں' ہر شعبے میں کام کرنے والوں کو یہ شعور دلایا جاتا ہے کہ تم ایک انقلاب کے علمبردار سپاہی ہو اور تمہیں ساری دنیا میں یہ انقلاب برپا کرنا ہے۔

ہمارے ہاں تعلیمی پالیسی کو تشکیل دینے والے فاضل حضرات میں اگرچہ طرح طرح کی علمی و تحقیقی قابلیتیں اور ٹیکنیکل مہارتیں جمع ہیں مگر ان کے ذہنوں میں انقلابیت موجود نہیں ہے۔ تجدید و احیائے اسلام کا کام تعلیم کے حلقے سے لے کر پوری زندگی کے وسیع دائرے تک سرانجام دینے کے لئے ایمانی انقلابیت کی ضرورت ہے۔ یہ انقلابیت اگر موجود ہوتی تو تعلیمی پالیسی میں ہم اس کی جھلک ضرور دیکھتے۔ موجودہ تعلیمی پالیسی میں جہاں دنیا بھر میں اسلام کا پیغام پھیلانے کا ذکر کیا گیا ہے وہاں بات بہ انداز دگر ہوتی اور طالب علم سے کہا جاتا کہ تم اسلامی انقلاب کے علمبردار اور خدا کے سپاہی ہو' تمہیں ساری دنیا کو اس پر تیار کرنا ہے کہ تمام قومیں اپنے اپنے یہاں اسلامی انقلاب برپا کریں۔

یہ نقطۂ نظر نہ صرف نئے نظام تعلیم کو موثر بنا دیتا' بلکہ نوجوان طلبہ کے دلوں کو ایسی حرکت و حرارت سے مالا مال کر دیتا کہ وہ اپنے آپ کو تبدیل کرنے میں بھی لگن دکھاتے اور ساری انسانیت کو اسلام کے پاکیزہ' فلاحی اور تعمیری انقلاب کا راستہ دکھانے کی بھاری ذمہ داری کے لئے تیاری بھی کرتے۔

غالباً یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ لفظ انقلاب کے معنی مار دھاڑ خون خرابے کے ہیں۔ حالانکہ اس اصطلاح کو یہ مفہوم تو اشتراکیوں کے عملی تجربوں نے دیا ہے۔ اصلاً انقلاب کا

بنیادی تصور یہ ہے کہ جزوی تبدیلیوں کے بجائے جامع تبدیلی مطلوب ہو' دوسرے یہ کے اس کے لئے بھرپور جدوجہد کی جائے اور تیسرے یہ کہ مزاحم قوتوں اور مخالف رجحانات سے سمجھوتے کرنے کے بجائے ان کا مقابلہ کیا جائے' نیز کرنے کے کام ادھورے یا ادھ کچرے طریق سے نہ کئے جائیں' بلکہ اصول و معیار کے مطابق کئے جائیں۔

دوسرا مفہوم انقلابی نقطہ نظر کا یہ ہوتا ہے کہ وہ جب کام کر رہا ہو تو آدمی کی سوچ بچار یوں ہوتی ہے کہ مجھے فلاں کام فلاں طریق سے ضرور کرنا ہے اور وہ اگر کچھ کرنے کا موقع پائے تو پھر کسر نہیں چھوڑتا۔ وہ حالات کو مجبور کرتا ہے کہ سازگار ہوں' رکاوٹیں دور ہوں۔ مزاحمت کرنے والے لوگوں کو خوش اسلوبی سے' یا قوت سے درست کر لیتا ہے۔ ذہن انقلابی نہ ہو تو آدمی مصلحتوں اور اندیشوں میں گھرا رہتا ہے اور ہر مزاحم قوت کو دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہے۔

ہماری تازہ ترین تعلیمی پالیسی کے پیچھے انقلابی ذہن کا کارفرما نہ ہونا اسے کمزور کر دیتا ہے۔

سائنس کی نصابی تدوین

پچھلی گفتگو کی روشنی میں اسی تعلیمی پالیسی کے ایک خصوصی باب کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ اگرچہ ایک زوردار پیراگراف سائنسی تعلیم کے متعلق لکھا گیا ہے' مگر واضح تعلیمی مقاصد کے رو سے نقطہ نظر کی جو تبدیلیاں سائنس کی تدریس و تعلیم میں آنی چاہئیں ان کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ مقاصد کو مختلف ابواب میں ہم دخیل نہیں دیکھتے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ابواب کے نوٹس الگ الگ لکھے گئے ہیں اور ان پر مقاصد والا نوٹ چسپاں کر دیا گیا ہے۔

مثلاً سائنس کی تدریس اور نصابی تدوین میں جس زاویہ نگاہ (Approach) سے اسلامی نظام تعلیم میں کام لینا ہے اور وہ یہ ہے کہ سائنس کی تمام کاوشوں' تجربوں اور انکشافات و اکتشافات کا مدعا کائنات و حیات میں کارفرما نوامیس الٰہی یا سنت اللہ کو معلوم کرنا ہے اور ان کے انطباق کی مفید راہیں نکالنا ہے۔ اشیاء اور قوتوں کے متعلق سنن الٰہیہ کا علم جتنا جتنا بڑھے گا' اتنا ہی ہم خدا کے پیدا کردہ مادی وسائل یا متاع دنیوی سے زیادہ استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس ایمانی تصور کے تحت اب بات اس طرح پیش نہ کی جائے گی کہ یہ نیوٹن کا قانون ہے اور وہ جان ڈیوی کا یا آئن سٹائن کا' بلکہ اب نیا پیرایہ بیان ہوگا کہ جان ڈیوی یا نیوٹن نے فلاں فلاں

قانون الٰہی کو دریافت کیا۔ اسی طرح یہ کہا جائے گا کہ فلاں عالم نے فلاں دائرے میں قانون الٰہی کا جو تصور اخذ کیا تھا اسے بعد کے کسی محقق نے غلط ثابت کر دیا ہے اور اب سنت اللہ کے متعلق ہماری معلومات یہاں تک پہنچی ہیں اور مزید انکشافات کا دروازہ بند نہیں ہے۔

ہر چیز متاع ہے' ہر چیز خدا کی امانت ہے۔ ہر چیز خدا کے قوانین کے تحت کام کرتی ہے اور ہر چیز سے استفادہ کرنے کے لئے خدا کی سنت کو معلوم کرنا ضروری ہے اور ہر چیز سے ان حدود میں کام لیا جائے گا جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کی ہیں۔

پھر سائنس کی تدریس میں ہمیں اپنے طالب علم کو اس احساس کہتری سے نکالنا ہے کہ سائنس بس اہل مغرب کا عطیہ ہے۔ ہمیں اس کا سرا ایک طرف تاریخ بعید میں تلاش کر کے دکھانا ہے کہ انسانیت شروع سے سائنس کے علم اور اس کے دائرہ استعمال میں اضافہ کرتی آئی ہے۔ دوسری طرف ہمیں اپنے طالب علم کے سامنے یہ حقیقت بھی رکھنی ہے کہ ہمارے اسلاف نے سائنس کا بہت سا سفر طے کیا۔ انہوں نے ایجادات کیں' علوم کی بنیاد رکھی۔ لیکن بعد میں جب ان کے اندر اسلام کی انقلابی تحریک کے دبے ہوئے جذبے میں کمی آ گئی تو ان کا سیاسی اقتدار اور اقتصادی تفوق ختم ہوا اور اس کے ساتھ سائنس کی راہ پر بھی ان کی پیش قدمی رک گئی۔ بعد ازاں ان کی یونیورسٹیوں سے پڑھ کے جانے والے ان کے شاگردوں نے مذہبی' سیاسی' معاشی و سماجی دائرے میں بھی اور سائنس اور تعلیم کے دائرے میں بھی سرگرمی سے کام شروع کیا۔ دراصل مغرب نے مختلف علوم اور سائنس کی جو عمارت بلندیوں تک پہنچا دی ہے اس کی بنیادیں مسلمانوں نے رکھی تھیں' اور اسی بنا پر ہم دور جدید کی سائنسی ترقیات میں حصہ دار ہیں۔ ساتھ ہی طلباء میں یہ جذبہ پیدا کیا جائے کہ اب انہیں اپنے اسلاف کی عظمت کا احیا کرنا ہے اور دوسرے دائروں کے ساتھ ساتھ سائنس کے سفر کو از سر نو جاری کرنا ہے۔ یہ مہم نہ صرف اقتصادی اور دفاعی لحاظ سے ضروری ہے' بلکہ بین الاقوامی وقار کے لئے لازم ہے۔

اس حقیقت نفس الامری کو بھی واضح کرنا ضروری ہے کہ اسلامی دور کی سائنسی ترقیات میں ایک یہ اصول ملحوظ رہا کہ علم اور ایجادات کو انسانی افادیت و خدمت کے لئے استعمال کرنا ہے۔ دوسرا اصول یہ کہ سائنسی تحقیقاتوں اور تجربات اور ان کے ماحصل کو اخلاقی قوانین کے تحت رہنا چاہئے۔ مثلاً ریڈیو یا ٹیلی ویژن کی ایجاد کو لیجئے' علم کے فروغ اور کردار سازی کے لئے ان کو اصلاً استعمال ہونا چاہئے تھا' پھر ایک اہم ضرورت ملکی و عالمی خبروں اور بڑے بڑے

واقعات سے عوام آگاہی حاصل کر سکتے تھے۔ شعر وادب' مناظر فطرت' کارخانوں' بندرگاہوں' چھاپہ خانوں' یونیورسٹیوں' ہسپتالوں' جیلوں' ریلوں' جہازوں' حکومت کے اعلیٰ شعبوں اور بڑے بڑے دفاتر وغیرہ کے مشاہدات بذریعہ متحرک تصاویر معلوماتی تفریح کی تعریف میں آتے۔ مگر چونکہ سائنس خدا پرست مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر مغرب کے مادہ پرست ملحدانہ ذہن کے تسلط میں نشوونما پا رہی تھی' لہٰذا ٹیلی ویژن کے پردہ پر جنسی وحشت' نفس پرستانہ عیّاشی جنون' نیز جرائم چھا گئے۔ اس طرح کے مواد کی بنیاد لادینیت پر رکھی گئی اس وجہ سے یہ ایک نئی آفت نمودار ہوئی کہ غالب اقوام نے اپنے ملحدانہ کلچر کی عالمی تبلیغ کی مہم شروع کر دی۔ یعنی سائنس کے ذریعے تمام اقوام عالم پر ملحدانہ فحش کلچر کو موسیقی کی صوتی تانوں اور نسوانی بدن کے عریاں رقصوں کی دلربائیوں کے اسلحہ سے غالب و مسلط کرنے کی جنگِ مسلسل کا آغاز کر دیا گیا۔ اول تو کم سے کم درجے کے معیار اخلاق کی رو سے ٹیلی ویژن کے وسیع الاثر تعلیمی ذریعے کو متذکرہ آلودگیوں سے پاک رکھنا چاہئے تھا۔ لیکن اگر کوئی قوم اپنے عوام کی مرضی سے ان کے لئے ایسی نشریات چاہتی تو صرف اندرون ملک کی حد تک ان کو محدود رکھنے کے لئے سائنسی ذرائع کو استعمال کرتی۔ لیکن اپنا کلچرل سماج قائم کرنے اور دوسری اقوام کے مذاہب' معاشرت اور اخلاق کی غارت گری کرنا کیسے جائز ہو گیا۔

ہر قوم کو آزادی ہوتی کہ وہ اپنے عوام کو ان کے معتقدات' ان کے تاریخی ابواب' اور اسلاف کے بلند کردار' ان کی روایات اور اخلاقی اقدار کے مطابق خود پروگرام بناتی اور اسے بیرونی مداخلت کا اندیشہ نہ ہوتا۔ لیکن دنیا بھر میں سفید فام آبادی نے نہایت تباہ کن آلودگی (Pollution) پھیلا دی ہے جس کی سمیاتی خوراکیں ہر روز گھنٹوں سمعی و بصری شعاعوں اور لہروں کے ذریعے بزرگوں' ماؤں بہنوں' نوخیز نسلوں کے فرد فرد کے دل و دماغ میں داخل کی جا رہی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ دنیا میں ہر جگہ جرائم بڑھ رہے ہیں۔ خصوصاً جنسی جرائم اور عورت کی مظلومیت کی آگ ہر معاشرے میں پھیل رہی ہے۔

ایک اور پہلو سے دیکھیں تو مغربی ممالک اور یہودیوں' بھارتیوں' کی ڈپلومیسیوں اور پالیسیوں کے مطابق ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے ذریعے سیاسی' معاشی جنگ بھی لڑی جا رہی ہے یعنی دروغ اور مکر و فریب اور منافقت کو خوب فروغ دیا جا رہا ہے۔ اس کا نام ہے علم اور ترقی۔

تعلیم نسواں

اسی طرح خواتین کا تعلیم کے باب میں کوئی اشارہ نہیں ان کے اس اختصاصی مقام کے متعلق جو خدا و رسولؐ نے واضح اور قطعی انداز میں متعین کیا ہے۔ بخلاف اس کے مغربی تہذیب نے اپنے سیکولر اصولوں اور انسان کے حیوانی تصور کے تحت ان کے لئے جو طرز و اسلوب رائج کیا ہے۔ اس سے آگے سوچنے کی جرات مسلم معاشروں میں نہیں ہے۔ آج بھی یہ ہوا باقی ہے کہ کہیں کسی جداگانہ طرز فکر کی وجہ سے ہمیں قدامت پسند اور پسماندہ نہ قرار دے دیا جائے۔ اس خود مسلط کردہ غیر اختیاری دباؤ کے زیر اثر ہم یہ بات فخر اور احساس برتری کے ساتھ کہنے کی تاب نہیں رکھتے کہ عورت کو ترقی کے نام پر جس پستی میں مغرب نے لا ڈالا ہے' ہم اپنی خواتین کے لئے اسے پسند نہیں کرتے۔ اگر واقعی مطلوب اسلام ہے تو پردہ (خواہ اس کا کم سے کم درجے کا فقہی تصور سامنے رکھا جائے) کا قانون لازم ہے۔ گھروں کے باہر صنفین کا بے محابہ قسم کا اختلاط (Free Mixing) درست نہیں ہے۔ گھر کے ادارے کا تحفظ اور بنیادی انسانی رشتوں اور روابطوں کا استحکام مطلوب ہے تو نئی نسل کو پوری مادری توجہ کی فراہمی ضروری ہے۔ نسائیت کے وقار و احترام کی کڑی حفاظت موجودہ دور کی کاروباریت اور دولت پرستی اور جنسی ہیجانات کے مقابلے میں شدید طور پر اہم ہے۔ خواتین کی تعلیم کا مسئلہ اسلام کے ان بنیادی تصورات کے فریم میں رکھ کر زیر غور لانا چاہئے۔

اس کے لئے نظام تعلیم میں لازمی طور پر خواتین کے لئے جداگانہ تعلیمی اداروں کا انتظام ہونا چاہئے اور مخلوط تعلیم کو یکسر ختم کر دینا چاہئے۔ پہلے جو تعلیمی مدارج (Tiers) تھے ان کے لحاظ سے معاشرے کا یہ مطالبہ تھا کہ یونیورسٹیوں کی سطح پر خواتین کے لئے تعلیمی انتظام جداگانہ ہو۔ چنانچہ خواتین یونیورسٹی کا آوازہ نیچے ہی سے نہیں اوپر سے بھی سنائی دیا اور ملک میں اس کی گونج بڑی مسرت سے محسوس کی گئی۔ اب تعلیمی مدارج کی نئی تقسیم کی صورت میں ہم یہ کہیں گے کہ نویں جماعت سے جو آئندہ ہائر سیکنڈری سکولوں یا انٹرمیڈیٹ کالجوں کا حصہ ہو گی' خواتین کی تعلیم کے لئے الگ غیر مخلوط ادارے قائم کئے جائیں۔

بدقسمتی سے آہستہ آہستہ خواتین یونیورسٹی کا آوازہ عملی اقدام نہ ہونے کی وجہ سے دبتا چلا گیا اور نئی پالیسی نے تو گویا اسے بالکل مدفون کر دیا ہے۔ خصوصاً نئے مدارج تعلیم کی تقسیم

خاصی پیچیدہ صورت حالات پیدا کرنے کا باعث ہوگی۔

میں کہتا ہوں کہ جس تعلیمی پالیسی کے بنیادی مقاصد میں واضح طور پر ایک مقصد یہ بھی رکھا گیا تھا کہ طلبہ کی زندگیوں میں قول و عمل کے فاصلوں کو ختم کرنا ہے۔ وہ پالیسی خود اسلامیت کے دعوے سے تضاد رکھتی ہے۔

اگر تعلیمی دانشوروں میں خدا اور رسولؐ کے لئے حقیقی ایمان موجود ہے تو انہیں یا تو جرات سے مغربیت اور سیکولرازم کے بنائے ہوئے طلسم ترقی کو توڑ کر خواتین کی تعلیم کا جداگانہ انتظام کرنے کا اعلان کرنا چاہئے اور یا اس پالیسی میں یہ لکھ دینا چاہئے کہ اسلام کے جو تقاضے خواتین کی تعلیم کے متعلق ہیں وہ ہم پورے نہیں کر سکتے۔

بہرحال نئی تعلیمی پالیسی کے پیچھے حقیقی انقلابی ذہن کارفرما نہیں ہے۔

انقلابی ذہن

انقلابی ذہن وہ ہوتا ہے جو کسی بھی تبدیلی کے لئے برسوں سوچ بچار کرتا ہے۔ غلط حالات پر مضطرب ہوتا ہے' صحیح نقشے کے کارفرما ہونے کے لئے دعوت دیتا ہے' متعلقہ سوالات اور الجھنوں کو حل کرتا ہے' اس کے اندر دانش وری کے ساتھ ساتھ ایک ایمانی شعور اور انقلابی جذبہ موجود ہوتا ہے۔

یہاں چونکہ اسلامی جذبہ انقلاب کے ساتھ مسئلہ تعلیم پر سوچنے والے ذہن پس منظر میں ہیں اور جن لوگوں کو تعلیمی سندات اور عہدوں کی وجہ سے نیا نقشہ تعلیم بنانے پر لگایا گیا تھا وہ نہ تو انقلابی دردمندی رکھتے ہیں' نہ ویسی حرکت و حرارت۔ وہ محض ٹیکنیکل ماہرین ہیں۔ وہ ایک کمپیوٹر کی طرح کام کر سکتے ہیں۔ آپ نے کہا کہ فلاں تبدیلی مطلوب ہے' انہوں نے انجینئرز کی طرح اس کا خاکہ مرتب کر دیا' یہ خاکہ بڑا وقیع ہے۔ ان کی پالیسی بڑی شاندار ہے مگر سارے نظام تفکر کی رگوں میں گردش کرنے والا وہ خون نہیں ہے جو ہونا چاہئے بلکہ ستم ظریفی یہ بھی ہے کہ ایسے ماہرین بھی اس ''اسلامی مہم'' میں شریک رہے جو بنیادی طور پر اس بات کے مخالف ہیں کہ یہاں سچ مچ کی کوئی مکمل اور صحیح اسلامی تبدیلی نمودار ہو۔

کانفرنس نے کام کا دوسرا حصہ کمیٹیوں کے سپرد کر دیا اور کمیٹیوں نے افراد میں تقسیم کر دیا۔

نصاب سازی کا معاملہ بھی خوب ہے

بھٹو دور میں نصابات کا جو نیا سلسلہ تیار کیا گیا تھا انہی لکھی لکھائی (بلکہ شاید چھپی چھپائی) کتابوں میں ترامیم کر کے تازہ پالیسی کے قریب لایا جارہا ہے۔ اس کام میں زیادہ تر منفی اقدام یہ ہے کہ اسلامی عقائد و مقاصد اور نظریہ پاکستان کے خلاف کوئی چیز باقی نہ رہے۔ جن نصابات کا پورا ڈھانچہ کسی اور طرح اٹھایا گیا ہو اب ان کو منفی ترمیمات سے کارآمد بنانا عجیب سی بات ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی اور یہ "نئی" نصابی کتب (Text Books) اکٹھی آ رہی ہیں قدرتی طور پر اثر یہی پڑے گا کہ نئی درسی کتب نئی پالیسی کی آئینہ دار ہیں۔ اس طرح نئی تعلیمی پالیسی کے بارے میں حسن ظن کا پیمانہ کمی کی طرف جائے گا۔

کہا جا سکتا ہے کہ عبوری دور کے لئے یہ کام چلانے کی مناسب ترکیب ہے مگر کیا واقعی مناسب ہے؟

ضمناً ایک دلچسپ بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ مرکزی انقلابی ذہن کی رہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے مختلف مضامین اور درجوں کے لئے اتنے مختلف الخیال حضرات نے اپنے اپنے رنگ میں کتابیں لکھی اور لکھوائی ہیں کہ نتائج کار کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیسا انتشار ہے جو آئندہ تعلیم کے لئے نمودار ہو گیا ہے۔

مثلاً ایک صاحب کو موقع ملا تو انہوں نے انیس دو بیر کے چار چھ مرثیے اردو کورس میں گھسا دیئے۔ پھر مرثیوں کے بھی ایسے حصے نصابات میں دینے کی روایت چلی آ رہی تھی جس میں صبح و شام کے مناظر دکھائے جاتے تھے' مگر اب تو ایسے حصے لائے گئے ہیں جن میں داستان کربلا کو ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھا گیا ہے اور اس کی تعلیم ساری قوم کے بچوں کو دی جائے گی۔

پھر کسی اور نے مولانا جعفر ندوی کا وہ مضمون داخل نصاب کر دیا جو قل العفو کے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے غیر معیاری انداز سے لکھا گیا ہے۔ حیرت ہے کہ ندوی صاحب کی جس تحریر پر اختلافی بحثیں ہوتی رہیں اور متعدد مضامین جواباً لکھے گئے' اسی اختلافی تحریر کو اٹھا کر طلباء کے سرتھوپ دیا گیا ہے کہ وہ چار و ناچار اسے پڑھیں اور اس کو ترجمانی حقیقت' تفسیر قرآن اور تعبیر تاریخ سمجھیں۔

پھر ستم ظریفی یہ ہے کہ شیعہ سنی اتحاد کے نام پر ایسی چیزوں سے بچ کر نکلنے کا فیصلہ کیا گیا ہے جن سے کوئی ایک گروہ اختلاف رکھتا ہو۔ اس اصول کے تحت خلافت راشدہ کا تین چوتھائی دور تاریخ سے حذف کرنا ہوگا (پھر باقی کیا رہے گا) یا صرف ایسی آیات و احادیث پڑھانے کی پابندی جن پر دونوں فریق متفق ہوں' یہ معنی رکھتا ہے کہ شیعہ نقطہ نظر سے جو چیز درست نہ ہو' وہ خارج کر دی جائے۔ یعنی اقلیت کی مرضی چلے اور اکثریت اپنی اولادوں کو صحیح دینی تصور' صحیح احکام اور محترم شخصیتوں اور ان کے کارناموں سے بے خبر رکھے۔ گویا ترتیب بالکل الٹ گئی کہ نظام تعلیم اکثریت کے عقائد و تصورات کا حامل ہوتا ہے' اقلیتوں کو کچھ مراعات دی جاتی ہیں۔

اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ اگر اسی تجربے کی بنیاد پر مصر میں یہ بات طے پائے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں (عیسائیوں سے اپنے کسی فرقے کو تشبیہ دینا مطلوب نہیں) کے اتحاد کے ضروری ہے کہ صرف ایسی چیزیں قانون اور تعلیم میں لائی جائیں جن پر دونوں متفق ہوں۔ اس کے بعد کیا رہے گی اسلامیت

اتحاد کا عجیب فارمولا کسی زرخیز دماغ نے نکالا ہے

اردو بطور تعلیمی زبان

اردو زبان کو پوری طرح تعلیمی زبان کی حیثیت دینے کے مطالبے میں یہ بات از خود شامل تھی کہ اردو میڈیم اور انگریزی میڈیم اسکولوں (کانونٹ اور پبلک اسکول) کے دو الگ الگ دھارے جس طرح بہہ رہے ہیں ان کو ایک کیا جائے۔

نئی تعلیمی پالیسی یہ بھی نہ کر سکی۔

حال ہی میں وزیر تعلیم کا ایک اخباری بیان نظر سے گزرا جس میں تعلیمی پالیسی ہی کی ترجمانی کی گئی ہے۔ انہوں نے یہ فرمایا کہ گورنمنٹ کے اپنے قائم کردہ انگریزی میڈیم اسکولوں کو حکم دے دیا گیا ہے کہ وہ اردو زبان کو رائج کریں۔ اس حکم سے خوشی کی ایک لہر عام لوگوں میں دوڑ گئی' مگر حقائق کے جاننے والوں کے لئے اس حکم کی زد اتنی محدود تھی کہ کوئی بڑا حقیقی فرق واقع نہیں ہوگا۔ میں قطعی اعداد و شمار تو حوالے کے بغیر نہیں دے سکتا مگر اندازاً کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں انگریزی میڈیم سکول کی تعداد ساڑھے سات سو سے کچھ اوپر ہے ان

میں سے گورنمنٹ کے کوئی دس بیس اسکول ہوں گے ان میں اگر اردو زبان رائج بھی ہو جائے تو اڑھائی صد سے زائد اسکول علی حالہا باقی رہیں گے۔ علاوہ بریں انگریزی میڈیم اسکولوں کی ایک تعداد فوج کی بھی ہے۔ ان سے بھی ۱۵ سال تک کوئی تعرض نہیں کیا جا سکتا۔

اب اگر مخلصانہ اور حنیفانہ نقطہ نظر سے سوچا جائے تو ایک حکم سے تمام کے تمام انگریزی میڈیم اسکولوں کو اردو کے زیر نگیں لایا جا سکتا تھا اور وحدت تعلیم پیدا کی جا سکتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ بیرونی مشنری کانونٹ اسکولوں کے ساتھ بحالات موجودہ یہ نرمی برتی جا سکتی تھی کہ وہ قائم رہیں مگر کوئی پاکستانی طالب علم ان میں داخلہ نہیں لے سکتا۔

سکولوں کو چھیڑے بغیر ایک طریقہ اور بھی ہے۔ بس اتنا فیصلہ کرنا کافی ہے کہ تمام امتحانات اور انٹرویوز اردو زبان میں ہوں گے۔[1]

نئی تعلیمی پالیسی اس اہم معاملے میں ادائے فرض کے صحیح معیار سے بہت پیچھے رہ گئی ہے۔

بلکہ اس میں غیر ضروری طور پر پچھلی ایک روایت کی مکھی پر مکھی ماری گئی کہ ابتدائی مدارج میں قومی زبان اردو کے ساتھ ساتھ مقامی علاقائی بولی کو بھی ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے

---

[1] اردو کو اس کا صحیح مقام دینے کے لئے بعض چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں بہت نتیجہ خیز ہو سکتی ہیں مثلاً یہ کہ کابینہ کی تمام کارروائیاں اردو میں ہوں گی۔ ایسے افراد کو وقتی طور پر استثنیٰ دیا جا سکتا ہے جو اردو میں تقریر نہ کر سکیں۔ اس طرح ایک موثر تبدیلی یہ ہو سکتی ہے کہ تمام محکموں کے سیکرٹری حضرات فائلوں پر تلخیصی نوٹ اردو میں لکھیں گے۔ مزید قابل توجہ اہم اور موثر صورتیں یہ ہیں:

۱۔ پبلک سے تعلق رکھنے والے تمام دفتری فارم اردو زبان میں ہوں گے۔ (خواہ کوئی دوسری زبان بھی ساتھ استعمال کی گئی ہو۔)

۲۔ تمام فرموں کی رجسٹریشن کے لئے لازم ہوگا کہ وہ اپنے میمورنڈم اور آرٹیکلز اردو میں داخل کریں۔ نیز اپنے سائن بورڈوں' لیٹر فارموں اور مہروں وغیرہ میں اردو کو لازماً استعمال کریں۔

۳۔ دفتروں اور دکانوں کے تمام بورڈ لازمی طور پر اردو میں ہوں گے۔ ضرورت ہو تو ساتھ دوسری زبان استعمال کی جا سکتی ہے۔

۴۔ تمام گاڑیوں کی نمبر پلیٹیں اردو میں ہوں گی۔

۵۔ ریلوے' بسوں' ڈاک کی ٹکٹوں' رسیدی ٹکٹوں' نیز کھیل یا تفریح سے متعلق تمام ٹکٹوں پر اردو میں اندراجات ضروری ہوں گے۔

برتا جائے۔ فی الحقیقت اتنی بات کافی تھی کہ اساتذہ مقامی علاقائی بولیوں کو ذریعہ تعلیم بنا سکتے ہیں' مگر اس معنی میں ذریعہ تعلیم صرف اردو زبان ہو گی کہ نصابات اردو میں ہوں گے اور امتحانات بھی اردو زبان میں لئے جائیں گے۔ اگر یہ نہیں تو پھر ذہنی پراگندگی ضرور نشوونما پائے گی۔

اہمیت اساتذہ

نئی تعلیمی پالیسی نے اپنے روبعمل لانے کے لئے اساتذہ کے پارٹ کی شدید اہمیت کو واضح کرنے کے باوجود ان سے محض اتنا ہی مطالبہ کیا ہے کہ وہ تعلیم کی فنی صلاحیتوں کے ساتھ نظریہ پاکستان سے گہری وابستگی رکھتے ہوں۔ اسلام کا جو پرزور راگ مقاصد میں چھیڑا گیا تھا' یہاں آ کر اس کے سُر بے حد دھیمے ہو گئے ہیں۔ اصل شئی مطلوب اسلامیت تھی' یہاں وہ پاکستانیت تک محدود ہو گئی ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ کیا کسی اسلامی نظام تعلیم میں کام کرنے کے لئے ایسے لوگ موزوں ہو سکتے ہیں جو اسلام کا علم نہ رکھتے ہوں یا اسلام پر عمل نہ کرتے ہوں؟

اگر اسلامی نظام تعلیم محض ایک سائن بورڈ نہیں ہے بلکہ اسے قطعی طور پر روبکار لانا ہے اور اب اسلامیات محض ایک مضمون ہی نہ رہے گا بلکہ تمام مضامین کی رگ رگ میں دین کے مرکزی اور بنیادی علم کو سرایت کرنا ہے تو پھر کسی بھی مضمون کو پڑھانے کے لئے اسلامی ذہن و کردار کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے اساتذہ کی ٹریننگ کے باب میں کوئی نقشہ نہیں بنایا گیا۔ ساتھ ہی یہ امر بھی قابل غور ہے کہ موجودہ اساتذہ جو کئی سال تک کام کرتے رہیں گے۔ ان میں کمیونسٹ' ملحد' مذہب دشمن' مغرب پرست' سیکولرازم کے قائل' قادیانی اور کج کردار لوگ بھی بکثرت موجود ہیں۔ یہ ساری تعلیمی فوج مل کر اسلام کے لئے کیا فتوحات کر سکے گی۔

اسلامی نظام تعلیم کو جس دن سے شروع کرنا ہو' اس دن سے اعلان کر دیجئے کہ اب ہماری درسگاہوں کو صرف مسلم ذہن و کردار کے لوگوں کی ضرورت ہو گی' بقیہ حضرات ابھی سے اپنے مستقبل کی راہ ڈھونڈ لیں۔

لیکن نئی تعلیمی پالیسی ایسے کسی اقدام کے آثار اپنے اندر نہیں رکھتی ہے۔

میں آخر میں یہ بات کہنے پر مجبور ہوں کہ سارے معاملے کو از سر نو سوچا جائے اور

انتخابات سے پہلے پہلے تعلیمی پالیسی کی اصلاح بھی ہو جانی چاہیے۔ نئی پالیسی کے تحت لکھی جانے والی درسی کتب سے قبل کے عبوری دور کے لئے فوری طور پر بھٹو دور کی لکھوائی ہوئی درسی کتب کو بہتر بنا کر اس کے ساتھ مختصر اضافی کورسز شامل کیے جائیں۔

لیکن تعلیمی گاڑی کو صحیح پٹڑی پر ڈالنے کے لئے ایسے انقلاب پسند ذہنوں کو تلاش کیا جائے جو برسوں سے اسلامی تعلیمی انقلاب کے مسئلے پر سوچتے رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کی سربراہی میں ماہرین کی ٹیمیں کام کریں گی تو چول سے چول درست بیٹھے گی۔ ورنہ معاشرہ پھر ایک نئی تعلیمی پالیسی کے انتظار میں بے چین رہے گا۔

انگریزی زبان کی بالادستی —

جمہوریت کے نام پر

ہمارا حال ایک ایسے آسیب زادہ آدمی کا سا ہے جس پر کسی روح بد نے اپنا منحوس سایہ ڈال رکھا ہو۔ اس کا اپنا دماغ' اپنی زبان اور اپنے ہاتھ پاؤں اس کے بس میں نہ ہوں بلکہ وہ آسیب کی بولی بولے' آسیب کی باتیں ادا کرے' اس کی ہر جنبش آسیب کے منشا کے مطابق ہو' اس کے اپنے عادات و اطوار اور ذوق و آداب سب گم ہو جائیں' اس کی اپنی شخصیت مٹ جائے اور ایک اجنبی شخصیت اس کے پیکر میں اپنا آشیانہ بنا لے۔ ذہنی غلامی کا آسیب ہمارے سروں پر ایسا سوار ہوا ہے کہ گھروں' بازاروں' ذرائع ابلاغ' تعلیم گاہوں' پارلیمانی اور حکومتی دفتروں تک اس آسیب کے منحوس سائے پھیلے ہوئے ہیں۔

سو جب تک ہم اپنے آسیب کی زبان اور لہجے میں بات کر رہے ہیں ہمارے دل و دماغ سب اسی کے قبضے میں ہیں۔ وہ جب رخصت ہوگا تو سب سے پہلے ہماری زبان ہی شہادت دے گی کہ بلا ٹل گئی۔

وزارت تعلیم کے مراسلے مورخہ ۲ رمئی ۱۹۷۹ء کی ایک کاپی نجانے کن صاحب نے مجھے بھجوائی ہے اور اس پر اخباری مراسلے یا نوٹ بھی لکھے گئے ہیں۔ اس مضمون کا مدعا آئندہ کے لئے جماعت اول سے سرکاری اسکولوں میں انگریزی کی تعلیم کا اجراء ہے۔ تمام صوبائی حکومتوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ لوگوں (یا طلبہ) کی مرضی کے مطابق انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اختیار کرنے کی اجازت دی جائے۔ جہاں پہلے سے اردو ذریعۂ تعلیم کے طور پر رائج ہو وہاں انگریزی کی تعلیم بطور ایک اضافی زبان کے' پہلے درجے سے شروع کی جائے۔

اس سے ظاہر ہے کہ مغربی جمہوریت میں خاص طور پر وہ جس شکل میں مشرقی اور ایشیائی ممالک میں رائج ہے وہاں کہیں تو اکثریت ایک وحشی قوت بن جاتی ہے اور کہیں علاقائی

اقلیتیں وفاقی برادری کو علیحدگی کی دھمکی دے کر اس سے اپنے غیر منصفانہ مطالبے منواتی ہیں اور کہیں اقتدار (وزارت) پر آنے والی قوت پوری طرح فسطائیت سے کام لے کر اندھا دھند جو کام چاہے کر گزرتی ہے اور جو حکم چاہے ٹھونس دیتی ہے تو۔

یہی آخری صورت اس حکم نامے میں کام کر رہی ہے۔

اس موضوع پر جن اعلیٰ درجے کے مفکرین نے عمروں کام کیا اور دلائل کے انبار لگا دیئے' ان میں مولوی عبدالحق مرحوم[1] سے لے کر ڈاکٹر سید محمد عبداللہ مرحوم تک اور آج جتنے ماہرین موجود ہیں یا اساتذہ کی جو تنظیمیں میدان میں ہیں' یا نظریۂ پاکستان کے مطابق نظام تعلیم سے دلچسپی لینے والے افراد اور ادارے کام کر رہے ہیں یا جو بہت سی تصانیف اس موضوع پر موجود ہیں ان سب کی طرف سے آنکھیں بند کر کے یہ حکم جاری کیا گیا ہے۔ حد یہ ہے کہ خود عوامی اور جمہوری ایوان میں بھی اس پر بحث نہیں ہوئی۔ عوامی حلقوں سے اخباری بحثوں کے ذریعے استصواب نہیں کیا گیا۔ یکے بعد دیگرے جو تعلیمی پالیسیاں اور رپورٹیں پہلے بنتی رہی ہیں ان سے بھی قطع نظر کر لیا گیا ہے۔

یہ نہیں تو پھر چند عقلی دلائل سامنے رکھیے۔

---

[1] جب ہر مضمون اور علم کا سیکھنا کسی ایسی غیر زبان کے ذریعے لازم قرار دیا جائے جو بالکل اجنبی ہو تو وہ ایک عذاب ہو جاتا ہے۔ قوائے جسمانی و ذہنی مضمحل ہو جاتے ہیں۔ اور جدت و جودت مفقود ہو جاتی ہے۔ ایک قوت تو خود زبان سیکھنے کی ہے اور دوسری اس کے ذریعے اس سے مضمون سمجھنے کی' نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ تو زبان پر پوری قدرت حاصل ہوتی ہے اور نہ مضمون پر' اور وقت دگنا بلکہ کئی گناہ زیادہ صرف ہوتا ہے اور عمر کا سب سے عزیز حصہ اس الجھن میں بے کار جاتا ہے۔ دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا ملک ہوگا جو اس مخمصے میں مبتلا ہو۔

دوسرا بڑا عیب یہ ہے کہ انتہائی تعلیم تک ہر مضمون انگریزی زبان اور انگریزی یا دوسرے یورپی مصنفین کی لکھی ہوئی کتابوں کے ذریعے پڑھنے سے طلبہ کے طرز فکر و خیال پر بڑا اثر پڑتا ہے اور غیر محسوس طور پر وہ اسی رنگ میں رنگے جاتے ہیں' نقالی اور تقلید غالب آ جاتی ہے۔ اس ذہنی نکبت کی وجہ سے وہ بے لاگ غور فکر سے قاصر رہتے ہیں' ان میں اور ان کے ماحول میں مغائرت پیدا ہو جاتی ہے جو قومی ترقی اور نشوونما کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ ''اردو یونیورسٹی وقت کا اہم تقاضا''

تعلیم اور ذریعہ تعلیم ـــــ قومی مسئلہ

تعلیم اور ذریعہ تعلیم کا مسئلہ قومی ہے۔ تعلیم کا مقصد جہاں معلومات دینا ہے' وہاں تہذیبی طور پر نئی نسلوں کے چہروں اور خدوخال کو ان کے نظام' عقیدہ و فکر' ان کی اخلاقی اقدار' ان کے تہذیبی شعائر اور ان کی تاریخی روایات کے مطابق ڈھالنا ہے۔ دنیا میں کوئی مثال ایسی موجود نہیں کہ کسی قوم کے بچوں نے بدیسی زبان میں غوطہ زن ہو کر اپنی تہذیب کے موتی سمیٹے ہوں۔ انگریزی خود ایک تہذیب کی ترجمان ہے جو اسے پڑھے' بولے اور لکھے گا' وہ ٹھیک اس تہذیب میں رنگتا چلا جائے گا جو انگریزی زبان کے ہر لفظ اور ہر جملے میں شامل ہے۔ ایسا ہی ہے کہ جیسے شیر کو آپ خوگر بنا رہے ہوں کہ گھاس کھا کر گزارا کرے۔

اب تک ہماری قوم نے جس سطح تک انگریزی سیکھی ہے اور جس طبقے میں اس نے نفوذ کیا ہے' اس پر غور کر کے دیکھ لیجئے! اسی کے مطابق ان کے رہن سہن' کھانا پینا' میل جول' برتن بستر' شعر و ادب' نظریات و افکار' پیمانہ خیر و شر اور معیارِ صداقت بدل کر ٹھیک مغرب کے مطابق ہو گئے ہیں' بلکہ ان کا بدترین اثر اندھی تقلید کی صورت میں پڑا ہے' ظاہر میں بھی تقلید اور قلب و ذہن میں بھی تقلید' دوسرے لفظوں میں انگریزی زبان کی تعلیم کے نتیجے میں دوہری غلامی مسلط ہو گئی۔[1]

خالص انگریزی زبان میں اول تا آخر پڑھنے والے طبقوں سے نہ کوئی صاحب تحقیق اٹھا اور نہ صاحب تخلیق' اگر کسی نے کچھ کام کیا بھی تو چاہے وہ اردو میں ہو' چاہے انگریزی میں وہ ہمیشہ ادنیٰ درجے ہی کا رہا۔ یہ نظام تعلیم برسوں کے تجربے کے باوجود آج تک کلرک اور بابو یا زیادہ سے زیادہ دفتری افسر پیدا کر سکا ہے۔ اس کے ذریعے نہ سائنس دان پیدا ہوں گے' نہ علمی شخصیتیں نہ شعراء و ادباء۔

---

[1] دوہری غلامی...... یعنی تعلیمی غلامی اور لسانی غلامی...... جس دن ہمارے سروں سے ٹل گئیں اس دن دوسری تمام غلامیاں ختم ہو جائیں گی۔ لسانی غلامی خود اسی تعلیمی غلامی کا ایک شعبہ ہے جامع مسئلہ تعلیمی غلامی ہی کا ہے ابھی تک تو حال یہ ہے کہ

مکتب از مقصود خویش آگاہ نیست

اس لئے شاہین بچوں کو خاک بازی کا سبق مل رہا ہے اور تعلیم کے تیزاب میں آہنی خودی کو ڈال کر راکھ کا ڈھیر بنایا جا رہا ہے۔

اردو زبان کی صلاحیت

عثمانیہ یونیورسٹی نے اردو کو ذریعہ تعلیم بنا کر اور ہر شعبے میں اعلیٰ درجے کے علماء و محققین تیار کر کے اس نظریہ کی جڑ مار دی تھی کہ ابھی اردو میں اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ انگریزی کی جگہ ذریعہ تعلیم بن سکے۔

اپنی زبان کے ذریعے جو ذہن بنتا ہے وہ فعال اور متحرک ہوتا ہے چنانچہ گھر سے مذہب اور سکول سے اردو سیکھ کر جو لوگ آگے بڑھے ان میں بے شمار نامور شخصیتیں ابھریں جنہوں نے انگریزی زبان میں بھی قابلیت دکھائی۔۔۔۔ محمد علی جوہر، ظفر علی خاں، اقبال کو دیکھ لیجئے پھر سر سید احمد خاں، پرنسپل ضیاء الدین، ذاکر حسین، غلام السیدین اور بے شمار دوسری نامور شخصیتوں پر نظر ڈالئے۔ سائنس میں ہمارے ہاں چوٹی کا آدمی ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اردو ذریعہ تعلیم والی عثمانیہ یونیورسٹی میں ہی پروان چڑھا۔ اس درجے کا کوئی دوسرا آدمی انگلش میڈیم درس گاہوں سے پاکستان بننے کے بعد آپ نے تیار کر کے معاشرے کو دیا ہو تو ذرا سامنے لائیے۔

قومی اور علاقائی زبانیں[1]

اوپر ہم نے تعلیم اور ذریعہ تعلیم کو قومی مسئلہ کہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس معاملے میں صوبائی کھینچا تانی اور لسانی گروہوں کے تعصبات کے ٹکراؤ کو دخل دینے کا کوئی موقع نہیں ملنا چاہئے پہلے ہر جگہ اچھی خاصی رو چل رہی تھی، جب پاکستان بنا تو پھر باری باری ہر صوبے سے آواز اٹھی کہ "پہلے ہماری زبان" ارے خدا کے بندو! دنیا میں جہاں جاؤ، علاقائی زبانیں دسیوں ہوتی ہیں، مگر ذریعہ تعلیم، ذریعہ انصاف، ذریعہ کاروبار، ذریعہ ادب و صحافت، ذریعہ دفتری امور وہ واحد قومی زبان ہوتی ہے، جسے سب علاقوں میں سمجھا جاتا ہے اور جس کے ذریعے ہر جگہ کام چلایا

[1] ہمارے ہاں ایک عنصر ایسا موجود ہے جس کی نیت علاقائی زبانوں کے معاملے میں نیک نہیں ہے۔ وہ ہر علاقے میں علاقائی زبان کا سرپرست خاص بنا بیٹھا ہے۔ پہلے وہ کسی علاقائی زبان کا معصومانہ راگ الاپتا ہے، پھر علاقائی کلچر کا نعرہ بلند کر کے ناچ شروع کر دیتا ہے، پھر علاقائی حقوق و مفاد کا ہنگامہ بپا کرتا ہے، یہاں تک کہ علاقائی قیادتیں وجد و حال میں آ کر گتھم گتھا ہونے لگتی ہیں۔ زبان کے مسئلے کا ایک سرا بڑا معصومانہ ہے اور دوسرا سرا سیاسی فتنوں سے جا ملتا ہے۔

جاتا ہے۔ باقی زبانیں اپنی اپنی جگہ باقی ہیں اور ان میں ادبی و ثقافتی کام ہوتے رہتے ہیں۔ قومی زبان تو وہ ہوگی جو ہماری اسلامی تہذیب اور ہمارے اصول و مقاصد کو ہمارے اس ماحول کے مطابق ابھار دے جس میں ہم رہ رہے ہیں۔

اس مقصد کے لئے ساری زبانوں کے علمی ادبی سرمائے کو جمع کر کے اور اس کے بعد ملکی اور غیر ملکی درس گاہوں کا اندازہ کر کے پھر یہ فیصلہ کیجئے کہ قومی اور تعلیمی زبان کس کو بنایا جائے۔ اگر زبان اور اسلام اور پاکستان جیسے معاملات کو آپ ٹیڑھا ترچھا کرتے رہے تو یہ تکون کبھی بھی نہ بن سکے گی، جس پر ہماری زندگی اور ترقی کا دارومدار ہے۔

اصل خرابی

اصل خرابی کا حل آپ کے پاس نہیں ہے۔ آج سے ۵۰/۶۰ سال پہلے ہمارے دیہاتی علاقوں کا نوجوان اگر اینگلو ورنیکلر مڈل اسکول سے سند کامیابی لے لیتا تھا تو وہ کسی معاملے میں دس جملے بول بھی سکتا تھا۔ دس جملے کا خط یا درخواست لکھ سکتا تھا، لیکن اس سے بڑھ کر بعض خاص بڑی یونیورسٹیوں کے تحت یا خاص ہائی اسکولوں میں انگریزی کی تعلیم اتنی معیاری ہوتی تھی کہ چھٹے درجے سے آغاز کر کے دسویں تک ۵ سال میں وہ مطالعہ کے علوم کی کنجیاں حاصل کر لیتا تھا۔

فرق یہ تھا کہ ادھر اس کی اردو[1] بہت اچھی ہوتی تھی: تاریخ، جغرافیہ، حفظان صحت، معلومات عامہ اور ریاضی، الجبرا، جیومیٹری میں مضبوط مقام رکھتا تھا۔ آج یہ اس لئے نہیں ہو سکتا

---

[1] آج تو اردو اس لحاظ سے بڑی ہی معصوم ہے کہ نہ تو درست اردو مدرسوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ اور نہ اردو بولنے اور لکھنے والے صحت زبان کی زیادہ فکر کرتے ہیں۔ بدقسمتی یہ کہ اردو کے پرانے مرکز اجڑ گئے ہیں، جن علاقوں میں اہل زبان رہتے تھے وہ پاکستان سے الگ ہو گئے اور جو اہل زبان مہاجر بن کر پاکستان کے حصے میں آئے وہ خود سندھ اور پنجاب اور صوبہ سرحد میں اس طرح بکھر گئے ہیں کہ خود ان کا اپنے بچوں کی زبان کو تباہی سے بچا لے جانا ممکن نہیں رہا اور حال یہ ہے کہ اچھے اچھے مقرر، صحافی، ادیب اور شاعر تک زبان کی فاش غلطیاں کرتے ہیں۔ اندریں حالات نہایت ضروری ہے کہ اردو کے قواعد، محاورات، روزمرے اور تلفظ کے بارے میں اتنا وسیع لٹریچر موجود ہو کہ جس سے ہمارے اساتذہ و طلبا بھی استفادہ کر سکیں اور ہمارے مقررین صحافی اور ادیب بھی۔

کہ نہ آپ ٹیچر کو صحیح طور پر تیار کر سکتے ہیں نہ اس سے صحیح طور پر کام لے سکتے ہیں اور نہ درسگاہوں میں نظم قائم کر سکتے ہیں' نہ امتحانات میں دیانت داری کا ماحول پیدا کر سکتے ہیں۔ اپنی اس ''کوتاہی کا ازالہ'' آپ درجہ اول سے انگریزی تعلیم کا بار چار پانچ سال کے بچے پر ٹھونس کر کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ جن خرابیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے' ان کے ہوتے ہوئے یہ بھی لایعنی حرکت ہوگی۔

بچے اور اجنبی زبان

اب ذرا بچوں پر نگاہ ڈالئے! اس وقت بھی حال یہ ہے کہ دس دس سیر کے بستے کندھوں سے لٹکائے معصوم بچے اسکول سے نکلتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ کسی قلی سے سامان اٹھوا کر لے جایا جارہا ہے۔ کبھی آپ نے ان کو دیکھا' کبھی ان پر رحم آیا۔

پھر ان بچوں پر یہ مزید ظلم ہے کہ ان کے چھوٹے سے دماغ میں آپ ایک غیر قوم کی زبان کو ٹھونستے ہیں' جس میں اس کا اپنا رنگ' اپنی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں پایا جاتا۔ وہ اندھا دھند اسے رٹتا ہے اور ہر اسکول میں کچھ خاص فقرے یا شعر چھوٹے بچوں کو یاد کرا دیئے جاتے ہیں اور ان کو ''ڈیڈی' ممی' انکل'' کہنا سکھا دیا جاتا ہے تو گھر والے ان لفظوں کو سن کر خوش ہو جاتے ہیں کہ ''بچہ ترقی کر رہا ہے۔'' اور پھر اس طرح کی رٹا رٹ سے ساری عمر اس کو سابقہ رہتا ہے۔

بچے کو ذرا سا چلنے پھرنے کے قابل ہوتے ہی اسے ایک دور دراز کی اجنبی زبان رٹنا شروع کرا دینا اور پھر ساری عمر اس مصیبت میں مبتلا رکھنا کہ پہلے وہ کسی بھی علم کی معلومات کو سمجھنے کے لئے انگریزی زبان کو سمجھے اور صرف انگریزی زبان کے واسطے ہی سے وہ خزانہ علم تک پہنچے' کتنا بڑا عذاب ہے۔ بچوں میں سے ۶۰ فیصد' امتحانات میں سارے مضامین میں قابل ہونے کی پوری صلاحیت رکھنے کے باوجود' محض ایک اجنبی زبان کی وجہ سے فیل ہوتے ہیں۔ دوسرے آپ ان کے ذہنوں میں یہ بیج بوتے ہیں کہ علم کے حصول کا واحد ذریعہ انگریزی زبان پڑھنا ہے۔ آخر جاپان کیوں اس خبط میں مبتلا نہیں' کوئی عرب ملک نہیں' کوئی مغربی قوم نہیں' فرانس والے' جرمنی والے' اٹلی والے' انڈونیشیا والے[1] اسرائیل والے[2] سب اپنی اپنی

[1] ملائی زبان اردو کے مقابلے میں بہت پس ماندہ ہے لیکن جب ڈاکٹر سوکارنو کی قیادت میں انڈونیشیا ←

زبانوں میں بچوں کو تعلیم دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں آٹھ سال کی عمر کا بچہ بھی مصنف بنا اور ہر صاحب تعلیم نوجوان کسی نہ کسی شعبہ علم میں اضافہ کرتا ہے۔

لیکن ہمارے ملک میں اقتدار اور قیادتیں محض صوبائی و علاقائی کشاکش کی چکیوں میں اپنی نئی نسلوں کو پیستی ہیں اور ان کے بھلے برے سے بالکل لاتعلقی اختیار کر لیتی ہیں، حکومت، قانون، معاشرہ، مذہبی ادارات، تعلیمی ماہرین، پریس، کوئی بھی معصوم بچوں کو ظلم کی اس چکی میں پسنے سے نہیں بچا سکتا۔ صد ہا دماغ ہمیشہ کے لئے جامد ہو جاتے ہیں، صد ہا دماغ احساس کہتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

قرآن نے جہاں ایک معصوم بچی کو عدالت آخرت میں مدعیہ بنا کر کھڑا کیا ہے جہاں وہ سوال کرتی ہے کہ "اسے کس گناہ کی عقوبت میں (زندہ مٹی میں گاڑ کر) قتل کیا گیا ہے۔" اس مقام پر غور فرما کر یہ سوچئے کہ آپ کے دور کے بچوں کی جب قطاروں کی قطاریں مظلومیت کی

← آزاد ہوا تو یہی زبان پروان بن گئی وہاں ڈچ زبان کو وہی حیثیت حاصل تھی جو ہمارے ہاں انگریزی کو حاصل تھی اور اب تک حاصل ہے۔ ڈاکٹر سوکارنو نے انقلابی جوش سے کام لیتے ہوئے ایک قانون نافذ کیا کہ ایک تو ملائی زبان کے لئے رومن رسم الخط اختیار کیا جائے، دوسرے چند مہینوں کے اندر اندر یہ دفتری زبان بن جائے۔ تیسرے ایک سال کے اندر تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم اسی زبان میں دی جائے۔ اس پر سارا ملک حرکت میں آ گیا، اساتذہ اور ادیب اور دانش ور مصروف ہو گئے۔ پہلے مختلف مضامین کے انڈونیشی زبان میں نوٹس تیار ہوئے پھر کتابیں چھپنے لگیں۔ ۱۹۵۲ء کے وسط تک کتابیں چھپ گئیں۔ اس زمانے میں انڈونیشیا کے کسی بقراط کو یہ جرات نہ ہوئی کہ ملائی زبان کی بے بضاعتی کا تذکرہ کرتا یا اصطلاحات کے تراجم کا سوال اٹھاتا۔ اصطلاحات کتابیں لکھتے لکھتے خود بخود بنتی چلی گئیں اور دو سال کے بعد ڈچ زبان کے نام لیوا ٹانواں ٹانواں رہ گئے۔ آج انڈونیشیا میں ڈچ زبان کا سراغ ہی نہیں ملتا۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید "اردو کو سرکاری زبان بنانے کا عمل کب مکمل ہوگا" مطبوعہ اردو نامہ مئی ۱۹۹۰ء

۲۔ اسرائیل میں جملہ علوم وفنون اور سائنس کا ذریعہ تعلیم عبرانی ہے۔ جو صدیوں سے مردہ ہو چکی تھی اور اب دفتر، عدالت، کاروبار میں ہر جگہ رائج کر دی گئی ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ وہاں عبرانی کے سوا کوئی دوسری زبان استعمال کرے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ "اردو یونیورسٹی وقت کا اہم تقاضا"

داستان حیات' ہاتھ میں لئے آپ کے خلاف خدا کی عدالت میں استغاثہ کریں گی اور فریادی بنیں گی اور کہیں گی کہ ان کے دماغوں پر کیوں ناجائز بوجھ ڈالا گیا؟ ان کی قوتوں کو کیوں اغیار کی برتری اور تقلید کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا؟ کیوں ان کے لئے حقیقی ترقی کی راہیں بند کر دی گئیں۔؟ کیوں ان کو اپنے دین اور اپنی تہذیب اور اپنی تاریخ کی آئینہ دار زبان سے محروم کیا گیا؟ یا کم سے کم اس زبان کو جو اس کی شخصیت کی پرتو تھی' ایک غیر زبان کے سامنے کنیز بنا دیا گیا۔ ان کو ملت اسلامیہ اور انسانیت عظمیٰ کا جزو ہونے کی بناء پر کیوں صحیح نشو ونما نہیں دی گئی اور کیوں جبریت کی ایک رس نچوڑ مشین میں اچھی طرح کچل دیا گیا؟ وہ سوال کریں گی کہ ان کو کیوں ملحدانہ تہذیب اور فاسقانہ معاشرت کا شکار بنا دیا گیا؟ پھر کہیں گی ہم آخری بارگاہ میں یہ فریاد لائی ہیں' ہم پر ظلم کرنے والی نسل کو سزا دی جائے۔

جناب! عرض یہ ہے کہ سیاسیات کے چکر اور ٹیڑھے انتظامی اور تصادمی نقطہ ہائے نظر کے سب کھیل یہاں پر دھرے رہ جائیں گے اور آپ نہایت درجہ بے بس ہو کر خدا کے حضور مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوں گے۔ خدارا قوم سے' دین سے' اپنی تہذیب سے' بچوں سے' ان کی خودی سے اور ان کے ضمیروں سے انصاف کیجئے۔

اپنے بچوں کے لئے زندگی کو آسان' ان کے والدین کے لئے تعلیم کو ارزاں اور بچوں کے ذہنوں کو ذوق آزادی' خودی اور کسی اعلیٰ نصب العین سے آراستہ کیجئے۔

قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۹۹ء

اہداف ومقاصد پر ایک نظر

پاکستان کی مجوزہ تعلیمی پالیسی (۱۹۹۸ تا ۲۰۱۵) کے اہم ترین باب ''اہداف و مقاصد'' کے مطالعہ کا مجھے موقع ملا۔ میں اگرچہ نہ تعلیمی طور پر کوئی مقام فضیلت رکھتا ہوں اور نہ ہی کوئی مستند دانش ور ہوں۔ بدیں سبب مجھے تعلیمی پالیسی سے تعرض کا کوئی خاص استحقاق نہیں ہے' مگر نوجوانی سے ہی مجھے تعلیم و تدریس کے متعلق مطالعہ کا بہت شوق رہا ہے' کچھ مشاہدات و تجربات بھی ہیں اور اپنی دلچسپی کی وجہ سے پچھلی تعلیمی پالیسیوں پر اور مسائل تعلیم و تعلم پر میں نے وقتاً فوقتاً مضامین لکھے ہیں اور سوالوں کے تحریری جواب دیتا رہا ہوں' اس لیے رغبت ہوئی کہ پاکستان اور ملتِ پاکستان کو سنوارنے والے مسئلۂ تعلیم (تعلیمی پالیسی) پر اظہار خیال کروں۔ نئی تعلیمی پالیسی کے Aims and Objectives یعنی اہداف ومقاصد (باب دوم) کی نہایت ہی ضروری اور بنیادی بحث میرے سامنے ہے۔

صرف یہ اوراق (۱۲ صفحات) اس امر کی شہادت دینے کے لئے کافی ہیں کہ پوری دیگ کے چاول کیسے ہوں گے۔ میں نے ان اوراق کا مطالعہ کر کے کچھ ایسی مثبت چیزوں کی طرف توجہ دلائی ہے جن کے بغیر اسلامی تعلیم کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے' بلکہ بعض اصولی ضرورتوں کو پورا کئے بغیر کسی قسم کے نظام تعلیم کی بھی چول سے چول نہیں ملتی۔ کچھ امور ڈھیلے ڈھالے (vague) الفاظ میں اس طرح بیان کیے ہیں کہ ان کو جگہ جگہ سے چن کر اکٹھا کرنا مشکل' اور ایسا ہو بھی جائے تو مطلب ادھورا یا مرکب قسم کا سامنے آئے۔ پھر ڈپلومیٹک انداز بیان اور بھاری بھر کم اصطلاحات کا استعمال اور بھی چکر میں ڈالتا ہے۔ پھر میری ایک اور مشکل یہ ہے کہ پوری پالیسی سامنے نہیں' صرف اس کا ابتدائی جزو ہے' حالانکہ ہو سکتا ہے اس جزئی مطالعہ میں آدمی جو چیز سمجھے وہ پوری پالیسی آنے کے بعد کچھ اور ہی شکل اختیار کر جائے۔ بہرحال یہ تیسری مجبوری و معذوری ہے' اور اس کی وجہ سے میرے اظہار خیال میں کوئی ٹیڑھ

نکل آئے تو نہ میں قصوروار ہوں' نہ کوئی دوسرا۔
—— مجبور ہوں کہ جو خیالات تشکیل پائے' عرض کردوں۔

یہ بہت ہی دردمندانہ احساس میرے دل و دماغ کو مجروح کرتا ہے کہ پاکستانی حکمران اور ماہرین تعلیم اگرچہ متعدد تعلیمی پالیسیاں قوم کو دے چکے ہیں' مگر کچھ ہی عرصے میں تجربہ بتاتا ہے کہ جو کچھ تعلیمی پالیسی کے نام پر تیار کیا گیا ہے' وہ غیر اطمینان بخش ہے۔سوال یہ ہے کہ کیا تعلیم کا صراط مستقیم معلوم کرنے کے لئے تجربات کا سلسلہ جاری رہے گا؟ آخر کب تک؟ کیوں نہیں تعلیم کے پالیسی ساز اور ان کے نقشوں پر نظام تعلیم کی عمارت نت نئے اسلوب سے تعمیر کرنے والے معمار' ایک ہی بار بیٹھ کر اس راز کا تعین کرتے کہ کونسی خرابیاں اور کوتاہیاں بار بار مرعوب کن اصطلاحات اور فلسفیانہ مگر قدرے ڈپلومیٹک اندازِ بیان کی آڑ میں پناہ گاہیں بنا کر چھپی رہ جاتی ہیں۔

اس مسئلے پر قلم اٹھانے سے پہلے یہ طے ہو جانا چاہیے کہ آیا ہم دنیا کی دوسری ملحد' مشرک اور لادین قوموں کی طرح کا ایک گروہ ہیں' یا سب سے مختلف انداز کی ایک ملت؟ اور یہ بھی طے ہو جانا چاہیے کہ ہمارا ضابطۂ حیات اور اس کے مطابق نظام تہذیب جسے ہم دین کہتے ہیں وہ دنیا کے دوسرے محدود' چند عقیدے اور عبادتیں یا کچھ رسوم و تقاریب رکھنے والے مذاہب کی طرح کا مذہب ہے جو ہر غالب نظام کا ساتھ دے سکتے ہیں اور کئی طرح کے متضاد بیرونی اثرات کو بہ آسانی جذب کر لیتے ہیں؟ بس بہت بڑا گھپلا تو یہی ہے۔صاف ظاہر ہے کہ ہم ایسا مذہبی گروہ نہیں ہیں۔

ہم نے آج تک دل کی گہرائیوں سے یہ سمجھا کہ ہم اقوام عالم سے مختلف ساخت کے لوگ ہیں' ہم کسی قوت کا سیاسی' معاشی' مالیاتی یا کلچرل تسلط قبول نہیں کر سکتے۔اور نہ ہم کسی ایسے نظام تعلیم سے مطمئن ہو سکتے ہیں جو ہمارے ذہنوں پر دوسروں کی برتری کا سکہ جما کر ہمیں احساس کہتری میں مبتلا کرے۔جو ہمیں معیشت یا کلچر یا ترقی کے نام پر دوسروں کی دم تھام کر چلنے والے نوجوان تیار کر کے دے —— جیسے کہ اب تک ہو رہا ہے۔ہمارا مسئلہ سائنس اور ٹیکنالوجی ضرور ہے' لیکن ایسی سائنس اور ٹیکنالوجی ہمیں نہیں چاہیے جو ہماری انا' ہماری تہذیب' ہمارے اخلاق اور ہمارے ذوق تحقیق علمی اور ہمارے ادبی رجحان تخلیق کو

رونق کچلتی چلی جائے' یا بہت کرم کرے تو اثباتاً ان چیزوں کا بھی مساویانہ حق تسلیم کرنے کے بجائے محض اپنے کاروان ترقی کی گردِ راہ بننے کی گنجائش رہنے دے۔

پاکستان بننے سے بھی قبل نواب بہادر یار جنگ نے فرمایا تھا:

''ہندوستان کی سب سے بڑی بدبختی یہی تھی کہ یہاں کا تعلیمی نظام اس قوم نے مرتب کیا جو نہ صرف ہندوستان کی سرزمین اور اس کے معاشی ذرائع پر قابض ہونا چاہتی تھی' بلکہ اس کے ذہن وفکر پر بھی اپنا قبضہ جمانا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لئے اس نے ہماری تاریخ کو اس انداز سے ہمارے سامنے پیش کیا جس نے ہم پر خود فراموشی کو بڑھایا اور خود اعتمادی کو گھٹایا' جس نے ہماری مشرقی خصوصیات کو فنا کیا اور ہمیں مغربی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا۔ ضرورت ہے کہ مستقبل کے لائحہ عمل میں سب سے پہلا مقام تعلیم کو دیا جائے۔ ایسا تعلیمی نظام جس کی بنیاد کتاب و سنت پر ہو جس نظام تعلیم سے گزرنے کے بعد مسلمان کا بچہ اسلامی نظام میں نشوونما پائے تاکہ وہ اپنی عملی زندگی میں ملت اسلامیہ کی صحیح خدمت انجام دے سکے۔''[1]

میں نے نظریہ تعلیم اور تعلیمی نظاموں پر تھوڑا بہت جو مطالعہ وتفکر کیا ہے' اور اس موضوع پر خود بھی کچھ نہ کچھ لکھا ہے' میں نہایت حیرت سے داد دیتا ہوں نواب بہادر یار جنگ کو کہ آج سے کئی عشرے قبل مسلمانان پاکستان کی بننے والی ریاست کے لئے کس درجہ مختصر الفاظ میں غلامی کی تعلیم سے موازنہ کرتے ہوئے آزاد پاکستان کے نظام تعلیم کی پالیسی کے حدود اربعہ بیان کر دیئے ہیں۔ یہ فوقیت اس شخص کو حاصل ہے جس نے چبائے چغلے ہوئے بھاری بھرکم الفاظ کا ڈھیر لگانے کے بجائے نہایت مختصر پیرائے میں پاکستان کے لئے تعلیمی حقائق اور مطلوبات صریح اور دوٹوک طریق سے بیان کر دیئے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص نہ کسی سامراجی طاقت کے آسیبی سائے میں تھا' نہ اسے اپنے ایمان اور اپنی خدا پرست قوم کے علاوہ

---

[1] نواب بہادر یار جنگ مسلم لیگ کے شاہیں مزاج مجاہد تھے۔ مندرجہ بالا اقتباس مرحوم کی ایک اہم تاریخی تقریر سے لیا گیا ہے جو ۲۶ دسمبر ۱۹۴۳ء کو کراچی میں منعقدہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں زیر صدارت قائداعظم کی گئی۔ دوران تقریر قائداعظم نے نواب صاحب کے خیالات کو بار بار سراہا اور ان کے تعلیمی نقطہ نظر' مقاصد اور خاکے کی پرزور تائید ایسے انداز سے کی جس سے قائداعظم کا یہ احساس ٹپکتا تھا کہ — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

کسی دور کا دل رکھنے کی ضرورت تھی' اور نہ اس کے فکر و بیان پر کسی زور دار طبقے کا کوئی بوجھ تھا۔

انقلابی خطوط پر قوموں کی تقدیر بدلنے والے لیڈر غیور و خود دار ہوتے ہیں' دو دلے نہیں ہوتے۔ سیاسی عہد و پیمان اور پالیسیوں اور کاروائیوں کو یہی دو دلاپن فاسد بناتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی رحمتیں ہوں نواب بہادر یار جنگ پر۔

میں نے مندرجہ بالا اقتباس کو اس لئے اہمیت دی ہے کہ اس چند سطری عبارت میں جس خوبی سے موجودہ نظام تعلیم کے اصل مرض ''سرطان'' کو واضح کر دیا گیا ہے اور پھر پاکستان کے مطلوبہ نظام تعلیم کی تعریف متعین کر دی گئی ہے' وہ ہمارے لئے روشن برہان ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ پاکستان کے تشکیل پاتے ہی دو چار سال میں نیا نظام تعلیم نمودار ہو جاتا۔

کاش کہ ہمارے پالیسی ساز اس حقیقت کو سامنے رکھتے کہ ایک سامراجی نظام نے ہمارے اسلاف اور ان کی نسلوں کو اور خود ہم لوگوں کو تعلیمی غلامی کے تیزاب میں ڈالا اور ہماری ملی خودی کے سنہری ہمالاؤں کو راکھ کے ڈھیروں میں تبدیل کر دیا۔ ہماری کتنی نسلوں کے ذہن و اخلاق برباد کر دیئے اور اب جب بظاہر سیاسی اور حکومتی سامراج غائب ہے' ساہوکارانہ امدادوں' لسانی غلبے اور کلچرل فتوحات کے پیرائے میں پہلے سے زہریلا سامراج ہماری جڑیں اسی نظام تعلیم کی مدد سے کاٹ رہا ہے جس کا مقصد غلام سازی' ملازم سازی اور افسر سازی تھا۔ اتنے برسوں میں کسی لیڈر اور سیاسی اقتدار پر آنے والی پارٹی کو احساس تک نہ ہوا کہ تعلیم ہمارے ایمان و کردار اور ہماری خودی اور آزادی پر بلڈوزر چلا رہی ہے۔

○

ا۔ نظریۂ علم

حقیقت میں کوئی نظام تعلیم بغیر اس کے مرتب یا قائم نہیں ہو سکتا کہ اس کے لئے پہلے ''نظریہ علم'' (Theory of Knowledge) متعین نہ ہو جائے۔ مجھے اغراض و مقاصد (برائے نظام تعلیم ۱۹۹۸ء تا ۲۰۱۰ء) میں ایسا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نظریہ علم دور غلامی کے نظام تعلیم کا برقرار رکھا گیا ہے۔ یعنی انجن پٹڑی وہی ہے' صرف بوگیاں بدلی جا رہی ہیں۔ پہلے ہمارے ماہرین اس مسئلے پر کاوش کریں۔

انقلابی جرات مند ذہن ہو تو ہمارا پہلا ٹکراؤ تو دور غلامی کے تصور علم اور اہل مغرب کے لادینی نظریۂ علم کے خلاف ہو گا۔ ڈریئے نہیں' توپ وتفنگ کی لڑائی نہیں' ایمان وشعور کی لڑائی ہے بخلاف لادینیت و مادہ پرستانہ عقلیت۔

مادہ پرستانہ لادینی عقلیت کا نظریہ علم یہ ہے کہ علم صرف وہ ہے جو حواس خمسہ کے ذریعے حاصل ہونے والی معلومات پر مشتمل ہے۔ دوسرا جزو یہ کہ تجربہ و مشاہدہ کے بعد قیاس و استدلال ایک ایسی قوت ہے جو محض حسی معلومات کے دائرے کو اور بڑھا دیتی ہے۔ لیکن کوئی بھی شے یا واقعہ یا حالت احساس و قیاس کے حدود سے باہر کی ہو وہ انسانی دائرہ علم سے خارج ہے۔

دوسری طرف خدا پرستانہ نظریہ علم یہ ہے کہ بہت کم حقائق و معلومات مادہ پرستانہ عقل کی حدود علم میں آتی ہیں' اور بے حد لامتناہی صداقتیں اور واقعیتیں وہ ہیں جو عقل کوتاہ نظر (short sighted) کی زد میں نہیں آ سکتی ہیں۔ کیونکہ الہام و وحی (اور ان کا محدود عکس وجدانیات میں پایا جاتا ہے) پردۂ غیب میں مستور حقیقتوں کے علاوہ تاریخ میں کام کرنے والے قوانین وعوامل کے زیر اثر انسانی معاشروں اور تہذیبوں کے عروج وزوال کے صدیوں پر پھیلے ہوئے سلسلۂ احوال کے اسباب ونتائج کو دکھا کر آدمؑ سے اب تک چلے آنے والے ''سواء السبیل'' (راہ راست) کی ہدایت فراہم کرتی ہے۔ وہ بے شمار مادی امور اور جسمانی اور نفسیاتی رموز کو جو عقل کے لئے عسیر الفہم تھے آج سے صدیوں پہلے الہامی علم نے آشکارا کر دیا۔ منکرین الہام کو بالآخر ماننا پڑا۔ الہام و وحی کی تعلیمات کو بھی عقل کئی مرتبہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

تقابل یہ ہے کہ عقلی فلسفہ سیاست اور سائنس اپنا تجربہ ایک ظن سے دوسرے گمان تک ماہرین کے اختلافات کے مظاہرے کے ساتھ کرتے ہیں۔ جب کہ الہامی علم کے ماہرین نے ہر دور اور ہر ملک میں ایک ہی پیغام دیا' ایک ہی جیسے اعلیٰ کردار کے ساتھ نمودار ہوئے' ایک ہی طرز پر مزاحمتوں اور تعذیبوں کا سامنا کیا' اگر وہ اپنے مشن میں کامیاب ہوئے تو ایک ہی طرح کے اخلاص سے آراستہ پیروکاروں کو ساتھ لے کر ہر دور میں ایک ہی رنگ کے انقلاب پیدا کیے۔

یہ وہ خصوصیات ہیں جو ان کی صداقت کی ایسی زبردست گواہی دیتی ہیں کہ عقل بھی سر

جھکا دیتی ہے۔ بشرطیکہ مفاد اور تعصبات نے اسے جکڑ نہ رکھا ہو۔

سو ہمارے خدا پرستانہ یا اسلامی نظریہ علم (Islamic Theory of Knowledge) کے ضروری پہلو یہ ہیں:

۱۔ علم کا اصل واحد سرچشمہ خدا ہے اور اسی کے دیئے ہوئے حسی' قیاسی یا الہامی علم سے ہم زندگی اور تہذیب کو سنوارتے ہیں۔ وہ ''علم الاسماء'' کا اولین سبق آدمؑ کو دے کر پہلا معلم بنا اور پہلا درس دیا۔ پھر آخری رسولؐ پر جو وحی بھیجی اس کا اولین سبق بھی ''اقراء'' کا تھا۔

۲۔ ہر وہ عمل جو الہامی علم یا وحی کے علم سے ٹکراتا ہے' درست نہیں ہے۔

۳۔ اسلامی نظریہ علم کی رو سے علوم کے چند شعبے ہیں:

ا۔ خدا' انبیاء اور وحی کو جاننے اور سرمایۂ ایمان بنانے کی کوشش کرنا۔

ب۔ کائنات کی حقیقت' اس کی ترتیب اور اس کے اندر کام کرنے والے قوانین الٰہیہ کو سمجھنا۔ اور خدا نے اپنی صفات کو نمایاں کرنے کے لئے جو علامات (آیات) اس کے اندر رکھی ہیں' ان سے آگاہی حاصل کرنا۔ کائنات کے آغاز اور انجام کے متعلق اس کی طرف سے دی گئی معلومات کو جاننا۔

ج۔ انسان کو اس کے جسم' اس کی نفسیات اور اس کے اخلاق کے پہلوؤں سے سمجھنا اور اس پر جو خدائی قوانین کام کرتے ہیں' ان کو الہامی معلومات (کتاب و سنت) کی مدد سے تفصیلات اور باریکیوں تک سمجھنا۔ یہ حقیقت جاننا کہ انسانیت کا ہر فرد اپنی ساخت اور استعدادوں اور ممکنات کے لحاظ سے خدا کے قوانین مشیت کی حدود سے محدود ہے۔

د۔ یہ سوال کہ اس دنیا کی زندگی کے بعد کیا ہوگا؟ ـــــ الہامی ہدایت (کتاب و سنت) سے جاننا۔ پھر عالم آخرت' مرحلہ برزخ' حساب کتاب' جزا و سزا' اور جنت و جہنم کا شعور حاصل کرنا۔ آخرت کے محاسبے اور جواب دہی کا احساس دنیوی زندگی کو سنوارتا ہے۔

ر۔ دنیوی لحاظ سے انسان کے لئے کیسی تہذیب' کیسے اخلاق' کیسا نظم سیاست و معیشت' کیسا نظام معاشرت و تمدن نفع بخش اور اطمینان بخش ہے۔ باقی رزق' جنس' سود' جرائم

'جنگ' 'صلح' عدالت وغیرہ سارے مسائل کا کونسا حل صحیح تر ہے جو دنیوی بہبود سے زیادہ آخرت کی فلاح کا ذریعہ ہو۔

س۔ خدا سے انسانی تعلق عبد ہونے کا ہے۔ خدا معبود لاشریک ہے۔ اللہ واحد اور عبد کا یہ تعلق واحد راستہ ہے خیر و فلاح کا۔[1]

یہ ہے اس نظریۂ علم کی شکل جس پر ہمارے نظام تعلیم' اس کے نصاب' نصابی کتب کے مواد' امتحانات اور طلبہ کی ذہنی و اخلاقی استعداد کو مبنی ہونا چاہیے۔

آج اگر آپ سے کوئی پوچھے کہ آپ کا نظریہ علم کیا ہے تو آپ ایسے کھسیانے سے ہو جائیں گے جیسے جیب کٹ جانے پر کوئی شخص ہوتا ہے۔ اور فی الواقع ہماری ایک نہیں' ساری جیبیں کاٹی جا چکی ہیں اور آستین و گریباں سب چاک چاک ہیں۔ اب ملی تشخص کے سارے زخموں کی چارہ گری کیجئے' اور اس فرض سے آنکھیں چرائیے نہیں۔

○

۲۔ مقصد نظامِ تعلیم

دوسرا بڑا سوال یہ ہے کہ کسی نظام تعلیم کا مقصد کیا ہے؟

آج تک ہمارے حکمراں' ہمارے ماہرین تعلیم اور ہمارے مفکر اور دانشور مل جل کر یہ طے نہیں کر سکے کہ پاکستان کے نظام تعلیم کا نصب العین کیا ہے؟ بس سندیں اور ڈگریاں جاری کرنا جن کے ذریعے نوکریاں مل سکیں۔

ہمارے نظام تعلیم کا نصب العین بالکل بدیہی ہے کہ طالب علم ایسے ایمان و اخلاق اور ایسے اسلامی شعور کے ساتھ انسانیاتی اور سوشل علوم' نیز سائنسی اور ٹیکنالوجیکل دانش کے ساتھ

---

[1] معبود سے عبد (خدا سے بندے) کے اس لابدی تعلق کا ذریعہ ایمان' دعا عبادات' صبر و شکر' تسلیم و رضا' انفاق و قربانی' ایثار و خدمت' توسیع و اشاعت پیغام الٰہی' باہمی تنظیم و تربیت' معروف کا قیام' منکرات کا انسداد' جہاد' اعلائے کلمۃ اللہ اور قوانین الٰہیہ کا نفاذ ہیں۔ عبد سے معبود کے صحیح اور موثر رابطے کے لئے معبود یعنی حق تعالیٰ کی صفات کا شعور ضروری ہے۔ کم سے کم یہ جاننا چاہیے کہ وہی خالق' مالک' رازق' الہٰ' رب' حاکم' ہدایت دینے والا' خیر و شر اور حلال و حرام کا تعین کرنے والا' قانون ساز' آخرت میں امتحان زندگی کے نتیجے میں جزا' سزا دہندہ' عفو کرنے والا' دعائیں سننے والا' تمام دائرہ ہائے تخلیق اور حیات آدم کے لئے بھی تقدیر ساز وہی ہے۔ وہ رحیم ہے اور اس کی رحمت بڑی وسعت رکھتی ہے۔

تیار ہوں کہ وہ پاکستان کو ایک صحیح اور مضبوط اسلامی ریاست کی حیثیت سے چلا سکیں۔ غیر اسلامی اور ملحدانہ ریاستوں کی اس دنیا میں اسلامی ریاست کو وہی لوگ چلا سکتے ہیں جو علمی و ادبی محاذ پر بھی سربلند ہوں' معاشی اور سائنسی دائرے میں بھی تیز رفتار پیش قدمی کریں' اور دفاع کے لئے اسلامی جذبۂ جہاد کے ساتھ سرحدوں پر اور چھاؤنیوں میں جدید ترین اسلحہ کے انبار لگا دیں۔ اس سے کم درجے کے کسی نسخے سے اسلامی ریاست نہیں بنائی جا سکتی۔

○

۳۔ انسانِ مطلوب

پھر نہایت اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں کس طرح کے انسان تیار کرنے ہیں؟

جدید عالمی نظام تعلیم اپنی لادینیت کی وجہ سے سوائے اس کے کچھ کر ہی نہیں سکتا کہ انسان کو دنیوی معیشت کے دائرے کے اندر محبوس رکھ کر جسمانی' دماغی اور مشینی قوتوں کے ذریعے زر اندوزی اور زر پرستی کا دین اسے سکھائے۔ اور زیادہ سے زیادہ مفاد و مسرت کے حصول کو اس کا منتہا بنائے۔ اس کی ذہنیت اور کردار میں ہزار آلودگیاں ہوں' ہوا کریں بس وہ معیشت کے کولہو کا ایک اچھا بیل ثابت ہو۔ اس تصور نے زندگی کو درندوں کا جہنمی اکھاڑا بنا دیا ہے۔

بخلاف اس کے ہمیں چونکہ ایسی اسلامی ریاست چلانے کے لئے مردانِ کار کی ضرورت ہے جو اپنے شہریوں کو خدا پرستی اور حسن اخلاق' ضروریات زندگی اور تعلیم و صحت' عدل و انصاف جیسی نعمتوں سے مالا مال کر سکے' اس لئے ہمیں ایسی تعلیم کی ضرورت ہے جو معاش و معاد' انسانی رابطوں کے حقوق اور فرائض' ریاست اور شہریوں نیز اداروں اور افراد کے درمیان اسلامی نہج کے توازن کا اہتمام کر سکے۔

ایسے نظام تعلیم کے افراد خیانت' حرام خوری و حرام کاری' منافقت' ضمیر فروشی' قوم فروشی' جھوٹ' عیاشی وغیرہ جیسی بیماریوں میں مبتلا نہیں ہونے چاہئیں۔ بلکہ انہیں راست باز' امانت دار' پاسداران عہد' ایثار پسند' خادم خلق اور تعلیم خدا و رسولؐ سے بہرہ مند اور اس پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ یہ ایسے لوگ ہوں کہ کسی باطل سے' خدا اور رسولؐ کے دشمنوں سے' افراد اور قوموں اور طبقوں کے ظلم سے' فتنہ و فساد کے علمبرداروں سے یا کسی مفاد کے حصول اور کسی

اندیشہ نقصان کے دباؤ کی وجہ سے ظلم وخیانت کے ساتھ رواداری اختیار نہ کر سکیں۔

وہ اپنے اصولوں کے لئے' اپنے دین (نظام تہذیب) کے لئے' ملت اسلامیہ' پاکستان اور پورے عالم اسلام کے لئے اپنا فرض انجام دیتے ہوئے ہر زیادتی اور جور واستبداد کا مقابلہ کرنے والے ہوں۔

انہیں علوم اور ادبیات کے دائروں میں اعلیٰ درجے کا تحقیقی اور تخلیقی کام کر کے دنیا پر اپنا سکہ جما دینا چاہیے' انہیں خدا اور رسول اور دین کے خلاف مستشرقین اور دیگر معاندین کے متعصبانہ حملوں کو پرزور تحقیق واستدلال سے بے وقعت بنا دینا چاہیے۔ انہیں اپنی تاریخ پر ناروا حملے کرنے والے مغربیوں' ترقی پسندوں اور ہندوؤں کو نہایت مسکت جواب دینا چاہیے۔ ان کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ عالمی پریس میں یہودیوں اور دیگر مغربی اقوام کے پر زور پروپیگنڈے کے توڑ کے لئے مضبوط محاذ قائم کریں۔

ہمارا نظام تعلیم وہی ہو گا جو اس طرز کے انسان تیار کر کے میدان میں لائے۔

ان متذکرہ خوبیوں کے انسان زرعی' انجینئرنگ' صنعتی' تجارتی' معالجانہ اور دوسرے ٹیکنالوجی کے کاموں میں اپنی پوری توجہ معیشت پر صرف کریں۔ اور حاصل معیشت سمیٹتے ہوئے یہ خیال رکھیں کہ وہ صرف اپنے لئے ہی کما نہیں رہے ہیں' بلکہ اپنے دین کے لئے' اپنی اسلامی ریاست کے لئے' غریب عوام کے لئے بھی وہ جانفشانی کر رہے ہیں۔ نیز زندگی بسر کرنے اور اپنے تحفظ کا سامان کرنے کا اصل مدعا دنیا میں فتنہ وفساد پھیلانے والی قوتوں سے لڑ کر عدل وامن کا ماحول پیدا کرنا ہے' اور اس کے ہر کونے اور ناکے کی حفاظت مضبوطی سے کرنی ہے۔

میں اگرچہ طول بیان سے بچنا چاہتا ہوں لیکن ایک اہم واقعاتی مثال وضاحت مدعا کے لئے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ گذشتہ جنگ عظیم میں میں نے ایک پوسٹر دیکھا جس میں محکمہ ریلوے کا ایک ملازم کانٹا بدلتے ہوئے دکھایا گیا اور عنوان جنگی کامیابی (فتح) کا ہے اور نیچے جلی فقرہ یہ لکھا ہوا ہے کہ it depends upon me (یعنی جنگ کی کامیابی کا دارومدار مجھ پر ہے) پھر اسی طرح کے پوسٹروں میں کسی کلرک کو دیکھا' کسی جج کو دیکھا' اور فقرہ سب پوسٹروں میں وہی لکھا ہوا تھا کہ فتح مجھ پر (میرے کام پر) منحصر ہے۔

بالکل اسی طرح ہم اگر اپنے تعلیمی سانچے میں ایسے مردان کار کو ڈھالیں۔ جو معیشت'

سائنس اور ٹیکنالوجی اور علمی و ادبی مضامین میں تیاری کرتے ہوئے بھی اور کامیابی کے بعد کسی ڈیوٹی یا کاروبار میں محو ہوتے ہوئے بھی اپنے سامنے ملت کے احیا اور اسلامی نظام عدل کی تعمیر کا مقصود رکھتے ہوں اور فلاح انسانیت کی ایک نئی برادری بنانا چاہتے ہوں ـــــ اور پھر اپنا اپنا کام کرتے ہوئے ہر فرد یہ جذبہ رکھتا ہو کہ 'it depends upon me' تو یقین جانئے کہ بغیر کسی توڑ پھوڑ کے چند سال میں ایسا انقلاب آئے گا کہ پاکستان فی الحقیقت پاکستان بن جائے گا۔ ایک سینیٹر اجلاس میں حصہ لیتے ہوئے ایک صدر ملک کی صدارت کرتے ہوئے' ایک پروفیسر تعلیم دیتے ہوئے' ایک ہاکر اخبار پہنچاتے ہوئے' ایک کسان فصل بوتے یا کاٹتے ہوئے' ایک مزدور بوجھ ڈھوتے ہوئے' بڑی بڑی ملوں کے مالک اور انتظامی عملے اور کارکن محنت کاروں میں سے ہر ایک کے دل میں یہ روح مچل رہی ہو کہ میں جو بھی کام کر رہا ہوں' وہ ایک اصولی اور ہمہ گیر انقلاب کے لئے کر رہا ہوں' تاکہ انسانیت کو سکھ چین ملے۔

اتنی اور ایسی اسپرٹ جو نظام تعلیم نہ دے سکے وہ نوجوانوں کی صلاحیتوں اور قوتوں کا گلا گھونٹ دے گا

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا ' لا الہ الا اللہ

بہر حال جہاں سارا زمانہ اپنے لئے کسی براہیم کی تلاش میں ہے' وہاں سب سے پہلے تو پاکستان کو ایک ایسے براہیم کی تلاش ہے کہ غلامی کے دور سے جو بت ہم پر لدے ہیں' آزادی کے دور میں سامراجیوں نے ان سے زیادہ بھاری بت ہم پر لاد دیئے ہیں ـــــ اور وہ اب اس تاک میں ہیں کہ کب اچھل کر خود بھی پوری طرح ہم پر سوار ہو جائیں' اور عنان ہاتھ میں لے کر اپنی اغراض کے لیے استعمال کرتے رہیں۔

سامراجیوں کو اپنی زبان' اپنے نقشہ تعلیم اور اپنے کلچر کے یہاں مسلط ہو جانے کی وجہ سے نہایت آسانی سے اتنا نفوذ حاصل ہے کہ وہ حکومتیں بنواتے اور تڑواتے ہیں اور ہمارے داخلی معاملات میں آخری تہ تک مداخلت کرتے ہیں۔

اس مہلک حالت مرض کا علاج تعلیم کو بیخ و بن سے کونپلوں تک بدل دینا ہے۔

اس کے لیے علم کی جانچ کا آخری معیار ہو گا کیا؟ وہ خیر و شر کا پیمانہ کیا اختیار کرے گا؟ مستقل اور غیر متبدل اعلیٰ اخلاقی اقدار کو وہ کس سرچشمہ (Source) سے لے گا۔ کن

خوبیوں کو وہ اپنے اندر اور قومی ماحول میں اور عالمی فضاء میں پھیلانے اور ابھارنے کی کوشش کرے گا اور کن برائیوں کو وہ ہر سطح پر مٹانے کی خدمت انجام دے گا؟

لارڈ میکالے نے جس کی نہایت گہری پرچھائیں اب تک ہمارے نظام تعلیم پر پڑ رہی ہے' برطانوی نو آبادی ہند کے لئے نظام تعلیم کا خاکہ بنایا تو اس میں قطعی طور پر واضح کر دیا کہ حکومت برطانیہ کا تعلیمی مقصد کیا ہے اور وہ کس طرز کے افراد بنانا چاہتی ہے۔

افسوس کہ اس پہلو سے تعلیمی پالیسی "اہداف و مقاصد" (Aims & Objectives) کے باب میں متفرق طور پر عجیب عجیب باتیں کہی گئی ہیں جن میں سے بعض کو اسلامی معاشرہ میں اختیار کرنا گول خانے میں چوکھونٹی چیز کو فٹ کرنے کی کوشش ہے' اور بعض اصطلاحات یا جملے نہایت ضروری حقیقت کو مبہم طور پر بیان کرتے ہیں' جیسے ڈپلومیٹک بیانوں اور معاہدوں اور خبروں کا انداز ہوتا ہے۔ کسی بھی قوم کی تعمیر کا کام جس بھی شعبے میں کیا جانا ہو' نہایت مضبوط' کھرے' دوٹوک بات کرنے والے آدمیوں کو اس پر مامور ہونا چاہیے۔ "آزاد شاعری" کے انداز کی باتیں یہاں نہیں بچ سکتیں۔

یہاں ہم ایک مثال انسان پرستی (Humanism) کی دے رہے ہیں۔

○

۴۔ انسان پرستی (Humanism)

موجودہ نظام تعلیم کی کوتاہیاں بیان کرتے ہوئے' پالیسی سازوں کی مطلوبہ یہ ضرورت واضح ہوتی ہے کہ معاشرہ کو پوری طرح Humanistic بنانا چاہیے۔ دیکھا اس امریکی اسرائیلی و چانکیائی فکری سحر طرازی کا اثر؟ سیدھی طرح پاکستان کی ملت اسلامیہ کے انفرادی اور اجتماعی وجود کو اسلامی یا مسلمان بنانے کے بجائے ایک مغالطہ انگیز متنازعہ اصطلاح کو آگے کر دیا گیا ہے ___ قرارداد مقاصد کے بالکل خلاف۔ وہاں تو ہے کہ مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگیوں کو کتاب و سنت کے مطابق ڈھالا جائے گا۔

مغرب والوں کی یہ اصطلاح ہیومن ازم[1] (Humanism) ان کی تاریخ کے مخصوص احوال کے مدوجزر سے ابھری' اور وہ انہی کی ایک ضرورت کو پورا کرتی ہے۔

---

[1] Aims & Objectives page 7 para 2.1

قصہ مختصر یہ کہ جب عالم عیسائیت میں (Christendom) عیسائیوں کے اختلافات اور پاپائیت اور سیاست کی نزاعات کے سبب بڑی بڑی دراڑیں پڑ گئیں اور ہر قوم نے اپنا کلیسائی نظام الگ بنا لیا تو عیسائی اقوام کے درمیان سیاسی و معاشی لحاظ ہی سے نہیں' مذہبی منافرتوں اور کئی مذہبی تعبیرات اور پادریوں کے بنائے ہوئے قوانین کی وجہ سے منافرتوں اور مناقشوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یوں عیسائیوں اور عیسائیوں کے درمیان ہر طرف خلا پیدا ہو گیا اور تجارت اور معاہدات جنگ و صلح' علمی لین دین اور مصائب میں امداد بہم پہنچانے کے لئے سیکولر وطنی اقوام کو ایک دوسری کے ساتھ رابطوں کے لئے افتراق پیدا کرنے والے خلا پر پل بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور یہ پل بن گیا۔

مغربی Humanism نہ کوئی مذہبی یا خدائی حکم تھا' نہ تورات و انجیل میں ایسا کوئی مستقل اخلاقی ضابطہ بنا کے دیا گیا تھا۔

یہ بعد کی بات ہے کہ جب Pan . Islamism کی رَو مسلمانوں میں چلی تو اہل مغرب کے سیاست کاروں اور دانش وروں کو پین اسلام ازم (یا بین الاسلامیت) میں مقابل کے ایک مذہبی محاذ کی بو محسوس ہوئی۔ انہوں نے ہماری اس اصطلاح اور رجحان کے خلاف پروپیگنڈے کی جنگ لڑ کر اپنی اصطلاح ہیومن ازم کو آگے کر دیا۔

اس اصطلاح کا اصل مطلب تو یہ ہے کہ نوع انسانی کو ایک برادری سمجھ کر ہر ملک' نسل اور مذہب کا انسان دوسرے انسانوں کو اپنے جیسا انسان سمجھ کر اس سے معاملہ کرے۔ مگر یہ چونکہ ایک فلسفیانہ تصور پر کھڑا مبہم سمجھوتا ہے اور اس میں کوئی تقدس نہیں پایا جاتا' اس لئے غالب قوتیں اس سے اپنا پسندیدہ مطلب اخذ کرتی ہیں اور جہاں چاہیں اس کا اطلاق کرتی ہیں' اور جہاں چاہیں اس سے آنکھیں پھیر لیتی ہیں۔ کمزور فریق خواہ کچھ ہی معنی لیتے رہیں۔ بوسنیا' چیچنیا' فلسطین' قبرص' کشمیر' البانیہ' الجزائر میں' سوڈان میں' عراق میں کتنے کتنے "ٹن" ہیومن ازم کا قاتلوں' ظالموں اور تباہ کاروں نے استعمال کیا۔

اسلام میں اگر کوئی تصور بلکہ ضابطہ ہے تو وہ انسانی مساوات' خدمت انسانیت اور تعلیم[1]

---

[1] معروف دانشور اور انگریزی زبان و ادب کے ماہر پروفیسر ڈاکٹر عبدالمغنی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہیومن ازم کا مطلب "انسان پرستی" ہے "انسان دوستی" نہیں۔ انسان دوستی کے لیے انگریزی میں کوئی لفظ اصطلاحاً مستعمل اور مروج نہیں ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ڈاکٹر عبدالمغنی کا پی ایچ ڈی مقالہ "T.S. Eliet's Concept of Culture"

انسانیت کا ہے جسے ایک اصطلاح میں ڈھالیں تو وہ فلاح انسانیت کی اصطلاح ہے۔ انگریزی میں اس کے قریب کی کوئی اصطلاح بن سکتی ہے تو وہ Humanism کی ہے۔ یعنی انسانوں میں انسانی ادب و شائستگی و اخلاق کا پایا جانا' یا پیدا کیا جانا۔ مگر یہ ناکافی اور کمزور اصطلاح ہے۔ لیکن ان اصطلاحوں کے چکر کی ضرورت کیا ہے۔ اپنی حیثیت اور اپنے نقشہ کار کو صاف صاف بیان کیجئے۔ لیکن بیان کیا بھی تو کیا کمال کیا۔ واعظین اغراض و مقاصد لکھتے ہیں:

"To introduce Islamic order as one of the vital and important areas"

یعنی اسلامی نظام کو اس حیثیت سے متعارف (یا پیش) کرنا ہے کہ وہ ایک لازمی اور اہم دائرہ فکر ہے' یا میدان کار کا ایک حصہ۔

''جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی۔''

یعنی اسلامی نظام بھی میدان مباحث کا ایک اہم جزو ہے۔ یعنی جو کل تھا اسے جزو بنا دیا' انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اور پھر جو مقاصد کو اپنے اندر سمیٹ لینے والا اصل مبحث تھا اسے اولین مقام دینے اور پالیسی میں اور اس کے اغراض و مقاصد میں اس کو مرکز استدلال اور روح بیان بنانے سے پورا پورا بچاؤ کر کے اس بات کا اطمینان کر لیا گیا ہے کہ استادانِ تہذیب والحاد جو قرضوں کی لگام دے کر ہم پر سوار بھی ہیں' اب ہم پر دہشت گردی' بنیاد پرستی اور سچ مچ کا مسلمان ہونے کا الزام نہیں لگا سکیں گے۔

کیا اس طرح کے دبنے اور جھینپنے والوں نے بھی تاریخ انسانیت میں کوئی کارنامے دکھائے ہیں۔

اسی متذکرہ نکتے کی مزید وضاحت میں کہا گیا ہے۔

It will present a strategy which should enable the students to understand the message of the Holy Quran, imbibe in them the spirit of Islam and appreciate it in the context of new scientific and technological advancements (page 8)

یعنی یہ ایسی حکمت علمی پیش کرے گا جس کی بدولت طلبہ اس قابل ہو جائیں گے کہ

قرآن حکیم اوراس کے پیغام کو سمجھ سکیں نیز اسلام کی روح کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی نئی اصلاحات کے سیاق وسباق میں اپنے اندر جذب کریں

روح اسلام' شاید اسلام سے مختلف چیز ہے کہ اس روح اسلام کا نظام تعلیم سے کوئی ایسا بڑا تقاضا نہیں ہے کہ گذشتہ سامراج نے نظام تعلیم کی ساخت لادینی افادہ پرستی کے لئے ذریعہ فروغ بنا دی ہے' اسے بدلا جا سکے۔ دورِ غلامی نے ہماری ایسی برین واشنگ کر دی ہے اور ایمان وخودی کو اتنا کھوکھلا یا مضمحل کر دیا ہے کہ آج ہمارے اکابر سے اصاغر تک مروجہ تعلیمی ہیروئن کے نشے کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ قوم کی قوم خدا پرستانہ تہذیب اور کلچر کا پورا تصور ہی گم کر کے بتان مفاد کی پرستش میں لگ گئی ہے۔ نظام تعلیم بھی اب ایسا ہی بنے گا کہ قرآن بھی پڑھایا جائے تو اس طرح کہ سیکولرازم اور مفاد پرستی کا بال بھی بیکا نہ ہو۔

پاکستان بنتے ہی ایک موقع پیدا ہوا تھا کہ ابتدائی سال دو سال میں پچھلے دور کی تعلیمی' علمی اور فکری زنجیروں کو توڑ کر بھٹی میں پگھلنے کے لئے ڈالا جائے۔ مگر اس قیمتی میراث کی عادت ومحبت غالب آ گئی ۔ افسوس کہ میراثِ غلامی کی شکست وریخت کر کے خدا پرستانہ تہذیبی نظام کو بالکل نئے سرے سے استوار نہ کیا جا سکا۔ آج تک کوئی بھی تعلیمی پالیسی کسی مثبت تبدیلی کا پیغام لے کر نہ آئی اور اب جو یہ نیا موقع پروگرام ۲۰۱۰ء کے سلسلے میں پیدا ہوا' وہ بھی تعلیم کے لئے سابق بنیادی ساخت کے ساتھ کچھ ادھورے اور جزوی تصورات نیم دلانہ طریق سے اور حرف پیچا پیچ کی صورت میں لائے گئے۔ اسلام دشمن نظریات کے خلاف ہمارا تعلیمی نظام کوئی معرکہ شروع نہیں کرنا چاہتا' اور نہ اس کے لئے اپنے مخصوص علوم وافکار کے اسلحہ کے ساتھ مستقبل کے سپاہی پیدا کرنا چاہتا ہے۔

کاش کہ ایسے نوجوان ہمارے ہاں پیدا ہو سکتے جو کسی مغربی فلسفے اور کسی ملحدانہ نظریے یا کسی منکر خدا کلچر کے کئی پہلوؤں پر ڈٹ کے یہ کہنے کے قابل ہو سکتے کہ نہیں' ہم اس کو نہیں مانتے' اور علمی وتحقیقی اور تجرباتی استدلال کے ساتھ اپنے نقطۂ نظر کو ثابت کر کے کہتے کہ یہ ہے ہمارا نقطۂ نظر۔ اگر ہم فکری معرکے کے قابل ہو سکتے تو آزادی کا کچھ ذائقہ ہمیں پہلی مرتبہ محسوس ہوتا' اب تو ہم صرف دوسروں سے مرعوب اور مقلد ہیں۔[1]

---

[1] کتنا کامیاب اور مفید کام ہوتا کہ ہماری درس گاہوں میں مختلف نصابی دائروں میں یہ دکھایا جاتا کہ دنیا میں اخلاقی قوت کتنی بے اثر ہو چکی ہے' اور جرائم کے اعداد وشمار کتنے خوفناک حالات کے گواہ ←

ہمارے محترم پالیسی سازانِ تعلیم کو یہ شعور و احساس حاصل ہے کہ:

......school should be used as an agent for social change

(part C 2:9:11 , page 10)

سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ سوشل تبدیلی (Social Change) سے کیا مراد ہے؟ کس حالت کی طرف سے معاشرے کو کس حالت کی طرف لے جانا ہے؟ یا کیا مٹانا ہے اور کیا بنانا ہے؟

فلسفۂ تعلیم کا جس طرح یہ اہم سوال ہے' اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر مسئلہ یہ ہے کہ تبدیلی (change) کس نظریہ و مقصد سے ہوگی اور اس کے مقاصد و اہداف کیا ہونگے؟ اور کیا کسی معاشرہ کی اساسی ساخت کسی سمت تغیر کو متعین کرتی ہے' نیز کیا اس کا عمومی رجحان ہے' اس کی رائے عامہ' اس کی صحافت' اس کا لٹریچر اس کا تقاضا کرتے ہیں؟ آخری بات یہ کہ جو قوم کتاب وسنت کو محض پرائیویٹ طور پر ہی نہیں بلکہ خالص دستوری حیثیت سے ایک خاص نہج پر ایک خاص نقشے کے مطابق نافذ کرنا چاہتی ہے کیا وہ آپ کی بنائی ہوئی اس پالیسی کو رد نہ کر دے گی۔

عملاً تعلیم اپنی ڈگر پر چلتی رہی' ادھر نت نئی پالیساں بنتی رہیں' لیکن آج تک کوئی ایسی بڑی تبدیلی بذریعہ تعلیم نئی نسلوں کے فکر و کردار اور معاشرے کے احوال میں واقع نہ ہوئی جو

← ہیں۔ عورتوں کو گھروں سے نکال کر مخلوط معاشرہ کے نتیجے میں رضا مندانہ اور جبری بدکاری کتنی بڑھ چکی ہے' طلاقوں کی کثرت' اسقاط اور کنڈوم کلچر' گھروں اور خاندانوں کا اجڑ جانا' ٹوٹے ہوئے کنبے' حرام اولادیں' کنواری مائیں' والدین (دونوں یا ایک) کی توجہ و محبت سے محروم بچوں کا لاکھوں کی تعداد میں جرائم میں مبتلا ہو جانا' معاشی مفاد کے لیے غالب قوموں کا کمزوروں پر حملے کر کے ظلم اور تباہی انسانوں پر مسلط کر دینا' نہایت خوفناک قسم کے ہتھیاروں کے انبار ہر بڑے ملک کا ذخیرہ کر لینا' مختلف ممالک پر پابندیاں اور آبادی' خصوصاً بچوں اور خواتین کو غذا و دوا کی محرومی کے ذریعے ہلاکت کے غار میں دھکیلنا' مختلف قسم کے تعصبات (خصوصاً مسلمانوں کے خلاف) کا عیسائیوں اور یہود وہنود میں فروغ' عریانی' فحاشی' فتنہ خیز موسیقی' رقص' نائٹ کلب' شراب اور سینما' ٹیلی ویژن وغیرہ کے پھیلائے ہوئے زہروں کا عوام پر اثر انداز ہونا' اور ایسی ہی دوسری بلاؤں کے خلاف مقالات اور کتب تیار ہوتیں' کجا یہ جو کچھ "وہاں" ہو رہا ہے' اس کی مکمل چربہ سازی یہاں کی جا رہی ہے۔

افراد کے وزن اور قامت میں اضافہ کر سکے (یا مزید انحطاط کو روک سکے) اور قوم کو نصب العین اور سعی و قربانی کے لحاظ سے روشن چہرے والی سر بلند قوم بنا سکے۔

اس تعلیمی پالیسی میں بھی ایسی کسی تبدیلی کے لئے تو کوئی ٹھوس اور موثر اور جامع اقدامات تجویز نہیں کئے گئے جو پاکستان کی جمہوریہ اسلامیہ کو اس کی تشکیل کے نصب العین کے مطابق کتاب و سنت کے بیّن واضح راستے پر گام زن کر سکیں اور اس کی نئی نسلوں اور نوجوانوں کو اس ایمان و اخلاق اور سیاسی و معاشی شعور سے آراستہ کر سکیں کہ پاکستان دنیا بھر کے لئے روشنی کا مینار ثابت ہو سکے۔

تبدیلی جو سوچی گئی ہے وہ یہ ہے کہ معیشت' صنعت اور ٹیکنالوجی پر قوم اور اس کی نسلوں کو متوجہ کر کے مادی ترقی کی دوڑ میں منہمک کر دیا جائے۔ ہمیں ان چیزوں میں آگے بڑھنے کی بہت شدید ضرورت ہے' مگر ہم اپنے تہذیبی و ایمانی اور معاشرتی و اخلاقی پہلوؤں سے جس حد سے بڑھی ہوئی گراوٹ کا شکار ہیں' اگر اس کا ازالہ کرنے اور اپنی معاشی و مادی تگ و تاز کو اپنی زوردار ایمانی و ملی خودی کے تابع رکھنے کا اہتمام نہ کر سکے تو ہم معاشی حیوانات کے گلّے کے گلّے ہر سال تیار کر کے لاتے رہیں گے۔ اچھی طرح یہ حقیقت نوٹ کر لیجئے کہ جس معاشرے کی اول درجے کی پرزور سرگرمی زر آفرینی' زر اندوزی اور اس کے بل پر عیاشی کرنا ہو جائے وہ لازماً سیکولرازم (نظام اجتماعی کی لادینیت) کی راہ پر پیشقدمی کرتی ہے اور اس کا سیکولرازم پہلے دین کو بالائے طاق رکھوا دیتا ہے اور پھر اس کا کٹر پن دین اور اسکے اداروں اور اس کی تقریبات کے خلاف اعلان جنگ کر دیتا ہے۔ روس کے معاش پرست فلسفے کا نتیجہ دیکھ لیجئے' بھارتیوں کے سیکولرازم کا نشوو ارتقا دیکھ لیجئے' اپنے ہاں ترکی کے سیکولرازم کی اسلام دشمنی کی تاریخ پڑھ لیجئے بلکہ حالیہ دور کی سفاکانہ پامالی اقدار اسلامی کو ملاحظہ کیجئے۔ بوسنیا کے بعد سرب قصائیوں کے تعصب کے چھروں سے مسلمانوں کو ذبح ہوتے دیکھئے۔

ہوش کے ناخن لیجئے اور تعمیر و ترقی کا ایسا نقشہ بنایئے کہ معاش اور معاد یا دولت اور اخلاق کے دونوں پہلوؤں کو ملحوظ رکھ کر قوم کو آگے بڑھایا جا سکے۔ بلکہ ایمانی و اخلاقی پہلو کو اوّلیت (Governing position) دی جائے اور اس کے پچھلے نقصانات کا ازالہ کیا جائے۔

نئے نظام تعلیم کے پالیسی سازوں نے اہداف و مقاصد (Aims and Objectives) کی عمارت تو کھڑی کر دی مگر اس اصولی حقیقت کو نہیں چھوا کہ آخر پاکستان کی

تشکیل کرنے والوں نے اپنایا یہ جو مقصد بتایا تھا کہ ہم اپنی جداگانہ ریاست میں اپنے نظریات' عقائد اور تصورات کے مطابق زندگی کا نظام بنانا چاہتے ہیں' تو اس کے تقاضے کے مطابق اہل پاکستان کے لئے نظام تعلیم تجویز کرتے ہوئے آخر یہ ضرورت کیوں نظر انداز کر دی گئی کہ ہمارا نظریہ علم (Theory of knowledge) کیا ہے؟ اگر آپ اسے شفاف طریق سے لاتے تو وہی آپ کی پالیسی کے اہداف و مقاصد کے لئے بہترین کسوٹی بن جاتی۔

○

۵۔ حرف آخر

انہی حقیقتوں کی بنا پر مفکر اسلام مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے فرمایا تھا کہ یہ تعلیم گاہیں نہیں' قتل گاہیں ہیں' جہاں جا کر تو جوانوں کی خودی' ایمان اور ضمیر کو ماہر قسائیوں سے ذبح کرایا جاتا ہے' اور جب ۱۴ یا ۱۶ سال بعد سلسلہ امتحانات کی تکمیل پر معلوم ہو جاتا ہے کہ بہ حیثیت مسلمان اور بہ حیثیت انسان زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں تو اسے اس بات کی ڈگری دے دی جاتی ہے کہ اب زندہ و خوددار انسان کی حیثیت سے سیاسی یا فکری یا دینی و اخلاقی دائروں میں کسی بھی جبر و مکر سے کام لے کر لوٹ مار کرنے والی قوت کے خلاف محض للکارنے یا آنکھیں دکھانے تک کی خفیف حس بھی باقی نہیں ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ روکنا تو کجا تنقیص اور تنقید کی جرات ختم' تنقید کجا سوال کرنے کا حوصلہ بھی نہیں۔ بس تقلید ہے اور تائید ہے اور حملہ آور یا فاتح قوت کے حق میں پر زور دار دلائل ہیں' اسی کے منصوبے چلتے ہیں اور اسی کی ہدایات اور ڈپلومیٹک سرگوشیاں۔

جہاں یہ ذہنیتیں ہوں وہاں' کس کا کینڈا ہے کہ وہ نظام تعلیم کے اصل سرپرستوں اور خداوندوں کے مطلوبہ اصول و مقاصد کو پورے نظام تعلیم سے کھرچ کر الگ کر دے۔ کرنے والے زیادہ سے زیادہ یہی تو کارنامہ کر سکے کہ یکے بعد دیگرے تعلیمی پالیسیوں کے ڈھیر لگا دیئے' مگر وہ سارے ڈھیر الٹا اس فاسد نظام تعلیم کی روح بد کی حفاظت کے لئے قلعہ بندیوں کی دیواریں بن گئے۔ کسی نے کوئی مثبت کام کیا تو دینیات کا پیریڈ بڑھا دیا' حفاظ قرآن کے لئے امتحانی نمبروں میں کچھ Grace marks کا اضافہ کر دیا۔ یا اب قرآن اور ترجمے کو شامل نصاب کر دیا۔

میکالے کا پرنالہ تو وہیں کا وہیں رہا۔،
نظام تعلیم ساخت کے لحاظ سے سیکولر (لادینیت پر مبنی) ہے۔ اور وہ نہ صحیح مسلمان پیدا کرنے کے قابل ہے' نہ قرار داد مقاصد کے اصول پورے کر سکتا ہے اور نہ وہ اچھے' شائستہ اور دیانت دار انسان ہی فراہم کر سکتا ہے۔
نظام تعلیم کی بنیادی' جامع' ہمہ گیر اور موثر تبدیلی صرف انقلابی اسپرٹ کو حرکت میں لانے سے آسکتی ہے۔ یعنی یہ یہ ہمارے مطلوبات ہیں' ان کو ہمیں لازماً عمل میں لانا ہے — اور یہ یہ چیزیں ہمارے ایمانی' انسانی اور پاکستانی تقاضوں سے ٹکراتی ہیں' انہیں ہمیں اکھاڑ پھینکنا ہے۔ خواہ کوئی چیں بر جبیں ہو یا دانت پیسے۔

حروب صلیبیہ کا نیا دور *

یہ حروب صلیبیہ کا ایک عجیب نیا دور ہے جس میں ان جنگوں کی شکست خوردہ روح بد ایک ایسی دومونہی ناگن میں بدل گئی ہے جس کے ایک سرے پر الحاد کا ڈنک ہے اور دوسرے پر مذہبی تعصب کا انتقامی زہر۔

ماضی کی حروب صلیبیہ شمشیر و تیر کے زور سے لڑی گئی تھیں' مگر جدید حروب صلیبیہ (جن میں الحاد و عیسائیت اور دوسرے مسخ شدہ محدود مذاہب شامل ہیں) تزویر سے لڑی جا رہی ہیں۔ ان حروب صلیبیہ میں بیشتر مورچوں پر مسلمانان کرام ہی تحریکات اسلامی کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں' البتہ ان کو روپیہ' وسائل' اسلحہ اور پروپیگنڈہ کی مدد دینے والی مخالف اسلام قوتیں محاذ سے بہت پیچھے بیٹھی دوربینوں اور سیاروں کی مدد سے محاذ کا سارا کھیل دیکھ رہی ہیں اور ہمارے اہل قوت' اہل دولت اور اہل دانش کے باطل نواز مخلصانہ کارناموں کی قہقہے لگا لگا کر داد دے رہی ہیں۔

ایسی شرم ناک حالت سے تاریخ میں کبھی ہمیں سابقہ نہ ہوا تھا کہ اسلامی نظریہ و تہذیب کے حق میں' اور اس کے خلاف لڑائی لڑنے والے دونوں طرف مسلمان گروہ ہوں۔

تین جبریتیں

پیچھے بیٹھے ہوئے' مگر صاف نظر آنے والے دشمن کے تزویری حربے اور وسائل بہت زیادہ ہیں۔ ہمارے معاندین کا ایک دائرہ علمی ہے۔ اس دائرہ میں سب سے پہلے انہوں نے تجرباتی عقل کو معیار فیصلہ قرار دے کر ہمارے علوم کے بنیادی نقطۂ نظر کو مسلسل زد میں رکھا۔ عقل کے نام سے قیاس نے نظریہ ارتقاء کا محل کھڑا کیا۔ پھر اس کاوش سے کچھ قواعد اخذ کئے گئے۔ نظریہ ارتقاء نے خدا کے تصور کو ختم کر کے مادی تصور کائنات کا کھونٹا گاڑ دیا۔ نظریہ ارتقاء

* ترجمان القرآن' مارچ۔ مئی ۱۹۸۸ء

میں معنی جبریت پنہاں ہیں۔ لہٰذا اگر زیادہ قوت والا کمزور کو کچلتا ہے تو وہ عین نظامِ فطرت ہے۔ اس نظریے نے امپریلزم کی پیش قدمی اور اس کے مظالم کے لئے جواز فراہم کیا اور اب بھی سرمایہ و اقتدار کی زیادتیوں کے لئے ارتقاء کا معنی فتوائے جواز ہی دیتا ہے۔ ایک طرف تاریخ کی جبریت کو طبقاتی تصادم کی صورت میں پیش کیا گیا جس کے معنی یہ ہوئے کہ ہمیشہ ایک طبقہ دوسرے طبقہ کی تباہی کا سامان کرتا رہے اور اس عمل میں کسی قسم کے اخلاق کا دخل نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ تاریخی جبریت ہے۔ مزید برآں انسان کو نفسیاتی جبریت کے شکنجے میں کسا ہوا دکھا کر اس کو خدا پرستی اور اخلاقی شعور سے آزاد کر دیا۔ یعنی قرار دیا گیا کہ وہ بھی حیوانوں میں سے ایک حیوان ہے۔ پھر یورپ میں چونکہ دور علوم کا آغاز پادریوں اور دانشوروں کی نامعقول آویزش سے ہوا اس لیے دانشوروں کے ذہنوں میں مذہب و اخلاق کے ہر تصور کے خلاف باغیانہ ردِعمل پیدا ہو گیا۔ بعد ازاں سیکولر جمہوریت' نیشنلزم' پارٹی سسٹم اور لبرل ازل کے تصورات بنتے گئے' حتیٰ کہ فلسفہ' سیاست' معیشت' اخلاق' نفسیات' سوشیالوجی وغیرہ علوم نئی بنیادوں پر مدون ہو گئے۔ مرد و زن کے تعلقات کے نئے معیارات نے معاشرت کو بدل دیا۔ وفاداری اور پردہ داری کی بنیادیں ڈھے گئیں۔ کچھ لوگ ان علوم پر جدید لٹریچر پڑھ کر اور ان کی انسائیکلو پیڈیاؤں کے ترجمے کر کے وہ سارا فکری و نظریاتی زہر اپنی زبانوں میں منتقل کر لیتے ہیں' مگر کہیں تنقید کی جرات نہیں کرتے۔[1]

---

[1] مثال کے طور پر ایک کتاب مغرب میں چھپی۔ اس کا عربی ترجمہ مصر میں محمد عطیہ الابراشی پروفیسر علم النفس' (دارالعلوم مصر) کا کیا ہوا شائع ہوا۔ اردو میں "فلسفہ تعلیم و تربیت" کے نام سے اشاعت پذیر ہوا۔ (مترجم تھے رئیس احمد جعفری) درج ذیل تبصرہ ترجمان القرآن میں پچاس کی دہائی میں شائع ہوا۔

حکمرانوں اور رئیسوں کا مصر عام مسلمانوں کے رجحانات کے خلاف تہذیب و سیاست میں بھی اور تعلیمات میں بھی فرنگی نقطۂ نگاہ کو پوری وفاداری و نیازمندی سے قبول کر چکا ہے۔ چنانچہ علم و ادب کی دنیا کی تعمیر مغرب سے درآمد کردہ فکری مسالے سے ہو رہی ہے۔ آج کل مصر دوسرے مسلمان ملکوں سے جتنا تقلید مغرب میں آگے ہے' اتنا ہی وہ مغربی علوم پر کتابیں شائع کرنے اور یورپین مصنفین کی کتابوں کے تراجم پیش کرنے میں بھی پیش پیش ہے۔ اس طرح وہ مشرق وسطیٰ کا علمی و ادبی لیڈر بن رہا ہے۔ پاکستان میں بھی مصر کی "علمی ترقیوں" کے بھرم سے کچھ لوگ متاثر ہیں اور وہ کسی مصری کتاب کے ترجمے کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ←

اب تازہ علوم کا یہ دریا مغربی امپریلزم کے ساتھ ساتھ بہہ نکلا اور ہماری ظاہری غلامی ختم ہونے کے بعد بھی آج تک اس کی لہریں چڑھتی آ رہی ہیں اور ہمارے وہ سر ڈوبتے جا رہے ہیں جن میں ایمان کا سودا تھا۔

انہی علوم پر مبنی نصابی کتب بن کے آتی ہیں اور اگر مقامی طور پر کچھ کتابیں لکھوائی جاتی ہیں تو وہ بھی مغربی نصابی کتب کا عکس ہوتی ہیں۔ نصابی کتابوں کی تصویریں بلحاظ لباس، بلحاظ

← ہمارے سامنے جس مصری کتاب کا ترجمہ مذکورہ بالا عنوان سے تبصرے کے لیے رکھا ہے' یہ اپنے موضوع پر معلومات تو خاصے سمیٹے ہوئے ہے' لیکن اس پر بھی گواہ ہے کہ مصر کا اپنا فکری افلاس کس انتہا درجے کی پستی پر پہنچ گیا ہے کہ تعلیم و تربیت کے اصول' فلسفے اور نظام پر جو کچھ اس کے مصنفین کو مغرب سے ملتا ہے اس پر کسی طرح کی تنقید کیے بغیر اور اس میں کوئی رد و بدل کیے بغیر جوں کا توں اٹھا لاتے ہیں۔ ان کے ذہن سے یہ بات نکل ہی گئی ہے کہ اسلام جو ہمہ تن ایک ''تعلیمی و تبلیغی دین'' ہے اور جس کا بڑا مقصد ہی یہ ہے کہ اپنے خاص نظامِ زندگی کے لیے مطلوبہ نوعیت کے انسان تعمیر کرے اور ان کی ذہنی' اعتقادی' اخلاقی اور عملی تربیت کا اہتمام کرے' اپنا کوئی خاص زاویہ نظر تعلیم و تربیت کے باب میں رکھتا ہے۔ یہ کتاب جن مطالب پر مشتمل ہے وہ غلامانہ ذہنیت کے ساتھ اس طرح قبول کیے گئے ہیں گویا عرش بریں سے وحی اتر رہی ہے اور اس میں تحریف و ترمیم کرنا منافیِ ایمان اور مفسدِ آخرت ہوگا۔

ہمارے ملک کے مشہور ادیب رئیس احمد جعفری نے اس کتاب کو اردو کا جامہ پہنانے کے لیے منتخب کیا ہے۔ بلاشبہ ان کی خدمت اس لحاظ سے قدر کی مستحق ہے کہ ہماری نوخیز نسل کے اساتذہ اور والدین اور عام پڑھے لکھے لوگ اس کے ذریعے یہ جان سکتے ہیں کہ مغربی ممالک نے اپنے فلسفہ حیات کے سانچے میں مستقبل کے انسانوں کو ڈھالنے کے لیے کتنی فکری کاوشیں اور کتنے عملی تجربات کر ڈالے ہیں اور تعلیم و تربیت کے فن کو فروغ دینے کے لیے کتنے ہی مختلف مدارس فکر و عمل وجود میں آ چکے ہیں ــــــ لیکن جب ہم اس نقطۂ نظر سے سوچتے ہیں کہ ہمیں ایک اسلامی نظامِ تعلیم و تربیت کی تعمیر میں یہ کتاب کس حد تک مدد دے سکتی ہے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ایک مصری کتاب کا ترجمہ شائع کرنے سے بہتر یہ ہوتا کہ جعفری صاحب بطور خود ایک نئے زاویۂ نگاہ کے ساتھ مغرب کی کاوشوں سے استفادہ کرتے ہوئے کوئی تحقیقی چیز پیش کرتے۔ لیکن چونکہ ترجموں کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا' اس لیے بدرجۂ آخر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب پر ایک جامع مقدمہ ایسا لکھا جانا چاہیے تھا جس میں اسلامی فلسفۂ تعلیم و تربیت کو نمایاں کیا جاتا اور اسی فلسفہ کی روشنی میں پیشِ نظر کتاب پر مترجم خود ایک تبصرہ فرما دیتے۔ یہ چیز عام مطالعہ کرنے والوں کو بڑی مدد بہم پہنچاتی۔

(ترجمان القرآن جلد ۴۴ عدد ۵)

گھر' بلحاظ ماحول' بلحاظ عمومی منظر' بلحاظ عمارات بالکل چربہ ہوتی ہیں مغربی تصویر دیں گا۔ کہیں آپ کو اپنے کلچر کے رنگ میں رنگی تصویر نہ ملے گی۔ کتنی بڑی سازش ہے ایک قوم کو بیرونی فکر اور کلچر کی غلامی میں مبتلا کرنے کی!

تعلیم میں انگریزی کا تسلط

ہماری ایک اور مصیبت یہ ہے کہ ایک تو انگریزی تعلیم کی برتری کے تخت کے پایوں کو گویا ہمارے سروں پر ٹکا کر کیلیں ٹھونک دی گئی ہیں۔ تعلیم میں آگے بڑھنا اور عہدے پانا یا ترقی کا کوئی اچھا راستہ اختیار کرنا انگریزی پرستی کے بغیر ممکن نہیں۔ اوپر وہ طبقہ سیاسی اقتدار اور دفتری نظام کی باگ ڈور تھامے بیٹھا ہے جس کی اکثریت چونکہ دور غلامی میں اچھی اردو نہیں سیکھ سکی تھی' لہٰذا وہ یہ چاہتا ہے کہ انگریزی ہی کا سکہ چلتا رہے اور اردو سر نہ اٹھا سکے۔ مارکیٹ میں انگریزی کی اس مانگ نے نہ صرف غیر ملکی مشنری اسکولوں کے لئے میدان کھول دیا ہے بلکہ ان کی دیکھا دیکھی دو دو سو اور چار چار سو روپے فیس لینے والے بہت شاندار مقامی پرائیویٹ سکول کھل گئے ہیں۔ جہاں درجہ اول سے "سی اے ٹی کیٹ" کا درس شروع ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اتنی بڑی فیسیں نہیں دے سکتے ان کے لیے ۵۰ روپے میں اور کہیں ۱۰۰ روپے ماہانہ فیس والے بے شمار مدارس گلی گلی میں موجود ہیں۔

دوسری طرف عام سرکاری مدارس اور کالج ہیں' جن میں پڑھائی کی حالت یوں بھی قابل رحم ہی رہتی ہے۔ اور پھر وہ خصوصی اہمیت انگریزی کو دے نہیں سکتے۔ ان کی طرف صرف مفلس خاندانوں کے بچے جاتے ہیں' جن کے سامنے محنت مزدوری یا ادنیٰ قسم کی نوکریوں کے سوا اور کوئی منتہا نہیں ہوتا۔

اس طرح انگریزی والے اسکول آئندہ کے لئے ارباب جاہ اور بیوروکریسی کے افراد کو تیار کرتے ہیں اور سرکاری درس گاہیں معمولی ملازم پیشہ اور مزدوری پیشہ نوجوانوں کو میدان میں لاتی ہیں۔

اس طرح تعلیم و دانش کی ایسی تقسیم ہوتی ہے کہ کھلے کھلے دو طبقے ہمارے دیکھتے دیکھتے بن جاتے ہیں۔ ایک ایسا ہے جیسے برہمن' دوسرا ایسا ہے جیسے شودر۔ سارا معاشرہ دو ٹکڑوں میں بٹ جائے گا۔ اور بدحال اکثریت کے اضطرابات کبھی نہ کبھی قیامت اٹھا سکتے ہیں۔

یہ صورت معاملہ چونکہ ہمیں کمزور کرنے والی ہے اور اس میں سے راستہ نکلتا ہے کہ انگریزی زبان اور انگریزی تہذیب کا ہم پر تسلط ہو لہذا یہ معاند اسلام عالمی قوتوں کی پسندیدہ صورت ہے۔

ایک اور ٹریجڈی

برسبیل تذکرہ یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ صرف ''زبان'' ہی ایک تعلیمی مسئلہ نہیں ہے' بلکہ تعلیمی نظام کی بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ اس کے مقصد کا کوئی تعین نہیں اور ساری تعلیمی پالیسیوں اور پورے تعلیمی عمل کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ کیسا انسان تیار کرنا مطلوب ہے۔ بلکہ زیادہ تر سانچہ وہی ہے جو لارڈ میکالے نے اختیار کیا تھا۔

ہمارے ہاں مغرب سے مرعوب طبقہ کی کسی حکومت سے نظام تعلیم اور مواد تعلیم اور نصاب تعلیم کی اصلاح و تجدید' خصوصاً اسلامی بنیادوں پر اس کی بحالی و استواری کے لیے مساعی کی توقع کرنا عبث ہے' کیونکہ دور دور تک پھیلے ہوئے بنجر ذہنی صحرا میں نہ کہیں پانی نظر آتا ہے' نہ سبزہ۔ فقط سراب ہی سراب ہیں۔ آج تک تعلیمی تبدیلیوں کے جتنے سفینے چلائے گئے ہیں' انہیں سرابوں ہی میں چلا کر غرق کیا گیا۔

یہاں کے ناقص' مقلدانہ اور مرعوبانہ نظام تعلیم سے نکل کر جب کوئی نوجوان لادین غیر ملکی یونیورسٹیوں میں پہنچتا ہے تو وہ ایسے نظام تعلیم سے دوچار ہوتا ہے جس کے چلانے والے اور پڑھنے پڑھانے والے سب کے سب اپنے سیکولر ذہن اور مادہ پرستانہ تہذیب پر پوری طرح مطمئن ہوتے ہیں۔ اس مضبوط قلعہ الحاد میں باہر سے جب اکا دکا کمزور مذہبیت رکھنے والے نوجوان پہنچتے ہیں تو مقابل کی صفوں کا یقین و اعتماد ان کے رہے سہے دھندلے سے ایمان کو بھی ختم کر دیتا ہے۔ ایسی ہلکی سی آمادۂ شکست مذہبیت والے جوان بھی کم ہوتے ہیں' باقی سب تو پہلے ہی مفتوح ہو کر پہنچتے ہیں۔ میدان میں تو بعد میں جاتے ہیں' شکست گھر بیٹھے کھا چکے ہوتے ہیں۔

آخر یہ کیسا مجہول قسم کا نقشۂ احوال ہے۔ ہم لوگ کیسے تضادوں کی دلدل میں پھنسے پڑے ہیں۔ کسے پکاریں کہ وہ ہماری خبر لے' ہمیں یہاں سے نکالے ـــــ مگر نکلنے کو جی بھی تو چاہتا ہو۔ جو بلبل پنجرے کے بے محنت راتب کا خوگر ہو گیا ہو' اسے گل و لالہ کی دنیا کبھی کھینچ

نہیں سکتی۔ اس کا ذوقِ پرواز تو مر چکا' وہ تو محض ایک مشتِ پر ہے۔ نہ سوختنی' نہ فروختنی!

یوں دورِ جدید کی صلیبی جنگ جو بے جان مذہبیت اور علمی الحاد اور تہذیبی بدراہی کی متحدہ قوت سے لڑی جا رہی ہے۔ ہمارے ایوانِ حکومت کے بعد سب سے بڑی اور کھلی ذلت آمیز شکست ہمیں میدانِ تعلیم میں دے رہی ہے۔

مشنری تعلیم گاہیں

مشنری ادارے انگریزی زبان اور انگریزی ذہنیت سے ہمارے معصوم بچوں کو آراستہ کر کے' انہیں اپنے لباس پہنا کر' اپنے مذہبی گیت یاد کرا کے' اپنی روایات کی ترغیب دے کر' انہیں سیاسی آزادی کے پردے میں تہذیبی غلامی اختیار کرنے کا سلیقہ سکھا کر' اسلام کی ہر پرچھائیں سے دور رکھ کر اور اسے بہ صد حکمت نفرت دلا کر اور بھاری فیسیں ہماری قومی دولت سے نچوڑ کر ہماری تباہی کا سامان کر رہے ہیں۔ ادھر بچے کو عیسائیت کے ساتھ دینِ الحاد اور تہذیبی مادہ پرستی کی تعلیم ملتی ہے اور اس کی ترقی و کامیابی پر ماں باپ اور افراد خاندان پھولے نہیں سماتے' اور ادھر گھر میں وہ کبھی کبھار خدا کا' حضورؐ پاک کا' قرآن کا ذکر سنتا ہے ـــــ اور دونوں طرف کی معلومات اس کے ذہن میں ہر آن ٹکراتی رہتی ہیں' حتیٰ کہ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے گھر والوں کے کمزور سے مذہبی تصور کو عیسائی درس گاہ کی تعلیم نے پوری طرح پچھاڑ دیا ہے۔

ہمارے پاکستان میں اگر یہ حالات دوسرے کئی مسلمان ممالک (لبنان' نائیجیریا' انڈونیشیا' مصر' سوڈان' ترکی' ملائیشیا وغیرہ وغیرہ) سے قدرے بہتر ہیں لیکن حکومت اور بیوروکریسی پر سپر پاورز کے ذریعے عیسائیت کا دباؤ رہتا ہے۔ یہاں بھی (شفاخانوں کے علاوہ) کثیر تعداد میں مشنری اسکول عیسائیت کی شفاف سی جھلی میں لپٹی ہوئی مغربی فکر اور مغربی تہذیب مغربی برتری کی تعلیم مسلمان شاہین زادوں کو دے کر انہیں خاکبازی سکھانے میں محو ہیں۔ آئندہ نسلوں کے پاس نہ اپنا مذہب رہے گا' نہ اپنی تہذیب' نہ اپنی زبان' اور یہی نسل سپر پاورز کی آشیر باد کے ساتھ حکمران اور کار پرداز ہو گی۔ بیچارے اسلام کو ان سے کس خیر کی امید ہو سکتی ہے۔

آئندہ نسلوں کا حشر

ہمارے ایک عزیز دوست جو ایک طرف' وسیع معلمانہ تجربہ رکھنے والے قابل استاد ہیں

اور دوسری طرف مروجہ نظام اور نظام مدارس اور خصوصاً مشنری تعلیمی مساعی اور باہر سے چھپ کر آنے والی درسی کتابوں کا تفصیلی جائزہ لے رہے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے گفتگوئیں کرنے کے علاوہ اپنی معلومات' مواد اور جمع کردہ اعداد و شمار کی ایک جھلک ایسی دکھائی کہ اب میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ بیرونی ملحدانہ تہذیب اور بیرونی زبان کی جو بیڑیاں ہمیں پہنائی جا رہی ہیں ان سے آزاد ہونے کی راہ کیا ہے اور ان سے آزاد ہوئے بغیر ہم اسلام کے لیے اس معاشرے میں کوئی بڑا کام کر کے کوئی ہمہ گیر تبدیلی کس طرح لا سکتے ہیں۔ مسئلہ یہ نہیں کہ ہمارے ذہن اسیر قفس ہیں۔ بلکہ زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ ہم نے تو اپنی نسلوں کو اغیار کے ہاتھوں میں گروی رکھ دیا ہے اور جہاں کہیں اپنے آدمی کام کرتے دکھائی دیتے ہیں وہ تو اغیار ہی کا کام کر رہے ہیں۔ وہی ذہن' وہی نصاب' وہی تصویریں' وہی رنگ' وہی زبان—— اور اسی ملک گیر گردابِ تعلیم میں ہمارا اپنا سب کچھ غرق ہوا جا رہا ہے' ہر غرقابی کے بعد کچھ بلبلے اٹھتے ہیں اور پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔ میں تو یوں محسوس کرتا ہوں کہ ہم عہدوں اور تنخواہوں کے عوض اپنی اولادوں کو اسی طرح قسائیوں کے حوالے کر رہے ہیں جیسے ہر روز ہر شہر کی بکر منڈی میں بے شمار گردنیں چھریوں کے حوالے کر دی جاتی ہیں۔ ہم جادو کے اس دریا میں جو ہمارے آگے اور پیچھے اور دائیں اور بائیں بہہ رہا ہے اپنے ایک ایک بچے کو اٹھا اٹھا کر پھینکتے ہیں اور جو جتنا زیادہ ڈوب جاتا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی وجہ سے ہمارا بیڑا اتنا ہی جلد پار ہو گا۔ ہم وافر سکوں اور نوٹوں اور معیار زندگی اور آسائشات کو حاصل کرنے کے لیے اپنی اولاد کے ساتھ اپنے ایمان' اپنے عقیدوں' اپنے فریضۂ دعوت' اپنے جذبہ انفاق فی سبیل اللہ' اپنے جنون جہاد برائے حق اور اپنی نمازوں' روزوں اور پردے اور شرم اور غیرت اور روایات اور اقدار سب کو مادہ پرستی کی آگ میں جھونک رہے ہیں جو زمانے نے ہر طرف بھڑکا رکھی ہے۔

عیسائی مشنری تعلیمی ادارے

عیسائی مشنریوں کے قائم کردہ تعلیمی ادارے مختلف ناموں سے چل رہے ہیں مثلاً:

ST. JOSEPH , ST . MARY , ST . ANTHONY , SACRED HEART. یہ ادارے اس تصور پر قائم کیے گئے ہیں کہ برصغیر میں بسنے والی اقوام غیر مہذب اور تعلیم سے بے بہرہ ہیں۔

ہم انہیں تہذیب اور تعلیم سکھانے پر مامور ہیں[1] یہ ادارے بیرونی مشنریوں کی مالی امدادوں اور عیسائی حکومتوں کی سرپرستی میں چل رہے ہیں اور سمندر پار کے چھپے ہوئے لٹریچر کی مدد سے ملحدانہ کلچر کو عیسائیت کا رنگ دے کر اسے پھیلا رہے ہیں اور شاخ در شاخ کتنے مشنری سکول قائم ہیں۔

نصاب کی بالکل ابتدائی انگلش کتابوں میں عریاں رانوں کے ساتھ ایک لڑکی اور مغربی لباس میں ایک لڑکا' بار بار ان کے عیسائی نام اور بار بار ان کی تصویریں' پھر ایک کتا' بار بار کتا مختلف حالتوں میں' پھر نام لیے بغیر کرسمس ٹری' ایک سے زیادہ بار —— نہ محمد مصطفیٰ ﷺ کا ذکر' نہ مسجد کی تصویر' نہ قرآن کی کوئی آیت —— تاریخ اور جغرافیہ بھی اگر مذکور ہوا تو یوں کہ ایک باب کا عنوان ہے:۔

"Irrigation System During Tudor Dynasty"

یعنی ٹیوڈر بادشاہوں کے زمانے کا نظام آب پاشی جس کا تعلق انگلینڈ سے ہے۔ اب ذرا ان مدارس کے ماحول کی ساحری کا اندازہ ان الفاظ میں کیجئے:

پروجاہت عمارتیں' طلباء کی محدود تعداد کے لیے کشادہ کلاس رومز' طویل راہداریاں' کامن رومز' آڈیٹوریم' تھیٹر' تیرنے کے حوض' جسمانی تربیت کے لیے جمنیزیم' کھیلوں کے سرسبز گراؤنڈ' رہائش کے لیے باوقار ہاسٹل اور ان میں مامور خدّام' یہ سب مراعات بچے کو ہمہ وقت یہ احساس دلاتی ہیں کہ وہ اہم ہے۔ مشن اسکولوں میں فادر کا پُرنور چہرہ' سفید داڑھی' سفید لباس' گلے میں صلیب کا نشان اور راہبات کے جمگھٹے۔[2]

---

[1] ترتیب الٹ گئی' پہلے مسلمان دنیا کو علم تہذیب کی نعمتیں عطا کرنے والے تھے' اور محتاجوں میں خود یورپ شدید ترین محتاج تھا۔ اب مسلمانوں کو علم اور تہذیب سکھانے والے اغیار ہیں۔ ہم نے اپنی سابق پوزیشن بحال کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ آج ہم دنیا میں علم وتہذیب کے اول درجے کے گداگر ہیں۔

[2] ان کے بالمقابل بچہ جب محلے یا گاؤں کی مسجد کے امام صاحب کی مفلوک الحالی اور ان کے لباس کو دیکھتا ہے تو اندازہ کر لیجئے کہ اس کے دل میں اپنی اقدار و روایات کا کونسا درخشاں تصور پیدا ہوگا۔ اور ان سے اس کو کیا وابستگی پیدا ہوگی۔ جب کہ اس کے ماں باپ' حاکم' افسر' دانش ور' استاد سب اسے تحقیر سے ملا کہتے ہیں۔ ملا پر یہ حملہ بالواسطہ طور پر اسلام سے نفرت کا باعث بنتا ہے۔ ←

آزاد تعلیمی جزیرے

ان اداروں کو ہمارے ہاں کے نظام امتحانات سے بھی بالاتری حاصل ہے۔ اور محض اس وجہ سے یہ جو کچھ بھی جس طرح چاہیں پڑھاتے سکھاتے رہیں۔ ہمارے یہاں سے مؤثر مداخلت نہیں کی جا سکتی۔ یہ بے شمار آزاد جزیرے ہیں جو ہماری اجتماعی زندگی کے سمندر میں ہم سے تعلیمی و تہذیبی اختلاف رکھنے والوں نے تعمیر کر لیے ہیں۔

دردناک حقیقت یہ ہے کہ کئی پبلک سکول اور کالج ایسے بھی ہیں جن میں ہمارے بعض لیڈروں کے حصص ہیں۔ ہمارے سیاست دان، ادیب، سرکاری عہدے دار صدر یا مہمان خصوصی بن کے جاتے ہیں اور اپنی سرپرستی میں ان کو نوازنے کے ساتھ انعامات یا سندات تقسیم کرتے ہیں۔ اس وقت باہر کے چالاک شکاری دل ہی دل میں کہتے ہوں گے، کس خوبی سے ہم نے ایک قوم کی قوم کو الو بنایا۔

اب یہ ادارے جو ہر سال صدہا نوجوانوں کو تیار کر کے (اور کبھی مغربی بلند تعلیم سے

← علاوہ اس کے Mass Education کے لیے حکومتی یا تجارتی یا رفاہی یا گروہی ادارے جو چل رہے ہیں۔ ان میں بچوں کی بھرمار ہے۔ ایک ایک کلاس روم میں سو سو بچے بیٹھتے ہیں۔ فرنیچر، تجربہ گاہوں اور دیگر تعلیمی سہولتوں کا فقدان ہے، کھیل کے میدان ناپید ہیں۔ اساتذہ بالعموم معیار مطلوب سے فروتر ہیں۔ بچہ اول روز سے عدم توجہی اور بعض اوقات تشدد کا شکار رہتا ہے۔ وہ کئی وجوہ سے سکول میں سبق کو سمجھ نہیں پاتا۔ گھر کا ماحول مفوضہ کام کرنے کے لیے سازگار نہیں اور نہ کوئی مدد دینے والا ہے۔ ان سارے حالات کی سزا اسے گالیوں، ڈنڈوں، گھونسوں اور مرغا بننے کی صورت میں ملتی ہے۔ مایوسیوں اور ناانصافیوں کی گود میں پروان چڑھنے والے ایسے بچے ہر شعبۂ زندگی میں کام چور، خائن اور اپنے آپ سے خفا اور معاشرے سے بیزار رہتے ہیں۔

گویا ہمارے ہاں کے اس طرح کے تعلیمی ادارے بچوں کے دلوں میں اپنے دین اور ملک کے بارے میں مایوسی پیدا کر رہے ہیں۔ فارغ التحصیل طلبہ مشنری اسکولوں اور ان کے رنگ میں رنگے ہوئے اسکولوں اور ان کے نظام اور ان کے مذہب سب کے لیے اپنے اندر ایک مرعوبیت لے کے اٹھتے ہیں۔ گویا ہم اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے تعلیمی محاذ پر ان اغیار سے مار کھا رہے ہیں جو باہر سے یہاں آ کر کام کر رہے ہیں۔ ہائے یہ زنانہ طرز کی شکست! یہ صورت بھی گویا ہمارے دین و تہذیب ہی کے لیے نہیں، ملکی استحکام کے لیے بھی تباہ کن ہے۔

گزار کر) ہماری فوجی اور سول بیورو کریسی میں ڈال رہے ہیں۔ اور خاکروب خاندانوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کو اپنے خرچ پر پڑھا کر بپتسمہ دے کر، اپنے بے شمار تعلیمی اداروں میں معلمانہ مسندوں پر بٹھا کر بڑے بڑے خاندانوں، نوابوں، جاگیرداروں، جرنیلوں اور وزیروں کے بچوں کو ان کی شاگردی کے سایہ میں دئے ہوئے ہیں ـــــ اندازہ کیجئے ایسے معلمین و معلمات کے سماجی مرتبے (Status) میں آنے والے انقلاب عظیم کا۔ ''صاحب'' کے گھر کموڈ اور گندی نالیوں کو صاف کرتے کرتے بچے اٹھتے ہیں اور اسی صاحب کے بچوں یا نواسوں اور پوتوں کے لیے سر (ماسٹر) اور مس یا میڈم بن کر ان کو امریکیوں اور انگریزوں کے ذہن سے جب غیر اسلامی اور غیر پاکستانی تہذیب کے سانچے میں ڈھال رہے ہوتے ہیں تو اس شکل میں گویا مسلمانوں کی دینی برتری اور تہذیبی خودداری کا انتقام لے رہے ہوتے ہیں۔ اور بڑے بڑے خاندانوں کے نادان مسلمان خوش ہو رہے ہوتے ہیں کہ اب ان کی اولادیں ترقی کی راہ پر پڑ گئی ہیں۔ گویا اس تعلیمی و تہذیبی صلیبی جنگ میں ہم اپنی ملّی خودی کے یروشلم کی کنجیاں فاتح صلیبی قوت کے حوالے کر رہے ہوتے ہیں۔ اور اسے کامیابی سمجھتے ہیں کہ ایک پرانا کباڑ خانہ دشمن کی تحویل میں دے دیا گیا ہے۔

ان اداروں کا ماحصل

ان تعلیمی اداروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سائنسی ترقی کا ذریعہ ہوں گے۔ انگریزی دور سے لے کر اب تک برابر یہ کام کرتے رہے ہیں۔ بتایئے انہوں نے کوئی سائنس دان پیدا کیا؟ کوئی صاحب ایجادات کہیں سے ابھرا ہے؟ کسی نے ملک میں استعمالی مشینی اور دفاعی صنعتوں میں کوئی نیا اقدام کر دکھایا؟ حقیقت میں سائنس کا نام ہی نام ہے۔ اصل میں گرجے، مخلوط سوسائٹی، ننگی ٹانگوں، کھلے بالوں اور انسانی زندگی میں کتوں کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے علاوہ لغو مناظر سے لطف اندوزی اور خواہشات سے تفریح حاصل کرنے اور حقیقی خدا پرستی، دینداری، عبادات، حدود حلال و حرام، اخلاقی بلندی و پستی کے پورے تصورات سے ہماری نسلوں کو دور لے جانے کا درس دینا مقصود ہے۔ چنانچہ یہ سب الحاد اور مسیحیت و مغربیت کی پرچھائیں قبول کرنے والے پبلک اسکول ہماری اولادوں کو ایسے جانوروں میں بدل دینا چاہتے ہیں جو کھانے پینے اور دیگر موانعات میں اندھا دھند مشغول ہوں۔ دولت سے اتنی

محبت رکھتے ہوں کہ خیانت کا رنگ خوب پھیلائیں۔ عورت کو گھر سے نکال کر پردے سے اور بڑی حد تک لباس سے بھی آزاد کر کے اسے نمائش کاری اور ہوس کاری کے اسٹیج پر لا کھڑا کریں اور مخلوط سوسائٹی' فحاشی اور عیاشی کے ذریعے تمام اخلاقی احساسات کو تباہ کر دیں۔

اگر ایک یہی مہم چلتی رہے تو احیائے اسلام کے خواب کو پریشان کرنا بڑا آسان ہے۔ کجا یہ کہ دسیوں ترکیبیں اور بھی کام کر رہی ہیں۔ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے معاشرے کی کتنی ایمانی و اخلاقی سرزمین کو اب تک فتح کیا جا چکا ہوگا۔

ایک اور یلغار (آغا خاں بورڈ)

دوسری طرف یہ قصہ بھی چھڑ چکا ہے کہ ایک تعلیمی و تہذیبی یلغار اسمٰعیلیوں (آغا خاں بورڈ) نے بھی ہمارے دماغ درست کرنے کے لیے شروع کی ہے۔ مدتوں تک یہ سمجھا جاتا رہا کہ یہ لوگ دوسروں سے تعرض کیے بغیر اور سیاسی مقاصد کو سامنے رکھے بغیر معاشرے میں سیکولر سے خاموش کام کرتے رہے ہیں۔ مگر اب پاکستان پر جو ان کے پُر اسرار توجہ خاص طور پر ہوئی ہے تو لازماً اس کے پیچھے ایک خطرناک منصوبہ ہے۔ اس وقت (۱۹۸۸ء) دو بڑے تعلیمی و ثقافتی اڈے ان کی طرف سے قائم ہوئے ہیں۔ جو بظاہر بڑا احسان معلوم ہوتے ہیں کہ پاکستان کی ترقی کے لیے ایک گروہ روپیہ اور قابلیت دونوں کو کھلے دل سے استعمال کر رہا ہے۔ مگر یہ احساس معصومانہ قسم کے ہیں۔ ایک طرف ان کے عالمی لیڈر اور پیر آغا خاں' امریکہ و برطانیہ کے محبوبانِ خاص میں سے ہیں۔ دوسری طرف ہندو لاء مذہبی تائید کے ساتھ ان کا معاون ہے' اور پھر بھارت میں ان کی خاصی آبادی اور بہت بڑے کاروبار بھی ہیں۔ یہ وہاں کے مسلمانوں سے بالکل الگ ایک گروہ ہیں۔ ان کے عقائد توحید و رسالت دونوں کے معانی کو غتر بود کرنے اور نماز کے بجائے اپنے پیر کو سجدہ کرنے اور حاضر امام کو حرام و حلال کا فیصلہ کرنے کا مختار کل سمجھتے ہیں۔

اس مذہبیت کے ساتھ اور امریکی' برطانوی اور بھارتی رابطوں کے ساتھ وہ پاکستان پر بہت مہربان ہیں۔ وہ شروع سے بنو اُمیہ کے دور حکومت کو اسلام کا شاندار مظہر ۔ ننتے ہوئے اور رقص و موسیقی اور آزادئ نسواں کی ترغیب دلاتے ہوئے پاکستان کو سیکولرازم کی راہ پر لے جانا چاہتے ہیں۔ پاکستان میں اپنے پروگرام کو آگے بڑھانے کے لیے انہوں نے یہاں بڑی

سخاوتیں دکھائی ہیں۔

اب انہوں نے کچھ تازہ اقدام کیے ہیں۔ پہلے تو کراچی میں میڈیکل تعلیم کا انتہائی معیاری ادارہ اول درجے کی سہولتیں کے ساتھ قائم کیا تاکہ نوجوانوں کے بہترین دماغوں کو وہ اپنے زیراثر لے کر چند سال کے دور تعلیم میں ''درست'' کریں۔ تاکہ جب یہ لوگ پاکستان میں بڑی بڑی حیثیتوں سے ساتھ کام کریں تو یہ اور ان کے اقربا سوسائٹی کو سیکولرازم کا شکار بنا کے چھوڑیں۔ دوسری طرف ملکی اداروں کی پستی کا احساس ان میں اپنے ملک اور معاشرے کی محبت کو مجروح کر دے۔ لیکن دوسرا اقدام اس سے بھی بڑا ہے۔ گلگت اور ملحقہ علاقوں میں شیعہ اور سنی آبادی کا ایک خاص توازن قائم تھا۔ اب اسمٰعیلی ادارے کے قیام سے یہ توازن ٹوٹ جائے گا۔ کیونکہ یہ لوگ بہت روپیہ خرچ کر کے' بہت سہولتیں دے کر اردگرد کی آبادی کی نوجوان قوت کو سمیٹتے جائیں گے۔ جب کہ دوسری طرف پرانی طرز کے ہمارے اسلامی مدارس اور نئی طرز کے متوسط سے مراکز کی طرف رجوع مسلسل کم ہوتا جائے گا۔ غریبی اور جہالت میں پڑے ہوئے لوگوں کو پیسے اور نئی تہذیب کے زور سے رسمی حد تک اسمٰعیلیت کی طرف اور حقیقی طور پر مغربیت اور سیکولرازم کی طرف کھینچا جائے گا۔

ہمارا دیوالیہ پن

ہمارے ہاں چونکہ لوگ کھانے پینے کے کاروبار میں لگے ہیں۔ ہر کوئی رشوت و خیانت، کی اسکیموں پر روزانہ کاوش کر کر کے ان کو عمل میں لا کر فائدے حاصل کرتا ہے اور پھر آگے کا نقشہ بناتا ہے۔ ممبریوں اور عہدوں کی بانٹ' بلکہ خرید و فروخت ہوتی رہتی ہے' اور لوگ علاقوں اور صوبوں 'ور زبانوں کے لیے باہم دست و گریباں ہیں۔ اتنے اہم معاملات کے ہوتے ہوئے کس کو فرصت کہ وہ کار خاص کے اداروں کے ذریعے ہر چیز کی مخفی حقیقت کو وقت سے پہلے سمجھ سکے اور کس کو اس ضرورت کا احساس کہ وہ اپنے سرحدی علاقوں کو تعلیم اور معیشت اور دفاع کے لحاظ سے مضبوط بنائے۔ اور کس میں ہمت کہ وہ مشتبہ قسم کے غلط کام کرنے والوں کو روک سکے اور مشکوک اداروں کو اگر حکومت کی مستقل نگرانی میں نہ لے سکے تو کم سے کم ان پر بعض ضروری پابندیاں لگا دے۔

مگر جس حکومت کا اپنا کوئی تعلیمی تصور ہی نہ ہو اور کوئی تہذیبی نقشہ ہی نہ ہو' اس کے

ہاں تو میدان کھلا ہے کہ جس کا جی چاہے آئے اور جیسی تعلیم وتہذیب چاہے قوم میں پھیلائے' کوئی احتساب اور روک ٹوک اور امتناع نہیں ہے۔ جہاں ۴۰ سال میں دستور ہی کا فصلہ نہ ہو پایا ہو' جہاں یہی طے نہ ہو کہ کس قسم کی حکومت پاکستان کو چاہیے۔ جہاں یہی سوال جھگڑے کا باعث ہو کہ شریعت ہو گی یا لادینیت' وہاں کس بنیاد پر کسی اپنے بیگانے کو روکا جائے کہ فلاں کام یہاں کیا جا سکتا ہے۔ فلاں نہیں کیا جا سکتا۔

ایسی خستہ حالی و بے چارگی اور جمود و جذام کا عالم جہاں طاری ہو' وہاں ہم لوگ اسلام جیسے عظمت مآب نظام زندگی کی دعوت لیے اس امید میں کھڑے ہیں کہ شاید دیر صرف اتنی ہے کہ نظام اسلام کی معلومات قیادت کے سامنے رکھ دی جائیں تو وہ فوراً انہیں آنکھوں سے لگا کر نافذ کر دے گی۔ پیارے ساتھیو! یہ جو کچھ دیکھتے ہو کٹھ پتلیاں ہیں' گڑیاں ہیں' مومی مجسمے ہیں' یہ جیتے جاگتے آدمی بھی نہیں' تمہیں تو مسلمان چاہئیں!

مگر یہ جبھی ہو گا کہ پہلے تم خود مسلمان بنو اور ساری مرعوبیتوں سے نکل آؤ۔

مغربی سامراج کا نیا ہدف ـــــ تعلیم *

ساہوکارانہ سامراج نے غلامی کی ایک تازہ زنجیر ہماری گردنوں کے گرد لپیٹنے کا فیصلہ کر لیا ہے' بلکہ حکومت کو منوا کر عملی اقدام بھی شروع کرا دیا ہے۔ ہماری جمہوریت نے اس کارِ خیر پر اپنے معزز و موقر غلام سازوں کے ہاتھ پاؤں چوم کر بہ صد تشکر قوم کی گیارہ کروڑ گردنیں آقائے عظیم کے سامنے جھکا دی ہیں کہ ان گردنوں کے گرد جو پھندا بھی کسنا ہو کس لیجئے اور جو نشتر بھی رگ ہائے جان کے قریب فٹ کرنے ہوں' کر لیجئے۔ ''گولی کس کی اور گہنے کس کے!'' (یعنی کنیز بھی آپ کی اور گہنے بھی آپ کے!) بلکہ گہنوں کی جگہ آپ طوق بھی پہنا دیں تو کنیز تو پھر بھی بصد ادب آپ کی سلامتی کی دعائیں کرے گی۔ ''تم سلامت رہو ہزار برس۔ ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار''

ہم اس درجہ کے بے مثال محسن شناس ہیں۔ ہوا یہ کہ اوپر کی دنیا میں جہاں پر اسراریت کے بادل چھائے رہتے ہیں' وہاں ہمارے بڑوں اور ان کے بڑوں کے درمیان بات چیت پاکستان کے تعلیمی حالات پر ہوئی۔ خرابی احوال کے مختلف نمایاں پہلو بحث میں آئے۔ ہمارے جدید غلام ساز تو پہلے سے منصوبے ذہن میں لے کر آئے تھے یہاں انہوں نے محض تعلیمی زوال اور پسماندگی کی بحث چھیڑی۔ ہمارے جمہوری مالکوں نے ساہوکار سامراجیوں سے یہ کہا کہ کچھ آپ ہی اس بارے میں جائزہ و تحقیق سے کام لے کر نقشۂ اصلاح تجویز کر دیجئے' ہم لوگ تو اور بہت اعلیٰ درجے کے جھمیلوں میں گلے گلے تک دھنسے ہوئے ہیں۔ اور ہمیں تو اس ایک کام سے فرصت نہیں کہ اپنے آپ کو اور اپنے جاہ و جلالت کو بچایا جائے۔

اس طرح ورلڈ بنک کی ڈیوٹی لگی کہ وہ پاکستان کے تعلیمی حالات کا سروے کرے۔ ورلڈ بنک نے کام کی وسعت کو دیکھ کر اپنے ساتھ آئی ایم ایف (International Monetary Fund) کو بھی لگا لیا دونوں ''امریکہ ـــــ مغربی ـــــ اسرائیلی'' سامراج

---

* یہ مضمون ۱۹۸۹ میں لکھا گیا۔

کے چیتے کے اگلے دو پنجے ہیں۔ سامراج کی مہارت فن ہے کہ ان بنکوں کو تعلیمی جائزے اور سروے اور تجاویز اصلاح مرتب کرنے کی دعوت خود ہماری حکومت کی طرف سے دلوائی گئی۔ فروری' مارچ ۸۹ء میں یہ کام ہوا۔ پنجاب کے اندر سروے کا کام خود ورلڈ بنک نے کیا۔ اور پنجاب سے باہر کے پاکستان میں آئی ایم ایف نے کیا۔ اس تقسیم میں بھی ایک خاص ذہنیت کام کر رہی ہے اور وہ پنجاب کی حیثیت کو جداگانہ نوعیت دیتے ہیں' کیونکہ یہ تو ہمیشہ سے پکا پاکستان رہا ہے اور وہ یہیں کے تعلیمی دروبست کی توڑ پھوڑ کو زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔

خاموشی ہی خاموشی میں پورے ملک کا تعلیمی جائزہ لے لیا گیا۔ اور دونوں بنکوں کے یہودی اس سارے منصوبے کو چلانے اور ایک خاص شکل دینے والے تھے۔ سروے ٹیمیں بالکل سی آئی ڈی کی طرح بعض تعلیمی اکابر سے ملیں' اساتذہ سے رائیں لیں' طلبہ سے ان کے تاثرات جمع کیے۔

اور پھر غور و فکر کے بعد ۶۲ صفحات کی ایک رپورٹ جس کا ظاہر عنوان "A Discussion Report" ہے۔ دراصل ایک لطیف طرز کا حکم نامہ ہے اور ایسا مقدس حکم نامہ ہے کہ ہمارے ہاں نیت کے لحاظ سے انگوٹھا لگا دیا گیا۔ البتہ ظاہر میں کچھ ورکنگ نوٹس مرتب کر کے بیورو کریسی اور ارباب تعلیم کو تھما دیئے گئے۔ جو یہ جانتے ہیں کہ یہ نوٹس حرف آخر ہیں۔ چنانچہ اس کے مطابق تدریجاً عمل شروع ہو گیا ہے۔

آگے چل کر آپ پر کھلے گا کہ علامہ اقبالؒ، قائداعظمؒ اور مولانا مودودیؒ نے خون جلا جلا کر اور جانیں گھلا گھلا کر اسلام' پاکستان' نظریہ پاکستان' اسلامی قومیت' تصور ملت' احیائے نظام اسلامی' ایمانیات و تصورات اور بہ حیثیت قومی زبان کے اردو کا جو خزانہ ہمیں دیا تھا وہ تو زیر بحث اسکیم کے پنجے میں ملیامیٹ ہوا جا رہا ہے۔

اب تک ہمارے ساہوکارانہ سامراج نے ہمیں کٹھ پتلیاں بنا کر خارجہ پالیسیوں میں مداخلت شروع کی تھی۔ کچھ مالیات اور ٹیکسوں کے نظام کو بگاڑا' موجودہ بدترین جمہوریت اور حکمران پارٹی کے تحفظ کے لئے سازشوں کے جال بچھائے' موجودہ جمہوریت کو توڑنے کی صورت میں قرضوں اور امدادوں کی بندش کا ٹھینگا دکھایا گیا۔ اب تعلیم کو ہدف بنا لیا گیا ہے۔ دور حاضر کے فراعنہ نے تعلیم کے حربے سے مقصد برآری کا راستہ نکالا ہے۔

یہ تو معروف و معلوم حقیقت ہے کہ پاکستانی راہوار اقتدار سے صدر ضیاء الحق کی نعش اتارنے کے بعد اس راہوار کی زین پر کس طاقت نے کس کٹھ پتلی کو ہم سب کی دیکھتی آنکھوں کے سامنے بٹھایا۔ پھر مسلسل رکاب تھام کر سہارا دیا۔ عالمی پروپیگنڈے اور ڈپلومیسی کی طاقتوں سے امیج بنایا۔ پھر یہاں امریکی سفارت خانہ علی الاعلان پالیسیوں' احکام اور قوانین کے متعلق رہنمائی دیتا رہا۔ امریکہ سے آنیوالے وزراء اور ایلچی اور سینیٹر ہر بار پاکستان کے معاملات خارجہ (خصوصاً بھارت سے تعلقات) کے متعلق رہنمائی بلکہ انتباہات تک دیتے رہے ہیں۔ گویا کہ ہمارے اصل حکمران وہ ہیں۔ ہماری یہ حیثیت نہیں کہ ہمارے لیڈر یا جماعتیں یا اخبارات ان مداخلت کاروں کے' تجاوز عن الحدود' پر شدید گرفت کریں اور تقاضا کریں کہ ایک آزاد قوم کے ساتھ اپنے طرز معاملہ کو درست کریں' ورنہ اپنی تشریفات اور عنایات سے ہماری جان بخشی کریں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا اب نظام تعلیم کی رگ گلو پر چھری رکھ دی گئی ہے۔

نظام تعلیم کی اہمیت

کسی قوم کا نظام تعلیم اس کے مجموعی نظام حیات کا گویا دل و دماغ ہوتا ہے جس کا پہلا کام ایمان و اخلاق اور قوم کے تہذیبی وجود' مخصوص ملی تشخص' تاریخی رزم خیر و شر' نظام اقدار و شعائر کے سرمائے نئی نسلوں تک پہنچانا' اور اس کے مطابق نصب العین ودیعت کرنا ہوتا ہے۔ اور نصب العین ہی کی خدمت کے لئے ایک طرف معاشی تگ و تاز انسانی زندگی میں ضروری ہے' دوسری طرف دفاعی قوتوں کی تنظیم اور تیاری کا کام' تیسری طرف علوم انسانی اور علوم مادی دونوں میں اس نقطۂ نظر سے ترقی کہ دوسری اقوام سے مسابقت کرنے میں پسپائی نہ ہونے پائے اور پہلے سے اگر کوئی کمزوری موجود ہو تو وہ جلد رفع کر لی جائے۔ کیونکہ اب معیشت اور دفاع کا انحصار علوم ایمانی' علوم انسانی اور علوم مادی کی ہم آہنگ اور متوازی ترقی پر ہے۔

اب ہمارے غلام ساز ساہوکارانہ امریکی سامراج نے یہودیوں کے تعاون سے ایک ایسا قدم اٹھایا ہے کہ ہماری قومی زندگی کے دل و دماغ کی مرکزی قوت مادی ترقی کے نام سے اغیار کے ہاتھوں میں چلی جائے اور اس کے ایمانی و انسانی پہلو کا خوب اچھی طرح کچومر نکال دیا جائے۔ تاکہ فنڈا منٹلزم کا خطرہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے' جو سامراجی طاقتوں اور لادین

تہذیبوں کے فروغ میں رکاوٹ بنتا ہے۔ اس وقت لادین مادہ پرستی کی نگاہ میں پاکستان وہ سب سے زیادہ خطرناک (Spot) ہے جہاں سے فتنۂ امنظرزم کی وہ طوفانی قوت اٹھ سکتی ہے جس کا ادنیٰ کرشمہ یہ ہے کہ وہ ممولے کو شہباز سے لڑا دیتی ہے اور ہاتھیوں کو ننھی ننھی چونٹیاں تڑپا دیتی ہیں۔

وہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ مغربی الحاد' فسق و فجور' بے حیائی' بدکاری' شراب و قمار' خیانت وغیرہ سب کچھ پھیلے مگر کسی میں اسلام کے لئے اتنا موثر جذبہ باقی نہ رہے کہ احتجاج اور ملامت کی کوئی تحریک اٹھ سکے۔ بلکہ حرام و حلال کی تمیز کے بغیر یہ قوم سب کچھ ہضم کرتی جائے اور پھر نشے میں آ کر کہے کہ ہم ترقی کر رہے ہیں۔ شاہت الوجوہ!!!

معاشی حیوان

دنیا میں کوئی ایسی احمق قوم موجود نہیں ہے جو اپنا نظام تعلیم دوسروں سے بنواتی ہو۔ مثلاً جیسے جنگ فیکٹری لگانے کے لئے آپ برطانیہ یا جرمنی یا جاپان کو آرڈر دیتے ہیں اور وہ مطلوبہ نقشے اور معیار کارکردگی کی مشینری فراہم کر دیتے ہیں۔ تعلیم اس طرح دوسرے کے ہاں کارخانوں میں نہیں بنوائی جاتی۔ یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو ''من چہ سرائم و طنبورہ من چہ سرائم'' والی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس رپورٹ (یا حکم نامے) میں مرکزی بات یہ ہے کہ تعلیم کے سامنے اصل مسئلہ ''کوالٹی'' کا ہے اور کوالٹی کی تشریح خالص مادی معنوں میں یہ کی گئی ہے کہ معاشی و ٹیکنیکل ترقی کی صلاحیت کا مطلوبہ معیار تک موجود ہونا۔ ساری تعلیم کا مرکزی نقطہ یہ ہو گا باقی تمام مضامین اور مواد سب بے کار ہے۔ نظریہ پاکستان' اسلامی تعلیمات' قرآن' حدیث' سیرت' تاریخ انبیاء' تاریخ اسلام' تاریخ ملت' اردو زبان' سب کچھ کوالٹی کی تعریف سے خارج ہے۔ اس قسم کی چیزیں ''ہائیر ایجوکیشن'' (جس سے رپورٹ اصل بحث کرتی ہے) سے نیچے ہی نیچے رہ جانی چاہئیں۔ یعنی درجہ وسطانی میں میٹرک کے ساتھ ایف اے کی تعلیم کو ملا کر ان لوگوں کو فارغ کر دیا جائے جنہیں چپڑاسی' کلرک' عرضی نویس' امام مسجد' پرائمری ٹیچر' ترکھان' کمہار' خوانچہ فروش' تیلی' تنبولی' ٹائپسٹ یا آرٹسٹ بننا ہے۔ رہی اعلیٰ تعلیم جو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جائے گی۔ جہاں سے ملک کے حکمران' لیڈر' دانشور' سائنس دان' انجینئر'

ڈاکٹر، بیوروکریٹس، فوجی کمانڈر اور اعلیٰ درجے کے اہل تحقیق تیار ہو کر نکلیں گے۔ ان کے نصاب ہر اس چیز سے پاک ہوں گے جو "کوالٹی" کے معیار برتر کے حصول میں خلل انداز ہوں۔ گویا لفظ "کوالٹی" اپنی مخصوص تشریح کے ساتھ ایک کلیدی اصطلاح ہے اور ساری بحث کو سمجھنے کے لئے اس کو مرکزی نقطہ کے طور پر سامنے رکھنا ضروری ہے۔

یعنی ہمارا نظامِ تعلیم خالص معاشی حیوان اور تکنیکی روبوٹ پیدا کرنے کا ذریعہ ہوگا۔ اور قدرتی بات ہے کہ جب اعلیٰ تعلیم اس طرح کی ہوگی تو قدرتی طور پر نیچے سے تیاری اسی طرز کی ہوگی تاکہ نیچے سے آنے والے طالب علم ترقی کی راہ پر تیز قدم چل سکیں۔

مشہور مثل ہے کہ خانہ خالی را دیوی گیرد۔ آپ نے اپنے نظامِ زندگی اور نظامِ حکومت کی طرح نظامِ تعلیم کو بھی مقصد اور نصب العین سے خالی رکھا۔ نتیجہ یہ کہ طالب علم سندوں کے ساتھ ذہنی خلا اور فرسٹریشن لے کے کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکلتے رہے۔ بار بار پالیسیاں بنیں اور نصاب نقشے بنے، نصابی کتابیں لکھوائی گئیں۔ بعض میں ترامیم و اصلاحات کرائی گئیں لیکن ماحصل کیا ہے۔ نظریے کا فقدان، مقصد کا خلا اور نصب العین سے محرومی۔

ایسے نظامِ تعلیم سے نکلی ہوئی نسلوں کو آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ کس طرح وحدت کے بجائے انتشار کی طرف اور امن کے بجائے خونخواری کی طرف، اور پابندی قانون کے بجائے اپنی قوت کو بنائے قانون بنانے کی طرف اور دینی حدود اور تہذیبی قیود کا احترام کرنے کے بجائے ان کو توڑ کر مخالفانہ اطوار اپنانے کی طرف جا رہی ہیں اور اس رویئے پر فخر محسوس کرتی ہیں۔ وہ اسے ترقی کہتے ہیں۔ مگر سخت درجہ کے ذہنی بحران میں مبتلا ہیں۔ اور اسی وجہ سے حکمرانوں اور منتخب نمائندوں اور لیڈروں اور عہدہ داروں اور دانش وروں میں بھی اخلاقی پستی نمایاں ہے۔ اور ہم بہ حیثیت نظریاتی و تہذیبی گروہ کے ایک ڈوبتے جہاز کی طرح آہستہ آہستہ نیچے جا رہے ہیں۔ اس وقت ہمیں حضرت الیاسؑ جیسے رہنما اور حضرت نوحؑ جیسا سفینہ درکار ہے۔

جمہوریت اور تعلیم

اتنے بڑے اہم کام اور تعلیم جیسے نمبر ون ادارے کا مطالعہ اور اس کی کمزوریوں کو نشان زد کرنے اور اس کے لئے اصلاحات تجویز کرنے کی ذمہ داری کسی پر ڈالتے ہوئے جمہوریت کی نیلم پری کو یہ خیال کیوں نہ آیا کہ پوری قوم کے اس بنیادی مسئلے کو جس کے لئے قرارداد

مقاصد میں واضح خطوط بتائے گئے ہیں۔ اور جو ہر قوم کی طرح ہمارے دین اور ہماری تہذیب سے تعلق رکھتا ہے' اسے کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اولاً وفاقی ایوان میں لایا جائے کہ حکومت یہ کام یوں کرنا چاہتی ہے۔ پھر اسمبلی سے نکل کر یہ بحث اخبارات' اداروں اور اساتذہ اور علماء تک پہنچنی چاہئے تھی۔ بعد ازاں رد عمل دیکھ کر کوئی فیصلہ کیا جاتا۔

مگر ہمارے ہاں ایک انوکھی جمہوریت گلوٹین بن کر مسلط ہو گئی ہے۔ یہ جمہوریت بس اتنی ہے کہ کوئی پارٹی بطور حکمران منتخب ہو جائے یا کوئی فرد یا (بصورت موجودہ) کوئی عورت وزیراعظم بن جائے اس کے بعد وزیراعظم یا اس کی پارٹی جب جو جی چاہے کرتی رہے' نہ ایوان سے پوچھنے کی ضرورت' نہ رائے عام کے سامنے اشد اہمیت تک کے مسائل لے جانے کی حاجت۔ چاہے کسی سے کوئی لین دین ہو جائے یا کوئی معاہدہ ہو جائے' یا قوم کے کسی مسئلے کے حل کی ذمہ داری خود اس کے نظریاتی مخالفین کے سپرد کر دی جائے۔ یا تجارتی یا جنگی یا کسی اور معاملے میں دوست یا دشمن طاقت کے لئے حکومت کی کوئی سی پالیسی نافذ ہو جائے' کسی کو حق نہیں کہ آواز بلند کرے' کیونکہ ایک دفعہ جب کسی کو ووٹوں کے بل پر اقتدار مل گیا تو پھر جو چاہے وہ کرے یعنی ایک بار ووٹوں سے جو تخت پر بیٹھ گیا وہ ظل اللہ ہے' چنگیز ہے' ہلاکو ہے' نمرود ہے' شداد ہے' الامان والحفیظ! کیا یہ مارشل لا سے بدتر نہیں؟

آخر ہمارے ساتھ یہ مذاق کیوں روا رکھا جا رہا ہے کہ ورلڈ بنک سے خفیہ طور پر سرگوشیوں میں ایک معاملہ طے ہوتا ہے' ذمہ داری سونپی جاتی ہے' رپورٹ بنتی ہے' اسے قبول کر لیا جاتا ہے۔ بس اچانک یہ بات پردہ راز سے باہر نکل آتی ہے کہ اندر کا ہیا میں گڑ پھوڑا گیا ہے۔

یہ جمہوریت نہیں ہے' یہ آمریت ہے' فسطائیت ہے' ہٹلر ازم ہے۔ جو لوگ اس جمہوریت کا نام آنے پر انگوٹھے چومتے پھرتے ہیں' انہیں اتنا علم نہیں ہو سکا کہ اندر کے مارشل لاء سے تو آپ محفوظ ہیں' مگر دشمنوں کی غیر مرئی سامراجیت جمہوریت کے پردہ رنگین کی آڑ میں آپ کو ناکوں چنے چبوا رہی ہے اور صیہونیوں اور بھارتیوں کے منشا کے مطابق آپ کی نظریاتی و دینی تباہی کے جو سامان کر رہی ہے' بلکہ آپ کو معاشی و صنعتی دیوالیہ پن کی طرف بھی لے جا رہی ہے وہ آپ کو اس لئے پیاری ہے کہ اس نے جمہوریت کے ایک ڈرامے کا انتظام ہمارے لئے کر دیا ہے اور ہمارے سیاسی "ڈزنی لینڈ" کے اس ڈرامے کے پیچھے ساری نقشہ

گری ان کی ہے۔ یہ مارشل لا سے دس گناہ بدتر صورت حالات ہے۔ یہ مارشل لا سے بھی اوپر کا مارشل لا ہے اور یہاں سیاسی مؤذن' صحافتی بانگے اور دانش ور منادیے چاروں طرف پکارتے پھرتے ہیں کہ جمہوریت اگر ملک کی ساری دولت کو دریا برد کر دے' اگر اقتصادیات کو تباہ کر دے' اگر اخلاق و شائستگی کو غارت کر دے' اگر قدم قدم پر لہو کی ندیاں بہانے کے سامان کر دے۔ اگر وہ رعایا کے زن و بچہ کو لہو میں پیل دے' اگر وہ خارجہ پالیسی کی مارکیٹ میں پاکستان کی قدر و قیمت گرا گرا سے ذلیل کر دے بلکہ اگر وہ بین الاقوامی دارالرقیق (غلام فروشی کی منڈی) میں ساری قوم کو بیچ دے تب بھی اس کی جوتیوں کو چومنا چاہیئے۔ افسوس ہے کہ جن مسلمانوں نے اپنے دین کے متعلق ایسی والہیت کبھی نہیں دکھائی وہ موجودہ مکروہ جمہوریت کو تو گویا پوجنے کے لئے تیار ہیں۔ کیا خدا اور رسولؐ کے لئے بھی ایسی فریفتگی کا کوئی مظاہرہ آپ کر سکے۔

جائزہ تعلیم اور نقشہ اصلاح کا کام اگر کرنا ہی تھا تو کیا اس ملک میں دس' بیس افراد ایسے نہ تھے جو علم و تجربہ کی قوتوں سے کام لے کر اس خدمت کو انجام دیتے اور اس معاوضہ (زرمبادلہ) کی رقم کو بچایا جا سکتا تھا جو بیرونی بنکوں کے ماہرین کے وفود کو ادا کی گئی اور ملک کو اس خطرے سے بچایا جا سکتا تھا کہ صلیبی اور صیہونی طاقتیں ہمارے معاشرے کی گہرائیوں میں اتر کر نہ صرف رپورٹ مرتب کر گئیں بلکہ ساتھ ہی جاسوسی کا فریضہ از خود انجام پا گیا۔

گویا ہم نے دنیا کے سامنے ایک تو یہ اعلان کیا کہ ہمارے پاس محض دس بیس ماہرین تعلیم بھی ایسے نہیں ہیں کہ جن کی مدد سے ہم تعلیمی خرابی احوال کا جائزہ لے سکیں اور اصلاح و ترقی کی اسکیم بنا سکیں۔

دوسرے یہ کہ ہم نے دنیا کو اپنی یہ کمزوری بھی دکھا دی کہ ہمارے ملک اور شعبوں اور اداروں کے ماہرین مشیر (بلکہ کارپرداز) غیر پاکستانی' سامراجی عناصر ہیں۔

ہم یہ بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کیا تعلیم ایسا لباس ہے کہ جو ایک ہی ساخت کا ہوتے ہوئے ہر قوم کو فٹ آ سکے ــــ بلالحاظ اس کے کہ اس کا قد و قامت کیا ہے؟ اس کی امنگیں کیا ہیں؟ اس کا نظریہ تعلیم اور مقصد تعلیم کیا ہے؟ کون سے اجزاء و عناصر ہیں جن کا تعلیم سے خارج ہو جانا یا کمزور ہو جانا کسی قوم کے لئے تباہ کن ہو سکتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہمیں قرآن کا مفہوم سمجھانے کے لئے ورلڈ بنک یا بین الاقوامی ترقیاتی بنک آ کے درس دے؟ کیا یہ قرین

قیاس ہے کہ تحریک پاکستان کی روح اور اس کے مقصد اور اس کی مزاحم قوتوں کے متعلق انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ کی ٹیم آ کر ہمیں بتائے کہ اس دائرے میں ہمیں کیا کرنا چاہئے کیا کیا نہیں؟

آزادی سے پہلے بھی ہماری تقدیر باہر سے بن کر آتی تھی اب بھی اگر ہماری تقدیر باہر ہی سے طے ہو کر آئے تو آخر فرق کیا ہوا۔ پہلے دور غلامی کے خلاف تو سیاسی تحریکیں تھیں' ایجی ٹیشن تھا' سول نافرمانی تھی' پورا ادب چیخ رہا تھا' مذہبی اداروں سے صدائے اختلاف و احتجاج' بلکہ نفیر جہاد تک بلند ہو رہی تھی۔ لیکن موجودہ آسیبی غلامی کو اول تو غلامی سمجھنا مشکل' پھر جس غلامی کو جمہوری حکومت کمال آزادی سمجھتی ہو' اس کے خلاف تحریکیں کیا اٹھیں گی۔ ہم ان نئی زنجیروں کو توڑنا چاہتے ہیں مگر ہمارے اکابر یہ زنجیریں ہمیں پہنانے پر بضد ہیں۔ گویا جمہوریت کا اصرار ہے کہ غلامی کر لو اور ہم چاہتے ہیں کہ ہم غلامی پر لعنت بھیجیں ۔۔۔۔ خواہ وہ اندر کی فسطائیت کی ہو' یا بیرونی سامراجیت کی۔

معلوم ہوا ہے کہ اس رپورٹ پر شرط پوری کرنے کے لئے چند سیمینار بھی کرائے گئے ہیں جو خفیہ نوعیت کے تھے۔ یعنی اپنے خاص خاص آدمیوں کو کسی ہال میں جمع کر کے باتیں کر کرالی گئیں۔ فری میسنوں کی طرح نہ کوئی اخباری اعلان' نہ تفصیلی رپورٹ' سوال یہ ہے کہ اس اخفاء کی ضرورت کیا تھی اور جمہوریت کے پردے کے پیچھے بیٹھ کر خفیہ سرگوشیاں کرنا کیا جمہوریت کا نقیض نہیں ہے۔ ایک پبلک مسئلہ تھا آپ اسے پبلک میں لاتے' تمام سیاسی جماعتوں اور دینی اداروں اور علمی مراکز کو بھیجتے' اخبارات کو پہنچاتے' بڑے شہروں میں اعلان کردہ سیمینار خود بھی منعقد کرتے' اور دوسروں کو بھی اس کا موقع دیتے۔ بیانات اور قراردادیں شائع ہوتیں' اساتذہ سے پوچھا جاتا' پھر آپ اسے وفاقی ایوان کے سامنے مشورے کے لئے رکھتے' اس کے بعد فضا کا مجموعی رنگ دیکھ کر آپ فیصلہ کرتے کہ یہ قدم اٹھانا چاہئے یا نہیں۔

آخر یہ کون سی جمہوریت ہے کہ اخفاء کا ایک جزیرہ آپ نے الگ بنا لیا ہے' اس جزیرے سے باہر کی کسی کو خبر ہی نہیں کہ اندر کیا ہو رہا ہے' اور اندر وہ فیصلے ہو رہے ہیں کہ قوم کی پوری زندگی تلپٹ ہو جائے اور اس کے اہم ترین اداروں کا نقشہ بدل جائے۔

ہم اس نظام اخفا کو ملک کے لئے نہایت خطرناک' نہایت مہلک اور نہایت تباہ کن سمجھتے ہیں اور اس کی خطرناکی میں اس بات سے اور اضافہ ہو جاتا ہے کہ یہ جمہوریت کے نام سے

ہو۔ اور ہمیں معلوم ہے کہ اس اخفائی میتھڈالوجی کو اور بھی کئی اہم امور میں بہت ہی تباہ کن انداز سے استعمال کیا گیا ہے۔

سرکاری تعلیمی اداروں کا مستقبل

آخر میں اس رپورٹ کے ''سگنلز'' کو قبول کرتے ہوئے جو ڈائریکٹو جاری کیا گیا ہے اور جس کے تحت درس گاہوں کی ایک خاص تعداد کو اولین مرحلے میں آزاد کر دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے' اسے کیوں وفاقی ایوان میں باقاعدہ منظوری کے لئے پیش نہیں کیا گیا۔ اور ایسی جلدی بھی کیا تھی سارا اقدام ایک طرح کے آرڈی ننس سسٹم پر ہو جائے اور کوئی سوال' اعتراض یا اختلاف رونما نہ ہو۔ کیا واشنگٹن سے آنے والی ہدایات (چاہے رپورٹوں کی شکل میں ہوں) وحی و الہام ہیں کہ ان کے لئے (آمنا وصدقنا) کہنے کے علاوہ کوئی اور رویہ اختیار نہیں کیا جا سکتا۔

واضح رہے کہ دس سال میں حکومت تمام تعلیمی اداروں کو گھر سے نکال باہر کرے گی کہ میاں جاؤ' اپنے لئے خود کماؤ اور کھاؤ' اماں باوا کی روٹیاں کہاں تک توڑو گے۔ پہلی اطلاع یہ تھی کہ صرف پنجاب میں پہلے مرحلے میں ۱۹ اعلیٰ ترین مراکز تعلیم اور ۱۳ معیاری اسکولز کو حکومت گود سے نکال کر باہر پھینک دے گی۔ دلچسپ بات یہ کہ حسب رسم ایک نمائشی تردیدی بیان بھی پنجاب میں نکلا۔ مگر اب تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ محکمہ تعلیم پنجاب کے سیکرٹری صاحب نے ان اطلاعات کی تردید کی (وہی مغالطہ انگیز تردید) کہ تعلیمی اداروں کو نجی شعبے کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ تاہم ''انہوں نے بتایا کہ بارہ اہم کالجوں اور بارہ سکولوں کو خود مختاری دی جائے گی۔ (اسی پر بس نہیں) فرمایا: اس منصوبے پر مرحلہ وار عمل کیا جائے گا۔ اور اس میں کم از کم ایک ڈویژن سے ایک ایک سکول اور کالج کو شامل کیا جائے گا۔ اب فارغ خطی مل رہی ہے گورنمنٹ کالج لاہور' کینرڈ کالج لاہور' لاہور کالج فار ویمن لاہور' گورنمنٹ کالج راولپنڈی' گورنمنٹ زمیندارہ کالج گجرات' گورنمنٹ کالج سرگودھا' گورنمنٹ کالج برائے خواتین فیصل آباد' گورنمنٹ کالج ساہی وال' گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازی خاں' گورنمنٹ ایف سی کالج بہاول پور' گورنمنٹ کالج فار بوائز فیصل آباد اور مرے کالج سیالکوٹ کو' پھر اسکولوں کی لسٹ ہے۔ تو جناب اور کرائیے تردید۔

کاش کہ پنجاب ہی اخلاقی یا اجتماعی آواز اٹھا سکتا۔ وزارت، اخبارات، تعلیمی اکابر ___ مگر جنید و شبلی و عطار ہم مست!___ کوئی آدمی بالائی حلقوں میں ایسا نہیں جو جرأت سے اس آئینی غلامی کے خلاف قوم کو چونکائے۔

افسوس کہ اس ملک میں آج جرأت مند، دیانت دار اور دانشور لیڈر کسی دائرے میں نہیں۔ کیا دلچسپ کھیل ہے کہ قوم الگ، اسمبلی الگ، وزیراعظم الگ! وزیراعظم پوری قوم اور نسلوں کو متاثر کرنے والے فیصلے اور اقدام کر ڈالے اور نہ اسمبلی کو خبر ہو، نہ قوم کے کانوں میں بھنک پڑے۔ سبحان اللہ! کیا ہی پراسرار جمہوریت ہے یوں سمجھئے کہ جمہوریت کی یخنی تیار کی جا رہی ہے یہ الگ بات ہے کہ یہ ذرا زہریلی ہے۔

غیر ملکی اداروں کی تعلیم گاہیں*

ہمارے چند اہم سماجی مسائل میں سے ایک مسئلہ انگریزی طرز کے مشنری کانونٹ اسکولوں کا ہے' جو غیر ملکی اداروں کے انتظام سے چل رہے ہیں۔ ان سکولوں کا وجود بہت ہی دوررس قسم کی پیچیدگیاں پیدا کر رہا ہے جس کے نتائج ہر لحاظ سے مضر ہوں گے۔ مگر ہمارے ہاں اکثر ذہین عناصر تک سرے سے اس مسئلہ سے آگاہ ہی نہیں ہیں' بلکہ ان اسکولوں کے وجود کو نعمت غیر مترقبہ سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو کبھی کبھار ان کے متعلق ہلکی سے تشویش ہوتی ہے مگر وہ زیادہ گہرائی تک سوچنے کی ضرورت نہیں سمجھتے ۔ جو لوگ زیادہ دور تک سوچتے ہیں وہ اپنے آپ کو بے بسی کے عالم میں پاتے ہیں آخر کریں کیا ــــ!!

احساس رکھنے والا یہ قلیل سا عنصر جب یہ دیکھتا ہے کہ کچھ بیرونی ادارے خاصی بڑی رقوم خرچ کر کے اپنے ماہر کارکنوں کی قابلیتیں ہماری خدمت کے لیے سالہا سال سے مصروف کئے ہوئے ہیں تو اسے دال میں کالا کی مثل یاد آ جاتی ہے۔ پھر جب وہ دیکھتا ہے کہ آزادی کی سچی روح سے سرشار ہونے والے تمام ایشیائی ممالک نے اس طرح کے بیرونی اداروں کو اپنے ہاں بالکل بند کر دیا ہے تو اس کی نگاہوں میں مسئلہ نازک تر ہو جاتا ہے' چین اور انڈیا کی مثالیں سامنے ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں اس طرز کے ادارے انگریزی حکومت کے بعد بہت زور شور سے چل رہے ہیں' بلکہ دلوں اور دماغوں کی دنیا میں خاصی دور تک جڑیں چھوڑے چلے جا رہے ہیں۔

آیئے اس مسئلہ کا عقلی جائزہ لیا جائے۔

لسانی پہلو

ان اداروں کا وجود (جن میں غیر ملکی درسگاہوں کے ساتھ ساتھ ان مقامی درس گاہوں

---

* مطبوعہ: شہاب' لاہور۔ جون ۱۹۶۰ء

کو بھی شامل کر لیجیے جو انہی سے اپنا نقشۂ کار مستعار لے رہی ہیں) ہمارے لسانی مسئلہ پر گہرا اثر ڈالنے والا ہے اور یہ اثر تیزی سے رونما ہو رہا ہے۔

یہ تو ظاہری بات ہے کہ دنیا کی غالب اقوام کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ ان کی ذہنی برتری کا سکہ زمین کے چپے چپے میں چلے۔ ان کے تہذیبی اطوار مقبول ہوں' ان کی تقلید پھیلے کیونکہ اسی طریق سے وہ سیاسی فوقیت بھی حاصل کر سکتی ہیں اور مختلف قسم کے مفادات کے لیے راستے بنا سکتی ہیں۔ اس اثر اندازی کے لیے سیدھا اور آسان راستہ زبان کا راستہ ہے' یعنی کسی قوم کی زبان جب کسی دوسری قوم کے ذہن پر چھا جاتی ہے تو پھر اسی کے نظریات' اسی کا طرز فکر اور اسی کا ثقافتی رنگ بھی غالب آتا ہے۔ چنانچہ برطانوی حکومت نے انگریزی زبان کی کھیتی تیار کرنے کے لیے جو بیج یہاں لمبے عرصہ تک بوئے تھے وہ پھوٹ آئے ہیں اور ہری ہری فصل لہلہا رہی ہے۔ اب اس فصل کی آبیاری انگریزی میں تعلیم دلانے والے ادارات سرگرمی سے کر رہے ہیں۔ اب تک جو کام ہو چکا ہے' اس کی کامیابی کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا کہ ہمارے الجھے ہوئے ذہن آج تک قومی زبان کا مسئلہ حل نہیں کر سکے۔ اپنی زبان پر ہمارا اعتماد جم نہیں پاتا اور عملاً انگریزی کے بڑھتے ہوئے استعمال کے ساتھ اس کی ذہنی دھاک اس حد تک بیٹھ چکی ہے کہ اسے درجہ اول کی زبان سے کم تر کوئی حیثیت دے کر اگر ہم سوچتے ہیں تو طرح طرح کے اندیشوں میں گھر جاتے ہیں۔ ورنہ اگر جاپان' چین اور عرب ممالک کی مثالیں سامنے رکھ کر ہم نے اتنے برس اردو کو قومی زبان کی سطح تک لانے میں صرف کئے ہوتے تو ایک عظیم قومی مسئلہ سے ہم فارغ ہو کر خاصا ذہنی سفر طے کر چکے ہوتے ——!

بصورت موجودہ حالات کا رخ ایسا ہے کہ شاید انگریزی زبان ہی ایک دن ہماری قومی زبان قرار پائے۔ ورنہ کم از کم اسے درجہ اول کی زبان کا مقام حاصل ہو۔ چوتھائی صدی تک لسانی مسئلہ ملتوی رہے گا۔ اس دوران میں انگریزی زبان کے مورچے موجودہ مقام سے اتنے آگے جا چکے ہوں گے کہ مشکل ہی سے بیچاری اردو کے لیے وقار کا کوئی مقام باقی رہ جائے گا۔

اس وقت نقشہ یہ ہے کہ ہمارے دفتری نظام کے منہ میں انگریزی کی زبان کام کرتی ہے۔ ہماری فرموں کے نام' دکانوں اور دفتروں کے سائن بورڈ بیشتر انگریزی میں ہیں۔

کاروباری خط و کتابت انگریزی میں ہوتی ہے' اونچے لوگ فر فر انگریزی بولتے ہیں اور انگریزی بولنے میں کچھ ایسا نشۂ پندار محسوس ہوتا ہے کہ عام لوگ بھی اردو پنجابی کے الفاظ کے ساتھ انگریزی کے ٹوٹے پھوٹے کلمات جوڑ جاڑ کے بولتے ہیں۔ ادبیات کو دیکھئے تو بہترین مصنفین افسانوں' ڈراموں اور تنقیدی نگارشات میں ضرورت ہو یا نہ ہو انگریزی اصطلاحات ٹھونستے جاتے ہیں۔ آخر انہیں یہ ثابت کرنا ہے کہ ان کا مطالعہ انگریزی میں بڑا وسیع ہے۔ (اور یہ چیز بہرحال سرمایہ افتخار تو ہے ہی) اخبار نویس اپنے ترجموں میں بے دھڑک انگریزی الفاظ کو اردو رسم الخط کا جامہ پہناتے جاتے ہیں اور ذرہ بھر کاوش نہیں کرتے کہ اردو کے موزوں الفاظ ان کی جگہ رکھیں یا قابلیت ساتھ دے تو خوبصورت ترجمے کریں۔ اب بچے بھی امی کو 'ممی' اور ابا کو 'ڈیڈی' کہہ کر ترقی یافتہ ہونے کا نشہ محسوس کرتے ہیں——!

ایسی ذہنی غلامی کے ساتھ انگریزی زبان کو تاخت و تاراج کا کھلا موقع ہم دیئے رکھیں تو چوتھائی صدی میں معاملہ صاف ہو جائے گا۔

اس لسانی جنگ میں غیر ملکی تعلیم گاہیں اور ان کی نقل اتارنے والے مقامی ادارے گویا نہایت مضبوط قسم کے مورچے ہیں۔ ان تعلیم گاہوں میں بالکل نوعمری سے جن بچوں کو لیا جاتا ہے' ان کی مادری زبان کو موت کے گھاٹ اتار کر ان کی تعلیم کا آغاز ''اے' بی' سی' ڈی'' سے کیا جاتا ہے۔ اور پھر ذریعہ تعلیم بھی انگریزی ہی کو بنایا جاتا ہے۔ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ وہ انگریزی میں پڑھنے اور لکھنے اور بولنے کے علاوہ انگریزی ہی میں سوچا کریں!

اب اگر ہم لوگ صاف طور پر یہ طے کرلیں کہ ہماری آئندہ زبان انگریزی ہوگی' تب تو یہ مہم بڑی قابل قدر ہے۔ لیکن اگر ایمانداری سے ہمیں اپنی زبان کو قومی زبان بنانا ہو تو پھر سفر الٹی سمت میں طے ہو رہا ہے!

اگلے دن ایک ''خادم اردو'' کے ساتھ چند لمحہ کی نشست رہی ان کے کوئی بے تکلف بزرگ ان سے ملنے آئے اور ان کے بچوں کی تعلیم پر گفتگو ہونے لگی۔ ان صاحب نے مشورہ دیا کہ میری بات مانو تو بچوں کو انگریزی طرز کے اسکولوں میں داخل کراؤ۔ بجائے اس کے کہ دس برس بعد اس نتیجہ پر پہنچ کر حسرت ناکام سے دوچار ہو۔ آج بروقت صحیح فیصلہ کرو۔ انہوں نے فرمایا' یہ تو ظاہر ہے کہ انگریزی کا تفوق روز بروز بڑھ رہا ہے اور آگے جا کر جن مراحل پر قابلیتوں کی آخری جانچ ہوتی ہے' وہاں پہنچنے کے بعد انگریزی کی اہمیت پوری طرح محسوس

ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے لڑکے کی مثال دی کہ وہ کالج میں اگرچہ صف اول میں مقام رکھتا ہے مگر اس کا کہنا ہے کہ طالب علم کی کامیابی میں انگریزی کی استعداد نہایت فیصلہ کن ہے اور یہی وجہ ہے کہ انگریزی مدارس کے راستے سے آئے ہوئے طلبہ کو اولین معیار پر رہنے کے لیے اگر چھ گھنٹے کی محنت کرنی پڑتی ہے تو مجھے دس گھنٹے کی دماغ سوزی کرنی ہوتی ہے۔ اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری قومی مارکیٹ میں انگریزی کی مانگ زیادہ ہے اور دوسری ہر قابلیت کے مقابلے میں اس قابلیت کا بھاؤ چڑھ رہا ہے!

اب جس ملک میں ایک خاص زبان کا بھاؤ بھی چڑھا دیا گیا ہو اور اس کے لیے بہترین معیار کی درسگاہیں دھڑا دھڑ نئی نسلوں کو کھینچ کر ان کے ذہن اسی زبان کے سانچے میں ڈھال رہی ہوں' اس میں کوئی دوسری زبان ابھر کیسے سکتی ہے!

تعلیمی پہلو

اب مسئلہ کو خالص تعلیمی نقطۂ نظر سے لیجئے۔

فلسفہ تعلیم پر آج تک جو کچھ بھی انسانی کاوشیں ہوتی رہی ہیں ان سب کا ماحصل لازماً اس بات کے حق میں جاتا ہے کہ ذریعہ تعلیم ہمیشہ مادری یا قومی زبان کو ہونا چاہیے۔ تمام علوم و فنون ہی نہیں غیروں کی زبانوں کو بھی اپنی زبان کے راستے آنا چاہیے۔

پس معصوم طلبہ پر یہ بڑا بھاری ظلم ہے کہ ان کی مادری یا قومی زبان کا گلا گھونٹ دیا جائے اور ان پر یہ بوجھ ڈالا جائے کہ وہ جتنا علم حاصل کریں وہ ایک ایسی زبان کے ذریعے حاصل کریں جو ان کی اپنی زبان نہیں ہے اور جس کا حصول بجائے خود پہاڑ کھودنے کے برابر ہے۔ انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے والی درسگاہیں اس ظلم کے اڈے ہیں اور ہم ان ظلم کے اڈوں پر خود اپنی اولادوں کو جا جا کے چھوڑتے ہیں' جیسے بھیڑ بکریوں کو قصاب خانوں میں بھیجا جاتا ہے۔

اور ان درسگاہوں کا سارا کام بہت ہی مبالغہ انگیز ہے' یعنی بچوں کو وہاں محدود درجہ میں روزمرہ استعمال کی انگریزی بول چال سکھا دی جاتی ہے جس سے وہ بڑے ذہین اور قابل نظر آتے ہیں۔ لیکن غیر زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے ان کا عام پیمانہ قابلیت نیچے رہتا ہے اور دوسرے مضامین میں وہ معمولی استعداد بہ مشکل حاصل کرتے ہیں —— انگریزی

مدارس سے نکلے ہوئے بچوں کی جب دوسرے مدارس میں جانچ کی جاتی ہے تو وہ بالعموم کمزور نکلتے ہیں۔ ایک معیاری ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے بتایا کہ انگریزی طرز کی درسگاہوں سے آنے والے طلبہ ان کے لیے بڑا پرابلم ہوتے ہیں اور وہ اپنے درجہ کے ساتھ چل نہیں سکتے۔ بعض والدین کے تلخ تجربوں کا ذکر بھی آیا جو کبھی ان کے سامنے دکھڑا رو چکے ہیں۔ ایک اور فاضل پروفیسر جو تعلیمات سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں، انگریزی طرز کے مدارس کے طلبہ ان کی رائے میں بھی مجموعی پیمانہ قابلیت کے لحاظ سے پست رہتے ہیں۔ کالجوں میں ان کا اپنا مشاہدہ یہ ہے کہ اردو کے ذریعے تعلیم پانے والے طلبہ بات کو زیادہ اچھی طرح سمجھتے ہیں اور زیادہ تیزی سے ترقی کرتے ہیں۔ انگریزی میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم حاصل کر کے آنے والے طلبہ ان سے کمزور ثابت ہوتے ہیں۔ ان کا خیال یہ بھی ہے کہ اوپر جا کر جو انٹرویو وغیرہ ہوتے ہیں ان میں بھی انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ دوسروں سے کم تناسب پر کامیاب ہوتے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں اعداد و شمار جمع کرنے کی فکر میں ہیں ـــــ!

یعنی نظریاتی طور پر مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا جو کلیہ تسلیم شدہ ہے، عملی تجربہ بھی اس کی توثیق کرتا ہے۔ مگر پھر بھی انگریزی طرز کے مدارس بضد ہیں کہ وہ مادری زبان کا قتل کر کے اس کی جگہ انگریزی کو ہمارے بچوں پر مسلط کریں گے۔ حد یہ کہ تعلیمی کمیشن کی رپورٹ کے بعد نظام تعلیم میں جو تبدیلیاں شروع ہوئی ہیں، ان کے مطابق جب مشنری اور کانونٹ اسکولوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اردو پڑھانے کا انتظام کریں تو بعض نے اس مطالبے سے فرار کی خاصی کوششیں کیں۔ آخر بہت مشکل سے انہوں نے سمجھوتہ کی کوئی صورت اختیار کی۔

تعلیمی نقطۂ نظر سے ان درسگاہوں کے کام میں ایک کمی اور بھی ہے، ان کے یہاں انگریزی جیسی غیر ملکی زبان ڈائرکٹ میتھڈ سے سکھائی جاتی ہے اور اول روز سے پوری تعلیم اس طرح دی جاتی ہے جیسے طلبہ انگریزی بولنے والی کسی قوم کے بچے ہوں۔ کراچی اور لاہور میں ہونے کے باوجود ان درسگاہوں میں کیمرج کا ماحول فرض کیا جاتا ہے۔ دنیا بھر کے ماہرین تعلیم غیر زبان کی تعلیم کے لیے اس طریقے کو موزوں تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن پاکستان میں یہ انوکھا اور مضحکہ انگیز بلکہ ظالمانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے ـــــ!

اس طریقے سے آپ انگریزی کی کتنی ہی استعداد پیدا کر دیں، طلبہ میں نہ حقیقی قابلیت پیدا ہو سکتی ہے اور نہ ان کی فکری اور تخلیقی قوتیں بیدار ہو سکتی ہیں۔ ایک ملک کے طلبہ کو آپ

کوئی بھی مضمون خصوصاً زبان دانی ـــــ کی تعلیم دیں تو ان کو انہیں کے سماجی و معاشرتی ماحول میں رکھ کر پڑھانا چاہیے۔ نصابی مواد میں بھی اور درسگاہ کی فضا میں بھی اسی ماحول کے عناصر کو رچا بسا ہونا چاہیے۔ بخلاف اس کے اگر آپ طالب علم کو اس کے واقعاتی ماحول سے الگ کر لیتے ہیں تو اس پر ظلم دہرا ہو جاتا ہے۔ وہ بیچارا علم حاصل کرے تو ایک اجنبی زبان کے ذریعے حاصل کرے اور اس اجنبی زبان کو سمجھنے کے لیے اجنبی ماحول اپنے ذہن میں پیدا کرے۔ مصنوعی پن کے اس چکر میں اس کی قوتیں تباہ ہوتی رہتی ہیں۔

مذہبی پہلو

جو درس گاہیں کلیسائی تنظیموں کے تحت چل رہی ہیں وہ تبلیغ و تحریص کی مختلف تدبیریں عمل میں لا کر ہمارے ہاں کے مسلمان بچوں کے دلوں میں عیسائیت کے بیج بونے کی کوشش کرتی ہیں اور یہ کوشش ایک ایک بچے پر برسوں جاری رہتی ہے۔ یہ درست ہے کہ اپنی کوششوں کی مقدار کے مطابق وہ نتائج نہیں حاصل کر پاتیں۔ یعنی ان کے فارغ التحصیل طلباء میں سے بہت تھوڑی تعداد عیسائیت اختیار کرتی ہے۔ لیکن پھر بھی ان کوششوں کے اثرات ملت کے لیے سخت نقصان دہ بلکہ تباہ کن ہیں۔ پھر یہ بھی نہ بھولیے کہ اب تک اگر عیسائیت کے پھیلنے کی رفتار سست رہی ہے تو اس کے بڑے اہم اسباب تھے۔ ان میں سے پہلا سبب گھروں میں مذہبی فضا کا پایا جانا تھا جو کہیں زیادہ مضبوط تھی اور کہیں کمزور۔ دوسرا سبب وہ نفرت بھی تھی جو مغرب کی شہنشاہیت پسند قوموں کے خلاف دور غلامی میں کارفرما تھی۔ تیسرا سبب ثقافتی فرق کا احساس اور اپنے جداگانہ ثقافتی وجود کا شعور تھا۔ اب یہ تینوں سبب کمزور ہو چکے ہیں۔ ہمارا بالائی طبقہ جو بچوں کو غیر ملکی عیسائی مشنوں کی درس گاہوں کے حوالے کرتا ہے اس کا ایک مختصر عنصر اسلام کی حد تک مذہب دشمن بن چکا ہے۔ باقی میں سے بہت سے گھرانے عملاً مذہب کو ترک کر چکے ہیں اور ان کا رویہ مذہبی امور میں سخت سردمہری کا ہے۔ اس طرح آزادی کے بعد سے چونکہ ترقی کرنے کے لیے بڑی قوموں کی عنایات ناگزیر ہوتی ہیں اس لیے معاملات دوستانہ خطوط پر جا رہے ہیں۔ ثقافتی لحاظ سے ہمارے آگے کے لوگ اپنے گھروں کو مغربیت کا بپتسمہ دے چکے ہیں۔ چنانچہ پچھلے چار چھ برس سے عیسائیت کے پھیلاؤ کی رفتار تیز ہوگئی ہے اور مزید چند سال کے بعد یہ اور تیز ہو سکتی ہے۔

لیکن مذہبی حیثیت سے یہ غیر ملکی تعلیمی ادارے ایک اور منفی کام بھی کرتے ہیں وہ یہ کہ امراء کے بچوں کو (جو پہلے ہی اسلام سے کورے ہوتے ہیں) وہ طرح طرح کے شکوک و شبہات میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اس طرح ایک طرف ان میں عیسائیت کے لیے رواداری پیدا ہو جاتی ہے اور دوسری طرف اسلام سے بیزاری۔

ان غیر ملکی اداروں کی تقلید میں جو قومی ادارے امراء کے ذوق کا لحاظ کر کے غیر ملکی رنگ اختیار کئے ہوئے ہیں وہ بھی مذہبی پہلو سے بچوں کے ذہن کا ستیاناس کر رہے ہیں۔ اس میں سے بعض تو مذہب سے بالاتر رہنے کے اس مرض میں مبتلا ہیں جس کا نام ترقی پسندانہ وسیع النظری ہے۔ بعض وہ ہیں جو عمومی تعلیم میں اسلامیت کا چھوٹا سا ایک پیوند لگاتے ہیں۔ اس پیوند کو دور سے دیکھیں تو بھلا لگتا ہے۔ قریب سے جائزہ لیں تو مذاق معلوم ہوتا ہے۔ نصابی کتابیں دوسرے ڈھب کی' مواد تعلیم مختلف قسم کا' اساتذہ کے رنگ ڈھنگ بیگانہ' درس گاہ کا ماحول مستعار ـــــ اس چوکھٹے کے ایک کونے میں آپ نے مذہب کا نام بھی لکھ ڈالا تو اس سے کیا بنے گا۔ طالب علم انگریزی زبان' سائنس' تاریخ' جغرافیہ اور دوسرے مضامین میں جو اہمیت پاتا ہے وہ اسے کبھی مذہب کے لیے محسوس نہیں ہوتی۔ پھر سارے مضامین میں زندگی کا جو نقطۂ نظر حل ہوتا ہے اور فنون عملی اور تربیت جسمانی کے نام سے جو جو دلکش تجربے وہ حاصل کرتا ہے وہ مذہب کا ٹینٹوا دبائے رکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اس تعلیمی شتر گربہ پن سے دو چار ہونے والا طالب علم جب کچھ بن کے نکلتا ہے تو وہ یا تو تارک مذہب ہوتا ہے یا مخالف مذہب!!

غیر ملکی مذہبی درس گاہوں کے متعلق سننے میں یہ بھی آیا ہے اگرچہ تصدیق طلب ہے کہ نئی تعلیمی سفارشات کے تحت جب ان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ابتدائی درجوں کے لیے اسلامیات کی تعلیم کا انتظام کریں تو انہوں نے اسے پورا کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر جب کہ انتباہ دیا گیا کہ اس انتظام کے بغیر ان کو منظوری حاصل نہ ہو سکے گی تو انہوں نے شان بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ جواب دیا کہ ہم اپنے بچوں کو کیمبرج کا امتحان دلوا لیں گے۔

ثقافتی پہلو

پاکستان کی ریاست ایک اصولی ریاست ہے اور اس کو بنانے اور چلانے والی قوم اپنا

ایک مستقل نظریہ و نظام رکھنے والی قوم ہے۔ اس کا نظام تعلیم لازماً اس کے سیاسی نظریے کے گرد گھومنا چاہیے۔ اور اس کے ذریعے اسی ثقافت کی آبیاری ہونی چاہیے جو پاکستان کی اپنی ثقافت ہے!

لیکن غیر ملکی درس گاہیں اور ان کے قدم بہ قدم چلنے والی دیسی درس گاہیں پاکستان کی ثقافت کی دھجیاں بکھیر رہی ہیں۔ ان کی طرف سے انتہائی منظم کوشش جاری ہے کہ ہمارے ـــــ خصوصاً ہمارے طبقہ امراء کے ـــــ بچوں کو پوری طرح مغرب زدہ کر کے نکالیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک خدا پرست ذہن کے بجائے آزادی پسند' تفریح پسند اور لذت پسند ذہن سے آراستہ کرنا' ان کو میل جول کی آزادی دینا' ان کو مشرقی آداب کے بجائے فرنگی معاشرت کے زیر اثر لانا' ان میں حیا داری کے بجائے بے باکی پیدا کرنا' ان پر جنسی اسرار و رموز فاش کرنا اور اس راہ کے ابتدائی تجربے کرنے کے مواقع دینا' لڑکیوں کو کھلی پنڈلیوں کے ساتھ چست لباسوں میں رہنے کی تربیت دینا (چنانچہ بارہ پندرہ برس تک کی لڑکیاں اب اسی ہیئت میں سڑکوں پر دکھائی دیتی ہیں) اور پھر استانیوں کا ان کے سامنے بھڑ کیلے فیشنوں اور خاص ڈرامائی اداؤں کے ساتھ نمونہ بن کے آنا۔ یہ ساری تدابیر ایسی ہیں کہ طلباء میں مسلم ذہن اور اسلامی ثقافت کا ابھرنا ممکن ہی نہیں رہتا۔ اوپر سے انگریزی زبان کی گھٹا ہر دم چھائی رہتی ہے جو مغرب کے ثقافتی تصورات کی پھواریں مسلسل برساتی رہتی ہے۔

اب اگر ہمارے طبقہ بالائی کی اولادوں کا ثقافتی شعور اس طرح مسخ کر دیا جائے تو بقیہ قوم یا تو ان کی پیروی کرنے کو فخر سمجھے گی اور یا پھر خواص و عوام کے درمیان ثقافتی کشمکش بڑھتی جائے گی۔ جو بھی صورت ہو نتیجہ پاکستان کے حق میں مضر ہوگا۔

سیاسی پہلو

تمام ایشیائی ملکوں کو سامنے رکھ کر دیکھیے تو غیر ملکی تعلیمی اداروں کے متعلق یہ بات بالکل واضح ہے کہ لسانی' ثقافتی اور مذہبی تینوں قسم کے اثرات سے وہ آئندہ کے برسر قیادت طبقوں کو ایک خاص رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں۔ اور مغرب کے زیر اثر لانا چاہتے ہیں۔ ایک دور رس سیاسی مقصد اس کوشش میں مخفی ہے۔ مطلوب یہ ہے کہ ایشیائی ملکوں میں مذہبیت' مشرقیت اور ایشیائیت کے علمبرداروں کے مقابلے میں اپنے کام کے عنصر کا محاذ مضبوط کیا جائے۔ یہ لمبا اور

ٹھنڈا کام آہستہ غیر محسوس طریق سے ہو رہا ہے۔ خود ہمارے ہاں ہر سال نئی نسل کے کئی سو افراد اس محاذ پر جا جا کر قدم جما رہے ہیں۔ جب کوئی وقت آئے گا تو معلوم ہو گا کہ کس طرح ہماری بہت بڑی قوت کو ہم سے توڑا جا چکا ہے۔

پھر بہت سے تجربات کے بعد ایشیائی ملکوں میں یہ حقیقت بھی ثابت ہو چکی ہے کہ غیر ملکی تعلیمی اور تبلیغی اداروں کے بعض افراد جاسوسی بھی کیا کرتے ہیں اور مختلف احوال و رجحانات کی خفیہ رپورٹیں بھیجتے ہیں اور ہدایات لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ ایک طرف چین نے غیر ملکی مشنوں اور درس گاہوں کو اکھیڑ دیا اور دوسری طرف ہمارے پڑوسی ملک بھارت میں اس سلسلے کا یکسر خاتمہ کر دیا گیا۔

اب مشکل یہ آ پڑی ہے کہ غیر ملکی مشن اور ان کے تعلیمی ادارے اپنی پشت پر ایسی بڑی بڑی حکومتوں کی تائید رکھتے ہیں جن سے ہمیں مختلف اقسام کی دوستانہ امدادیں مل رہی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تعلیم کے میدان میں ہمارے قومی فیصلوں تک کے مقابلے میں یہ ادارے ڈٹ سکتے ہیں۔

اس مسئلہ کو سابق قیادتوں نے کبھی اہمیت نہیں دی۔ خدا کرے کہ ہماری موجودہ قیادت اس طرف توجہ کرے اور ایک کمیشن بٹھا کر ہر پہلو سے غیر ملکی تعلیمی اداروں اور ان کے ہم رنگ دیسی اداروں کے حالات کی چھان بین کرے۔ اور پھر حسب ذیل اصولی فیصلوں کو نافذ کرے:

۱۔ کوئی تعلیمی ادارہ ابتدائی درجوں میں کسی غیر زبان کو ذریعہ تعلیم نہ بنائے۔

۲۔ تبلیغ مذہب کا کوئی غیر ملکی ادارہ مدارس نہ کھولے۔ یہ کام ملکی ادارات کر سکتے ہیں۔

۳۔ پاکستان کی ہر ابتدائی تعلیم گاہ میں قومی فیصلے کے مطابق اسلامیات کی تعلیم لازمی ہو۔

۴۔ کوئی تعلیم گاہ غیر پاکستانی ثقافت بچوں پر مسلط نہ کرے (بعض اصولی امور کو متعین طور پر ممنوع کر دیا جائے)

اردو ـــــ مجرموں کے کٹہرے میں *

میڈم انگلش اونچے گیلری باکس میں ٹھسے سے بیٹھی ہوئی ایک ڈرامے کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی ہے۔ نیچے ایک عدالت لگی ہے' اردو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑی ہے اور اس کے ساتھ اردو کے حامیوں اور محبوں کی بھی صف کی صف زیر عتاب ہے۔

جو استغاثہ حامیان اردو لے کے گئے تھے وہ بس یہ تھا:

تحریک پاکستان جن عوام کے بنیادی تقاضوں اور مقاصد کی علمبردار تھی' اور جس کو اس نے اپنے مستقل سلوگنوں کی حیثیت دے کر حالات کو فتح کیا اور جنہیں وہ تحریکی پرچم بنا کے اقدام کرتے ہوئے ایک آزاد مسلم معاشرہ وجود میں لانے کا سہرا اپنے سر باندھنے کے قابل ہوئی' ان میں اگر سرفہرست اسلام تھا تو دوسرے درجے پر اردو زبان تھی۔ ہماری قومی وحدت کی نظریاتی و اعتقادی بنیاد تو یقیناً اسلام تھا اور ہے لیکن خارجی عوامل میں سے (جو قوموں پر ہمیشہ گہرے اثرات ڈالتے ہیں) مشترک تاریخی تجربے اور مشترک تہذیبی شعور کے ساتھ لسانی ذریعۂ وحدت کی حیثیت سے اردو کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بلکہ موخر الذکر کو غیر معمولی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ ہمارے مشترک تاریخی تجربے کے ریکارڈ اور مشترک تہذیبی شعور کے عکس کو بھی اردو ہی اپنے اندر لئے ہوئے ہمارے ساتھ ساتھ چلی آ رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم نے اپنے اس عزیز ہم سفر کو ہم دوش اور ہم قدم بنانے کے بجائے دھکیل دھتکار کر پیچھے ہٹا دیا ہے' لیکن وہ اب بھی ہمارے پیچھے غبار راہ کے ساتھ ویسی ہی والہیت سے چلی آ رہی ہے جیسے سبکتگین کے پیچھے پیچھے ممتا کی ماری وہ ہرنی امید وبیم کے عالم میں رواں دواں تھی جس کا بچہ حوالہ فتراک ہو چکا تھا۔

تہذیبی وجود اور زبان

زبان محض لفظوں کا ایک ڈھیر نہیں ہوتی' جیسے منڈی میں پیازوں یا گاجروں یا بینگنوں

* سیارہ۔ اگست ۱۹۶۸ء

کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔ آپ کا جی چاہے تو اس ڈھیر میں سے کوئی چیز لے لیں اور چاہیں تو اس ڈھیر کا سودا کرلیں۔ یہ کوئی لباس نہیں ہے کہ آج آپ نے پہن لیا' کل کباڑی کے ہاں بیچ کر بالکل دوسری وضع کا ایک نیا لباس خرید لیا۔ نہ یہ فرنیچر کی طرح ہے کہ ایک صوفہ سیٹ اٹھوا دیا اور دوسرا لا کر سجا دیا۔

زبان ایک قوم کے تہذیبی وجود کے ساتھ گوشت پوست کا رشتہ رکھتی ہے۔ وہ اس کے عقیدوں اور مقاصد سے بھی جڑی ہوتی ہے' وہ اس کے نظام تہذیب و اخلاق سے بھی مربوط ہوتی ہے۔ وہ اس کی تاریخ کے تمام ادوار سے بھی متعلق ہوتی ہے۔ معاملہ ویسا ہی سمجھ لیجئے جیسے جسم انسانی میں زبان کا ہے کہ اس کا ایک رشتہ دماغ سے ہے' ایک رشتہ دل سے ہے' ایک رشتہ ذائقے اور ذوق سے ہے۔ وہ راحت دل کے ساز کے نغمے بھی لے سے سناتی ہے اور درد و کرب کی نے کی پرسوز آہنگ بھی پیش کرتی ہے۔ برسوں کے باہمی تعامل سے آہستہ آہستہ دل اور زبان' دماغ اور زبان' نگاہ اور زبان' جسم اور زبان' لاشعور اور زبان کے رشتے نشوونما پاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ایک قوم کی زبان اس قوم کے فکری نشو وارتقاء کی داستان بھی ہوتی ہے۔ اس کے تاریخی سفر کی روئیداد بھی' اس کی روایات واقدار کی آئینہ دار بھی' اس کے ذوقیات و جمالیات کی محرم بھی' اس کے اسلاف کے کارناموں کی محافظ بھی' اس کے علمی و تحقیقی خزائن کی امانت دار بھی' زبان بہ حیثیت مجموعی تو بڑی چیز ہے' کسی زبان کا رسم الخط[1] تک —— جو اس کا

[1] رسم الخط کی کیا اہمیت ہے؟ اس کا اندازہ مورخ ٹائن بی کے درج ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔
"ہٹلر کے ترک ہم عصر صدر مصطفیٰ کمال پاشا نے قوم کو اپنے تہذیبی ورثے سے یکسر کاٹنے کا مقصد بڑی کامیابی کے ساتھ مگر کم شدید ذرائع سے حاصل کیا' لیکن یہ ذریعہ کہیں زیادہ موثر تھا (یعنی رسم الخط کی تبدیلی) ترک آمر کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا کہ اپنے ہم وطنوں کو ایرانی ثقافتی و تہذیبی نظام سے یکسر آزاد کر دے' اور ان کے فکر و نظر اور ان کی ثقافت کو مغربی تہذیب کے سانچے میں بالجبر ڈھال دے۔ لیکن بجائے اس کہ وہ ان کتابوں کو نظر آتش کرتا' جو اس تہذیب کی امین تھیں' اس نے رسم الخط کو بدلنے کا طریقہ اختیار کیا...... (اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ) عربی' فارسی اور خود ترک عثمانیہ لٹریچر نئی نسلوں کی دسترس سے باہر ہو گیا۔ ایسا لٹریچر جس کے اثر سے وہ اس مغربیت کے خلاف علم بغاوت بلند کر سکتے تھے' جو ترک آمر اپنے ملک پر مسلط کر رہا تھا۔ اب کسی کتاب کو جلانے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ اس لیے کہ وہ رسم الخط جو اس لٹریچر اور اس ورثے کے لیے کلید کی حیثیت رکھتا تھا' تبدیل کیا ←

بظاہر خارجی پیرایہ ہوتا ہے مدت ہائے مدید میں اتنے گہرے رابطے قوم اور اس کی تہذیب سے پیدا کر لیتا ہے کہ اسے یوں جدا نہیں کیا جا سکتا جیسے سانپ کینچلی چھوڑ دیتا ہے۔ رسم الخط نہ صرف اشکال حروف اور صوتیات کے درمیان اتنا گہرا رشتہ پیدا کر دیتا ہے کہ لفظوں اور لکیروں کو تفصیلی جائزے کے بغیر' سرسری طور پر دیکھنے میں' مخصوص آوازیں اور تلفظ اور لہجے اور ان کے ساتھ ان کے ہم مزاج تصورات و جذبات و احساسات ابھر آتے ہیں۔ بلکہ رسم الخط صوتیات کی نقش گری میں ایک قوم کے جمالیاتی ذوق کا قرنوں یا صدیوں لمبا تدریجی عمل اپنے اندر جذب کئے ہوئے ہوتا ہے۔ پس زبان تو بڑی چیز ہے آپ اگر فطری ساخت کے رسم الخط سے بھی کسی قوم کو محروم کر کے اسے کسی مستعار رسم الخط کا بار گراں اٹھانے پر مجبور کر دیں تو یہ ایک اذیت ناک تجربہ ہو گا۔ کجا یہ کہ آپ اس کی زبان کو پہلے تو اس کا اصل مقام دینے میں کوتاہی اور تاخیر دکھائیں' پھر اس زبان کو آہستہ آہستہ نیچے دھکیلیں' پھر عقلی طور پر اس زبان کے خلاف مقدمہ بھی کھڑا کر دیں۔

قومی مقاصد اور زبان

زبان کسی زندہ قوم کے ہاں اس کے عقیدوں اور مقاصد کی طرح مقام احترام رکھتی ہے' اس سے عوام کی جذباتی وابستگی ہوتی ہے' زبان کو ایک تہذیبی شعبے کی حیثیت سے قدر و قیمت حاصل ہوتی ہے۔ اب یہ تو ایک مصیبت کی بات ہے کہ کچھ حالات ملت پاکستان کو ٹھیک اس قومی زبان سے محروم کرنے یا اس کے بارے میں پریشان و مضطرب کرنے کا باعث بن جائیں جسے وہ پاکستان کے مجوزہ نقشۂ حیات کا ایک اہم جزو قرار دے کر جدوجہد اور قربانیوں کا کٹھن سفر طے کر کے منزل تک پہنچی ہو ـــــ گویا وہ اب منزل پر پہنچنے کے بعد یہ دیکھے کہ منزل اپنی جگہ چھوڑ کر اس سے دور بھاگ چلی ہے' یا اسے کچھ ناخوشگوار محرکات اغوا کر کے لے

← جا چکا تھا اور اس کے کھو جانے کے بعد اس لٹریچر کے جوہری اثر سے کوئی خطرہ باقی نہیں رہا تھا۔ اب پورے اطمینان کے ساتھ ان علمی کتابوں اور بلند پایہ مخطوطوں کو الماریوں میں سڑنے کے لیے چھوڑا جا سکتا تھا' کیونکہ (نئے رسم الخط کی تلوار چلنے کے بعد) اب وہ بابل کے پرانے صحیفوں کی طرح نئی نسلوں کے لیے ناقابل فہم ہو گئی ہیں اور ماہرین کی ایک چھوٹی سی جمعیت کے علاوہ کسی کی ان تک رسائی نہ رہی۔ اپنے رسم الخط کی تنسیخ اور کتابوں کو نذر آتش کرنا' تہذیبی روایات سے اپنا تعلق کاٹ دینے کا مادی مظہر ہے۔ (آرنلڈ ٹائن بی ''مطالعہ تاریخ'' ج ۵ ص ۱۱۲)

جا رہے ہیں۔

اردو کی مظلومیت

آہ! اردو کی مظلومی! بھارت میں اغیار اسے دبا کچل کر کھدیڑ رہے ہیں اور ادھر یہاں اسے اپنوں کی شانِ بے نیازی کا سامنا ہے' جو حال اسلام کا ہو رہا ہے' وہ بیچاری اردو کا ہے۔

اردو کے خلاف الزام لائے جا رہے ہیں کہ:۔

- ملزمہ اور اس کے حامی علاقائی زبانوں کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔
- ملزمہ اور اس کے حامی انگریزی زبان کے فروغ کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر کے نوجوانوں کو جدید علوم سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔
- ملزمہ تعلیمی سطح پر انگریزی زبان کی جگہ لینے پر بضد ہے حالانکہ اس میں یہ استعداد نہیں ہے کہ وہ علوم جدیدہ (خصوصاً سائنسی علوم) کے لئے ذریعہ تعلیم بن سکے۔

ان تمام الزمات کے جواب اربابِ فکر و تحقیق بار ہا دے چکے۔ تحریری مقالات کے ذریعے بھی! جلسوں اور مذاکروں کے ذریعے بھی! نمونے کے اسباق پیش کر کے بھی! علمی کتابوں اور مقالات اور اصطلاحات کے تراجم کے ذریعے بھی۔

مگر ملزمہ اور اس کے وکلا کی باتیں فضا میں تحلیل ہو کے رہ جاتی ہیں۔ البتہ عدالتی ججوں اور وکلاء کے ارشادات ٹھوس پتھروں کی شکل اختیار کر کے اردو زبان پر برسنے لگتے ہیں اور وہ مجرموں کے کٹہرے میں بند مسلسل جراحتوں سے دوچار ہے۔

کیا اردو کے متعلق کسی کو یہ مغالطہ لاحق ہے کہ لوگ اسے فراموش بھی کر سکتے ہیں' اس کے جبین و رخسار کی قطع و برید کے عمل کی تائید کر سکتے ہیں؟ اس کو اس کے مقام سے محروم رکھنے کو پسند کر سکتے ہیں' اور ایک سامراجی قوم کی جبراً مسلط کردہ اور الحاد پروردہ زبان —— انگریزی کی اردو سے برتری کو ہمیشہ کے لئے گوارا کر سکتے ہیں؟

انگریزی تو ملکہ بنی راج سنگھاسن پر بیٹھی ہو اور اردو کسی کونے میں کنیز بنی دور کھڑی رہے —— کیا یہ غیر فطری نقشۂ احوال کسی زور ور کی سرپرستی کے بل پر دیر تک قائم رکھا جا سکتا ہے؟

آپ بے شک اسے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیں' پھر بھی وہ عوام کی نگاہ میں

محبوب ہے' اس کا حسن خراج محبت وعقیدت مسلسل وصول کر رہا ہے۔ وہ ملت پاکستان کے لئے ایک اہم رشتہ وحدت کے طور پر ناگزیر ضرورت ہے۔ کیونکہ کوئی دوسری علاقائی زبان ملکی سطح کی ضروریات کو پورا کرنے کے قابل نہیں گردانی جاسکتی۔

تو پھر ایک غلط کام میں وقت کو ضائع کرنا' اور قوتوں کو اردو کی مزاحمت میں برباد کرنا کیا ویسا ہی ایک قومی نقصان نہیں ہے جیسا کسی پل کو تباہ کر دینے یا کسی ڈیم کو ڈائنامائیٹ کر دینے سے ہوسکتا ہے۔؟

جو اپنا وقت اور اپنی قوتیں اس غلط کام پر برباد کرنا چاہے' شوق سے کرے' مگر ہم اسے یہ بتائے دیتے ہیں کہ جس اردو کو ہزار قسم کی قانونی تدبیروں اور سیاسی پالیسیوں سے بھارت کا اردو دشمن حکمران گروہ سارا زور لگا کر ختم نہ کر سکا' تو یہ تو پاکستان ہے جہاں اسلام کے ساتھ گندھی ہوئی اردو کی محبت اتنی طاقت ضرور رکھتی ہے کہ وہ علاقائی عصبیتوں کا مقابلہ کر کے اپنا راستہ بنائے ــــ اور ہمارے اس ٹھوس اندازے کے گواہ وہ اخبارات و جرائد اور مطبوعات ہیں جو گزشتہ کئی سال سے ذہنی ماحول پر پرتو افگن ہیں۔

مخلوط تعلیم

مخلوط تعلیم اور مخلوط سوسائٹی کے کچھ لازمی برگ و بار ہیں۔ ان کے خلاف پورا زور لگا کر بھی کچھ عرصے کے لئے ان کو کسی قدر کم کیا جاسکتا ہے' مگر نہ تو ان کو ختم کیا جاسکتا ہے اور نہ دیر تک ان کی روک تھام کا سلسلہ جاری رہ سکتا ہے۔

جو پودا آپ کاشت کرتے ہیں' اس پر فطری طور سے جیسے پھل پھول لگنے چاہئیں وہ ضرور لگیں گے۔

اصل سوال یہ ہے کہ آیا مخلوط تعلیم کو روکا جاسکتا ہے؟ کتنے دل دردمند اہل قوت ایسے ہیں جو اس خلاف اسلام تجربے کو دیکھ کر تڑپتے ہیں اور ان میں اتنی ہمت ہو کہ وہ سیل بلا کو روکنے کے لئے کوئی موثر اقدام کر سکیں؟ ہمارے معاشرے میں چاروں طرف منافقین پھیلے ہوئے ہیں جو اسلام کا نام لے کر مغرب کی ملحدانہ تہذیب اور ہوس پرستانہ ثقافت کے لیے راستہ بنا رہے ہیں۔ تھوڑے بہت اصحاب کی احتجاجی فریادیں تو اس سیل بلا کو روک نہیں

سکتیں۔

پھر مخلوط تعلیم بھی مجرد ایک خرابی نہیں ہے جو معاشرے میں آ گھسی ہو' بلکہ خرابیوں کا پورا ایک لشکر ہے جو نو بہ نو فتوحات کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اور ہر خرابی کا تعلق دسیوں دوسری خرابیوں سے ہے۔

اس لشکر کا مقابلہ کرنے کے لئے ایمان راسخ' فکر صالح اور اخلاق محکم کی ضرورت ہے۔ کیا یہ قوتیں ہمارے ہاں اس درجے اور پیمانے کی ہیں کہ وہ کچھ کر کے دکھا سکیں؟ یا کیا ہم نے ان قوتوں کو پیدا کرنے کے لیے بھرپور کام کیا ہے؟ اگر نہیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ خدا کے دین کے لیے قائم ہونے والی ریاست میں کل اور کیا کچھ ہوگا۔

توسیع تعلیم

ہماری ایک انتہائی اہم ضرورت توسیع تعلیم ہے' یعنی ہم ایک طرف جلد سے جلد اپنی سو فیصد آبادی کو خواندہ بنائیں' اور دوسری طرف ذی صلاحیت نوجوانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو تعلیم کے اعلیٰ مدارج تک پہنچا دیں۔ ہمیں قومی سر بلندی اور اپنے نظریاتی و تہذیبی وجود کے استحکام کے لئے موجودہ دنیا میں بہت بڑی فکری طاقت کی ضرورت ہے۔ قومی سطح پر ہمارا دلیل کا محاذ مضبوط ہونا چاہئے۔ ہمارے ہاں اعلیٰ درجے کے مفکرین' محققین اور مصنفین کی ایسی صفیں موجود ہونی چاہئیں جو ذہنی لحاظ سے ملت پاکستان کا لوہا ساری دنیا سے منوا سکیں۔ ہمیں اپنے نظریۂ حیات کے مطابق تمام علوم و فنون کا ناقدانہ جائزہ لے کر ان کی تدوین جدید کا فریضہ انجام دینا ہے۔ اس کے لئے اعلیٰ درجہ کے دماغوں کی ضرورت ہے۔

اس کے ساتھ ہمیں فن تعلیم' فن علاج' فن انجینئری اور ایٹمی سائنس کے میدانوں میں ماہرین درکار ہیں اور بھاری تعداد میں درکار ہیں اور اس پہلو سے ہم دنیا کی بڑی قوموں کے مقابلے میں اتنے زیادہ پیچھے ہیں کہ جب تک اس پسماندگی کو دور کرنے کے لئے پورے اہتمام سے خاص مہم نہ چلائی جائے گی ہم اس دنیا میں اقتصادی' صنعتی اور عسکری لحاظ سے مضبوط مقام حاصل نہیں کر سکیں گے۔

ہمیں عالمی صحافت اور پروپیگنڈے کے دائروں میں بھی اپنی مضبوط جگہ بنانی ہے جس

پر زیادہ تر مغربی اقوام اور خصوصاً یہودیوں کا قبضہ ہے اور یا پھر ان کے بالمقابل اشتراکی دنیا کا پریس ہے۔ موجودہ صورت میں دنیا کی خبری مشینری ہمارے مفاد کے لئے ہمیشہ ضرر رساں ثابت ہوتی رہی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یو این او (UNO) اور دوسرے عالمی ادارات کے لئے بھی اور سفارتی حلقوں کے لئے بھی ہمیں ذہین و قابل افراد کی بھاری تعداد فراہم کرنی ہے۔

پس ہمیں اپنے تعلیمی نظام کو اس طرح ترتیب دینا چاہیے کہ تعلیم کا حصول نہ صرف سستا ہو بلکہ زیادہ سے زیادہ سہل بھی ہو۔

اس سلسلہ میں ذیل کے نکات قابل غور ہیں:۔

۱۔ بڑے سے بڑے امتحانات پرائیویٹ طور پر دینے کے لئے راستے کھلے رکھے جائیں۔

۲۔ بڑے شہروں میں ملازمین اور دوسرے مصروف لوگوں کے لئے ڈگری کورسز اور ٹیکنیکل کورسز پاس کرنے کے لئے شام کی کلاسوں کا انتظام کیا جائے۔

۳۔ سکولوں اور کالجوں میں ڈبل شفٹ کا انتظام کیا جائے۔ نیز عمارات اور سیٹوں میں توسیع کی جائے۔

۴۔ السنہ شرقیہ کے راستے سے غریب لوگ اعلیٰ تعلیم تک بآسانی پہنچ جاتے ہیں لیکن جدید اصلاحات نے اس راستے کو مشکل تر بنا دیا ہے' یہ پابندیاں ہٹا دی جائیں۔

۵۔ اساتذہ' صحافیوں اور مصنفین کے لئے جو کم از کم زبان و ادب کے میدان میں دس برس کام کر چکے ہوں' ایسی گنجائش نکالی جائے کہ وہ ایم اے یا کم سے کم بی اے کے امتحان میں (پورے مضامین) براہ راست شرکت کر سکیں۔

ڈاکٹروں اور انجینئروں کی ہمارے ہاں بہ مقابلہ ضرورت بہت کمی ہے اور سینکڑوں اسامیاں خالی پڑی ہیں۔ اس کمی کو جلد پورا کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ پروفیشنل ایجوکیشن کے اداروں میں عمارات اور اسٹاف کی توسیع کے ذریعے زیادہ طلبہ کی جگہ نکالی جائے اور یہ بھی ضروری ہے کہ مزید میڈیکل اور انجینئرنگ کالج کھولے جائیں۔

یعنی بنیادی تعلیم سے لے کر اعلیٰ مراحل تک تمام شہریوں کے سامنے آگے بڑھنے کے لئے راستے پوری طرح کھول دیئے جائیں اور ہر ممکن سہولت انہیں بہم پہنچائی جائے۔ تعمیر ملت

کا یہ بنیادی کام انڈسٹری' زراعت اور دفاع سے کم اہم نہیں ہے' بلکہ قومی زندگی کے تمام شعبوں کی مضبوطی اور بہتر کارکردگی کا انحصار تعلیم پر ہے۔

طبقاتی نظام تعلیم

ہمارا معاشرہ جس شکل میں طبق بر طبق بنا ہوا ہے' اس کی وجہ سے ہر معاملہ میں عدم مساوات کو قائم رکھا جاتا ہے۔ اصلاح کا ایک نقطۂ آغاز تعلیم گاہ (یا نظام تعلیم) ہے۔ بدقسمتی سے خود اسی سرچشمۂ اصلاح کو کج اندیشی و غلط کاری نے اتنا گدلا کر دیا ہے کہ آگے کچھ بنتا ہی نہیں' بلکہ تعلیمی ادارے خود فتنوں اور تضادات کا ایک سرچشمہ بن گئے ہیں۔ ان اداروں نے قوم کو ذہنی طور پر طبقاتی جزیروں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک سے زیادہ تعلیمی سسٹم اور معیارات' انگریزی والے سکول اور اردو والے سکول' حاکم و مقتدر طبقے کے بچوں کے لئے درس گاہیں' اور عوام کے لئے درس گاہیں' ملکی مراکز تعلیم اور غیر ملکی مشنری مراکز۔

ملک بھر میں عرصے سے یہ مطالبہ زوروں پر رہا ہے کہ دو طرز کے یا دولسانی نظام ہائے تعلیم کی وجہ سے یک بام و دو ہوا کا جو تفرقہ انگیز اور طبقہ ساز ماحول بن گیا ہے اسے یک قلم ختم کر دیا جائے۔ خاص زور اس پر دیا جاتا رہا ہے کہ غیر ملکی ذرائع سے چلنے والے انگلش میڈیم اسکولوں سے جلد نجات حاصل کی جائے۔ مگر نہ کوئی جمہوریت ایسا کر سکی اور نہ مارشل لاء۔

ہماری تہذیبی تاریخ میں عقیدہ توحید کے جو وسیع عمرانی اثرات پڑے ان میں کئی ایسے واقعات شامل ہیں جو "وحدت نظام تعلیم" کے حق میں مہر شہادت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مثلاً ایک واقعہ......

ہارون اور مہدی (عباسی دور کے شہزادے)

دونوں نے امام مالکؒ کے درس موطا میں یہ خواہش کی کہ ان کو دوسرے طلبہ سے الگ خیمہ خلافت (شاہی) میں بیٹھ کر املا کرنے کی اجازت دی جائے۔ امام صاحب نے انکار کر دیا۔[۲]

---

۱ اردو سائنس بورڈ کے ایک سوال نامہ کے جواب میں۔

۲ حیات مالکؒ از سید سلیمان ندوی

یعنی ہمارے یہاں کسی طرح کے فرق و امتیاز کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

چلتے چلتے ایک واقعہ اور سن لیجئے جس سے ہماری روایت واضح ہوتی ہے۔ خالد بن احمد ویلی امیر بخارا نے امام بخاری کو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے گھر پر بلایا۔ مگر انہوں نے علم حدیث کے تقدس (اور عوامی مساوات) کو سامنے رکھتے ہوئے انکار کر دیا۔ پھر امیر بخارا نے چاہا کہ مدرسے کے اندر اس کے بچوں کو نشست اور سلوک میں ترجیح دی جائے۔ امام نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ امیر بخارا کو غصہ آیا اور انہوں نے امام کو شہر بدر کرا دیا۔ ادھر تھوڑے ہی عرصے بعد خود امیر بخارا کو معزول کر دیا گیا اور مخالفوں نے گدھے پر سوار کر کے اس کی تشہیر کرائی۔

اب ہمارے ہاں اس روایت کے مطابق تعلیمی مساوات قائم ہونی چاہئے جس کا اصل الاصول یہ ہو کہ تمام درس گاہوں کی تعلیمی اور امتحانی زبان اردو ہو گی' تمام مدارس میں ہر بچے کے لئے داخلے کا دروازہ کھلا ہو گا۔ سب جگہ نصاب و نصابی کتب ایک نہ بھی ہوں تو ان کا معیار ایک جیسا ہو گا۔ سب جگہ ماحول اور معیار یکساں ہوں گے۔ تمام طلبہ کے لئے اسکولی لباس (Uniform) سادہ اور یکساں ہو گا۔ اور کسی بھی تعلیم گاہ سے ایک خاص سطح کے فارغ التحصیل طلبہ کو مختلف ملازمتوں اور انٹرویوز میں شامل ہونے کا یکساں موقع ملے گا (مقررہ معیار تعلیم اور نمبروں وغیرہ کی شرط کے ساتھ)۔

اس طرح مساوات کا اصول نظام تعلیم میں نافذ کرنے کے لئے کچھ طور اطوار اور شعائر میں مماثلت پیدا کرنی ہو گی۔

نظامِ امتحانات

میں غیر فنی آدمی ہونے کی وجہ سے طریقۂ امتحان پر کوئی حتمی رائے نہیں دے سکتا' مگر اتنا بہرحال سب کو معلوم ہے کہ مروجہ طریقے ناکام ہو چکے ہیں' حتی کہ سمسٹر سسٹم بھی یہاں جواب دے گیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ ہمارے معاشرے میں پھیلا ہوا خیانت کا روگ ہے۔ ہر طالب علم اور طالبہ اور ان کے والدین اور اقربا اس کوشش میں رہتے ہیں کہ کسی طرح پہلے سے

۔ آئی۔ای۔آر (پنجاب یونیورسٹی) کی ایک طالبہ کے سوال کے جواب میں لکھا گیا۔

پرچہ یا سوالات معلوم ہو جائیں' ہال میں نقل کا انتظام ہو جائے (جو کھلم کھلا ہوتا ہے) یا امتحان کے بعد پرچے بدلے جاسکیں یا ان پر لگے ہوئے نمبروں میں یا لسٹ (List) میں اضافہ ہو سکے۔

یعنی ذہن اب یہ رہ ہی نہیں گئے کہ ہمیں علم حاصل کرنا ہے' صرف ڈپلومے یا ڈگری پر نگاہ ہوتی ہے۔ اور اگر جھوٹے سچے اچھے نمبروں یا ڈویژن کی ڈگری مل جائے تو وہ گویا بڑی آمدنی اور بڑے عہدے کا ڈیمانڈ ڈرافٹ یا وثیقہ ہے۔

اندریں صورت ہمیں اپنا نقشۂ کار بدلنے کے لیے اصل بنیادی تبدیلی یہ کرنی چاہیے کہ معلم و متعلم اور ممتحن کو صاف طور پر بتا دیا جائے' پالیسی میں شامل ہو کہ ہمیں فلاں اور فلاں اور اتنی اور اتنی معلومات درکار ہیں بلکہ ایسا متحرک ذہن اور بیدار صلاحیتیں درکار ہیں کہ جو تعلیم کے دینی و ملی و تہذیبی مقاصد کے لیے معاملات و مسائل کو خود سوچ سکتے ہوں۔

سوالات میں کورس کی لفظی پابندی سے ہٹ کر ایسا خاکہ طالب علم کے سامنے رکھا جائے کہ مکان بنانے میں' قرض لینے میں' کاروبار کرنے میں اگر تم فلاں فلاں حالات سے دوچار ہو تو اپنا قضیہ کس طرح حل کرو گے؟

یا مثلاً اگر تمہیں حج کے لیے جانا ہو تو جغرافی لحاظ سے کون کون سے راستے ہیں جنہیں تم استعمال کر سکو گے اور کن ذرائع سے کام لو گے اور جو مختلف ممالک اور ان کے قوانین اور موسم اور راستوں یا قیام گاہوں یا مدد حاصل کرنے کے لیے جن اداروں کی تم کو ضرورت ہو گی ان سے کیسے عہدہ برآ ہو گے۔

اسی طرح انڈسٹری' زراعت' وڈیرہ ازم' امیری غریبی کا غیر ضروری تفاوت' دفاعی مسائل' ریلوے کی انتظامی خرابیاں' خیانت و رشوت کا روگ' ان سوالات کو ہر مضمون کے پرچے میں سمو کے رکھنا ہے۔ تاکہ دو اور دو چار کی طرح کے جواب نہ ہوں جن کی نقل ہو سکتی ہے یا کسی سے چار لفظ پوچھ کر' یا کتاب سے نقل کر کے کام چلایا جا سکتا ہو۔

اسی طرح آپ طلبہ سے کہیے جمہوریت (مغربی) پر' اشتراکیت پر' فرائیڈین تصورات پر' نظریہ ارتقاء پر' افادی اخلاق پر' ترقی کے مادی مفہوم پر تنقید کیجیے۔

اس طرح کے سوالات میں نقل ماری اور عیاری نہیں چل سکتی۔ مگر اس کے لیے طریق تعلیم و تعلم کو بھی بدلنا ہو گا۔

ایک تدبیر یہ ہو سکتی ہے کہ ہر بڑے امتحان کے بعد انٹرویو ہو اور اس میں پوچھا جائے کہ فلاں سوال کو تم نے کیسے سمجھا اور اس کا حل کس طرح تجویز کیا۔ اکثر یہ ہو گا کہ خالی الذہن طالب علم کا پول کھل جائے گا۔

ایک اور مشکل بڑی تعداد میں طلبہ کے ایک ایک امتحان گاہ میں جمع ہونے سے (اور پھر باہر سے اُن کو غنڈوں اور پولیس تک کی مدد ملنے سے) پیدا ہوتی ہے' وہ کچھ نہ کچھ باقی رہے گی۔ اس کا علاج ایک دولت پرست اور خدا فراموش معاشرے میں سوچنا بڑا مشکل ہے۔ جہاں ایک تہجد خواں بھی چاہے گا کہ اس کا پوتا یا نواسہ ضرور فسٹ کلاس میں پاس ہو بلکہ وظیفہ لے اور پوزیشن حاصل کرے۔ ایسے لوگوں کی مدد کے لیے اشرار اور دہشت گردوں اور ہنگامہ برپا کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہمارے اندر موجود ہے۔ خود استاد اس رومانس میں شریک ہو جاتا ہے جس کا دوسرا سرا باقاعدہ جنگی کاروائی ہے۔

اس معاملے کو میں سوچ سوچ کر عاجز آ گیا۔

شارٹ کٹ یہ ہے کہ ہم نے اپنے سمسٹر سسٹم کو بہتر بنائیں۔ مثلاً

سمسٹر سسٹم کے تحت (نصابی مضمون کے مطابق) پیش آمدہ تقاریب کا ہفتہ منانا۔ مضمون لکھنے والے مضمون لکھیں' تقریریں کرنے والے تقریریں کریں' شعر کہنے والے شاعری کریں' ریاضی والے مسئلہ یا تقریب کے مصارف وغیرہ کے متعلق اندازے تیار کریں بجٹ اور قومی دولت سے تناسب نکالیں۔ آرٹسٹ جائز حدود میں آرٹ ورک کریں۔ یا کارٹون' سکیچ اور چارٹ وغیرہ بنائیں۔ خطاط خطاطی کریں۔ جنہیں انگریزی میں بولنا اور لکھنا ہو وہ انگریزی میں کام کریں۔ سلسلے سے متعلق اسلاف کا مواد' مغربی نقطہ ہائے نظر' اقوال' اشتہار' آیات' احادیث جمع کریں۔

اس اجتماعی (Collective) کام میں جس نے جیسا حصہ لیا ہو' ویسے نمبر اسے دیے جائیں۔ ابتدائی رف نمبرنگ براہِ راست کام کرانے والے معلمین کریں۔

اسی طرح آپ نے اورنگ زیب پر لیکچر دیا۔ اب اس معاملے میں سمسٹر کے طریق پر ضروری کام ایک ہفتے پر پھیلا دیجیے' اور طلبہ کے مختلف گروپس کو مختلف حصوں میں کام سونپیے۔

مثلاً اورنگ زیب جواب ہے اکبر کے بگاڑ کا ـــــ اورنگ زیب نے ایک نہایت ہی بگڑے ہوئے اور قتل مقاتلہ میں مبتلا اور سازشوں میں الجھے ہوئے معاشرے میں احیائے اسلام کا کام شروع کیا۔ اس نے فتاوائے عالمگیری جیسا متفقہ قانون اسلامی اپنے قلمرو میں عملاً جاری کر دیا۔ اس کے متعلق مخالفین' خصوصاً ہندوؤں کے اعتراضات اور ان کے جوابات' اس سلسلے کی اہم کتابیں (Bibliography) اور ان میں سے ہر ایک کی نوعیت اور اہمیت پر نوٹ۔ ہندوؤں کی عملاً احیائے اسلام کی سخت مخالفت کی مثالیں۔ ہندوؤں اور انگریزوں کی مخالفانہ کتب کی نشاندہی۔ اورنگ زیب کے دور کا نقشہ۔ بعد میں زوال کیوں آ گیا۔

اسی طرح مثلاً ادب میں ٹالسٹائی کی سادہ مثال کو لیتا ہوں۔ اس نے ایک طرف تو معاشرے کے مظالم کے خلاف جذبات کا اظہار کیا اور جو تحریک عوام میں برسوں سے مبہم طریق پر چل رہی تھی اس کا عکس اس کے ہاں موجود ہے۔ مگر دوسری طرف وہ رہنمائی مذہب (انجیل کے ادب) سے لیتا ہے اور اس طرح ایک نیا ادبی مدرسۂ فکر پیدا کر دیتا ہے۔ اس پر تعلیم و تحقیق کے لیے ایک وسیع نقشہ سمسٹر کا بنانا پڑے گا۔

سمسٹر کا مواد اگر اس طرز پر ڈھال دیا جائے تو نقل بازی اور ایک دوسرے سے معلومات مستعار لے کر کام چلانا مشکل ہو جاتا ہے۔ کلاس میں سوال جواب ہی سے طالب علم کا کافی امتحان ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر اگر ہفتے میں ایک یا دو بار یا پانچ دن بعد ایک پیریڈ بحث و تمحیص کا رکھا جائے جس کا قائد معلم ہی ہو گا۔

سمسٹر کا اصول یہ ہے کہ ایک مقررہ پیریڈ کے لیے نہایت بھاری بھرکم پروگرام طالب علم کے سامنے ہوتا ہے اور وہ پورے انہماک سے ہفتہ دو ہفتے کتابیں پڑھ کر اور ماہرین سے معلومات لے کر اسے پورا کر سکتا ہے۔ اس کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا کہ وہ نقل کرنے اور کرانے کا کاروبار چلا سکے۔ اسے ہر منٹ کی خود ضرورت ہے' ورنہ نمبر مارے جائیں گے۔ دوسروں کو نقل کرانے اور مواد سمجھانے کے لیے وقت دے کر وہ اپنا نقصان کیوں گوارا کرے۔ ہاں خود کلاس روم میں معلومات کا تبادلہ بحثوں میں ہو سکتا ہے۔

بہرحال ایسے سمسٹر کی بنیادی نمبرنگ تو متعلقہ معلم کرے گا (اپنے مضمون میں) لیکن نظر ثانی ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ۔ نیز طلبہ سے دو تین پروفیسروں کا بورڈ ان کا تحریری ریکارڈ سامنے رکھ کر یہ ضرور پوچھ لے کہ انہوں نے فلاں مسئلے اور فلاں سوال کو کیسے حل کیا۔

بعد ازاں یہ بورڈ نمبرنگ کی آخری توثیق (یا اس سے اختلاف) کر کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کو بھیج دے گا۔

افسوس ہے کہ میں ایک غیر تکنیکی آدمی ہونے کی وجہ سے زیادہ باتیں کر نہیں سکتا' اور میں نے جو کچھ کہا ہے' ہوسکتا ہے کہ اس میں بھی غلطیاں اور جھول ہوں۔ یا کوئی صورت پہلے سے موجود ہو۔

حصہ سوم

عمل تعلیم

ہمیں کیسے تعلیمی ادارے مطلوب ہیں

ہمیں ایسے تعلیمی ادارے مطلوب ہیں جو ہماری نسلوں کو دشمن قوتوں کے لئے سواری کا کام دینے سے انکار کر دیں جہاں سے مادہ پرستانہ طاغوتی تہذیب کے انسانیت کش مظاہرے کے خلاف علمی بغاوت[1] کا اظہار ہو۔

مقصد اصلی یہ ہو کہ ہمارے خستہ حال اور زوال پذیر اور باہم آویز معاشرے کو دلدل سے نکالنے کے لئے ایسے انسان تیار کئے جائیں جو ایمان' علم اور اخلاق سے آراستہ ہوں اور جرأت و عزیمت سے اپنے آپ کو قال و حال کی زبان سے مسلم کہہ سکیں۔

جو درس گاہیں محض معلومات طالب علموں کی جھولی میں ڈال کر ان کو رخصت کر دیں یا زیادہ کرم کریں تو اغیار کے خلاف اسلام اور خلاف انسانیت نظریات کی مالائیں ان کے گلے میں ڈال کر ذہنی غلامی کے تاج ان کے سروں پر رکھ دیں۔ ان پر ان تمام مفاسد کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو ہمارے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی تعلیمی ادارہ نظریہ اسلامی والے پاکستان کو اعلیٰ درجے کے انسان تیار کر کے نہیں دیتا تو پھر عظیم الشان عمارتوں سے کیا حاصل؟ کیا یہاں ہمیشہ پڑھے لکھے جاہل اور تقلید کیش اور دولت کے پیچھے بھاگنے والے انسان ہی تیار کئے جاتے رہیں گے۔

آج ایسے تعلیمی اداروں کی ضرورت ہے جو ایسے نئے انسان پیدا کریں جو اپنے ایمان' اپنے علم اور اپنے اخلاق کے زور سے اس معاشرے کے فتنوں کا زور توڑ دیں اور پھر ساری

---

[1] علمی بغاوت تو تب ہی ممکن ہے جب طلبہ میں تفکر و تنقید کی صلاحیتوں کو جگایا جائے۔ اس تفکر و تنقید کی بنیاد اس شعور پر ہونی چاہئے کہ موجودہ نظام تعلیم اپنے علوم اور نصابات میں معلومات کو جس محور کے گرد ترتیب دے کر لاتا ہے وہ مادہ پرستی کا محور ہے۔ یہ مادہ پرستی جو ظاہر پرستی کی عملی اشکال اختیار کرتی ہے اسلام کی عین ضد ہے اور اس کی دشمن اور اس سے متصادم! یہی وہ فاسد روح علوم ہے جس پر ہماری درس گاہوں میں طلبہ کو حملہ آور ہونے کا درس ملنا چاہئے۔

دنیائے انسانیت کے لئے خدمت انسانیت کا لائحہ عمل لے کے اٹھیں۔

درس گاہیں قومی امانت

درس گاہیں پوری قوم کی امانت ہیں۔ ان پر قوم کا روپیہ صرف ہوتا ہے قوم ایک خاص اقتصادی و اخلاقی مزاج رکھتی ہے اور وہ اس مزاج کے مطابق اپنے نظام تعلیم کی تشکیل بھی چاہتی ہے۔

پھر درس گاہوں کے مسائل کو تعلیمی نقطۂ نظر سے دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے تعلیم گاہوں کا اصل کام تعلیم ہے۔ دوسری تربیتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ کھیلوں اور تفریحات کی گنجائش بھی ہوسکتی ہے مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ تعلیم کے مقابلے میں ان کا تناسب بڑھ نہ جائے' دوسرے وہ طلبہ کی ذہنی و اخلاقی تعمیر میں خلل انداز نہ ہوں (ذہنی و اخلاقی تعمیر ان عقائد و تصورات کے مطابق ہو جن کی حامل قوم کی بھاری اکثریت ہے)۔

مدرسے کا ماحول

ہماری درس گاہوں کے ماحول کو ہر پہلو سے اسلامی ہونا چاہئے۔ اور اس کی فضا کو غیر اسلامی اثرات سے پوری طرح پاک کر دینا چاہئے' تاکہ جو طلبہ اس ماحول میں چند سال گزاریں ان کی ذہنیتیں اور سیرتیں خود بہ خود اسلام کے ڈھب پر بدل جائیں۔ ہمارے تعلیمی ماحول کی ساری دلچسپیوں اور سرگرمیوں اور مصروفیتوں کی روح اسلام کو ہونا چاہئے۔ یہاں کی گفتگوئیں' یہاں کی مجالس' یہاں کے کھیل' یہاں کے مباحثے' یہاں کی نشست و برخاست' یہاں کے باہمی روابط' یہاں کے آداب و رسوم' یہاں کی تقسیم اوقات سبھی کی روح اسلام ہو' اور سبھی اسلام کے تقاضوں کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہوں۔ دوسرے لفظوں میں تعلیمی ماحول ایک ایسے فطری سانچے کی حیثیت اختیار کرے جس میں قرآن کے نقشے اور اسوہ نبیؐ کے نمونے کا مطلوبہ انسان ہی ڈھل سکے۔

درس گاہوں کی اہمیت

میرے نزدیک نئی قوم اور نئے نظام اور مختلف نظریوں اور اصلاح و تغیر کی تمام تحریکوں کی تاسیس فی الحقیقت درس گاہوں میں کی جاتی ہے اور اگر کسی قوم کو فکری' ثقافتی اور تہذیبی

تصادم سے سابقہ پڑ جائے تو اس تصادم کا فیصلہ تعلیمی اداروں میں ہی ہوتا ہے —— باقی جو کچھ ہے وہ سیاست ہو' صحافت ہو' ادب ہو' سبھی کچھ دراصل تعلیم کے برگ و بار ہیں۔

یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ تعلیمی ادارے اگر اپنے مقصود سے آگاہ ہوں تو ان کے تیار کردہ نوجوان خودی کی قوت سے پہاڑوں کو اپنی جگہ سے سرکا دیتے ہیں' ستاروں پر کمندیں ڈالتے ہیں اور بالآخر خود ملت کے مقدر کے ستارے بن جاتے ہیں۔

جامعہ خواتین ــــــ

کیوں اور کس طرح؟

خواتین یونیورسٹی محض عام یونیورسٹیوں کی طرح ایک اور یونیورسٹی قائم ہو جانے کا معاملہ نہیں' بلکہ یہ اقدام سیکولر ذہنوں کی مسلط کردہ شب دیجور کی چادر سیاہ میں ایک ایسا شگاف ہوگا جس سے روشنی کی رکی ہوئی شعاعوں کا تیز و تند بہاؤ ایک آبشار کی طرح شروع ہو سکتا ہے۔ اور جب یہ تجویز جامۂ عمل پہن لے گی ــــ بشرطیکہ اسے ایمانی شعور کے ساتھ وسیع مفہوم اور بھرپور شکل میں جلوہ گر کیا جائے ــــ تو مسحورین فرنگ اور مقلدین تہذیب دوں نہاد کی تعمیر کردہ کانچ کی تمام دبیز دیواریں منہدم ہونے لگیں گی جو ہمارے لیے راہ حق میں حائل ہوگئی ہیں۔

ہمیں جو دنیا بنا کر دی گئی ہے ــــ وہ سیاست و معیشت سے لے کر تعلیم و ثقافت تک ــــ سیکولر اور مادہ پرستانہ مفاد طلبی اور نفع اندوزی اور عیش مستی کی دنیا ہے۔ تمام علوم میں' تعلیمی نصابوں میں' عام پسند لٹریچر میں' ناولوں اور افسانوں میں' شاعری اور موسیقی میں' عریاں تصویروں اور فلموں میں یہی زہر ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ ہمیں اس تدریج سے پچھلی دو تین صدی کے عرصے میں زہر خورانی کا شکار بنایا گیا ہے کہ اب ''ہیروئن'' (Heroin) کے فریفتگان کی طرح یہ زہر ہمارے لیے نشہ و سرور کا لازمی ذریعہ بن گیا ہے۔ ہم اس راہ سے ہٹ کر سوچ نہیں رکھتے' قدم آگے نہیں بڑھا سکتے' ہزار ہا اعتراض اور شکوک و اوہام میں گھر کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب کبھی ہم اسلام کے کسی اصول یا اس کی کسی قدر کا احیاء کرنا چاہتے ہیں' گریز کے سینکڑوں بہانے فرار کے ہزاروں راستے دائیں طرف بھی اور بائیں طرف بھی کھل جاتے ہیں۔ ہمارے ملک کے علاوہ بیشتر دوسرے مسلمان ممالک میں بھی انگریزی یا کسی دوسری مغربی حکومت نے سیکولر طرز فکر پیدا کرنے کی مہم کے ساتھ ساتھ ایسا اہتمام کیا کہ سیکولر

ذہن کے طبقے کو معاشرے کی قیادت کے لیے تیار کیا' اور جب اس کے رخصت ہونے کا وقت آیا تو قافلہ آزادی کی سربراہی کے لیے اس طبقے کو خود سہارا دے کر اس نے اقتدار کے گھوڑے پر چڑھایا تا کہ اسلام کو تمدنی زندگی سے بے دخل کرنے کا جو لمبا کام وہ بڑی حد تک کر چکی تھی' اس کے بعد بھی اس کی تکمیل کے مراحل طے ہوتے رہیں' اور کم سے کم علمی' تعلیمی اور ثقافتی سامراج بدستور کام کرتے رہے۔ چنانچہ ہماری قریبی تاریخ گواہ ہے کہ مصر میں' ترکیہ میں' انڈونیشیا میں' پاکستان میں' جہاں بھی کہیں احیائے اسلام کی تحریک نے سر اٹھایا' فوراً مغربی سامراج کے سیکولرسٹ ورثا اپنی پوری شان مسلمانی کے ساتھ زنجیریں اور مشین گنیں' سولیاں اور پھانسیاں لے کر آگے بڑھے اور اسلام اور مسلمانوں کی سچی خدمت کرنے والوں کا بے دریغ خون بہایا۔

پاکستان میں آپ نے نہیں دیکھا کہ جب اول اول اسلامی دستور کا عوامی مطالبہ زور پر آیا تو حکمرانوں نے معاشرے کے گراں قدر عنصر پر غداری اور تخریب کے الزامات لگائے اور ان کے لیے زندانوں کے در کھول دیے۔ پھر جب قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کی مہم ۵۳ء میں شروع ہوئی تو' سے کچلنے کے لیے گولیوں اور سنگینوں اور سلاسل اور تازیانوں کی پوری قوت استعمال کر دی گئی۔ تمام جیل بھر گئے' حکومت تہ و بالا ہو گئی' مگر قادیانیت نوازی میں فرق نہ آیا' جس کی خاطر امت محمد ﷺ کے لاکھوں افراد مختلف اذیتوں اور نقصانوں کا نشانہ بنے۔ عائلی قوانین میں تحریفی عمل دور ایوبی میں کیا گیا۔ اس کے خلاف علما کے ردعمل پر شدید گرفت کی گئی۔ حتیٰ کہ عید کے چاند کے مسئلے میں اختلاف رائے واقع ہونے پر چند ممتاز عالموں کو محبوس کر دیا گیا۔ یوں بھی مجموعی طور پر دیکھیں تو پاکستان میں اسلامی مقاصد کے لیے کام کرنے والوں کی قربانیوں اور ان کے خلاف ہونے والی کارروائیوں کی میزان ہر دوسرے عنصر سے زیادہ بنتی ہے۔

یوں ہماری اسلامی ریاست پر سیکولرازم فرماں روا ہے۔ اور وہ بس اسلام کو اس حد تک گوارا کرتا ہے کہ اس کے نعرے لگتے رہیں' اس کے لیبل غیر اسلامی اقدامات پر چپکائے جائیں' اور جواب میں وہ داعیان اسلام سے چاہتا ہے کہ وہ اس کے ہر اقدام کو اسلامی ثابت کرنے والے فتوے اور مقالات لکھتے رہیں۔ اس حالت سے نکلے بغیر نہ اسلام روبہ عمل آ سکتا ہے' اور نہ ہم اسلام کے خلاف سیکولرازم کی کشمکش کو برقرار رکھ کر ترقی کر سکتے ہیں۔

ہم اپنی بحث کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلے حصے میں ''کیوں'' کا جواب دیتے ہوئے مقاصد بیان کیے جائیں گے' اور دوسرے حصے میں ''کس طرح'' کے جواب میں تجویز کو جامہ عمل پہنانے کی صورت مذکور ہوگی۔

خواتین یونیورسٹی

حصہ اوّل ـــــ مقاصد

اب مسئلہ یہ ہے کہ خواتین و طالبات کی تعلیم تو پہلے ہی سے ہو رہی تھی' پھر آخر ان کے لیے علیحدہ یونیورسٹی کیوں؟ دوسرے لفظوں میں وہ مقاصد کیا ہیں جن کی بنا پر جامعہ خواتین کی ضرورت ہے؟ اس سوال کے جواب میں مقاصد جس منطقی ترتیب سے بیان ہونے چاہئیں' اسے چھوڑ کر سب سے پہلے ہم خواتین اور طالبات کے مفاد کے لحاظ سے جامعہ خواتین کی ضرورت پر گفتگو کرتے ہیں۔

خواتین کے حق میں ایک زیادتی کا ازالہ

مخلوط تعلیم کے کالجوں میں طلبہ کی اکثریت کے ساتھ طالبات کی اقلیت ایک طرح کی ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ طالبات بالعموم الگ گروہوں اور ٹولیوں میں رہتی ہیں۔ ان کے لیے داخلے کے وقت نشستیں علیحدہ متعین ہوتی ہیں۔ زیادہ تر کلاس روم میں بھی سیٹیں الگ ہوتی ہیں۔ ان کے کامن رومز بھی الگ ہوتے ہیں۔ یونینز میں بھی ان کی نشستیں علیحدہ معین ہوتی ہیں۔ ان کے لیے کچھ خاص پابندیاں اور قیود ہوتی ہیں۔ طالبات کے ہوسٹلوں کا انتظام بھی سخت تر ہوتا ہے۔ ان کے لیے بعض ضوابط بھی الگ ہوتے ہیں۔ نیز منتظمین' اساتذہ اور دوسرے عملہ دفتر کا رویہ بھی طالبات کے ساتھ مختلف ہوتا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی طالبات دبی دبی رہتی ہیں اور ثانوی حیثیت میں رہنے کے دباؤ کا مقابلہ محض تیز طرار جملوں اور شوخ و شنگ حرکات سے نہیں ہوسکتا۔ اندریں صورت مخلوط تعلیم کے علمبردار اور حامی جو فوائد پیش نظر رکھتے ہیں' وہ بھی پوری طرح حاصل نہیں ہوتے' اور مخلوط تعلیم کے مخالفین جو نقصانات بتاتے ہیں' ان کا کچھ حصہ بھی طالبات اور معاشرے کے پلے پڑتا ہے۔

اگر سیدھی طرح خواتین کے لیے جداگانہ تعلیم گاہوں کا اصول تسلیم کرلیا جائے تو جامعات

اور کلیات کے ہر دائرے میں خواتین بلا مداخلت غیرے بے تکلفی سے حصہ لے کر فوائد سے بہرہ مند ہو سکتی ہیں۔ طالبات اپنی کلاس میں خاتون لیکچرر سے ہر قسم کے سوالات پوچھنے اور ہر قسم کے سوالات کے جوابات دینے میں بڑی آسانی محسوس کریں گی۔ یہ تو ایک مصیبت ہے کہ ہر بات کرتے ہوئے دوسری صنف کا تصور ذہن میں آ جائے کہ اس کا ردعمل کیا ہو گا۔

کلاس روم کے علاوہ' مختلف تقاریب میں' جلسوں میں' کھیلوں میں' لائبریری میں' کیفے ٹیریا میں ہر جگہ طالبات ہر قسم کے ذہنی تحفظات اور احتیاطوں سے ہٹ کر پوری آزادی سے اپنا پارٹ ادا کر سکیں گی۔ اصل معاملہ مجموعی شخصیت کے نشوونما کا ہے جس کی کمی زیادہ نمبر لینے سے پوری نہیں ہو سکتی۔ مخلوط نظام تعلیم میں لڑکوں اور لڑکیوں' دونوں کی شخصیتوں کا نشوونما غیر متوازن ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر جامعات خواتین عورتوں اور لڑکیوں کو زیادہ بہتر تعلیم اور زیادہ حقیقی ترقی بہم پہنچانے کے ذریعہ ہوں گے۔ ان کی ذہنی اور جسمانی صلاحتیں زیادہ اچھی طرح نشوونما پائیں گی اور ان کا ایمان واخلاقی معیار آج سے دسیوں گنا برتر ہو گا۔

خواتین کو پوری توجہ سے اس امر کا نوٹس لینا چاہیے کہ اصلاً مخلوط نظام تعلیم —— بلحاظ نظریات و مقاصد' اور بلحاظ نصابات —— انگریزی دور سے ہی لڑکوں کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ یہ بڑی زیادتی ہے کہ خواتین کی مخصوص صلاحیتوں (جن سے مرد بہرہ مند نہیں ہیں) اور ذمہ داریوں کو نظر انداز کر کے طالبات کو اٹھا کر مردانہ نظام تعلیم کی گود میں پھینک دیا جائے۔ گویا نظام تعلیم کی نگاہ میں اصل چیز مرد ہیں' اور ساری اہمیت ان کی ہے۔ کسی لڑکی کو اگر تعلیم پانی ہو تو مردوں کے لیے جو انتظام کیا گیا ہے اسی سے فائدہ اٹھائے۔ اس کی اپنی صنف کی اتنی قدر و قیمت نہیں ہے کہ خاص اس کے لیے درسگاہوں اور اساتذہ اور نصابات کا موزوں انتظام کیا جائے۔ عورتوں کو اگر تعلیم حاصل کرنی ہو تو انہیں صرف مردانہ معیار اور طرز کی تعلیم بہم پہنچائی جا سکتی ہے' اور اگر انہیں ترقی کرنی ہو تو وہ صرف مردانہ مشاغل اور مردانہ کاموں کے ذریعے ہو سکتی ہے' نیز انہیں مردوں کے لیے ایوان ثقافت میں سامان تفریح بننا ہو گا۔ کوئی دوسرا راستہ تعلیم و ترقی کا نہیں ہے۔ فی الحقیقت سامراج نے ہر دوسرے دائرہ زندگی کی طرح شعبہ تعلیم میں بھی مردوں کو بے جا برتری دی ہے۔[1] کرم بس اتنا ہے کہ "مساوات

---

[1] انطباقی اجتماعی نفسیات (applied collective psychology) کے نقطہ نظر سے مخلوط تعلیم کے اولین علمبرداروں سے لے کر اس کے موجودہ حامیوں تک سب کے ذہنوں میں عورت کی ←

مردوزن' [1] کے بے معنی نعرے کا خوشنما پردہ ذہنوں پر ڈال دیا گیا ہے۔ سامراج کا بنایا ہوا قفسِ تعلیم دورِ آزادی میں بھی جوں کا توں رہا اور ہمارے اپنے کار پردازوں نے بھی عورتوں کو مردوں کا تابع مہمل بنا کر علم وترقی کی راہ پر چلایا۔

مردوں سے بڑھ کر خود خواتین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے آپ کو برطانوی سامراج کے تاسیس کردہ مردانہ نظامِ تعلیم کے قفس سے' جس پر مخلوط تعلیم کا بورڈ لگا دیا گیا ہے' پوری قوت صرف کر کے نکالیں۔ معاملہ محض یونیورسٹی کی الگ عمارت کا نہیں کہ یہاں سے اٹھے اور وہاں جا کے بیٹھ گئے' جو علمی شعبے جس ترتیب سے یہاں کام کر رہے تھے اسی ترتیب سے وہاں انہیں استوار کر دیا گیا۔ اصل مطلوب یہ ہے کہ خواتین وطالبات کی اپنی آزاد تعلیمی دنیا ہو جس میں وہ کلاس روم کی نصابی تعلیم سے لے کر قومی دفاع کی مشقوں تک' اور علمی مباحثوں اور ادبی مجالس سے لے کر کھیل کے میدان اور جوڈو کراٹے [2] کی تربیت تک دوسری صنف کی مداخلت سے آزاد ہوں۔

خواتین اساتذہ اور طالبات دونوں اپنے اپنے دائروں میں پورا نقشۂ کار اپنے رجحانات کے مطابق خود طے کریں اور ہر قسم کے انتظامات کو خود چلائیں اور اپنی مشکلات پر خود

← کمتری کے تصور کا غلبہ ہے اور اپنے ہی اس تصور سے الجھنے کی وجہ سے انہوں نے مخلوط تعلیم کو ذریعہ ترقی نسواں قرار دیا ہے۔ دوسری طرف خود منتظمین اور طلبہ کے رویے سے بھی ظاہر ہے کہ وہ عورت کو کمتر سمجھتے ہیں۔ اپنے اس غلط احساس کا شعوری علاج کرنے کے بجائے وہ اسے مختلف نظریات اور اداروں کے پردوں میں پنہاں کر دیتے ہیں۔ مخلوط تعلیم اور مخلوط معاشرت کی تہہ میں عورت کی کمتری کا نظریہ بیٹھا ہوا ہے۔

[1] قانونی واخلاقی مساوات الگ چیز ہے جس کا اسلام کا خود اولین علمبردار اور بہترین نمونہ ہے۔ کامل مساوات مردوزن کا مغالطہ انگیز نعرہ لگانے کے لیے جسمانی وعضوی (Biological)' اعصابی (Nervous) اور نفسیاتی (Psychological) فروق وامتیازات سے آنکھیں بند کر لینا لازم ہے۔ جدید علمی' عضوی' سائنسی اور نفسیاتی تحقیقات تو حقیقت کا پتہ دیتی ہے۔ لیکن مغرب کے سوشل نظام کے سیاسی علمبردار اور ان کے حامی فلسفی اور بعض فلسفہ طراز سائنس دان نسائیت کو مغالطے کے ایک پھندے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ مساوات کے نعرے سے ایک اور عملی نعرہ پیدا ہوتا ہے۔ ''دوش بدوش'' بس اسی دوش بدوش کی پٹاری میں جدید انتشار انگیز معاشرت کے سانپ اور بچھو چھپے ہوئے ہیں۔

[2] واضح رہے کہ موجودہ فاسد ماحول میں تحفظ ناموس کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ خواتین خود حفاظتی تدابیر کے لیے اپنے اندر صلاحیت پیدا کریں۔

قابو پائیں ـــــ خلاصہ یہ کہ خواتین کے لیے جداگانہ جامعات (Universities) اور کلیات (Colleges) کا قیام ان کا بہت بڑا استحقاق ہے۔

پردہ پسند خواتین کی اکثریت کی ضرورت

پردے سے انحراف کرنے والی چند ہزار خواتین کو چھوڑ کر بقیہ غالب اکثریت اس معنی میں پردہ پسند ہے کہ وہ برقعہ استعمال کرے یا چادر سے کام چلائے' پورا وقت خانہ داری اور نئی نسل کی تربیت کو دے' یا مجبورانہ حالات میں گھر سے باہر کسی طرح کی محنت مزدوری کرے۔ بہر صورت وہ شرم و حیا' عصمت و پاکدامنی اور غیر محرم مردوں سے خلط ملط رہنے اور بے تکلف ہونے میں شدید احتیاط کے اصولوں کی باغی نہیں ہے۔ وہ اسلامی معاشرت کی قدروں کو خود بھی سینے سے لگائے ہوئے ہے' اور اپنی اولاد کو بھی جدیدیت کے سیلاب میں بہہ جانے سے بچانا چاہتی ہے۔

خواتین کی اکثریت سخت مشکل سے دوچار ہے۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد مخلوط تعلیم اور اس کے نتائج و اثرات کے پیش نظر خود بھی مخلوط تعلیمی اداروں میں نہیں آتی' اور اپنی اولاد کو بھی ان کے حوالے کرنے پر تیار نہیں ہوتی۔ پردہ پسند خواتین تین راستے اختیار کیے ہوئے ہیں۔

- کچھ خواتین گھروں میں بچیوں کے لیے تعلیم کا کافی یا ناکافی انتظام کر کے یا تو ان کو پرائیویٹ طور سے امتحانات دلواتی ہیں' یا امتحانات پاس کرانے سے بے نیاز رکھتی ہیں۔
- کچھ خواتین جو غریب اور محب اسلام گھروں سے تعلق رکھتی ہیں' بطور خود گھروں میں تعلیم کا انتظام کرنے کے قابل نہیں ہوتیں' مگر مخلوط تعلیمی اداروں میں اولادوں کو بھجوانے کے مقابلے میں انہیں جاہل رکھنے کو ترجیح دیتی ہیں۔
- کچھ وہ ہیں جو اپنی بچیوں کو بادل نخواستہ مخلوط نظام تعلیم کے حوالے کر دیتی ہیں مگر اس تکلیف دہ احساس میں مبتلا رہتی ہیں کہ ہم نے نئی پود کو خطرات کی زد میں دے دیا۔ اب اگر بچاؤ کا دارومدار ہے تو خدا کی خصوصی عنایت پر ہے۔ ایسی بچیوں میں سے کچھ تو پردے کے ساتھ تعلیم گاہوں میں جاتی ہیں' مگر چند ہی روز میں ان کی ہمت برقعہ پوشی جواب دے جاتی ہے۔ کچھ ایسی ہوتی ہیں جو ہر روز گھر سے برقع پہن کے

جاتی ہیں مگر کالج یا یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی برقعہ اتار دیتی ہیں۔ اور پھر واپس روانہ ہوتے ہوئے پہن لیتی ہیں۔ یہ روز کا عملی تضاد ان کے ذہن و کردار کی ساخت کو تباہ کر دیتا ہے۔ ایک تعداد ایسی بھی ہوتی ہے جس میں پردے کے خلاف باقاعدہ بغاوت شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ مخلوط تعلیم ایک ایسا چھرا ہے جس نے خواتین کی اکثریت اور اس کی اولادوں کی تعلیمی ترقی کو ذبح کر دیا ہے اور یکے بعد دیگرے بچیوں کی جو صفیں اٹھتی چلی آ رہی ہیں ان سب کے حق میں یہ مذبوحی حرکت مسلسل جاری ہے۔

صدہا گھروں اور لاکھوں خواتین اور بچیوں کو یہ مشکل درپیش ہے کہ مخلوط تعلیم ان کی ترقی کے راستے میں پہاڑ بن کر حائل ہے۔ ان کی آواز اس لیے سنائی نہیں دیتی کہ ان کے آگے چند ہزار بااثر' دولت مند' تعلیم یافتہ' لکھنے اور بولنے اور لیڈری کرنے والی ماڈرن خواتین تنظیمی قوت کے ساتھ کھڑی ہیں۔ ماڈرن خواتین و بیگمات کو کئی سال سے قومی لیڈروں اور سرکاری افسروں کی سرپرستی اور فنڈز کی امداد اور پروپیگنڈے کی قوتوں اور قومی ذرائع ابلاغ کی خدمات کی پشت پناہی حاصل ہے۔ انہوں نے اندرون ملک اور بیرون ملک ایسا اثر جما لیا ہے جیسے پورے پاکستان کی خواتین کی ترجمانی کا اجارہ انہی کے پاس ہے۔ حالانکہ یہ مغرب کے تہذیبی سامراج کی ایجنٹ بن کر پاکستانی خواتین کی اکثریت کے ایمانیات اور مطلوبات کو نمایاں ہونے سے روکتی ہیں' اور یہ محسوس کراتی ہیں کہ جو رنگ انہوں نے اختیار کر لیا ہے اس کے علاوہ پاکستان میں کوئی دوسرا نسائی رنگ موجود ہی نہیں ہے۔ اور اگر موجود ہے تو اس کے لیے ان کے دلوں میں احترام تو کجا' رواداری بھی باقی نہیں۔ یہ اکثریتی رنگ کو بالکل کاٹ دینا چاہتی ہیں۔

اب اگر کوئی بہتر قیادت یا حکومت مظلوم اکثریتی طبقۂ اناث کو سامنے رکھے تو ملک کی ترقی اور قوم کی بہبود کا اس سے تقاضہ یہ ہے کہ وہ خواتین و طالبات کے لیے الگ تعلیم گاہوں کا انتظام کرے۔[1]

ہمارا اندازہ یہ ہے کہ خواتین کے لیے الگ جامعات و کلیات کا ظہور ہوتے ہی بہت

---

[1] اسلامی نقطہ نظر سے سوچنا تو الگ بات ہے' ہمارے پڑوسی بھارت نے محض قومی افادیت کے نقطۂ نظر سے اس طبقہ خواتین کا خاص لحاظ کیا جو روایتی ہندو معاشرے کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ ایسی کثیر التعداد خواتین مخلوط تعلیم کے دائرے میں مرد طلبہ کے ساتھ بیٹھ کر خود تعلیم پانا یا اپنی بچیوں کو ←

سی ایسی خواتین اور طالبات نئی تعلیم گاہوں کی طرف رجوع کریں گی جو مخلوط تعلیم کے نتائج و اثرات سے خائف ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ تعلیمی ترقی کے نتیجے کے طور پر اقتصادی اور اخلاقی ترقی کی رفتار بڑھے گی۔

مخلوط تعلیم کے مفاسد سے نجات

مخلوط تعلیم کا نظام خود ہماری تہذیب کا پیدا کردہ نہیں ہے' بلکہ یہ صنعتی انقلاب کے نتیجے میں نشوونما پانے والی ملحدانہ و مادہ پرستانہ تہذیب کی اولاد ہے۔ اسے ہم آزادنہ ذہن کے ساتھ بھلا برا سوچ کر اور اپنے تہذیبی تشخص کی ضروریات کو سمجھ کر باہر سے خود پسند کر کے نہیں لائے' بلکہ اسے ہم پر ٹھونس دیا گیا ہے۔ یہ ہماری آئیڈیالوجی' ہمارے عقائد اور ہمارے اپنے معاشرے کے اندر سے نہیں اُگا ہے' بلکہ ایک مصیبت ہے جو باہر سے لا کر ہمیں اوڑھا دی گئی ہے۔ ہمیں صیادوں نے جبراً اس قفس میں ڈالا' اور اب ہم خوگرِ قفس ہو گئے ہیں۔

اندریں صورت' اگر پہلے کبھی ہم اس کا ناقدانہ جائزہ نہیں لے سکے تو اب لینا چاہیے اور اس کے مفاسد کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا چاہیے کہ ہمارا دین اور ہمارا قومی وجود اور ہمارا معاشرتی مزاج اسے ساتھ لے کے چل سکتا ہے یا نہیں۔ اس کا جائزہ لینے میں آپ کو حسب ذیل نکات مدد دیں گے۔

۱۔ صنعتی انقلاب اٹھا تو اس نے نہایت ہی دیرینہ اور مضبوط و مستحکم معاشرتی اقدار کو ہلا کر رکھ دیا۔ تہذیبی ٹوٹ پھوٹ کے اس مرحلے میں کوئی ایسی قوت موجود نہ تھی جو نوخیز خرابیوں کی اصلاح کر کے صنعتی انقلاب کو صحیح رخ پر ڈال دیتی۔ سیاسیات' اقتصادیات' فلسفہ' مذہب' اخلاق اور نظام معاشرت' ہر چیز تہ و بالا ہو گئی۔ اسی انقلاب کا ایک عطیہ مخلوط معاشرت ہے۔ کیونکہ نئی مشینی قوت نے دیہاتیوں کو گاؤں گاؤں سے نکالا اور مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی گھروں سے کارگاہوں میں مزدوری کرنے کے لیے منتقل کر دیا۔ یوں مخلوط معاشرت کی بنیاد

← پڑھانا پسند نہیں کرتیں۔ ان کے لیے آج سے ۲۰'۲۵ سال پہلے دو الگ یونیورسٹیاں (Women Universities) قائم کر دی گئیں۔ ان میں سے ایک ایس' ڈی' این' ڈی' ٹی ویمن یونیورسٹی تھا کریبے ہے جس کے ساتھ ۵۱-۵۰ میں چار کالجوں کا الحاق کیا گیا تھا۔ (بحوالہ پمفلٹ مخلوط تعلیم از احمد انس) علاوہ ازیں امریکہ تک میں عورتوں کے لیے الگ یونیورسٹیاں موجود ہیں۔

پڑی۔ اور اس کے نتیجے میں صنفین کے جداگانہ تعلیمی انتظامات ختم ہو کر مخلوط تعلیم کا سلسلہ فروغ پانے لگا۔ آیئے ذرا مخلوط تعلیم کی تاریخ پر نگاہ ڈال لیں۔[1]

- چین کے کسی گذشتہ دور میں مخلوط تعلیم کا سراغ نہیں ملتا۔[2]
- مغرب کے دور جدید کے ابتدائی حصے تک (چودھویں صدی کے آغاز سے اٹھارویں صدی کے اوائل تک) مخلوط تعلیم کا کوئی باقاعدہ وجود نہیں تھا۔ مستقل نظام کی حیثیت سے اس کی ابتداء اٹھارویں صدی کے اواخر میں ہوئی۔[3]
- مخلوط تعلیم کو اختیار کرنے میں امریکہ سب سے آگے رہا۔ مروجہ اصطلاح (co.education) نے امریکی لغت کے بطن سے جنم لیا ہے جو اولاً ۱۷۷۴ء میں استعمال ہوئی۔[4]

امریکی معاشرہ جن عناصر سے ترکیب یافتہ تھا' ان میں ایک تو مذہبی نزاعات سے تنگ آ کر وطن چھوڑنے والے لوگ تھے' دوسرے مفرور مجرم' تیسرے ہوس دولت کی رو میں نئی دنیا کی طرف لپکنے والے عناصر۔ ان کی عمریں ۲۵ سے ۴۰ سال تک تھیں۔ یہ لوگ اپنے اپنے معاشرے اور خاندانوں کی روایات اور مذہبی و اخلاقی پابندیوں سے آزاد تھے۔ ان میں غالباً عورتوں کی تعداد کم تھی اور گرسنہ مردوں کی تعداد زیادہ۔ ایسے بے تکے معاشرے میں جہاں منشیات' زنا کاری (اور حرام اولادیں)' قمار بازی' لوٹ مار کے جرائم پروان چڑھے (اور ان جرائم کے اثرات آج بھی نمایاں ہیں) وہاں مخلوط معاشرت اور مخلوط تعلیم کا تجربہ بھی زور شور سے شروع ہوا۔[5]

- انگلستان میں ۱۸۷۰ء اور ۱۹۰۲ء کے قوانین میں مخلوط تعلیم کا راستہ کھولا گیا۔ مگر اس موضوع پر انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز کے مقالہ نگار کا کہنا ہے کہ شرفا اور

---

[1] قلت وقت کی وجہ سے بطور خود از سر نو تحقیق و مطالعہ کا لمبا کام کرنے کے بجائے میں نے بعض ضرورتوں کے لیے پہلے سے موجود کام پر انحصار کیا ہے۔ اور بیشتر اقتباسات یا اعداد و شمار مستعار لے لیے ہیں۔ بہ طور خاص برادر عزیز احمد انس کے پمفلٹ ''مخلوط تعلیم'' مطبوعہ ادارہ مطبوعات طلبہ 1۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور میں سے۔

[2،۳،۴،۵] مخلوط تعلیم

معززین نے اپنے بچے ان اسکولوں میں بھیجنے پسند نہ کیے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں ۱۳۹۱ مدارس میں سے صرف ۳۹۴ مخلوطی تھے۔[1]

- فرانس میں مخلوط تعلیم کی اجازت صرف اسی صورت میں دی گئی کہ لڑکیوں کی تعداد ۵۰ سے کم اور لڑکوں کی ۱۰۰ سے زیادہ نہ ہو۔ ورنہ الگ سکول کھولنا لازمی ہوگا۔ ایک ماہر تعلیم میر (Meyer) اپنی کتاب ''بیسویں صدی میں تعلیم کا ارتقا'' میں لکھتا ہے کہ مخلوط تعلیم کو فرانس میں بالعموم پسند نہیں کیا جاتا۔[2]
- ۱۸۶۷ء میں جب فرانس میں لازمی تعلیم کا آغاز ہوا تو قاعدہ یہ مقرر ہوا کہ پانچ سو کی آبادی میں لڑکیوں کا ایک علیحدہ سکول لازماً قائم کیا جائے گا' نیز تیرہ سال کی عمر کے بعد مخلوط تعلیم نہیں ہوگی بلکہ علیحدہ علیحدہ انتظامات کیے جائیں گے۔[3]
- جنوبی امریکہ میں جو لوگ چرچ اور کانونٹ کے اسکولوں میں بچوں کو تعلیم دلا سکتے ہیں' وہ مخلوط تعلیم کے اسکولوں میں داخلے نہیں دلواتے تھے۔[4]
- روس میں انقلاب کے بعد ۲۰ سال تک مکمل مخلوط تعلیم کا تجربہ کیا گیا۔ پھر جب عملاً خوفناک نتائج سامنے آئے تو اسے ترک کر دیا گیا۔ نیا طرز فکر یہ تھا کہ ''مخلوط تعلیم لڑکوں اور لڑکیوں کے جسمانی نشوونما اور مستقبل کی عملی زندگی کے لیے دونوں جنسوں کی تربیت میں فرق و اختلاف کا لحاظ نہیں رکھتی' اور نہ عملی اور فوجی سرگرمیوں میں دونوں کی الگ الگ ضروریات کا اہتمام کر سکتی ہے۔ نیز طالب علموں میں مطلوبہ نظم و ضبط کی ضمانت بھی نہیں دیتی۔''[5]

اس مطالعہ تاریخ کی روشنی میں ہم سمجھتے ہیں کہ آزاد صحت مند فضا میں پروان چڑھنے والے کسی مذہبی عقیدے یا فلسفیانہ نظریے پر مخلوط تعلیم کی بنیاد نہیں ہے۔ بلکہ صنعتی انقلاب کے مہیا کردہ ہنگامی اور غیر معتدل بلکہ فاسد احوال نے اس غیر فطری نظام تعلیم کو پروان چڑھایا اور معاشروں کی حقیقی پسند کے خلاف تدریجاً ان پر مسلط کیا ہے۔ مخلوط تعلیم کے جواز اور افادیت کے نظریے اور فلسفے ساتھ کے ساتھ آہستہ آہستہ نشوونما پاتے چلے گئے۔

ہم مسلمانوں کا نظام معاشرت اور تصور نسائیت تو دوسری اقوام سے زیادہ بلند اور بیّن ہے' لیکن یہ حقیقت بہت سبق آموز ہے کہ بہ حیثیت مجموعی انسانیت مخلوط تعلیم کو پہلے سے نا

۱، ۲، ۳، ۴، ۵۔ مخلوط تعلیم از احمد انس ص ۲۲ تا ۲۸۔

پسند کرتی تھی۔

۲۔ مخلوط تعلیم کا لازمی نتیجہ جنسی غلاظت ہے۔[1]

چند سال قبل کے حقائق پیش خدمت ہیں۔ یہ ایک رپورٹ سے ماخوذ ہیں جو امریکہ کے مخلوط تعلیمی اداروں کی اخلاقی حالت کا جائزہ لینے کے لیے لکھی گئی تھی۔

- ڈاکٹر ہوبرٹ ہسکوز کا اندازہ ہے کہ مخلوط کالجوں میں اور لڑکوں کے کالج کے قریب واقع لڑکیوں کے علیحدہ کالج میں ۸۰٪ لڑکیاں تعلیم حاصل کرنے سے قبل جنسی تجربات سے گذر چکی ہوتی ہیں۔
- ونسٹفائن کا اندازہ ہے کہ شادی سے پہلے جنسی تعلقات قائم کرنے والی لڑکیوں میں کالج کی طالبات کا تناسب ایسی طالبات کے مقابلے کہیں زیادہ ہے جنہوں نے کالج میں تعلیم حاصل نہیں کی۔
- ورجینیا کے ایک چھوٹے سکول کی فارغ التحصیل طالبات کے اپنے بیانات سے پتہ چلا کہ ۷۵ سے ۸۵ فی صد تک لڑکیاں جنسی تعلقات قائم کر چکی ہوتی ہیں۔
- مشی گن یونیورسٹی کے طلبہ کا اپنا اندازہ ہے کہ گریجوایٹ ہونے تک بمشکل ۲۰٪ اور بعض کی رائے میں ۳۰٪ لڑکیاں جنسی تعلقات سے بچ کر نکلتی ہیں۔
- اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم یافتہ لڑکیوں میں سے ہر ۶ کے اندر ایک شادی سے پہلے ہی حاملہ ہو چکی ہوتی ہے۔
- سراکو یونیورسٹی کی ۶ ہزار طالبات میں اوسطاً ۴۴۰ سالانہ حاملہ ہوتی ہیں (حالانکہ اس افتاد سے بچاؤ کے لیے سائنس اور طب نے طرح طرح کے مانع حمل ذرائع بہم پہنچا رکھے ہیں)۔
- قبل شادی جنسی تعلقات قائم کرنے والی طالبات میں سے ۲۰ سال کی عمر تک ۳۱٪ پوری طرح بارور ہوتی ہیں۔
- کوئیز کالج کی ایک طالبہ نے بطور فخر خود یہ کہا کہ میں نے حال ہی میں اپنے خاتمۂ عصمت کی سالگرہ منائی ہے۔

یہ ہیں مخلوط تعلیم کے برگ و بار!

---

[1] آگے کی معلومات کے لیے ملاحظہ ہو مخلوط تعلیم ص ۴۷ تا ۴۹۔

۳۔ ہمارے ہاں جب مندرجہ بالا طرز کے واقعات کا ذکر آتا ہے تو لوگ تردید کے لیے یہ جواب دیتے ہیں کہ وہ تو مغرب والوں کی باتیں ہیں' ہم تو مشرقی ہیں' پاکستانی ہیں' ایسی چیزیں ہمارے ہاں کاہے کو ہونے لگیں۔

مصیبت یہ ہے کہ معاشرت اور اخلاق کے بگاڑ کے جو قوانین تاریخ میں بار بار اپنا یکساں عمل کرتے رہے ہیں' لوگ اول تو ان پر غور ہی نہیں کرتے اور غور کرتے ہیں تو یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ان قوانین کے تحت دوسروں کے ہاں جو نتائج بد نکلتے رہے ہیں' وہ ہمارے یہاں نہیں نکل سکتے۔

سیدھی سی بات ہے کہ اگر مخلوط تعلیم کے دروازے سے داخل ہو کر مخلوط معاشرت کی راہ میں گامزن ہوں تو چاہے آپ کتنے ہی محتاط ہو کر چلیں اور چاہے آپ کی رفتار کتنی ہی سست ہو' سنگ و میل اور مراحل و مناظر تو وہی پیش آئیں گے جو اس راستے پر آنے چاہییں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ چلیں تو مخلوط تعلیم و معاشرت کی راہ پر' اور نتائج ملیں پردہ دارانہ نظام کے۔ چاہیے یہ کہ مغرب کے تکمیل کو پہنچے ہوئے تجربہ کے جملہ نتائج کو سامنے رکھ کر اندازہ کر لیں کہ آپ نے اگر اسی تجربے کا آغاز کیا ہے تو تدریجاً آپ کو پہنچنا وہیں ہے جہاں اہل مغرب پہنچے ہیں۔

یہاں ابھی چونکہ ابتدا ہے تجربہ محدود ہے (اور کچھ مزاحمتی قوتیں برسرِ عمل ہیں) لہذا یہاں مخلوط تعلیم کے ثمرات پوری طرح جھولیوں میں پڑے نہیں۔ مگر کچھ کچھ واقعات و احوال ایسے ہیں جو آگے کے نتائج کی نشان دہی کر رہے ہیں۔ مثلاً ابھی ابھی ماضی قریب میں لاہور کی ایک شہرت یافتہ درسگاہ کی متعدد طالبات ایک خوفناک اسکینڈل سے دوچار ہوئیں۔ یا مثلاً آصف حسین کی کتاب (The Educated Pakistani Girl) میں ایک لڑکی کا مصنف سے بیان کردہ واقعہ یوں درج ہے کہ ''ایک پارٹی کے موقع پر اس نے ساتھ کے کمرے کا دروازہ کھولا تو اندر ایک جوڑا محبت کرنے میں مشغول تھا۔'' وضاحت کی گئی ہے کہ ''یہ افلاطونی محبت نہ تھی''۔ ایسے واقعات بھی ہیں کہ مخلوط تعلیم گاہوں کے پروفیسروں نے اپنی نوجوان شاگردوں سے دل و نگاہ کا رشتہ استوار کیا اور بالآخر نوبت شادی تک پہنچی۔ اس امر کا بھی جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ نائٹ کلبوں' شراب خانوں' مخلوط ثقافتی تقریبوں اور رقص کی مجلسوں کا نشوونما ہمارے یہاں مخلوط تعلیم کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ متوازی طور سے ہوا ہے یا نہیں؟ اور

ان دائروں میں آنے والی ایسی خواتین یا لڑکیوں کی تعداد کیا ہے جن کی نسائیت کو مخلوط تعلیم یا مخلوط معاشرت کے آتشیں محلول میں بجھاؤ دیا گیا ہے۔

اس طرح کے سامنے آنے والے اور پس پردہ مخفی احوال و واقعات کو در کنار رکھ کر بھی دیکھیں تو مخلوط تعلیم کے بڑے خطرناک مضمرات نمودار ہو رہے ہیں۔

ایک یہ کہ دو صنفوں کے بہم ہونے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں طرف بناؤ سنگھار کا اہتمام بڑھ جاتا ہے۔ خاص طور سے لڑکیاں فیشن' ملبوسات اور بناؤ سنگھار کے سامانوں پر بہت خرچ کرتی ہیں۔ جنسی جذبہ مجبور کرتا ہے کہ دونوں صنفیں اپنے اندر کشش (Charm) پیدا کریں۔ اس مسابقت میں غریب گھروں کی بچیاں شکست کھا جاتی ہیں وہ یا تو غلط ذرائع سے اپنے آپ کو دوسروں کے برابر لانے کی کوشش کرتی ہیں یا احساس کمتری کے بوجھ تلے دب کر تعلیمی ترقی سے محروم ہو جاتی ہیں۔

مخلوط درس گاہوں میں معاشقوں کے تجربے بھی ہوتے ہیں—— ان میں سے کچھ کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ زیادہ تر غلط شکل میں۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ناقابل انکار ہے کہ لڑکیوں اور لڑکوں دونوں کی نگاہ میں تعلیم گاہ کی مخلوط سوسائٹی منگیتر حاصل کرنے کے لیے ایک اچھی شکار گاہ ہوتی ہے۔ دونوں صنفوں کے افراد شکار کی تلاش میں رہتے ہیں' اور کبھی کوئی پسندیدہ چیز نشانے پر آ جائے تو تیر چلا دیتے ہیں۔ اس اہم مقصد کے لیے لڑکیاں بسا اوقات اپنا بہت کچھ داؤں میں لگا دیتی ہیں اور بارہا کوئی نہ کوئی شکاری بظاہر ان کا شکار بن کر خزانہ عصمت لوٹ کر اپنی راہ لیتا ہے۔ اس قسم کے اشتعال انگیز ماحول سے نکلنے والے لڑکے اور لڑکیاں اپنے گھروں اور خاندانوں اور محلوں میں طرح طرح کے پرابلم پیدا کر دیتے ہیں۔ خصوصاً انگریزی لٹریچر (اور اس کا چربہ پیدا کرنے والے اردو لٹریچر) کو پڑھنے کی وجہ سے بڑا رومانٹک اور زندگی اور ماحول کے حقائق سے' ماورا قسم کا ایک نظریۂ حسن' ایک تصور عشق اور ایک معیار ازدواج ان کے ذہنوں میں گھر کر لیتا ہے۔ عام قسموں کے ناولوں اور ڈائجسٹوں کو پڑھنے کی وجہ سے وہ بعض علمی اور ادبی سلوگنوں اور خاص خاص جملوں کو اپنا سرمایہ ایمانیات بنا لیتے ہیں۔ لغت محبت کے خاص الفاظ اور اصطلاحات ان کے تخیلات میں نگینوں کی طرح جڑ جاتے ہیں۔ حساسیت حد سے بڑھ جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے دوسروں

کے ساتھ افہام و تفہیم کرنے اور ٹھنڈے تدبر سے مسائل حل کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ گھر گھر کے نظام وحدت کے بخیے ادھڑنے لگتے ہیں۔ بات اگر حسب منشا نہ بنے تو پھر واحد راستہ خودکشی کا ہے۔ مخلوط تعلیم کے میکدے کے جرعہ نوش طالب علم ہوں یا طالبات' ایسے ایسے غلط رومانوی اقدام کر گزرتے ہیں کہ والدین' بھائی بہنوں اور خاندان بھر کے لیے مصیبت پیدا ہو جاتی ہے۔ لڑکیاں گھروں سے نکل کر گھومنے اور نام نہاد ترقی پسند سوسائٹی میں گھلنے ملنے کی عادی ہو جاتی ہیں۔ وہ یا تو کسی حادثے کا شکار ہوتی ہیں یا رندی و ہوسناکی کے ان اڈوں کی روح بن جاتی ہیں جو مغرب کے تہذیبی سامراج کی طرف سے ہمارے معاشرے کو تحفے میں ملے ہیں۔ اسی طرح جو نوجوان آوارہ نگاہی کے روگ میں مبتلا ہو جاتے ہیں' وہ خاندان اور محلے کی لڑکیوں کے لیے آسیب بن جاتے ہیں۔

مخلوط تعلیم (اور مخلوط معاشرت) کے دور دور تک پھیلے ہوئے بے شمار متفرق اثرات کو ہم یکجا سمیٹ کر دیکھ نہیں سکتے۔ کوئی وقوعہ ہوتا ہے تو اسے مجرد ایک یونٹ کی حیثیت سے لیتے ہیں کہ یہ تو بس ایک اتفاقی حادثہ تھا جو ہو گیا۔

مخلوط تعلیم کے اداروں میں روزانہ چند گھنٹوں تک دونوں صنفوں کے گروہوں کا خلط ملط رہنا' ایک غیر ختم اعصابی تناؤ (Tension) کا باعث بنتا ہے' اور اس طرح کا مسلسل اثر انداز ہونے والا اعصابی تناؤ ذہنی' جسمانی' نفسیاتی اور اخلاقی لحاظ سے بہت مضر اثرات رکھتا ہے۔ ان اثرات کا الگ الگ تجزیہ کر کے ماپنا تو ممکن نہیں' البتہ مخلوط تعلیم سے گزری ہوئی نئی نسلوں کے مجموعی کردار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور یہ اندازہ کسی طرح بھی امید افزا نہیں ہے۔

ہمارے مغرب زدہ اور ترقی پسند خاندان جو اپنی اولادوں کو مخلوط تعلیم کے اسٹیج پر پہنچا کر ایک فاسد ماحول پیدا کرنے میں ممد ہو رہے ہیں' ان کو کیا پروا معاشرے کے غریب گھرانوں کی جن کی شرافت کیش اور پردہ پسند بیویوں اور بیٹیوں کے لیے ہر طرف ایک سیال آگ پھیلتی جا رہی ہے۔ ان کا گھروں سے بہ مجبوری باہر نکلنا تو درکنار رہا' خود گھروں کے اندر حفظ ناموس سنگین آزمائش بن گیا ہے۔

بھارتی ماہرین تعلیم کا نقطۂ نظر

مناسب ہو گا کہ یہاں ہم بھارتی ماہرین تعلیم کے نقطہ نظر سے بھی خواتین پر مخلوط تعلیم

اور مردانہ تعلیم کے اثرات کا جائزہ لیں۔

ہندوستان کے یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن نے رادھا کرشن کی صدارت میں جو رپورٹ[1] مرتب کی تھی اس میں سے دو ایک حوالے ملاحظہ ہوں۔

- ''عورتوں کی موجودہ تعلیم ان کی اصل زندگی سے سرے سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ یہ صرف ضیاع کی صورت ہی نہیں بلکہ ضرر رساں بھی ہے اور نا اہلیت پیدا کرنے کا باعث بھی۔''
- ''عورتوں کی تعلیم کا موجودہ نظام جو درحقیقت مردوں کی ضروریات کے لحاظ سے تشکیل دیا گیا ہے خواتین میں روزمرہ زندگی کے عملی مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی قابلیت وصلاحیت پیدا نہیں کرتا۔''
- ''نرسنگ اور ہوم اکنامکس کی تعلیم کو وہ ہتک سمجھتی ہیں۔ اور سائنس کے عہدوں میں مقابلہ کی خواہاں ہوتی ہیں۔''
- ایک ماہر تعلیم خاتون کی رائے تھی کہ انگلستان اور جاپان کے مخلوط اداروں کے تفصیلی مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ ان اداروں میں نہ مناسب توجہ دی جاتی ہے اور نہ خواتین کے لیے سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔

گویا ہمارے پڑوس کی سیکولر اسٹیٹ نے بغیر کسی مذہبی بنیاد کے خالص دنیاوی نقطۂ نظر سے مروجہ نظام تعلیم کو خواتین کے حق میں مضر پایا ہے۔

ایک اور حوالہ مغربی لٹریچر سے اخذ کردہ بھی ملاحظہ ہو۔

انسائیکلو پیڈیا آف سوشل سائنسز کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ ''یونیورسٹیوں میں کلیات کے شعبہ ہائے علوم کے چیرمینوں کو ایک مستقل قضیہ درپیش ہے کہ طلبہ و طالبات ایک دوسرے میں اتنی دلچسپی رکھتے ہیں کہ پڑھائی پر توجہ نہیں دے سکتے۔''[2]

یہ ہے کیس مخلوط تعلیم کے خلاف جسے ہم نے چار نکات میں بیان کیا ہے۔ اب ذرا عقلی انداز سے سوچیے کہ یہ ساری اقوام کے لیے اور خصوصاً ہم مسلمانوں کے لیے کتنا ضرر رساں ہے۔ اس کے باوجود اگر نام نہاد ماڈرن طبقہ کے لوگ اپنا ووٹ مخلوط تعلیم کے حق میں ہی دیں

---

[1] مخلوط تعلیم۔ احمد انس ۳۸ تا ۴۱۔

[2] پردہ ـــــ سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ ص ۱۰۱

تو سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ یا تو وہ مغربی نظریات اور اداروں کے حق میں اندھا تعصب رکھتے ہیں یا وہ ان سے شدید حد تک سحر زدہ ہیں۔

اسلام کا دیانتدارانہ اتباع

یہ مقصد اتنا اہم اور بنیادی ہے کہ صحیح ترتیب کے لحاظ سے اسے سب سے پہلے لانا چاہیے تھا مگر بعض وجوہ سے ہم نے اس مثبت مقصد کو مؤخر رکھا ہے اور اب یہ جہاں بھی مذکور ہے اس کی اولیت و مقصدیت اس کے ساتھ ہے۔

سیدھی سی بات ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور تاریخی احوال سے گزرتے ہوئے ہم خواہ کیسی بھی فکری اور عملی کوتاہیوں میں جا پڑے ہوں آج بھی ہمارے لیے سرچشمۂ ہدایت اسلام ہے۔ دیانتداری کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ہر معاملہ میں اسلام کے مقرر کردہ اصول و حدود کو معیار فیصلہ قرار دیں اور سرسری معلومات کو لے کر تاویلاتی ہیر پھیر سے انحراف کی راہیں نکالنے کے بجائے دین برحق کے تقاضوں کو بہترین مفہوم کے ساتھ عملی زندگی کا حصہ بنائیں۔ حتیٰ کہ صحیح ایمان یہ ہے کہ بعض احکام و حدود اگر بظاہر ہماری طبائع کو (جو اختلال زدہ ہیں) خوش آئند نہ معلوم ہوں تو بھی انہیں سر آنکھوں پر رکھیں۔

اسلام کے معاشرتی ضابطوں کا اگر ٹھنڈے دل اور گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ فلاحِ انسانیت کے اس نظام میں نسائیت کے مقام احترام' اس کے جوہر ناموس اور خواتین کے ذہن و کردار کی پاکیزگی کے تحفظ کا مکمل اور موثر انتظام کیا گیا ہے۔

اس تحفظ کے لیے قرآن و حدیث میں صریح و بدیہی طور پر پردہ داری کے احکام دیے گئے ہیں۔ خواتین کے لیے غیر محرموں (محرموں کی فہرست مقرر کر دی گئی) کے سامنے نمائش زینت و آرائش کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ بات کرنے میں لوچ اور ناز و ادا کا طریقہ اختیار کرنے سے روکا گیا ہے۔ اور صنفین کے اختلاط عام کے راستے بند کیے گئے ہیں۔

قرآن میں جو آیات خواتین' پردے یا نظام معاشرت سے متعلق ہیں ان کو کوئی بھی معقول آدمی سامنے رکھ کر خود دیکھ سکتا ہے کہ قانونی و اخلاقی احکام جس طرح بیان ہوئے ہیں ان کے اگر کم سے کم تقاضوں کو بھی سامنے رکھا جائے تو مغربی تہذیب کی مخلوط معاشرت (اور مخلوط تعلیم) کو کسی طرح بھی حریم اسلام میں داخل نہیں کیا جا سکتا۔

قرآنی احکام کی عملی تفسیر و تشریح کی حیثیت سے نبی اکرم ﷺ کے ثابت شدہ اسوہ کو

دیکھئے تو یہ حقائق سامنے آتے ہیں کہ حضورؐ نے عورتوں کے لیے تعلیم و وعظ کا ایک الگ انتظام کیا۔ نمازوں میں ان کی صفیں الگ رکھیں۔ مسجد سے نکلنے کا راستہ الگ مقرر فرمایا۔ عیدین میں ان کی نشست کا علیحدہ بندوبست کیا۔ زندگی کی روزمرہ تقریبوں اور مجالس میں مخلوطیت کو سختی سے روکا۔ مردوں سے بیعت لینے کے طریقے کے بخلاف بیعت کرنے والی کسی عورت کے ہاتھ کو کبھی مس نہیں کیا۔ انہیں بیرون خانہ کی بھاری سرگرمیوں (مثلاً جہاد وغیرہ)[1] سے مستثنیٰ کر کے بشارت دی کہ وہ اپنی مخصوص نسوانی ذمہ داریوں کو حسن و خوبی سے ادا کرتے ہوئی ویسی ہی جزا پائیں گی جیسی مجاہدین اور شہدا کو ملتی ہے۔ انہیں سیاسی تگ و دو[2] سے الگ رہ کر گھروں کے ...ست کو سنبھالنے اور نئی نسلوں کی برداشت و پرداخت کرنے میں انہماک کا راستہ دکھایا۔ اور ...تصادی ترقی کے لیے گھریلو صنعت کی طرف توجہ دلائی۔

مقصد یہ تھا کہ بیرون خانہ کے ہنگامے جو کچھ بھی ہوں۔ تعمیر انسانیت کے ان بنیادی ...ں کا کام متاثر نہ ہو۔ جنہیں گھر اور خاندان کہا جاتا ہے۔ اور جن کا انچارج خواتین کو بنایا ...ہے۔ اسلامی ریاست اور معاشرے کی وہ تمام افرادی قوت (Man - Power) جو ...یادت کے مناصب کو سنبھالتی ہے' جو تعلیم اور انصاف کے اداروں کو چلاتی ہے' جو اقتصادی ...تی کے لیے عمومی جدوجہد کرتی ہے' جو جہاد کے محاذ پر قربانیاں دیتی ہے۔ اس کی قوت و صحت کا دارومدار اس کی صحیح ذہنی' اخلاقی اور تہذیبی نشوونما پر ہے۔ یہی وہ بڑا کام ہے جس کے لیے خواتین کی خدمات مختص کی گئی ہیں۔ اگر خواتین اس ذمہ داری سے کنی کترانے لگیں تو ناقص افرادی قوت تیار ہوگی۔ ناقص افرادی قوت کے بل پر کوئی دوسرا نظام تو شاید چلتا رہے' اسلامی نظام کبھی نہیں چل سکتا۔ بلکہ آج عالم انسانی میں جنگ' جرم اور جبریت کی جو فضا بن گئی ہے اور

---

[1] اسماء بنت یزید خواتین کا ایک وفد لے کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اور سب کی طرف سے مردوں کی بیرون خانہ ذمہ داریوں کا ذکر کر کے عرض کیا ہم خواتین آخر کیوں ثواب کے ایسے کاموں سے محروم رکھی گئی ہیں۔ حضور نے وضاحت کی کہ تمہارے لیے گھریلو ذمہ داریوں پر ویسا ہی ثواب ہے۔ اور ایمان و اطاعت کا کمال یہ تھا کہ خواتین نے بے چون و چرا تسلیم کر لیا۔ "پاکستانی عورت دوراہے پر" از مولانا امین احسن اصلاحی۔

[2] جنگ جمل کے خاتمے پر حضرت علیؓ نے جناب عائشہ صدیقہؓ سے یہی کہا کہ آپ کا یہ کام نہ تھا۔ آپ کو گھر میں بیٹھنا چاہیے تھا۔ اور حضرت عائشہ نے یہ بات تسلیم کر لی۔

دولت اور خواہش کے بتوں کی جیسی پرستش ہو رہی ہے' یہ سب کچھ نتیجہ ہے اس کوتاہی کا کہ آج جو مرد عالمی قوتوں کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہیں انہیں گھر میں بچپن کے مقدس ادارے کی محبت بھری فضا میں صحیح اور بھرپور تربیت نہیں ملی۔

ہماری پچھلی طویل تاریخ میں پابندیٔ پردہ کے ساتھ خواتین نے علوم بھی حاصل کیے' انہوں نے کاروبار بھی چلائے' کتابیں بھی لکھیں' شعر و ادب میں بھی حصہ لیا۔ مگر گھروں کو بحیثیت اسلام کے تہذیبی مراکز تربیت کے اپنی بھرپور توجہ سے محروم نہیں کیا۔ اکا دکا خواتین ایسی بھی ہر دور میں ملتی ہیں جو سیاست' تصوف یا کسی اور دلچسپی کے میدان میں مردانہ حدود تک جا پہنچتی ہیں۔ مگر بحیثیت مجموعی ہمارے معاشرے میں گھر کا ادارہ ہر قسم کے حالات میں محفوظ اور مضبوط رہا۔ یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ کے سقوط' ظالم بادشاہوں کے ظہور' غیر اسلامی طرز سیاست کے نشوونما' فتنوں کے سیلابی عمل کے بحرانی مدوجزر سے گزرتے ہوئے بھی ہمارے گھروں سے علمائے حق' ائمہ ہدیٰ' مجاہدین اور شہداء کی صفیں برابر اٹھ اٹھ کے تاریخ کے میدان میں آتی رہیں۔ بعض قیمتی روایات اور قدروں کے باقی رہنے پر ہم ماضی کے طبقہ اناث کے ممنون ہیں جس نے غیر فطری مساوات مرد وزن کے تصور سے بدمست ہو کر مردانہ مشاغل اختیار کرنے' مردوں سے مسابقت کرنے اور سیر سپاٹوں اور کھلی محفل آرائیوں کی لذت کو اپنے اس عظیم اختصاصی مشن پر قربان کر دیا جو آنحضورؐ اس طبقے کو تفویض کر گئے تھے۔

اور برصغیر کے دور غلامی میں بھی اگر ہمارے اندر ایمان و اخلاق کا کچھ جوہر بچا کھچا موجود رہا تو یہ عطیہ ہے ان قابل صد افتخار خواتین کا جنہوں نے پچھلی دو ڈھائی صدیوں میں گھروں کے تہذیبی محاذوں پر مضبوط کردار کا مظاہرہ کیا۔ وہ کسی لالچ اور کسی شوق کی کشش سے مسحور ہو کر دوسرے مشاغل کی طرف نہیں لپکیں۔ ورنہ وہی حال ہوتا جیسے کسی جنگی ناکے کا سنتری تتلیاں پکڑنے کے لیے دوڑتا پھرے اور پیچھے دشمن چپکے سے آ کر قابض ہو جائے۔ ہماری خواتین اگر فرض میں کوتاہی کرتیں تو کون یہ تصور کر سکتا ہے کہ یہاں تحریک مجاہدین برپا ہوتی اور انقلاب ۱۸۵۷ء نمودار ہوتا۔ اور خلافت کی مہم زوروں پر چلتی' اور حصول آزادی اور قیام پاکستان کے لیے قوم اتنی پرزور تگ و تاز کر سکتی۔

ہماری خواتین کے اس پارٹ کو دیکھ کر بالآخر تہذیب مغرب نے ہمارے گھروں کے آخری اور پچھلے مورچوں میں مداخلت کر کے ان کے نظام کو درہم برہم کرنے کا فیصلہ کیا۔

مردوں کو تو وہ تعلیم کے تیزاب سے گزار کر اور ان کو اقتصادی ترقی کے لالچ اور غریبی کے خوف سے دو چار کر کے دیکھ چکی تھی۔ ان مساعی کو کم نتیجہ خیز پا کر بالآخر سامراجی قوت نے مسلم خاتون کو ہدف بنایا۔ اور اسے آہستہ آہستہ گھر کے دروازے سے باہر نکالا۔ اور پھر تدریجاً عمل سحر کر کے اسے رقص کے سٹیج اور نائیٹ کلب کے فرش پر لا کھڑا کیا' اور اب ہمارے معاشرے کے آخری تہذیبی مورچے جنہیں گھر کہتے ہیں' کمزور ہونا شروع ہو گئے ہیں۔

مخلوط تعلیم کوئی سیدھا سادہ عمل اور معمولی واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے معاشرے کی پوری بنیادیں ہلا دینے کا سامان ہے۔

چاہیے تو یہ تھا کہ پاکستان بنتے ہی ہم اپنے شکستہ محاذ کو از سرنو درست کرتے اور اسلام نے مردوں اور عورتوں میں ڈیوٹیوں کی جو تقسیم کی تھی' اسے بحال کر دیتے۔ لیکن ہمارے اندر سے اٹھ کر ہمارے اوپر کار فرمائی اور کار پردازی کرنے والے طبقوں نے ہمیں بصد فخر تہذیبی شکست کے راستے پر آگے ہی آگے بڑھنے پر مجبور کر دیا۔

دیکھ لیجیے کہ جب سے مخلوط معاشرت کو فروغ ملا ہے ہماری اخلاقی پستی میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ مسرفانہ طریقے پھیل رہے ہیں۔ حلال و حرام کے امتیازات اٹھ رہے ہیں۔ خدا کی محبت اور آخرت کے خوف سے دل خالی ہو رہے ہیں۔ اور مادہ پرستی اور حیوانی نفسانیت رواج پا رہی ہے۔ اور یہ بھی دیکھ لیجے کہ مخلوط تعلیم اور مخلوط معاشرت لازم و ملزوم ہیں۔

اگر پہلے اس معاملہ میں ہم خرابی احوال پر قابو نہیں پا سکے تو اب ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرنا چاہیے بلکہ یہ سمجھ کر کام کرنا چاہیے کہ جیسے پاکستان آج ہی بنا ہے اور ہمیں اسے اسلام کا مطلوبہ پاکستان بنانا ہے۔

اسلام کو قبول کرنے یا مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہر فرد' ہر طبقہ اور ہر صنف خدا اور رسولؐ سے براہ راست معلوم کر لے کہ اس کے فرائض کیا ہیں اور اس کے حقوق کیا ہیں۔ مردوں سے حقوق طلب کرنے اور مردوں کے خلاف عورتوں کی جنگ حقوق کا سرے سے تصور ہی باطل ہے۔ یہاں law giver اور ہادی صرف خدا ہے اور اس کے الہامی قانون کی عملی شرح پیش کرنے والا مستند نمائندہ الٰہی رسول برحق ﷺ ہے۔ جسے اشکال ہو خدا اور رسولؐ کی اتھارٹی کی طرف رجوع کرے اور پوچھے کہ مجھ پر ذمہ داری کیا ہے اور میرے سر فرض کیا ہیں؟ کن پابندیوں میں مجھے کام کرنا ہے؟ میری آزاد مرضی کہاں تک چلے گی؟ اور میری ذاتی

خواہشات و جذبات کا دائرۂ تگ و تاز کیا ہے؟ پھر جو امر و نہی سامنے آئے پوری خوشنودی دل کے ساتھ سر تسلیم خم کرنا چاہیے اور اپنا بھرپور رضا کارانہ اور وفادارانہ جذبۂ طاعت پیش کر دینا چاہیے۔

اور اگر بد قسمتی سے کسی کو خدا اور رسولؐ کی مرضیات پسند نہ آئیں تو اس کے لیے کھلا کھلا راستہ ارتداد کا اور مخفی راستہ نفاق کا ہے۔ اس کا دنیا میں نتیجہ ذلت و خواری اور آخرت میں عذاب و عتاب ہے۔

وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی اور پوری انسانیت کی فلاح کے لیے یکسو ہو کر غلبہ تہذیب اسلامی کے لیے اٹھ کھڑے ہوں' دیانت داری سے اس کے اصولوں کو تسلیم کریں اور آج جو مشغلے اور ادارات اور حقوق و فرائض کی تقسیمیں اسلام کے احکام اور مقاصد کے صریحاً خلاف برسر عمل ہیں' ان کو جرأت مومنانہ سے توڑ کر ان کی تعمیر نو کریں۔ ایسا ہی ایک ادارہ مخلوط تعلیم کا ہے۔ جس کے ساتھ مخلوط معاشرت کا منطقی جوڑ ہے۔ ان بے جوڑ چیزوں کو نہ صرف یہ کہ اسلام ساتھ لے کر چل نہیں سکتا بلکہ مخلوط تعلیم و معاشرت اور اس سے پیدا ہونے والی ذہنیت اور اخلاقی احوال احیائے اسلام کی راہ میں شدید ترین مزاحم قوتیں ہیں۔

تو اے مردانِ حق اندیش و خواتین صفا کیش! اٹھیے اور موجودہ نقشۂ احوال کو بدل ڈالیے تا کہ اسلام کے تقاضے پورے ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ رہے۔

اعلان جنگ۔ تہذیب حاضر کے خلاف

اسلامی نظام کے قیام یا اسلامی تہذیب کے احیا کا عزم مغربی تہذیب کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ مغرب کی ملحدانہ فکر پر قائم ہونے والی مادہ پرستانہ تہذیب جو ہر شعبہ زندگی میں اسلام کے اصول و مقاصد سے ٹکراتی ہے۔ اس نے ''ترقی'' کے خوشنما پردے میں عورت کو نہایت ہی گھٹیا مرتبے پر ڈال دیا ہے اور اس نے دنیا بھر میں ''نسائیت بگاڑ'' ثقافت کا رنگین طوفان برپا کر رکھا ہے۔

مغربی معاشروں میں عورت کی چلت پھرت' حسین چہروں اور رنگین لباسوں کی نمائش اور ان کا مردوں کی نقالی میں طرح طرح کے کام کسی تماشا گر کے کرتبوں کی مانند کر دکھانا'

مقابلہ ہائے حسن اور فیشن پریڈوں میں شریک ہونا' اور دفتروں اور دکانوں سے لے کر نائیٹ کلبوں اور میخانوں تک مردوں میں گھسنا' بہ اول نظر ہماری عورتوں کو بھی خوب دلکش لگتا ہے۔ مگر معاملہ ایسا نہیں کہ نگاہیں صرف سوسائٹی کے گرد پوش تک ہی رہ جائیں ذرا اندر تک دیکھنے کی ضرورت ہے۔

خواتین کے حوالے سے اس تہذیب دوں نہاد کے خلاف ہمارا چارج شیٹ یہ ہے کہ اس نے پردہ وحیا اور عصمت وعفت کے تمام تصورات کو ملیا میٹ کر کے نیز ادارہ خاندان کی بنیادیں ڈھا کر ''آزادی نسواں'' ''ترقی نسواں'' ''حقوق نسواں'' اور ''مساوات مردوزن'' کے خوبصورت عنوانات کے ساتھ مخلوط معاشرت قائم کر کے عورت کو مردوں کے لیے سہل الحصول' ہمہ وقتی ''دوش بدوش'' اور ہرجائی قسم کا شہوانی کھلونا بنا دیا ہے اور بہ اعتبار حقیقت اسے شرف انسانیت سے محروم کر دیا ہے۔ اور پوری اولاد آدم کو جنسی غلاظت کی بیماری میں مبتلا کر دیا ہے۔

جن معاشروں میں حال یہ ہو کہ سیکرٹری اور ٹائپسٹ اور سیلز گرلز اپنے کاروباری مالکوں یا افسروں کی بیویوں کے لیے کھلم کھلا رقیب وحریف بنتی رہتی ہوں' جہاں شادی سے پیشتر لڑکیوں کی اکثریت کا کنوار پن ختم ہو چکتا ہو (اور جو اکا دکا بچ نکلیں انہیں معنوی طور پر ''ملانی'' سمجھا جاتا ہو) جہاں دس دس بارہ بارہ سال کے لڑکے لڑکیاں ڈیٹنگ (Dating) کرتے ہوں اور گھر سے باہر جس کے ساتھ چاہیں رات گزاریں' جہاں مانع حمل دواؤں' آلات اور آپریشنوں اور اسقاط کی اباحت اور سہولتوں کے باوجود حرام اولادوں کی کثیر تعداد سوسائٹی میں پلتی ہو۔ اور بعد میں ان میں سے بعض افراد اہم ذمہ داریوں کے حامل بنتے ہوں۔ جہاں ازدواج بلا نکاح کے ساتھ ساتھ کثرت طلاق کی وجہ سے مناکحتوں کی آئے دن شکست و ریخت ہوتی رہی ہو' جہاں عورت اتنے سستے پن پر آجائے کہ وہ مردوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے حسن آرائی اور لباسوں کے فیشنوں اور میک اپ اور عریانی اور شراب نوشی اور رقص و سرود اور فلمی ایکٹنگ کے مختلف طریقوں میں جان کھپاتی پھرے۔ جہاں شادی کا راستہ نہ پا سکنے والی کثیر التعداد عورتیں اس سطح سے بھی گر کر داشتائیں بننے کے لیے یوں در بہ در گھومیں جیسے کوئی گریجویٹ کلرکی کی نوکری کی درخواست لیے گھومتا ہے' اور جن کی قسمت میں یہ ''سعادت'' بھی نہ آسکے وہ پارکوں اور بازاروں اور ہوٹلوں کے آس پاس ہر آئند وروند سے

یہ پوچھتی پھریں کہ ''ساتھی چاہیے۔''[۱] اور جہاں یہ شہوانیت اتنی بے قابو ہو جائے[۲] کہ باغوں کی روشوں اور پارکوں کے پلاٹوں میں اخفا کے کسی اہتمام کے بغیر حیوانی عمل کے مناظر عام ہو جائیں' جہاں رابطۂ مردوزن کے عام اور سستا ہو جانے کی وجہ سے مردوں میں بھی اور عورتوں میں بھی ہم جنسی کی لعنت اتنا زور پکڑ جائے کہ قانون کو اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے پڑیں۔ جہاں تعلیم گاہوں میں جنسی موضوع بالکل کھلا ہو اور جنسی آزادی کی فضا میں ''تجربات'' کرنا آسان ہو' جہاں امراض خبیثہ بکثرت پھیل چکے ہوں۔ جہاں فحش فلموں' گھٹیا ناولوں' افسانوں اور نظموں میں عورت کے استعمال سے نفع اندوزی کی جاتی ہو۔ جہاں عورت کے عریاں مجسموں اور شرمناک تصویروں کے ذریعے کمائی کی جاتی ہو۔ جہاں اہل کاروبار عورتوں کے حسن و جمال کو لطیف جنسی اکساہٹوں کے ساتھ سمعی و بصری دائروں میں ذریعہ اشتہار بناتے ہوں۔ جہاں مردوں کی عمومی تواضع کے لیے نائیٹ کلبوں اور شراب خانوں اور رقص گاہوں اور آرائش گھروں میں آزاد عورتیں ٹھیک اس مرتبے پر گر جائیں جس پر تاریک دور کی لونڈیاں ہوا کرتی تھیں۔ جہاں عورت کو جرم اور جاسوسی کی سرگرمیوں میں آلہ کار بنایا جاتا ہو۔ جہاں سیاسی اور کاروباری نوعیت کے شبستانوں میں عورت کو ہوسناکی کے دسترخوانوں پر سجایا جاتا ہو —— یہ سب کچھ اتنا بھیانک ہے کہ ان حالات کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے آدمی لرز جاتا ہے۔[۳] جس

---

[۱] کئی عشرے قبل کی ایک رپورٹ ''Prostitution in United States'' میں انکشاف کیا گیا ہے کہ جن عورتوں نے زنا کاری کو مستقل پیشہ بنالیا ہے ان کی تعداد کا کم سے کم اندازہ چار پانچ لاکھ کے درمیان ہے۔ نیز اب یہ کاروبار حد درجہ منظم ہو گیا ہے۔ اس کے لیے بکثرت ''ملاقات خانے'' (assignation houses) اور طلب خانے (call houses) ''شریف'' مردوں اور عورتوں کی تفریح کی خاطر تیار رہتے ہیں۔ ایک شہر میں ایسے اٹھتر اڈے دوسرے میں تینتالیس اور تیسرے میں تینتیس تحقیق میں آئے۔ (بحوالہ ''پردہ''۔ از مولانا مودودی)

[۲] اشاعت میں آنے والے احوال میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جرمنی میں (week end) پر مخلوط پارٹیاں پکنک منانے نکلتی ہیں۔ کھلی جگہ پہنچ کر کھانا ہوتا ہے۔ مشروب کا دور چلتا ہے اور پھر وہیں آس پاس جوڑے ''کاردیگر'' میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

[۳] ایک اور جائزہ بتاتا ہے کہ بیسواؤں (جن میں شوقیہ زانیات بھی شامل ہیں) کو اب کمپنی گرلز' کال گرلز یا سوسائٹی گرلز کہا جاتا ہے' ان سے سارا معاملہ فون پر اس طرح طے ہو جاتا ہے جیسے کسی ڈاکٹر یا وکیل سے۔ (بحوالہ تعمیر انسانیت از پروفیسر حمید صدیقی)

تہذیب کی معاشرت کا یہ نقشہ ہو۔ اس کے ساتھ اسلام یا مسلمان ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ پس ہمیں اس کے خلاف ٹھیک اس طرح اعلان جنگ کرنا چاہیے جیسے اقبالؒ نے ضرب کلیم کے سرورق کا سلوگن لکھا تھا۔

حالات کا یہ بگاڑ فوری طور پر رونما نہیں ہو گیا بلکہ صنعتی انقلاب کے وقت جس درخت خبیث نے محض کونپلیں ہی نکالی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ بڑا ہوا' شاخیں پھیلاتا گیا اور آج اپنے زہریلے کانٹوں اور کسیلے پھلوں کے باوجود' مغربی معاشروں اور حکومتوں کے بس میں نہیں کہ اسے اکھاڑ پھینکیں۔ اسی طرح آج ہمارے ہاں مغربی تہذیب و معاشرت ابتدائی مرحلے میں ہے' اگر اس وقت اس کے مفاسد کا انسداد نہ کیا گیا تو آگے چل کر اس کی اذیت ناکیوں کے باوجود اس سے تعرض نہ کیا جا سکے گا۔

اور مخلوط تعلیمی ادارے مغرب کی اس فاسد تہذیب کے اڈے ہیں۔ اگر ہم اسلام سے وفاداری چاہتے ہیں تو ان اڈوں کو ختم کر دینا ہو گا۔ مخلوط تعلیم کے خاتمے کو تہذیب مغرب کے خلاف جہاد کی راہ میں قدم اول سمجھنا چاہیے۔

ماحصل

ہم نے ان مقاصد کو سامنے رکھ دیا ہے جو ایمانی اور افادی نقطۂ نظر سے مخلوط تعلیم کا طریقہ ترک کر کے خواتین کے لیے تعلیم کا الگ انتظام کرنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ غور کرنے والوں کے لیے یہ مواد فکری تحریک کا مؤثر ذریعہ بھی ہو گا اور صحیح نتیجے تک پہنچنے میں مدد بھی۔

''جامعہ خواتین کیوں؟'' کا جواب ہو چکا۔ اب مسئلے کا دوسرا پہلو زیر گفتگو آتا ہے کہ ''خواتین یونیورسٹی'' کس طرح یعنی وہ کیسے چلے گی؟ اور اس کا تنظیمی اور تدریسی خاکہ کیا ہو گا؟

○

خواتین یونیورسٹی

حصہ دوم —— کس طرح

چند ابتدائی امور

◆ سب سے پہلے یہ ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ جامعہ خواتین قائم کرتے ہی یہ

فیصلہ کر لینا چاہیے کہ اس انقلابی اقدام کے ساتھ اسی ادارے سے اسلامی نظام تعلیم کا نفاذ شروع کر دیا جائے گا۔ جس کے لیے برسوں سے مطالبات اٹھائے جاتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں تعلیم کا مقصد درس گاہ کا ماحول' اساتذہ کا کردار' درسیات کا نظام سب کچھ اسلام کے اصول و مقاصد کے مطابق ہونا چاہیے۔

❷ جامعہ خواتین کو متذکرہ بالا مقاصد کے ساتھ وجود دینے کے لازمی معنی یہ ہیں کہ آئندہ کے لیے مخلوط تعلیم کا سلسلہ اس ملک میں جاری نہیں رہنا چاہیے۔ بالفاظ دیگر ایک یونیورسٹی کے تجربے سے آغاز کر کے ایک تین یا پانچ سالہ منصوبے کے تحت مزید یونیورسٹیاں اور خواتین کے کالج اتنی تعداد میں قائم کر دیے جائیں کہ خواتین مردوں کے کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کی محتاج نہ رہیں۔ یہ صورت مسلم تہذیب کے نقطۂ نظر سے کسی طرح بھی معقول نہیں ہو سکتی کہ خواتین کے لیے جداگانہ تعلیمی ادارات کے ساتھ ساتھ مخلوط تعلیم بھی چلتی رہے۔ ایک مختصر مدت میں خواتین کے لیے اتنی جداگانہ تعلیم گاہیں قائم کر دی جائیں کہ انہیں مخلوط تعلیم کے چکر سے نکالا جا سکے۔ وہ وقت جلد آ جانا چاہیے کہ مخلوط تعلیم یکسر ممنوع ہو اور کوئی طالبہ لڑکوں کے کسی کالج (یا یونیورسٹی) میں داخلہ حاصل نہ کر سکے۔ جس شہر یا علاقے میں خواتین کے لیے جداگانہ یونیورسٹی یا کالج کا انتظام ہو جائے اس میں مخلوط اداروں میں تعلیم پانے والی طالبات کی لازماً منتقلی ہو جانی چاہیے۔

❸ عدم اختلاط صنفین (seperation of sexes) کے اسلامی اصول پر اگر کام کرنا ہو تو پھر تعلیم کے علاوہ دوسرے دائروں میں بھی خواتین کے لیے ضروری ادارات الگ قائم کرنے ہوں گے۔ جہاں کہیں ہسپتال موجود ہیں ان کو توسیع دی جائے اور ہر سرکاری ہسپتال کے زنانہ وارڈ میں صرف لیڈی ڈاکٹروں اور نرسوں کا تقرر کیا جائے۔ عائلی زندگی سے متعلق خواتین کے لیے جداگانہ عدالتیں قائم ہوں جن کے مجسٹریٹ اور وکلاء بھی طبقہ خواتین میں سے ہوں۔ خواتین ڈینٹسٹوں اور آئی سپیشلسٹوں کا انتظام بھی ہونا چاہیے۔ اسی طرح شہروں اور قصبوں میں ان کے لئے علیحدہ لیکچر ہال اور کھیل کے میدان مختص ہوں' جن کے گرد فصیلیں ہوں۔

ان تعمیری کاموں کے ساتھ پہلے ہی قدم پر مخلوط ثقافتی تقریبوں اور نائٹ کلبوں وغیرہ کا

سلسلہ بیک قلم بند کر دینا چاہیے۔ مرد اور عورتیں علیحدہ علیحدہ تقاریب کا اہتمام کریں۔ اور اپنے لیے صاف ستھری مجالس یا تفریحی کلب (جہاں لائبریریوں' کھیلوں اور بحث و نظر کے انتظامات ہوں) بنائیں۔

مخلوط ثقافتی تقاریب اور مخلوط کلبوں اور ہوٹلوں اور پارکوں کی مخلوط تفریحی نشستوں کو ممنوع قرار دینے کے ساتھ ساتھ سرکاری افسروں اور ملازمین (اور ان کی بیگمات اور زیر کفالت افراد) کو ایسی تقاریب و مجالس میں شرکت کرنے اور ان کی مالی یا کسی اور طرح کی مدد کرنے سے روک دیا جائے۔

یہ ایک مختلف جائز صورت ہوگی کہ' مثلاً مردوں کی مجالس میں کوئی لیکچر سننے کے لیے پردے کے اہتمام کے ساتھ خواتین شرکت کریں۔ یا خواتین کے اجتماع میں ضروری احتیاط کے ساتھ کوئی مرد خطاب کرے۔

مخلوط مجالس و تقاریب کو روکنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خواتین کی اپنی سوشل سرگرمیاں بڑھ جائیں گی اور وسیع تر حلقوں کی ایسی خواتین بھی دل چسپی لینے لگیں گی جو مخلوط تقاریب و مجالس سے کنارہ کش رہتی ہیں اور ایسی سرگرمیوں میں جس طرح کے مفاسد ابھرتے ہیں ان کو سخت ناپسند کرتی ہیں۔ اپنے دائرے میں خواتین کی سوشل سرگرمیوں کے بڑھنے' اداروں میں خواتین کی زیادہ تعداد کے دل چسپی لینے سے ''ترقی نسواں'' کا کام بہتر طور سے انجام پائے گا۔ نیز اس تبدیلی کے نتیجے میں جو مختصر سا مخالف پردہ' اباحت پسند اور مغرب زدہ عنصر خواتین کی نمائندگی اور قیادت سنبھالے ہوئے ہے' اور ان کی مجالس و سرگرمیوں پر حاوی رہتا ہے' اس کی اجارہ داری ختم ہو جائے گی۔ غریب عوام میں سے اور محبِّ دین حلقوں میں سے نئی خواتین اور نوجوان لڑکیاں آگے بڑھیں گی۔ اور موجودہ غلط رو تحریک نسواں کا سیکولر رنگ کٹ جائے گا۔ بڑے گھرانوں اور عہدوں اور سرمائے اور لباس اور آرائش کے زور سے جس گروہ نے مغربی معاشرت کی دھاک بٹھا رکھی ہے اور جو ساری قوم کو زبردستی دھکیل کر مخالف اسلام تہذیبی سامراج کے پھندوں میں جا پھنسانا چاہتا ہے وہ قیادت و نمائندگی خواتین کی اس اجارہ داری سے محروم ہو جائے گا جو سرکاری تائید و حمایت سے قائم ہو کر مضبوط تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

مخلوط ثقافتی اور سوشل سرگرمیوں میں فضا تفریحی دائروں میں تو شدید طور پر جنسیت زدہ ہوتی ہی ہے۔ نسبتاً سنجیدہ دکھائی دینے والی حرکات میں بھی وہ کچھ نہ کچھ خلل انداز ہوتی ہے۔

چلے ہیں ہلال احمر کے لیے چندہ لینے اور ساتھ ہی شوخ و شنگ لباس و آرائش کا مظاہرہ بھی ہے۔ لگے ہیں خدمت خلق کے کسی کام میں' اور ساتھ ہی ناز و ادا اور آوارہ نگاہی کے کرشمے بھی ہیں۔ کر رہے ہیں مصیبت زدوں میں تقسیم پارچات اور فوٹو گرافروں کو حکم ہے کہ وہ ساتھ ہی تصاویر لیں۔

درحقیقت مخلوط سرگرمیاں جو کچھ بھی افادیت رکھتی ہوں' ان میں تخریبی عوامل موجود رہتے ہیں۔ پس اب یہ سلسلہ ختم ہو جانا چاہیے۔

ایک اصولی بات

نظریات و معتقدات کے تحت جب کسی معاشرے میں کوئی انقلابی قسم کا قدم اٹھایا جا رہا ہو تو اس کی کامیابی کا انحصار دوسری باتوں کے علاوہ سب سے پہلے اس اصولی بات پر ہوتا ہے کہ اس کے ہونے نہ ہونے کا فیصلہ کرنے والے' اس کا خاکہ بنانے والے' اس کی تفصیلات طے کرنے والے ایمانی لحاظ سے یکسو اور مضبوط ہوں۔

ہمارے یہاں جامعہ خواتین کے قیام یا مخلوط تعلیم کے ترک کا فیصلہ کسی معمولی تبدیلی کی نشاندہی نہیں کرتا۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں' سیکولرازم کے طلسم کو توڑنے اور مغرب کے تہذیبی سامراج کے خلاف جنگ چھیڑنے کا اقدام ہے۔ دانشوروں اور سیاست کاروں اور انتظامیہ کے کارپردازوں میں سے ایک بڑی تعداد اس تذکرے کے چھڑتے ہی پیچ و تاب کھا رہی ہے۔ ایک عنصر ایسا ہے جو فن منافقت میں ایسی مہارت رکھتا ہے کہ ایک ناپسندیدہ پروگرام کے حق میں قصیدہ خوانیاں کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے' پروگرام کی ذمہ داریوں میں بڑی دلچسپی سے شریک ہوتا ہے اور پھر اندر ہی اندر اسے ناکام کرنے کی تدابیر پر ایسی خوبصورتی سے عمل کرتا ہے کہ پروگرام کے پرجوش علمبردار بھی سجدہ سہو کر لیتے ہیں۔

جامعہ خواتین کے قیام کے سلسلے میں اصل مسئلہ یہی ہے کہ آیا ہم ایسے دس پانچ ذہین اور فعال افراد کو اکٹھا کر سکتے ہیں جو دیانتداری سے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ہمیں کوئی امید افزاء نقشہ بنا کے دے سکیں' ایسے افراد جن کی مومنانہ ذہنیت کا انعکاس پہلے سے ہو رہا ہو' جن کے ہاتھوں اسلامی مقاصد کے لیے ماضی میں کچھ کام ہو چکے ہوں' جن کے حق میں یہ اعتماد عام پایا جاتا ہو کہ یہ لوگ اگر ہماری تقدیر بنانے کے لیے آگے آئیں تو کچھ اچھے نتائج

پلے پڑیں گے۔

انقلابی کاموں کے لیے محض ٹیکنیکل مہارتوں پر دارومدار نہیں کیا جا سکتا۔ ٹیکنیکل اور فنی لوگ اپنے ایک خاص طرز فکر کے قیدی ہوتے ہیں۔ اور اسی طرز فکر کو مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ انقلابی کاموں میں ایمانی شعور کے ساتھ تخلیقی فعالیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایمانی شعور سے آراستہ لوگ اگر زمام کار ہاتھ میں لے کر ٹیکنیکل افراد سے اپنے معینہ خطوط کار پر مدد لیں تو کام چل سکتا ہے۔

اگلے مرحلے کے لیے یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا جامعہ خواتین کے لیے ہمارے پاس وائس چانسلر اور لیکچرر اور پروفیسر اور پرنسپل بننے کے لیے اور درسیات مرتب کرنے کے لیے ایسی خواتین مناسب تعداد میں ہیں جو علمی قابلیت اور تدریسی و انتظامی تجربے کے ساتھ ساتھ ایک سچے مسلمان کی ذہنیت سے مالا مال ہوں اور جو خود احیائے اسلام کا جذبہ رکھتی ہوں۔ اور جنہیں مخلوط تعلیم اور اس طرز تعلیم کو ہمارے سر منڈھنے والی مخالف اسلام تہذیب ناپسند ہو۔ اس معاشرے کا تعلیم یافتہ خصوصاً دانشوروں اور فنی ماہرین کا طبقہ ایسا پچرنگا ہے کہ بیک نظر کام کے آدمیوں کو پہنچانا مشکل ہے۔ خاص طور سے اسلام گریز عناصر نے ایسے ایسے خول اپنے اوپر چڑھا رکھے ہیں اور ایسے مصنوعی چہرے سجا رکھے ہیں اور پھر وقت وقت کی بات وہ ایسے شاندار انداز میں کرتے ہیں کہ یوں لگتا ہے کہ جیسے اسلام کے بہترین جان نثار فریفتگان سے تعارف ہو رہا ہے۔ ان پچرنگے عناصر میں مختلف اقسام کے لوگوں کو ان کے انداز قد سے صرف وہ قوتیں ٹھیک طرح پہچانتی ہیں جو برسوں سے کھرے انسانوں کی تلاش کا کام کر رہی ہیں۔ اور تجربات کی بنا پر جن کی نگاہیں ان مسلمانان عظیم کو پہچانتی ہیں جو دراصل مخالف اسلام ہیں۔

اسلام کی راہ پر کوئی ایک انقلابی قدم اٹھانے میں بھی وہ سارا عنصر بے کار ہے جس میں کوئی الحاد پسند ہے' کوئی سیکولر مائینڈڈ (secular minded) ہے' کوئی اشتراکیت زدہ ہے' کوئی مغرب پرست ہے اور کوئی بندہ مفاد —— ان اوصاف کی کچھ بھی جھلک کسی میں پائی جاتی ہو تو اسے جامعہ خواتین یا کسی دوسرے اسلامی پروگرام میں حصہ لینے کے لیے پاس بھی نہیں پھٹکنے دینا چاہیے۔ خاص طور سے مرحلہ آغاز میں یہ احتیاط اشد ضروری ہے۔ جب کام ہو جائے ~~بعد~~ گاڑی چل جائے تو پھر ان کی خطرناکی کم تر درجے میں ہوگی۔ اس اصولی بات کو

اگر ہم پورا نہ کر سکے تو بمشکل ہی یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ جامعہ خواتین کا یا کوئی دوسرا خواب جامہ عمل پہن سکے گا۔ بلکہ خطرہ تو یہاں تک ہے کہ یہ ماہرین و دانشور جامعہ خواتین کو ایسے خطوط پر استوار کرا دیں کہ کل اس قدم کو واپس لینا پڑ جائے۔

پس کام اور کام کی اسکیم یا پروگرام سے پہلے موزوں آدمیوں کی ضرورت ہے۔

نصابی مضامین کی ترتیب و تدوین نو

جامعہ خواتین[1] کا بڑا مسئلہ نصابی مضامین کی ترتیب اور اس کے بعد تدوین نو کا ہے۔ نئی درسی کتب کی تیاری کے لیے دو چار سال کا زمانہ چاہیے۔ پہلے مفصل نصابی خاکہ بنے پھر اس کے مطابق کتابیں لکھی جائیں' ان کتابوں میں سے مناسب کو منظوری حاصل ہو۔ اس لیے ضروری کام کا لائحہ عمل الگ سے تیار ہونا چاہیے۔

میرا خیال یہ ہے کہ فی الوقت جن مضامین کو بھی جامعہ خواتین میں بآسانی شروع کیا جا سکتا ہو' ان سے کام کا آغاز کر دیا جائے۔

مضامین اور فیکلٹیز

مضامین کے حسب ذیل گروپ تو سامنے آتے ہی ہیں۔

---

[1] پیچھے کہی ہوئی بات کو میں پھر دہراتا ہوں کہ اگر اسلامی معاشرت کے اصولی تقاضوں کے تحت جامعہ خواتین کا قیام مطلوب ہے اور ہم خدا کی رضا حاصل کر کے مغرب کے فاسد طرز معاشرت کے نتائج بد سے دنیا اور آخرت میں بچنا چاہتے ہیں تو جامعہ خواتین کے قیام کے متوازی مغربی طرز معاشرت کے مخلوطی مظاہر سے بچنا اشد ضروری ہے۔ حال ہی میں اخباری اعلان ہوا ہے کہ پاکستان کی زنانہ ہاکی ٹیم بھارت میں میچ کھیلنے جائے گی۔ اندازہ کیجئے کتنے برے اثرات ہوں گے اس کے۔ طالبات کی مختلف درس گاہوں میں جو فنکشن ان دنوں ہوئے ہیں ان کی رونق افزائی مردوں ہی کے ذریعے کی گئی۔ ٹیلی وژن پر دوپٹے والی پابندی کے باوجود نہ صرف اس پابندی کی خلاف ورزیاں ہو رہی ہیں' بلکہ اس حد سے بہت آگے بڑھ کر مغربی آرٹ اور ثقافت کے تقاضے پورے کیے جا رہے ہیں۔ دیواری اور اخباری اشتہارات میں عورت کا جس طرح استعمال کیا جا رہا ہے وہ ایک ایسے تضاد کا آئینہ دار ہے جو اگر بڑھتا گیا تو اسلام کے حق میں ہونے والے اقدامات کی برکات پر برا اثر ڈالے گا۔

۱۔فلسفہ گروپ

الٰہیات' نفسیات' فلسفہ اخلاق ۔فلسفہ تعلیم (تعلیمی نفسیات)۔فلسفہ تمدن و سیاست (ہجوی نفسیات)' فلسفۂ جرم وسزا وغیرہ۔

۲۔سائنس گروپ

فزکس ۔ کیمسٹری ۔ فزیالوجی ۔بیالوجی۔ جیالوجی ۔ پٹیرو کمسٹری۔ شماریات ۔ ریاضی ۔جوہری توانائی۔جغرافیہ (طبعی واقتصادی) وغیرہ۔

۳۔انسانیات

تاریخ' تاریخ اسلام' تاریخ عالم اسلام (موجودہ ـــــ مغربی امپیریلزم کے ظہور سے اب تک)۔تاریخ تحریکات اسلامی ۔برصغیر کی تاریخ۔تاریخ پاکستان۔
سوشیالوجی ۔اقتصادیات ۔پولٹیکل سائنس ۔قانون ۔تعلیم وتدریس۔

۴۔لسانیات

اردو' پنجابی' سندھی' بلوچی ۔
انگریزی' فرانسیسی' جرمن' روسی' چینی وغیرہ
ہندی' سنسکرت' بنگلہ' تامل۔سنہالی وغیرہ
عربی' فارسی' ترکی' سواحلی' وغیرہ۔

۵۔اسلامیات

تفسیر' حدیث' فقہ' تاریخ اسلام اور تاریخ امت محمدیہ (دور نبوت ۔ اور خلافت ادوار مابعد) اسلام اور دوسرے مذاہب کا تقابلی مطالعہ ۔جدید مادی تحریکات کا مطالعہ ۔ ماضی اور حال کی اسلامی تحریکات کا مطالعہ۔
اسلامی نقطہ نظر سے تہذیب جدید کا ناقدانہ مطالعہ۔

۶۔اسلامی حکمت حیات

انتہائی لازمی اور بنیادی مضمون بہ عنوان اسلامی حکمت حیات) Islamic Wisdom

(of Life) یہ مضمون تعلیم کے ابتدائی درجے سے شروع ہو کر اوپر تک جائے گا اور تمام علوم و فنون کے ساتھ یہ انتہائی لازمی ہو گا۔ اس مضمون کا مقصد طلبہ و طالبات کے ذہن و کردار کو اسلام سے ہم آہنگ کرنا ہے۔

اس مضمون میں اسلام کے بنیادی طرز فکر' عقائد' عبادات' اخلاقیات اور حدود حلال و حرام کے علاوہ اسلامی سیاست' اسلامی معاشرت اور اسلامی معیشت کے پورے خاکے بیان ہوں گے۔ تفسیر' حدیث' فقہ اور کلام وغیرہ علوم کے نشوونما پر معلومات دی جائیں گی۔ ملت اسلامیہ کی سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ علوم و افکار کی تاریخ اور فرقہ بندی کا نشوونما اور ہیئت حاکمہ میں پیدا ہونے والے تغیرات طلبہ اور طالبات کے سامنے لائے جائیں گے۔ ماضی اور حال میں نمودار ہونے والی احیائے اسلام کی تحریکات کو پیش کیا جائے گا۔ موجودہ دنیا میں غالب قوتوں اور جدید تہذیب اور اس کی پیدا کردہ سیاسی و معاشی تحریکات کے مقابلے میں اسلام کی دعوت کو ابھارنے اور تحریکی انداز پر کام کرنے کے لیے رہنمائی دی جائے گی۔ ملت اسلامیہ کی اہم تاریخی شخصیتوں اور ان کے کارناموں کا بیان ہو گا اور دور حاضر میں عالم اسلام کی ممتاز شخصیتوں کا تعارف کرایا جائے گا۔ اہم اداروں اور کتابوں پر نظر ڈالی جائے گی۔

اس مضمون کا دوسرا جزو پاکستان اسٹڈیز یا مطالعہ پاکستان ہو گا جو پہلے سے رائج ہے۔

اس مضمون کا تیسرا جزو خواتین کے لیے خاص طور پر مرتب کرنا ہو گا۔ اس جزو میں خواتین کے مقام و منصب اور حقوق و فرائض پیش کیے جائیں گے۔ دائرہ زوجیت اور فریضہ امومت کے متعلق اسلامی حکمت اور اس کے ساتھ احکام مذکور ہوں گے۔ تاریخ اسلام میں قرون اولیٰ سے اب تک خواتین کے ایمانی و اخلاقی اور علمی و فکری اور تعلیمی و تصنیفی کارنامے پیش کیے جائیں گے۔ نیز مغرب کی تحریک آزادی نسواں اور ترقی نسواں اور مساوات مرد و زن کے نظریے کا ناقدانہ مطالعہ کیا جائے گا۔ اسی کے ساتھ پردے کے موضوع پر عقلی تجربات وشواہد کی روشنی میں دینی احکام کی حکمت و مصلحت کو اجاگر کیا جائے گا۔[1]

باقی تمام مضامین کی نئی درسیات تیار ہونے کے وقفے تک یوں کام چلایا جا سکتا ہے کہ مضمون کے ساتھ ایک مختصر سا اضافی کورس شامل کر دیا جائے جو حسب ذیل اجزاء پر مشتمل

---

[1] اس ایک کتاب کو پورے نظام پر از اول تا آخر پھیلائے ہوئے سلیبس کے مطابق جلد مرتب کرا لینا ہو گا۔

ہو۔

❶ اس مضمون کے متعلق قرآن اور حدیث کی رہنمائی۔

❷ اس خاص دائرہ علم میں مسلمانوں کا کیا ہوا پچھلا کام' اور موجودہ دور میں ہونے والی پیشقدمی۔

❸ اس مضمون میں لادین مادہ پرستانہ تہذیب کے شامل شدہ نظریات و تصورات پر تنقیدی بحث۔

یہ ضرورتیں اردو' انگریزی اور عربی میں اب تک کے شائع شدہ جدید لٹریچر (کتب اور مقالات و مضامین) سے پوری ہو سکتی ہیں۔ چند مقالات یا اقتباسات کو بطور مجموعہ مرتب کرایا جا سکتا ہے۔

ایسے اضافی کورسز میں سے بھی امتحانی سوالات دیے جائیں جو کم از کم ۲۵ فیصد نمبروں کے ہوں۔ اضافی کورسز (یعنی اسلامی حصہ اور فاسد مغربی تہذیب کے متعلق تنقیدی حصہ) سے متعلق پرچے یا سوالات میں پاس ہونے کے نمبر لیے بغیر کسی کو کامیاب نہ قرار دیا جائے۔

کچھ کام مروجہ کتب کے ساتھ مقدمے اور ان کے مباحث پر جا بجا نوٹس لکھوا کر بھی لیا جا سکتا ہے۔ دوسرا ضروری کام عبوری وقفے کے لیے یہ ہے کہ ہر مضمون سے متعلق ٹیچرز گائیڈ بکس تیار کی جائیں۔ جن میں واضح کر دیا جائے کہ کسی مضمون کو پڑھاتے ہوئے کیا تبدیلی مطلوب ہے اور کیسا ذہن متعلمین میں تیار کرنا ہے نیز اہم اور ضروری مواد بھی گائیڈ بکس میں شامل کیا جائے۔

مضامین کے لحاظ سے گروپس

اسلامی حکمت حیات + پاکستان اسٹڈیز + مسلم خاتون کا منصب' اول درجے کا لازمی مضمون ہو گا اور ہر گروپ کے لیے ضروری۔

گروپس حسب ذیل ہوں گے۔

۱۔ فلسفہ گروپ۔ کوئی سے دو مضامین فلسفہ+لسانیات۔ یا اسلامیات یا انسانیات میں سے ایک مضمون۔

۲۔ انسانیات گروپ۔ کوئی سے دو مضامین میں سے + لسانیات یا اسلامیات یا فلسفہ

میں سے ایک مضمون۔

۳۔ اسلامیات گروپ۔ کوئی سے دو مضامین اسلامیات میں سے+لسانیات یا انسانیات یا فلسفہ میں سے ایک مضمون۔

۴۔ سائنس گروپ۔ کوئی سے دو مضامین سائنس میں سے+ اسلامیات یا لسانیات یا انسانیات یا فلسفہ میں سے ایک مضمون۔

۵۔ لسانیات گروپ۔ کوئی سی دو زبانیں + اسلامیات یا انسانیات میں سے ایک مضمون۔

یوں آنرز اور پوسٹ گریجوایٹ طالبات کے لیے پانچ گروپ متعین ہو گئے' جن میں سے ہر ایک کو اسلامی حکمت حیات سمیت جملہ چار مضامین لینے ہوں گے۔

نچلے تمام مدارج تعلیم کے لیے اسی کے مطابق نقشہ نصابات تجویز کرنا ہوگا۔

خواتین کے لیے اقتصادی راستہ

تعلیم پا کر نوکریوں کی راہ پر دوڑ لگانے کا جو سلسلہ انگریزی دور سے مردوں میں چلا' وہی اب خواتین میں بھی عام ہو رہا ہے۔ حالانکہ جہاں تعلیم یافتہ مردوں کے لیے کافی روزگار نہ ہو وہاں عورتوں کا بھی اس میدان میں آ پہنچنا ملک کے مجموعی مفاد کے لیے مناسب نہیں ہے۔ کیوں نہ ایسی صنعتی اور پیشہ وارانہ تربیت سے خاتون کو آراستہ کر دیا جائے کہ وہ یونیورسٹی سے نکلتے ہی پورے اعتماد کے ساتھ پردہ داری کو قائم رکھتے ہوئے نہایت منفعت بخش کام شروع کرے۔

اس سلسلے کے مختلف درجوں کے کام بھی میٹرک' ایف اے' بی اے اور ایم اے کے مراحل تک پھیلا دینے چاہیں۔ عام کاموں میں سے گھر میں کمپیوٹر کمپوزنگ کو ذریعہ آمدن بنایا جا سکتا ہے۔ ترجمہ و تصنیف کے کام کیے جا سکتے ہیں۔ ریڈی میڈ گارمنٹس کا کاروبار چلایا جا سکتا ہے۔ ریڈیو اسمبلنگ اور گھڑیوں ٹائم پیسوں کی صنعت کو خواتین مل کر آرگنائز کر سکتی ہیں۔ راستے بہت ہیں مگر تفصیل میں جانا ممکن نہیں۔ البتہ اتنا کہوں گا کہ کسی دکان پر سیلز گرل یا ہوٹل میں ویٹرس یا دفتر میں سیکریٹری بننے سے ہزار درجہ بہتر یہ ہے کہ گھروں میں دوا سازی یا وم اور براسو اور پالش اور سیاہی (خصوصاً پریس کے لیے) بنانے کے کام آزادانہ اور باعزت طریقے

سے کیے جائیں۔

فصیل دار گراؤنڈز میں خواتین کھیلوں میں دلچسپی لیں اور جانوں اور عصمتوں کے تحفظ کے لیے جدید فنون مزاحمت بھی سیکھیں۔ بلکہ گاڑیوں کی ڈرائیونگ اور اسلحہ کا استعمال بھی جاننا چاہیے۔ ہو سکے تو وہ ہوائی جہاز چلانا بھی سیکھ لیں۔

خواتین یونیورسٹی میں صباحی خطابوں کے ذریعے' درس قرآن و حدیث کے ذریعے' اسلامی تقاریب اور تہواروں کا صحیح طریق سے اہتمام کرنے کے ذریعے خاص خاص موضوعات پر ممتاز اسلامی شخصیتوں (خصوصیت سے خواتین) کو لیکچرز کے لیے مدعو کرنے کے ذریعے' اسلامی بنیادوں پر ذہن و کردار کی تعمیر کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

استدراک

لاہور کے ایک روزنامے میں ایک مضمون ''تعلیمی پسماندگی کے اسباب و علل'' نظر سے گزرا۔ ہر چند کے اس مضمون کا روئے سخن میری طرف نہیں اور نہ میری چھیڑی ہوئی گفتگو سے اس میں تعرض کیا گیا ہے۔ مگر یہ فکری پراگندگی پھیلانے کی اس مجموعی مہم کا ایک حصہ ضرور ہے جو اسلام کے مقاصد کی طرف پیش قدمی میں خلل انداز ہوتی چلی آ رہی ہے۔ میں صاحب مضمون کی نیت پر کوئی حملہ نہیں کر سکتا' ممکن ہے کہ وہ بالکل سادہ طبع ہوں اور فضا میں عرصہ سے پھیلائے جانے والے فقروں کو کسی لمبے چوڑے تفکر و تجزیہ کے بغیر استعمال کر رہے ہوں۔ مگر جو کچھ انہوں نے اسلام کے متعلق بہ سلسلہ مخلوط تعلیم فرمایا وہ اس بات کا شاہد ہے کہ انہوں نے قرآن و سنت کے اصل مآخذ سے کوئی استفادہ نہیں کیا ہے۔ وہ غیر مخلوط تعلیم کو عدم توسیع تعلیم کا سبب قرار دیتے ہوئے ایسی باتیں کہ گئے ہیں جن کا تحقیق کی میزان پر کوئی وزن نہیں۔

ملاحظہ ہو:

> ''آخری سبب (تعلیمی پسماندگی کا) جو کہ کم اہم نہیں ہے' وہ ہمارے معاشرے میں عورت کا غیر فطری یا غیر اسلامی مقام ہے۔ ہم اگر دور رسالتمآب ﷺ کے ابتدائی دور اور ترقی کے دور کو دیکھیں تو مرد اور عورت کو ساتھ ساتھ اپنے اپنے فرائض نبھاتے پائیں گے۔ مساجد میں نماز مرد بھی پڑھتے تھے' عورتیں بھی پڑھتی تھیں۔

جدال و قتال میں عورتیں مرد کے شانہ بشانہ ہوتی تھیں۔ مرد اگر تلوار سے جہاد کرتے تھے تو عورتیں مرہم پٹی کرتی تھیں' زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں' اور دیگر ایسے کام سرانجام دیتی تھیں۔"

یااللہ! کیا ان صاحب کو معلوم ہے کہ عورتوں کا مساجد میں جانا خاص قسم کی پابندیوں کے ساتھ تھا' اور ان پر یہ بھی واضح کیا گیا تھا کہ عورتوں کا گھروں میں نماز پڑھنا مسجدوں میں پڑھنے سے افضل ہے اور زیادہ ثواب کا باعث ہے۔ کیا ان صاحب کو معلوم ہے کہ حضرت عمرؓ نے رفقا کے مشورے سے اس رخصت کو بھی محدود تر کر دیا تھا۔ کیا ان صاحب کو معلوم ہے کہ عورتوں کو تعلیم و تلقین فرمانے کے لئے رسولؐ پاک ﷺ نے مردوں سے الگ انتظام کیا تھا؟ کیا یہ صاحب بتا سکتے ہیں کہ کتنے غزوات میں کس تعداد میں خواتین نے شرکت کی؟ ایک آدھ موقع پر (خصوصاً غزوہ اُحد) جبکہ حالات اشد صورت اختیار کر گئے تھے اور مسلم سپاہ کی تعداد کم تھی' اگر دو چار خواتین نے اس طرح کا حصہ لیا تھا تو اس کی بنا پر یہ عمومی دعویٰ کیسے پیدا ہو گیا کہ عورتوں کی کوئی باقاعدہ رجمنٹ یا کور یا صف ہمیشہ میدان جنگ میں جاتی تھی؟ کیا لکھنے والے کو معلوم ہے کہ حضورؐ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر خواتین کا ساتھ جانا ناپسند فرمایا تھا اور پھر ساتھ آ جانے والی چند خواتین کو بر سبیل تنزلی اجازت دے دی؟ اور یہ بھی سامنے رہے کہ قرونِ اولیٰ کی خواتین ایسی نہ تھیں کہ کسی آفت کے موقع پر اگر پردے کی حدود پوری طرح ملحوظ نہ رہ سکی ہوں تو وہ اسے بنیاد بنا کر پھر پورا "فلسفہ دوش بدوش" وضع کر لیتیں اور بعد میں گھروں میں واپس جانے اور پردے کی پابندیاں قبول کرنے سے ہی انکار کر دیتیں۔ سوال یہ بھی ہے کہ اگر کسی ملک کی آبادی کافی ہو اور مرد بہت تعداد میں ہوں' جن میں بے روزگاری و بے کاری بھی موجود ہو' کیا وہاں مرہم پٹی کرنے اور پانی پلانے کی ذمہ داریاں مرد انجام نہیں دے سکتے؟ یہ سب کچھ درکنار' سوال یہ ہے کہ اس قسم کی سرسری باتوں سے یہ نتیجہ کیسے نکل آئے گا کہ مخلوط تعلیم' تقاریب اور مخلوط شاپنگ اور مخلوط کرکٹ (یا ٹینس اور ہاکی وغیرہ) اور مخلوط مباحثے اور مخلوط فوٹو وغیرہ سب جائز ہو گئے۔ بلکہ دوش بدوش اور شانہ بشانہ تقاضے تو دراصل رقص گاہوں میں جا کر پورے ہوتے ہیں۔

یہ صاحب مزید لکھتے ہیں کہ

"اس میں (یعنی مخلوط تعلیم میں) بے شمار معاشرتی خرابیاں ہو سکتی ہیں جیسا کہ ہم

سوچتے ہیں۔لیکن ہمیں قرون اولیٰ کا اسلامی معاشرہ نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔''

واہ' کیا خوبصورت منطق ہے۔یعنی یہ بات تو تسلیم ہے کہ مخلوط تعلیم میں خرابیاں ہیں' اور وہ بھی ''بے شمار'' لیکن ہمیں ان تمام خرابیوں کو اس بنا پر گوارا کرنا چاہیے کہ یہی راہ قرون اولیٰ کے معاشرے نے ہمارے لئے معین کی ہے۔یعنی مخلوط تعلیم کی خرابیوں کا الزام بھی قرون اولیٰ کے اسلامی معاشرے کے سر۔

خیالات کے توازن کی داد تو یہ بات سامنے آنے پر ہی آپ دے سکیں گے کہ مضمون نگار نے مخلوط نظام معاشرت کی یہ پہچان بیان کی ہے کہ ''جو آج مغربی یا ترقی یافتہ اقوام میں جاری و ساری ہے۔'' یعنی اسلامی نظام معاشرت تو ملحدانہ فکری بنیادوں پر کھڑی ہونے والی مادی تہذیب کے علمبرداروں نے ہمارے خدا اور رسول ﷺ کی رہنمائی کے بغیر قائم کر لیا۔ بلکہ تاریخ کی روشنی میں کہنا چاہیے کہ آٹو میٹک طور پر قائم ہو گیا۔ وہاں کسی قرون اولیٰ کی ضرورت نہیں پڑی اور نہ کسی اسلامی معاشرہ سے مثال لینے اور کسی دین اور کسی سنت کا اتباع کرنے کی۔کاش کہ ہمارے ان دوست نے اس مرتبے پر ذرا گہری نظر سے غور کیا ہوتا جو عورت کو مغربی سوسائٹی نے دیا ہے۔

پھر فرماتے ہیں کہ:

''اگر اُس وقت (یعنی قرون اولیٰ میں) مخلوط معاشرتی نظام کو ــــــ رائج رکھ کر مسلمان یا اسلام معاشرتی یا دیگر برائیوں سے بچ سکتا تھا اور دنیا میں امامت کے فرائض انجام دے سکتا تھا' تو آج بھی اس کے ویسے ہی اثرات مل سکتے ہیں۔''

آج کا مسلمان رشوت' بدعنوانی' ظلم و تشدد' ملاوٹ' اسمگلنگ اور دوسری صریح برائیوں میں سے کس کس سے بچ کر چل رہا ہے کہ بس ایک مخلوط تعلیم سے پیدا ہونے والی خرابیوں ہی سے وہ اپنے آپ کو محفوظ رکھ لے گا۔ان صاحب نے یہ نہیں سوچا کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے کردار کی کتنی پختہ تعمیر کی گئی تھی اور اس کے باوجود وہاں پردہ اور حیا کے ضابطے رائج تھے۔ بخلاف اس کے آج کے بے راہ رو معاشرے میں جہاں وہ مومنانہ کردار کمیاب ہے' اگر اسلام کے تحفظاتی احکام اور ضابطے بھی اڑا دیئے جائیں تو کیا حشر ہو گا۔

کیا ہی ژولیدہ فکریاں ہیں اور کیا ہی تضاد نگاریاں ہیں!

جدید ترین ترقی یافتہ (بہ اصطلاح وقت) اقوام کا بھی حال یہ ہے کہ جہاں کہیں جنگ

یا تباہی وارد ہو' وہاں سے پہلے عورتوں کو نکال لیا جاتا ہے' وہاں پھر ''دوش بدوش'' کا فلسفہ کام نہیں دیتا۔ کہیں عورت کو اصل حکومتی قوت نہیں دی جاتی ' محض نمائشی مناصب دے دیئے جاتے ہیں۔ کوئی عورت سپہ سالار جنگ یا ماتحت درجے کی کمانڈر بھی نہیں ہوتی۔ کیونکہ عورتوں کے ساتھ نزاکت طبع اور جذباتیت وحساسیت کی جو خوبیاں اس سے متعلق فطری مقاصد کے لئے رکھی گئی ہیں' وہ بعض مردانہ فرائض کی انجام دہی میں رکاوٹ ثابت ہوئی ہیں۔ ہاں اگر ان خوبیوں کو بالکل غارت کر دیا جائے تو مردانہ عورت نمودار ہو جاتی ہے' مگر وہ عورت کے اصل بنیادی فطری مقاصد کے دائرے سے مسترد ہو جاتی ہے۔ یہ کتنا بڑا ظالمانہ اور فطرت بگاڑ عمل ہے۔

پس نہ اسلام مخلوط معاشرت اور مخلوط تعلیم کا نقیب ہے اور نہ یہ راستہ قوم کی صلاح و فلاح کا ہے۔

بیت الحکمۃ —— جامعہ ہمدرد کا قیام*

حکیم محمد سعید نے جب اول اول اپنے تعلیمی منصوبے کا انکشاف کیا تھا تو اس وقت دل میں سچی مسرت کی ایک کلی پھوٹی تھی۔ ہمدرد کراچی کی طرف سے بیت الحکمت پر معلوماتی دستاویز اور اس کے مندرجات پڑھ کر وہ کلی نسیم دلنواز کے جھونکوں سے رنگ و نکہت بکھیرتا ہوا ایک پھول بن گئی ہے۔

حکیم صاحب اپنے تمام جلوے سمیٹ کر بیت الحکمۃ کی جس دلگداز پھبن میں سامنے آئے ہیں' اسے دیکھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے کہ شخص واحد نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں اور وسیع رابطوں کے بل پر وہ کام کر دکھایا ہے (اگرچہ ابھی مرحلہ ابتدا ہے) جسے آج تک کوئی حکومت و وزارت نہ کر سکی اور جسے بڑے بڑے دانشور اور معاشرے کے مصلح اور رہنما کبھی سوچ بھی نہ سکے۔

ہم پاکستانی مسلمانوں کی بداعمالیوں اور دولت پرستی اور جاہ طلبی اور حرام خوری کا وبال اس شکل میں ظاہر ہوا ہے کہ یہاں بڑے بڑے تعلیمی ادارے یا انسان ساز مراکز ہمارے نہیں ہیں۔ بلکہ ہم کو ہمارے ہاتھوں سے چھین لینے کے لئے شاطران زمانہ نے نہایت پرکشش شکل میں مہیا کر رکھے ہیں۔ دنیا کی بڑی قوتوں کی ایک ہمہ گیر سازش یہ ہے کہ قوم محمد ﷺ سے اس کے عقائد' اس کے اخلاقی اصول و اقدار اور اس کے تہذیبی شعائر اور اس کے قوانین خیر و شر چھین کر ایک ایسی گداگروں کی بھیڑ میں بدل دیا جائے جو دربدر اپنے ایمان و ضمیر کی قاشیں بیچ کر روپے' ڈالر اور پاؤنڈ کی بھیک مانگنے کے لئے اپنے کاسے پھیلاتی پھرے۔ اس کے جوان ہر فتنۂ دوراں اور ہر فسادِ اخلاق کے رتھوں کو کھینچنے کے لئے گدھے اور خچر بن سکیں اور بے چون و چراں چابک بھی کھا سکیں۔

اس ہمہ گیر سازش کے خلاف عالم اسلام جو اکا دکا کام کر سکا ہے' ان میں منصوبے کے

---

* ترجمان القرآن جنوری ۱۹۹۰ء

مطابق ہمدرد یونیورسٹی اوراس کے بیت الحکمۃ کا وجود مجھے بڑا سرمایۂ امید محسوس ہوتا ہے۔

پاکستان میں یہ پہلا ادارہ سر اٹھا رہا ہے جو ہماری نئی نسلوں کو دشمن قوتوں کے لئے سواری کا کام دینے سے انکار کر دے۔ یہ پہلا ادارہ ہوگا جہاں سے مادہ پرستانہ طاغوتی تہذیب کے انسانیت کش مظاہرے کے خلاف علمی بغاوت کا آغاز ہوگا۔

اگرچہ ہمارے سامنے صرف یونیورسٹی کی لائبریری کا نہایت ہی جامع' بے مثال اور امید افزا مراسلہ ہے جو پیش کیا جا رہا ہے۔ مگر میں یہ بات یہاں ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ مجموعی طور پر محمد بن قاسمؒ کے مقام ورود پر جو عظیم ادارہ' ——— سکول' کالج' لائبریری' ہال' کھیل کے لئے اسٹیڈیم وغیرہ' ——— ایستادہ ہو رہا ہے اس کا مقصد اصلی یہ ہے کہ ہمارے خستہ حال اور زوال پذیر اور باہم آویز معاشرے کو موجودہ دلدل سے نکالنے کے لئے ایسے انسان تیار کئے جائیں جو ایمان' علم اور اخلاق سے آراستہ ہوں اور جرات وعزیمت سے اپنے آپ کو قال و حال کی زبان سے مسلم کہہ سکیں۔ ورنہ جو درس گاہیں محض معلومات طالب علموں کی جھولی میں ڈال کر ان کو رخصت کر دیں یا زیادہ کرم کریں تو اغیار کے خلاف اسلام اور خلاف انسانیت نظریات کی مالائیں ان کے گلے میں ڈال کر ذہنی غلامی کے تاج ان کے سروں پر رکھ دیں' ان پر تو ان تمام مفاسد کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو ہمارے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر یہ نیا عظیم ادارہ نظریہ اسلامی والے پاکستان کے لئے اعلیٰ درجے کے انسان تیار کر کے نہیں دیتا تو پھر پتھروں اور اینٹوں کے یہ انبار' سیمنٹ اور سریئے کے یہ ڈھیر جو عظیم الشان عمارتوں میں ڈھل رہے ہیں' ان سے کیا حاصل؟ کیا یہاں ہمیشہ پڑھے لکھے جاہل اور تقلید کیش اور دولت کے پیچھے بھاگنے والے انسان پیدا کئے جاتے رہیں گے۔ حکیم صاحب یقیناً وہ نئے انسان پیدا کرنا چاہیں گے جو اپنے ایمان' اپنے علم اور اپنے اخلاق کے زور سے اس معاشرے کے فتنوں کا زور توڑ یں گے۔

اس اعلیٰ اور پاکیزہ کام میں صرف ایک ہی مشکل ہے۔ بااصول اور بامقصد انسان پیدا کرنے والے ایک بڑے ادارے کے لئے آپ اعلیٰ درجے کے کارکنوں (Teachers) کی ٹیم کہاں سے اور کیسے حاصل کریں گے۔ حکیم صاحب کو اس چناؤ میں ایک تو کڑا معیار مقرر کرنا ہوگا' دوسرے اس کام میں سفارشات کا راستہ بند کرنا ہوگا' اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ کسی سائنس دان یا محقق یا لائبریرین کو مقرر کرتے ہوئے آپ کو صرف یہی جانچ نہیں

کرنی ہوگی کہ اس کی تعلیمی اور تجرباتی کوالیفکیشن کیا ہے' بلکہ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ پچھلے دور کار میں اس کا کردار کیا رہا ہے' اسلام کے متعلق اس کا نقطۂ نظر اور اس کی خدمات کیا ہیں؟ پاکستان کے بارے میں اس کا ریکارڈ کیا ہے؟ ایمان و اخلاق کے لحاظ سے آیا وہ راستی اور دیانت کے ساتھ ادائے فرض کرنے اور حقیقی محنت کرنے کے قابل ہے۔ ان آخری باتوں کی زیادہ سے زیادہ تحقیق اور چھان بین اپنے دوستوں' رجال خاص اور متعلقہ اداروں (بلکہ ہو سکے تو کسی شخص کے خاندان کے دوسرے لوگوں کے بارے میں بھی ٹوہ لگائی جائے کہ کون کیا ہے یا کیا کرتا رہا) سے پوچھا جائے۔

خدا سے دعا ہے کہ جس طرح محمد بن قاسم کی آمد سے کفرزاد ہند کے لئے باب الاسلام کھلا تھا اسی طرح باب الاسلام کے مقام پر قائم ہونے والے ادارے سے وہی نور اور وہی روشنی آج پھر پھیلے۔ آمین۔

ایک نئی یونیورسٹی کا قیام*

(چند تجاویز)

اسلام کے اساسی و اصولی تقاضوں کے تحت موجودہ تعلیمی زنداں کے اندر کس طرح کا تعلیمی ادارہ کس طرز پر کام کرے اور اسے پہلے ہی قدم سے کن چیزوں سے بچنا چاہئے' اس کے تعلیمی اور انتظامی امور کو کس طرح چلایا جائے کہ ٹکراؤ بھی نہ ہو اور ایک پہلو دوسرے کی اہم ضرورتوں کو دبا نہ دے۔ نیز ایسی یونیورسٹی (یا پبلک اسکول) کو کسی خاص شخص' یا گروہ یا فرقے یا دھڑے' یا نظریاتی تعصب کے چکر میں پڑے بغیر چند مقاصد کے لئے سارے پروگرام بنانے چاہئیں۔ مثلاً:

۱۔ اسلام کے وہ اساسی اور کلی تصورات جن کی حیثیت اجماعی ہے اور غیر فرقہ وارانہ نوعیت رکھتے ہیں' ان کی جڑیں دل و دماغ میں مضبوطی سے لگا دی جائیں۔ باقی کام مطالعہ و تحقیق کرتے ہوئے طالب علم آزادی (مگر اساتذہ کی رہبری) سے خود کرے۔

۲۔ کسی جماعت' گروہ دھڑے یا فرقے اور نظریاتی تفکرات کے کسی خاص نہج کی طرف نوجوانوں کو دھکیلا نہ جائے اور نہ ان کو ایسی کسی مخالفت یا تعصب میں ڈالا جائے۔ یہ کام تو پبلک سکول یا یونیورسٹی بنائے بغیر بھی بخوبی ہو رہا ہے۔

۳۔ ان میں اس نوعیت کا ایمانی شعور کام کرے کہ جس سے فکر اور عمل دونوں میں تحریک اور پیش قدمی کا جذبہ پیدا ہو۔

۴۔ ان کو اس بات کا نہایت گہرا احساس دلایا جائے کہ اس وقت لادین تہذیب' ملحدانہ

---

* ایک تعلیم یافتہ نوجوان دوست نے ایک جامعہ (یونیورسٹی) کے قیام کا ارادہ کرتے ہوئے' بلکہ ابتدائی اقدامات کرنے کے بعد' مجھ سے بھی مشورہ لیا کہ یہ کام کس طرح کرنا چاہیے۔ ان کی تجاویز کو دیکھ کر میں نے بھی اپنے خیالات پیش کر دیے۔ جون ۱۹۹۰ء۔

افکار غیر حیا دارانہ معاشرت اور اخلاقی قدروں کو تباہ کرنے والے مختلف نوعیت اور سطحوں کے عوامل کام کر رہے ہیں کہ جن کی پیش قدمی ہمیں بہت پیچھے چھوڑ کر اسلام کے ابھرنے کے لئے راستے بند کر رہی ہے۔ اس خوفناک خاموش اور زیر زمین جنگ کے خلاف سب سے بڑا کام ذہنی اور فکری، تحقیقی اور تخلیقی اور دعوتی و اصلاحی سرگرمیوں کے ذریعے کرنا ہے۔ اور آپ نوجوانوں کو اسی جنگ سے عہدہ برآ ہو کر طاغوتی تسلط سے عالم اسلام کو فکری دائروں سے لے کر سیاسی دائروں تک بچانا ہے۔ یہ درس گاہ آپ (یعنی طلبہ) کو حق وصداقت کا سپاہی بنا کر میدان میں بھیجنا چاہتی ہے۔

۵۔ طلبہ میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ پاکستان میں اس کی داخلی قوتوں نے بھی وہی متذکرہ بالا جنگ جاری کر رکھی ہے۔ لیکن اس میں اپنا فرض ادا کرتے ہوئے یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ یہاں کے حالات کا بگاڑ خواہ کیسا ہی ہو، یہ مقام ہمارا وہ جنگی مرکز (base) ہو گا جہاں سے ہم اپنی قوتیں تیار کر کے میدان میں جھونکیں گے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس خطے کو خرابی احوال سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے (اگرچہ ایک تعلیمی ادارے کی ذمہ داریاں محدود ہیں) اور ہر ایسے فتنہ کی سرکوبی کی سعی کی جائے جو اس میں طاغوت کے غلبہ کا ذریعہ ہو۔

۶۔ ہمیں الحاد اور دین کی علمی، ادبی، صحافی، پروپیگنڈائی اور ڈپلومیٹک کوششوں کی بیخ کنی کے لئے عالم اسلام میں ایک تو اپنے پیغام کو پھیلانا ہے (جنگ مغربی طاغوتی تہذیب کے خلاف) اور دوسرے ان سے اتحاد کو مضبوط کرنے کی مساعی جاری رکھنی ہیں۔ ان مساعی میں ان کے داخلی سیاسی نظاموں کی نوعیت کو حائل نہیں ہونا چاہئے۔

۷۔ مغرب کے خلاف مجرد ایک نفرت ہی پیدا نہیں کرنی ہے، بلکہ یہ دکھانا ہے کہ وہاں کا ایک نادان یا شریر عنصر (متعصب پادری، غیر متبدل مخالفت رکھنے والے مستشرقین اور سامراجی سیاست کاری اور معاشی صیادی کے ماہرین) خاص طور پر حالات پر چھایا ہوا ہے، مگر وہاں حق کی آواز اٹھانے والے بھی ہیں اور حق کو قبول کرنے والے بھی۔ لہٰذا مغرب والوں کے لئے ایک تہ نشین سا جذبہ ہمدردی موجود رہنا چاہئے، اور وہاں کے عام اور اچھے لوگوں کو دعوت دینے کے لئے "وعظ" کے طریقوں سے ہٹ کر دعوت کا کام ایسی صورت میں کرنا چاہئے کہ محبت کا رنگ جھلک رہا ہو۔

۸۔ سائنس کے میدان میں آگے کا کام شروع کرنے میں ہم کو جو وقت لگے گا وہ ظاہر ہے' کیونکہ ہم پیچھے رہ گئے ہیں' مگر ایک کام ہم کو ابتداء ہی سے کرنا چاہیے۔ ہمارے اعلیٰ درجے کے اساتذہ کی رہنمائی میں سائنس کی کھائی ہوئی ٹھوکروں پر ریسرچ کرکے مواد سامنے لانا چاہیے۔

اسی طرح فلسفے کی حماقتوں پر گرفت کرنے کی ضرورت ہے۔ نظریات کی بار بار تبدیلیاں ہیں کہ آج آدم کہیں ٹھک کر کھڑا ہی نہیں ہوسکتا۔ اس وجہ سے اس دور میں تشکیک و توہم اور انتشار کو فروغ حاصل ہے۔

اگر ہماری کوئی یونیورسٹی ایسا اعلیٰ کام سامنے لا سکے تو اس کی کتاب مغرب کے علماء کے حلقۂ مطالعہ میں must کی حیثیت اختیار کرے گی۔

اس طرح مستشرقین[۱] کی غلطیوں پر دلائل و اسناد کے ساتھ گرفت کرکے نہ صرف کوئی اہم چیز اشاعت میں لائی جائے بلکہ کچھ لوگ خاص خاص مستشرقین سے خط و کتابت یا ملاقاتیں کرکے ان کے سامنے ان کی غلطیاں واضح کریں۔ میرا خیال ہے کہ بیشتر لوگ بات مان لیتے ہیں۔

میری ذاتی رائے کے مطابق ایسے اقدام سے پہلے نہ صرف دنیا کی اعلیٰ تعلیم گاہوں کے مقاصد اور مناہج کا مطالعہ کرنا چاہئے' اور نہ صرف بیرونی (بلکہ زیادہ تر اندرونی) اعلیٰ درس گاہوں کے کارپردازوں سے تعلیمی و انتظامی امور کو صحت مندانہ خطوط پر چلانے کے لئے اصول اور ہدایات حاصل کرنی چاہئیں۔ بلکہ اپنے نظریۂ تعلیم (دینی+جدید) کے ساتھ اتفاق رکھنے والوں کی ایک ٹیم کو ساتھ لے کر کئی نشستوں میں اہم امور پر بحث کرنی چاہئے۔ خصوصاً وہ حضرات جو کسی اعلیٰ مرتبہ پر تعلیمی تجربہ عملاً رکھتے ہوں اور مسائل سے براہ راست آگاہ ہوں۔

---

[۱] مستشرقین کی کتب نصابات میں شامل کرتے ہوئے بہت احتیاط کی جائے۔ یہ لوگ اسلام پر لکھتے ہیں تو ان کا قلم سامنے ہوتا ہے مگر آستین میں وہ دشنہ پنہاں رکھتے ہیں مثلاً ڈاکٹر فلپ ہٹی' منٹگمری واٹ وغیرہ کی اسلام پر تحریریں۔

استاد ـــــ معمارِ انسانیت

مجھے ایک خاندان معلمین سے متعلق ہونے کی وجہ سے معلمین کے طبقے سے خصوصی دلچسپی ہے اور میں ''استاذ'' کو سوسائٹی کی موثر ترین تعمیری خدمات انجام دینے والا (بشرطیکہ وہ اپنے منصب کی ذمہ داریوں سے آگاہ ہو) کردار سمجھتا ہوں۔ آج بھی معلمین ہی کے گروہ میں اعلیٰ درجہ کے انسان ملتے ہیں۔ میرے نزدیک نئی قوم اور نئے نظام اور مختلف نظریوں اور تحریکوں کی تاسیس فی الحقیقت درس گاہوں میں کی جاتی ہے۔ اور اگر کسی قوم کو فکری اور ثقافتی تصادم سے سابقہ پڑ جائے تو اس تصادم کا فیصلہ تعلیمی اداروں میں ہی ہوتا ہے ـــــ باقی جو کچھ ہے وہ سیاست ہو' صحافت ہو' ادب ہو' سبھی کچھ دراصل تعلیم کے برگ و بار ہیں آج اگر ہمارے ہاں تضاد اور اضطراب کا دور دورہ ہر شعبہ میں دکھائی دیتا ہے تو اس کا سرچشمہ خود تعلیم کا داخلی تضاد و اضطراب ہے بلکہ اور آگے جائیں تو خود استاد کے ذہن و کردار کے تضاد اور لامقصدیت کا سکہ رواں ہے۔

صحیح معلم وہی ہے جو کسان کی طرح پورے ''حضور قلب'' کے ساتھ اپنے فریضہ کاشت کو انجام دیتا ہے۔ معلم کا کام تعمیر انسانیت ہے۔

استاد کی اولیں ضروری خوبی قابلیت ہے یعنی استاد کی علمی فوقیت کو درس و تدریس کے دوران طلبہ خود محسوس کر لیں۔ قابلیت مروجہ سطح سے بلند تر ہو۔ میرا وسیع تجربہ و مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ قابل معلم خواہ پرائمری کا ہو یا یونیورسٹی کا لوگوں کی محبتوں اور توجہات کا مرکز بن جاتا ہے۔ اور ایسے اساتذہ کے شاگردوں کا ایک مستقل حلقہ ساری عمر ان سے وابستہ رہتا ہے نیز ان کی روشن کردہ قدروں کے چراغ ذہنوں میں جھلملاتے رہتے ہیں۔ اور ان کی شعاعیں مزید آگے پھیلتی رہتی ہیں۔ تعلیم سچی وہی ہے جس کا سلسلہ دل بہ دل اور دماغ بہ دماغ آگے چلتا رہے ـــــ تاحشر!

معلم کی دوسری لازمی خوبی اس کا کردار ہے۔ وہ مضبوط اصول رکھتا ہو' انہیں بار بار

بدلے نہیں' اپنے ذاتی مفاد کی طرف ذرا سا بھی جھکاؤ نہ رکھتا ہو۔ استاد سلسلہ تعلیم میں سوائے نیکی اور قابلیت کے اور کسی بنیاد پر طلبہ کو دوسروں پر فوقیت نہ دے۔ سب کے لئے اپنا فیضان یکساں رکھے۔

تیسری خوبی یہ ہے کہ طلبہ کے ساتھ اس کا رابطہ ترسیل (Communication) بہت مضبوط اور خوشگوار ہو۔ بات کرنے کا انداز' مسائل کی وضاحت کرنے کا طریقہ' ان کی ذہنی تسکین' ان کے فہم کے مطابق مباحث کی مناسب تدریج' لیکچر یا بیان کو ماحول کے مخصوص انداز اور آئے دن کے حوادث سے مربوط رکھ کر تفہیم حقائق' طلبہ کی خودی کو بیدار کرنے کے لئے خود شناسی کی راہیں دکھائے' ان میں ذہنی جمود کو توڑنے کے لئے انقلابی جذبہ پیش قدمی اور صداقتوں کی علمبرداری میں مزاحمتوں کا سامنا کرتا ہوا لطف و مسرت کا احساس دلائے۔ سفر علم کی کٹھنائیوں اور آس پاس جہالت اور تقلید اغیار کی تاریکیوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی ہولناکیوں میں ان کو امید دلا سکے۔

یہ بنیادی خوبیاں ہیں باقی تفصیلات بہت وسیع ہو سکتی ہیں۔

استاد مطلوب

ہمیں ایسے اساتذہ مطلوب ہیں جو تعلیم کی فنی صلاحیتوں کے ساتھ اسلام اور نظریہ پاکستان سے گہری وابستگی رکھتے ہوں۔ اسلامی نظام تعلیم کے لئے ایسے لوگ موزوں نہیں ہو سکتے جو اسلام کا علم نہ رکھتے ہوں یا اسلام پر عمل نہ کرتے ہوں۔

ہمارے تعلیمی ادارے ایک بھاری سل کے نیچے دبے ہوئے ہیں جو جمود کے مادوں سے بنی ہوئی ہے اور جسے غیر اختیاری اسباب نے مسلط کر دیا ہے۔ ہمارے ہاں فکر پیش کرنے یا فکر کی آبیاری کرنے یا فکر کو ابھارنے والے تمام ادارے آزادی خیال کی لازمی فضا سے محروم ہیں۔ حکیمانہ سطح پر یونیورسٹیاں بھی کچھ کام کر سکتی ہیں' مگر مجموعی فضا کا اثر خود حکیمانہ اور مفکرانہ کام کرنے والے ذہنوں پر بھی پڑتا ہے اور وہ بھی اسی بوجھ کے نیچے دب گئے ہیں جو سارے معاشرے کے سینہ پر رکھا ہوا ہے۔

کام تو جبھی ہو سکتا ہے کہ نظام تعلیم بدلے' لیکن نظام تعلیم اگر موجودہ حالت انجماد میں پڑا رہے۔ (یا اسے اسی طرح رکھا جائے) تو پھر؟

پھر اس کا علاج اس معلم کے پاس ہے جو اپنے فیضانِ نظر سے مکتب میں کرامت کر دکھائے۔ معلم جس کی آزادانہ نگاہ جمود کے قلعے میں چھید کر دے۔ معلم جو نئی نسل کو ذوقِ نظر اور ذوقِ عمل دے سکے جوان میں آزادی وصداقت کی پیاس بھڑکا دے۔

اگر نظام تعلیم کو باہر سے بدلنے والی قوتیں بے بس ہیں تو اسے اندر سے بدلنے کے لئے معلم اور متعلم موثر قوت ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس پنجرے کے اندر ایک بار کچھ پھڑ پھڑاتے ہوئے طیور۔ خیال کی تخلیق کر ڈالئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

استاد کی اہمیت

اسلامی نظام تعلیم میں تعلیمی ماحول اور نصاب کے علاوہ اول درجے کی اہمیت استاد کی شخصیت کو حاصل ہے۔ ہماری کتاب اگر مسلم ہو لیکن استاد مسلم ہونے کا عملی نمونہ نہ ہو یا اس کے نظریات مسلم نہ ہوں تو تنہا کتاب ضرورت کے مسلم پیدا کر کے نہیں دے سکتی۔ خطرہ تو یہ ہے کہ غلط نظریات رکھنے والا استاد طالب علموں کو گمراہ بھی کر سکتا ہے۔

ہمیں ملک وملت سے محبت کرنے والے صاف ستھرے ذہن وکردار کے ایسے اساتذہ درکار ہیں جن میں ایک طرف دین پر ایمان محکم موجود ہو اور دوسری طرف وہ احوال دنیا سے رمز شناس ہوں۔ تیسری طرف وہ اس عملی نفاق سے محفوظ ہوں جس کے نمونے آج بکثرت پائے جاتے ہیں۔ نونہالان قوم کو اسلام کے انقلابی جذبہ کا علم بردار بنانے کے لئے محض پیشہ ور اساتذہ سے کام نہیں چلایا جا سکتا۔ ایسے تمام اساتذہ جو ہمارے نظام تعلیم کے اصول و مقاصد اور ان کے اخلاقی تقاضوں سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ بنا سکیں ان کے لئے بہتر راستہ یہی ہے کہ وہ بروقت کوئی موزوں روزگار تلاش کر لیں۔ اساتذہ کو اپنے اندر اسلامی مقاصد کے مطابق ایک ایسی شخصیت پرورش کر کے مدرسے (اور کالج) میں داخل ہونا چاہئے جو طلبہ کے ذہنوں اور سیرتوں پر اپنا پرتو ڈال کر ان کی تعمیر جدید کر سکے۔ کتاب سے طلبہ ''معلومات'' حاصل کریں اور استاد سے ''معمولات''۔ ایک طرف ان کا فکر غذا حاصل کرے اور دوسری طرف سے ان کا عمل تقویت پائے۔ ان دو ضروریات کو پورا کئے بغیر اگر محض کتابوں میں اسلام کو داخل کر دیا جائے تو اسلام کا ''قول'' تو طلبہ میں پیدا ہو سکتا ہے اسلام کا ''عمل'' پیدا نہیں ہو سکتا۔ نری کتابی تعلیم شاعری سکھا سکتی ہے انقلابی کارکن پیدا نہیں کر سکتی اور ہمیں انقلابی

جذبات رکھنے والے عملی کارکنوں کی ضرورت ہے۔

کسی مخصوص نظریئے پر استوار شدہ ایک بامقصد نظام تعلیم کے لئے سب سے ضروری چیز' اس کے تقاضوں پر پورا اترنے والا استاد ہے۔ دراصل استاد (پرائمری مدرس سے لے کر وائس چانسلر تک) نظام تعلیم کی گاڑی کا ڈرائیور ہوتا ہے' وہ جس منزل کی طرف چاہے اسے لے جائے۔

نصابات کی تیاری' نصابی کتب کی تدوین اور بعد ازاں ان کے مطابق تعلیم کا مرحلہ ایسے اساتذہ کے ذریعے طے ہونا چاہیئے جن کو ان مقاصد کے لئے تربیت دی گئی ہو۔ انہیں اصولوں اور مقاصد کا پورا شعور ہونا چاہیئے ورنہ محض کاروباری طریق سے اگر ناشرین سے کتابیں لکھوائیں اور ملازمانہ حیثیت سے پڑھائی گئیں تو مقصد غارت ہو جائے گا۔

اسلامی نظام تعلیم میں نظریہ و مقصد کے مطابق استادوں کے انتخاب اور ان کی تربیت کا اہتمام اشد ضروری ہے۔

استادوں کی بھرتی کے وقت یہ چھان بین ہونی چاہئے کہ وہ ذہنی طور پر فرومایہ اور اخلاقی لحاظ سے ناقابل اعتماد شخصیت تو نہیں رکھتا اور پھر اسے اسلامی نظام تعلیم کو چلانے کے لئے فکری اور عملی دونوں طرح کی تربیت دی جانی چاہئے۔ موجودہ بگڑے ہوئے ماحول کے لحاظ سے شاید یہ امر مناسب ہو گا کہ:۔

- استادوں کی بھرتی اور ان کے تقرر کے وقت' ان سے اسلام' نظریۂ پاکستان اور نظام تعلیم کے مقاصد سے رشتہ وفا رکھنے کا باقاعدہ تحریری حلف لیا جائے۔
- استادوں کا مرتبہ بلندتر کرنے کے لئے ان پر زیادہ خرچ کیا جائے اور انہیں پریشان حالی اور ذہنی انتشار سے نکالا جائے۔

اساتذہ کو نئی پود کی تربیت میں سب سے زیادہ زور نظم و ضبط' شائستگی' سلیقے اور آداب پر دینا چاہئے کیونکہ ان صفات کے بغیر اسلامی زندگی ممکن نہیں۔

نظام تعلیم کو جو پاکستانی اور اسلامی ذہن رکھنے والے فعال اور غیور نوجوان تیار کرنے ہیں ان کا تصور سامنے رکھیں تو پھر مغربی علوم کی تعلیم دیتے ہوئے بھی اساتذہ ان میں ایک ایسا تنقیدی شعور ابھاریں کہ وہ ذہنی غلامی میں مبتلا ہو کر ٹھس نہ ہو جائیں۔

مثلاً استاد فرائڈ' ایڈلر' ہیگل' مارکس یا نظریہ جمہوریت کے ماہرین یا جرم و سزا کے مفکرین

کی کوئی چیز پڑھا رہا ہے تو یہ سوال اپنے لیکچر میں اٹھائے کہ یہ مغربی نظریات آنکھیں بند کر کے قبول نہیں کرنا چاہئیں۔ بلکہ ناقد بن کر اسلامی ذہن سے ان مادہ پرستوں کی غلطیاں پکڑیں۔ پھر طلبہ کو کھلا موقع دینا چاہئے کہ وہ بحث کریں اور اس طرح کے سوالات ان کے امتحانی پرچوں میں ہونے چاہئیں۔

استاد مطلوب وہی ہے جس سے طلبہ اسلامی علم و حکمت کی برتری کا شعور لے کر نکلیں اور ان میں یہ جذبہ ہو کہ انہیں ساری دنیا میں وہ روشنی پہنچانی ہے جو حضرت محمد ﷺ قرآن کی صورت میں لائے تھے۔

مقام معلم

معلم ایک قائد (Leader) ہوتا ہے' معلمی قیادت کی صحیح مثال ہے۔ بری جماعت کو اچھا استاد اگرچہ بہت اچھا نہیں بنا سکتا' مگر اس کی حالت کو کچھ بہتر ضرور کر سکتا ہے اچھی سے اچھی جماعت کو برا استاد بگاڑ کر رکھ دیتا ہے اور اگر خوش قسمتی سے اچھی جماعت کو اچھا استاد مل جائے تو وہ اسے آئیڈیل اور مثالی سطح تک پہنچا دے گا۔

استادوں کی دو بڑی قسمیں ہیں۔

ایک استاد وہ ہوتا ہے جو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق جو کچھ پسند کرتا ہے اسے جماعت پر زبردستی ٹھونس دینا چاہتا ہے۔ وہ جماعت (Class) کے رجحانات' اس کے احوال' اس کی ضرورتوں اور مسائل کو بالکل نہیں سمجھتا۔ جماعت کا ذہن مزاحمت کرتا ہے اور استاد لٹھ لے کر جہاد کرنے لگتا ہے۔ ایسا استاد اپنے آپ سے محبت کرتا ہے' جماعت کے لئے ذہن میں جذبہ تحقیر رکھتا ہے اور ہمیشہ اپنی قابلیت و بصیرت اور جماعت کی نالائقی کا رونا روتا ہے۔ ایسا استاد اگر بڑا قابل اور نیکی کا علمبردار بھی ہو تو بھی جماعت کا ستیاناس کر کے رکھ دے گا اور اگر وہ غبی اور بدکردار بھی ہو تو کار طفلاں تمام کر کے رکھ دے گا۔

دوسرا استاد وہ ہوتا ہے جو پہلے جماعت کی ذہنی حالت' اس کے جبلی و فطری رجحانات' اس کی مشکلات اور اس کے مسائل کو دیکھتا ہے' ان کو حل کرتا ہے اور اس طرح تعلیم و تدریس کے لئے راستہ تیار کرتا ہے۔ وہ کچھ سکھانے سے پہلے بہت کچھ اپنی جماعت سے سیکھتا بھی ہے اور متواتر سیکھتا رہتا ہے۔ وہ طالب علموں کے سامنے خود ایک طالب علم بن کر آتا ہے وہ ان کا

ساتھی بن کر قدم قدم چلتا ہے۔ اس ذہن کے استاد میں جماعت کے لئے شفقت و محبت ہوتی ہے اور وہ ان کی ذرا ذرا سی خوبیوں کا قدر دان ہوتا ہے۔ ان کی کمزوریوں سے چشم پوشی کرتا اور ان کی کامیابیوں پر ان کے دل بڑھاتا ہے۔ وہ لاٹھی کے بجائے دست شفقت سے کام چلاتا ہے۔ ایسے استادوں پر شاگرد دل و جاں نثار کرتے ہیں۔

معلمانہ منصب وہ پاک منصب ہے جس پر خداوند حکیم و علیم نے انسانیت کی تعمیر کے لئے اپنے انبیاء کی مقدس شخصیتوں کو مامور کیا تھا۔ خدا کے آخری رسول ﷺ انسانیت کو راستی اور نیکی کی تعلیم دینے والے سب سے بڑے معلم تھے۔ آج حضورؐ کی امت کا جو بھی فرد تعلیم کے دائرے میں خدمات انجام دے رہا ہے وہ حضورؐ ہی کی تعلیمی تحریک کو آگے بڑھانے کا ذمہ دار ہے۔ یہ ایک طرح سے رسول برحق کی جزوی جانشینی کا منصب ہے۔

اسلام کی ایک وجہ امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ معلمانہ استدلال اور دل و دماغ کی صحیح تعمیر و تشکیل کو تہذیبی تغیر کا ذریعہ بناتا ہے۔

فرائض معلم

کون اندازہ کر سکتا ہے کہ خیال کتنی بڑی طاقت اور کتنی بڑی دولت ہے۔ طاقت و دولت ہی نہیں ـــــ تہذیب انسانی کی اصل پونجی یہی ہے۔ سچ کہا حکیم نکتہ داں نے:۔

قوموں کی حیات ان کے تخیل پہ ہے موقوف

پس خیال کی تخلیق، کسی تخلیقی خیال کی تخلیق، کسی خیال افروز اور عمل انگیز خیال کی تخلیق ایک مقدس خدمت ہے۔ زندہ قوموں اور ترقی کرتے ہوئے معاشروں نے اپنے ان افراد اور طبقوں کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے جو اس مقدس خدمت کو انجام دیتے ہیں۔ سب سے بالاتر مقام الہامی خیال کا ہے جو پیغمبروں کے واسطے سے اترتا ہے۔ الہامی خیال تمام اچھے اور تعمیری اور صالح خیالوں کا اولین بیج ہوتا ہے۔ اور الہامی خیال تمام زندگی افروز خیالات کے پس منظر میں موجود رہتا ہے۔ کبھی شعور اسے دیکھ لیتا ہے اور کبھی نہیں دیکھ پاتا۔ الہامی خیال کی روشنی میں علمی خیال، حکیمانہ خیال اور فلسفیانہ خیال کی نشوونما ہوتی ہے۔ پھر ایک دنیا ادبی خیال کی دنیا ہے جہاں بیٹھ کر ادیب الہامی اور حکیمانہ خیال کو جذباتی لباس میں عام لوگوں کے لئے قابل اخذ بناتا ہے۔ پھر ایک طرف سیاسی اسٹیج کا خطیب اور دوسری طرف صحافی کسی نئے خیال

کو سیاسی دائرے میں ماحول سے متصادم کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں ـــــ معلم کے اعلیٰ ترین فرائض میں سے ایک یہ ہے کہ وہ الہامی اور حکیمانہ اور ادبی خیال کو پچھلی نسلوں سے لے کر اگلی نسلوں کی طرف منتقل کر دے تاکہ خیال کی نمو اور بالیدگی کا تسلسل جاری رہے۔

○

معلم کا فرض ہے کہ وہ اپنے طلبہ و طالبات کے رویئے پر نگاہ رکھے اور تربیت کے ساتھ اس کے احوال کو نوٹ کرتا رہے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا' استادوں اور ہم مرتبہ طالب علموں سے رویہ' بات کرنے کا انداز' لڑائی بھڑائی' تقسیم اوقات' عادات مطالعہ' صفائی ستھرائی' دوسروں کی خدمت اور بھلائی' انصاف پسندی' اپنی غلطی کا اعتراف' معافی مانگنے والوں کو معاف کر دینا یہ سب کچھ یہاں بیان کرنا مشکل ہے لیکن ایسے ضروری اخلاقیات کی درجہ بدرجہ ایک فہرست استاد کے سامنے ہونی چاہیے۔

○

تعلیم اور گھر کا باہمی تعلق اہم ہے۔ پروفیسر یا استاد گھر والوں کو آگاہ کرتا رہے کہ بچے یا طالب علم کو وہ کن چیزوں سے محفوظ رکھیں' گھروں کا باہمی سماجی اور تہذیبی رویہ کیسا ہو' اور طالب علم کی مخصوص خوبیوں یا کمزوریوں سے ان کو بذریعہ ماہانہ رپورٹ آگاہ کریں۔ زیادہ اہم معاملہ ہو تو ان کو درس گاہ میں بلوا لیں' یا آسانی سے ممکن ہو تو ہر ہفتے کسی ایک طالب علم کے گھر جا کر وہاں کا مشاہدہ بھی کریں اور والدین سے بات بھی کریں۔

اس سلسلے میں یوم والدین کو رسمی' نمائشی اور پروپیگنڈا کی تقریب نہ بنایا جائے بلکہ والدین کو وہ خاص باتیں نوٹ کروائی جائیں جو درس گاہ میں پیدا کرنی مطلوب ہیں اور وہ باتیں جن کا انسداد مطلوب ہے۔ والدین سے اپیل کی جائے کہ وہ بھی گھر میں ان باتوں کو ملحوظ رکھیں اور گھر اور درس گاہ میں وحدت پیدا کریں۔

میری تجویز ہے کہ کوئی ایسی صورت ہونی چاہیے کہ بہت ہی ادنیٰ آداب و اصلاحات سے لے کر بہت بڑی بڑی خدمات کی انجام دہی تک استاد والدین سے تعاون طلب کرے۔ مثلاً بچے کو جھوٹ سے بچانا ہے تو درس گاہ کے مخصوص اہتمام کے علاوہ والدین سے بھی یہ درخواست ہونا چاہیے کہ آپ سے' آپ کے بچے کی بھلائی کے لئے سکول چاہتا ہے کہ آپ جھوٹ سے سختی سے پرہیز کریں۔ ہر معاملے میں ملاقاتیں یا اجتماعات ممکن نہ ہوں تو کم از کم

ڈاک کے ذریعے مہینے میں ایک بار ان کو مدرسہ کے اخلاقی پروگرام کے سلسلے سے متوجہ کیا جائے اور ایک اصلاحی نقشۂ کار کی تفصیلات سمجھا کر ان کا تعاون حاصل کیا جائے۔

استاد اور معاشرہ

اساتذہ کو اکثر تلقین کی جاتی ہے کہ اپنے کام کو مقصد کی سچی لگن کے ساتھ مالی صلہ سے بے نیاز ہو کر سرانجام دیں۔ یہ تلقین بھی اپنی جگہ درست ہے مگر یہ کچھ باتیں کہنے کے لئے محرک بھی بن رہی ہے۔

پہلی اصولی بات یہ ہے کہ کسی سماج میں جس عنصر سے جیسا زیادہ اہم اور قیمتی کام لیا جانا ہوتا ہے اسی کے مطابق اس کا معاشرتی مرتبہ بھی معین ہوتا ہے اور اسی کے مطابق اسے مالی حاصل بھی ملتا ہے۔ آج تک ہمارے سماج نے استاد کے کام کو وہ اہمیت دی ہی نہیں جو اس میں ہونی چاہئے۔ نتیجہ یہ کہ استاد کا سماجی مرتبہ بھی ایک پٹواری اور ایک کانسٹیبل سے کمتر چلا آ رہا ہے اور اسے اپنی خدمات کا معاوضہ بھی حقیر ملتا ہے۔ اب اگر استاد کے کام کی اہمیت بڑھائی جائے تو منطقی طور پر اس کا مرتبہ اور اس کا معاوضہ بھی بڑھنا چاہئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کسی عنصر کے لئے اگر مالی مفادات کا عمومی معیار درست کر دیا جائے تو پھر افراد میں لگن بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔ ان سے زائد خدمات بھی لی جا سکتی ہیں' ان میں غیر معمولی سرگرمی ابھاری جا سکتی ہے اور ان سے قربانیاں بھی طلب کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اگر معاوضۂ کار کا عمومی معیار کسی طبقہ کے لئے پست رکھا جائے تو پھر تلقینوں سے اس کے لئے کوئی غیر معمولی جذبہ مشکل ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔

ان دونوں باتوں کو ملحوظ رکھا جائے تو ہمارے سماج پر لازم آتا ہے کہ وہ استاد کا مرتبہ معاشرتی اور اقتصادی دونوں حیثیتوں سے بلند کرے' استاد جتنا زیادہ معزز اور مطمئن ہو گا' آئندہ نسلیں اتنی ہی بہتر صلاحیتوں سے آراستہ ہوں گی۔

سرکاری طور پر استاد کا رتبہ بڑھانے میں بعض تدابیر ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ہر سطح کی اہم سرکاری تقاریب میں معلموں کو مدعو کیا جائے۔ بڑے سے بڑا افسر معلم کا احترام کرے' کوئی معلم کسی سرکاری دفتر یا ادارے میں داخل ہو تو وہاں کے افسران اور کارکن اسے خصوصی توجہ دیں۔

گاؤں اور محلوں میں رہنے والے مختلف درجوں کے معلموں کو عوام کے متعلق بعض تصدیقات کا اختیار ہونا چاہیے۔ معلم اگر گواہی کے لیے عدالت میں جائے تو اسے قانون کے دائرے اور آداب عدالت کے حدود میں خصوصی اہمیت دی جائے۔ اس موضوع پر باتیں اور بھی سوچی جا سکتی ہے۔

مثالی استاد

زندگی میں بہت سے مثالی اساتذہ دیکھے یہاں صرف دو اساتذہ کا ذکر رہا ہوں۔

ہمارے ایک غیر مسلم ہیڈ ماسٹر صاحب تھے پہلا اثر تو ان کی آمد پر یہ پڑا کہ بہت مختصر سامان' سادہ لباس' بعض درجوں کے کمروں میں گئے اور طلبہ سے دو چار میٹھی میٹھی پر لطف باتیں کیں اور پھر کہا کہ آج تم سب کو جلد چھٹی دے دی جائے گی بس ابھی ابھی آرڈر کر رہا ہوں۔ انہوں نے شروع میں ہی کسی دن لیکچر دیا اور بچوں کو بتایا کہ صفائی کی کتنی اہمیت ہے اور میں خود اس بارے میں کیا کرتا ہوں' ان کی دھرم پتنی تو سرگباش ہو چکی تھیں' ایک چھوٹا بچہ (سات آٹھ سال کا) تھا اس کی دیکھ بھال بھی کرتے اور کھانا ایک ہندو ملازم سے پکواتے۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے کمرے میں ایک چٹائی بچھا رکھی ہے اسی پر سوتا بھی ہوں' بیٹھتا بھی ہوں' ملنے والے لوگ آئیں یا طالب علم تو وہ بھی اس پر بیٹھتے ہیں (اس کا مشاہدہ اور تجربہ مجھے ہے) پھر انہوں نے بتایا کہ میں اس کو خود ہی صاف کر لیتا ہوں۔ جوتوں کے بارے میں بتایا کہ میں ہر روز خود پالش کرتا ہوں۔

ایک دن انہوں نے تمام عملے اور طلبہ کو کشادہ صحن میں جمع کیا اور سب کے سامنے چند کلمات کہے کہ اسکول ہم سب کا ہے اور ہمیں اس کی صفائی کا خیال رکھنا چاہئے۔ خود ساتھ ہو کر سب کو اس کام میں لگایا کہ پورے صحن میں کوئی کاغذ' کوئی تنکا یا کوئی روڑہ اور درختوں کے پتے وغیرہ ملیں تو (خالی بالٹیاں رکھ دی گئی تھیں) انہیں بالٹیوں میں ڈالتے جاؤ۔ وہ اپنی آمدنی میں سے کچھ حصہ غریب طلبہ کی فیسوں یا کتابوں میں لگا دیتے' کچھ مفلوک الحال افراد کو دیتے۔ ظاہر ہے کہ ہندوؤں کی خاصی تعداد مستفید ہوتی مگر ان کا ظاہراً احوال یہ تھا ہندو مسلم تمیز کا کوئی مسئلہ نہیں اور فوجی وظائف تو تمام مسلمان بچوں کے ہوتے جن کے لئے وہ محکمہ تعلیم اور محکمہ افواج سے لمبی خط و کتابت کرتے۔

اسی طرح کی ایک مثال حکیم سعید مرحوم کی ہے جو شائع ہو چکی ہے۔ ایک دن انہوں نے دیکھا کہ چھوٹے بچوں کے جوتے صاف نہیں فوراً آگے بڑھے اپنا رومال نکالا اور بچوں کے جوتے صاف کرنے لگے۔ ان کی دیکھا دیکھی اوروں کو بھی توجہ ہوئی۔ غالباً اس درس کے بعد بچوں کو خود خیال ہو گیا کہ ہمیں جوتے صاف کر کے اور پالش کر کے لانا چاہئیں۔ انہیں یونیورسٹی کے چانسلر نے کس خوبصورت انداز سے ایک سبق سکھایا۔

کارکردگی اساتذہ

اساتذہ کی کارکردگی بہتر بنانے کے لئے مختلف مقامات کی درس گاہوں (اسکولوں اور کالجوں) میں ہر ماہ ان کی میٹنگ بطور ریفریشر کورس رکھی جائے اور پیشتر سے کسی ایک استاد کے ذمے کسی مضمون کا کوئی سبق پڑھانا طے ہو۔ وہ دوسرے اساتذہ یا پروفیسروں کو بطور کلاس مخاطب کر کے ریاضی یا ہسٹری یا سائنس یا انگلش یا نفسیات یا کسی بھی نصابی مضمون پر لکچر دے۔ لکچر کے خاتمے پر چند مقررہ اصحاب سوالات کریں اور سبق پیش کرنے والے صاحب جواب دیں۔ پھر چند مقررہ اصحاب اس پوری کارروائی پر تبصرہ کریں اور غلطیوں یا کمزوریوں پر گرفت کریں' نیز اس تدریس کا بہتر پیرایہ بتائیں۔ پروفیسر یا استاد کو بتایا جائے کہ وہ کس طرح لکچر دے کہ وہ اپنی کلاس کی توجہ کا مرکز اور ان کی دلچسپی کا محور بن جائے۔

استادوں یا پروفیسروں کو پابند کیا جائے کہ وہ ڈائری لکھیں اور اس میں ہر روز جس کلاس کو جو تعلیم دی ہو یا طلبہ کے کئے ہوئے کام دیکھے ہوں نیز ان کی صلاحیتوں کے جو اچھے یا برے نمونے سامنے آئے ہوں ان کو درج کریں۔ ماہانہ میٹنگز میں کوئی ایک صاحب اپنی ڈائری میں سے دو چار تاریخوں سے متعلق اندراجات سنائیں۔ ڈائری میں وہ اپنی مشکلات بھی درج کریں اور مشکلوں کے جو حل وہ دریافت کر سکے ہوں وہ بھی لکھیں۔ اگر کچھ طلبہ یا کوئی ایک خاص قسم کا کیس ہو مثلاً قابلیت و ذہانت کے معیار کا بہت کم ہونا' لاپرواہ ہونا' کلاس میں دخل اندازی کرنا' ان کا خاص طور پر اندراج کریں اور ان کی اصلاح کے لئے جو بھی طریقے انہوں نے اختیار کئے اور جو بھی نتائج نکلے ہوں ان کا ریکارڈ رکھیں۔

اساتذہ —— ریفریشر کورس*

۱۔ درس قرآن ہر روز صبح

ترجمہ —— تشریح —— سوالات کے جوابات (صاحب درس ایسا آدمی تجویز کریں جس کا علمی معیار بھی اچھا ہو اور جس کا عالمانہ کردار دنیا طلبی سے پاک ہو)

سورہ لقمان (نظریہ تعلیم و تربیت اطفال)

سورہ حجرات (مکمل تعلیم اخلاق)

قصہ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ (تربیت اولاد)

سورہ بنی اسرائیل (اسلامی معاشرہ کے اخلاقی اصول)

آخری دس سورتیں (طلبہ کو تعلیم دینے کے لئے)

(اساتذہ درس کے باقاعدہ نوٹ لکھیں)

۲۔ درس حدیث ہر روز بعد نماز ظہر یا عصر یا عشاء

مشکوۃ یا ریاض الصالحین میں سے

کتاب الایمان' کتاب العلم اور کتاب الاخلاق کی منتخب احادیث

(اساتذہ درس کے باقاعدہ نوٹ لکھیں)

۳۔ چند اہم کتب مطالعہ

بعض کتابیں پوری مجلس اساتذہ میں سنائی جائیں اور بعض کے خاص خاص ابواب مثلاً

اسلامی نظام حیات (پروفیسر خورشید احمد)

مقالات شبلی میں سے چند منتخب مقالات

---

* ۵۰ کی دہائی میں اساتذہ کے ایک ریفریشر کورس کے لیے مرتب کردہ خاکہ۔

ڈاکٹر حمید اللہ کے ہاں سے عہد نبویؐ کا نظام تعلیم
مولانا ابوالحسن علی کی کتاب تاریخ دعوت وعزیمت کے بعض ابواب
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب ''اسلام کا نظام حیات'' یا ''خطبات''
انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام (پروفیسر عبدالحمید صدیقی)
یہ کتاب مغربی فکر وتہذیب کا غلبہ دور کرنے کے لئے اور اسلامی ذہن کو ہموار کرنے کے لئے بہت مفید ہوگی۔
تعلیمات (از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی)
سیرت عمر بن عبدالعزیز (دارالمصنفین)
اس کتاب سے ولولہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک شخص بگڑے ہوئے معاشرے کی اصلاح کے لئے سرگرم عمل ہو جائے۔
''محسن انسانیت ﷺ''
سیری اس کتاب میں سے تین باب ''مقدمہ'' ''حضورؐ کی شخصیت ایک نظر میں'' اور ''اُجالا پھیلتا ہی چلا گیا''

۴۔ شعر و شاعری

کلام جوہر (ان کی شخصیت، علمی وصحافتی کام اور سیاسی سرگرمیوں کے پس منظر کے ساتھ)
مسدس حالی (جتنا حصہ مکمل ہو)
نغمے بہ نژادنو (جاوید نامہ)
مختلف ایسے فاضل اساتذہ جو ان میں سے کسی شخصیت سے گہرا ذہنی ربط رکھتے ہوں، بشکل لیکچرز توضیح کریں۔

۵۔ خصوصی لیکچرز

حسب ذیل موضوعات پر فاضل حضرات کو ایک ایک کر کے خصوصی لیکچرز کے لئے مدعو کیا جائے۔
معلم کی ذمہ داریاں (تعمیر کردار میں تعلیمی نفسیات سے مدد)

اسلامی نظام تعلیم کی خصوصیات

موجودہ نظام تعلیم کی خرابیاں

طلبہ میں اسلامی زندگی کیسے پیدا کی جائے؟

میرے استاد

میرا زمانہ طالب علمی

ہمیں کیسا انسان مطلوب ہے؟

چند اصحاب کے نام میں تجویز کرتا ہوں' جن کے علمی و ادبی کام اور ان کی شخصیت کو اختصار سے زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ' پروفیسر عبدالحمید صدیقی' مولوی ظفر اقبال' پروفیسر حمید احمد خاں' مولانا عبدالنبی کوکب' علامہ علاؤ الدین صدیقی' مفتی محمد حسین نعیمی' مولانا محمد چراغ' گوجرانوالہ' مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامعہ اشرفیہ' پروفیسر خورشید احمد' مفتی محمد ادریس صاحب کاندھلوی' مولانا محمد سہیل صاحب' گوجرانوالہ' میاں بشیر احمد' پروفیسر علم الدین سالک' مولانا غلام رسول مہر' ڈاکٹر برہان الدین فاروقی' پروفیسر کرامت حسین جعفری وغیرہ۔

۶۔ مفید ذہنی تفریح

لاہور جیسے مقام پر اگر ریفریشر کورس ہو تو بعض اچھے تعمیر پسند شعرا کو مدعو کیا جائے۔ (ایک ایک کو الگ الگ) ان سے ان کا ایسا کلام سنا جائے جو مقصد سے ہم آہنگ ہو۔

۷۔ باہمی مذاکرات

ریفریشر کورس کے دوران میں کم از کم ۳' ۴' دن باہمی مذاکرات ہوں۔ یعنی ایک مقررہ موضوع پر چھوٹی چھوٹی تقاریر میں مختصر اظہار خیال۔ ہر مذاکرے کی صدارت کسی علمی یا تعلیمی شخصیت سے کرائی جائے۔

موضوعات

معلم کی مشکلات (خصوصاً بہ سلسلہ اسلامی تربیت)

طالب علم کی مشکلات (خصوصاً بہ سلسلہ اسلامی تربیت)

سماجی ماحول کی پیچیدگیاں (خصوصاً بہ سلسلہ اسلامی تربیت)

نئے اقدامات کے لئے تجاویز (خصوصاً بہ سلسلہ اسلامی تربیت)

ریفریشر کورس کے اختتام سے قبل ایک مذاکرہ ایسا بھی ہو جس میں ہر معلم یہ بیان کرے کہ ریفریشر کورس اس کی نگاہ میں کیسا رہا؟ اسے کیا فائدہ پہنچا؟ اور وہ کیا عزائم و جذبات لے کے جا رہا ہے۔

ابتدا میں (پہلے دن) اگر ایک مجلس میں ہر معلم اپنا تعارف کراتے ہوئے اپنی معلمانہ روئیداد سنا دے تو دلچسپ اور مفید ہو گا۔

۸۔ دینی اداروں اور شخصیتوں سے تعارف

شہر بھر میں جتنی بھی دینی درسگاہیں یا ادارے ہیں ان سب میں معلمین کے وفود بھیجے جائیں۔ کوئی اہم دینی شخصیت ایسی نہ رہے جس سے وفود مل کر گفتگو نہ کریں۔ گفتگوئیں تعلیم اور اصلاح معاشرہ وغیرہ موضوعات پر ہوں' اور ان کے نوٹس لئے جائیں۔

واپس آ کر وفود اپنی اپنی روئیداد سنائیں اور پھر آپس میں تبادلہ خیال کریں۔

۹۔ ریفریشر کورس' اس کے لیکچر روم اور قیام گاہ کا ماحول

- قرآن کی آیات و احادیث سے اچھے اچھے کلمات جگہ جگہ ترجمہ کے ساتھ آویزاں کئے جائیں مثلاً "تم وہ بہترین امت ہو جنہیں اس لئے اٹھایا گیا ہے کہ نیکی کو قائم کرو گے اور بدی کا انسداد کرو گے۔"
- خصوصاً علم اور معلمین کے بارے میں کلمات مبارکہ۔
- اٹھنے بیٹھنے' کھانے پینے' سونے جاگنے' بات چیت کے متعلق اسلامی آداب کو واضح کرنے والی آیات و احادیث۔
- معین نظام الاوقات میں اوقات نماز کا تعین۔
- ناظم صلوٰۃ کا تقرر' موذن کا تقرر' امام کا تقرر' نماز کے لئے جگہ اور فرش کا انتظام (ترک نماز کوئی معلم نہ کرے گا)۔
- ریڈنگ روم کا انتظام جہاں تمام اخبارات مہیا کئے جائیں۔ مختلف دینی اداروں سے ان کے لٹریچر کے سیٹ حاصل کر لئے جائیں اور وہ بھی موجود رہیں۔

ماہ رواں کے تمام دینی، علمی اور ادبی رسائل بھی فراہم کر دیئے جائیں۔

❁ امام صلوٰۃ یا کسی دوسرے موزوں صاحب کی یہ ڈیوٹی لگائی جائے کہ وہ ایک مقررہ پیریڈ میں معلمین کو وہ تمام ضروری چیزیں مع ترجمہ یاد کرا دے جو ایک مسلمان کو جاننی چاہئیں۔

نماز، اذان، جنازہ کی دعائیں، نماز کے بعد کی دعائیں، دعائے قنوت، صفت ایمان مجمل ومفصل، آخری دس سورتیں۔

روزہ مرہ زندگی اور عبادات کے متعلق عام مسائل واحکام۔

عملہ اور نگران ایسے مقرر کئے جائیں جو خود اسلامی ذہن وکردار رکھتے ہوں اور پابند صوم وصلوٰۃ ہوں۔

خصوصاً ایسے حضرات کو کورس کے سربراہوں کی صف میں ہرگز نہ لیا جائے جو ملحدانہ ذہن یا کھلا کھلا غیر اسلامی کردار رکھتے ہوں۔

نمائش اور دکھاوے اور پبلسٹی کا پہلو نہایت ہی محدود رکھا جائے۔

۱۰۔ امتحان

میری رائے یہ ہے کہ ریفریشر کورس کے دوران میں جو کچھ تعلیم وتربیت دی جائے اس کی تکمیل پر ایک مختصر سا امتحان لے کر سندات اور انعامات بھی دیئے جائیں۔ کافی ہوگا کہ صرف ایک تحریری پرچہ ہو جس کے دو حصے ہوں —— ایک حصہ علمی اور تعلیمی مسائل سے متعلق، دوسرا حصہ اسلامیات سے متعلق، نیز ایک زبانی انٹرویو لے لیا جائے۔

ریفریشر کورس کے دوران اچھا کردار دکھانے کے نمبر بھی دیئے جائیں۔

اول، دوم، سوم آنے والوں کو علی الترتیب گولڈ میڈل، سلور میڈل اور سرٹیفکیٹ دیئے جائیں ان کے ساتھ ان کتابوں کے سیٹ بھی جو کورس میں شامل رہی ہوں۔

باقی تمام پاس ہونے والوں کو سرٹیفکیٹ کے ساتھ ایک ایک کتاب تحفۃً دی جائے۔

۱۱۔ اختتامی خطاب

اختتامی خطاب کے لیے کوئی ایسی شخصیت ڈھونڈیئے جو فاضل ہونے کے ساتھ اسلامی کردار کے لحاظ سے درخشاں ہو اور اس کی بات دلوں پر اثر کرے۔

اس اختتامی خطاب میں وہ معلمین کو اس بھاری ذمہ داری کا احساس دلائیں جو اصلاح و تعمیر معاشرہ کے سلسلے میں خدا کی طرف سے ان پر عائد ہوتی ہے۔ وہ ان کو احساس دلائیں کہ معلمی کاروبار نہیں ہے بلکہ درحقیقت چھوٹے پیمانے پر اسی مقدس مشن کو جاری رکھنے کی کوشش ہے جس کے علمبردار انبیاء تھے۔ معلم کو اپنا کام اس پاک جذبے سے کرنا چاہئے جس جذبے سے آدمی خدا کی عبادت انجام دیتا ہے۔ پھر وہ حالات کے بگاڑ کا نقشہ ان کے سامنے رکھ کر اپیل کریں کہ اب تم ہی لوگ اس بگاڑ کی روک تھام کر سکتے ہو۔ وہ انہیں یہ تصور بھی دلائیں کہ ریفریشر کورس محض ایک تفریحی سرگرمی نہیں ہے بلکہ ایک سنجیدہ کوشش ہے۔ ایک پرامن ذہنی و اخلاقی انقلاب کی تیاری کے لئے ایک کوشش ہے۔ اس لئے اس کورس کا ماحول بہت پاکیزہ رہنا چاہئے وہ انہیں یہ تلقین بھی کریں کہ معلمین اس موقع پر سنیما اور دوسری غیر اخلاقی تفریحات کی طرف ہرگز متوجہ نہ ہوں اور فسق و فجور سے اپنے دل و نگاہ کو محفوظ رکھ کر اپنی تعمیر نو کریں۔

ہمارا طالب علم

میں تعلیم ـــــ خصوصاً پاکستان کے نظام تعلیم ـــــ کے متعلق جو باتیں اکثر لکھتا رہا ہوں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر قوم' دین' ملک اور یونیورسٹی یہ چاہتی ہے کہ وہ ایک خاص طرز کے آدمیوں کی ذہنی' معلوماتی' اخلاقی اور ثقافتی' تخلیقی اور تحقیقی ہیئت تیار کر کے ہر طالب علم کو اس کے مطابق ڈھال دے۔ وہ نوجوانوں کو کوئی نصب العین دے' کوئی خاص لگن دے' کوئی سمت سفر اور ذوق سفر دے' کوئی اقدار اور شعائر دے' کوئی تشخص اور شناخت دے۔

یہی مطلوب اسلام تھا' اور یہی مقصود پاکستان اور یہی عقلی طور پر ترقی اور حرکت کے لئے قوت محرکہ اور اسی کی دی ہوئی اسپرٹ سے وہ معرکہ آرائی ہماری نئی نسلیں جاری رکھ سکتیں جو شر و فساد اور تخریب اور بگاڑ' پستی اور ابتذال' نفسانیت اور مکر و جبر' نیز مختلف قسم کے تعصبات اور ظلم و استبداد کے خلاف ہر دائرے میں جاری رکھنا سامان بہبود اور ذریعہ فلاح و سعادت ہے۔

انسان سازی کا یہی کام کسی بھی اچھے نظام تعلیم کا محور ہے۔

ہماری یونیورسٹیاں اور درس گاہیں اپنے حقیقی مقصد کے بغیر مجھے بھیڑ بکریوں یا گائے بھینسوں کے ان باڑوں کی مانند نظر آتی ہیں جن کے اندر خاص اوقات میں ان جانوروں کو بند کر دیا جاتا ہے' اور پھر کھول دیا جاتا ہے۔ جانوروں سے برتر اگر کوئی عمل ہوتا دکھائی دیتا ہے تو وہ معلومات کے بوجھ ذہنوں پر لادنے کا ہے۔ یوں بھی میں جب چھوٹے چھوٹے بچوں کو دس دس بارہ بارہ سیر کے بستے پیٹھوں پر لٹکائے دیکھتا ہوں اور پھر بڑے ہو کر ان کے دماغوں پر فلسفیوں اور ادیبوں اور سائنس دانوں کی کتابوں اور فارمولوں اور نکتہ آرائیوں کے انبار لدتے دیکھتا ہوں تو بے اختیار وہ مصرع گونجنے لگتا ہے کہ

چار پائے برو کتابے چند

...... گزارش کا مقصد یہ ہے کہ ایک طالب علم سولہ سولہ سال حصول تعلیم پر صرف کرتا ہے

مگر اس کی حاصل کردہ تعلیم اس کے دماغ میں اس طرح الگ ایک پوٹلی کی طرح رسولی بن کر پڑی رہتی ہے' اور اس کی عملی زندگی سے ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ ایک تعلیم یافتہ' ایک صاحب شعور' ایک مہذب شخص' ایک شائستہ کلام' ایک نور اخلاق سے بہرہ مند' مسائل پہ غور و کاوش کرنے والا' اور پیچیدگیوں کے حل نکالنے والا انسان ہے ـــــ سچا اور حقیقی انسان ہے۔

وہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ایک لمبا دور کس طرح گزارتا ہے؟ اس کی گپ شپ' اس کی رکاکت مزاح' اس کے کیفے ٹیریا کے قہقہے' یا کیفستانی سرمستیاں' لڑکیوں کے لئے اس کی نگاہوں کی منحنی حرکات' الفاظ کے پھول اور چنگاریاں اچھالنا' استادوں کے ساتھ انداز گفتگو' ان کی غیر حاضری میں ان کے لئے تحقیر آمیز فقرے اور ان پر تالیاں پیٹ دینا' جلوسوں میں بھنگڑے ڈالنا' قومی املاک کو تباہ کرنا' عام شہریوں کو تنگ کرنا' ٹریفک کو خراب کرنا' گاڑیوں کے شیشے توڑنا' پولیس کے خلاف جہاد' طلبہ کے گروہوں کا آپس میں برسر جنگ رہنا' ہاتھوں اور ہاکیوں کی مار پیٹ سے آگے نکل کر کلاشنکوفیں اور دستی بم استعمال کرنا' گاڑیوں یا سکوٹروں کو جلا دینا' مستقل طور پر ایکٹ ٹیڑوں کا رنگ ڈھنگ اور انہی کا طرز گفتار اختیار کرنا' اسباق یا لکچروں سے استفادہ کرنے کے بجائے ادھر ادھر سے نوٹ حاصل کر لینا' پھر امتحانوں کے وقت پرچے معلوم کر لینا' نقل ماری کے لئے باقاعدہ کمانڈو گروپ اور چھاپہ مار گروپ تیار کرنا' ہال کے نگراں کو جان کی دھمکیاں دینا' (حال ہی میں امتحان گاہوں میں گھس کر پرچے چھینے گئے' لڑکیوں کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا گیا) جبراً نقل کرنا اور کروانا' پھر پرچے جدھر جدھر جائیں پیچھے پیچھے ایسے جانا جیسے پھولوں سے رس چوسنے کے لئے شہد کی مکھی جاتی ہے' پیسے خرچ کر کے نمبر بڑھوانا یا نیا پرچہ لکھ کر شامل کرانا' یا بدرجہ آخر نمبروں کی آخری لسٹ پر نمبر زیادہ درج کرانا' اس طرح بغیر پڑھے لکھے اور محنت کئے' اے ون (a one) درجے پر کامیاب ہونا۔ اور کانووکیشن کے موقع پر ڈگری یا اس کے ساتھ سونے کا تمغہ بھی حاصل کر لینا۔ بس ساری دوڑ ڈگری کے ایک کاغذ کے لئے تھی۔ اس کا حصول تقریباً اسی طرح ہوتا ہے جیسے کچھ بڑے گھروں کے ''تہی جیب'' لڑکے کسی ماہر غنڈے کی رہنمائی میں مارچ کریں اور بنک لوٹ لیں۔ دولت حاصل کرنے کا آسان نسخہ۔ سو اسی طرح تعلیم میں کامیابی کا بھی آسان نسخہ رائج ہے۔ کچھ تھوڑے سے لوگ بچ بچا کے رہتے ہیں۔ مگر یہ حقیقی محنت کرنے والے طالب علم ہمیشہ گھاٹے میں رہتے ہیں اور ان کی محنت کا پھل دوسرے کھاتے ہیں۔ وہی الزام جو جاگیرداری اور سرمایہ داری پر

مارکسی طرز فکر کے لوگ لگاتے ہیں۔ ٹھیک وہی نظام تعلیم میں بھی چلتا ہے۔

ایک طالب علم کی سرگزشت یہ ہے کہ وہ نقل کے بجائے عقل پر قائم رہ کر تعلیم حاصل کرتا رہا۔ میٹرک کے امتحان میں حساب کے دس سوالوں کا پرچہ (سونمبر) کا آیا۔ اس میں اتنی قابلیت تھی کہ اس نے آدھے وقت میں پہلے ہی ۵ سوال حل کر لئے' اور بقیہ کو بھی وہ حل کر لیتا تو پورے سونمبر لینا اس کے لئے یقینی تھا۔ ایک نگراں صاحب آئے اور انہوں نے کہا کہ اپنا پرچہ ایک اور لڑکے کو نقل کرنے کے لئے دو۔ اس نے انکار کیا تو نگراں صاحب نے اس کا پرچہ چھین کر کہا جاؤ اب وقت ختم ہو چکا ہے۔ دوسرے روز اسے پھر بتایا گیا کہ اگر وہی طرز عمل رکھو گے تو ویسا ہی نتیجہ بھگتو گے۔ طالب علم نے ہتھیار ڈال دیئے' کیونکہ وہ پہلے ہی ۵۰ نمبر سے محروم ہو چکا تھا۔

یعنی ذہنیت اب یہ نہیں ہے کہ علم یا کم سے کم معلومات حاصل کرنی ہیں' بلکہ ڈگری کا قرطاس گلے میں لٹکانا ہے۔

مزید ستم یہ کہ اگر پاکستان کی یونیورسٹیوں میں ایم اے' اور پی ایچ ڈی کے جمع شدہ مقالات کی کوئی ایسی فہرست بنے جس میں کئے ہوئے کاموں کی درجہ بندی بھی کی جائے تو بہت ہی کم مقالات ایسے ملیں گے جو کسی نادر موضوع پر' ٹھوس انداز سے' نئے طرز کاوش کے ساتھ پیش کئے گئے ہوں' بلکہ اگر مسلسل گرتے ہوئے معیار کی رعایت کا سلسلہ ختم ہو جائے تو مقالات کی ایک کثیر تعداد (گستاخی معاف) نالائقی کا سرٹیفکیٹ ہو گی۔ بری طرح نقل ماری کی عادت' پچھلے کاموں سے استفادہ اور انکی تکرار' پڑھے بغیر ادھر ادھر سے اقتباسات جمع کر کے انہیں جوڑ لینا اور پھر ان کاموں پر طالب علموں کی داخلی پالیٹکس کی پاور کا اثر انداز ہونا' یہ صورت حالات ہمیں سال بہ سال پستی کی طرف دھکیل رہی ہے۔

''میکنو'' کے کھیل میں جس طرح (make a new) کا پرلطف تجربہ بچوں کو تفریح دیتا ہے' اسی طرح ہمارے ہاں شروع سے اب تک تعلیمی پالیسیاں بنتی چلی آ رہی ہیں ''ہر کہ آمد عمارت نو ساخت''۔ مگر درحقیقت الفاظ کا ادل بدل ہوتا ہے' عمارت نو کہیں نظر نہیں آتی۔ ورنہ تعلیمی پالیسی کی عمارت نو زمین سے آسمان کی طرف بلند ہوتی ہوئی تعلیم گاہوں اور کلاس روموں' یا لیکچر ہالوں میں ہر استاد اور طالب علم کو دکھائی دیتی۔ مگر یہاں تو سب جانتے ہیں کہ کولہو چل رہے ہیں اور بیل ان کے گرد گھوم رہے ہیں۔

گویا اس تعلیم کا کوئی محرک (incentive) سوائے اس کے نہیں ہے کہ کوئی نوکری (Job) مل جائے۔ جاب کے دائرے میں داخل ہونے کے لئے ایک پاس (Pass) چاہئے' وہ پاس ڈگری یا ڈپلوما ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بے روزگاروں کی کثرت کی وجہ سے کتنے لمبے ''کیو Queue'' میں ہمارے بی اے' ایم اے اور پی ایچ ڈی صاحبان کو کھڑے ہونا ہوگا۔ مگر یہاں بھی چاندی کی کنجی قفل کھول دیتی ہے کوئی بڑی سفارش یا معتدبہ رشوت' یہاں تو تبادلوں کے لئے بھی رشوت کے ریٹ مقرر ہیں۔ اب ذرا سوچئے کہ ایک بے مقصد آدمی' ایک کوتاہ علم (اور اس پہلو سے مخفی احساس کہتری رکھنے والا آدمی) رشوت دے کر کسی ملازمت یا افسری پر پہنچا ہوا آدمی کام کیا کرے گا؟ اس کا دماغ تو سب سے پہلے اپنے لگائے ہوئے سرمائے اور اس کے ساتھ مروجہ معیار زندگی کے تقاضوں کے مطابق اپنے سرمائے پر سود حاصل کرنے کی ترکیبیں سوچے گا۔

یہ ہے اصل مرتبہ و مقام آپ کے تعلیم یافتہ آدمی کا!

وہ نہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں کوئی کارنامہ دکھا سکتا ہے' نہ ادبی تخلیق و ایجاد کے کمالات پیش کر سکتا ہے نہ اس کے علم کے تھیلے میں اخلاقی اصولوں کے آلات ہیں جن کو کسی مقام پر برت سکے۔ وہ آپ کو سرِ راہ تنکے کھاتا ہوا یا کیلے کے چھلکے پھینکتا ہوا ملے گا' وہ ٹریفک رولز کو توڑتا ہوا ملے گا' وہ ممانعت کے باوجود پتنگ اڑاتا ہوا ملے گا' وہ گندے سے گندے ریڈیو فلم اور بلیو فلم دیکھتا ملے گا' وہ بے ٹکٹ سفر کرتا ملے گا' وہ کسی ریزرو سیٹ پر قابض ہوتا ملے گا' وہ بے تکے جلوسوں میں گلا پھاڑتا ملے گا' وہ چلتے پھرتے بڑھکیں مارتا ملے گا ـــــ اور وہ ہر کوچہ ہوس میں ملے گا۔ آخر یہ کیا تعلیم ہے؟

نوجوان مطلوب *

آج ہمیں ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے جو اپنا تعلیمی دور بہت قابل فخر معیارات کے ساتھ گزاریں' سائنسی اور غیر سائنسی علوم کی زمینوں کو فتح کریں اور اس فتح کے لئے وحی الٰہی کے فراہم کردہ اسلحہ شعورِ حقیقت سے پوری طرح کام لے سکیں' ایسے جوان جو وطن عزیز کی

* اقتباسات از ''تحریک اسلامی کو کیسے نوجوان درکار ہیں''

بہت بڑی نظر انداز شدہ ضرورت ـــــ علمی امامت ـــــ کے حصول کی جدوجہد میں لگ جائیں' وہ فلسفہ' نفسیات' تاریخ' سیاست حاضرہ' اقتصادیات[1] اور اسلامی موضوعات کے دائروں میں تحقیق کے ایسے عظیم الشان کام لے کے سامنے آئیں کہ مشرق و مغرب کے علماء و محققین ان سے بے نیاز نہ ہو سکیں' بلکہ انکا ہر طرف چرچا ہو اور ہر عالم دوسرے کو متوجہ کرے کہ فلاں موضوع پر ریسرچ کا کام بغیر فلاں کتاب کو پڑھے مکمل نہیں ہو سکتا۔ کیا ہم علم کے میدان میں ایسے سنگ ہائے میل گاڑ سکے؟ کچھ دوسرے لوگ ہوتے جو فکشن کے ادبی دائرے میں وقیع حیثیت کے ساتھ نکلتے اور اپنا لوہا منوا کر خیالات حق و باطل کے اس محاذ پر فتوحات دکھاتے جو ابھی تک کمیونسٹوں اور جدیدیوں اور سیکولر رجحان کے دانشوروں کے قبضے میں ہے' لیکن اس میدان میں کوئی بڑا فاتحانہ کام نہ ہو سکا۔

پھر یہ ضروری تھا کہ اپنی اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ کچھ نوجوان مفاد کے یاقوت و جواہر پر ایک نگاہ تحقیر ڈال کر اپنے آپ کو محض معقول گزر بسر کے عوض علمی' تعلیمی اور تحقیقی اداروں کے سامنے پیش کر کے درخواست کرتے کہ صاحب! ہم اللہ اور اس کے رسولؐ کے دین کے غلبے کے لئے کچھ خدمات انجام دینا چاہتے ہیں' آپ ہمیں ساتھ لے کر رہنمائی دیں۔ میری آرزو ہے کہ ہر نوجوان دور تعلیم اعلیٰ میں اور اس کے بعد دو چار سال میں کم سے کم ۵۰ علمی معیار کی کتب پر عبور رکھتا ہو۔ اتنی تیاری کے بغیر وہ ذہنی معرکہ نہیں لڑا جا سکتا جو ہمیں درپیش ہے جس نے ابھی تک ہمیں "رنگ" (Ring) کے جنگلے سے لگا رکھا ہے اور سر نہیں اٹھانے دیا' محض اپنے گھر میں اور ساتھیوں میں پھنے خاں بنے رہنے سے تاریخی بازیاں سر نہیں ہوتیں۔

پھر ایک کام یہ تھا کہ نوجوانوں کی ٹیمیں اپنے آپ کو سول سروس کے عہدوں کے لئے محکمہ خارجہ و داخلہ کے لئے' سی آئی ڈی کے لئے' مالیات کے لئے' کمپیوٹر سروسوں کے لئے' فوج کے لئے' پی اے ایف اور پی آئی اے کے لئے' ایٹمی توانائی کے لئے' ڈپلومیٹک مسائل

---

[1] نیز ظہور کائنات' نظام کائنات اور فلسفہ ارتقا پر کام کریں' نیز مستشرقین کی طرف سے اسلام' نبیؐ برحق' تاریخ اسلام کے خلاف جو کچھ لکھا گیا ہے' اس کا مکمل مطالعہ' اس کے تمام ضروری نوٹ اور تشفی بخش جوابات پیش کرنے کا فریضہ انجام دیں۔

کے لئے محنت کر کے ایسی تیاری کرتیں کہ جدھر جاتیں' دروازے ان کے لئے کھل جاتے۔
یاد رکھئے' اصل کام مستقبل کی علمی امامت' اخلاقی قیادت' نظریاتی سیادت اور گہری سیاسی اثر اندازی کی صلاحیت حاصل کرنا ہے۔ وہ بھی صرف خدا کے لئے' خدا کے رسولؐ کی محبت کی سرمستی میں' خدا اور رسولؐ کی ہدایات و تعلیمات کے شعور کے ساتھ اور خدا کے ذکر اور رسول ﷺ کے لئے درود مسلسل کے ساتھ۔

طلبہ کے اخلاق و کردار کی تباہی کے اسباب

ہمارے تعلیمی نظام کے علاوہ یہاں کے سماجی حالات (سیاسی اور معاشی بھی) ایک بحرانی صورت رکھتے ہیں' لہٰذا ـــــ فارغ التحصیل ہونے کے بعد طلبہ کی ایک خاص تعداد میں وہ شعور نشوونما پاتا ہی نہیں کہ نگاہ اخلاقی علو اور اس کے تقاضوں پر پڑ سکے۔

نصابات

زندگی کے بارے میں تعلیم کے مروج نصابی علوم سے گذرنے کے بعد نوجوانوں میں وہ ذہنی تمرکز پیدا نہیں ہوتا' جس کے بغیر کائنات' وجود' موت' خیر و شر' ہستی باری تعالیٰ کے متعلق متفرق تصورات کسی نقطے پر جمع ہو ہی نہیں سکتے اور ان میں سے کتنے ہی تصورات ایسے ہوتے ہیں جن کے متعلق کوئی شخص ایک گمان اور وہم یا غیر یقینی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے۔
بالفاظ دیگر الحادی' افادی اور مادی (مادہ پرستانہ) نصابی علوم انسانوں کو ایک ذہنی انتشار اور روحانی بحران سے دوچار کر دیتے ہیں۔ خصوصاً ہمارے معاشرے کی مذہبی حقیقتیں اور اخلاقی قدریں جب سامنے آتی ہیں تو حاصل کردہ علوم سے انکا دبا دبا یا کھلا کھلا ٹکراؤ دائمی انتشار کا مرض پیدا کر دیتا ہے۔ پھر ستم یہ کہ جہاں معاشرے میں یا خاندان میں تھوڑی بہت اخلاقی و دینی قدریں چمکتی دکھائی دیتی ہیں وہاں دوسری طرف اسلام کے نام لیوا' اسلام پر جزوی عمل کرنے اور دوسری طرف تعلیم جدید کے دودھ پر پل کر اسلام سے گریز اور انحراف کی راہیں نکالنے والے اور مسلمان ہوتے ہوئے عملاً غیر مسلموں کی طرح زندگی گزارنے والے لوگ چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ اس سے آج کے تعلیم یافتہ نوجوان کا انتشار ذہنی اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

بے مقصد زندگی

جدید تعلیم یافتہ طبقے کے نوخیز لوگ کسی بھی بنیادی اصول وعقیدہ اور کسی واضح نصب العین کے بغیر جب اپنے ماحول کے درمیان کھڑے ہو کر سوچتے ہیں تو جس بھی خواہش یا جذبے میں ابھار آ جائے اور خارجی عوامل میں سے جو بھی پوری کوشش سے وقتی طور پر مرکز نگاہ بن جائے وہ اس کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں اور انسانیت' دین یا اخلاق کے سارے تصورات سے آزاد ہو کر دوڑ لگاتے ہیں۔ مگر وہ جس چمکتی چیز کے لئے بھی لپکتے ہیں اسے پا لینے کے بعد انہیں محسوس ہوتا ہے کہ مسرت وتسکین کا ایک جگنو تھا جو اپنی چمک کھو بیٹھا۔ پھر وہ کسی اور شرر کے دیوانے ہو جاتے ہیں' غرضیکہ سراب کے بعد سراب کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے مگر سارے تجربات کی یاس انگیزیوں کے بعد ان کے دلوں میں اضطراب کی آگ اور زور سے بھڑک اٹھتی ہے اور ان کے رگ رگ میں جلن پھیل جاتی ہے۔ پھر مروجہ تہذیب انہیں اپنی ایسی ایسی گندی تفریحات وتعیشات کے گھاٹ تک لے جاتی ہے جہاں وہ بدمستی میں پھسل کر پیپ اور کچ لہو کے ایک تالاب میں غوطے کھاتے ہیں۔ الغرض قسم قسم کے مصنوعی نشے جب اپنا خمار چھوڑ کر رخصت ہوتے ہیں تو مریض اضطراب کے دل و دماغ سے شرف انسانیت کا سارا عرق نچوڑ لے جاتے ہیں۔ بس ایک کھوکھلا ڈھانچہ ناکام حسرتوں کی زد میں بے بسی کے زخم چاٹتا رہ جاتا ہے۔

اس سارے سفر میں اخلاق و کردار کے علامتی بورڈ کہیں آتے ہی نہیں!

معاشی سبب

فارغ التحصیل طلبہ کی ایک آزمائش اس وجہ سے بھی ہوتی ہے کہ وہ فی نفسہٖ علم کو پوری زندگی کی ایک ضرورت یا زخم ہائے پنہاں کے مرہم کی حیثیت سے جان ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ انہوں نے وہ علم پڑھا ہے جس کی گردش مفاد کے گرد ہے' مگر معاد سے وہ بے تعلق ہے۔

اس حالت میں نہ تو نوجوانوں میں تاریخ وفلسفہ کی تحقیقات کا جذبہ پیدا ہوتا ہے' نہ اعلیٰ درجے کے افکار کی تخلیق کا رجحان' نہ سائنسی تجربات وایجادات کا کوئی ولولہ' نہ ملت یا انسانیت کی خدمت کا کوئی پروگرام۔ ساری قابلیتیں اپنی ذات کے مادی ہیولے کے گرد گھوم جاتی ہیں یعنی یہ مروجہ تعلیم ان کی نگاہوں کو ایک ہی چیز پر مرتکز کر دیتی ہے وہ ہے معاش۔ آپ

والدین اور خاندان کی ذہنیتوں اور طلبہ کی امنگوں کا سرسری سا جائزہ بھی لیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ تعلیم دولت کی لونڈی ہے جو کسی کا ہاتھ پکڑ کر مالک تک پہنچا دیتی ہے۔ پھر دولت تو ایک محدود سا لفظ ہے' یہاں معیار زندگی کا اتنا عمودی اور افقی پھیلاؤ ہے کہ تمام لوگ زیادہ سے زیادہ بہتر درجہ پانے کے لئے حالت مسابقت میں ہیں اور ان کا دماغ ہر وقت کھولتا رہتا ہے۔ اس مسابقت مجنونانہ نے تو رہی سہی متاع خیر وخوبی کا بھی بیڑہ غرق کر دیا ہے۔ اس دوڑ کی کوئی انتہا نہیں' ماسوا اس کے کہ "حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ" (سورة التكاثر:۱۰۲)

اب مشکل یہ ہے کہ سائل اتنے ہیں کہ وسائل ان سے بہت کم ہیں۔ نتیجہ بڑے پیمانے پر بے روزگاری اور علاوہ ازیں ادنیٰ سطح کی مزدوری' ذلت وخواری کے ساتھ نہایت قلیل آمدنیاں اور ان طبقوں میں موت اور جہالت' بیماری اور جرائم اور منشیات کی چڑیلوں کے رقص جاری رہتے ہیں۔ درمیانے طبقے کے نصف زیریں کے احوال بڑے عبرتناک ہیں مگر یہاں تذکرے کا موقع نہیں۔

اب یہ جن پچھڑے ہوئے عناصر کا بیان ہے وہ اپنی زندگی کی کیاری میں قدروں کے پھول کیا اگائیں گے' وہ تو سنورے ہوئے تختوں کو بھی اجاڑیں گے۔

اب ہم اپنے تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی بدحالی کو زیر غور لاتے ہیں۔ خرابی احوال اور تنگیٔ وسائل ان کو اس قابل بھی نہیں چھوڑتی کہ وہ نئے نئے طریقوں سے راستے نکالیں۔ بخلاف اس کے وہ انتہائی خوفناک فرسٹریشن (Frustration) کے سانپ دماغ میں لئے ہوئے جائز رزق کے بجائے ناجائز اور حرام کے راستوں پر نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ افلاس کی محرومیوں اور ذلتوں کا ڈسا ہوا ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان جب ایک بار غلط راستے پر قدم رکھ دیتا ہے تو وہ فریب کار' جیب تراش' ملاوٹ اور اسمگلنگ بلکہ ہیروئن خوری اور ہیروئن کی اسمگلنگ جیسے کارنامے انجام دینے لگتا ہے۔ کچھ لوگ اور آگے بڑھتے ہیں بلکہ غیروں کی بنائی ہوئی تخریب کاری کی اسکیموں پر ایسی وفاداری سے عمل کرتے ہیں جو کبھی انہوں نے خدا یا رسول ﷺ کے لئے عمر بھر میں نہ دکھائی ہوگی۔[1]

---

[1] نوجوانوں کی تمام بنیادی فرسٹریشن میں ان کی درخواستوں کے مقابلے میں سفارشوں کا کام کر جانا۔ انٹرویو میں ان کے بہترین Bio Data کے باوجود ان سے نالائق لوگوں کا فائق ہو جانا۔ امتحانات میں جائز محنت سے حاصل کردہ نمبروں کے بالمقابل "نقل مافیا" کے الٹ پلٹ کرشمے' پے در ←

جن بیماریوں کا چارہ گر نظام تعلیم کو بننا تھا اب اگر وہی ان کے فروغ کا ذریعہ بن جائے تو ؎

مژدہ باد! اے مرگ! عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

نفسیاتی سبب

نوجوانی میں قدرتی طور پر ایک چیز نشوونما پا کر زور پر آ جاتی ہے یعنی آدمی میں Self Importance کا جذبہ ایک پوری شدت سے ابھرتا ہے۔ وہ معاشرہ کی توجہ حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن وہ علمی اعزاز کا شعور' اخلاقی علو' خدمت خلق یا کسی تصنیف یا کسی اچھے نتیجہ محنت کو سامنے لانے کے قابل نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ حصول مقصد کے لئے روایات سے ہٹے ہوئے غلط سلط بلکہ وجہ ملامت بننے والے طور طریقے اختیار کرتا ہے اور اس طرح افراد یا معاشرہ کو Shock دیتا ہے۔ پھر جب جواباً کوئی بلبلائے' خوف زدہ ہو جائے' ڈانٹے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔ یہی چیز ایک طرف گستاخی بن جاتی ہے' دوسری طرف معاشرہ کے توڑ پھوڑ کا باعث بنتی ہے' یہی بہت سے جرائم پیدا کرتی ہے۔ ہر شعبہ زندگی میں بگڑے ہوئے افراد معاشرہ کو دیتی ہے۔ اور بھی علامات اس بیماری کی ہیں مثلاً زبان کا حلیہ بگاڑ کر یا بے ڈھنگا لباس پہن کر' اپنی حرکات و سکنات کو شائستگی کے دائرے سے نکال کر' انسانی رابطوں اور رویوں میں خلل پیدا کر کے' لوگوں کو مذاق اور طنز و تحقیر کا نشانہ بنا کر' اپنی تہذیبی روایات اور قدروں کو پامال کر کے' وہ ظاہر کرتا ہے کہ میں ایک خاص امتیازی شخصیت ہوں۔

متخالف نظام تعلیم کی وجہ سے ہمارے نوجوانوں میں یہ احساس پیدا نہیں ہوتا کہ ہم باقی دنیا سے مختلف تشخص رکھتے ہیں' ہمارا کوئی نظریہ کائنات و حیات' شعور انسان و تہذیب اور اپنا سیاسی و ثقافتی تصور ہے۔ بخلاف اس کے طوفان مغرب نوجوانوں کو مغربی کلچر میں رنگ دیتا ہے وہ تقلید کا جوا اتار کر سر نہیں اٹھا سکتے۔ ان میں اغیار کے مسلط کردہ نظام کے خلاف جذبہ

← پے اضافے کا موجب بنتا ہے۔ معاشرے میں وہ رشوت خوروں اور دوسرے مال بنانے والوں کو جب بڑی بڑی عمارتیں بناتے دیکھتے ہیں اور سوسائٹی سرکاری خزانے میں نقب لگانے والوں اور غریب سائلوں کی کھال اتارنے والوں کی جب عزت کرتی ہے تو ایک بے روزگار یا غریب نوجوان سراپا شعلہ بن جاتا ہے۔

بغاوت پیدا نہیں ہوتا۔

طلبہ کی تنظیمیں

طلبہ کے کرداروں کی تباہی کا ایک سبب ان کی وہ تنظیمیں بھی ہیں جو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کام کرتی ہیں۔ عام طور پر ان تنظیموں کا نہج ہمارے ہاں یہ رہا ہے کہ یا تو وہ محض نسلی' علاقائی یا لسانی دھڑے ہوتے ہیں جو تعصب کا زہراب نوش کر کر کے پاگل پن کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ جو اپنے دھڑے کا ہے وہ اچھا ہو یا برا' ہمیں ہر حال میں اس کا ساتھ دینا ہے اور جو ہمارے دھڑے کا نہیں ہے اس سے ہماری دشمنی ہے۔ ان جذبات کی کارفرمائی میں ایسے ایسے نتائج نکلتے ہیں کہ میرٹ والے ناکام اور میرٹ میں پست لوگ کامیاب ہوتے ہیں' نیز باہم دگر تصادم ہوتے ہیں جو خون خرابے تک پہنچتے ہیں۔ جوانی کے اندھے جوش کے عالم میں جو بھی آسیب ذہن پر سوار ہو جائے' پھر وہ انسانیت کی تذلیل و تباہی میں کسر نہیں چھوڑتا۔ دوسری طرف کچھ وہ تنظیمیں ہوتی ہیں جو سیاسی جماعتوں کے تحت خاص خاص رجحانات کے لئے کام کرتی ہیں۔ یہ بھی طلبہ کو دوسروں سے کاٹنے اور اپنے ساتھ ملانے' نیز انتخابات کے زمانے میں خاص طور پر اپنا لوہا منوانے کے لئے مقابلے میں کام کرتی ہیں اور تند جذبات کی وجہ سے بار بار خون ریزیاں ہوتی ہیں۔ اس سیاسی تربیت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ طلبہ اپنے استادوں سے لے کر پرنسپل یا وائس چانسلر تک ہر کسی کو اپنی سیاسی طاقت سے خوف زدہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ناجائز مطالبات منواتے ہیں' اساتذہ کے تبادلے کرواتے ہیں' یونینز (Unions) کے لئے پارلیمنٹری پارٹیوں جیسے حقوق طلب کرتے ہیں۔ پھر جو کشمکش کبھی مکے' تھپڑ سے چلی تھی' اب کلاشنکوف تک جا پہنچی ہے۔

پاکستان بننے کے بعد جب اسلام پسند طلبہ منظم ہوئے تو امید پیدا ہوئی کہ ایک ایسا گروہ آیا ہے جو لسانی و علاقائی یا سیاسی' مذہبی دھڑوں کے دنگل میں کودنے کے بجائے تمام طلبہ کو یکساں اپنا مخاطب بنا کر دین و اخلاق کی دعوت دے گا۔ لیکن آگے چل کر ان کو اندازہ ہوا کہ انتخابات میں حصہ لئے بغیر اور یونین کے ذرائع کو حاصل کئے بغیر غلط عناصر کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد انتخابی مقابلوں کی سیاست شروع ہو گئی۔ طلبہ تنظیمیں سیاسی پارٹیوں کے ساتھ مل کر کام کرنے لگیں تو پھر یونین کے مقام سے اٹھنے والوں نے جنگی پالیسی اختیار کر

لی۔ اسلحہ اور غیر طالب علم غنڈے یونیورسٹیوں کے اندر جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تعلیمی ماحول کی اصلاح اور طلبہ کی اخلاقی تربیت کا کام اس طوفان کشاکش میں بالکل دب گیا۔

طلبہ کی یہ داخلی سیاست اور غیر سیاسی دھونس دھانس جب ہر طرف پھیلی تو جنگی کارروائیوں کی وجہ سے اچھے اچھے کام ملتوی ہو گئے اور نہایت ضروری اصول تہ میں چلے گئے اور دل و دماغ کسی اور ڈھب پر تیار ہونے لگے۔

ہمارے طلبہ جنہوں نے دعوت کے ساتھ خدمت طلبہ کے کام شروع کیے تھے ان کے لئے خدمت عوام کا بھی بڑا وسیع میدان مختلف اداروں اور شعبوں میں پھیلا ہوا تھا' مگر کسی نے ادھر توجہ کرنے کی فرصت پائی ہی نہیں۔ بلکہ بعد میں تو تعمیری مثبت خدمات جہاں تک ہو رہی تھیں ان کا سلسلہ بھی سکڑ گیا۔ ضرورت ہے کہ ایک ایسی تحریک اٹھے جو طلبہ کو مثبت نظریات پر جمع کرے اور طلبہ کو مذہبی و اخلاقی راستے پر خدا' ملت اور انسانیت سے محبت کرنا سکھائے۔ خدا کے لئے عبادت و دعا' ملت کے لئے دینی خدمات اور انسانیت کے لئے عمومی خدمات کے کام کر کے بہترین اخلاقی قدروں کا مظاہرہ کرے۔

ہم اب تک ایسا تعمیری کام نہ کر سکے۔ اب ہم معذرتیں کر کے تاریخ کو اس کا رویہ بدلنے پر راضی نہیں کر سکتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہماری ایک وسیع التعداد نسل وہ کچھ نہ بن سکی جیسا اسے ہم بنانا چاہتے تھے۔

منافقت

بہت بڑی بیماری جو پچھلے دس پندرہ سالوں میں خوب نشوونما پا کر چھا گئی ہے وہ منافقت ہے۔ ہمارے سیاست کار اسلام اور فلاح عامہ کے پروگرام لے کر اٹھتے ہیں لیکن عوام کے ووٹوں سے جب کامیاب ہو جاتے ہیں تو خوشنما تقریریں' تاویلیں' توجیہیں اور مجبوریاں ہزار بیان کریں گے' مگر مثبت سمت میں ایک قدم آگے نہ بڑھائیں گے۔

یہی منافقت اخبارات میں طرح طرح سے کام کرتی ہے۔ یہی منافقت تعلیم میں بھی گھس گئی ہے اور امتحانات میں نقل بازی' اور نمبر لگوانے کے لئے تگ و دو اور آخری مرحلے میں چند نمبروں کی تبدیلی سے ڈویژن بدلوانے کی کوشش' ان سارے معاملوں کی روح منافقت

ہے۔

خرابیوں کی بنیاد

ان ساری خرابیوں کی بنیاد ذہن کی اس کمزوری اور کم شعوری پر ہے کہ مغرب (امریکہ و یورپ) چونکہ دولت' معاش' پیداواروں' سائنسی ایجادوں کے لحاظ سے پیش پیش ہے اور اتنا پیش پیش کہ اسے جالینا آسان نہیں' پس فلسفوں' نظریات اور اخلاقیات و اجتماعیات میں بھی جو تصورات وہ دے رہا ہے وہ بالکل برحق ہیں' وہاں کے طور طریقے' آداب و شعار' انسانی رویئے' مختلف ادارے بھی جوں کے توں نقل کرنے کے قابل ہیں۔ مغرب پرستی' اس کی فکری اور ثقافتی بلکہ لسانی' تعلیمی اور سماجی معاملات میں بھی سب کچھ وہیں سے اٹھا لانا چاہئے۔ اس ذہنی غلامی اور خود ناشناسی اور اپنے دین و تاریخ سے بے خبری نے ''نقل بمطابق اصل'' کی جو بیماری پیدا کر دی ہے اس کی وجہ سے ایک تو ذہنوں کی حقیقی زرخیزی اور دلوں کا ابھار اور خودی کی معجزانہ کرشموں کا سدباب ہو گیا ہے۔ کوئی سیاسی ادارہ بنانا ہو یا کسی درزی کو لباس قطع کرنا ہو یا کسی آرٹسٹ کو کوئی ڈیزائن تیار کرنا تو ایسے تمام معاملات میں ادھر سے گائیڈ بکیں (Guide Books) تیار ملتی ہیں۔ وہاں حرام کو حلال مانا جاتا ہو تو ہمارے مہذب لوگ بھی شراب اور لحم خنزیر اور زنا اور جوئے میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اسے سرمایۂ فخر سمجھتے ہیں۔

یہ بیماری جب فکر و شعور کی گہری جڑوں تک جا پہنچتی ہے تو پھر اوپر کے پتوں اور کونپلوں کو نہیں بچایا جا سکتا ہے۔ اس بیماری میں مبتلا قومیں مسلسل پستی میں گرتی چلی جاتی ہیں۔

ہمارے نوجوان تعلیم سے آراستہ ہونے کے بعد بکثرت اس بیماری کے مکمل یا تین چوتھائی حد تک شکار ہو چکے ہیں۔ نہ اپنے دین و ایمان کی خبر' نہ اپنی تہذیب و ثقافت کا پتہ' نہ اپنی تاریخ اور اپنے اسلاف اور ان کے کارناموں کا شعور' نہ ماضی میں مسلمانوں کی سائنسی' طبی' فلکیاتی اور جغرافیائی نیز بحری علوم و تجربات کا کوئی تصور ـــــ بلکہ الٹا اپنی ہر چیز کو اور اپنے ماضی کو بلکہ دین کو باعث شرم سمجھ کر اسے چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ہمارے طلبہ ——— ہماری آئندہ نسل

نئی نسل کا بگاڑ کے بارے میں ایک بات ذہن نشین کر لیجیے کہ یہ کوئی فوری اور وقتی حادثہ نہیں ہے اور نہ صرف موجودہ نسل ہی کا مسئلہ ہے۔ بگاڑ کا سلسلہ ہماری پچھلی کئی نسلوں سے چلا آ رہا ہے موجودہ دور میں اس کی رفتار تیز اور دائرہ وسیع ہو گیا ہے۔

اس تمہید کو ذہن میں رکھ کر خرابی کے تمام اسباب کو دو نکات میں جمع کیا جا سکتا ہے۔[1]

نصب العین کا فقدان

داخلی طور پر نوجوانوں کو محکم عقائد' اخلاقی اقدار اور درخشاں تاریخی روایات سے سرشار ہوتے ہوئے ایک اعلیٰ درجے کا ایسا نصب العین مقدر ہونا چاہیے جس میں معاشرہ کی فلاح و بہبود سے لے کر نوع انسانی کی ترقی و سلامتی تک کے محرکات موجود ہوں۔ جس قوم کے نوجوان یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے پاس ایک روشنی ہے' ہم فانوس ہیں یا چراغ ہیں اور ہمیں تاریکی کے ماروں کو سہارا دینا ہے اس سے زیادہ خوش نصیب کون ہو گا؟ وہ نوجوان فیشن' روپے پیسے' نوکری' کاروبار' نسل رنگ' ہر چیز سے اس امر کو بالاتر رکھیں گے کہ ہم ساری دنیا کی بھلائی کے علمبردار ہیں لہٰذا ہمیں سب سے بڑھ کر امین اور خوش اخلاق اور محنتی ہونا چاہیئے اور ہمیں ہر اس شے سے اجتناب کرنا چاہیئے جو ہمیں ہمارے نصب العین' ہمارے عقائد اور ہمارے اخلاق سے ہم کو دور لے جائے اور ہماری تہذیب ہم سے چھین لے ——— چاہے وہ کتنے ہی شاندار معیار کا عیش و طرب ہو اور حسن و جمال کے کیسے ہی نادر نمونے سامنے ہوں اور تفریحات کے لئے طرح طرح کے میدان کھلے ہوں۔

کوئی شخص بھی جو خدا پرستانہ اعلیٰ مقصد رکھتا ہو اور جسے قیامت کی جوابدہی کا احساس ہو وہ نہ ہر خواہش کے پیچھے لپکتا ہے' نہ ہر لذت کے لئے آوارہ ہوتا ہے اور نہ ہر نظریئے کے

---

[1] ——— چراغ راہ۔ ۱۹۵۲ء

جال میں پھنستا ہے۔

افسوس کہ ہمارے زوال اور ہمارے ترقی یافتہ دشمنوں کے حملوں نے ہم سے اور ہمارے نوجوانوں سے یہ جوہر باطن چھین لیا ہے' جہاں ہے وہاں بھی بیشتر آدھا چوتھائی اور دوسری متضاد چیزوں کے ساتھ گڈمڈ یا بے جان رسموں کی صورت میں۔

لہٰذا اگر آپ دیکھتے ہیں کہ چاروں طرف اصول ٹوٹ گئے ہیں' اخلاق ریزہ ریزہ ہو گئے ہیں' عصمتوں کے آبگینے کرچی کرچی ہو گئے ہیں' دل بدل گئے ہیں' نگاہیں بدل گئی ہیں' راہیں بدل گئی ہیں تو یہ اس خلا کے ہوتے ہوئے کچھ عجب نہیں جو ہمارے اور ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں میں پیدا ہو چکا ہے اور بڑھ رہا ہے اور اس کے ساتھ وہ تضادات جو سیاست' مذہب' کاروبار' صحافت' ادب ہر دائرے میں پائے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں علی الخصوص یہ بات عرض کرنا ضروری ہے کہ نوجوانوں میں مایوسی اور فرسٹریشن زیادہ ہے۔ کیونکہ وہ ہر چیز میں ٹکراؤ اور تصادم دیکھ رہے ہیں' حتیٰ کہ والدین اساتذہ اور لیڈروں کے کردار میں بھی۔ نیز ان کو قدم قدم پر خیانت اور ناانصافیوں اور مظالم کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ماحول

دوسری وجہ ماحول ہے جو انتہائی حد تک بدل گیا ہے اس تبدیلی کو مختصراً بیان کرنا مشکل ہے۔ تاہم پہلی بات یہ ہے کہ علم اور خدمات سب سے دولت کا مرتبہ بڑھ گیا ہے۔ اور دولت اور معیار زندگی کی دوڑ میں بڑے چھوٹے دیوانہ وار بھاگ رہے ہیں' گر بھی رہے ہیں' مر بھی رہے ہیں' ٹکرا بھی رہے ہیں اور جو کامیاب ہوتے ہیں وہ بھی خراب ہو رہے ہیں' مگر یہ ایک جادو ہے کہ اس سے کوئی بچ کے رہ نہیں سکتا۔ سوائے ان چند لوگوں کے جن کے اندر کی ایمانی خودی انتہائی مضبوط ہو۔ ورنہ یہ سیلاب ہاتھیوں کے پاؤں اکھیڑ دیتا ہے۔

دوسری چیز انسانی کرداروں (شخصیتوں) کی بہ لحاظ احترام تبدیلی ہے۔ پہلے احترام اس کا تھا جو زیادہ علم' مضبوط ایمان اور اچھا کردار رکھتا ہو۔ اب اس کو اسٹیج سے ہٹا کر زمانے نے آدھی جگہ تو سیاسی حکمرانوں اور حکمران بن سکنے والے لیڈروں کے لئے چھوڑ دی ہے اور آدھی جگہ (بلکہ کچھ زیادہ) اداکاروں' گویوں' میراثیوں' ڈومنیوں' بہروپیوں کو دے دی ہے۔ خصوصاً حکومت نے ان عناصر کی سرپرستی اور ان کے اداروں کی پشت پناہی بڑھا دی ہے اور

اخبارات کا تو گویا اولین فریضہ یہ ہو گیا ہے کہ اس طرح کے لوگوں کو اتنا اونچا اٹھائیں کہ چاند تاروں کے وجودمات ہو جائیں اور نوجوانوں کے ذہنوں پر ان کا اتنا تسلط ہو جائے کہ ان کے دلوں میں دین و اخلاق کی باتوں اور مقاصد اعلیٰ کی بحثوں کے گھسنے کے دروازے ہی بند ہو جائیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جب اسلام کا اثر ہٹا کر سیکولرازم قائم کرنے کے لئے دین الٰہی کے نام سے کوشش کی گئی تھی تو اس وقت بھی طبلے سارنگی' ناچ رنگ وغیرہ کے معاملوں کو فروغ دیا گیا تھا۔

اسی کے لئے خارج کے احوال خراب کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ اہل سیاست حصول اقتدار کے لئے اور ایک دوسرے کی کاٹ کے لئے جوڑ توڑ اور سودا بازیاں کرتے ہیں' اپنے اعلانات اور فیصلوں کو بدلتے ہیں اور اپنے پیرو کاروں کو جرائم اور بدتمیزی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ یہ وبائیں مذہبی فرقوں کے حلقوں میں بھی جا پہنچی ہیں۔ شیخ و واعظ اور صوفیاء و اولیا کے کردار بھی اب نوجوانوں میں مزید اضطرابات پیدا کرتے ہیں۔ وڈیروں کا سیاست و معیشت پر بہت تسلط ہے اور اس تسلط کے گندے نتائج چاروں طرف پھیلتے ہیں۔ پھر مزید ستم یہ کہ باہر کی سپر پاورز بے خدا تہذیب کو ہم پر ٹھونسنے کے لئے پورا زور لگا رہی ہیں —— بذریعہ تعلیم بھی' بذریعہ علوم بھی' بذریعہ پروپیگنڈا بھی' بذریعہ ایڈ (aid) بھی' بذریعہ ڈپلومیسی بھی اور پھر سپر پاورز کے چھوٹ بھیئے بھی ہیں' یعنی انڈیا اور اسرائیل۔ وہ بھی اپنے گماشتوں کے ذریعے ہمارے اندر تخریب و تباہی کے علاوہ تہذیبی بگاڑ اور اخلاقی فساد کو پھیلانے کے لئے کوشاں ہیں۔ آپ کو اندازہ ہو گا کہ بھارت کی فلموں اور اس کے ساتھ مختلف اطراف سے پہنچنے والی بلیو فلموں نے حالات پر کیا اثر ڈالا ہے۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ منشیات کا کاروبار کس طرح گھر گھر تباہی کا زہر پہنچا رہا ہے۔

آخر میں میں یہ کہوں گا کہ اس خوفناک طوفان تباہی میں بھی کچھ ادارے تعمیری کام کر سکتے تھے —— سب سے پہلے گھر' پھر مدرسہ' پھر اخبارات' پھر لٹریچر' پھر سیاسی اکابر' پھر مذہبی بزرگ' پھر ارباب تصوف۔ لیکن افسوس ہے کہ ان میں سے اکثریت تو بالکل الٹی سمت میں جا رہی ہے۔ بقیہ کچھ ادھورے کام کر رہے ہیں۔ آخر میں وہ رہ جاتے ہیں جو جامد اور ناکارہ ہیں۔

شجرۂ تعلیم کے واجبی پھل *

گزشتہ جشن آزادی (۱۴/ اگست ۱۹۵۲ء) کے موقع پر پہلی مرتبہ یہ چھپی ہوئی حقیقت بالکل عریاں ہو کر سامنے آ گئی کہ ہمارے طلبا اخلاقی حیثیت سے انتہائی خطرناک حد تک روگی ہیں۔ انہوں نے راولپنڈی میں "لال دوپٹہ ململ کا" جیسا مکروہ نغمہ الاپتے ہوئے مارچ کیا ہے' نیز ابھی حال ہی میں (۱۹۵۳ء) پنجاب یونیورسٹی کے تحت امتحانات میں بیٹھنے کے لئے کراچی سے نوجوان طلباء کے جو گروہ لاہور آئے ہیں' انہوں نے پاکستان ایکسپریس پر آتے ہوئے مسلسل تین روز تک اپنی جن صلاحیتوں کو ملک کے سامنے پیش کیا وہ ہر طرف سے خراجِ لعنت لے رہی ہیں۔ انہوں نے عورتوں کے ڈبوں پر یورش کی ہے' انہوں نے ماؤں بہنوں سے مذاق کئے ہیں' ایک عورت کا برقعہ نوچ لیا ہے' ایک معمر آدمی کو پیٹا اور ننگا کیا ہے۔ ریلوے کے عملے کو سخت پریشان کیا ہے' گاڑی کو جا بہ جا روکا ہے' ریلوے لائن کے متصل جو باغات ہیں ان میں گھس کر پھلوں کی لوٹ مچائی ہے' ڈائننگ کار میں برتن توڑے ہیں اور کوئی حرکت ایسی باقی نہیں چھوڑی ہے جس پر انسانیت نفرین بھیجتی ہے۔

ادھر ۲/ مارچ (۱۹۵۳ء) کا یہ واقعہ ہماری تشویش پر مزید اضافہ کرتا ہے کہ لاہور میں چھ طلبا' طالبات کو چھیڑنے کے الزام میں گرفتار کئے گئے ہیں۔

یہ ہیں وہ لوگ جو کل ہماری زندگی کی باگ ڈور تھامنے والے ہیں۔ ان کے ذریعے کل ہمارا نظام سیاست و معیشت چلے گا۔ یہی کل ملک و قوم کے نفع و نقصان کا فیصلہ کرنے والے ہوں گے۔ انہی کے ہاتھوں کل اسلام کی قسمت بنے گی۔

بلاشبہ یہ نوجوان اپنی ان حرکات کے ذمہ دار ہیں اور قابل ملامت! لیکن ان کی اخلاقی حالت اس نظام تعلیم اور اس ماحول کے فساد کو بھی تو سامنے لاتی ہے جس کے سانچوں میں ان کے ذہن اور ان کی سیرتیں ڈھل رہی ہیں۔ ہمارا نظام تعلیم کتابیں تو طلباء کے کندھوں پر لادتا ہے لیکن ان کو اخلاق سے آراستہ نہیں کرتا۔ وہ سند تو دیتا ہے انسانی روح نہیں دیتا۔ وہ حیوانی احساسات کو تو جگاتا ہے انسانی جذبات کو بیدار نہیں کرتا' وہ خواہش پرستی کا درس تو دیتا ہے لیکن خدا پرستی کا نہیں دیتا' وہ عہدوں پر نگاہیں مرتکز کراتا ہے مگر کسی بلند نصب العین کی طرف متوجہ

* چراغِ راہ' اپریل ۱۹۵۳ء

نہیں کرتا۔

پھر اس نظام تعلیم کے ارد گرد دور دور تک پھیلا ہوا گندا ماحول ہے کہ جو ہمہ تن فسق و فجور کی ایک عظیم الشان یونیورسٹی ہے اس یونیورسٹی میں تن پرستی' نمائش کاری' نظر بازی' عشق آزمائی' ہوس رانی' رشوت خوری' چور بازاری' غنڈہ گردی پر زبان سے نہیں عمل سے درس دینے والے اور دن رات درس دینے والے اتنے بڑے بڑے پروفیسر وقف ہیں کہ اخلاقی فساد کے پرچے میں بالکل کودن ہی قسم کے کچھ طلبا پاس مارک لئے بغیر رہ جائیں تو رہ جائیں' ورنہ اکثر تو فرسٹ ڈویژن آتے ہیں۔

یہ طلبا ماحول کے باغیچہ کے وسط میں جڑیں چھوڑنے والے شجرۂ تعلیم کے بالکل واجبی پھل ہیں۔ آپ کو یہ پھل کڑوے لگتے ہوں تو ان پھلوں پر غصہ نہ اتاریئے۔ توجہ فرمایئے اس شجرہ خبیثہ پر جو اس کے سوا کوئی اور پھل دے ہی نہیں سکتا —— اور توجہ فرمایئے اس صحافت پر' اس ادب و شاعری پر' اس مصوری و موسیقی پر' ان فلمی مناظر پر' ان ریڈیو گانوں پر' ان مینا بازاروں پر' ان متحرک جلوہ ہائے سر راہے پر' جو اس شجرہ خبیثہ کی آبیاری کرتے ہیں۔ پھر اگر ولولہ اصلاح اپنے اندر کروٹ لیتا محسوس ہو تو اس شجرہ خبیثہ کی جڑوں پر کلہاڑا رکھنے اور اس ماحول کے خلاف معرکہ لڑنے کے لئے اٹھ کر کھڑے ہو جایئے۔

فتنۂ فردا*

نئی نسلوں کی اٹھان بڑے عجیب و غریب انداز سے ہو رہی ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جو کونپلیں آج پھوٹ رہی ہیں یہ کل کیا شکل اختیار کریں گی اور کیسے گل کھلائیں گی۔ بہر حال یہ فتنۂ فردا ہے جسے ہم نے پرورش دیا ہے۔

اس میں نئی نسلوں کا قصور نہیں ہے۔ قصور تو پیش رو نسل ہی کا ہے جس کا خمیازہ بعد والوں کو بھگتنا ہو گا۔ نئی نسل ایک مسئلہ ہے دو نمونوں کی آویزش سے پیدا شدہ۔ یہ آویزش گزشتہ دور تک کسی فیصلہ کن مرحلے میں داخل نہ ہوئی تھی۔ مگر آزادی کے بعد اس میں فیصلہ کن انداز پیدا ہو گیا ہے۔ اس سے قبل ہمارے اندر قوت مزاحمت تھی اور خاصی زور دار تھی۔ یہ

---

* ماہنامہ سیارہ' دسمبر ۱۹۶۳ء

مزاحمت سیاسی جماعتوں' مذہبی اداروں' تعلیم گاہوں' علمی و ادبی تخلیقات' سماجی سرگرمیوں' رہن سہن اور لباس وغیرہ ہر چیز میں کارفرما تھی۔

علامہ اقبالؒ نے اس قوت مزاحمت کو اکسانے کی آخری کوششیں کیں اور خود تحریک پاکستان سے توقع یہی تھی کہ "وہ ہماری قومی خودی کو مضبوط تر کرے گی اور پاکستان مغرب کے ملحدانہ نظریات اور فاسد ثقافت کے مقابلے کے لئے ایک مستحکم قلعہ ثابت ہوگا۔" مگر بدقسمتی سے تحریک پاکستان کو لے کے اٹھنے والی قوت مفاد کے چکر میں پڑ کر بکھر گئی اور ملی کردار کے نقیب کھوکھلے نعرے لگانے والے پستی میں گرتے چلے گئے۔

پاکستان میں چونکہ نظریہ پاکستان کو نشوونما اور برگ و بار لانے کا موقع نہیں ملا بلکہ اسے ملیامیٹ کرنے والی قوتیں زور پکڑتی چلی گئیں اس لئے موجودہ پیش رو نسل نے جو لڑائی دیوبند اور علی گڑھ کے دیئے ہوئے دوگونہ رجحانات کے تحت شروع کی تھی وہ ہرتی چلی گئی۔ یہ پیش رو نسل خود مادی مفاد کے پیچھے ایسی دیوانی ہوئی ہے کہ اصول و نظریات اور روایات و اقدار کو اس نے پامال کر دیا ہے۔ اب نئی نسل کو نہ تو اسلامی نظریات پر اعتقاد دیا جا سکا اور نہ ان کی نگاہ میں اپنی روایات و اقدار کا احترام قائم ہو سکا۔ یہ نسل اپنی بنیادوں سے اکھڑ چکی ہے اس لئے خلا میں آوارہ ہے۔

مجموعی ماحول کے فساد کی وجہ سے نوبت اب یہاں آ پہنچی ہے کہ معاشرے کا جو عنصر فکری اور ثقافتی آویزش میں آج بھی مضبوطی سے کھڑا نبرد آزما ہے اور جس نے دین کو سرمایہ حیات بنا رکھا ہے اور شرافت کی اقدار کو سینے سے لگا رکھا ہے' اس کی اولادیں بھی اس کی نظر کے سامنے بہک رہی ہیں اور وہ بے بس ہے۔

میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ اول درجے کے شرفا کے بچے ٹیڈی ازم یا نیم عریاں لباس سے سرشار ہو رہے ہیں' وہ تاش اور چوسر کھیلتے ہیں' وہ گندے عناصر کے ساتھ آوارہ گردی کرتے ہیں' وہ دن اور رات کے مختلف حصوں میں گھروں سے غیر حاضر رہتے ہیں۔ وہ اپنے سفلہ مزاج دوستوں کے جھرمٹ ساتھ لے کر اپنے اور دوسروں کے گھروں میں گھس کر قہقہے لگاتے اور شور و غوغا کرتے ہیں۔

ان میں اپنے سے بڑوں کا احترام ختم ہو رہا ہے۔ ان کو دوسروں کے آرام کا لحاظ اور دوسروں کی تکلیف کا بالکل خیال نہیں' راہ چلتی لڑکیوں کو گھورتے ہیں' ان کو کسی تعمیری و سنجیدہ کام

سے کوئی دلچسپی نہیں' انہیں اپنے بزرگان خاندان تک کے انداز فکر کا پاس نہیں اور انہیں روکنے ٹوکنے کی جرات کوئی بھی نہیں کر سکتا۔

کیا قائدین' معلمین اور مصلحین اس فتنۂ فردا کی روک تھام کے لئے کوئی تدابیر بتا سکتے ہیں؟

ہماری نگاہ میں سب سے بڑی تدبیر یہ ہے کہ اپنی آئیڈیالوجی کی بنیاد پر کوئی ایسا تعمیری نصب العین سامنے رکھا جائے' جس کے لئے ایک ہمہ گیر تحریک چلے اور اس تحریک میں خود موجودہ پیش رو نسل خلوص سے قوتیں صرف کرے اور یہی تحریک نوجوانوں کو مصروفیت فراہم کرے۔ اسی تحریک کے واسطے سے ان کا ٹوٹا ہوا رشتہ نظریہ اسلامی اور اقدار اسلامی سے جڑے اور اسی کے ذریعے ان میں کردار نشوونما پائے۔

بدقسمتی سے یہ مثبت کام جس کو کرنا چاہئے وہی اس کے کرنے والوں کی راہ میں مزاحم ہیں۔

کل کی مائیں*

اعلیٰ تعلیمی اداروں کی لڑکیوں کے ذہنی رجحانات کا ایک جائزہ اخبارات میں شائع ہوا ہے اس جائزے کی رو سے لڑکیوں کی اکثریت میں دو رجحانات غالب ہیں۔

— ایک تو انہیں اپنے معاملات میں والدین کی مداخلت سخت ناگوار اور ناقابل برداشت ہے۔

— دوسرے وہ فیشن اور آرائش کے نئے تقاضوں کو دل کھول کر پورا کرنا چاہتی ہیں۔

جائزے کے اس ماحصل کو سامنے رکھئے تو سوچنے اور محسوس کرنے کے کئی نکات سامنے آتے ہیں۔

ہمیشہ ایسا ہوا ہے کہ نئی پود جب اٹھتی ہے تو ادھ کچرے ذہن کے ساتھ وقتی جذباتی ہیجانات کے تحت اس میں طرح طرح کی خواہشیں ابھرتی ہیں جن کو وہ اچھے اور برے کی تمیز کے بغیر لبیک کہتی ہے۔ نئی پود کو نئے تجربے کرنے کا لپکا ہوتا ہے۔ دوسری طرف والدین'

---

* سیارہ' اپریل ۱۹۶۵ء

خاندان' اساتذہ اور مجموعی سماجی ماحول ان کی نئی نئی خواہشوں میں مزاحم ہوتے ہیں۔ چونکہ ایک طرف سے شفقت کا اور دوسری طرف سے ادب و احترام کا معاملہ ہوتا ہے اس لئے نئے تقاضوں اور پرانے تصورات کے درمیان مزاحمت ہونے سے تبدیلی میں تدریج پیدا ہوتی ہے' اقدامات میں توازن آ جاتا ہے اور مزاجوں میں ٹھہراؤ رہتا ہے۔ اس طرح سرمایۂ قدامت میں جو کچھ اچھا ہے وہ سلامت رہ جاتا ہے اور تحائف جدت میں سے وہی چیزیں استعمال کی جاتی ہیں جو فی الواقع قابل قدر ہیں۔ دوسرے قدیم وجدید عناصر ہم آہنگ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح جو تغیرات آتے ہیں وہ ''حادثے'' نہیں بنتے بلکہ ارتقائی عمل کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ ماں باپ اور اولادوں کا گہرا تعلق ماضی اور مستقبل کو حال کے اسٹیج پر گلے ملائے رکھتا ہے اور امروز وفردا مل جاتے ہیں۔ مگر جب اولادیں والدین کی سرپرستی و رہنمائی سے کلی بغاوت چاہیں اور ذہنی انقطاع کا مطالبہ کریں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بغاوت کا طوفان امڈ رہا ہے جس کے ہوتے ہوئے توازن کا امکان نہیں رہتا' ماضی سے مستقبل کا رشتہ کٹ جاتا ہے اور معاشرہ کے تمدنی وجود کا تسلسل قائم نہیں رہ سکتا۔

ایک قابل توجہ امر یہ ہے کہ نئی نسل کی توجہ بدن کے تقاضوں اور زندگی کے ظاہری پہلو کی طرف زیادہ ہے' بلکہ مجنونانہ حد تک ہے۔ دکھ یہ ہے کہ اس وبا میں لڑکیاں ـــــ کل کی مائیں ـــــ بھی بری طرح مبتلا ہو گئی ہیں' بلکہ بہک رہی ہیں جائزہ کے آئینے میں لڑکیوں میں پایا جانے والا کوئی مقصد بلند نہیں جھلکتا' کسی بڑے اخلاقی مشن کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ خوبصورت بننے اور زندگی کا لطف لینے کے علاوہ کوئی اور جذبہ دکھائی نہیں دیتا۔

ـــــ تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے بچے اغیار کے طلسم کے شکار اس انداز سے ہو رہے ہیں جیسے ان پر بھوت پریت کا سایہ ہو۔ کسی پر جن آتا ہے تو اس کی ساری حرکات غیر اختیاری ہوتی ہیں۔ اس کی اپنی شخصیت کھو جاتی ہے ایک نئی شخصیت انوکھی حرکات کرنے لگتی ہے۔ عجیب عجیب باتیں اس کی زبان سے ادا ہوتی ہیں۔ وہ رونے کی جگہ ہنستا ہے اور ہنسنے کی جگہ روتا ہے' وہ اپنے بزرگوں کو گالی دینے لگتا ہے اور کسی دشمن سے پیار کرنے لگتا ہے۔ گھر کے لوگ' ہمدرد اور خیر خواہ بے بسی سے دیکھتے ہیں۔ بس اسی طرح قومی پیمانے پر ایک دورہ پڑ رہا ہے مغربیت کا جن سوار ہے۔

بیرونی اثرات لینا جبھی مفید ہوتا ہے کہ ان پر کوئی انضباط ہو' وہ کسی چھلنی سے چھن کر

آئیں' ان میں چھانٹ پرکھ کی جائے اور اپنے اصول' اپنے تصورات' اپنی اقدار اور اپنے تشخص کو صحیح سلامت رکھنے کا اہتمام ہو۔ اس معاملے میں جو ذمہ داری خاندان پر' نظام تعلیم پر' ادب و صحافت پر' مجموعی سماجی ماحول پر اور فرماں روا طاقت پر عائد ہوتی ہے' افسوس کہ اسے کوئی بھی پورا کرنے والا نہیں۔

پھر یہ بات جہاں خوش آئند ہے کہ لڑکیوں میں کچھ تعداد مذہب سے وابستگی رکھنے والی ہے' اسی بات کا دوسرا پہلو مایوس کن بھی ہے کہ یہ مذہب پسندی بے جان اور منفی قسم کی ہے۔ اس مذہب پسندی میں کوئی جذبہ اقدام نہیں' اس میں مشن کی سی روح نہیں۔

یہ ہے دھارے کا رخ! کیا آپ اسے اچھے رخ پر موڑ سکتے ہیں؟

ثقافتی سرطان درس گاہوں میں *

سرطان ایک "چور مرض" ہے یعنی آہستہ آہستہ جسم میں ریشے پھیلاتا جاتا ہے' اور ایک دن آتا ہے کہ ننھے ننھے خلّیات کو چپکے چپکے شکست دینے والے یہ ریشے آدمی کے پورے بدن کو پچھاڑ لیتے ہیں۔ آپ سرطان کے خلاف مضامین لکھتے رہیے' تقریریں کرتے رہیے' احتجاج کیجیے' روئیے اور چیخیے' مگر سرطان اپنا کام آرام سے کرتا رہے گا۔

ہمارے معاشرے میں بھی مغربی ثقافت نے سرطان کی طرح ہماری اقدار و روایات کے خلیات کو تباہ کرنے کا کام ہماری تنقیدوں اور احتجاجوں کے باوجود جاری رکھا ہے ــــــ اور ستم یہ کہ ثقافتی سرطان درس گاہوں میں بھی تیزی سے پھیل رہا ہے۔

لاہور کے ایک مقامی کالج کی طرف سے لڑکیوں کی ٹیم کا عید کے روز دہلی میں جا کر ہاکی میچ کھیلنا اس معاشرے کے لئے سانحہ ہے جو اسلام کے نام پر قائم ہوا ہے۔

جس ترقی نسواں کا آغاز اس معصومانہ تصور سے کیا گیا تھا کہ اسلام نے عورت کو بھی انسانیت کا درجہ دیا ہے اور تعلیم حاصل کرنے کے حق سے نوازا ہے' لہٰذا اسے آگے بڑھنے کا موقع دینا چاہیے' اس ترقی نسواں کا دروازہ کھلنے کے بعد اب قافلۂ ترقی ان منازل سے گزر رہا ہے جن سے گزر کر مغربی معاشرہ حرام اولادوں اور کنواری ماؤں کے اوج کمال پر آ پہنچا ہے۔

---

* سیارہ جون ۱۹۶۸ء

کیا ہماری بھی یہی طے شدہ منزل ہے' یا ہمیں کسی حد پر رکنا ہے۔

اور اب ان نئے نئے تجربات میں کسی نے کبھی اسلام کو یاد نہیں کیا کہ اس کے حدود و حلال و حرام کیا کہتے ہیں۔؟

ہم کسی ایسے عمل تنویم کی زد میں ہیں کہ نہ قوم کے لیڈروں کی توجہ ادھر جاتی ہے' نہ وزراء کو کوئی احساس ہوتا ہے اور نہ محکمہ تعلیم کے کارپرداز مضطرب ہوتے ہیں۔ لاہور کے اس لبرل کالج نے اپنی ایمان سوز اور اخلاق بگاڑ تربیت میں اتنی کامیابی حاصل کر لی ہے کہ اس کی طالبات میں یا ان کے والدین میں کوئی جذبۂ احتجاج پیدا نہیں ہوتا' لاہور میں کسی ہال کے اندر بھی اس واقعہ پر کوئی احتجاجی اجلاس نہیں ہو سکا۔ دو چار افراد کے تاثرات اخبارات میں پائے گئے' یا اکا دکا نوٹ لکھ دیا گیا اور قصہ ختم۔

منظر زنانہ کالج کا*

منظر زنانہ کالج کا ہے۔ مردوں کا ہجوم بھی ہے اور صدہا لڑکیاں گھوم پھر رہی ہیں۔ تمام لڑکیاں فیشن کی متحرک ماڈل ہیں ——— ماڈرن فیشن کے ماڈل بھی اور الٹرا ماڈرن فیشن کے ماڈل بھی۔ دو چار فیصدی غریب لڑکیاں وائل کی قمیصیں اور ململ کے دوپٹے پہنے سادہ انداز میں ہیں' مگر سخت سکڑی سمٹی اور جھینپی ہوئی ——— جیسے کسی جرم میں مبتلا ہیں۔ دو چار برقعے بھی دکھائی دیئے مگر بلا استثنا ہر چہرہ آزاد۔

کیا پرنسپل اور پروفیسروں سے لے کر پورے محکمہ تعلیم اور سربراہان ملت تک کوئی نہیں جوان کو یہ راستہ دکھا سکے کہ:

- مسلمان خواتین اور لڑکیوں کے سے انداز اختیار کرو۔
- یا کم سے کم سادگی کو شعار بناؤ۔

معلوم ہوتا ہے کہ ایک اندھی رو ہے جس میں نہ لڑکیوں کو سوچنے کی مہلت' نہ پروفیسروں کے لئے کوئی لمحہ فکریہ' نہ پرنسپلوں کے لئے کوئی مقام تشویش اور نہ کارپردازان تعلیم کے پاس اسلامیت کے تقاضوں پر غور کرنے کی فرصت اور نہ سربراہان ملت کے ہاں مہلت

---

* ماہنامہ 'سیارہ' ستمبر ۱۹۷۰ء

کاوش۔ بس ایک مسمریزم زدہ قافلہ ہے جو نامعلوم راہوں پر نامعلوم منزل کی طرف چلا جارہا ہے۔

کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

کیا کوئی صورت ہے ــــ کوئی موقع ہے ــــ کوئی طریقہ ہے ــــ کہ ہم اپنی درسگاہوں کو روحانی اور اخلاقی لحاظ سے قتل گاہیں بننے سے بچا سکیں؟ ہماری درسگاہوں پر ہمارے دین اور ہماری ثقافت کا سکہ چلے' کسی بیرونی نظام فکر و ثقافت کی حکمرانی باقی نہ رہے۔؟

ہم تو ایک ہی بات جانتے ہیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے عورت کے لیے عفت و حیاء کی جو قدریں اور عدمِ اظہار زینت (فیشن وغیرہ) اور تقلید اغیار سے اجتناب کرنے کے اصول معین فرمائے ہیں وہی برحق اور باعث فلاح ہیں۔ اس تعلیم کے بخلاف مغرب نے یونانی پس منظر کے ساتھ جو معاشرت و ثقافت اختیار کی وہ تدریجاً بد سے بدتر نتائج کی طرف بڑھتی جا رہی ہے' اور اگر ہم نے بھی تقلید مغرب جاری رکھی تو وہ سارے گندے نتائج یہاں بھی رونما ہوں گے جو مغربی معاشرہ کے جنسی اور ازدواجی دائروں میں ہو رہے ہیں۔

نصابات

مغربی فلسفۂ حیات کی بنیاد پر ترتیب دیئے ہوئے نصابات کو قطعاً برطرف کر کے اسلامی معتقدات اور اسلامی حکمت کی بنیادوں پر نئے نصابات مرتب ہونے چاہئیں۔

عبوری دور میں ہمیں چند اہم کام ضرور کرنے چاہئیں۔

الف انسانیات وعمرانیات (Humanities) کی حد تک ہر درجے میں ہر نصابی کتاب اور مضمون کے ساتھ ایک تنقیدی حصہ لکھوا کر شامل کرنا چاہیے اور اسی کے مطابق امتحانی پرچوں میں سوالات آنے چاہئیں کہ فلاں نظریے پر فلاں شخص کے افکار پر' فلاں کتاب پر ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے اظہار خیال کرو۔

ب ہر علم و موضوع پر ایسی ٹھوس اور معیاری کتابیں اور مجموعہ ہائے مقالات شامل نصاب کیے جائیں جو ہمارے اپنے مفکرین اور علماء اور دانش وروں نے اسلامی بنیادوں پر لکھے ہوں۔

یہاں میں چند کتابوں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں مگر ان کے نام درج کرنے سے پہلے یہ کہوں گا کہ دائرہ علم میں سیاسی تعصبات کو ہرگز دخیل نہیں ہونا چاہیے (بدقسمتی سے یہ تعصب ہر جگہ چوکی جمائے بیٹھا ہے) بلکہ معیار مطلوب پر پرکھنے سے جو چیز بھی اچھی معلوم ہو اسے اختیار کرنا چاہیے مثلاً انگریزی میں فاضل مسلمانوں کی لکھی ہوئی دو کتابیں ایسی ہیں جن کو مناسب تعلیمی درجوں کے انگریزی نصاب میں شامل ہونا چاہیے۔ ایک اے' کے' بروہی کی Adventures In Self Expression اور دوسری علامہ اسد کی Road to Mecca بلکہ Islam at the Crossroads کو بھی شامل کر لینا چاہیے۔

اب میں ان چند علمی کتابوں کا تذکرہ کرتا ہوں جن میں علمی اور سائنٹیفک طریقے سے مغرب کے نظام فکر اور نظام تہذیب پر تنقید کی گئی ہے اور یہ اگر طلبہ کو مختلف مدارج کے کورسوں میں پڑھا دی جائیں تو وہ خود شعوری سے آراستہ ہو کر مغرب کی غلطیوں اور کمزوریوں پر گرفت

کر سکتے ہیں۔ کم سے کم وہ مرعوبیت تو باقی نہ رہے گی جو کسی آزاد قوم کے شایان شان نہیں۔
مسلمانوں کا عروج و زوال از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی' انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام از پروفیسر عبدالحمید صدیقی' علم جدید کا چیلنج از وحید الدین خاں' تنقیحات از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

یہ کتابیں ہمیں طلسم مغرب سے نکالنے میں مدد دے سکتی ہیں جس کے بعد محض معلوماتی' سائنسی اور ٹیکنیکل استفادہ کرنے میں کوئی خرابی باقی نہیں رہ سکتی۔ اس کے ساتھ اگر اتنا کام اور ہو جائے کہ اقبال نے مغرب' مغربی علوم' مغربی تہذیب اور اس کے مختلف اجتماعی ڈھانچوں' سرمایہ داری' نازیت اور کمیونزم وغیرہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے خوبصورتی سے مرتب کرایا جائے۔

علاوہ ازیں ایسے قدیم و جدید مصنفین کی ایک فہرست مرتب کرائی جائے جن کی منتخب کتابوں یا مقالات کو نصابی کتابوں میں شریک کرنا چاہیے' نیز جن کے ناموں سے آئندہ نسلوں کو لازماً متعارف ہونا چاہیے۔

ج۔ جن لکھنے والوں کی تحریریں یا اقتباس لیے جائیں ان کی جانچ پرکھ اس انداز سے ہونی چاہیے کہ یہ مسلم زاویہ نگاہ سے یہ بات پیش کرنے والے ہیں۔ اگر کسی اور طبع کے آدمی کی کوئی چیز اپنانی پڑے تو مختصراً اس کا تعارف کرا دیا جائے بغیر اس کے کہ اس پر کوئی حملہ ہو۔ بس یہ سمجھ لینا چاہیے کہ نصاب کوئی پارلیمنٹ نہیں ہے جہاں سب کی نمائندگی ضروری ہو بلکہ صرف ان تحریروں کو اس میں شامل کیا جائے جو صحیح اسلامی اساس پر قائم ہوں یا اس سے منحرف نہ ہوں۔

د۔ مغربی ادبیات پڑھاتے ہوئے ایک تو ایسی چیزیں منتخب کی جائیں جن میں جنسی گندگی اور الحاد و مادہ پرستی کے عناصر نہ ہوں۔ دوسرے ان کو پڑھانے کا انداز وہ ہو جو ہمارے عربی مدارس میں عرب کی جاہلی شاعری کے پڑھانے کا رہا ہے۔ صدیوں سے جاہلی شاعری میں خلاف اسلام معیار کی چیزیں پڑھائی جاتی ہیں مگر اس سے کبھی فساد اخلاق پیدا نہیں ہوا۔ اس کے وجوہ دو تھے۔

ایک یہ کہ مجموعی سلسلہ نصابات (جس میں قرآن و حدیث کا غلبہ تھا) میں یہ حصہ بہت کمزور رہتا ہے۔ دوسرے استاد کی شخصیت اور تعلیمی ماحول کی پاکیزگی طلبہ کو اس کے برے

اثرات سے محفوظ رکھتی تھی۔

ر۔ سائنسی علوم کے پڑھانے میں سب سے پہلا اہتمام یہ ضروری ہے کہ سائنس کے ساتھ جو ملحدانہ فلسفہ ممزوج ہوتا ہے' اسے چھانٹ کر الگ کر دیا جائے اور اس کی جگہ اسلامی اعتقاد و حکمت کو اس میں جذب کیا جائے۔ سائنس کی ہر کتاب میں نہ صرف یہ کہ ایک مقدمہ میں سائنس کی حیثیت (علم اشیاء) اور اس کے ذریعے قوانین الٰہی کی دریافت کی وضاحت کی جائے' بلکہ ثابت شدہ سائنسی قوانین (نہ کہ محض Theories) کو خدا کے قوانین کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔

علاوہ ازیں طالب علم کو یہ معلومات بھی دی جائیں کہ کسی بھی طبعی یا تکنیکی علم کے دائرے میں نبی اکرم ﷺ سے لے کر بعد کے مسلمانوں تک نے اپنے اپنے حالات زمانہ کے لحاظ سے کیا حصہ ادا کیا' اور علمی تدوین کے کیا کارنامے انجام پائے۔ تاکہ طالب علم یہ تصور لے کے نکلے کہ اس چراغ کے اصل جلانے والے ہم تھے اور اب پھر ہمیں اس کو روشن تر کرنا ہے۔

سائنس (تسخیر مادہ) کے ساتھ اخلاقی تقاضوں کو ہم آہنگ رکھنے کے لئے ہمارے نظام تعلیم کو نئی نسلوں کا ذہن تیار کرنا چاہیے۔

۳۔ ایک نیا مضمون ہمارے ہاں پاکستان' نظریہ پاکستان' تحریک پاکستان اور تاریخ پاکستان پر مشتمل ہونا چاہیے۔ تاکہ نئی پود اس کشمکش کے اسباب اور اس میں دی گئی قربانیوں سے واقف ہو جسے اس کے اسلاف نے برسوں جاری رکھ کر ایک آزاد سلطنت کو حاصل کیا اور اس آزاد سلطنت کا بنیادی مقصد ان کے سامنے متعین ہو۔

نصاب سازی

(۱)

نصابات کی تیاری میں قومی نصب العین کو مدنظر رکھنے کے علاوہ یہ بات بھی اول قدم پر طے کر لینی ضروری ہے کہ اسلام میں مذہب انفرادی معاملہ ہے یا اجتماعی؟ اور اسلام پوری زندگی پر محیط ہوتا ہے یا اس کا ایک جزو بن کر رہتا ہے؟ پھر اگر اسلام کو خود اس کی اپنی منشا کے مطابق پوری زندگی کا دین تسلیم کیا جائے تو نظام تعلیم ایسا اختیار کرنا پڑے گا کہ جس میں سے دین و دنیا کی تفریق کا ذرا سا تصور بھی طلبہ اخذ نہ کر سکیں۔ اور نہ انہیں یہ شبہ لاحق ہو سکے کہ اسلام کسی دوسرے نظام کا جزو بن کر ــــ یا غیر اسلام سے اشتراک کر کے بھی رہ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جمہوری ممالک میں نصاب جمہوریت عام نصاب سے الگ نہیں ہے کہ اس کا استاد اور پیریڈ جداگانہ ہو اور اسی طرح روس میں اشتراکی دور میں اشتراکیت کے نصاب کو دوسرے مضامین سے جداگانہ نہیں قرار دیا گیا کہ بقیہ نظام تعلیم کے ساتھ اشتراکیت کی تعلیم کا ایک ٹکڑا الگ ہے کیونکہ کسی اصولی نظام زندگی کی تعلیم کا یہ طریقہ ہے ہی نہیں۔

(۲)

ہمارے لئے ناگزیر ہے کہ ہم تمام مضامین میں تعلیم دینیات کو سمو کر پورے نظام تعلیم کو دینی بنا دیں۔ ہمارے یہاں فلسفہ پڑھایا جائے تو وہ اسلامی فلسفہ ہونا چاہیے۔ ریاضی سکھائی جائے تو اس میں دینی ضروریات کو پورا کرنے کا اہتمام ہونا چاہیے۔ طبیعات کی تعلیم دی جائے تو طبیعات سے دین نے جو جو استدلال کئے ہیں اور کائنات کے طبعی نظام کے متعلق جو اہم قوانین بیان کئے ہیں وہ اس میں واضح ہونے چاہئیں' تاریخ بیان کی جائے تو اس فلسفہ رزم خیر و شر اور حکمت فنا و بقائے اقوام اور تاریخ میں ان اسلامی اصولوں کی کارفرمائی کے اثبات کے لئے بیان کی جائے جنہیں اسلام نے پیش کیا ہے۔ سیاست پیش کی جائے تو وہ اسلامی

سیاست ہو اور معاشیات پیش کی جائے تو وہ اسلامی معاشیات ہو ـــــ اور یہ امر نصاب تعلیم کے ہر گوشے میں ملحوظ رہے کہ طلبہ میں ہمیں غیر اسلامی اصول و نظم پر تنقید کرنے اور خالص عقلی طریق پر اسلام کی فوقیت کو محسوس کرنے کی قوتیں ابھارنی ہیں۔

اسلامی نظام تعلیم کے لئے وہ سانچہ ہو جس میں ہمارے جملہ علوم و فنون کے نصاب ڈھل جائیں۔ جہاں تک اسلام کے بنیادی حقائق اور اساسی عبادات اور دوسرے مذہبی مسائل کا تعلق ہے وہ زبان دانی کے نصاب میں جذب کر دیئے جانے چاہئیں۔

دین و دنیا کی تفریق کے خطرناک تصور کا سدباب کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ ہم تعلیم دینیات کا کوئی جداگانہ پیریڈ' جداگانہ ٹیچر اور جداگانہ نصاب مقرر کرنے سے پوری طرح اجتناب کریں۔ پوری تعلیم کو تعلیم دینیات ہونا چاہیے۔ یعنی دنویات کے متعلق دین کے مطالبات ہر شعبے میں واضح طور پر سامنے لانے چاہئیں۔ ہمارے ہر ٹیچر اور پروفیسر کو معلم اسلامیات ہونا چاہیے اور ہمارے ہر پیریڈ کو دینیات کا پیریڈ ہونا چاہیے۔

(۳)

اسلام کوئی مذہب نہیں بلکہ پورے نظام حیات کا نقشہ ہے۔ اس لئے اسے محض ایک مضمون کی شکل نہیں دی جا سکتی (اگرچہ اس کے متعلق خصوصی مضمون بھی رکھا جا سکتا ہے) اسلام کو ہمیں پورے نصابی سلسلوں میں پھیلا دینا چاہیے۔ اور پہلے درجے سے لے کر بلند ترین درجے تک بلکہ اعلیٰ قسم کے ٹیکنیکل علوم کے ساتھ بھی اور تربیتی اداروں میں بھی اسلام کے بنیادی فلسفہ حیات اور حکمت تہذیب کو شامل نصاب کرنا چاہیے۔

قدیم نظام تعلیم اور جدید نظام تعلیم کو ہم آہنگ کرنے کا سوال ہی بڑا ٹیڑھا ہے۔ جس طرح جدید تعلیمی اداروں میں دینیات کا پیریڈ رکھنے سے بات نہیں بنتی اسی طرح درس نظامی کے ساتھ انگریزی پڑھانے سے بھی کام نہیں چلتا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ جدید مروجہ میکالوی نظام تعلیم کی اساس الحاد' دنویت اور مادہ پرستی ہے۔ لہٰذا سارے علوم بھی اسی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ تھوڑی سی تعلیم دینیات اس کی زہر کا تریاق نہیں بن سکتی۔ وہ تو جڑ سے بدلنے کے قابل ہے۔

علم التعلیم کی ساخت بھی بدقسمتی سے ہمارے مقاصد اور ہماری ضروریات کے مطابق

نہیں ہے۔ ہمیں ایک ایسے علم التعلیم کی ضرورت ہے۔ جس کا مقصد و منشا ہی مسلم ذہن و کردار کے عالم، معلم، ڈاکٹر، سائنس دان اور ماہرین سیاست و معیشت پیدا کرنا ہو۔ اگر علم التعلیم اور تعلیمی تکنیک اور اس کو استعمال کرنے والا معلم، اپنے زیر تعلیم نوجوانوں کے طرز فکر اور پیمانہ ہائے خیر و شر اور معیارات خوب و ناخوب کو اسلامی نہیں بنا سکتا ہے۔ تو یہ سارا کھیل ایک نئی شان کی جاہلیت کا کھیل ہے۔

(۴)

تعلیمی نصاب کے مقاصد

مجملاً تعلیمی نصاب کے مقاصد درج ذیل ہیں

(الف) ہر مضمون کے درجہ وار مناسب حصے کرنا۔

(ب) ہر درجہ کے لئے نصاب مجوزہ کے اندر تدریج اور ترجیحات مقرر کرنا۔

(ج) ہر مضمون کے زیر عنوان یہ واضح کرنا کہ مرکزی نظریہ و مقصد تعلیم کے تحت کونسے نظریات اور مروجہ تصورات ہمارے ملی تشخص کے خلاف ہیں۔

(۵)

قرآن کو بہ حیثیت مستقل مضمون یا ''اسلامی حکمت حیات'' کے وسیع تر نصاب کے اہم جزو ترکیبی کی حیثیت سے لیا جانا چاہیے اس کے علاوہ جغرافیہ، تاریخ، فلسفہ، نفسیات، علم الاخلاق، علم تعلیم، قانون، مدنیات، اقتصادیات اور سائنس (بیالوجی، فزیالوجی، وغیرہ سبھی اس میں شامل ہیں۔) اور دوسرے جو علوم بھی ہمارے ہاں پڑھائے جاتے ہیں ان سے متعلق قرآن کی آیات تفسیر و تبیین کے ساتھ مرتب کر کے ہر مضمون کے ساتھ اضافی قرآنی کورس شامل کر دیا جائے یا ایسی قیمتی تعلیمات کو بحثوں میں جذب کر دیا جائے۔ تب ہم یہ کہنے کے قابل ہوسکیں گے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں قرآن کو مرکزی اہمیت دے کر پڑھایا جارہا ہے۔

نصابات کی تدوین نو

نصاب اور نصابی کتابوں کے متعلق پاکستان بننے کے بعد کئی بار اہل علم کے مشوروں اور ماہرین تعلیم کی آراء کی روشنی میں نقشہ ہائے کار بنے۔ ان کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ تیز بڑی بڑی عالمی' اسلامی اور دینی یونیورسٹیوں اور ان کے ماتحت تعلیمی بورڈوں سے نصابات حاصل کر کے جائزہ لینا چاہیے کہ انہوں نے نصابات اور نصابی کتب کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے اب تک کیا کچھ کیا ہے۔

نصاب مرتب کرتے ہوئے ہر سطح کے لحاظ سے دو باتیں طے کرنا ہوں گی:

ایک یہ کہ آج تک کے فلسفوں' علوم انسانی اور علوم تجربی کے فراہم کردہ سرمایہ دانش سے کیا کیا کچھ درجہ بدرجہ لینا ہے۔

دوسرے یہ کہ ان علوم پر جوانان پاکستان کی خودی اور ان کے ایمان کی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے عقائد' افکار' احکام اور عملی و اجتہادی کاموں' نیز اپنی مادی اور تجربی ترقیات سے کتنا کچھ شامل کرنا ہے۔

یہ نازک کام اس طرح ہونا چاہیے کہ دو الگ الگ علمی دھارے نوجوانوں کے ذہنوں میں نہ بہنے لگیں۔ ایک دینی اور ایک دنیوی (یا لادینی)۔ اور اس طرح بھی نہیں ہونا چاہیے کہ دونوں علوم یعنی ایک الہامی علم ہدایت اور دوسرے قیاسی' حواسی اور تجرباتی علم کو آپس میں ٹکرا دیا جائے۔ اور مستقلاً ہر ذہن میں ایک الجھاؤ پیدا کر دیا جائے۔ یا ایسے الگ الگ گروہ ابھر کھڑے ہوں جو برسر کشمکش رہیں۔

اب ہمیں دینی مدارس اور جدید کالجوں میں طالب علموں کے الگ الگ گروہ جمع کر کے کسی کو مذہبی عالم اور کسی کو سائنس دان' ڈاکٹر اور انجینئر بنانے کا طریقہ ترک کر دینا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نقشے کے اول بدل میں چند سال لگ جائیں کیونکہ دو طرفہ ذہنوں اور ان کی

قیادتوں میں اعتماد پیدا ہو جانا چاہیے۔[1]

ہم چاہتے ہیں کہ مسلمان مفسر اور مسلمان قانون دان اور مسلمان قاضی کی طرح مسلمان' ڈاکٹر اور مسلمان انجینئر اور مسلمان ماہرین جوہری توانائی اور مسلمان کمپیوٹر ایکسپرٹ یا مسلمان خلا باز کے لیے ایک ہی نظام تعلیم ہو۔ یہ سب لوگ ایک ہی خدا پرستانہ اخلاقی سپرٹ اور فلاح انسانیت کے ایک ہی نصب العین سے سرشار ہوں۔ شاید یہ وحدانی سسٹم تشکیل پانے میں کچھ وقت لے گا۔

جہاں تک نصابی کتابوں کا تعلق ہے' اس تصور کے ساتھ تیار کی جائیں کہ ہمیں خدا کی زمین پر خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے' اس کے تفویض کردہ فرائض کو' اس کی ہدایات کے مطابق ایک امتحان کی طرح انجام دینا ہے۔ یہ پس منظر جس بھی مضمون کے ساتھ' ادنیٰ یا اعلیٰ درجوں میں کام کرے گا اس مضمون میں روح پیدا ہو جائے گی کہ کرگھا چلانے والا ایک مزدور' میزائل چھوڑنے والا ایک سپاہی' معلومات کے نئے نئے شکار کرنے والا ایک خلا نورد یہ جذبہ رکھے گا کہ میں اللہ تعالیٰ کی مرضی پوری کر رہا ہوں لہذا یہ مقام عبادت ہے۔

ہمیں ایسی نصابی کتب مطلوب نہیں ہیں جن میں مغرب کے لادینی افکار پیش کئے گئے ہوں یا ان کے ساتھ اسلامیت کا پیوند لگایا گیا ہو۔[2] بلکہ طالب علموں کے ہاتھوں میں ایسی کتابیں ہونی چاہئیں جن میں الحاد' مادی تصور کائنات' حیوانی تصور انسانیت' خودی کا نظریۂ ارتقاء' جدلی

---

[1] یہ ہماری ایک بڑی قومی پیچیدگی ہے کہ دینی مدارس ایسا عالم دین پیدا کرتے ہیں جو جدید دور سے پوری طرح آگاہ نہیں' جدید کالج ایسا عالم دنیا پیدا کرتے ہیں جو دین کا رمز آشنا نہیں۔ دونوں کا زاویہ نگاہ خوف ناک حد تک اختلاف رکھتا ہے اور ان کا ذہنی تصادم بے شمار مشکلات کا باعث بن رہا ہے۔

[2] آج ہمارے ہاں علم و ادب کی دنیا کی تعمیر مغرب سے درآمد کردہ فکری مسالے سے ہو رہی ہے۔ فکری افلاس انتہا درجے کی پستی پر پہنچ گیا ہے کہ تعلیم و تربیت کے اصول' فلسفے اور نظام پر جو کچھ ہمارے مصنفین کو مغرب سے ملتا ہے اس پر کسی طرح کی تنقید کئے بغیر اور اس میں کوئی ردوبدل کئے بغیر جوں کا توں اٹھا لاتے ہیں۔ ان کے ذہن سے یہ بات بالکل نکل گئی ہے کہ اسلام ہمہ تن ایک "تعلیمی و تبلیغی دین" ہے اور اُس کا بڑا مقصد ہی یہ ہے کہ اپنے خاص نظام زندگی کے لئے مطلوبہ نوعیت کے انسان تعمیر کرے اور ان کی ذہنی' اعتقادی' اخلاقی اور عملی تربیت کا اہتمام کرے۔ اسلام اپنا ایک خاص زاویہ نظر' تعلیم و تربیت کے باب میں رکھتا ہے۔ مغرب کے نظریات غلامانہ ذہنیت کے ساتھ اس طرح قبول کئے گئے ہیں گویا عرش بریں سے وحی اتر رہی ہے اور اس میں تحریف و ترمیم کرنا منافی ایمان اور مفسد آخرت ہوگا۔

فلسفہ تاریخ' طبقاتی تشریح معاشرہ' افادی نظریہ اخلاق' نفسیاتی حکمت جبریت اور دوسرے باطل افکار کو تنقید کی زد میں لا کر اس طرح توڑ دیا جائے کہ اسلامی صداقتوں کے فہم میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔

ہر مضمون کے لئے پہلے سے موجود اور مروج کتابوں پر نظر ڈالیں۔ مثلاً نفسیات کے بارے میں آپ ولیم جیمز' فرائیڈ' ینگ' ایڈلر' برٹرینڈ رسل وغیرہ بے شمار مفکرین کی کتابیں (اور ان کے ضروری حصے یا خلاصے) سامنے رکھیں۔ ادھر سے آپ نفسیاتی احوال کے متعلق قرآن کی آیات (مع مختلف مفسرین کی تفسیروں کے مباحث کے) حضورؐ پاک کی خاص خاص احادیث (اور ان کی شروح) کو سامنے رکھیں' پھر مؤلف اخلاق جلالی اور تصانیف امام غزالی و دیگر تصانیف کو سامنے رکھیں۔ علاوہ ازیں دور حاضر میں مسلم اہل فکر نے مغربی نفسیات پر تنقید کرتے ہوئے اسلامی نقطہ نظر سے کوئی کتاب یا مقالہ لکھا ہو وہ بھی جمع کر لیں۔ پھر آپ کے نظام تعلیم کے لئے نصابی کتابیں لکھنے والے ان دو طرفہ معلومات کو اس طرح جمع کریں کہ اسلامی حکمت نفسیات غالب رہے۔ مثلاً جدید نفسیات ہمیں ہر طرف سے گھیر گھار کر نفسیاتی جبریت کے کلیہ تک لے آتی ہے' جس میں انسان جکڑا ہوا ہے۔ مگر اسلامی نفسیات یہ بتاتی ہے کہ نفس میں کام کرنے والی قوتوں کے تانے بانے کو توڑ کر جب چاہے انسان خودی اور قوت ارادی کے زور سے آزاد ہو سکتا ہے' ہاں اگر وہ اس حالت پر راضی ہو کر (تن بہ تقدیر) پڑا رہے تو پھر نفسیاتی قوتیں مختلف قسم کے جالے ـ مثلاً عادت کا جال —— اس کے گرد لپیٹتی رہتی ہے۔ اس کے باوجود اسلامی تصور یہ ہے کہ انسان کی خودی انتہائی زبردست چیز ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کی قوت ارادی اور قوت فیصلہ جب ایک بار اُگ آتی ہے تو پھر اگر اس کے اوپر سل بھی رکھی ہو تو وہ سل کو بھی چیر کر باہر آ جاتی ہے۔

اس طرح تمام علوم میں کوشش کی جا سکتی ہے۔

ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ بڑی جماعتوں (کلاسوں) میں بعض موضوعات پر اعلیٰ درجے کی معیاری کتابیں[1] شریک کریں جن کی قدر و قیمت

---

[1] جیسے کتاب الاموال۔ کتاب الخراج' ہدایہ' کنز العمال' مقدمہ ابن خلدون وغیرہ' زمانہ قریب کے علاوہ مفکرین کی تصانیف (ان کے تراجم) مثلاً حجۃ اللہ بالغہ (شاہ ولی اللہ) منصب امامت (شاہ اسماعیل) -- تذکرہ (مولانا ابوالکلام آزاد) تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (علامہ اقبالؒ) الکلام اور علم الکلام ←

مستقل ہے۔ تمام اہم موضوعات مثلاً قومیت' اقتصادیات' بنکنگ بلا سود' اسلامی قانون وغیرہ کے متعلق ملک بھر کے علماء اور دانش وروں کے تحریر کردہ اچھے اچھے مقالات کے مجموعے مرتب کر لیے جائیں۔ عالم اسلام کے دوسرے لوگوں کی کاوشوں کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

کچھ پہلو ایسے ہوں گے اور مسائل آئیں گے جن کے لئے استاد یا لیکچرر کو بطور خود لیکچر یا سبق تیار کرنا ہو گا۔

اس قسم کے عبوری تجرباتی دور کے بعد مستقل نصابی کتابیں ہر سطح پر اور ہر علم کے لئے فراہم ہو جائیں گی۔ اس کے لئے ملک بھر کے مفکرین و مصنفین کو اچھے معاوضوں پر مقرر کردہ مقاصد اور خاکوں کے مطابق کتابیں لکھنے کے لئے تیار کیا جا سکتا ہے۔

← (شبلی نعمانی) ارض القرآن (سید سلیمان ندوی) اور جدید معاشی نظریات (مولانا مودودیؒ) اور اس مرتبے کی دوسری کتابیں اسلامی فکر و شعور کے لازوال سرچشمے ہیں۔ ملت کے سابق اور موجودہ مفکرین سے استفادہ کئے بغیر ہمارا نظام تعلیم اسلامی تو کجا قومی بھی نہیں بن سکتا۔

نفسیات کے اسلامی خطوط

قرآن حکیم کی روشنی میں

علم النفس کا پھیلاؤ آج بے حد بڑھ چکا ہے' اس کا ایک سرا اگر فلسفے کے دائرے میں پہنچتا ہے تو دوسرا سائنس کے میدان میں۔ نفسیاتی نظریات بے شمار ہیں اور ان کے نشوونما کی تاریخ بڑی طویل' پھر ان نظریات کے باہمی تصادم کی اگر تصویر کشی کی جائے تو خود یہی فلم بڑا لمبا ہو گا۔

دوسری طرف قرآن کریم کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ اس نے اپنی ساری تعلیمات کو' خواہ وہ سیاسیات و اقتصادیات یا ازدواج اور جنگ کے قانونی امور پر مشتمل ہوں' اخلاقی اصولوں کی بنیاد پر استوار کیا ہے' اور اخلاقی اصولوں کی تعلیم و تلقین میں اس نے نفسیات انسانی کو حد درجہ ملحوظ رکھا ہے۔ فی الحقیقت قرآن عقائد (یا اساسی حقائق کی معرفت) کے بعد جن مباحث کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے' وہ اخلاقیات اور نفسیات ہیں۔ قرآن کا ہر طالب علم فی الحقیقت نفسیات کا طالب علم بھی ہوتا ہے۔ مگر قرآن کا علم النفس اپنی ایک مخصوص شکل رکھتا ہے' جو مروجہ علم النفس اور نفسیاتی نظریات سے مختلف ہے۔ اس کے لئے ہم قرآنی نفسیات یا قرآنی علم النفس کی اصطلاح اختیار کرتے ہیں۔ یہ کار عظیم مسلم دل و دماغ کے نوجوان علماء و محققین کا منتظر ہے کہ وہ قرآن کے نفسیاتی خطوط کو سامنے رکھ کر علم النفس کی تدوین نو کا فریضہ انجام دیں۔ یہ میدان کار ہمارے ہاں سب سے زیادہ نظر انداز چلا آ رہا ہے۔

موضوع ایسا ہے کہ جدید نظریات اور قرآنی نفسیات کے تقابلی مطالعہ کے لئے نہ صرف اقتباسات کا بلکہ مفصل بحثوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور یہ کام بڑے ریسرچ ورک ایک وسیع مقالہ ہی کی صورت میں انجام پا سکتا ہے۔ مگر اس کا چونکہ یہاں موقع نہیں' اس لئے قرآنی نفسیات کے چند اہم نکات و خطوط پیش کئے جا رہے ہیں تا کہ سوچنے والوں کے لئے نئی راہیں کھل سکیں۔

نفسیاتی کیفیات کی دینی اہمیت

قرآن میں جگہ جگہ یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ وہ انسانوں کے ظاہری اقوال و اعمال ہی کو نہیں دیکھتا بلکہ قلب کی داخلی کیفیات کو بھی دیکھتا ہے۔ (يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ) (الاحزاب:۵۱) وہ آنکھوں سے پھوٹنے والی نگاہ میں بھی آمیزش خیانت کا نوٹس لیتا ہے (يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ) (المومن:۱۹) حدیث میں ہے کہ اللہ تمہارے لباسوں اور تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتا' وہ تو دلوں کو دیکھتا ہے (ولکن ينتظر الى قلوبكم) ۔ وہ مخالفین اسلام کے ایک گروہ کی تعریف یوں بیان کرتا ہے کہ وہ جتنا زبانوں پر لاتے ہیں' ان سے کہیں زیادہ زہریلا مواد ان کے قلوب میں چھپا ہوا ہے۔ بروئے وضاحت رسول ﷺ معاملہ یہاں تک پہنچتا ہے کہ آدمی کا قلب اگر صحت مند رہتا ہے تو اس کی زندگی کا سارا ڈھانچہ درست ہوتا ہے' اور جب قلب کو روگ لگ جاتا ہے تو پوری زندگی میں بگاڑ آ جاتا ہے۔ پس معلوم یہ ہوا کہ دین و اخلاق یا قرآنی نظام حیات کا سارا دارومدار قلوب کی صحت مندی پر ہے۔ اسی بنا پر تمام افعال میں "نیت" کو اساسی اہمیت حاصل ہے۔ یعنی کوئی فعل انسان نے کس ارادے سے' کس مقصد سے اور کس ذہنی کیفیت کے ساتھ کیا۔ اس نے اگر ہجرت کی مگر کسی عورت کو حاصل کرنے کے لئے کی تو وہ ہجرت فی سبیل اللہ نہیں ہوگی۔ اس نے اگر جہاد کیا' لیکن مقصد مال غنیمت حاصل کرنا یا شجاعت میں ناموری پانا تھا تو وہ محض ایک کاروبار ہو کر رہ گیا۔ نہایت خوبصورت جامۂ اعمال ظاہری میں لپٹا ہوا ایک آدمی نفسیاتی لحاظ سے ریا کا مریض ہو سکتا ہے' جس کا درجۂ کمال نفاق ہے جو کفر سے بدتر حالت ہے۔ نیت کا محل قلب ہے یا باصطلاح جدید نفسیات انسانی۔ اسی بات کو اگر ہم جزئیات سے آگے بڑھا کر ایک جامع صورت دے دیں تو کہیں گے کہ اسلام کا رویہ ایک خارجی مظہر ہے' اس داخلی نفسیاتی کیفیت کا جسے ہم ایمان کہتے ہیں ۔ ایمان خود پوری زندگی کی صورت گری کے متعلق ایک بڑے پیمانے کی "نیت" اور ایک بڑا فیصلہ ہے۔ اگر حقیقت ایمان موجود نہ ہو' اور اسلام محض بہ طور "فارم" کے آدمی اختیار کر لے تو اس کا مقام ویسا ہی ہے جیسا کسی ایسے شخص کا جو پولیس یا فوج کا سپاہی تو نہ ہو' لیکن مغالطہ دینے کے لئے وردی پہن لے۔

نفسیاتی کیفیات اور اعمال میں جو رشتہ ہے اسے پیش نظر رکھیں' تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ

آخرت کے حساب میں آدمی کے ظاہری اعمال کے ساتھ ساتھ اس کی نیتیں اور مقاصد بھی سامنے آ جائیں گے اور انہیں کے لحاظ سے اعمال کی قیمت معین ہو گی۔

اگر یہ صحیح ہے' اور قرآنی توضیحات کے لحاظ سے یقیناً صحیح ہے تو پھر ایک مسلمان کے لئے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ شعور نفس حاصل کرے' اپنے باطن پر نگاہ رکھے' اور مختلف متصادم نفسیاتی رجحانات و عوامل کو انضباط میں لے۔ اسی لئے معرفت نفس کو معرفت رب کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

نفسیات کا پہلا اصولی سوال

قرآن نے آیات الٰہی کی ایک جلوہ گاہ نفس انسانی کو قرار دیا (وَفِيٓ اَنۡفُسِكُمۡ ' اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ) (الذّٰرِیٰت:۲۱) یعنی ہماری نفسیاتی ساخت بجائے خود شہادت ہے ایک صاحب ارادہ و حکمت خالق مقتدر کے وجود پر۔

ہماری نفسیات کے پر اسرار پہلو' اس کی قوتوں کی حکیمانہ ترتیب' اس کا جبر و قدر کا مقام اتصال ہونا' اور پھر مادی دنیا سے غیر مادی مظاہر کا ذریعہ ربط ہونا ایسے حقائق ہیں جن کی کوئی اطمینان بخش توجیہ تصور خدا سے علم النفس کو خالی رکھ کر نہیں کی جا سکتی۔

جسم ہی کچھ کم پر اسرار اور پیچیدہ نظام کا مظہر نہیں ہے' لیکن ذہن (Mind) تو وہ حقیقت ہے جس کے بے شمار قفل اس شاہ کلید (Master Key) کے بغیر کھل ہی نہیں سکتے جسے ہم خدا کا نام دیتے ہیں۔ جسم کے ساتھ دماغ کا نشوونما پا جانا' دماغ کے مختصر سے دائرے میں لامحدود خیالات و حقائق کا جلوہ گر ہونا' مکانی ہوتے ہوئے لا مقانیت تک اور زمانی ہوتے ہوئے لازمانیت تک کے تصورات قائم کر لینا' چھوٹے چھوٹے خلیات کا مختلف کاموں کے لئے تقسیم ہو جانا' اور ان ننھے ننھے اوراق پر کئی کئی لائبریریوں کے برابر علوم و افکار کا مرتسم ہو جانا' اور پھر جوئے خیال کا لامحدود مسلسل بہاؤ' یہ سب کچھ اگر نگاہ میں ہو تو اس دعوے سے بڑی حماقت کوئی نہیں ہو سکتی کہ مادہ کے ذرات مختلف حادثوں سے گزرتے گزرتے' اتفاقاً ایسی ترتیب پا گئے اور اتفاقاً ہی ان میں یہ صلاحیتیں نشوونما پا گئیں۔ پھر اتفاقات کا اربوں سال پر پھیلا ہوا سلسلہ اتنے لمبے تعمیری منصوبے پر کیسے متواتر چلتا رہا۔ حادثات نے اسے بار بار کیوں نہ تخریب سے دو چار کر دیا۔ دخان (gas) سے لے کر اجرام کی تشکیل تک' غیر حیاتی ماحول

سے زندگی پرور ماحول پیدا ہونے تک' اور امیبا (Amoeba) سے لے کر پیچیدہ انسانی ذہن کے ظہور تک کا سارا منصوبہ ایک ایسی گاڑی کی طرح کیوں منزل بہ منزل آگے بڑھتا جاتا جس کے لئے باقاعدہ سڑک اور سمت سفر معین ہو اور جس کا کوئی ڈرائیور اور گارڈ ہو۔ اور جس کا کوئی منظم ادارہ ہو۔ ذہن انسانی کا خاتمہ یا بگاڑ تو کسی حادثے کے پہنچنے میں قابل فہم ہے' مگر اس کا لمبا عمل تشکیل اتفاقی اور حادثاتی نہیں ہو سکتا۔ کوئی منصوبہ ساز (Planner) کوئی نقشہ گر (Designer) اور کوئی خالق (Creator) ضرور ہونا چاہیے۔ ورنہ نفس انسانی کی ساخت اور نفسیات انسانی کے تعامل کی کوئی مکمل اور اطمینان بخش توجیہ ممکن نہیں ہو گی۔

جدید نفسیات کا المیہ یہ ہے کہ تصور خدا کے بغیر ذہن کے معما کو حل کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں' اور آج اس معما کے ڈھیروں مختلف قیاسی جوابات ہمارے سامنے پڑے ہیں جن میں سے ہر ایک نا تمام ہے۔ اور ہر ایک بہت سے نفسیاتی حقائق کے بارے میں ہمیں گمان محض یا لاعلمی کی سرحد پر جا کے چھوڑ دیتا ہے۔

قرآنی علم النفس' نفس انسانی کا مطالعہ اور نفسیاتی تعامل کی توجیہ تصور خدا کی مدد سے کرتا ہے۔ یہیں سے نفسیات کے ایک مسلم طالب علم کا راستہ الگ ہو جاتا ہے۔ اس کے سامنے تو یہ حقیقت کھول کر کہہ دی گئی ہے کہ سمع 'بصر' فواد سے انسان کو آراستہ کرنے والا خدا ہے۔ انسان کی تخلیق علم و حکمت سے بہترین اسلوب پر کی گئی ہے۔ اس شعور سے سوچنے والوں کے سامنے "خدا پرستانہ نفسیات" کا ایک نیا راستہ کھلتا ہے۔ ایک مشہور مغربی فلسفی نے ایک نکتہ پیدا کیا تھا کہ "میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں" ٹھیک انہی خطوط پر سوچتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ "میں ہوں اور سوچتا ہوں' اس لئے یقیناً میرا کوئی خدا ہے۔" یعنی مادی خلیات کا سوچنے کے پراسرار عمل سے آراستہ ہو جانا ایک اتفاقی حادثے کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ یہ خود کسی ذہن برتر کا تخلیقی کرشمہ ہے۔ ایک کمپیوٹر کی تشکیل بھی تخلیقی ذہن کے بغیر نہیں ہو سکتی' کجا کہ کمپیوٹر بنانے والا ذہن حادثاتی طریق سے نمودار ہو جائے۔

گویا قرآنی نفسیات کا طالب علم اس شعور کے ساتھ مطالعہ کرے گا کہ نفسیات جدیدہ کا علم خدا کو کالعدم سمجھنے کے بے دلیل مفروضے پر مبنی ہونے کی وجہ سے غلط صورت میں تشکیل پا گیا ہے۔ لہذا اسے نئے خطوط پر خود کاوش کرنی ہے۔

احسن تقویم کا نفسیاتی مفہوم

قرآن نے بتایا کہ انسان کو احسن تقویم یا بہترین ساخت پر پیدا کیا گیا ہے۔اس حقیقت کو دوسری جگہ فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (الروم:۳۰) کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ احسن تقویم (بہترین خدائی نقشہ فطرت) کا ایک مفہوم جسمانی ساخت سے متعلق ہے جس میں قدوقامت کے علاوہ یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ چوپایوں کے مقابلے میں انسان دو پیروں پر چلتا ہے اور اس کے دو ہاتھ اعلیٰ تر سرگرمیوں کے لئے فارغ رکھے گئے ہیں۔ نیز اس میں "صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ" (المومن:۶۴) کا مفہوم بھی شامل ہے کہ ایسی صورت گری کی جو خوش آئند معلوم ہوتی ہے، تخلیق و ترتیب میں جمالیت ہے۔

احسن تقویم کا دوسرا مفہوم نفسیاتی ہے اور یہی پہلو اہم ہے۔ اگر انسان علم (عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا) (البقرہ:۳۱) ذرائع علم (سمع، بصر، فواد) حافظہ، قوت استدلال و استنباط، اخلاقی حاسہ یا قوت امتیاز خیر و شر، قوت متخیلہ اور قوت نطق و تکلم سے محروم ہوتا تو اس کی جسمانی ساخت کی خوبی بھی اسے دوسرے حیوانات سے بہتر نہ بنا سکتی بلکہ وہ نسبتاً مختصر جسم اور نرم و نازک کھال کی وجہ سے زیادہ مشکلات سے دوچار ہوتا اور جہدِ حیات میں بہت ہی کم تر درجے پر رہ جاتا۔

انسان کی فطری فوقیت کا زیادہ اہم پہلو نفسیاتی ہے۔ اور اس کی نفسیاتی قوتوں اور صلاحیتوں کا خزانہ بڑا بیکراں ہے۔

انسانی ذہن کی ساخت میں چند باتیں بنیادی طور پر اہم ہیں۔

فعالیت مسلسل

اس کے ذہن کی فعالیت مسلسل ایک امتیازی نوعیت رکھتی ہے۔ جوئے خیال کا بہاؤ اور اس میں تموج ہر آن جاری رہتا ہے۔ پھر اس میں ایک پراسرار القائی عمل بھی ہوتا رہتا ہے، یعنی بسا اوقات ایسے خیالات اور احساسات یکایک ابھرتے ہیں، جن کے لئے بظاہر نہ کوئی خارجی محرک موجود ہوتا ہے اور نہ ان کی طرف لے جانے والا کوئی واضح ذہنی عمل واقع ہوتا ہے۔ یہ ایسے ہوتا ہے جیسے جوئے خیال میں یکایک کوئی مچھلی ابھر آئے۔ یہ وہ چیز ہے جو

حیوانات کو حاصل نہیں۔

جبلی محدودیت سے آگے

حیوانات کے ذہنی عمل کا ایک خاص دائرہ جبلت نے مقرر کر دیا ہے جسے وہ پھاند نہیں سکتے' مگر انسان اپنے ذہنی عمل کے دائرے سے باہر بھی نکلتا رہتا ہے' اور اسے وسیع تر بھی بناتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خود اپنے دائرہ نفسیات کا بھی جائزہ لے سکتا ہے۔ (بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ) (القیامہ ۱۴:) وہ جبلی تقدیر کی اس کڑی پابندی سے آزاد ہو کر جو حیوانات کو محیط ہے' عقلی و شعوری طور پر ذمہ دار قرار پاتا ہے۔

نفسیات میں قانون زوجیت

اس کے ذہن میں تمام خواہشات' جذبات اور خیالات زوج زوج ہو کر آتے ہیں۔ گویا انسانی ذہن پر وہی قانون ''زوجیت'' کار فرما ہے جس کے زیر نگیں ساری کائنات ہے۔ یعنی جس طرح حیوانات جوڑا جوڑا ہیں' بعینہٖ تمام مخلوق وجود بھی اپنا کوئی جوڑا ایسا رکھتے ہیں جن سے ان کا رشتۂ تعامل ہوتا ہے۔ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی متبادل و متقابل ضرور ہوتا ہے۔ مثبت کے ساتھ منفی' اور منفی کے ساتھ مثبت تصورات نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ اسی کائنات گیر اصول کے تحت اس دنیا اور دینوی زندگی کے مقابل میں آخرت کا ہونا واجب التسلیم ہو جاتا ہے۔ نفسیات انسانی میں اس کائناتی اصول کی کار فرمائی اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ سارا نظام وجود وحدانی (unitary) اور یک آہنگ (uniformed) ہے۔ کائنات کو سمجھنے کے لئے نفس انسانی کا مطالعہ اور نفس انسانی سمجھنے کے لئے کائنات کا مطالعہ ممد ہے۔

نفسیات میں قانون زوجیت کا عمل یوں ہوتا ہے کہ مثلاً کسی کے دل میں خیال آیا کہ میں کسی کی ایک چیز چوری کر لوں' ساتھ ہی دوسرا خیال مقابل میں آ کھڑا ہو گا کہ چوری نہیں کرنی چاہیے۔ یا خیال آیا ہے کہ فلاں شخص بڑا اچھا ہے' تو ساتھ ہی اس کے کمزور پہلو بھی ذہن میں ابھر آئیں گے اور وہ استدلال کریں گے کہ وہ شخص برا ہے۔ یعنی ذہن کا عمل ''مکالماتی'' طرز کا ہے۔ ہر خیال ایک بے آواز مکالمہ پیدا کرتا ہے' ایک نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ آدمی ایک فیصلہ کرتا ہے۔ اس ذہنی عمل کو حدیث میں حضورؐ نے یوں بیان فرمایا ہے کہ آدمی کے اندر سے دو آوازیں اٹھتی ہیں: ایک فرشتے کی' اور ایک شیطان کی۔ (او کما قال)

ذہنی معیار انتخاب

آدمی متقابل خیالوں' خواہشوں' احساسات اور ذہنی محرکات میں سے جب انتخاب کرتا ہے تو حیوانات کی طرح اس کا معیار انتخاب خالص مادی و افادی نہیں ہوتا بلکہ اس کے معیار انتخاب کا واحد طرہ امتیاز یہ بھی ہے کہ (شعوری ہونے کے ساتھ) وہ لازماً ''اخلاقی'' بھی ہوتا ہے' چاہے اس کا تصور اخلاق صحیح ہو یا مسخ ہو جائے' محدود ہو یا وسیع' خالص ہو یا مرکب۔ لیکن وہ کبھی اخلاقی حاسے سے نجات نہیں پا سکتا۔ اسی حقیقت کو قرآن نے یوں بیان کیا کہ ''وَهَدَيْنَهُ النَّجْدَيْنِ'' (البلد:۱۰) (ہم نے دونوں راستے اسے سمجھا دیئے)۔ یہیں سے صحیح اور غلط' حق اور باطل' انصاف اور ظلم' راستی اور ناراستی' انسانیت اور حیوانیت' نیکی اور بدی' حلال اور حرام' جائز اور ناجائز وغیرہ کے تصورات نمودار ہوتے ہیں۔ ان تصورات کی اگر صحیح شعوری پرورش کا سامان بہم ہو جائے تو آدمی کا مسلک ''دین حق'' کا مسلک ہوتا ہے' ورنہ دین باطل (خواہ وہ حق و باطل کا مرکب ہو)۔

ہر آدمی فطرۃ اللہ کی عطا کردہ نفسیاتی ساخت سے مجبور ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی اخلاقی مذہب و مسلک ہو۔ خواہ وہ مذہب خدا پرستی و انسان دوستی ہو' خواہ مذہب الحاد' خواہ مذہب شرک اور خواہ مذہب مادیت۔ اخلاقی نظام مذہب انسان کی نفسیاتی ضرورت ہے' اور یہ ضرورت اگر صحیح طریق سے پوری نہ ہو سکے گی تو غلط طریق سے ہو گی۔

بہ ہر حال قرآنی تعلیم کے لحاظ سے انسان ایک اخلاقی وجود ہے' محض حیاتیاتی نہیں۔ تمیز خیر و شر کرنا ایک ایسی حد فاصل ہے جو اسے تمام دوسرے حیوانات سے بالکل الگ کر دیتی ہے' اور یہی وہ حد فاصل ہے جو مغرب کے نظریۂ ارتقا کے راستے میں حائل ہے اور انسان اور حیوان میں ایسا رشتہ قائم نہیں کیا جا سکتا جو انہیں صلب واحد سے جوڑ دے۔

طلب علم

انسانی نفسیات کی ایک خصوصیت طلب علم ہے۔ (رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا) (طٰہٰ:۱۱۴) وہ ہر چیز کو جاننا چاہتا ہے۔ نتیجے کے سبب کو' اور علت کے معلول کو۔ اس کے ذہن میں ہر بات پر ''کیا'' ''کیوں'' ''کیسے'' اور ''کس لئے'' کے سوال پے در پے پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ آخرت میں احیائے موتی پر ایمان رکھنے کے باوجود خدا سے سوال کرتے ہیں کہ كَيْفَ

تُحْيِ الْمَوْتٰی (البقرہ:۲۶۰) (آپ مردوں کو کس طرح زندہ کریں گے؟) یا حضرت موسیٰ حضرت خضر سے بار بار وعدہ کرنے کے باوجود کہ میں خاموشی سے دیکھتا جاؤں گا اور کچھ پوچھوں گا نہیں' حیرت انگیز واقعات کو دیکھ کر بار بار پکار اٹھتے ہیں کہ یہ تم نے کیا کیا؟ یا ایسا کیوں کیا؟ خود قرآن نے بے شمار سوالات مرتب کر کر کے انسان کے سامنے رکھے ہیں کہ وہ ان کے جوابات تلاش کرے۔ سوال کی راہ تدبر و تفکر کی راہ ہے۔ اس لئے قرآن نے بار بار تدبر و تفکر کی تاکید کی ہے۔ رہے وہ سراپا غفلت اور پلید الذھن لوگ (جو اپنی ذہنی قوتوں کو خود ہی زنگ آلود کر لیتے ہیں) جو نہ اپنی ذات اور نہ کائنات کے اموال پر توجہ کریں' نہ ان کے اندر سوالات پیدا ہوں' اور نہ تدبر و تفکر کی راہ اختیار کریں' قرآن ان کو "کَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ" (الاعراف:۱۷۹) (جانوروں کی طرح' بلکہ ان سے بھی زیادہ بدراہ) قرار دیتا ہے۔

طلب علم کا دائرہ صرف مادی اشیا کے مادی خواص دریافت کرنے تک محدود نہیں ہے جو سائنس کا دائرہ ہے' بلکہ اس سے اہم تر دائرہ تفکر و تدبر اس حقیقت عظمیٰ اور اس سے متعلقہ حقائق اساسی کو جاننا ہے جو کائنات کے مادی وجود پر حکمرانی کرتے ہیں۔ پھر ان اساسی حقائق کی روشنی میں ان اصول و نوامیس کو سمجھنا جو انسان کو پست یا بلند کرتے ہیں اور تاریخ میں اقوام کو ترقی و تنزل سے دوچار کرتے ہیں۔ قرآن اس حصہ علم کو اہم تر قرار دیتا ہے اور اپنا اصلی زور اس پر صرف کرتا ہے۔ طبعی اور مادی دائرے میں تو انسان زندگی کی ضرورتوں کے دباؤ سے مجبور ہے کہ وہ تگ و تاز کرتا رہے لیکن ایمان و اخلاق سے جس علم کا تعلق ہے' اسی کے بارے میں ہمیشہ اس نے غفلت دکھائی ہے' اور یہی کوتاہی بسا اوقات اسے لے ڈوبی ہے۔

یعنی قرآن کی رو سے زیادہ اسباب اور بہتر ذرائع مہیا کرنے والے علوم سے برتر وہ علم ہے جو بہتر انسان بناتا ہے جسے اسباب و ذرائع کو استعمال کرنا ہے۔ اسباب و ذرائع بہت اور اچھے ہوں اور انسان اچھا نہ ہو تو ان کا استعمال بگاڑ اور زوال اور ہلاکت کا باعث ہوتا ہے۔

اس انسان ساز علم کو "العلم" (The Knowledge) یا مرکزی علم قرار دیا گیا ہے۔ اس علم کے راستے کے لئے سنگ میل آیات الٰہی کو قرار دیا گیا ہے جو آفاق میں بھی ہیں اور انفس میں بھی (وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ) (الذاریات:۲۱) قرآن اپنی آیات الٰہی کی طرف متوجہ کرتا اور ان کو انسان کے سامنے اجاگر کرتا ہے۔ اور ان کے ذریعے اساسی حقائق کے ادراک تک پہنچاتا ہے۔

نفسیاتی قوتوں اور عمل پر اختیار

علم النفس کے جدید نظریات کا زور نفسیاتی جبیرت کی طرف ہے۔ یعنی انسان اپنی نفسیاتی قوتوں کے ہاتھوں میں ایک بے بس کٹھ پتلی ہے' اسی لئے جدید نظریہ جرم وسزا بھی غلط شکل اختیار کر گیا ہے۔ حالانکہ انسان میں نہ صرف یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ وہ اپنی نفسیاتی قوتوں کا شعور حاصل کرتا ہے اور ان کے عمل کو بڑی حد تک سمجھ لیتا ہے' بلکہ اس میں خود احتسابی کا ملکہ بھی ہے۔ وہ اپنی قوتوں کی تربیت بھی کرتا ہے' ان کا رخ بدل بھی سکتا ہے' ان پر قابو حاصل کر سکتا ہے' اور اسی لئے ہم ایک ہی قسم کے خارجی و داخلی محرکات کے ایک ہی سے جوابی عمل کی توقع ہر انسان سے نہیں کر سکتے۔ ایک ہی سے حالات میں مختلف افراد کا رویہ مختلف ہو گا۔

یقیناً انسان کی نفسیاتی ساخت معین ہے اور اس لئے وہ اس کے دائرے کے اندر محدود ہے' اور ان قوتوں کا شدید دباؤ اس پر ہوتا ہے جو حالات اور ماحول کی نوعیت کے مطابق کم و بیش ہوتا رہتا ہے' اور ان کا مقابلہ کرنے کے لئے اسے کم یا زیادہ زور لگانا پڑتا ہے' اس معنی میں اس کا اختیار بھی محدود ہے۔ مگر یہ محدود اختیار ہی اس کا سرمایہ منصب خلافت ہے۔ اس کو استعمال کر کے وہ ہابیل و قابیل' موسیٰ و فرعون اور حسینؓ و یزید کے مختلف کردار پیش کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ انسان ایک بے بس آلہ کار نہیں ہے۔

تصادم کی جولانگاہ

انسانی ذہن میں خیالات و جذبات کا زوج زوج ہو کر ابھرنا اور متضاد رجحانات کا کام کرنا اسے تصادم کی ایک جولانگاہ بنا دیتا ہے۔ زندہ انسان ہر آن داخلی تصادم سے دوچار رہتا ہے۔ ''اندریں معرکہ بے خیل و سپہ آمدہ ایم'' اقبالؒ دو جانب سے جب فرشتے کی آواز اور شیطان کی آواز اسے اکٹھی سنائی دیتی ہے تو وہ کشمکش میں پڑ جاتا ہے۔ لیکن بہرحال اسے عملی زندگی کی ضرورتیں مجبور کرتی ہیں کہ وہ فوری طور پر ہر ذہنی کشمکش کا فیصلہ کرے۔ اس کی قوت فیصلہ و انتخاب یا قوت ارادی وہ حاکمانہ قوت ہے جو آخری فیصلہ دیتی ہے اور اس کے مطابق پھر ساری دماغی اور جسمانی قوتیں برسرِ عمل ہو جاتی ہیں۔ یہی وہ کارزارِ کفر و دیں ہے جو انسان کے اندرون سے منتقل ہو کر اس کے باہر کی تمدنی زندگی میں نمودار ہو جاتا ہے۔

اس تصادم کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ انسان کے انفرادی کردار اور اس کے اجتماعی نظام میں کوئی حالت قائمہ (static) نہیں ہے اور نہ اٹل۔ بلکہ جب اچھائی کی قوتیں غالب ہو کر کام کریں گی تو برائی کی قوتیں اس کے مقابل میں مسلسل حملہ آور رہیں گی' اور جب برائی کی قوتیں زیادہ فروغ پا جائینگی تو اچھائی کی قوتیں ان کا مقابلہ کریں گی۔ اس مقابلے کے نتیجے میں توازن قوت بار بار بدلتا ہے۔ کبھی نیکی غالب آتی ہے' کبھی بدی۔ کبھی دن' کبھی رات۔ کبھی خزاں' کبھی بہار —— ٹھیک اسی طرح جیسے مادی نظام میں یہ تغیرات ہوتے ہیں اسی طرح ذہنی' اخلاقی اور تمدنی زندگی میں بھی ہوتے ہیں۔

اب یہ دیکھنا سمجھنا خود آدمی کا کام ہے کہ وہ اپنے رویے اور کردار کا ارادی وزن تصادم مسلسل میں کس طرف ڈال رہا ہے۔

یہ انسان کا فرض ہے کہ اگر وہ سچائی اور نیکی کی راہ کو پا لے تو وہ اپنے نفس میں کام کرنے والی بدی کی (شیطانی) قوتوں سے خبردار رہے۔ وہ خوب سمجھ لے کہ ایک دشمن قوت اس پر حملہ آور ہے جس کا نام شیطان ہے' اور جس کے ساتھ شیاطین جن و انس کی کوششوں کا ایک لشکر کا لشکر کام کر رہا ہے۔ اسی طرح ایک پاکیزہ تمدنی نظام کے قیام کے بعد اس کی حفاظت کرنا (لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا) (الاعراف:۵۶) بھی اچھے انسانوں کے فرائض میں داخل ہے۔ یہ سمجھنا باطل ہے کہ انسان اور تاریخ آٹو میٹک طور پر خیر و خوبی کی طرف ارتقا کر رہی ہے' اور ایک بار جو اچھائی غالب ہو جاتی ہے پھر اس کا اثر پائیدار اور مستقل ہوتا ہے' اسی طرح یہ سمجھنا بھی حماقت ہے کہ کوئی دور ایسا آئے گا کہ خرابیاں مٹ مٹا جائیں گی اور پھر دنیا مستقل طور پر جنت بن جائیگی۔ ایسے نظریات یکسر غلط ہیں' کیونکہ انسانی نفس مسلسل ایک تصادمی عمل سے دوچار رہتا ہے۔

نصاب ــــ ہوم اکنامکس

لڑکیوں کے نصاب میں ایک مضمون ''ہوم اکنامکس'' شامل ہے' جو نچلے درجوں میں خانہ داری کہلاتا ہے۔ یہ نام محض معروف نام ہونے کی حیثیت سے اختیار کر لیا گیا ہے لیکن اس سے ہمارا مقصود و مطلوب واضح نہیں ہوتا۔ گھر کی زندگی کے متعلق عورتوں کے لیے ہمارا تصور کار زیادہ وسیع ہے۔ اس لیے ہم اسے کوئی نیا نام دینا پسند کرتے ہیں۔ مثلاً ہوم سائنس یا حکمت حیات خاندانی' یا نظامت خاندان وغیرہ جیسا کوئی نیا نام تجویز کر سکتے ہیں۔ ہمارے علوم ماضیہ میں نظامت خاندانی کو ''تدبیر منزل'' کا نام دیا گیا تھا۔

اسلامی نقطہ نظر سے خانہ داری یا گھر یا خاندان کے معاملات میں سب سے اہم شعبہ افراد خانہ سے ربط و تعلق کا شعبہ ہے۔ گھر یا کسی بھی اجتماعیت کا پہلا اصول تعاون ہے اور وہ دیرپا تبھی ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد محبت پر استوار ہو۔ چنانچہ اس کا انتظام تو خود مشیت الٰہیہ نے کر دیا ہے کہ ماں باپ اور اولادوں اور میاں بیوی' بہن بھائیوں اور دوسرے رشتوں میں روح محبت کام کرے۔ اس کے ساتھ ایک ضروری اصول حفظ مراتب ہے۔ جیسے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ

لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یؤقر کبیرنا

''وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو ہمارے ہاں کے چھوٹوں پر شفقت نہ کرے اور بڑوں کا ادب نہ کرے۔''

علم خانہ داری یا ہوم سائنس کا دوسرا بڑا اصول اسلامی حکمت خاندانی میں عورت کے لیے یہ ہے (مرد مستثنیٰ نہیں' مگر یہاں بحث مخصوص ہے) کہ وہ اپنے تعلقات بڑوں اور چھوٹوں ــــ تنگ مزاجوں اور خوش دلوں' دوسری بڑی یا چھوٹی خواتین' محرم مردوں میں سے بزرگوں اور خوردوں اور خصوصاً بچوں اور بچیوں' نیز خادموں یا خادماؤں (اگر کوئی ہوں) اور محلہ یا خاندان سے ملنے جلنے کو آنے والی خواتین سے اپنے تعلقات استوار کرتے ہوئے اس امر کا

راستہ بنائے کہ ان تک دعوت دین کیسے پہنچائی جا سکے۔ بات چیت سے' کتابوں کے ذریعے' قرآنی یا مطالعہ کی یا ادبیات کی مجالس کے ذریعے' ایسے طریقوں پر غور کرنا چاہیے۔ خصوصاً بچوں کے بارے میں خاص خیال رکھا جائے۔ دعوت کا کام زیادہ خوبی سے خدمت کے ساتھ چلتا ہے۔ آپ کسی کے کام آ کر' کوئی ایثار کر کے' کوئی خدمت انجام دے کر' کوئی تکلیف اٹھا کر' کسی کی پڑھائی میں مدد کر کے' دلوں میں گھر کر لیں اور پھر صبا کی نازک خرامی کی طرح پیغام دیں کہ دماغوں میں ایک مہک اتر جائے اور کچھ پتہ بھی نہ چلے۔

اسی سلسلے کا ایک کام یہ ہے کہ اخلاقی قدروں اور معاشی مفاد' یا ایمان اور مقام و مرتبہ (status) کے درمیان جو جنگ برپا ہے اس کی وجہ سے گھر کے نظام آمد و خرچ میں حرام کے راستے نہ کھلنے پائیں۔ علاوہ ازیں مغربی تہذیب کے شعائر اور اس سے تعلق رکھنے والے رسوم و رواج اگر گھر میں پہلے سے گھس رہے ہوں تو ان کا ازالہ کرنا ہے' ساتھ ہی آئندہ کے لیے گھریلو فضا کو مزاحمت کے لیے پختہ بنانا ہے۔ اس طرح قدیم جاہلانہ رسوم' دوسری قوموں کی نقالیاں اور مسرفانہ ہنگامے جو گھس چکے ہوں ان کی بیخ کنی کی جائے۔ کتنا پہاڑ سا کام ہے۔

اس خصوص میں عورت کو خود بھی باشعور ہونا چاہیے اور گھر کی بڑی اور چھوٹی خواتین میں بھی یہ احساس پیدا کر دینا چاہیے کہ اس وقت مغرب کی ملحدانہ تہذیب کی بہت گہری یلغار مسلم خاتون کے خلاف ہے اور وہ اسے گھر سے نکال کر ایک طرف تو مختلف قسم کے جدید استحصالات کے شکنجے میں کس لینا چاہتی ہے (ہو سکے تو کورس میں مغربی نظام معاشرت کے دردناک اور تباہ کن اور عورت کے وجہ تذلیل بننے والے احوال کو شامل کر دیا جائے) اور دوسری طرف حملہ آور تہذیب، گھر کے عظیم الشان ادارے کو جو بچوں کی تربیت ابتداء سے دین کے خاص تصورات اور اخلاقی اقدار اور تاریخی روایات کے ساتھ کرتا ہے' اجاڑ دینا چاہتی ہے۔

اس سلسلے میں عورت کو جاننا چاہیے کہ کس طرح علوم' تعلیمی نصابی مواد' لٹریچر اور پروپیگنڈے میں ایسا زہریلا مواد شامل کیا گیا ہے کہ دین اور شریعت سے بغاوت پیدا ہو اور نعوذ باللہ عورتیں خدا و رسول ﷺ یا قرآن و حدیث کو چیلنج کرنے لگیں۔ چنانچہ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

پھر عورت پر شرعی اور عقلی دلائل سے واضح کیا جائے کہ پردہ اور مخلوط کھلی سوسائٹی سے اجتناب کیوں ضروری ہے۔

یہ سارا کام بغیر اس کے ممکن نہیں کہ پڑھی لکھی خواتین اپنے گھروں میں درس قرآن اور مختصر سے دینی اجتماع کا انتظام کریں جن میں سب افراد شریک ہوں۔

ہوم سائنس میں پھر وہ چیزیں بھی آ سکتی ہیں جو ایمانی و تہذیبی مسائل کے بجائے عام ضروریات سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً غذا کا مسئلہ' بیماروں کے لئے پرہیزی غذاؤں کا مسئلہ۔ لباس تیار کرنے یا اسے دھونے دھلانے کا مسئلہ۔ گھر کو صاف ستھرا رکھنے اور سجانے سنوارنے کا مسئلہ' مہمانداری کا مسئلہ' آمدنی ناکافی ہو تو گھریلو دستکاریوں کا مسئلہ۔ بجلی' سوئی گیس' تیل کے چولہوں کے خطرات سے بچنے کا مسئلہ۔ غرضیکہ ایسے تمام متفرق مسائل جو آج بنیادی اہمیت رکھتے ہیں' ان کو ثانوی درجے پر رکھ کر اول درجے پر وہ چیزیں رکھی جائیں جن کا اوپر ہم نے ذکر کیا ہے اسی مضمون میں ایک بڑا اہم مسئلہ تربیت اولاد کا آتا ہے۔

اس وقت جو نصابی یا غیر نصابی لٹریچر ملتا ہے وہ بچوں کی صفائی اور صحت اور عمر کے مطابق غذاؤں کی اقسام اور ان کی تیاری یا ان کے لباس اور کھیل تفریح کے متعلق ہوتا ہے۔ یہ سب چیزیں اپنی جگہ درست! مگر مسلمان عورت کی اولیں ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے بچے میں نور ایمان پیدا کرنے کی کوشش کرے' وہ اسے مسلمان کی اٹھان سے اٹھائے' سچائی اور نیکی کے رجحانات ابھارے' اسلامی اخلاق کی بنیادیں رکھے۔ حتیٰ کہ جب وہ سمجھ بوجھ تک پہنچے تو اسے شعور دلائے کہ تم ہر طرف سے اس دور کی گندگیوں اور برائیوں میں گھرے ہوئے ہو۔ اب تمہیں تنہا خود اپنا ہی بچاؤ نہیں کرنا ہے بلکہ اپنی ملت اور اپنے ابنائے وطن اور پھر انسانیت کو بھی بچانا ہے۔ یہ ایک جنگ ہے' تم اس میں نیکی اور سچائی کے سپاہی بن کر آگے بڑھو۔ محض ڈگری لینا' عہدہ پالینا اور روپیہ جمع کر لینا کوئی کمال نہیں۔ کمال یہ ہے کہ تم تاریکی میں شمعیں روشن کر دکھاؤ۔

افسوس ہے کہ دور جدید کا لٹریچر اس معاملے میں تنگ ہے۔ جدید نفسیات کے جو اطلاقی اشارات فراہم ہیں وہ مزاج کی الٹی ساخت میں مد ہیں۔ ماؤں کو جاننا چاہیے کہ کس طرح کی کیا چیزیں کس عمر میں کس حد تک' طریقے سے سکھائی جانی چاہئیں۔ تربیت اولاد کا اسلامی شعور جو کان میں پہلی اذان سے شروع ہو کر بچے کو مسجد کی صف نماز میں لا کھڑا کرتا ہے اور پھر بھاری سے بھاری ڈیوٹی خدا کی راہ میں اٹھانے پر تیار کر دیتا ہے' وہ آپ کو مغربی لٹریچر اور اس کے نقالوں میں کہاں سے ملے گا۔

ہوم اکنامکس کی تعلیم حاصل کر لینے کے بعد خواتین کے دل پر یہ بات نقش ہو جانی چاہیے کہ بچے کو کوئی کنڈر گارٹن اسکول اور انگلش میڈیم اسکول مسلمان نہیں بنا سکتا۔ وہ تو صرف نامسلمانی کے راستے پر ڈال سکتا ہے۔ کوئی بچہ گھر جہاں ایک ماں نوکری پر جاتے ہوئے اسے ڈال جاتی ہے (بلکہ پھینک جاتی ہے) وہاں کی نوکر پیشہ نرس ماں کا بدل نہیں ہو سکتی اور نہ ماں کی پسند کا ایمان و اخلاق بچے کو منتقل کر سکتی ہے۔ اسی طرح گھر کے نوکروں یا نوکرانیوں میں سے بھی کوئی آپ کا فریضہ ادا نہیں کر سکتا۔ یہ کام تو صرف آپ کا ہے۔

ابھی میں نے ایک مغربی عورت کا اپنا ذاتی تجربہ پڑھا۔ اس نے بچے کو بچہ گھر میں بھی رکھا، پھر نوکروں کے حوالے بھی کیا اور آخر اس نتیجے پر پہنچی کہ نوکری کرنے سے زیادہ اہم یہ ہے کہ میں اپنے بچے کو صحیح تربیت دے کر ایک اچھا انسان بنانے کی کوشش کروں اور اس نے تسلیم کیا کہ یہ کام میرے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔

تو یہ ہے تصور ہمارے سامنے ہوم اکنامکس یا ہوم سائنس کا!

نصاب تاریخ کا مسئلہ

نصاب تاریخ کا مسئلہ اگرچہ بے حد اہم ہے' لیکن اصل بڑا مسئلہ مجموعی طور پر نظام تعلیم کی درستی کا ہے۔ وہ اگر موجودہ نقشے پر چلتا رہے تو اس میں اسلامیات یا اسلامی تاریخ کے چند ابواب کا موجود ہونا تھوڑی بہت خیر و برکت تو ضرور رکھتا ہے مگر مادہ پرستانہ روح سے آراستہ اور الہامی حکمت کے دائرہ سے باہر ترتیب پائے ہوئے علوم کے اثرات بد کا توڑ نہیں ہو سکتا۔ اس وقت تو سارا زور اس پر لگ رہا ہے کہ جو تعلیمی صنم کدہ ہمارے لئے مقدر ہو گیا ہے اس کے کسی نہ کسی کونے میں سورۂ یاسین کا چارٹ بھی آویزاں رہے۔

مسلم نظریہ تاریخ

اسلامی تاریخ کے جو بھی ابواب نصابی کتب میں رکھے جائیں' قضیہ یہ ہے کہ ہم جس فلسفہ تاریخ کی عینک سے اپنے ماضی کو دیکھتے اور دکھاتے ہیں وہ ہماری آنکھوں میں ایسا بھینگا پن پیدا کر دینے والی ہے کہ ہماری اپنی صورت ہماری نگاہوں میں مسخ ہو جاتی ہے۔ اس مغربی فلسفہ تاریخ کی روح بد ہمارے مرتب کردہ نصابات تاریخ میں اس طرح حلول کر جاتی ہے کہ فلاح و فساد اور ترقی و تنزل اور خیر و شر کی اصطلاحوں کا وہ مفہوم ہی گم ہو جاتا ہے جو قرآن نے ہمیں سکھایا تھا۔ یہ ہماری بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ قرآن نے نمونے کی جو تاریخ بیان کی تھی اس کی روشنی میں ہم اپنا نظریہ تاریخ واضح شکل میں مرتب نہ کر سکے۔ مسلم نظریہ تاریخ کے چند خطوط فکر میں نے اپنی کتاب ''معرکہ دین و سیاست'' کے مقدمے میں پیش کئے تھے' مگر میرے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا کہ میں اپنی قوم کے مفکرین تاریخ کو ادھر توجہ فرمانے پر آمادہ کر سکتا۔ مستقبل کا کوئی محقق تاریخ ممکن ہے کہ ان خطوط فکر کو آثار قدیمہ بن جانے کے بعد کھدائی کر کے برآمد کر لے۔

جب تک آپ قرآنی حکمت کی اساس پر اپنا فلسفہ تاریخ مرتب نہیں کر لیتے یہ کسی طرح

ممکن نہیں کہ آپ اپنی تاریخ کے متعلق قطعیت سے طے کر سکیں کہ اس کو مطالعہ عام کے لئے نصابات میں کس ترتیب سے اور کس شکل میں لانا ہے۔ آپ کا فلسفہ تاریخ اگر طے ہوتا تو وہ خود بتاتا کہ کس تعلیمی مرحلے پر کیا چیز کس حد تک اور کس طرح پیش کرنی ہے۔ فی الحال تو ہم اندھیرے میں گامزن ہیں' اندھیرے میں ایک دوسرے کی رہنمائی کر رہے ہیں اور اندھیرے میں رہزنی بھی ہو رہی ہے۔

مطالعہ تاریخ: بنیادی نکات

بحیثیت مسلم ہمیں مطالعہ تاریخ (اور تدوین نصابات) میں مندرجہ ذیل نکات پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

تاریخ فی الحقیقت تحریکات کی تاریخ ہے۔ دینی' اخلاقی' راہبانہ' صوفیانہ اور معاشی تحریکیں بار بار جگہ جگہ سے نمودار ہوتی ہیں اور کسی گروہ انسانی کو اپنا علمبردار بنا لیتی ہیں۔ یہ تحریکیں غلبہ پا کر اپنے طرز کی مکمل تہذیب تشکیل کرتی ہیں۔ تحریکیں قوموں کو اٹھاتی ہیں۔ پھر قومیں تھک ہار کر انحراف کی راہ پر پڑ جاتی ہیں اور ان کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ مگر ہر زوال یافتہ قوم سابق تحریک کے احیاء سے یا کسی نئی تحریک کو اختیار کرنے سے پھر زندگی پا لیتی ہے۔

یہ تحریکی نظریہ تاریخ جسے قرآن نے انبیاء علیہم السلام کے تذکروں میں سمو کے پیش کیا ہے' مسلمان دانشور اس سے اتنے بے گانہ ہیں' جیسے کوئی شخص خود اپنے نام کو بھول جائے۔

تاریخ کو قوموں کے عروج و زوال کی روداد کہنے کے بجائے قرآنی نقطۂ نظر سے رزم گاہ خیر و شر سمجھنا چاہیے اور اس رزم گاہ میں ایسے دوگونہ کرداروں کا مطالعہ کرنا چاہیے جو خیر و شر کے محاذ پر نمودار ہوتے ہیں۔

ملت اسلامیہ کی تاریخ اس طرح پیش کی جانی چاہیے کہ وہ بقول اقبالؒ ہمارے لیے ایک ایسا آئینہ ہو جس میں ہم اپنے تہذیبی وجود کے چہرہ زیبا کی ساری رعنائیاں دیکھ سکیں اور مختلف احوال و ظروف کے چیلنج سے دوچار ہو کر جہاں کہیں ہم نے اپنی صورت کو مسخ کیا ہے اس سے بھی عبرت اندوز ہو سکیں۔

ہمیں ماضی کے تجربات کے ریکارڈ میں اپنے کردار کا مطالعہ اس لحاظ سے کرنا چاہیے کہ کب ہم اپنے نصب العین کا پرچم بلند رکھنے میں کامیاب رہے اور کن کن مواقع پر ہماری

کمزوری نے اسے سرنگوں ہو جانے دیا۔ کب ہم نے قربانیاں دے کر اپنے آپ کو، اپنے امتیازی تہذیبی وجود کے تحفظ کے لئے اپنے اصولوں پر قائم رکھا، اور کب ہم متزلزل ہو گئے۔ ہمیں اعتقادی، تہذیبی اور اخلاقی فتح وشکست کے مواقع کو جاننا چاہیئے۔

ہمیں اپنی ملی تاریخ کے ادوار کو عروج وزوال کی مروجہ اصطلاحات کے تحت تقسیم کرنے کے بجائے، استقامت، انحراف اور احیاء کے ادوار میں تقسیم کر کے دیکھنا چاہیے۔ بعض حالات میں مادی لحاظ سے ہم دوسروں سے کم تر حالت میں تھے مگر اپنے اصول ومقاصد پر استقامت کے لحاظ سے حد درجہ مضبوط۔ کبھی اقتدار، علم، معاشی اور فوجی قوت کے لحاظ سے ہماری دھاک بیٹھی ہوئی تھی مگر ہم اعتقادی اور اخلاقی لحاظ سے انحراف کے راستے پر گامزن تھے اور کبھی اچھے اور برے دونوں قسم کے حالات میں ہمارے اندر احیاء کی تحریکات نمودار ہوئیں۔

اوپر کے نکات کے مطابق اپنی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے جہاں ہم اپنے سنہرے اور تاریک ادوار کو پہچان سکتے ہیں وہیں بہ آسانی ہم اپنے ان اعیان واکابر کو پہچان سکتے ہیں جو صدہا کی تعداد میں آسمان تاریخ پر ستارے بن کر جگمگا رہے ہیں اور ان کے کردار کے مطالعے سے ہم حیات نو اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں۔

ان چند نکات کو سامنے رکھ کر اگر تاریخ اور نصابات تاریخ کو مرتب کیا جائے تو پھر چاہے آپ دور عروج کا مطالعہ کرائیں یا دور زوال کا اصل مقصد کسی حال میں ضائع نہیں ہوتا اور اگر علم تاریخ کا آئینہ ہی صورتوں کو مسخ کر دینے والا ہو تو زریں دور کا حال بیان کرتے رہیے ایک قصہ وافسانہ سے زیادہ اثر نہ رکھے گا۔

مختلف مدارج تعلیم کے نصاب

مختلف مدارج تعلیم کے نصاب کی تقسیم بیان کر کے یہ بتانا کہ فلاں دور چونکہ میٹرک تعلیم کے نصاب میں آ گیا ہے اس لئے اس کو آگے کے مراحل میں دوہرایا نہیں گیا تعلیمی نصاب کے کسی راز دان کے لئے قابل اطمینان نہیں ہے۔ ایک چیز بسا اوقات ابتدائی مدارج میں بھی پڑھائی جاتی ہے۔ ثانوی میں بھی، وسطانی میں بھی اور موقانی میں بھی، لیکن اسے تکرار نہیں کہہ سکتے۔ ہر تعلیمی سطح پر کسی مضمون کی وسعت وگہرائی میں فرق ہوتا ہے۔ آپ اگر تاریخ ملت کے اہم ترین ادوار کو ابتدائی ثانوی یا وسطانی مدارج میں شریک نصاب کر کے فارغ ہو

جاتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اہم ترین ادوار تاریخ کو آپ نے وہ اہمیت نہیں دی جس کے وہ مستحق تھے اور آپ ایک مناسب وسعت اور گہرائی کے ساتھ طلبہ کو ان کا مطالعہ کرانے کی ذمہ داری پوری نہیں کر سکے۔

نصاب تاریخ اور فرقہ واریت

اگر مسلمانوں کے کسی اقلیتی فرقہ کی طرف سے مطالبہ یہ ہے کہ کوئی ایسی چیز جو ان کے نقطۂ نظر سے مطابقت نہ رکھتی ہو مسلمانانِ پاکستان کے نصاب میں شامل نہ کی جائے یا کی جائے تو اسے دبا پچکا کر کسی کونے میں ڈال دیا جائے تو یہ بات نہ اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ ہوگی' نہ جمہوری اسالیب سے۔ اس کا نتیجہ تو یہی ہوسکتا ہے کہ تعلیم سے مذہب کا عنصر ہی خارج ہو جائے' جیسے یہودیوں کے دباؤ کی وجہ سے امریکی نظام تعلیم کو عیسائیت کی ہر جھلک سے خالی کر دیا گیا ہے۔ یعنی دین میں اختلاف کا نتیجہ لادینیت پر اتفاق! ـــــ بہرحال یہ بات اطمینان کا باعث ہے کہ مسلم اکثریت یہ چاہتی ہے کہ سارے اختلافات کے باوجود مسلمانوں کے مختلف فرقے ایک امت کے وسیع گھرانے میں ضم ہو کے رہیں۔

ضرورت صرف ایک بات کی ہے کہ دنیا کی اسلام دشمن تحریکات اور مسلم کش سازشوں کی جدید ''حروب صلیبیہ'' کو سامنے رکھا جائے اور تہذیب الحاد و مادیت کی اس خوفناک فکری' اخلاقی اور ثقافتی یلغار کی تباہ کاریوں کو سمجھا جائے جو شیعہ سنی اور بریلوی وہابی کی تمیز کے بغیر خدا پرستانہ خیالات و افکار اور اخلاق و کردار کو تہس نہس کرتی چلی جا رہی ہے۔ کوئی مسلمان شیعہ ہو یا سنی' اسے اصل مقابلہ اس دشمن قوت کا درپیش ہے۔ یہ مقابلہ بغیر اس کے کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا کہ ہمارے فرقے داخلی معرکہ آرائیوں کو چھوڑ کر وحدت کے محاذ پر صف آراء ہوں۔

دور اواخر کی تاریخ

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ دور اواخر کو زوال کا زمانہ کہنا صحیح ہے یا نہیں' کیونکہ اس میں آزادی کی جدوجہد بھی ہوئی اور مسلمانوں کی نئی نئی حکومتیں بھی قائم ہوئیں۔ یہ بات ذرا الجھی ہوئی ہے اور اسے سلجھانے کے لئے مسلم فلسفہ تاریخ کے مذکورہ بالا نکات سے مدد لی جاسکتی ہے۔

مسلم مورخ کو یہ دیکھنا اور دکھانا چاہیے کہ کب اور کہاں مسلمانوں کی کوئی حکومت قائم

ہوئی اور کب کوئی اسلامی حکومت قائم ہوئی ؟ ان دونوں میں فرق ملحوظ رکھ کر ہی عروج و زوال کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح جو تحریکات آزادی نمودار ہوئیں ان میں کونسی تحریک کسی بیرونی قوم کی غیر مسلم حکومت کے خلاف معرکہ آرا ہوئی اور کونسی تحریک ایسی تھی جو غیر اسلامی نظام سیاست و معیشت سے مسلمانوں کو نجات دلانے کے لئے سرگرم جہاد ہوئی۔

بدقسمتی سے اس طرز فکر کے ساتھ کام کرنے والے لوگ نہ فلسفہ تاریخ کے میدان میں ہیں، نہ تاریخ نگاروں میں، نہ مرتبین نصاب میں، اور نہ معلمین تاریخ میں۔

قرآنی سوشیالوجی

سوشیالوجی کے اساتذہ اور طلبہ کو پہلے اس عمومی حقیقت کا ادراک کرنا چاہیے کہ مغرب کی تہذیب الحاد' کی گود میں پرورش پائے ہوئے تمام علوم' جن کو ہمارے ہاں جوں کا توں سر آنکھوں پر رکھا جاتا ہے اور دل و دماغ میں اتار لیا جاتا ہے' ہمارے لئے ایک ایسا فکری قفس مہیا کرتے ہیں کہ ہم سب کے سب قرآن کی دعوت فلاح وسعادت اور اقبال کی خودی سمیت اس میں محبوس رہ کر عمریں گزار دیتے ہیں' لیکن اس قفس کی طلسمی فضا کا یہ کمال ہے کہ اگرچہ اس میں پھڑک پھڑک کر ہم اپنے سارے بال و پر تباہ کر لیتے ہیں' مگر ذہنوں پر آزادی افکار کا زعم طاری رہتا ہے۔

یہ علوم (خصوصاً سوشیالوجی) جن کا ضمیر خدا ناشناس مادہ پرستی سے اٹھایا گیا ہے' ہر طرف سے ہمارے ایمان پر حملہ آور ہوتے ہیں اور ہماری پسندیدہ تہذیب کو مجروح کرتے رہتے ہیں۔ مگر استاد صاحبان برسوں استادی کر کے' اور شاگرد لمبا طالب علمانہ دور گزار کر بھی اس ٹکراؤ سے آگاہ نہیں ہو پاتے جو خود ان کے فکری وتہذیبی وجود کے خلاف تعلیم گاہوں میں جاری ہے۔

مروجہ سوشیالوجی' اجتماعیت کے اصول وعوامل اور معاشرے کے ادارات کی ماہیت جس شکل میں ہمارے سامنے لاتی ہے' اس سے ہمارے اپنے فلسفہ اجتماعیت و مدنیت کی شکست و ریخت ہو جاتی ہے۔ یہودی اور امریکی سوشیالوجی ہو' یا اشتراکی قسم کی' دونوں ہمارے جہان ایمان و افکار کو تہ و بالا کرنے میں ایک دوسرے سے کم نہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ پاکستان کے اساتذہ وطلبہ اغیار کے تیار کردہ علمی قفس کو توڑ ڈالیں اور کھلی فکری فضا میں پرواز کرنے کا تجربہ شروع کریں۔

اسلام ایک مذہب نہیں ہے' بلکہ ایک ہیئت اجتماعیہ یا ایک سوشل سسٹم کا نام ہے۔ وہ

پوری انسانی زندگی اور اس کے سارے ادارات کی تشکیل نو کرنے والی ایک تہذیبی تحریک ہے۔

قرآن کو اگر مروجہ علوم کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ درحقیقت سوشیالوجی کی ایک مکمل اور جامع کتاب ہے' اور اس کا موضوع ھئیتِ اجتماعیہ ہے۔ اور اس موضوع پر جو اصول و کلیات اس نے دیئے ہیں وہ حرف آخر ہیں۔ قرآن نے ان تمام رابطوں اور اداروں کو وضاحت سے بیان کیا ہے جو انسانوں کو زیادہ بہتر شکل میں ایک دوسرے سے وابستہ کرتے ہیں اور جن کے ذریعے پاکیزہ مگر مربوط ترین اور مضبوط ترین معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

سوشیالوجی کے لئے ایک مرکزی سوال یہ ہے' جس کے جواب پر سوشل رابطوں کی صحت کا دارومدار ہے کہ آپ انسان کو کیا مقام دیتے ہیں۔ آیا نظم' قانون' توازن' توافق اور حسن سے آراستہ کائنات کو اتفاقی حوادث کے تسلسل کا نتیجہ قرار دے کر اس میں انسان کو ایک ذی عقل حیوان کا درجہ دیتے ہیں' یا آپ اسے صاحب قدرت و حکمت ہستی کا تخلیق کردہ شہکار قرار دے کر اخلاقی ذمہ داری کے مقام شرف پر رکھتے ہیں۔

دونوں صورتوں میں اس کے تعلقات کا نہج بالکل مختلف رہے گا۔ اور سماج اور اس کے تمام ادارات کی تشکیل الگ الگ طریقوں سے ہو گی۔ سیاست و حکومت' کاروبار' ملازمت' ازدواج' خاندان وغیرہ سارے رابطے اس مقام و منصب کے مطابق قائم ہوں گے جو انسان کے لئے طے کیا جائے گا۔

قرآنی حکمت انسان کو رب کائنات کی پیدا کردہ ذمہ دار اخلاقی مخلوق قرار دیتی ہے۔ اور اسے خلافت و نیابت کے مقام پر فائز کرتی ہے۔ اس پر متعدد فرائض عاید کرتی ہے' اسے بہت سے حقوق سے بہرمند کرتی ہے' اس کو احترام اور خود اعتمادی کے مقام پر رکھتی ہے اور پھر اسے بدلتے احوال میں خیر و شر کی کشمکش میں ڈال کر اس کی اچھی صلاحیتوں کو ابھارنے اور ان کو ارتقا کرنے کے مواقع پیدا کرتی ہے۔

انسانیت کا حیوانی تصور جو مروجہ تہذیب کی روحِ رواں ہے اور جس نے آدمی کے جسمانی یا معاشی تقاضوں کو اولیت دے کر اخلاقی رجحان کو دبا دیا ہے' اس کا ماحصل دو تین صدیوں کی علمی کاوشوں' سائنسی سرگرمیوں' مالی مصارف اور مختلف نوع کی محنتوں کے نتیجے میں سامنے آیا ہے وہ اتنا تکلیف دہ' امن سوز' اضطراب انگیز' اطمینان کش' بحران آفرین اور تصادم افزا ہے کہ یہ ماحصل بجائے خود انسانیت کے حیوانی تصور کے باطل و فاسد ہونے کی قاطع

دلیل ہے۔ نظام تمدن کے اساسی امور میں اگر نظریاتی استدلال کسی کے لئے قطعی فیصلے پر پہنچنے کے لئے کارگر نہ ہو تو ان اساسی امور کے برآمد ہونے والے بدیہی نتائج کی اچھائی یا برائی ایک فیصلہ کن دلیل ہوتی ہے۔

ہماری آج کی دنیا جس حیوانی تصور انسانیت کے تحت نمودار ہوئی ہے' اس نے سارے کرہ ارضی پر نوع انسانی کو طرح طرح کی تقسیموں کا شکار بنا کر ان کے درمیان ہر سطح پر لاینحل تصادم پیدا کر دیئے ہیں۔ جنگیں' خونیں انقلاب' اقلیتوں پر اکثریتوں کا تشدد اور اکثریت پر اقلیتوں کا جبری تسلط' سامراجی سازشیں۔ صحافت ہی میں نہیں علوم کے پیرائے میں جھوٹے اور فریب کارانہ پروپیگنڈے کا بڑھتا ہوا عنصر' بڑی قوموں کی طرف سے دوستی اور امداد کے پردے میں نوخیز ممالک کا استحصال' قوموں کا اپنے ہی قائدین کے ہاتھوں غلامی کے سے تلخ حالات سے گزرنا' معیار زندگی کے لئے فرد فرد کی مجنونانہ مسابقت' مسرت کے حصول کے لیے اخلاقی اور قانونی حدود کو توڑ کر اور دوسروں کو نقصان پہنچا کر ہر ممکن حربے سے کام لینے کے باوجود اس کوشش میں ناکامی' مصروفیات کے طوفان میں غوطے کھاتے ہوئے ہجوموں کے درمیان ہر شخص کا احساس تنہائی و بے کسی' جرائم کی افزائش اور ان میں ظلم و تشدد کا اضافہ' جسمانی امراض کے ساتھ ذہنی عوارض کی کثرت' سائنس اور ٹیکنالوجی کا تعمیری اور فلاحی مقاصد کی خدمت سے بڑھ کر تخریبی استعمال' قوموں کو مادی اور اخلاقی نقصانات پہنچا کر ساحرانہ فن تشہیر کے بل پر کاروباری منافع حاصل کرنا' تفریحات کے دائرے میں انسانی شرف کے لئے تباہ کن طریقوں کا فروغ' تہذیبی فساد کا شکار ہونے والی قوموں کی طرف سے دوسری قوموں پر فکری اور ثقافتی یلغار' ـــــــ یہ ہے نقشۂ احوال جس نے دنیا کے ہر فرد انسانی کو ایک لاینحل پریشانی کے گرداب میں مبتلا کر رکھا ہے۔

یہ ٹھیک منطقی نتائج ہیں انسانیت کے حیوانی تصور کے یا بالفاظ دیگر انسان کو کائنات میں غلط مقام دینے کے۔ حیوانی تصور فرد کے لئے خواہشات اور گروہوں کے لئے مفاد کو مرکز نگاہ بنا دیتا ہے' اور خواہشات اور مفاد کی غلامی میں مبتلا انسانوں کی تہذیب وہی احوال پیدا کر سکتی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

پس سوشیالوجی کے ہر محقق اور طالب علم کا فرض ہے کہ وہ سوشل سسٹم میں انسان کے صحیح مقام و منصب کا تعین کرے' اور آج جس غلط مقام و منصب پر وہ ہے اس کی غلطی کو

پورے زور استدلال سے واضح کرے۔

اصولی طور پر تین بڑے رابطے ہیں جن کے صحیح اور متوازن طور پر تشکیل پانے سے نظام تمدن درست ہوتا ہے' اور جن میں ناہمواریوں اور تضادات کی وجہ سے پورے تمدن میں بگاڑ پھیل جاتا ہے۔ وہ ہیں:

- انسان کا تعلق خدا سے
- انسان کا تعلق دوسرے انسانوں سے
  (سیاسی' معاشرتی' ازدواجی' اخلاقی' قانونی' کاروباری' بین الاقوامی)
- انسان کا تعلق مادی کائنات اور اسباب و وسائل سے۔
  (معاش' دولت' وسائل کار' سائنسی ایجادات' اسلحہ وغیرہ کے مسائل)

ان تین رابطوں کی جتنی مختلف ترتیبیں اختیار کی گئی ہیں' اتنے ہی جدا جدا تمدنی نظام اور اجتماعیت کے ڈھانچے پائے جاتے ہیں۔ ہماری سوشیالوجی میں خدا سے انسان کا تعلق ''عبودیت'' کہلاتا ہے جو ایمان' محبت اور اطاعت پر مشتمل ہے۔ انسانوں سے انسان کے مختلف رابطوں کو جس عنوان کے تحت لایا جا سکتا ہے وہ ہے ''عدل و احسان''۔ انسانوں کے باہمی مطلوبہ رویے کو مساوات و اخوت کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ مادی موجودات' قوتوں اور وسائل اور ضروریات سے انسان کا تعلق نیابتی فرماں روا کی حیثیت سے خدا کی مقررہ حدود میں خدمات لینے اور استفادہ کرنے کا ہے۔

سوشیالوجی کا کام ان تین رابطوں کا تعین کرنا اور انسان کو خدا' انسانوں اور مادی مخلوق کے درمیان صحیح مقام پر کھڑا کرنا ہے۔ اسی صحیح مقام کی دریافت اور شناخت کی فکری جدوجہد سے سوشیالوجی کی حکمت تشکیل پاتی ہے۔

قرآنی سوشیالوجی نے انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے جداگانہ بنیاد فراہم کی ہے۔ اس کا فہم و شعور بہت ضروری ہے۔

قرآن نے اتفاقی اجتماعیت کے بجائے ارادی اجتماعیت' غیر شعوری قومیت کے بجائے شعوری قومیت' مجبورانہ وابستگی کے بجائے رضا کارانہ وابستگی اور معاشی مفاد کے اشتراک کے بجائے ہم فکری اور ہم مقصدی کے لئے اشتراک کرنے کا راستہ نکالا ہے۔

قرآنی سوشیالوجی کی رو سے کائنات' انسان' زندگی اور معاشرے کے متعلق جو لوگ خدا پرستانہ طرز فکر اختیار کرتے ہیں وہ ایک جماعت ہیں' اور جو لوگ غیر خدا پرستانہ زاویہ نگاہ اپناتے ہیں وہ دوسری جماعت یا جماعتیں ہیں۔

قرآن دراصل تحریک فلاح انسانیت کی ایک پکار ہے۔ انسانی زندگی کو سنوارنے کی انقلابی مہم میں حصہ لینے کے لئے جو لوگ مختلف نسلوں' قبیلوں' علاقوں اور طبقوں سے نکل کے آتے ہیں' وہ ان سب میں ایمانی' شعوری اور مقصدی وحدت پیدا کرتا ہے' قرآنی تحریک کا پیدا کردہ رشتہ خون کے رشتوں سے زیادہ قوی اور بالاتر ہے۔ اس تحریک کے علمبردار دنیا کے بعید ترین گوشوں میں بھی اگر بکھرے ہوئے ہوں اور کتنی ہی مختلف جغرافی قومیتوں اور نسلی دائروں میں پائے جاتے ہوں' ایمان و مقصد کی وحدت دوسرے سارے رشتوں سے اہم تر ہونے کی وجہ سے ان کو باہم دگر وابستہ رکھتی ہے۔ یہ مختلف رنگوں اور مختلف بولیوں والے لوگ سچائی اور نیکی کے عالمگیر محاذ کے سپاہی ہونے کی وجہ سے جہاں کہیں ہوں' ایک کمان کی طرح مربوط رہتے ہیں' صف بستہ ہوتے ہیں' برائی کے خلاف لڑتے ہیں' جانیں نثار کرتے ہیں' اپنے خون سے تاریخ کے صفحات پر عز و شرف کی داستانیں رقم کرتے ہیں ___ اور خدا و رسول ﷺ کی وفاداری کا حلف اور میثاق ان کے لئے محبت و وابستگی کا اٹوٹ بندھن ہوتا ہے۔

قرآن کی پیش کردہ اساس اجتماعیت کو سمجھے بغیر مسلم نظریہ قومیت کو سمجھنا ناممکن ہے' جس کا تصور جغرافی و سیاسی قومیتوں سے بالاتر اور وسیع اور قوی ہے۔ قومیت کی مروجہ محدود اصطلاح کی وجہ سے اس کا مفہوم سمجھنا خاصا مشکل ہے۔ یہ تہذیبی قومیت' یا تحریکی وحدت ایک ایسی اجتماعیت ہے جو جغرافی سیاسی قومیت' کے بغیر اس صورت میں باقی رہتی ہے جبکہ اس سے وابستہ افراد کو مختلف قوموں اور مختلف سیاسی نظاموں میں بکھیر کر پھیلا دیا جائے۔ اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تحریکی وحدت اور یہ تہذیبی اجتماعیت مختلف وطنوں کی الگ الگ سیاسی قومیتوں کے درمیان بھی اپنی بالاتر حیثیت کے ساتھ قائم رہے۔ قرآن ایک ایسی قوم پیدا کرتا ہے جس کی بیک وقت کئی ریاستیں اور جغرافی قومیتیں موجود ہو سکتی ہیں۔

ہماری جداگانہ حکمت اجتماعیت ہمارے مخالفین کو ہمیشہ بری طرح کھٹکتی رہی ہے جنہوں نے ہمارے فکری و تہذیبی وجود کو مٹا کر فائدہ اٹھانا چاہا ہے۔ سب سے پہلے امپریلسٹوں نے

ہمیں غلام بناتے ہوئے اس خطرناک قوت کو مزاحم پایا اور یہی ان کے خلاف آزادی کی تحریکات کی روح بنی۔ ہماری یہی قوت اس میں مانع ہوئی کہ کوئی دوسری بڑی اور شاطر قوم ہمیں اپنے اندر جذب کر لے اور اپنے جداگانہ وجود کے تصور سے ہمیں محروم کر دے۔ انہی سامراجی اور شاطر قوتوں نے آخری حربہ ہمارے خلاف یہ استعمال کیا کہ اپنے علوم و ثقافت کے جال ہمارے اوپر پھیلانے کے ساتھ ساتھ وطنی قومیت اور سیکولر اسٹیٹ کے نظریات کے تیروں کی ہم پر بوچھاڑ کر دی۔

اہل مغرب، یہودی، سوشلسٹ، اہل ہند سب کے سب مسلم تصور اجتماعیت کے خلاف ہر قسم کے حربے استعمال کر رہے ہیں۔

بدقسمتی یہ ہے کہ قرآن کی پیدا کردہ تحریکی و تہذیبی وحدت اپنی پوری روح کے ساتھ بڑے پیمانے پر کارفرما نہیں ہے، کیونکہ قرآن کی تحریک فلاح انسانیت کے کارکنوں سے زوال و فساد کے ادوار سے گزرتے ہوئے تحریکی و تہذیبی شعور کھو گیا ہے، اصل مقصد کے کام کرنے کی اسپرٹ دب گئی ہے، اور اس شعور اور اسپرٹ کی جگہ ان میں تاریخی تسلسل کے تحت ایک جذباتی تعلق باقی رہ گیا ہے۔ اس جذباتی تعلق نے مسلم نیشنلزم کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہ مسلم نیشنلزم بھی اتنی موثر قوت ہے کہ جس کی وجہ سے اس کے دائرے میں داخل شدہ گروہ اپنے آپ کو دوسری قوموں سے الگ ایک مستقل وحدت سمجھتے ہیں۔

نہایت ضروری ہے کہ سوشیالوجی کے اساتذہ و طلبہ قرآن کی اساس اجتماعیت کا پورے تفکر سے مطالعہ کریں۔ ہماری امتیازی اجتماعیت ہمارا حفاظتی حصار ہے۔

یہ بڑا قابل غور مسئلہ ہے کہ ایک طرف قرآن ہمہ گیر اجتماعیت کا داعی ہے، اور دوسری طرف، وہ فرد کو اس اجتماعیت کا بھاری جوا اٹھانے کے لئے جبریت کے سانٹے سے کام نہیں لیتا، بلکہ محبت آمیز معلمانہ طریقے سے اسمیں ایک رضا کارانہ جذبہ خدمت و تعاون کو ابھارتا ہے۔

مغربی سرمایہ داری نے فرد کو تھوڑی سی قانونی پابندیوں کے ساتھ آزاد چھوڑنے کا تجربہ کیا تو وہ ناقابل برداشت نتائج تک پہنچا۔

اس کے ردعمل میں سوشلزم اٹھا اور اس نے فرد کو مکمل قانونی جبریت کے جوئے میں جکڑ

کر گلا گھونٹ دینے والی اجتماعیت میں ایسی بری طرح جکڑا کہ وہ ہاتھ پیر تو کیا اس کے بارے میں زبان تک بھی نہ ہلا سکے۔

ان دونوں کے بالمقابل قرآن نے اپنی ہمہ گیر تہذیبی اجتماعیت کو چلانے کے لئے فرد کو ذہنی اور اخلاقی طور پر رضا کارانہ جذبہ ایثار سے آراستہ کیا اور اس کے اندر خوف خدا اور اخلاقی ذمہ داری کا احساس اور آخرت کی جواب دہی کے شعور کی نگراں چوکیاں بٹھا کر اسے زیادہ سے زیادہ آزادیوں اور شہری حقوق سے آراستہ کیا۔

چنانچہ قرآنی تحریک کے پیدا کردہ مثالی معاشرے کے افراد اجتماعی مقاصد کے لئے اپنے اموال قربان کرتے تھے' اجتماعی مقصد کے لئے از خود آگے بڑھ بڑھ کر جانیں دیتے تھے' اجتماعی عدل کے تحفظ کے لئے اپنی پوشیدہ غلط کاریوں کا قوت حاکمہ کے سامنے آ کر اقرار کرتے اور سزا پانے کے لیے اصرار کرتے تھے۔ قانون ان سے جو کم سے کم حد تک کے ضروری مطالبات کرتا تھا وہ ان سے بہت زیادہ کچھ معاشرے کے مفاد کے لئے کر گزرتے تھے۔

رضا کارانہ ایثار و خدمت' رضا کارانہ تعاون اور رضا کارانہ طور پر پابندیوں کا قبول کرنا ایک طرف افراد میں بڑا اخلاقی علو پیدا کرتا تھا' اور دوسری طرف وہ اس خوف اور گھٹن کی بیماری سے محفوظ رہتے تھے جو آمرانہ اور فسطائی معاشروں میں عام ہوتی ہے۔

پس قرآنی سوشیالوجی کا اجتماعیت کو کامیاب بنانے اور اس کے لئے افراد کو مخصوص اسلوب سے تیار کرنے کا یہ تجربہ بے حد قابل غور ہے۔

مضبوط اور اچھی اجتماعیت کے لئے عدل کا ہونا اشد ضروری ہے۔ افراد اور گروہ اپنے آپ کو اس بات سے محفوظ و مامون سمجھیں کہ کوئی فرد یا گروہ سیاسی قوت' منصب' دولت' علم یا خاندانی اور قبیلوی جتھا بندی کی بنا پر ان کو ظلم و استحصال کا نشانہ بنا سکتا ہے۔ انہیں اعتماد ہونا چاہیے کہ سیاسی نظام' عدلیہ اور قانون' اور معاشرے کی رائے عامہ اور افراد کا اخلاقی شعور اس کے تحفظ کے لئے ہر حال میں اپنا فرض صحیح طور پر ادا کریں گے۔

باقی سارے مظالم کا سدباب نسبتاً سہل ہے' لیکن جبر و تشدد کرنے والے حکمران سے شہریوں کے حقوق و مفاد کا تحفظ ایک ایسا بھاری مسئلہ ہے کہ جس کے متعلق سیاسیات' دستور

اور قانون کے مختلف علوم میں ہمیشہ سلسلہ غور و بحث جاری رہا ہے۔ مستبد حکمراں قوت جمہوری پیرائے میں بھی مفاد عامہ کے نام پر ظلم ڈھا سکتی ہے اور وہ ایسے ڈھب سے قانون سازی بھی کر سکتی ہے کہ اس کے پاس اختیارات کا ایک اسلحہ خانہ موجود ہو اور وہ جب چاہے کسی کے خلاف ایک نہ ایک ہتھیار کو استعمال کر ڈالے۔ وہ کسی بہانے سے عدالتوں کو اپنی ناجائز کارروائیوں کا جائزہ لینے کے اختیار سے محروم کر سکتی ہے۔ مستبد حکمراں جمہوری نظام میں پارلیمنٹ کو بھی چکر دے سکتا ہے اور پروپیگنڈہ مشینری کو اپنے منشاء کے مطابق استعمال کر کے رائے عام کو بھی بہکا سکتا ہے اور اپنی صحیح یا غلط طریقوں سے حاصل کردہ اکثریتی قوت کو پستول کی طرح ساری قوم کے خلاف استعمال کر سکتا ہے۔

قرآنی سوشیالوجی نے اس عظیم ترین مسئلہ عدل کو حل کرنے کے لئے یہ صورت اختیار کی ہے کہ اپنے نقشہ پر معاشرہ کو استوار کرتے ہوئے وہ پہلے تعلیم و استدلال کے ذریعے ایک ایک فرد سے خدا کی بالاتر قوت حاکمہ اور اس کے بالاتر قانون ہدایت کو تسلیم کراتا ہے۔ معاشرے کی بھاری اکثریت جب اس بالاتر قوت اور بالاتر قانون کو مان لیتی ہے تو پھر وہ اپنے تیار کردہ معاشرے میں ایک ایسا سیاسی نظام جاری کرتا ہے جس کی حکمراں قوت' صدر' کابینہ' پارلیمنٹ' عدلیہ اور تمام اہل مناصب اور عام شہری اپنے آپ کو عظیم و قدوس حکمراں قوت کے مقدس بالاتر قانون کی حدود و قیود کا پابند بناتے ہیں' اور معاشرے کی کوئی قوت ان حدود سے تجاوز نہیں کرتی۔ صدر ریاست اور وزیر اعظم بھی ان حدود سے آگے قدم بڑھانے کی جرأت نہیں کرتا' پارلیمنٹ یا اسکی اکثریتی پارٹی بھی ان حدود کو پھاندنے کی جسارت نہیں کرتی۔ عدلیہ اور دفتری نظام کے کارکن اور فوجی افسران بھی ان حدود کو پھلانگنے کا خیال بھی نہیں کر سکتے۔ اسی طرح شہری عوام اور ان کی جماعتیں بھی اپنے مطالبات کو بالاتر مقدس قانون الٰہی کے دائرے میں محدود رکھتی ہیں۔

اس بالاتر قانون کو کوئی منسوخ نہیں کر سکتا' اس میں ترمیم نہیں کی جا سکتی' اسے وقتی مصلحتوں کا تابع نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ بالاتر قانون افراد اور افراد یا گروہوں اور گروہوں کے درمیان ہی نہیں بلکہ حکمراں طاقت اور شہریوں کے درمیاں بھی عدل کے قیام کے لئے میزان کی حیثیت رکھتا ہے۔ حکمراں طاقت کوئی قانون سازی اس بالاتر قانون سے دلیل لائے بغیر اور اذن حاصل کئے بغیر نہیں کر سکتی' اور نہ کوئی قانونی' انتظامی کاروائی اس کے منشا کے خلاف

کر سکتی ہے۔

حکمراں طاقت اور شہریوں کے درمیان توازن قائم رکھنے کے لئے مسلم سوشیالوجی نے ہئیت حاکمہ کی تشکیل کے لئے بیعت کا اصول مقرر کیا ہے یعنی کسی حکمراں فرد یا جماعت میں شہری اپنے اپنے مساویانہ حصہ اقتدار کا ارتکاز اس عہد کے ساتھ کرتے ہیں کہ وہ خدائی قانون شریعت کے حدود میں اطاعت کریں گے اور حکمراں کے لئے لازم ہوگا کہ وہ قانون شریعت کی حدود کا پابند رہ کر احکام دے اور انتظام چلائے۔ اب اگر شہری اس معاہدہ کی خلاف ورزی کریں تو وہ عدم اطاعت' قانون شکنی یا بغاوت کے جس بھی جرم کے مرتکب ہوں گے اس کی مقررہ سزا ان کو ملے گی' اور حکمراں اگر اس معاہدے کو پامال کر دے تو اس کی اطاعت کا وجوب ختم ہو جائے گا اور شہری اسے معزول کرنے کا حق حاصل کر لیں گے۔

سیاسی ہئیت حاکمہ کے لئے یہ مخصوص نقشہ صرف مسلم سوشیالوجی نے فراہم کیا ہے۔ باقی نظاموں میں انسانی اقتدار (وہ بادشاہتی ہو یا جمہوری) کسی بالاتر قوت اور بالاتر قانون کا پابند نہیں ہے۔ دستور اگرچہ پابندیاں لگاتا ہے مگر اسے ہر وقت بدلا جا سکتا ہے۔

خدائی حاکمیت اور بالاتر قانون شریعت سے آزاد جمہوریتوں میں ساحرانہ اطوار کے ماہر سیاست باز ہجومی سیاست' اور فریب کارانہ خطابت اور مرعوب کن مظاہرہ ہائے تشدد اور انتخابی خیانت سے کام لے کر بالعموم مصنوعی اکثریت حاصل کر کے اقتدار پر قابض ہو جاتے ہیں اور اختیارات کو من مانے طریقوں سے استعمال کرتے ہیں۔ تاریخ کا یہ المیہ بہت عام ہے کہ اقلیتی قوت مصنوعی اکثریت حاصل کر کے حقیقی اکثریت کے رجحانات کو کچلتی ہے اور معاشرے کو جدھر چاہتی ہے زبردستی دھکیل لے جاتی ہے۔

یہ سارے اسالیب مسلم سوشل سسٹم کے طریق سیاست میں ناجائز ہیں' کیونکہ بالاتر قانون اور اس سے متعلقہ اخلاقی شعور ان کی اجازت نہیں دیتا۔

چنانچہ دور نبوت اور دور خلافت میں نمونہ کا جو سوشل اور سیاسی سسٹم جاری رہا' اس میں ہجومی سیاست' فریب کارانہ خطابت' مرعوب کن جبریت اور انتخابی خیانت کی کوئی ادنیٰ مثال بھی نہیں ملتی۔ جونہی ان طریقوں کو معاشرے میں سر اٹھانے کا راستہ ملا' وہ پورا نظام عدل ٹوٹ گیا جس نے حکمراں کے اختیارات اور شہریوں کے حقوق کے دونوں پلڑوں پر مشتمل میزان قائم رکھی تھی۔

آج ہمیں سوشیالوجی کی تدوین نو کا کام کرتے ہوئے خدا کی حاکمیت اور برتر خدائی قانون کے تحت عادلانہ سیاسی نظام کو چلانے کے لئے اس شعور کو فروغ دینا چاہیے کہ بڑا ہجوم جمع کر لینا کوئی دلیل حق نہیں ہے' مار دھاڑ اور جبر وتشدد کے ذریعے عوام کو مرعوب کرنا کسی فرد یا گروہ کی راست روی کی علامت نہیں ہے' اور اسی طرح شہریوں یا پارلیمنٹ کو سحر خطابت یا پروپیگنڈے کے زور یا خوف اور لالچ کے ذریعے ہم نوا بنانا فلاح عوام کے خلاف ہے۔ ان طریقوں سے سچی جمہوریت نہیں پیدا ہوتی بلکہ جعلی جمہوریت پیدا ہوتی ہے جو آہستہ آہستہ لا جمہوری نہج اختیار کرتی جاتی ہے۔

پر خلوص دعوت' روشن استدلال' پاکیزہ کردار' عوام کی معلمانہ طریق سے تربیت وتنظیم مسلم معاشرے کی سیاسی قیادت کے وہ لازمی اوصاف ہیں جن سے کام لے کر سچی جمہوریت پیدا کی جا سکتی ہے جس میں حکمراں اور شہریوں کے درمیان مکمل عدل کارفرما ہو۔

ان حقائق کو سامنے رکھ کر سوچا جائے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ اب تک ہماری اسلامی ریاست میں یہ کام ہو جانا چاہیے تھا کہ دوسرے علوم کی تدوین نو کے ساتھ ساتھ سوشیالوجی کو قرآنی حکمت کی اساس پر از سر نو مرتب کر لیا جاتا۔ نہ صرف اس موضوع پر نصابی ضروریات پوری ہو رہی ہوتیں' بلکہ مطالعہ وتحقیق کے لئے خاصا وسیع لٹریچر موجود ہوتا۔

پچیس[1] سال کی لمبی مدت کی کوتاہی اس صورت واقعہ سے ظاہر ہے کہ ہماری اسلامی ریاست کی درس گاہوں میں خدا پرستانہ سوشیالوجی کی جگہ ملحدانہ اور مادہ پرستانہ سوشیالوجی کی تعلیم دی جا رہی ہے۔

کاش کہ اب بھی سوشیالوجی کے مصنفین' نصاب نویسوں اور اساتذہ کو اپنی صحیح ذمہ داری کا احساس ہو جائے اور وہ سوشیالوجی کے نصابات کے تدوین نو کے کام کا آغاز اس تمہیدی اقدام سے کریں کہ اب تک ہمارے ہاں مسلم سوشیالوجی اور اس کے متعلقہ موضوعات پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس سارے مواد کو کھنگالیں اور اسمیں بہترین مقالات کا ایک مجموعہ تیار کر کے طلبہ کے ہاتھوں میں دیں۔ نیز سوشیالوجی کے مغربی نصابات کے ساتھ وہ ایسے تنقیدی مباحث کو شامل کریں جن کی اساس قرآنی تصورات پر ہو اور جن کے ذریعے طلبہ کو فکری مغلوبیت و

[1] یہ مضمون ۱۹۷۲ء میں تحریر کیا گیا تھا۔

مرعوبیت کے تباہ کن روگ سے بچایا جا سکے۔

ہمارے علمی حلقے اور ہمارے تعلیمی ماہرین یہ تک نہیں جانتے کہ ہمارے اپنے اسلاف نے سوشیالوجی کے میدان میں کیا کیا اور کتنا کام کیا ہے۔ وہ مغرب کے ایک ایک مصنف یا فلسفی کے حوالے فرفر سنا سکتے ہیں' مگر اپنے گھر کے علمی خزائن' اور ان خزائن کو سمیٹ کر پیش کرنے والوں کے نام تک ان کو معلوم نہیں ہیں۔ لے دے کر ہمارے جدید اہل علم کو ایک ابن خلدون کا نام آتا ہے جسے وہ فلسفہ' تاریخ' سیاسیات' معاشیات اور مدنیات وغیرہ کے تمام علوم کی گفتگوؤں میں یاد کر لیتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے دوسرے ماہرین سیاسیات مثلاً ماوردی اور ابن تیمیہ' ہمارے قانونی ماہرین مثلاً ائمہ اربعہ اور ہمارے روحانی و اخلاقی حکماء مثلاً امام غزالیؒ سبھی کے ہاں مدنیات کی بحثیں موجود ہیں۔

غیر نصابی مطالعہ!

ایک مسلمان طالب علم کے پیش نظر صرف متعین نصابات کا مطالعہ ہی نہیں ہونا چاہئے' اسے فہم دین بھی حاصل ہونا چاہیے۔ جس کو ہم درج ذیل عنوانات کے تحت بیان کر سکتے ہیں۔

(۱) دینی مطالعہ

(۲) مطالعہ قدرت' ذات' نفسیات اور طبعی ماحول

(۳) مطالعہ علوم

(۴) مطالعہ ادبیات

(۵) تمدن واجتماعیات' سیاست' معیشت' معاشرت' تہذیب

اب ایک ایک نمبر کو مختصراً لیجئے۔

(۱) دینی مطالعہ

عمر کے مراحل کے مطابق ہونا چاہئے۔ قاعدے کا مرحلہ' سیپارہ خوانی' جملہ قرآن ناظرہ' قرآن کا ایسا ترجمہ جس کے ساتھ ضروری وضاحتیں موجود ہوں۔ قرآن کا تفسیری' تحقیقی اور تقابلی مطالعہ۔ حدیث کے منتخب مجموعے ریاض الصالحین' مشکوۃ' صحاح ستہ' بخاری و مسلم و موطا (مع شرح)' اصول فقہ کا مطالعہ' حکمت احکام کو جاننے کے لئے حجۃ اللہ البالغۃ' اوامر و نواہی اور گناہ کبیرہ وصغیرہ کو جاننا' اسلامی تاریخ کا مطالعہ' تاریخ دور نبوت و سیرت پاک' تاریخ دور خلفائے راشدین' مختلف حکمرانوں اور مسلم علاقوں کا مطالعہ' اسلامی تحریکوں کا مطالعہ۔[1]

---

[1] مطالعہ دین کے سلسلے میں جو فہرست یہاں دی گئی ہے وہ چند روز کے لئے نہیں بلکہ تدریجاً اسے کئی میقاتوں میں تقسیم کرنا چاہئے۔ یہ کام بہ مشکل چار پانچ برس میں ہو سکتا ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ دینی علوم کے سلسلے میں فارسی اور عربی کا جاننا ضروری ہے۔ ہر مسلمان طالب علم میں یہ شعور ابھارا جائے کہ وہ روزانہ کم از کم ایک گھنٹہ دینی مطالعہ کے لئے وقف کر دے۔ قرآن کا مطالعہ بلا ناغہ کرے' وقت بعد نماز صبح یا بعد عشاء یا بعد عصر رکھ لے جیسا اس کے لئے ممکن ہو۔

(۲) مطالعہ قدرت

اس وسیع موضوع کے تحت بہت سے علوم آتے ہیں۔ ایک جویائے علم کو یہ بھی جاننا ہے کہ یہ کائنات کیسی ہے؟ اس کے مظاہر و شواہد کیا راہنمائی دیتے ہیں' اس کا نظم اور در و بست کس طرح کام کرتا ہے۔ اس کائنات میں جمادات' نباتات' حیوانات' گیس (gases) روشنی' حرارت و برودت' زندگی اور فنا' بہار اور خزاں کا دور دورہ —— یہ ساری چیزیں کن حقائق کی گواہی دیتی ہیں۔

پھر اس کائنات میں انسانی زندگی کے لامحدود عجائبات ہیں۔ ملک' نسلیں' زبانیں' مذاہب ہیں۔ تعصبات اور فخر و مباہات کے نشے ہیں۔ قوت و دولت اور کمزوری و غریبی کے درمیان ظلم کے بھی نمونے ہیں اور محبت و احسان کے بھی۔ جور و استبداد بھی ہے انتقام بھی اور صبر و حلم بھی۔ جنگ و جدل کے ہنگامے ہیں اور صلح و امن کے سمجھوتے بھی۔ اخلاق' شائستگی اور عدل کی اعلیٰ قدروں کے کہیں فانوس روشن ہیں اور کہیں کج خلقی' بداطواری اور اکھڑ پن کی سیاہ چڑیلیں رقصاں ہیں۔

پس آدمی کو خود اپنی ذات کے علم کی ضرورت ہے۔ جس کا ایک حصہ نظام جسمانی' اس کی صحت و سلامتی' اس کی نشو و نما' اس کے اعضا و قویٰ کی صحیح کارکردگی' اس کے لئے اچھی غذائیں' اس کے لئے مضرات و مہلکات وغیرہ کا جاننا ہے۔ یہ سلسلہ معلومات عامہ سے چل کر طب و جراحت تک جاتا ہے اور ادویہ و امراض کی تحقیقاتیں روز بروز آگے بڑھ رہی ہیں۔ ذات کے علم کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ اپنی نفسیاتی دنیا کو جانے جس کی قوتیں اس کے ہر معاملے میں دخیل ہیں۔ اسے معلوم ہونا چاہئے کہ مبادیات سے آگے نکل کر انسان کے اندر کام کرنے والی نوری اور ناری قوتیں کونسی ہیں؟ انسانی زندگی میں ایک حیوان مطلق اور ایک مہذب اور بااصول حیات انسانی میں کس طرح تصادم جاری رہتا ہے۔ انسان کے اندر خیالات و تصورات ہمیشہ زوج زوج ہو کر کیوں آتے ہیں؟ متضاد چیزوں کے جمع ہونے سے ذہنی اختلال کی حالت پیدا ہوتی ہے۔ آدمی کو ان ساری چیزوں کا شعوری جائزہ خود لیتے رہنا چاہئے۔ اسے معلوم ہونا چاہئے کہ بیرونی اور اندرونی محرکات اس کے اندر کن جذبات و احساسات اور خواہشوں کو ابھارتے ہیں۔ دولت پرستی' دنیا طلبی' ہوس کی غلامی' جہالت' غصہ'

نفرت' انتقام' کینہ' غیبت' قتل' خودکشی اور دوسرے جرائم کے لئے اس پر کن نفسیاتی اور جسمانی قوتوں کا دباؤ ہوتا ہے اور ان قوتوں کو وہ کہاں تک تسخیر کر سکتا ہے اور کہاں تک جذبات و خواہشات پر غالب آ سکتا ہے۔

نفسیات کے علم کی سب سے بڑی ضرورت ہی یہ ہے کہ آدمی اپنے حیوانی جذبات کو ملکوتی داعیات کے زیرنگیں رکھ کر منضبط کر سکے۔ یہی دین چاہتا ہے اور یہی صحت مند تہذیب کا تقاضا ہے۔

ماحول وہ بھی ہے جو ملکی سیاست و معیشت اور معاشرت و ثقافت کا ہوتا ہے۔ مختلف طبقوں' گروہوں' برادریوں' پارٹیوں کی ذہنیتیں ہوتی ہیں' تعلیم کے مختلف ادارے کام کرتے ہیں' جغرافی حالات اور آب و ہوا کے لحاظ سے علاقائی تقسیمیں ہوتی ہیں۔ دریا' پہاڑ' جنگل' ریگزار' چشمے' چمنستان' باغات' کھیتی باڑی' عمارات' معیار زندگی' امارت وغربت وغیرہ سارے پہلو سامنے آتے ہیں۔ یہی ماحول شناس نگاہیں وسیع کرنے سے عالمی وسعت نگاہوں میں آ جاتی ہے۔ دنیا کے ممالک ان میں رہنے والی قومیں' ان سب کے جغرافی حالات' ان کے ہاں کی پیداواریں' ان کے طریق ہائے حکمرانی' ان کے ہاں طبقات' گروہوں' فرقوں اور نسلی تفریقات کے احوال' رفتار جرائم' تہذیب و معاشرت اور ثقافت کی نوعیت' مالی حالات تجارت وغیرہ۔ اسی طرح تاریخ انقلابات عالم یا تقابلی مطالعہ ادیان عالم (مع اعداد و شمار) عالمی پیمانے پر ملت اسلامیہ کے اتحاد پر مبنی کوئی تنظیم بنانے کے امکانات' یہ ساری معلومات ضروری ہیں۔ جنگوں کے محرکات اور صلح و امن کے پائیدار اصولوں کی تلاش بھی اس مطالعہ کے زیر اثر کی جا سکتی ہے۔

(۳) مطالعۂ علوم

تیسرا دائرہ مطالعہ علوم کا ہے۔ اس دائرے کی پہلی منزل تو یہ ہے کہ آدمی واقفیت عامہ کے طور پر ایسے اکثر علوم کا بنیادی مطالعہ کرے جن کا تعلق دور حاضر کے کسی بھی میدان تحقیق یا میدان عمل میں کام کرنے والے کے لئے ضروری ہے۔ اس کی ضرورت عام گفتگوؤں اور تقریروں میں بھی ہے اور تحریروں میں بھی۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ آدمی اصطلاحات دانی سے آگے بڑھ کر کسی علم کو تفصیلی طور پر جاننا چاہے۔ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ ایک یا دو تین

علوم کو متعین کر لیا جائے۔ پھر ان کے تدریجی مطالعہ کے لئے کتابوں کی فہرستیں تیار کی جاتی رہیں۔ حتیٰ کہ جس بھی مضمون کو آدمی اپنے لئے پسند کرے اس میں کم سے کم پندرہ بیس کتابیں معیاری قسم کی بغور دیکھ ڈالے اور ہر بات کو سمجھ کر ان کے نوٹس (Notes) بناتا رہے۔

اس بڑے کام کے لئے دو تین سال دنیا اور مرغوبات دنیا سے بے نیاز ہو کر کسی اچھے مقصدی ادارے یا یونیورسٹی یا دینی مرکز کے تحت یکسو ہو کر کام کرنا چاہیئے۔

(۴) مطالعہ ادبیات

چوتھا ضروری دائرہ ادب کا دائرہ ہے۔ ہمارے معاشرے میں ادب کا ذوق رکھنے اور اس سے حظ اندوز ہونے والا حلقہ بھی محدود ہے۔ پھر ادب نگاری یا شعر طرازی کرنے والے لوگ اور بھی کم ہیں' پھر ان میں سے اچھا معیار رکھنے والے اور انسانیت وتہذیب کے ترفع کے لئے بہترین اخلاقی اقدار کو اجاگر اور روشن کرنے والے یا اپنے پڑھنے والوں کے اطوار اور رویوں کے لحاظ کو بنانے والے کسی اعلیٰ مقصد کو شعر و ادب میں اس طرح شامل کرنے والے کم ہیں جیسے پھول میں رنگ و بو جمع ہو جاتے ہیں۔ سامنے کہیں لکھا ہوا نہیں ہوتا کہ یہ پھول خوشبو بھی دیتا ہے مگر قریب جانے والے کے مشام جاں میں خوشبو خود ہی پہنچ کر بتا دیتی ہے کہ میں ہوں۔ فن اور مقصد کا ایسا امتزاج نہ کیا جائے تو یا فن نہیں رہتا یا مقصد خراب ہو جاتا ہے۔ نتیجہ نہ فن نہ مقصد کی صورت میں نکلتا ہے۔

یہ تو ہوئی معاشرہ کی عام حالت۔ لیکن بدقسمتی سے دینی حلقوں میں اگرچہ عرب کی جاہلی شاعری لفظوں اور محاوروں کے معانی اور تلفظ کو جاننے کے لئے خوب رٹی جاتی ہے مگر شاذ ہی ایسے احباب دیکھے جن میں شعر سے محبت یا ادب سے خاص وابستگی ہو۔ نتیجہ یہ کہ دینی حلقوں کے لوگ قرآن جیسی ادب پرور اور تربیت ذوق کرنے والی کتاب اور حسن بیان اور لطف تعلیم وتدریس اور نفاست خطابت سے بھری ہوئی احادیث پڑھ کر بھی ''مرد عالم پر کلام نرم ونازک بے اثر''

ذہنی ساخت بس اس سانچے میں ڈھل جاتی ہے کہ ''ضَرَبَ یَضْرِبُ'' کا چکر ہی دماغ میں گھومتا رہتا ہے۔ کنویں میں چوہا گر جائے تو کتنے ڈول پانی نکالنا چاہیئے۔ کون سے الفاظ کنایہ طلاق کا مفہوم رکھتے ہیں یا کیا بات کہنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ جو ابھی پورا

مسلمان ہی نہیں ہے اسے کافر کہنے سے حاصل؟

پس مسلمانوں کو اور خصوصاً ان کے دینی حلقوں کو شعر و ادب کا ذوق پیدا کرنا چاہئے۔ مدرسہ کی مدد سے، ماں باپ کی مدد سے، دوستوں کی مدد سے، ادبی مجالس کی مدد سے، ادبی رسائل اور کتب کی مدد سے ان لطافتوں کی سمجھ بوجھ پیدا کرنی چاہئے جو بسا اوقات دلوں کو ہلا دیتی ہیں اور افکار و جذبات میں حشر برپا کر دیتی ہیں۔

اس مقصد کے لئے پہلے ادب و شعر کے متعلق آسان تشریحی کتابیں یا مجموعے کسی قابل آدمی کی مدد سے مطالعہ کرنے چاہئیں۔ پھر کلاسکس (Classics) کا نمبر آتا ہے۔ ان میں سے پہلے آسان چیزوں میں سے کچھ انتخاب کی جائیں پھر مشکل تر پر توجہ کی جائے۔ ساتھ کے ساتھ دو تین ادبی ماہانہ رسائل ـــــ کچھ خرید کر کچھ مانگ تانگ کر، کچھ لائبریریوں سے حاصل کر کے ـــــ مسلسل پڑھتے رہنا چاہئے۔ شروع میں تنقیدی تحریریں، مغربی نظریات پر مبنی اور بھاری بھرکم اصطلاحات کا بوجھ اٹھانے والے مقالات آپ کی سمجھ میں نہ آئیں گے انہیں موخر کر دیں۔

دوران مطالعہ جو عبارات سمجھ میں آئیں یا جو اشعار، ان میں یہ کاوش کریں کہ لکھنے والے نے کیا خاص انداز اختیار کیا ہے اور لفظوں اور تشبیہوں کا کیسا استعمال ہے جس کی وجہ سے کلام میں کشش ہے۔ اس معاملے میں اگر آپ شعرالعجم کو جانتے ہوں تو اس سے ورنہ شعرالہند سے مدد لیں۔ آزاد کی ''آب حیات'' بھی آپ کا ذہن بنائے گی۔ مرزا ہادی رسوا کا ''امراؤ جان ادا'' کو ضرور پڑھئے۔ مشاعروں میں شرکت کیجئے۔ مجموعہ ہائے کلام اور مجموعہ ہائے مضامین، قابل فہم افسانے۔ مثلاً پریم چند اور راشد الخیری کی کتابیں، آسان ناول مثلاً عبد الحلیم شرر کو لیجئے، نسیم حجازی کو پڑھئے۔ ایم اسلم کی بعض کتابیں، اے حمید کا اردو نثر کا انتخابی مجموعہ پھر آپ آہستہ آہستہ مشکل تر کی طرف بڑھئے۔ رسائل میں تبصروں کے علاوہ بعض خاص مضامین کسی ادیب و شاعر کے فن کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے چھپتے ہیں ان کو ضرور پڑھئے شاعروں میں میر، غالب، داغ، حالی، اکبر، اقبال، جگر مرادآبادی کو بہ طور خود بھی پڑھئے اور تشریحی مضامین یا تبصروں یا کتابوں کے مقدموں کے ذریعے بھی۔ مثلاً حالی کی کتاب غالب پر دیکھ لینا بہت مفید ہوگا۔ انیس و دبیر کے مرثیے بھی ضروری ہیں۔ نثر میں سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی، ملا واحدی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، مولانا محمد علی جوہر (ان کی شاعری

بھی)' ڈپٹی نذیر احمد' سرسید احمد خاں' رضی الدین صدیقی' مولوی عبدالحق بابائے اردو' مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ علامہ فراہی' رشید صدیقی' نیاز فتح پوری' جمیل الدین عالی' ڈاکٹر جمیل جالبی اوران ساری شخصیتوں کے قلمی کارنامے پڑھیں جن سب کے نام میں یہاں ذکر نہیں کرسکا۔

ادب میں انشا کا مطالعہ بڑا ضروری ہے۔مثلاً غالب کے خطوط' رشید احمد صدیقی کے خطوط' اقبال کے خطوط وغیرہ اسی طرح آج سفرنامہ کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ بڑے شاندار سفرنامے موجود ہیں ان کو پڑھیے۔مثلاً شبلی کا سفرنامہ مصروروم وشام' سرسید کا مسافران لندن' مرحوم ابن انشاء کا ''چلتے ہوتو چین کو چلیے'' (خدا کرے حافظہ غلطی نہ کر جائے) مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے' حکیم محمد سعید کے متعدد سفرنامے' مسافران حج وعمرہ کے کثیرالتعداد سفرنامے' عبدالرحمٰن عبد کی کتاب ''آنحضورؐ کے نقش قدم پر'' مرحوم صدیق سالک کا دل گداز سفرنامہ ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' مختلف لوگوں کی جیل کی سرگزشتیں (نثر میں بھی شاعرانہ تاثرات) بڑی ادب پرور ہوتی ہیں۔

مطالعہ ــــ کیا اور کیونکر؟*

ہم برابر یہ دیکھ رہے ہیں کہ ملک کی ذہنی سطح جو پہلے ہی پست تھی' ارتقا کرنے کے بجائے مزید پستی کی طرف جا رہی ہے۔ یہ انحطاط زندگی کے ہر دوسرے پہلو کے انحطاط سے زیادہ خطرناک ہے۔ ایک ملک کی معاشی بدحالی' فوجی قوت کی کمی اور صنعتی و زراعتی ترقی کی رفتار کی سستی پر قابو پایا جا سکتا ہے بشرطیکہ ذہنی قوت زوال کا شکار نہ ہو رہی ہو۔ اسی طرح کسی قوم کی اخلاقی بدحالی کو بھی ایک ہلے میں دور کیا جا سکتا ہے جبکہ فکری صحت درست ہو۔ لیکن جب تک ذہنی پسماندگی' فکری زوال اور علمی انحطاط موجود ہے اوپر کی خرابیوں میں سے کسی کا بھی ازالہ کرنا بہت ہی دشوار کام ہوتا ہے۔

ہمارے دیس میں ذہنی و فکری پستی روز افزوں ہے اور سنجیدگی سے ذہین لوگوں کو اس پر متوجہ ہونا چاہئے۔

تعلیم یافتہ طبقہ کا تناسب

اول تو ہماری آبادی میں تعلیم یافتہ طبقے کا تناسب اتنا کم ہے کہ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے شرمندگی ہوتی ہے۔ پھر جو تعلیم یافتہ طبقہ پایا جاتا ہے اگر آپ اس کے بارے میں تحقیق کریں تو معلوم ہوگا کہ بہ مشکل دس فی صدی افراد ایسے نکلیں گے جو کچھ مطالعہ کرتے ہوں' بقیہ نوے فی صدی افراد ذہنی حیثیت سے فاقہ کشی میں مبتلا ہیں۔ ان حضرات نے گویا فکری پہلو سے عمر بھر کے لئے بھوک ہڑتال کر رکھی ہے۔ پھر اس طبقے کے مطالعہ کرنے والے دس فیصدی افراد میں بہت بڑی اکثریت ان اہل ذوق کی ہے جو غیر سنجیدہ رسائل و کتب پڑھتے

* ایک صاحب جو بی ٹی (بی ایڈ) کی ٹریننگ سے فارغ ہو چکے تھے اور ان کا ارادہ تھا کہ وہ اسلامی تاریخ میں ایم اے کریں۔ انہوں نے خط لکھ کر پوچھا تھا میں کیا مطالعہ کروں اور کیسے کروں۔ ان کو جواباً یہ تحریر لکھی گئی جو ماہنامہ چراغ راہ کراچی میں پچاس کی دہائی میں شائع ہوئی۔ ترمیم و اضافہ کے بعد اس مجموعہ میں شامل ہے۔ (ماہنامہ چراغِ راہ۔ کراچی ۱۹۵۲ء)

ہیں اور جن کی نظر میں دنیا بھر کے اور اپنے ملک کے اونچے درجے کے مصنفین اور علماء اور شعراء سب خرافات نگار ہیں۔ ان کی تحریروں کا مطالعہ کرنے سے ان بیچاروں کے سر میں درد ہونے لگتا ہے اور اعصاب جلد تھک جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے نوے فی صدی لوگ جو چیزیں پڑھتے ہیں وہ ہمیشہ ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو کوئی صاف ستھرے ذوق کا آدمی ہاتھ میں لے کر خود اپنے آپ کو اپنی نگاہوں میں قابل ملامت سمجھے گا۔ جیسے ایک شریف آدمی راہ چلتے کھڑے ہو کر مداری کا تماشا دیکھنے لگے تو اسے اپنے آپ سے گھن آنے لگے گی۔ ان حضرات کا علمی ذوق بالکل اس گنوار کا سا ہے جو نیا نیا شہر میں آ کر عین چوراہے میں کسی کبابی یا کسی کلیجی اور سری پائے بیچنے والے سے "متاع لذیذ" خریدنے اور کھڑا کھڑا تناول فرمانے لگے اور دنیا کی دنیا اس کے پاس سے گزرتی رہے لیکن اسے ذرا شرم محسوس نہ ہو۔

چند گنتی کے آدمی ایسے ملیں گے جو کبھی کبھی ٹھوس قسم کا مطالعہ بھی کر لیتے ہیں لیکن ایسے لوگوں کا پلڑا بھی تفریحی مطالعہ کی طرف جھکا رہتا ہے علمی قسم کی جو کتابیں یہ پڑھ لیتے ہیں وہ بھی صرف ایسی کتابیں ہوتی ہیں جن کو لکھنے والوں نے دلچسپ بنانے کی خاص کوشش کی ہو۔ ورنہ اگر کسی خشک علمی موضوع پر کسی سنجیدہ نگار نے قلم اٹھاتے ہوئے ادبی شگفتگی اور تفریحی لذت کی آمیزش اپنی تحریر میں نہ کی ہو تو پھر یہ ہمارے بے شمار معمر بچوں کے لئے ایسی کونین بن جاتی ہیں جس پر شکر نہ لپیٹی گئی ہو' اور سادہ کونین کھانے سے یہ بہرحال ملیریا میں مبتلا رہنے کو لاکھ درجے ترجیح دیں گے۔ پڑھنا ان کی اپنی ضرورت نہیں ہے بلکہ ان کو پڑھانا خود مصنفین اور مدیروں کا کام ہے۔ ان کو چاہئے کہ وہ ان کے سامنے اپنے خیالات لائیں تو شکر پارے اور چاکلیٹ بنا کے لائیں' نہیں تو اپنے خیالات کو اپنے پاس ہی رکھیں۔

بازاری اہل قلم

ایک غلط نظام تعلیم کے تیار کردہ ادیب کے پاس بکھرے ہوئے جذبات و حسیات ہیں' جن کو جوڑنے والا کوئی نظریاتی رابطہ نہیں ان میں خیر و شر کی تمیز کرنے والا کوئی پیمانہ نہیں' سارے انسانی ادبیات میں سے مشترک روشن قدروں کی چھانٹ پرکھ کرنے والی کوئی کسوٹی نہیں! وہ خود کھویا کھویا سا ہے وہ کسی کو کیا سہارا دے گا۔ قدامت اور جدت' مشرقیت اور مغربیت' جمہوریت اور اشتراکیت' مادیت اور انسانیت کی مختلف رویں ٹکرا رہی ہیں اور وہ اس

کشمکش میں نہ خود اپنے لئے کوئی مضبوط موقف رکھتا ہے نہ قارئین کو کسی اصولی محاذ پر جما سکتا ہے۔ قوت ارادی اور قوت ایمانی کا اس میں فقدان ہے اور وہ مضبوط کردار کے ساتھ کسی فتنہ قلب ونظر کے سامنے قدم نہیں جما سکتا۔ کسی چلتی رو کی مزاحمت نہیں کر سکا۔ کسی سچائی کو منوانے کے لئے لمبی جنگ نہیں لڑ سکا۔ حالی اور اقبال جس مستحکم نظریاتی شعور، جس مقصدی زور اور جس قوت کردار کے ساتھ حالات پر اثر انداز ہوئے تھے اس کی مثال آج کہیں نہیں ملتی۔ ورنہ اگر ادیب کے پلے اپنا کوئی سرمایہ فکر ہو تو وہ ہر شر اور ہر نامطلوب حالت کے خلاف ایک کشمکش اٹھا دے۔ وہ خارجی حالات کے مقابلے میں انسان کی داخلی قوتوں کو متحرک کر دے، وہ آہستہ آہستہ عوام کے اندر ایک نئے انسان کی پرورش کرتا رہے۔

ہماری ذہنی پستی

اس معاملے میں مالی اور معاشی احوال کا بھی دخل ہے لیکن آسانی سے ہر کوتاہی کی ذمہ داری بالکلیہ مالی و معاشی حالات پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ ہماری ذہنی پستی کا اولین ذمہ دار نظام تعلیم ہے جو نوکری اور روزگار کی ہوس کے سوا اور کوئی مقصد اور کوئی ذوق دے کر طلبا کو رخصت نہیں کرتا اور سند پرستی میں مبتلا کر کے زیر تربیت دماغوں کا ستیاناس کر دیتا ہے۔ پھر ٹی وی، وی سی آر، ریڈیو اور فلم ہیں جو سونے پر سہاگہ پھیرتے ہیں پھر ہمارے ارباب سیاست کی کھوکھلی تقاریر ہیں جو پستی ذوق کی بارش دن رات برساتی پھرتی ہے۔ پھر ہمارے اخبارات اور رسائل ہیں جو معیار مطالعہ کو پست سے پست تر کرنے میں مصروف ہیں۔ ادھر وہ زرگر جو پبلشر کے نام سے اپنے اڈے جمائے بیٹھا ہے اور جس کو اس کے سوا کسی چیز سے واسطہ نہیں کہ پیسہ کدھر سے آتا ہے، وہ اگر یہ محسوس کرتا ہے کہ لوگ دودھ کے مقابلے میں بھنگ کو ترجیح دیتے ہیں تو وہ اپنے دارالاشاعت کو ایک وسیع پیمانے کا ذہنی بھنگڑ خانہ بنا دیتا ہے۔ پھر ہمارے کتب فروشوں کا کمال ہنر یہ ہے کہ کتابوں کا علمی و ادبی مرتبہ جتنا جتنا گرتا جاتا ہے اتنا ہی یہ ان کتابوں کے گرد پوشوں اور ان کے اشتہاروں کی علمی و ادبی شان کو دوبالا کرتے جا رہے ہیں یہ سارے عوامل ہیں جو مل جل کر ہمارے مختصر سے مطالعہ پسند عنصر کے ذوق کو تباہ کر رہے ہیں۔

معیار گفتگو

انہی عوامل کا یہ کرشمہ ہے کہ اگر کسی اہم معاملے میں تعلیم یافتہ طبقے سے بات چیت کی

جاتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کو اپنے مسائل کے بارے میں آتنی ابتدائی معلومات بھی نہیں ہیں جن کے بغیر کوئی گفتگو نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی۔ بارہا ڈاکٹروں' وکلاء' انجینئروں' پروفیسروں وغیرہ کی زبان سے اسلام اور سیاسیات پر حد درجہ سطحی باتیں سننی پڑتی ہیں۔ اتنا ہی نہیں بے شمار موقعوں پر خود مجھے تجربہ ہوا کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کی اکثریت اس بات کی محتاج ہے کہ اس کو کسی مسئلے پر جم کر گفتگو کرنے کا صحیح طریقہ سکھایا جائے۔ ایک بات ادھر کی کریں گے ایک ادھر کی۔ دوسرے کے سر ان باتوں کی ذمہ داری ڈالیں گے جن کا وہ خود مخالف ہے' پھر ایک ہی سلسلہ کلام میں تضاد کا مظاہرہ کریں گے۔ پھر پورے مکالمے میں ان کی طرف سے ایک انتشار سامنے آئے گا' بہت بچگانہ دلائل دیں گے' اور تو اور آپ کے متعلق اپنی رائے بیان کرتے ہوئے اس کی صحت کے لئے دلیل یہ دیں گے کہ اخبارات میں دیکھا ہے۔ پھر ان میں سے کتنے ہی لوگ انتہائی پست قسم کے تعصبات میں مبتلا ملیں گے۔ کتنے ہی معاملات میں ان کی اپنی کوئی رائے ہی نہ ہوگی۔ پھر آزادی رائے کا احساس تو کسی خوش قسمت ہی کے اندر ملے گا۔ ہمارا یہ تعلیم یافتہ طبقہ دوسرے ممالک کے اجڈ دیہاتیوں کے پہلو میں رکھا جائے تو مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس بین الاقوامی مقابلے میں پستی ذہن کا تمغہ ہی نہ حاصل کر بیٹھیں۔

بہرحال اس تخیل طرازی کو درکنار رکھ کر میں نئی نسل کی طرف روئے سخن کئے ہوئے افادی مطالعہ پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

بنیادی معلومات

مطالعہ کا اولیں مرحلہ بنیادی معلومات حاصل کرنے کا ہوتا ہے' چاہے وہ باقاعدہ تعلیم گاہوں کے اندر کسی خاص نصاب کی پابندی کرتے ہوئے حاصل کی جائیں یا آزادانہ' میری مراد ''ابتدائی تعلیم'' سے نہیں ہے بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دور حاضر میں یوں بھی بھلی زندگی گزارنے کے لئے اور خاص طور پر علمی میدان میں کوئی کام کرنے کے لئے ایک شخص کو فلسفہ' سیاست' معاشیات' تاریخ' اخلاق اور نفسیات کی بنیادی معلومات حاصل ہونی چاہئیں۔ خصوصاً نظریہ ارتقا' افادی اخلاقیات' فرائڈ کا نظریہ جنس' مارکسزم اور فلسفہ جمہوریت پر عبور ہونا چاہئے۔ اس مقصد کے لئے کتابیں اور اچھی کتابیں اور تازہ ترین کتابیں بکثرت ملیں گی اور ان میں

سے کوئی سی چند منتخب کی جا سکتی ہیں۔

اس اولین مرحلہ سے گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کو اپنے لئے مقصد حیات اور نظریہ زندگی اور اصولیات خیر و شر کو متعین کرنے کے لئے خصوصی توجہ کے ساتھ ایک منصوبہ کے تحت مطالعہ کرنا چاہئے تاکہ وہ آگے چل کر جو علمی کام کرنے والا ہو اس میں آوارہ گردی کرنے کے بجائے کسی منزل کی طرف راست پیش قدمی کر سکے۔ ہم مسلمانوں کے لئے یہ معاملہ اور بھی زیادہ اہم ہے۔ ہم جس سوسائٹی میں رہتے ہیں اس میں ایک عنصر اسلام کو ہمہ وجوہ اپنا اصول و نظریہ قرار دیئے ہوئے ہے۔ ایک دوسرا اقلیل عنصر اسلام سے کھلا کھلا باغیانہ رویہ رکھتا ہے لیکن بیچ میں ایک بڑا گروہ نہ ادھر کا نہ ادھر کا ہو کے رہ گیا ہے۔ چنانچہ اس عنصر کے علمی و تصنیفی کارناموں میں ان کی شتر گربگی پوری طرح سرایت کئے ہوئے ہے۔ یہ صورت بہت ہی مہلک ہے ہم میں سے ہر شخص کو نظریہ و اصول کے بارے میں بالکل صاف ذہن ہونا چاہئے۔ ایک مسلمان کہلانے والے کا کام یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اسلام کو جان لے اور جاننے کے بعد فیصلہ کرے، قطعی فیصلہ کرے کے اسلام کو نظریہ و اصول بنانا ہے یا کسی اور چیز کو۔ اسلام سے جس کی طبیعت مطمئن نہ ہو اس کا فرض ہے کہ صاف گوئی سے دوسرا راستہ اختیار کرے اور جس کی طبیعت اس سے راضی ہو جائے وہ پھر اپنے آپ کو ادھر یکسو کر لے۔

نظریہ و اصول اختیار کرنے کا یہ مطالعہ، خصوصاً اسلام کو سمجھنے کے لئے بہت ہی احتیاط کے ساتھ کیا جانا چاہئے۔ اس مقصد کے لئے لٹریچر صرف وہ انتخاب کرنا چاہئے جو اسلام کو ایک نظام زندگی کی حیثیت سے سامنے لانے والا ہو، اور اسے نظام زندگی کی حیثیت سے برپا کرنے کا راستہ دکھانے والا ہو۔ یہ مطالعہ جب شروع کیا جائے تو اڑتی اڑتی سنی سنائی باتوں سے خالی الذہن ہونے کی کوشش کی جائے ورنہ اسلامیات کے بارے میں اپنے سوالات اور ذہنی الجھنیں صاف نمبر وار نوٹ کر کے سامنے رکھ لینی چاہئیں۔ اب مطالعہ کے درمیان میں جو سوال حل ہو جائیں ان کو قلمزد کر دیا جائے اور جو نئے پیدا ہوں ان کو فہرست میں بڑھا لیا جائے اس طرح کے مقصدی مطالعہ میں ایک ترتیب کا ہونا ضروری ہے۔ مثلاً سیاسیات و معاشیات اور بین الاقوامی مسائل پر اولین نگاہ ڈالنا غلط ہوگا۔ سب سے پہلے اس سوال کا حتمی جواب حاصل کرنا چاہئے کہ اسلام ہے کیا اور اسے کیوں اختیار کیا جائے۔ مسلمانوں میں جو ذہنی پیچیدگیاں پھیلی ہوئی ہیں ان کا چند سال سے مشاہدہ کرنے کے بعد ہم لازم سمجھتے ہیں کہ

ایک ایک مسلمان کو اولاً اس بارے میں مطالعہ کرنا چاہئے کہ خدا واقعی ہے اور اس کی اطاعت و عبادت ضروری ہے' رسول واقعی رسول تھا اور اس کو زندگی کا عملی رہنما بنانا لازم ہے' اور قیامت واقعی آنے والی ہے اور اس کے تصور پر کردار کو استوار کرنا چاہئے۔ جو لٹریچر ان مسائل میں اطمینان دلا سکے' جو دین کو ایک کل کی حیثیت سے نگاہوں کے سامنے اس طرح واضح کر دے کہ ہر جز کا مقصد و مقام ٹھیک ٹھیک متعین ہو جائے اور جو پوری تاریخ انسانیت اور خصوصاً تاریخ امت کی صحیح تعبیر کر سکے اور از آدم تا ایندم چند ٹھوس اصولوں کو یکسانی کے ساتھ کام کرتا دکھا سکے۔ آدمی کو ایک مدت تک اپنی نگاہ ایسے ہی لٹریچر پر مرتکز رکھنی چاہئے۔

تنقیدی زاویہ نگاہ

یہ ابتدائی مطالعہ جو سیکھنے سمجھنے کے لئے ہونا چاہئے اگرچہ لازم ہے کہ اس میں تنقیدی زاویہ نگاہ موجود ہو' لیکن یہ سعی بالکل رائیگاں جائے گی اگر اس میں متعصبانہ اور مناظرانہ و مخالفانہ انداز فکر کام کر رہا ہو۔ جس شخص یا جس ادارے کے بارے میں تعصب اپنے دل میں موجود ہو اس کا لٹریچر دیکھنے سے قبل اپنی طبیعت کو صاف کرنا ضروری ہے۔ اس کے لٹریچر کے مطالعہ سے پہلے سنی سنائی باتوں پر جو رائے قائم کی گئی ہو اسے پہلے موت کے گھاٹ اتار دینا چاہئے۔

اس مطالعہ میں یہ احتیاط بھی ضروری ہے کہ بیک وقت متضاد اور متخالف قسم کے لٹریچر یا متفرق قسم کی چیزوں کو پڑھنے سے ذہن کا کبھی بھلا نہیں ہوتا۔ تقابلی مطالعہ کرنا ہو تو یوں کیا جائے کہ پہلے ایک سلسلہ افکار کا مطالعہ کیا جائے اور اپنی نوٹ بک میں درج کر لیا جائے کہ یہاں بنیادی نظریہ کیا ہے۔ دوسروں سے وجوہ اختلاف کیا ہیں' اصلاح کی اسکیم کیا ہے وغیرہ' اور پھر ایک طرف سے فارغ ہو کر کسی دوسرے سلسلہ افکار کو دیکھا جائے اور اس کا حاصل مطالعہ بھی نوٹ کیا جائے' علی ہذا القیاس مختلف مدارس فکر کا جائزہ لے کر پھر ایمانداری سے اپنے لئے دین کی صحیح تعبیر پیش کرنے والے نظریئے کو اختیار کر لیا جائے۔

اس مطالعہ کے دوران میں ہر ایسے لٹریچر سے پرہیز کیا جائے جس کو تخلیق کرنے والوں کا دینی علم پوری طرح قابل اعتماد نہ ہو' کیونکہ بہت سے لوگ غیر ذمہ دارانہ طریق سے محض قدرت تحریر رکھنے کی وجہ سے اسلام کی تعبیر کرنے کا نازک فریضہ اپنے سر لے لیتے ہیں۔ پھر

ایسے لوگوں کی تحریروں سے بھی بچا جائے جن کی عملی زندگی ـــــ انفرادی طور پر بھی اور سیاسی طور پر ـــــ دین کے اصولوں سے آزاد گزری ہو۔ پھر ان لوگوں کی کتابوں کو بھی خطرناک سمجھئے جن کی اولین دعوت فرقہ وارانہ، جزئی بحثوں پر مشتمل ہو اور مناظرانہ فطرت رکھتی ہو۔ مثلاً آپ یوں سمجھئے کہ دینی دعوتوں کی ایک نمائش گاہ آپ کے سامنے لگی ہے اور ہر اسٹال پر جا کر آپ شوکیس میں لگی ہوئی اہم ترین چیز پر نگاہ ڈالتے ہیں کہیں آپ کو ختم شریف اور قل شریف ملتا ہے، کہیں آپ کو فیضان نظر کی طرف بلایا جاتا ہے کہیں ''تقلید اور عدم تقلید'' کی بحثیں ملتی ہیں، کہیں ''انکار حدیث'' کا جھنڈا لہراتا نظر آتا ہے آپ ان سب کو چھوڑتے جائیے اور تلاش کیجئے اس مقام کو جہاں دین اور پورے دین کی بنیادی دعوت ـــــ جس کا خطاب مسلم اور غیر مسلم کے لئے اور ہر فرقے کے افراد کے لئے یکساں ہو ـــــ نمایاں طور پر محسوس ہو، یعنی پوری زندگی میں خدا کی عبودیت و طاعت کی دعوت!

اس طرح کی تلاش و تحقیق کے ساتھ جو کچھ آپ مطالعہ کریں اس کے نتیجے میں اگر محسوس ہو کہ آپ کے ذہن میں صحیح شعور نمودار ہوتی ہے تو پھر اس کی تکمیل کریں۔ صحیح لٹریچر جب بھی آپ کے مطالعہ میں آئے گا تو وہ آپ کو آپ کی موجودہ زندگی سے، آپ کے ماحول سے، آپ کے سیاسی و معاشرتی نظام سے غیر مطمئن کر دے گا، آپ کو ہر وہ چیز جو اسلام کے خلاف ہے کھٹکنے لگے گی، آپ اپنے اندر ایک تحریک اور ایک انقلابی جذبہ محسوس کریں گے۔ یہ مقام آئے تو جان لیجئے کہ صحیح مقام پر آپ آ پہنچے۔

تحقیقی و تکمیلی مطالعہ

اس مطالعہ سے فارغ ہو کر پھر آپ جس علم میں چاہیں تحقیقی و تکمیلی مطالعہ شروع کر سکتے ہیں۔ مثلاً آپ تعلیمات اور تاریخ اسلام کے موضوع پر اپنا دماغ لگانا چاہتے ہیں تو اس کے لئے پہلا کام یہ ہے کہ اسلام کے نظریہ تعلیم اور نظریہ تاریخ کو سمجھا جائے۔ موضوعات کے تمام بکھرے ہوئے نظائر جتنے جمع ہو جائیں ان کو پیش نظر رکھ کر جو عملی نتائج برآمد ہوتے ہیں ان سب کو نوٹ کر لیجئے۔ اس کے بعد دنیا کے جدید فلسفہ ہائے تاریخ اور طریقہ ہائے تعلیم کے مختلف مدارس فکر کا جائزہ لیجئے۔ خصوصاً جرمنی اور روس کے کے نظام تعلیم کو جمہوری ممالک کے نظام ہائے تعلیم کے ساتھ متقابلاً دیکھئے۔ پھر یہ محسوس کرنے کی کوشش کیجئے کہ اسلامی نظریہ

تعلیم اور مقصد تعلیم کے مقابلے میں دور حاضر کے نظام ہائے تعلیم کیا فرق رکھتے ہیں جو ان کے ہر رگ و پے میں محسوس کیا جاتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھئے کہ جدید تجربات میں سے کون سے ایسے ہیں کہ جن کو ایک اسلامی نظام تعلیم اپنے مزاج پر ڈھال کر جذب کر سکتا ہے۔ اور کن تجربات کے لئے اسلامی نظام تعلیم میں کوئی جگہ نہیں نکالی جا سکتی۔ اس طرح اسلام نے نظریہ تاریخ پر جو وسیع مواد دیا ہے اس سے اصول اخذ کر کے ان کی روشنی میں جدید مادی نظریات ـــــ خصوصاً مارکس کے نظریہ پر ـــــ گہری تنقیدی نگاہ ڈالئے۔ اس طرح نگاہ کے پختہ ہونے کے ساتھ پھر پوری تاریخ عالم کو ایک مسلم کی حیثیت سے دیکھئے اور اسے تاریخ عالم کے اندر رکھ کر اپنی تیرہ صدیوں کی تاریخ کو بالکل ایک مورخ کی طرح، لیکن ایک مسلم مورخ کی طرح ملاحظہ فرمائیے۔

اخبارات اور ادبیات

آخر میں مجھے اخبارات اور ادبیات کے مطالعہ کے سلسلے میں کچھ کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اخبارات میں جو بازاری پن اور ادبیات میں جو اخلاق باختگی اور سطحیت پیدا ہو رہی ہے وہ اس کا تقاضا کرتی ہے کہ شریف صحافت، صحت بخش ادب اور سنجیدہ علوم کی جان بچانے کیلئے گھٹیا اخبارات اور ادبیات کے خلاف ایک جہاد لڑا جائے۔ پیسے دے کر ایسی چیزیں خریدنا جو دماغ کو ماؤف، جذبات کو جذامی اور خیالات کو ذلیل بنا دیں، سخت حماقت ہے۔ یہ تو ایسا ہے گویا آدمی دوسروں کو مزدوری اور کرائے پر بلا کر لائے کہ آؤ ہماری ذہنی اور اخلاقی قوتوں کو برباد کر لو، ہم تمہاری خدمت کی دل کھول کر قدر کرتے ہیں۔ ہر چیز جسے آپ پڑھنے کے لئے منتخب کریں پہلے یہ دیکھیں کہ اس کا کوئی اصول ہے یا نہیں۔ اور کوئی اصول ہے تو کیا ہے اور اس کا کوئی معیار ہے یا نہیں اور معیار ہے تو کیا ہے۔ ادنیٰ اخبارات، فلمی رسالے اور فحش ادب جو ہمیں (Exploit) کرنے کے لئے بازار پر مسلط ہے اسے کوئی سنجیدہ اور بااصول اور حساس آدمی پیسے دے کر تو کجا پیسے لے کر بھی پڑھنے پر راضی نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک خطرناک صورت حالات ہے کہ جس اخبار نے ہماری گھٹیا نفسیات کا جائزہ لے کر دل خوش کن سرخیاں لگا دی ہوں اور دل فریب نوٹ لکھ دیئے ہوں یا جس رسالے نے اشتعال انگیز جنسی کہانیاں لکھ دی ہوں یا شوخ تصاویر چھاپ دی ہوں وہ ہمارے ذہنی دسترخوان پر نمایاں مقام حاصل

کر لے۔ یہ غلاظت کب تک ہماری ذہنی غذاؤں میں شامل رہے گی۔

جو چیز پڑھیے اس کا خاتمہ کر کے جائزہ لیجئے کہ تفریح کے علاوہ اس نے دیا کیا' سکھایا کیا' زندگی پر کیا اثر ڈالا' کیسی ذہنیت پیدا کی' اور ہماری کس کمی کو پورا کیا۔

اچھے لٹریچر اور اچھے اخبارات و جرائد کو پہچاننے اور ان کو حاصل کرنے کا ایک ذوق ہم سب کو اپنے اندر پرورش دینا چاہیے۔ اس سلسلے میں ادبی مجلسوں اور ادبی حلقوں کے ذریعے بہت اچھا کام کیا جا سکتا ہے یہ مجلسیں اور حلقے پرانے اور تازہ لٹریچر کو پرکھ کے بھلے اور برے کو الگ الگ ممیز کر لیں اور ذوق سلیم اور ذوق تنقید کی تعلیم دیں۔ اسی طرح ہمارے علمی و ادبی جرائد اپنے تبصرۂ کتب' (Review) کے صفحات کے ذریعے یہی خدمات انجام دے سکتے ہیں' لیکن افسوس ہے کہ کتابوں پر تبصرے کسی قطعی اصول کے بغیر بھی کیے جاتے ہیں' ان میں جانب داری بھی پائی جاتی ہے۔ اور پھر ان کا سرسری پن بڑا خطرناک ہوتا ہے۔

ان تدابیر کے علاوہ اپنی ساری معاشی تنگ حالیوں کے باوجود ہمارے تعلیم یافتہ اصحاب کو لازماً ماہانہ بجٹ میں سے کچھ نہ کچھ سامان مطالعہ کی خریداری کے لئے الگ کرنا چاہیے۔ دس بیس پچاس سو روپے جو کچھ ممکن ہو اس مقصد کے لئے نکالا جائے اور اسے ''ضروریات زندگی'' کی صف میں جگہ دی جائے۔ پھر جو کچھ خریدا جائے۔ اہل ذوق دوستوں سے مشورہ کرکے خریدا جائے پھر ہر اچھی چیز جو مطالعہ میں آئے اس کے بارے میں اپنے حلقہ احباب میں چرچا کیا جائے' ان کو ترغیب دی جائے کہ وہ ایسی چیز خود خریدیں' پھر اخبارات و جرائد میں مضامین اور مراسلات کے ذریعے اپنے مطالعاتی تجربات کو پیش کیا جائے' کتابوں میں تقابل کیا جائے اور مطالعہ کے سلسلے میں مشوروں کا تبادلہ ہوتا رہے۔

احباب سے ملاقات ہو تو باہم دگر اپنے مختصر نجی کتب خانوں کو دیکھا دکھایا جائے' کتابوں کے اچھے انتخاب پر داد دی جائے اور گھٹیا چیزوں سے اظہار بیزاری کیا جائے۔ یہاں تک کہ فضا ایسی ہو جائے کہ کوئی شخص ریل' بس' یا کسی مجلس میں اگر کوئی پست قسم کی کتاب' رسالہ یا اخبار پڑھ رہا ہو تو وہ برابر اپنے اندر شرمندگی محسوس کرے۔

رہا اوقات مطالعہ کا مسئلہ' سو یہ خود آپ کے طے کرنے کی چیز ہے اور اس میں صحت کے تقاضوں وغیرہ کا لحاظ رہنا چاہیے بس آپ کا مطالعہ کا پروگرام ایسا ہونا چاہیے جس میں حسب ذیل چیزوں میں سے ہر ایک کو جگہ مل سکے۔

(۱) قرآن کا ترجمہ احتساب نفس کے ساتھ (روزانہ)

(۲) احادیث کا مطالعہ (کم سے کم ہفتے میں دو بار)

(۳) اسلامیات پھر ٹھوس اور صالح لٹریچر (روزانہ)

(۴) اخبارات (روزانہ)

(۵) صالح ادبیات (ہفتے میں دو بار)

ان چیزوں کو نصابی مطالعہ اور تحقیقی مطالعہ کے درمیان اس طرح ترتیب دیجئے کہ تبدیلی ذریعہ آرام بھی ہو اور دماغی نشوونما میں کسی پہلو سے کمی بھی نہ رہ جائے۔

کھیل ــــــ اسلامی نقطۂ نگاہ *

بیرون خانہ کھیلے جانے والے کھیل (out door games) جو ورزشی فطرت رکھتے ہیں، اسلام میں کسی طرح ممنوع نہیں سمجھے جا سکتے اور نہ لھو کی تعریف میں آتے ہیں۔ ان سے نہ صرف جسم کو فائدہ پہنچتا ہے بلکہ ذہن اور روح کے لئے بھی یہ قوت بخش ہیں بشرطیکہ ذہنی اور روحانی فوائد حاصل کرنے کی فکر کی جائے۔ ورزشی کھیل خود دورِ نبویؐ میں کھیلے گئے ہیں نبی ﷺ نے حضرت عائشہؓ کے ساتھ تفریحاً دوڑ کا مقابلہ کیا ہے، اور ان مشاغل کو لھو میں شمار کئے جانے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

کھیل ''غیر اسلامی'' اس صورت میں بنتا ہے جب کہ وہ اصول، نظم اور اجتماعی اخلاق سے آزاد ہو یا اس کا اصول، نظم اور اخلاق غیر اسلامی ہو۔ لیکن اگر کھیل کے ادارے کو اسی طرح تابع اسلام کر دیا جائے اور اس پر اخلاقیات اسلام کو طاری کر دیا جائے جس طرح ادارہ تعلیم، ادارہ خاندان اور ادارہ حکومت پر حدود اسلامی کو تسلط دیا جاتا ہے تو کھیل ایک پاکیزہ فرض بن جاتا ہے۔

اہل مغرب نے کھیل کو بااصول بنا کر بالکل ایک ''کام'' بنا دیا ہے، اور اس سے وہ بہت بڑے ذہنی فوائد اخذ کرتے ہیں۔ مثلاً کھیل کے ذریعے وہ اپنے پابندی اوقات کے رجحان کو تقویت دیتے ہیں کہ جو وقت کھیل کے لئے مقرر ہے اسے بہرحال اسی طرح کھیل ہی پر صرف کرتے ہیں، جس طرح دوسرے فرائض اور مشاغل کے اوقات کو انہیں فرائض اور مشاغل کے لئے وقف رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کے لئے میدان میں بھی دیر سے پہنچنا ویسا ہی موجب شرم ہوتا ہے جیسا دفتر یا کارخانے یا عبادت گاہ میں دیر سے پہنچنا، پھر وہ کھیل کے ذریعے اپنے اندر ڈیوٹی کے احترام کے جذبہ کو بیدار رکھتے ہیں اور کھیل کا حق ادا کرنے کے لئے ویسے ہی

---

* ماہنامہ 'چراغ راہ' اکتوبر ۱۹۵۰ء

فکر مند رہتے ہیں جیسے ایک معلم مدرسہ کے فرائض کو' ایک کلرک دفتری ذمہ داریوں کو اور ایک جج عدالتی مصروفیات کو صحیح طور پر انجام دینے کے لئے فکر مند رہتا ہے۔ یہ لوگ وائسرائے اور گورنر اور جرنیل بن کر اگرچہ مصروفیات کے پہاڑ پشت پر لادے ہوئے ہوں لیکن ان کی ایک مصروفیت دوسری مصروفیت کو نگل نہیں سکتی یعنی نہ مطالعہ ملاقاتوں کا وقت لے گا نہ ملاقاتیں خط وکتابت کے وقت پر چھا جائیں گی' نہ خط وکتابت دفتری ذمہ داریوں پر محیط ہو سکے گی' نہ دفتری ذمہ داریاں کھیل کا وقت ہضم کر لیں گی بلکہ زندگی جن مختلف فرائض کے تسلسل کا نام ہے' اس میں کھیل بھی اسی جگہ پر رہے گا۔

پھر یہ لوگ کھیل کے ذریعے اپنے اندر احساس رفاقت و اجتماعیت کو سرگرم رکھتے ہیں' یعنی ایک کھلاڑی بہ شدت یہ بات محسوس کرے گا کہ دوسروں کا کھیل' دوسروں کی ورزش اور دوسروں کی تفریح اس پر منحصر ہے اور اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ ٹیم کے مجموعی نظام سے وہ اپنے آپ کو بلند و غیر متعلق سمجھے اور جب چاہے غیر حاضری کر لے۔ نہیں' بلکہ وہ ہر حال میں سب کے ساتھ ہے سب کے مشترکہ فیصلوں کا پابند ہے' سب کے بنائے ہوئے نظام کا مطیع ہے۔ ٹیم کی ٹیم جدھر جائے گی' ادھر ہی وہ بھی جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ جماعت بندی اور نظام سیاست کے جو اصول ان کی سوسائٹی میں رائج ہوں گے ان سب کو یہ کھیل کے میدان میں بھی پوری سنجیدگی سے استعمال کریں گے۔ مثلاً ان کا نظام اجتماعی جمہوریت پر چلتا ہے تو کھیل کا نظام بھی جمہوری ہو گا۔ ٹیم کثرت آرا سے کسی کو اپنا صدر یعنی کیپٹن مقرر کرے گی اور پھر اس کے احکام کا پوری طرح اتباع کرے گی اور اسی طرح کھیل کے لئے جج مقرر کرے گی اس کے فیصلوں کو چون و چرا کے بغیر قبول کرے گی۔ کھیل کا نظم اور اوقات اور ٹیم کی رکنیت کے قواعد و ضوابط جمہوری اصول پر طے ہوں گے اور کوئی ان سے انحراف نہ کرنے پائے گا۔ یوں یہ لوگ ایک منظم اجتماعی زندگی کی تربیت کھیل کے میدان میں اپنے آپ کو دیتے ہیں۔

کھیل اور اسلامی اخلاقی نظام

اب اگر ہمارے ہاں بھی کھیل کی اہمیت کو سمجھا جائے اور اس کے لئے اسلامی اخلاقی نظام معین کیا جائے اور ٹیم باقاعدہ ایک جماعت ہو' اس جماعت کا امیر (کیپٹن) ہو۔ اس کے اختلافات کو دور کرنے کے لئے ایک ''قاضی'' (ریفری) مقرر ہو۔ اس کے ارکین اطاعت نظم

کا اخلاقی شعور اپنے اندر ابھار لیں تو کھیل ایک پاکیزہ ادارہ بن کے رہے گا۔ لیکن یہاں یہ حال ہے کہ اگر بہت زور کر کے کسی سوسائٹی میں آپ اسلامی اخلاق کے اصولوں پر نظم قائم کر بھی لیں تو وہ ایک مصنوعی خول کی طرح بار خاطر بنا رہتا ہے کہ جہاں بالجبر اس کا مطالبہ کیا جائے وہاں تک اس کا مظاہرہ چار و ناچار لوگ کر بھی لیں گے لیکن ایسے مواقع سے باہر آتے ہی یہ خول اتر جائے گا اور اندر سے وہی ''حضرت مومن'' برآمد ہو جائیں گے جو بے قاعدگی اور بے ذوقی و بدنظمی کو اپنی فطرت بنا چکے ہیں۔ پھر ان کی مجلسیں' ان کی گفتگوئیں' ان کا کھانا پینا' ان کا مطالعہ' انتہائی غیر سنجیدگی کا نقشہ پیش کرے گا۔ کجا غریب کھیل کا میدان ـــــ وہاں تو ہر طرح کا شور' ہر طرح کی فقرہ بازی' ہر طرح کی بے آئینی' ہر طرح کی بدنظمی روا ہے۔ نہ رفقا کے جذبات کا لحاظ رہے گا نہ اجتماعیت کا احساس رہے گا نہ اطاعت امیر رہے گی اور نہ کوئی چیز ایسی رہ جائے گی جسے اسلامی کہنے کی جرات کی جا سکے۔

پس یقین مانئے کہ کھیل کا میدان ایک ایسی میزان ہے جس پر آدمی کا حقیقی ضمیر تل جاتا ہے۔ یہاں جو شخص تفریح کی فضا میں پابندی نظم نہیں کر سکتا اس سے سنجیدہ فضا میں کسی انضباط کی کیا توقع ہو سکتی ہے' یہاں ایک ہلکے پھلکے مشغلے میں جو آدمی رفقا کے جذبات کا لحاظ کرنے اور جماعتی شعور کے تقاضے پورے کرنے میں ناکام ہو رہا ہے وہ خشک مشاغل میں یہ باتیں کیسے کرے گا؟ یہاں جو شخص اپنی ٹیم کے ''پوائنٹ'' بڑھانے کے اپنے ہر ناجائز فعل (Foul) کو چھپاتا ہے وہ کیا سیاست میں اپنی قوم کے لئے اور کاروبار میں اپنی فیملی کے لئے جرائم کر کے انہیں نہ چھپاتا ہو گا؟ یہاں جس شخص سے اپنے امیر اور قاضی کی اطاعت نہیں ہو سکتی وہ زندگی کے کھیل میں کسی امیر اور قاضی کی اطاعت کہاں کر سکے گا؟

کھیل کے میدان میں نمائش کی قبا کے سارے ٹانکے ٹوٹ جاتے ہیں اور صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ کون آدمی اخلاقی اصولوں کو نگل تو گیا ہے' مگر ہضم نہیں کر سکا۔ آدمی ایک ہی سیرت کا مالک ہوتا ہے' یہ اگر کھیل کے میدان میں گھٹیا ثابت ہوتی ہے تو پھر یہ مسجد اور حرم میں جا کر بھی گھٹیا ہی رہے گی۔

کھیل کے فوائد

کھیل کے فوائد میں سے ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ دماغی اور ذہنی کام کرتے کرتے آدمی

میں خلوت پسندی اور انفرادیت کا جو غلبہ ہونے لگتا ہے' یہ اس کا ازالہ کرتا ہے اور احساسات کے نازک ہو جانے سے جو ''عبقریت'' سی بعض لوگوں میں ابھر آتی ہے اس کا ساتھ ساتھ علاج ہوتا رہتا ہے۔ دنیا کے خطرناک ترین امراض ذہنی میں سے ایک مرض علیحدگی پسندی کا مرض ہے جس کے ساتھ ''ذکاوت حس'' ابھر آتی ہے اور آدمی کو متکبر اور چڑچڑا بنا کر چھوڑتی ہے اور جس کی وجہ سے آدمی میں ایک فوق العام سنجیدگی کا احساس بھر جاتا ہے' کھیل کا میدان اس مرض کو دور کرنے کے لئے بہترین ''سینی ٹوریم'' یا دارالعلاج ہے۔ یہاں آدمی میں رفیقانہ مساوات کا احساس بیدار ہوتا ہے اور اپنے جذبوں کے طواف کی عادت چھوٹتی ہے اور دوسروں کے جذبات کا احترام پیدا ہوتا ہے۔ مگر جو لوگ ان فوائد کو کھیل سے حاصل نہ کر رہے ہوں ان کے لئے بہتر یہ ہے کہ کھیل سے باز رہیں اور اس سنجیدہ ادارے کو بدنام نہ کریں۔

بعض اوقات یہ غلط مشورہ بھی دیا جاتا ہے کیوں نہ کھیل کے وقت کو کام میں صرف کیا جائے' میں عرض کروں گا کہ کھیل خود کام ہے۔ ورزش' تفریح یا آرام کے عناصر کو اگر زندگی سے یہ سمجھ کر خارج کیا جانے لگے کہ ان کی جگہ کام کرنا فائدہ بخش ہے تو بجائے اس کے کہ آدمی زیادہ کام کر سکے اس کی قوت کارکردگی کم ہوتی جائے گی۔ مثلاً اگر میں آپ کو یہ مشورہ دوں کہ آپ سونے کی جگہ پڑھا کیجئے کیونکہ پڑھنا مفید کام ہے تو آپ اسے قبول کرنے سے انکار کر دیں گے' وجہ ظاہر ہے کہ نیند کام کے لئے قوت جمع کرنے کا ذریعہ ہے اور خود ایک مستقل کام کی حیثیت رکھتی ہے۔ بالکل اسی طرح کھیل بھی کام کے لئے قوت جمع کرنے کا وسیلہ ہے اور خود ایک مستقل کام ہے۔

کھیل کی نفسیات

کھیل کی نفسیات یہ ہیں کہ آدمی کے مشغلہ زندگی کے لحاظ سے اس کے بعض اعضا و اعصاب تو زیادہ مصروف کار رہتے ہیں اور بعض کم۔ اس وجہ سے دن گزارنے کے بعد زیادہ کام کرنے والے حصص قوت کا خزانہ خالی کر کے یہ چاہتے ہیں کہ انہیں آرام ملے تاکہ وہ ذخیرہ قوت جمع کرنے میں لگ جائیں' لیکن کم استعمال ہونے والے حصص دن بھر میں جو ذخیرہ قوت جمع کر چکے ہیں اسے کسی طرف خرچ کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ یہ ذخیرہ اگر خرچ نہ ہوتا رہے تو پھر ان حصص میں قوت پیدا ہونے کا کام بالکل رک جاتا ہے اور ایک مستقل جمود سا

رونما ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ جسم کی یہ دوہری ضرورت کھیل یعنی تفریح آمیز ورزش کی ایک اکساہٹ پیدا کرتی ہے۔ اب جو طرح طرح کی حرکات کا مسکرانے اور بول چال کا موقع پیدا ہوتا ہے اور ایک خاص طرح کی سوچ کے کولہو میں جتا ہوا فکر کا بیل ذرا آزادی سے حرکت کرتا ہے تو اسے سکون ملتا ہے —— اور یہ سکون اسے فرائض کا کولہو چلانے کے لئے از سرِ نو تیار کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کھیل کھانے پینے سانس لینے اور سونے کی طرح ایک ایسی فطری ضرورت ہے جسے ہر جاندار پورا کرنے پر مجبور ہے۔ مچھلیاں کھیلتی ہیں، چڑیاں اور کبوتر کھیلتے ہیں، بندر اور بلیاں کھیلتی ہیں اور آدمی بھی کسی نہ کسی صورت میں کھیلتا ہے، چاہے باقاعدگی سے کھیلے یا بے قاعدگی سے! بچوں کو جبلت خود کھیلنا سکھاتی ہے، جوان اپنی اپنی پسند کے کھیل کھیلتے ہیں اور بوڑھے بھی کسی نہ کسی طرح کھیل کا ارمان پورا کر لیتے ہیں۔ یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ ایک کلرک صاحب کرسی پر بیٹھے ٹانگ کو ہلا رہے ہیں یا کوئی ڈاکٹر صاحب گھومتی کرسی کو جھولا رہے ہیں یا کوئی ماسٹر جی اپنے ڈنڈے سے میز کو بجا رہے ہیں یا کوئی پروفیسر صاحب چلتے چلتے انگلیاں چٹخا رہے ہیں یا کوئی کاتب صاحب اپنی مونچھ کو مروڑ رہے ہیں یا کوئی بنئے صاحب گھر جاتے ہوئے روپے اس ہاتھ سے اس ہاتھ میں بجا بجا کر منتقل کر رہے ہیں یا کوئی مریض صاحب بستر پر پڑے اپنے سر پر بار بار ہاتھ پھیر رہے ہیں۔ ان سب لوگوں کی حرکات بتا رہی ہیں کہ یہ اپنا طبعی فریضہ باقاعدگی سے انجام نہ دینے کی وجہ سے مجبور ہیں کہ کچھ بے معنی حرکات سے اس کے خلا کو پورا کریں۔ ان لوگوں کی حالت ویسی ہی ہے جیسے کسی شخص کو روٹی نہ مل رہی ہو اور وہ پتے کھا رہا ہو! پس جس مطالبہ ذہن و جسم کو پورا کرنا ہی پڑے اسے مکروہ طریقوں سے کیوں پورا کیا جائے کیوں نہ ذوقِ سلیم کو استعمال کر کے پورا کیا جائے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کھیل کام کرنے کی اہلیت کو بڑھاتا ہے۔

تعلیم و تربیت

معاشرہ کی اجتماعی ذمہ داری

عباسی دور تک' اور مغرب میں عثمانی دور تک' سوسائٹی کا عام نقشہ' احوال اخلاقی لحاظ سے بہتر رہا۔ آداب و اخلاق اچھے تھے۔ مصری' مغربی اور افریقی مسلم معاشروں میں بھی عربی خطوط پر ماحول تیار ہوا۔ حتیٰ کہ ہند میں دورِ زوال کی جو سلطنتیں قائم ہوئیں ان کے سائے میں بھی اشرافی تمدن فروغ پاتا رہا۔ دہلی' لکھنؤ اور حیدر آباد ایک طرح کے تہذیبی مراکز بھی تھے اور ان کی معاشرتی و خاندانی فضاؤں میں بچے بھی خاص اثرات لے کر پروان چڑھتے۔

والدین اور گھر کے بزرگ بچوں سے پیار کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو یہ تعلیم زبان و عمل سے دیتے رہتے کہ فلاں لفظ بولنا چاہئے یا نہیں' بزرگوں سے بات کیسے کی جائے' ہم جولیوں سے کیا معاملہ ہو۔ خوردوں سے کیسے رابطہ رہے' مہمانوں سے معاملہ کیسا رہے۔ ایثار اور خدمت کے ابتدائی جذبات کی آبیاری گھروں ہی میں ہو جاتی۔ کیا کیا انداز و اطوار بدتمیزی میں داخل ہیں کیسی آوازیں نہیں نکالنی چاہئیں۔ نوکروں کے ساتھ معاملہ کیسے ہو۔ غیر مسلموں سے خوش خلقی کو کیسے نبھایا جائے۔ بچے کی شخصیت کی گھڑائی اسی مرحلے میں خاصی ہو جاتی۔

مکتب کے دور کا جب آغاز ہوتا' بسم اللہ کی تقریب سے سلسلہ شروع ہوتا اور کچھ ابتدائی وقت قرآن اور دینی مسائل کی طرف صرف ہوتا۔ یہاں بھی آداب و اطوار کی تربیت ہوتی۔ پھر مدرسہ آتا یا سکول' جہاں اساتذہ کی خوبیاں کام کرتیں بلکہ اوپر کے زمانوں میں استاد کی ذات پابندی وقت' فرض شناسی' عدل و انصاف اور خدمت و ہمدردی کا ایک نمونہ ہوتی اس کے ساتھ ابتدائی دور میں خاص اخلاق کے موضوعات پر کتابیں پڑھائی جاتیں۔ مثلاً اخلاق جلالی' اخلاق محسنی' گلستان سعدی' کلیلہ دمنہ وغیرہ۔ پھر چونکہ نصاب کا ایک اہم حصہ قرآن و حدیث ہوتے لہٰذا ان کے درس کے ذریعے استاد خاص توجہ سے ایمانیات اور اخلاقیات (علاوہ

قانونی احکام کے) کی موثر تلقین کرتے۔

آج گھر کی تربیت گاہ زیادہ تر صورتوں میں اجڑ چکی ہے۔ یعنی اول تو میاں بیوی دونوں ملازمت کے کولہو میں جتے ہیں' ورنہ خاتون اگر گھر پر رہتی بھی ہے اور بچے پر زیادہ توجہ دے سکتی ہے تو وہ بیچاری خود حقیقی اسلامی تعلیم سے خالی ہے' نیز اس کے ذہن پر لباس' زیور' آرائش' سہیلیاں' میٹنگز اور پارٹیز اور کلب کی دلچسپیاں سوار رہتی ہیں۔ گھر سے محبت و سکینت اٹھ گئی ہے۔ دولت ناچ رہی ہے اور بچہ حیرت سے تماشا دیکھ رہا ہے۔

معاشرے کی مجموعی فضا گھر سے لے کر معاشرے کے تمام دائروں سے ہوتی ہوئی اسکول اور کالج تک تمام کی تمام ایک تہذیبی تصادم کی وجہ سے دھواں دھار ہے۔ کوئی چیز واضح نہیں۔ ہر چیز مشتبہ بن گئی ہے۔ ہر بات ہر سوال اور ہر سوال کے جواب سے بے اطمینانی میں اضافہ۔ ان حالات میں سارے معاملے کو از سر نو سوچنا ضروری ہے۔

حصہ چہارم

رسمی و غیر رسمی تعلیم

نئی نسل کی تعلیم و تربیت

ایک قوم کی ترقی و تنزل کا بہترین پیمانہ یہ ہے کہ اس کی نئی پود کیسے رجحانات کے ساتھ ابھر رہی ہے۔ اگر والدین سے ان کے بچوں کا کردار روشن تر ہو رہا ہے تو یہ روشن مستقبل کی علامت ہے۔ بچوں کا کردار اگر مساویانہ سطح کا ہے تو گویا ایک حالت قائمہ کچھ دور تک چلے گی' لیکن اگر نئی پود ذہنی و اخلاقی لحاظ سے پستی کی طرف جا رہی ہے تو پھر قوم کو دس بیس برس کے اندر اندر موجودہ مقام سے نیچے گرنا ہوگا!

ہماری نئی نسلیں

اس پیمانے کو لے کر اپنے سے پہلی اور اپنے سے بعد کی نسل کا جائزہ لیجئے۔ ہم سے پہلی نسل نے اگرچہ غلامی کی تاریک فضا میں ہماری پرورش کی' لیکن اس نے ایک طرف مذہبی نقطہ نظر' شرافت کے آداب' اچھے انسانی جذبات و حسیات اور قابل فخر خاندانی روایات ہمارے اندر ودیعت کیں' دوسری طرف اس نے کسی نہ کسی حد تک ہمارے اندر ملی خودی کے شعور کا دیا روشن رکھا۔ اور ہمیں نہ صرف افکار اغیار کے مقابلے کا جذبہ دیا بلکہ خود غلامی کے خلاف لڑنے کی صلاحیت بھی تفویض کی۔ ہمارے بزرگوں کے کئے ہوئے تربیتی کام نے بیسویں صدی کے نصف اول کی تاریخ بنائی جو بہرحال اچھی اچھی مذہبی' سیاسی' سماجی اور ادبی تحریکات سے مالا مال رہی ہے۔ لیکن جو نسل ہمارے زیر سایہ تیار ہوئی اور ہو رہی ہے۔ اس کا کردار بے حد کچا ہے۔ اور اس کا فکری سرمایہ بہت ہی قلیل ہے۔ نئی نسل کا جو ہراول دستہ اس وقت تک میدان عمل میں آ چکا ہے وہ اپنے پیشرووں سے چند بھاری اختلافات رکھتا ہے۔ پہلے لوگوں میں شرافت کا احترام ہر حال میں ہوتا تھا لیکن نیا عنصر شرافت کو محض ایک حماقت خیال کرتا ہے۔ پہلے لوگوں کی نگاہوں میں خدا پرست اور بااخلاق طبقے کی قدر و منزلت تھی اور وہ اپنی کوتاہیوں پر ندامت کا احساس کرتے تھے لیکن نیا عنصر مذہبی کردار کی تحقیر و تذلیل کرتا ہے۔ اور اپنی

اخلاقی پستی کو سرمایہ افتخار گردانتا ہے۔ پہلے لوگوں میں بیرونی اثرات کے خلاف ایک مدافعانہ روح موجود تھی۔ لیکن نیا عنصر ہر قسم کے بیرونی اثرات کے آگے دیدہ و دل فرش راہ کرتا ہے۔ اور اس کے اندر سرے سے ملّی خودی کا احساس ہی ختم ہو رہا ہے۔ پہلے لوگ دوسری اچھی اور بری سرگرمیوں کے ساتھ کچھ نہ کچھ توجہ اعلیٰ انسانی اور ملّی مقاصد پر بھی دیتے تھے مگر نئے عنصر کے پیش نظر نفسانیات کے ماسوا کچھ نہیں ہے۔

اس ہراول دستے کے پیچھے لڑکوں کی صف ہے' یہ صف ملّی تصورات سے بیگانہ' تعلیم میں کوتاہ' کھیل تفریحات کی دلدادہ' گھٹیا فلموں اور کہانیوں کی شائق' باہم دگر فحش گو' آوارگی پسند اور بڑوں کے احترام سے خالی ہے۔ ان سے پیچھے چھوٹے بچے ہیں' جنہیں آپ گاؤں اور شہروں کی گلیوں میں ڈنڈے مارتے' آوارہ پھرتے' گالیاں بکتے' لڑتے بھڑتے' غل غپاڑہ کرتے' اور غلاظت پھیلاتے اور غلاظت میں کھیلتے دیکھ سکتے ہیں۔ ہمارا امتحانی پیمانہ اچھے مستقبل کی خبر نہیں دے رہا!

ان حالات میں کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ آپ کا بچہ بھی ایسی ہی اٹھان اٹھے؟ یقیناً آپ کو یہ ناپسند ہو گا۔

لیکن زیادہ تر امکان یہ ہے کہ بالکل نادانستہ طور پر آپ اپنے بچے کو اسی رخ جانے دے رہے ہوں!

مغربی نظریہ تربیت

ہم لوگ مغربی فکر و ثقافت کی طوفانی رو کی زد میں ہیں' جو بسا اوقات ہمیں اہم ترین مسائل کو سوچنے سمجھنے تک کا موقع نہیں دیتی' اور ہم ایسے ایسے اطوار سر تسلیم خم کر کے اپناتے جا رہے ہیں جو عین ہمارے ملّی وجود کی ضد ہیں۔ ازاں جملہ بچوں کی تربیت کا وہ مہلک نظریہ ہے جو عملاً تیزی سے پھیل رہا ہے' لیکن ہم نے کبھی اس کا تجزیہ کر کے نتائج کو سوچا ہی نہیں۔

مغربی نظریہ تربیت یہ ہے کہ بچے کو یکسر کھلا چھوڑ دو' اسے آزادانہ تجربے کرنے دو۔ اور اس کی شخصیت کو کھلی فضا میں نشوونما پانے دو۔ اس نظریہ کے حق میں نہایت زوردار سائنٹفک پروپیگنڈا متواتر ہو رہا ہے۔ جس کے مقابل پر ہم نظریاتی لحاظ سے نہتے اور بے بس ہیں۔ یہ نظریہ تربیت عین منطقی شگوفہ ہے اس مادی فلسفہ حیات کا جو تہذیب مغرب کی اساس

ہے۔اس کے برعکس اسلامی فلسفہ حیات کی رو سے انسانی زندگی کا معراج کمال یہ ہے کہ بچے کو ایک اچھا انسان بنانے کے لیے کم سے کم جو حسیات اس کی فطرت میں ابھر آنی چاہئیں وہ یہ ہیں۔

❀ یہ تصور عدل کہ جو کچھ میں اپنے لیے پسند کرتا ہوں' وہی دوسروں کے حق میں مجھے پسند کرنا چاہیے!

❀ یہ احساس ذمہ داری کہ مجھے گھر کے چمن سے لے کر تہذیب کے اداروں تک تخریب نہیں کرنی چاہیے' بلکہ حسن وخوبی میں اضافہ کرنا ہے!

❀ یہ اخلاقی حس کہ میرے جس عمل سے دوسروں کو بے جا تکلیف پہنچے' اس سے مجھے اجتناب کرنا ہے۔

❀ حق و ناحق کا اتنا شعور کہ جو چیز میری نہیں اور جسے میں نے جائز طور پر حاصل نہیں کیا اور جس سے فائدہ اٹھانے کی اجازت میں نے حاصل نہیں کی' اسے نہ قبضہ میں لینا ہے اور نہ اس سے فائدہ اٹھانا ہے!

❀ خدا کے احکام' سچائی کے اصولوں اور دیانت کے تقاضوں کے خلاف اگر کوئی دباؤ درپیش ہو ——— وہ خوف کی صورت میں ہو یا لالچ کی صورت میں ——— تو مجھے اس کا مقابلہ کرنا اور اس مقابلے میں کبھی ہتھیار نہیں ڈالنے ہیں۔

ماحول آپ کے خلاف جا رہا ہے

اگر حالات یہ ہوں کہ جس نہج پر آپ بچے کو اٹھانا چاہتے ہوں' اسی کے مطابق گھر اور خاندان' درس گاہ اور معاشرہ' ادب اور صحافت اور تمام سماجی ادارے کام کر رہے ہوں تو پھر شاید آپ کا اپنے بچوں سے ذاتی تغافل زیادہ نقصان کا باعث نہ بنے کیونکہ ماحول آپ کی کوتاہیوں کی تلافی کرنے کے لیے موجود ہے۔لیکن اگر اس سرے سے اس سرے تک ماحول آپ کے خلاف جا رہا ہو تو پھر بچے کی صحیح اٹھان کا انحصار فقط آپ پر ہے —— خواہ آپ ماں کے منصب پر ہوں یا باپ کے منصب پر!

اوپر کی تین صورتوں میں سے اگر اخلاقی لحاظ سے کوئی سا تعمیری رجحان بھی آپ میں موجود ہو تو خوب سمجھ لیجئے کہ ملک ہی نہیں پورا عالمی ماحول آپ کے مقصد کے خلاف جا رہا

ہے۔ خصوصاً اگر آپ تیسری صورت کے مطابق ایک مثبت جذبہ تعمیر رکھتے ہوں تو پھر اپنے بچوں کو کھلا چھوڑ دینے کا نظریہ آپ کے مقصد کے لیے تباہ کن ہے۔ آپ اپنے ہی تجربات سے پوچھیے تو وہ بتائیں گے کہ مکتب آپ کے ذہن کے مطابق نہیں ہے' سماجی ماحول آپ کے مطابق نہیں ہے' معاشی نظام اور عالم افکار آپ کے موافق نہیں ہے۔ بلکہ زیادہ تر صورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے آپ کا اپنا خاندان اور اپنا گھر بھی پوری طرح آپ کے لیے معاون نہیں ہے۔ ایسے طوفانی دھارے میں بچے کو تربیت کے مبہم تصورات کے ٹوکرے میں بٹھا کر موجوں کے حوالے کر دینا کوئی معقول کاروائی نہیں ہے ـــــ ضروری نہیں کہ ساحل دریا پر کسی فرعون کا محل واقع ہو اور ملکہ اس ٹوکرے کو نکلوا کر بچے کو متبنّیٰ بنالے اور پھر ضروری نہیں کہ ہر بچہ فرعونیت کے قصر میں کلیمی روح کے ساتھ نشوونما پا سکے۔

یہ بڑا خوفناک جوا ہے جو بہت سے ذہین لوگ اپنی اولادوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں اور اس جوئے میں جیتنے کے مواقع اگر ۵ فی ہزار بھی ہوں تو گویا بہت ہی زیادہ ہیں' ورنہ داؤ ہارنے کی مایوس کن مثالیں بکثرت ہیں۔

مجرد پہلی صورت بھی ہو تو بھی ہمارا یہ معاشرہ جس میں روپیہ بج رہا ہے اور اس کے حصول کے لیے رشوت' خیانت' اسمگلنگ' چور بازاری' جھوٹ اور مکاری' فریب اور دغا کے سارے طریقے وبا کی طرح پھیلے ہوئے ہیں' جس میں جنسی ہیجانات کی رویں تندتر ہوتی جارہی ہیں اور عفت وحیا کی قدریں کمزور ہو رہی ہیں۔ اور پھر جس میں عام آداب اور تہذیبی شعائر پستی کی طرف جارہے ہیں' اس کی موجوں میں کسی رہنمائی' مدد اور سہارے کے بغیر بچوں کو یہ کہہ کر ٹھیل دینا کہ "بیٹا چڑھ جا سولی رام بھلی کرے گا" نہایت خلاف دانش ہے۔ لیکن جن لوگوں کا معاملہ تیسری صورت سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ اگر اس راستے کو اختیار کرتے ہیں تو گویا وہ اپنی تعمیری مہم کو غارت کرنے کے لے اپنی اولادوں کو تیار کر رہے ہیں۔

آپ کو اگر یہ معلوم نہیں کہ آپ کا بچہ کن مسائل سے دوچار ہے۔ اس کی دوستیوں کے حلقے کیا ہیں' اس کے دن بھر کے مشاغل کیسے ہیں' اس میں کیا رجحانات کونپلیں نکال رہے ہیں' اس کی بول چال کیسی ہے' اس کا معاملہ بڑوں سے اور ہمجولیوں سے کس طرز کا ہے' اس کا سرمایہ معلومات کیا ہے اور اس کے اندر کیسے معتقدات کے بیج جگہ پکڑ رہے ہیں ـــــ اور نہ آپ کو غلط احوال کی روک تھام کی فکر ہے' نہ مطلوبہ اوصاف کو پروان چڑھانے کا اہتمام۔ اور نہ آپ

اپنے بچے کو رہنمائی اور مدد دے سکتے ہیں تو گویا آپ نے عمر کی اصل کمائی کو ایک جنگل میں چھوڑ دیا ہے کہ جس کا جی چاہے اس پر ہاتھ صاف کر جائے۔

تعمیری نظریۂ تربیت

اوپر کے غیر تحدیدی نظریہ تربیت کو ترک کر کے آپ کو دوسرا تعمیری نظریہ تربیت اختیار کرنا چاہیے۔ آپ کو اپنے بچے کو کم سے کم بنیادی اخلاقیات کا یہ شعور دینا ہے کہ اچھی زندگی چند پابندیوں سے بنتی ہے اور کچھ حدیں اور ضابطے ہیں جنہیں اصول بنا کر تمہیں آگے بڑھنا ہے۔ تم صرف اپنی خواہشوں کے لیے پیدا نہیں ہوئے' بلکہ تم پر دوسروں کے حقوق عائد ہوتے ہیں جنہیں دیانت داری سے تمہیں ادا کرنا ہے۔ آپ کو اپنے بچے کے ذہن میں یہ امر راسخ کرنا ہے کہ خدا کے ساتھ اور بندوں کے ساتھ تمہارا تعلق کیسا ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہ وہ نہایت طاقت ور اور کامیاب اور خوش باش اور زیرک و چالاک حیوان بن کر اٹھے' یہ ذی عقل جانور اپنے اعضا کو خوب اچھی طرح استعمال کر سکے' اپنی خواہشوں اور جذبوں کے تقاضے پورے کر سکے اور معاشرہ میں مفاد کے لیے جو دنگل لڑا جا رہا ہے۔ اس میں قوت آزمائی کر کے زیادہ زیادہ حصہ وصول کر سکے۔ اس فلسفہ حیات کے اخلاقیات مستقل استواری سے انکاری ہیں' یہ حلال و حرام کے ضابطوں کو اضافی اور مصلحت آمیز سمجھتا ہے۔ نفسیات کے دائرے میں یہ ''اخلاقی پابندیوں'' کو فساد و اختلال کا باعث قرار دیتا ہے۔ اسی طرح ہر شعبہ فکر میں ہم آہنگ قسم کے نظریات ہیں جو چوطرفہ زور ڈال کر نظریہ تعلیم و تربیت کو اپنے مطابق بناتے ہیں۔

پھر صنعتی انقلاب کے بعد سے جو انسانی معاشرہ تشکیل پذیر ہوا ہے۔ اس میں چونکہ والدین کے لیے ممکن نہیں رہا کہ وہ اپنی معاشی جدوجہد اور تفریحی دلچسپیوں سے اتنا وقت نکال سکیں کہ ادارۂ خاندان پر اور خصوصاً اپنے بچوں پر توجہ دے سکیں۔ اس لیے بالعموم ایک طرح کی مجبوری سے غیر شعوری طور پر عملاً نیا نظریہ تربیت قبول کر لیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں جوں جوں معاشرہ کی ہر نئی ساخت ابھر رہی ہے' والدین اولادوں کی تربیت سے صرف نظر کرتے جا رہے ہیں۔ ان کے پاس وقت نہیں اور ذہنی سکون نہیں ہے کہ وہ اپنے بچوں کے درمیان بیٹھیں' ان کے مشاغل کو دیکھیں' ان کے مسائل کا شعور حاصل کریں' ان کی اخلاقی نشوونما پر نگاہ رکھیں اور ان کو مناسب رہنمائی بہم پہنچائیں۔ بڑے خاندانوں کے لیے سیدھی سی راہ یہ ہے کہ وہ گھر پر

بچوں کو نوکروں کے سپرد کر دیں اور دن کو کسی کنڈر گارٹن یا دوسرے نرسری اسکول کی تحویل میں دے دیں ـــــ بغیر یہ سمجھے کہ ان کے نوکر اور ان کے محبوب مدارس ان کے بچے کو کس سانچے میں ڈھال رہے ہیں۔ حد یہ ہے کہ ہمارے امراء نے اپنی اولادوں کو ایسے مدارس کے حوالے کر دیا ہے جو مذہباً عیسائیت' ثقافتی لحاظ سے فرنگیت اور زبان کے لحاظ سے انگریزیت کے سانچوں میں انہیں ڈھال رہے ہیں۔

آپ چاہتے کیا ہیں

آپ کی سب سے بڑی کمائی' سب سے بڑی دولت اور سب سے بڑی جائیداد آپ کا بچہ ہے۔

وہ آپ کے کاروبار' آپ کی ملازمت' آپ کے کمائے ہوئے سکوں اور آپ کے خرید کردہ لباسوں اور سامانوں' آپ کی تعمیر کردہ عمارتوں اور آپ کی کاشت کردہ فصلوں سے زیادہ قیمتی ہے اپنے بچے کے پیکر میں دراصل مرنے کے بعد خود آپ کو زندہ رہنا ہے۔ اور آپ کے مقاصد کی تکمیل یا تخریب اسی کے ہاتھوں ہونی ہے۔ آپ چاہیں تو اسے قوم اور انسانیت کی تباہی کا ایک آلہ بنا کر چھوڑ جا سکتے ہیں اور چاہیں تو اسے دین وملت اور تہذیب وتمدن کا ایک عظیم معمار بنا سکتے ہیں۔

پس سوچئے کہ آپ کیسا جانشین چھوڑنا چاہتے ہیں' یا دوسرے لفظوں میں آپ کس قسم کے پیکر میں زندہ رہنا چاہتے ہیں۔

اگر آپ کے سامنے سرے سے کوئی غائت حیات ہی نہ ہو اور انسانی شخصیت کا کوئی اخلاقی معیار ہی نہ ہو اور آپ آدمی کو محض ایک خواہش پرست جانور کی حیثیت دیتے ہوں تو پھر آپ کو کسی فکر وکاوش کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر آپ کوئی اخلاقی تصور رکھتے ہیں تو پھر سارا مسئلہ آپ سے گہری فکر وتوجہ کا طالب ہے۔

ایک صورت یہ ہے کہ آپ ایک عمومی اخلاقی حس رکھتے ہوں اور چاہتے ہوں کہ آپ کا بچہ کسی قدر اچھے اوصاف' آپ کی پسندیدہ انسانی اقدار آپ کی محبوب خاندانی یا قومی روایات کے ساتھ اٹھے۔

ایک صورت یہ ہے کہ آپ ایک اوسط درجے کے صاحب ایمان مسلم کی طرح یہ

سوچتے ہوں کہ آپ کے بچے میں کچھ نہ کچھ جوہر اسلامیت موجود ہونا چاہیے۔

ایک صورت یہ ہے کہ اسلام کو انسانیت کے لیے بلند ترین نظریۂ فلاح مانتے ہوئے خود اس کے علمبردار ہوں اور اپنے بچے کے متعلق یہ چاہیں کہ وہ آپ سے بھی زیادہ بہتر صلاحیتوں کے ساتھ آپ کے فریضے کو ادا کرے اور غیر ارادی رجحانات کے خلاف ایک مضبوط سپاہی کی طرح کشمکش کرے۔

ان تینوں صورتوں میں آپ کو مغرب کے نہایت فاسد نظریہ تربیت کو ٹھکرا کر ایک دوسرا نظریہ تربیت اختیار کرنا ہوگا۔

تربیت کے مثبت اور منفی پہلو

بچے میں ان بنیادی اسلامی اوصاف کو نشوونما دینے کے لیے والدین کو بچوں کے لیے مناسب سامان مطالعہ فراہم کرنا چاہیے۔ گھر کی مجالس میں ایک منصوبہ کے تحت گفتگوؤں‘ کہانیوں‘ قرآن و حدیث کی تعلیمات اور تاریخی واقعات کے ذریعے مطلوبہ رجحانات کی مسلسل آبیاری کرنی چاہیے۔ بچوں کی سرگرمیوں اور مشاغل پر نظر رکھتے ہوئے ان کو غلط میلانات سے ہٹانے کی تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں۔ نیز نہایت ضروری ہے کہ مخالف اثرات سے —— خواہ وہ لٹریچر کی راہ سے آئیں‘ تصادم کی راہ سے‘ تعلیم کی راہ سے یا کسی اور راہ سے —— ان کے نازک ذہنوں کو بچایا جائے۔ یہ ساری کوشش رائیگاں جائے گی‘ اگر والدین خود مطلوبہ انسانی کردار کا ایک اچھا نمونہ نہ ہوں اور گھر میں ایک موزوں ماحول پیدا نہ کریں۔ والدین جن معاملات میں خود جتنے ذمہ دار‘ محتاط‘ حساس اور فرض شناس ہوں گے بچے اس کے مطابق اثر لیں گے۔ والدین اگر ناجائز کمائی سے استفادہ کرتے ہوں۔ اگر جھوٹ بولتے اور گالیاں دیتے ہوں‘ لڑتے ہوں۔ پڑوسیوں سے ناجائز زیادتیاں کرتے ہوں‘ ملی اقدار کو پامال کرتے ہوں‘ اور مغربیت کے لیے مرعوبانہ نقطۂ نظر رکھتے ہوں‘ مفادات کے لیے اصولوں کو توڑتے ہوں اور مزاحمتوں کے سامنے خم کھا جاتے ہوں تو ان کے بچے کبھی اچھا کردار لے کے نہیں اٹھ سکتے۔

جن والدین کے اندر بچے ایک بار یہ بو سونگھ لیں کہ وہ زندگی کا ایک خاص بہروپ بھرے ہوئے ہیں‘ وہ دورنگے ہیں‘ ان کے قول وفعل میں فرق ہے یا عقلی حیثیت سے وہ کمزور

ہیں تو پھر ان کے نصائح بچے کے حق میں بے کار ثابت ہو جاتے ہیں۔ زود حس بچہ خوب بھانپتا ہے کہ آپ کی پسند و ناپسند کا اصل معیار کیا ہے' آپ کن چیزوں سے مرعوب اور متاثر ہوتے ہیں' کیسے لوگوں سے دبتے اور کیسے لوگوں کو چاہتے ہیں اور کیسے لوگوں سے حقارت کا برتاؤ کرتے ہیں' آپ کا دوسروں کے سامنے اور ان کے پیچھے کیا رویہ ہوتا ہے' آپ کی اصل توجہ کن مقاصد پر ہے۔ آپ روپیہ پیسہ اور مفادات کے لیے کہاں تک جھکاؤ اختیار کر لیتے ہیں' آپ کے اصل ارمان کیا ہیں اور کہاں آپ پہنچنا چاہتے ہیں۔ کن پہلوؤں سے آپ تبدیلیاں قبول کرتے ہیں ــــ غرضیکہ آپ کا پورا طرز عمل ایک مدرسہ تربیت ہے۔ پس پہلے خود آپ کو خدا پرستی' انسان دوستی اور مذکورہ بالا اساسی اصول اخلاق کا نمونہ بننا ہے۔

اور پھر بچے پر ان اوصاف کا پرتو ڈالنا ہے۔ بچہ اصول مجردہ کو نہیں قبول کر سکتا اور نہ نصائح کا اثر اس پر گہرا ہوتا ہے' وہ نظریات اور اصولوں کو صرف عملی دائرے میں انطباق کرنے پر سمجھتا ہے۔ آپ جب تک روزمرہ کے گھریلو حالات و واقعات' بھائی بہنوں کے باہمی روابط اور جھگڑوں میں سے کچھ منتخب مواد کو لے کر گھریلو مجالس میں شفقت آمیز انداز سے زیر غور نہ لائیں اور تجزیہ کر کے سادہ استدلال سے ہر ہر ضروری پہلو بچے کو نہ سمجھائیں تو اصول مجردہ کا ذکر کر دینا بے کار ہے۔

پھر کام کا دوسرا بڑا پہلو وہ ہے کہ آپ جو کچھ بچے کو بتا رہے ہیں' اسے وہی کچھ بننے کے لیے ماحول کے فاسد اثرات سے بچائیں۔ آپ یوں محسوس کریں کہ غلط تصورات و مقاصد اور رسوم و اطوار کوئی بھیڑیے ہیں جو چاروں طرف منہ کھولے آپ کے بچے کو گھیرے ہوئے ہیں۔ معاشرے کے ایسے مہیب جنگل میں آپ اس بچے کو بے سہارا نہیں چھوڑ سکتے۔ آپ کو نگاہ رکھنی ہے کہ نظام تعلیم' لٹریچر' سینما' اشتہارات' اخبارات' لوگ اور بچے اور دوسرے عوامل آپ کے بچے کے دماغ میں کیا چیزیں اتار رہے ہیں اور کسی غلط چیز کے اثرات کا انسداد آپ کو کیسے کرنا ہے۔ اس انسداد کے لیے ضروری ہے کہ آپ بچے کو قریب رکھنے اور اس میں اپنا اعتماد بحال رکھنے کے لیے محبت کی کشش سے کام لیں' پھر اسے فہم و شعور سے تدریجاً مالا مال کریں' نیز اس میں قوت ارادی بھریں۔ یہ کام کھیل نہیں مطالعہ' غور و فکر' محنت اور توجہ چاہتا ہے۔ اور کئی پہلوؤں سے عظیم ایثار کا طالب ہے۔

تعمیری اصول تربیت

خواہ آپ بچے میں ایک عمومی روح اسلامیت بھرنا چاہتے ہوں' یا اسے اسلام کے نظریہ حق کا ایک باشعور داعی بنانا چاہتے ہوں' ان دونوں صورتوں میں اصول تربیت خود اسلام ہی کے ہاں سے لینے ہوں گے۔ یہاں تربیت کا نقطہ نظر ''قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا'' (تحریم:۶) سے اخذ کرنا ہوگا۔ یعنی یوں محسوس کیجئے کہ چاروں طرف دوزخ کی آگ دہک رہی ہے۔ اور اس کے اندر سے بال سے باریک ایک راہ نجات نکل رہی ہے۔ یہاں ہر انسان کے آگ میں گرنے کا خطرہ ہے۔ اس راہ نجات پر آپ کو خود بھی پوری احتیاط سے چلنا ہے اور بچے کو نہ صرف اپنے دور عمر میں چلانا ہے بلکہ اس کے اندر وہ قوت پیدا کرنی ہے کہ وہ خود بخود سیدھا گامزن رہ سکے۔ حال یہ ہے کہ آگ کے سمندر پر خواہشوں اور مفادات' تفریحات اور دلچسپیوں کے رنگین پھول تیر رہے ہیں اور بدی کی قوتیں طرح طرح کے خوشنما روپ دھارے ایک ایک متنفس کو ورغلا رہی ہیں ــــ آپ کی آنکھوں کا تارا بھی ان کے گھیرے میں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ذرا آنکھ چوکے' ذرا سی غفلت آپ سے ہو اور بچہ آپ کے ہاتھوں سے چھین لیا جائے۔ اور پھر ایک دن آپ اسے دیکھیں کہ وہ ٹھیک آپ کے کے مخالف محاذ پر کھڑا آپ کے کئے ہوئی کام کو غارت کر رہا ہے۔ خدانخواستہ یہ کتنا بڑا سانحہ ہوگا۔

ایک مشن رکھنے والے والدین کا حال تو قبیلوی دور کی اس بیوہ عورت کا سا ہوتا ہے۔ جو بسا اوقات اپنے جگر گوشے کو فقط اس ارمان کے ساتھ پالتی ہے کہ یہ بڑا ہوگا تو باپ کے خون کا انتقام لے گا۔ ایسی عورتیں گویا مشن رکھتی ہیں اور اپنی لوریوں' گفتگوؤں' کہانیوں اور دن رات کے طرز عمل سے وہ مشن ننھی سی جان کو ودیعت کرتی ہیں۔ ایک سچی لگن کی وجہ سے وہ فن تربیت میں بالعموم اتنی ماہر ہوتی ہیں کہ ان کا مشن کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور ان کے بچے واقعی جان کی بازی کھیل کر ان کا متعین کردہ مقصد حاصل کرتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح بدی کی قوتوں کے خلاف لڑنے والا ایک سپاہی اپنی اولاد کو اپنے مشن کی تکمیل کے لیے تیار کرتا ہے۔ وہ آخر تغافل کیش بن کر کیسے اپنی اولاد کو معاشرے کے جنگل میں اکیلا چھوڑ سکتا ہے کہ جس کا جی چاہے اسے کسی مقصد کے پیچھے لگا لے۔

راستی اور نیکی کو غالب کرنے کے لیے سب سے بڑے پیشوا اور علمبردار انبیاء علیہم

السلام تھے۔ ان سے مثال لیجیے تو ان کا طریقہ یہی ملے گا کہ انہوں نے اپنی اولادوں کو بالکل، ابتدا ہی سے اپنے مشن کے لیے تیار کیا اور مرتے دم بھی ان کو فکر تھی تو یہ کہ ان کے بچے ان کے خالی کردہ مورچوں کو سنبھال سکیں۔ قرآن میں اٹھا کر دیکھیے۔ حضرت یعقوب کی وصیت کو جو وہ بچوں سے کرتے ہیں، دیکھیے حضرت ابراہیمؑ کی توجہ کو جو وہ اپنے فرزند حضرت اسماعیلؑ پر صرف کرتے ہیں۔ دیکھیے حضرت ذکریا کی بے چینیوں کو جو اپنے کام کو جاری رکھنے کے لیے جانشین کے تمنائی ہوتے ہیں۔ اسی طرح لقمان جیسے مرد صالح کی اس تعلیم کو دیکھیے جو وہ اپنے بچے کو دیتے ہیں۔ احادیث رسول سے رہنمائی لیجیے تو اولاد کے لیے اصولی رویہ دو امور پر مبنی ہونا چاہیے۔ ایک محبت و شفقت، دوسرے عصائے تادیب۔ یعنی ترغیب و ترہیب کی حکیمانہ تدابیر اختیار کر کے ہمیں اپنے بچوں کو ایک متعین راہ پر لے جانا ہے، نہ یہ کہ ان کو زندگی کے صحرا میں آوارہ گردی کا کھلا موقع دے دیا جائے۔

چاہیے کہ آپ بچے پر توجہ دیں، اسے اپنے قرب میں رکھیں، وقت میں سے اسے کافی حصہ دیں، اس سے گفتگو کریں، اس کے اندر اچھے خیالات اتاریں، شروع ہی سے غلط رجحانات وعوامل سے اسے بچانے کا اہتمام کریں اسے پابند اصول و حدود زندگی گزارنے کی تربیت پہلے دن سے دیں، نیز اس کے ذہن نشین کرائیں کہ مسرت (Happiness) زندگی کا منشا نہیں بلکہ رضائے الٰہی ہے۔ جس کا حصول بہت سی مسرتوں کو چھوڑے بغیر ممکن نہیں!! بچے کو آپ جنگلی بیل کی طرح بڑھنے کے لیے کھلا نہ چھوڑ دیں بلکہ چمن انسانیت کے ایک بہترین پودے کی طرح تراش خراش کرتے ہوئے اٹھائیں تا کہ کل اس کی ٹہنیاں پھولوں سے لدی ہوں اور وہ اپنے میٹھے پھلوں سے تمدن کی جھولی بھر دے۔

ہمارا معاشرہ اور بچوں کی تربیت *

یہ تو واضح ہی ہے کہ ایک طرف بین الاقوامی اسلام دشمن خداوندان تہذیبِ الحاد نے ٹیلی ویژن کو ثقافتی' اخلاقی اور تہذیبی جنگ میں زک دینے کے لئے ہمارے خلاف بڑے زور شور سے استعمال کرنا شروع کیا ہے۔ اِدھر ہمارے اشاعتی ذرائع ابلاغ کا یہ حال ہے کہ ان میں سے بیشتر اغیار کے کلچر سے مفتوح ہیں اور رضا کارانہ طور پر ان کے ایجنٹوں کی حیثیت سے تہذیبی یلغار میں ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔

دوسری طرف معاشرہ ہے' جس میں پچھلے دس پندرہ سال کے اندر ہماری رہی سہی قدریں بھی تباہ ہوگئی ہیں۔ اب کہیں کہیں ایسے افراد یا خاندان یا ادارے رہ گئے ہیں جو اسلامی اقدار کو لے کر چل رہے ہوں یا ماڈرن اطوار کے ساتھ اپنی اقدار کو ملا کر ایک طرح کی سماجی کھچڑی بنا کر آگے بڑھ رہے ہوں۔

اس وقت معاشرے میں دولت پرستی' معیار پرستی' جنسی جنون' خیانت اور منافقت کی وبائیں پھیلی ہوئی ہیں اور اس ماحول کی زہریلی ہوا سے اپنے بچوں یا درس گاہوں کے بچوں کو بچانا بہت مشکل' بہت مشکل' بہت مشکل کام ہے۔ متذکرہ وباؤں کو آپ گفتگوؤں میں' واقعات میں' سرگرمیوں میں' لٹریچر میں' مجالس میں' گھروں میں ہر جگہ کام کرتا دیکھیں گے۔ بچہ یا بڑا طالب علم اس پتلی دلدل میں دن رات تیرتے اور لتھڑتے ہوئے بڑی مشکل سے خود اس دلدل کو ختم کر کے چمن بندی کی خیالی محنت کے لئے تیار ہو سکتا ہے۔

مگر قدرت کا قانون ہے کہ انتہائی حیوانی بلکہ شیطانی ماحول میں رہنے اور پلنے والوں ہی میں اس کے خلاف ردعمل پیدا کر کے ان کو ایک نئے ایمانی و اخلاقی انقلاب کا راستہ دکھاتا ہے جو خارزار' صحراؤں اور خونیں ندیوں کو پار کرنے کے بعد بالآخر ایک ایسے جزیرے تک پہنچا دیتا ہے جو دلدلی دنیا کے درمیان جنت ارضی بنتی ہے اور قدروں کے فانوس اس کی راتوں

* ایک طالب علم کے سوال کے جواب میں لکھا گیا۔

کو بھی دنوں کی طرح روشن رکھتے ہیں۔

لہٰذا سعی بلیغ واجب ہے۔

اس سعی کا پہلا لازمہ ایک ایسا مثالی استاد ہے جو صاحب فکر و نظر بھی ہو' وہ عملی سرگرمی والا آدمی (man of action) ہو' شگفتہ مزاج ہو اور ان مفاسد سے پاک ہو جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس کی کسی بات اور کسی حرکت اور کسی حسرت اور دوستوں سے کسی گفتگو اور کسی تحریر اور اس کی گھریلو زندگی سے بھی دولت پرستی' مادی معیار کی غلامی' جنسی ہوسناکی' خیانت' جھوٹ' وعدہ خلافی اور منافقت جیسی کسی بیماری کی علامات نہ پائی جاتی ہوں۔

افسوس ہے کہ سماج کی منڈی میں یہ جنس بہت کمیاب ہے۔

بعدہ نصابی کتب کے مواد کا مسئلہ ہے جس کی تفصیل میں جانے کی شاید ضرورت نہیں۔

نصابی کتب ـــــ درجہ اول سے لے کر فوقانی مدارج تک متذکرہ رذائل کے اثر سے پاک ہوں' ان کی تصاویر تک میں دولت کی فوقیت و عظمت کا شائبہ تک نہیں ہونا چاہئے (ہاں ایسی دولت مندی کی مثالیں سامنے آنی چاہئیں کہ جن کا مصرف زیادہ سے زیادہ انفاق فی سبیل اللہ اور اسراف و تبذیر اور نمائش دولت کے عیوب سے پاک رہی ہوں)۔

معاش اور دولت کو انسان کی ان ضروریات میں رکھا جائے جو اس کے اندر پائے جانے والے حیوان کے لئے ضروری ہیں یا دوسرے لفظوں میں جسم اور اس کی مشینری کے لئے لازم ہیں۔ اصل صاحب عزت ہستی وہ ملکوتی قوت ہے جسے کام کرنے کے لئے جسم کے آلات کی ضرورت ہے اور یہی ملکوتی قوت' نیکی' راستی' اخلاق' تہذیب' شائستگی اور شرافت' ایمان و عرفان اور مطالعہ و تحقیق یا صحت مند تخلیقی سرگرمیوں کے فروغ کا ذریعہ ہوتی ہے۔ تاریخ میں جو کچھ بھی قابل قدر اور پاکیزہ حصہ ہے وہ اسی ملکوتی قوت انسانی کے کام کا نتیجہ ہے اور دوسری طرف جو کچھ بھی پستیاں اور زوال اور سانحات اور تصادم دنیا میں پیدا ہوتے ہیں وہ اس حیوان کی بے قابو حرکات کا نتیجہ ہیں جو دراصل تو انسان کی سواری تھا اور بدقسمتی سے انسان نے اس کو اپنے اوپر سوار کر لیا ہے۔ جب ملکوتی و اخلاقی قوت سوار ہوتی ہے اور حیوانی جسم مرکب بنتا ہے تو نظام حیات صحیح خطوط پر نشوونما پاتا ہے' لیکن جب یہ ترتیب الٹ جاتی ہے تو ملکوتی قوت کے کمزور ہونے پر حیوانی جسم اس پر سوار ہو جاتا ہے اور الحاد و فساد سے دنیا بھر جاتی ہے۔

یہ حقیقت اگر طلبہ کو اچھی طرح سمجھا دی جائے اور ان سے کہا جائے کہ وہ اپنا یہ مسلک

پہلے دن سے طے کرلیں کہ ہم جسم کو اپنی ملکوتی قوتوں پر سواری نہیں کرنے دیں گے بلکہ جسم ملکوتی قوتوں کی سواری ہوگا ـــــ اور یہ بھی طے کرلیں کہ وہ جتنی توجہ جسم کی صحت ونشوونما پر صرف کریں گے اس سے دس گنا زیادہ قوتیں اپنی ملکوتی طاقت' اپنی اخلاقی طاقت اور اپنی خدمتی' تحقیقی اور تخلیقی طاقت پر صرف کریں گے۔

یہاں تک تو اصول کی بات ہوئی' یا دوسرے لفظوں میں وعظ ہوگیا۔

بچنے کا طریق کار بھی سوچنا ہے۔

مثلاً ٹیلی ویژن پر ویڈیو کیسٹ کے ذریعے ایسی فلمیں' چاہے باہر سے چھانٹ کر حاصل کی جائیں یا خود اپنے مقصدی ڈراموں کو ان میں منعکس کیا جائے' یا صنعت' جنگی اسلحہ' بحر (سمندر) کا مطالعہ' ملکوں ملکوں کے مختلف حصص کے جمع کردہ بہترین مناظر اور خاص خاص عمارتیں اور اہم لائبریریاں' میوزیم وغیرہ' قطب شمالی اور قطب جنوبی کی سیر وغیرہ' انسانی جسم پر تحقیقی اور دلچسپ اور معلوماتی پروگرام (اس سلسلے کی فہرست بڑی طویل بن سکتی ہے) اور اس طرح باہر کے فضول مناظر سے بچا بھی جا سکتا ہے اور طلبہ کو ایسی تفریح بھی فراہم کی جا سکتی ہے جو ان کے لئے دلچسپ ہو۔

تعلیمی اداروں کی لائبریریوں میں عمروں کے لحاظ سے ایسی کشش دار کتابیں موجود ہوں کہ طلبہ زیادہ وقت ان کے مطالعہ میں شوق سے صرف کریں۔ کہانیاں' نظمیں' تصویریں' معلومات' ترانے' لطیفے' اور ایسی چیزوں کا وسیع ذخیرہ چھوٹے بچوں کے لئے موجود ہو۔ اس سے اوپر والے بچوں کے لئے کہانیوں کے مجموعے نئے انداز سے شامل ہوں۔ اس سے اوپر کے لئے کائنات' اجرام فلکی' سمندر' صحرا' دریا' پہاڑ' آگ' بجلی' پانی' بھاپ' ریڈیو' ایٹم اور عجائبات عالم کے متعلق دلچسپ معلومات کشش دار شکل میں جمع کی جائیں۔

اس سے اوپر کے لئے ادب کے مجموعے' سائنس' فلسفے' نفسیات' اجتماعیات' سیاست' معیشت' جغرافیہ' تاریخ اور دیگر علوم کے متعلق کتب موجود ہوں۔

قرآن کا خاص ریڈنگ روم ہو جس میں تمام اہم تفسیریں اور قرآن کے متعلق لکھی گئی جملہ کتب جمع کی گئی ہوں۔

اسی طرح ایک احادیث کا سیکشن (Section) ہو' ایک تاریخ اسلامی کا' ایک تاریخ عالم کا' فقہ کا' نعت اور ادب اور صرف ونحو پر عربی کتب' عربی شاعری اور عربی کہانیوں اور ناولوں کے سیٹ (Set)۔

ابتدائی دینی تعلیم *

ہر اسلامی گھرانے میں بچوں کو بہت ابتدا سے ہی مختلف دینی کلمات یاد کرائے جائیں۔ پھر جب وہ کچھ سمجھ میں آئیں تو قرآن ناظرہ کا آغاز کر دینا چاہیے۔ یسرنا القرآن کے ذریعے یا خود چھوٹے چھوٹے سبق تیار کر کے۔ پھر جب وہ سیپارہ پڑھنے کے قابل ہوں تو شروع میں چاہے ایک لفظ ہی روزانہ ان کو پڑھایا جائے مگر یہ سفر شروع ہو جانا چاہیے' کچھ عرصے بعد دو دو یا تین تین لفظ' پھر پوری ایک آیت' پھر دو دو تین تین آیتیں اور آگے چل کر روزانہ کی سطریں' پھر رکوع' غرضیکہ یہ سلسلہ تدریجاً بڑھتا جائے۔ مگر اس کا اہتمام رہے کہ ایک لفظ کے دور سے لے کر رکوع یا پاؤ سیپارہ کے دور تک کا بچے پہلے ماں باپ یا مسجد کے صاحب مکتب سے جو سبق سیکھے گا' پھر بیٹھ کر اس کے ہر جزو کو ۵'۵ دفعہ دہرائے گا۔ پھر پورے سبق کو ایک ہی سانس میں پڑھ جائے گا۔ اس طرح اس کی تلاوت میں روانی آئے گی وہ ایک ایک لفظ اٹک اٹک کر نہیں پڑھے گا' استاد بھی یہ خیال رکھے کہ جہاں دو چار لفظوں کا جوڑ ملانا ذرا مشکل ہو' وہاں دو تین بار خود کہلائے۔ آخر میں بچہ اپنا پورا سبق سنا کر رخصت ہو گا۔ اگلے دن اس سبق کو وہ پھر دہرائے گا اور نئے سبق پر غور سے نظر ڈالے گا تا کہ استاد کے سامنے جانے سے پہلے زیادہ سے زیادہ تیار کر لے۔

ناظرہ قرآن کے ساتھ اسے کلمہ طیبہ و کلمہ شہادت' دیگر اچھے اچھے کلمات ذکر' آیت الکرسی' صفت ایمان مجمل' صفت ایمان مفصل' ایمانیات کی تشریح' پڑوسیوں غریبوں کے حقوق' پوری ملت محمدیہ کے حقوق' انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت' نماز میں پڑھے جانے والے کلمات' نماز پڑھنے کی ترکیب و ترتیب' وضو' اذان' جماعت' پانچوں نمازوں کی رکعتیں' فرض' سنت' نفل کا شعور' نماز جمعہ' نماز تراویح' نماز عیدین' واضح حرام چیزیں' کبیرہ اور صغیرہ گناہ' سنت اور بدعت کا فرق' ـــــ وغیرہ' امور ضروریہ کی تعلیم تدریجاً دی جائے جس کو دو سال میں سمیٹنا چاہیے۔

---

* اقتباس از تحریکی شعور صفحہ ۲۳۰

پنجابی میں پکی روٹی نے بڑا کام کیا ہے اور اردو میں مفتی کفایت اللہ مرحوم کے رسائل نے۔ آج کل کے لحاظ سے مفتی صاحب کے رسائل سے مدد لینی چاہیئے۔ یقین سے میں یہ کہ سکتا ہوں کہ ۵' ۷ سال کی عمر تک جس بچے کے دل میں قرآن اور حقائق دینیہ اور انوار ایمانیہ کا متذکرہ مختصر سا حصہ اتر گیا وہ سیکڑوں نظریات فاسدہ کے درمیان سے گزرتے ہوئے اور ہزاروں منکرات و فواحش سے دو چار ہونے کے باوجود بالآخر مسلم قوت سے مالا مال ہو کر ابھرے گا۔ اس کے باطن کے ایمانی' روحانی اور اخلاقی نور کو سو طرح کی بیرونی آندھیاں اور ظلمتیں گل نہیں کر سکتیں۔

باقی اونچی تعلیم وہ بعد کی عمر میں حاصل کرتا رہے گا یا مطالعہ کے ذریعے علمی سرچشموں سے استفادہ کرے گا۔

ہمارا دینی نظام تعلیم

میں اس سخت جاں دینی نظام تعلیم کے حق میں اپنے جذبہ اعتراف کو پیش کرتا ہوں کہ نہایت ناسازگار ماحول میں اس نظام نے اپنے آپ کو سالہا سال سے برقرار رکھا ہے۔ وہ اشخاص اور ادارے بڑے ہی قابل قدر ہیں جنھوں نے اسلام کے بالکل خلاف کام کرنے والے نظام اجتماعی کے دائرے میں بہت ہی کم آمدنیوں پر دینی تعلیم گاہوں کو چلایا اور روکھی سوکھی کھا کر اور درویشانہ رہن سہن اختیار کر کے ایک ملی خدمت کے لیے بیٹھ گئے۔ پھر قابل داد ہیں وہ فرزندان ملت بھی جنھوں نے دنیوی ترقیوں سے قطع نظر کر کے دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے زندگیاں کھپا دیں' انہیں قربانیوں کا یہ کم سے کم حاصل ہمارے سامنے ہے کہ کسی نہ کسی درجہ میں اسلام کے آثار فضا میں باقی ہیں۔

یہ اعتراف میرے دل میں ہمیشہ رہا اور ہمیشہ رہے گا مگر اس کے ساتھ ساتھ میں اپنے اس دینی نظام تعلیم کو ناقدانہ نقطۂ نظر سے بھی دیکھتا ہوں اور بڑی بے چینی سے یہ چاہتا ہوں کہ اس میں تعمیری تبدیلیاں جلد از جلد واقع ہونی چاہئیں ورنہ جو کچھ جس ڈھب سے چل رہا ہے زیادہ دیر نہ چل سکے گا۔ میرے اندر ان سرگرمیوں کے لیے کبھی تنقیص اور تحقیر کا جذبہ نہیں رہا لیکن میں ان کمزوریوں اور کوتاہیوں سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا جو موجود ہیں۔ اور اگر ان کو زیر بحث نہ لایا جائے تو وہ ہمیشہ موجود رہیں گی اور ان کی موجودگی اس عظیم الشان کام کے اصل مقصد کو نقصان پہنچا رہی ہے اور مزید نقصان پہنچائے گی۔ میرا جذبہء خیر خواہی دامن گیر ہو کر تقاضا کرتا ہے کہ میں بزرگان ملت کو ان کمزوریوں کے ازالہ کی طرف اس امید کے ساتھ متوجہ کروں کہ وہ اپنے سے ایک ادنیٰ آدمی کی بات سننے کے لیے اونچا ظرف رکھتے ہیں۔

تعلیم کی تمدنی اہمیت

سب سے پہلے تعلیم کی تمدنی اہمیت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ انسان سازی کے

پروگرام میں سب سے پہلے خاندان' پھر مکتب اور پھر معاش کا مجموعی ماحول حصہ لیتا ہے۔ مکتب کے اثرات تربیت فکر و عمل میں اس بنا پر بہت دخیل ہوتے ہیں کہ یہ ادارہ ہمہ تن اسی مقصد کے لیے وجود میں آیا ہے اور اس کے اندر طلبہ دن کا ایک بڑا حصہ اخذ و اکتساب میں گزارتے ہیں' تعلیم ایک نسل کے نظریاتی و تجرباتی سرمایہ کو بعد کی نسل تک منتقل کرنے کا ذریعہ ہے۔ متفرق تجربات چونکہ کسی نظریہ ہی کے گرد مجتمع اور مرتب ہوتے ہیں اس لیے کسی نظام تعلیم میں سب سے بڑی اہمیت نظریے کی ہوتی ہے۔ ہر نظریہ ایک خاص طرز کا کردار پیدا کرتا ہے اس وجہ سے ہر نظام تعلیم انسانیت کی تعمیر و تشکیل کے لیے ایک سانچہ کے طور پر کام کرتا ہے' پس تعلیم دراصل زندگی کے فلسفے اور زندگی بسر کرنے کے صحیح اسلوب و فن پر مشتمل ہوتی ہے۔ تعلیم کی تمدنی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ درس گاہ بڑے بڑے انقلابوں کی پرورش گاہ ثابت ہوتی ہے اور معلم ایک چلتے ہوئے نظام کو زیر و زبر کر دینے کا وسیلہ بن سکتا ہے۔

تعلیم کی یہی اہمیت تھی جس کے پیش نظر ہماری تاریخ میں تعمیر و اصلاح کے داعی جب کبھی بھی سیاست کے دائرے میں خوف ناک مزاحمتوں کے سبب پسپا ہوئے ہیں تو انہوں نے بلا تامل تعلیم کے مورچے سنبھال لئے ہیں۔ بنو امیہ کے دور استبداد میں اصلاح پسند عناصر نے فقہ و اجتہاد کی مجالس اور اکیڈمیوں کو قائم کیا۔ اور ان کے ذریعہ نوجوان طاقت کو اپنے گرد سمیٹا اور ان کے سینوں میں نظریہ حق اور نظام خیر و فلاح کے بیج ڈالنے کا پورا پورا اہتمام کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسا علمی اور تحقیقی لٹریچر تخلیق کیا جو معاشرہ کے مجموعی ماحول پر تادیر اثر انداز ہوتا رہے۔ اسی طرح تاتاریوں کی تاخت کے بعد جب دوسرا بڑا دھچکا تعمیری رجحانات کو پہنچا تو اسی کے ردّ عمل کے تحت تصوف نے ایک نیا محاذ قائم کر دیا۔ یہ خانقاہی نظام تعلیم و تربیت تھا۔ اس کا اصل منشاء یہ تھا کہ ناسازگار حالات میں عملی سیاست سے الگ تھلگ رہ کر ایسے حلقے منظم کر دیئے جائیں جن میں سچی خدا پرستی' دنیا سے بے نیازی' ایثار و قربانی' حسن خلق اور دعوت الی اللہ کا ولولہ موجود ہو۔ گوشہ ہائے خلوت میں بیٹھ کر اس طرح کا سرمایہ محفوظ کرنے کا ایک عبوری دور گزارا جائے اور پھر جب بھی حالات موقع دیں تو اس سرمائے کو اجتماعی دائرے میں کھپا دیا جائے۔ مگر بد قسمتی سے انفرادی روحانیت کا کیف اصل مقصود سے تغافل کا موجب بن گیا۔ اور تصوف اجتماعیت کے مقابلے میں بجائے خود ایک مستقل نظام بن کر رہ گیا۔ اسی طرح ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کے انہدام کے بعد جب نظام حیات کی باگ ڈور پوری

طرح الحاد اور سیکولرازم کے قبضے میں چلی گئی تو دعوت اسلامی کے علمبردار مسجدوں اور حجروں میں تعلیمی مراکز کھول کر بیٹھ گئے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ ایک وقت میں دیوبند نے بھی اور ندوہ نے بھی اپنے اپنے طرز خیال کے کردار تیار کر کے سیاسی و اجتماعی سرگرمیوں پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ لیکن یہاں بھی وہی ہوا کہ آہستہ آہستہ اصل نصب العین اور اس کے وسیع تقاضے نگاہوں سے اوجھل ہوتے چلے گئے۔ اور ہماری دینی درسگاہیں فقط خطیب' مناظر' مفتی اور مدرس پیدا کرنے میں لگ گئیں۔

تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری تعلیمی تحریکیں اولاً ہمیشہ ایک انقلابی و تعمیری رجحان کے تحت رونما ہوتی رہیں۔ اور ان کا منشاء نظام حق کے ایسے علمبردار پیدا کرنا تھا جو نظریہ اسلامی کے امانت دار ہوں اور دنیاوی مفاد کو چھوڑ کر رضائے الٰہی کے لیے انقلابی تحریک بپا کرنے میں موزوں وقت پر حصہ ادا کر سکیں۔ اب یہ اس ملت کی بدقسمتی ہے کہ آج جب کہ حق و باطل کی کشمکش زوروں پر ہے اور ایک فیصلہ کن مرحلہ درپیش ہے' ہمارے دینی مراکز تعلیم اس معرکے کی پشت پناہی کرنے اور اس میں بہترین افراد سے کمک پہنچانے کا فریضہ ادا نہیں کر رہے۔

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ دینی مدارس کی روح میں جمود آ گیا ہے۔ اور یہ زندگی کے اسلامی نظریہ و اسلوب کی تعلیم سے طلباء کو کماحقہ مالا مال کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہے۔ پیش آئندہ دور اور اجتماعی ماحول کی ضرورت کے مطابق ذہن و کردار کی تعمیر نہیں ہو پا رہی۔ پس اب کسی تعامل کے بغیر اس تعلیمی نظام کار پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اس پر اگر اس نظام کے کار پردازوں میں سے کچھ بھی تعداد غور و فکر کے لیے تیار ہو تو چار نکات ایسے ہیں کہ جن کو پیش نظر رکھ کر دینی مدارس کی موجودہ ہیئت میں تغیر پیدا کرنا چاہیے۔

ایک اجتماعی نظام زندگی

ہماری دینی درسگاہوں کے کار پرداز پہلا نکتہ یہ سامنے رکھیں کہ انہیں زندگی کے سیاسی و معاشی مسائل اور تمدنی و اجتماعی معاملات سے کٹے ہوئے انفرادی مذہب کی تعلیم نہیں دینی ہے۔ بلکہ ایک تحریکی فلسفے اور ایک اجتماعی نظام زندگی کی تعلیم دینی ہے۔ بدقسمتی سے اب تک کی تعلیمی سرگرمیاں انفرادی مذہب سکھانے کے نئے اسلوب پر جاری ہیں۔ چند عقائد اور ان

کے متعلق کلامی بحثیں' بنیادی عبادات اور ان سے متعلق فقہی مسائل' انفرادی اخلاق و آداب کا ایک ضابطہ اور اس کے متعلق واعظانہ تلقینات' فرقوں کے اعتقادی و فقہی نظام کے مناظرانہ و مجادلانہ طریق فکر اور مسلمانوں کے پرسنل لاء کی حد تک بالکل مقلدانہ اور غیر اجتہادی ذہن سے قانونی تیاری' بس ان چیزوں پر ہمارے دینی مدارس کا نظام تعلیم مشتمل ہے۔ یہ دینی نظام تعلیم برسوں کی کاوش کے بعد بھی ایسے افراد تیار کر کے نہیں دیتا جو عالمگیر پیمانے پر زندگی اور تمدن کے وسیع نظریات و مسائل پر ماہرانہ رائے دے سکیں' جن کے پاس اعلیٰ درجے کے عقلی معیارات موجود ہوں۔ اور جو ماحول کی تمام سرگرمیوں میں حصہ لے سکیں اور زندگی سے من حیث المجموع دلچسپی لیں۔

فعال و متحرک انسان

دوسرا قابل غور نکتہ یہ ہے کہ کسی بھی نظریہ و فکر کے لیے صرف ایسے افراد کار آمد ہوتے ہیں جو فعال اور متحرک ہوں اور اپنے نظریات کا پورا پورا شعور رکھتے ہوں۔ مگر ہمارے نقشہ کار میں کوئی ایسی کوتاہی موجود ہے کہ ہم اسلام کی علمبرداری کے لیے برسوں سے ایک ہی ڈھب کا جو کردار پیدا کر رہے ہیں وہ فعال اور متحرک اور ذہنی و فکری برتری کا شعور رکھنے والا نہیں ہے بلکہ بالعموم گوشہ گیر' سیاست گریز' منفعل' مضمحل' یاس زدہ' پسپائی پسند اور منفیت کیش ہے۔ یہ اتنے سارے سخت الفاظ خدا شاہد ہے کہ کسی جذبہ نفرت یا تنقیص سے نہیں کہے جا رہے ہیں بلکہ امر واقعہ کو چونکہ ان کے بغیر واضح نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے بڑی دردمندی سے عرض کیے جا رہے ہیں۔

آپ خود جائزہ لے کر دیکھیں تو قلیل سی ایک تعداد کو چھوڑ کر دینی مدارس کے پیدا کردہ انسان کو ہم زندگی کے اجتماعی ہنگاموں سے بالکل منقطع پاتے ہیں وہ موجوں کی کشاکش سے ہٹ کر دور ساحل پر بیٹھا نظر آتا ہے۔ وہ مخالف اسلام رجحانات اور انہیں لے کر چلنے والے بااثر طبقات سے مرعوب اور ان کے مقابلے میں کسی قدر کمتری کے احساس میں مبتلا ہے۔ وہ باطل اور بدی سے دور رہنا چاہتا ہے۔ مگر اس سے پنجہ آزمائی نہیں کرتا۔ وہ اپنے مشاغل کے ایک محدود دائرے میں پناہ گزیں ہے۔ کاش کہ ہماری دینی درسگاہیں اس حقیقت کو محسوس کر کے اپنے نظام کار کو بدل ڈالیں۔

جدید علوم کا مطالعہ

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ اسلامی نظام کے لیے جدوجہد کرنا اگر مطلوب ہو تو ہمیں ایسے ذہن کی ضرورت ہے جو دور حاضر کے ذہن کو بے تکلفی سے مخاطب کر سکے۔ دور حاضر کے ذہن کو اپنی قوم کے دائرے کے اندر بھی اور وسیع تر بین الاقوامی دائرے میں بھی مخاطب اور متاثر کرنے کے لیے شرط اول یہ ہے کہ اس کو سمجھنے اور اسکا تجزیہ کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ اس کے علمی اور معلوماتی پس منظر کا احاطہ کیا جائے' وہ جس طرح کی کش مکش سے دوچار ہے اس کا پورا پورا اندازہ ہو اور اس کے سامنے آج جو مسائل جس شکل میں آ گئے ہیں۔ اور ان کے ساتھ جو کچھ استدلال موجود ہے اس سے داعی باخبر ہو۔ یہ صلاحیت دینی مدارس اپنے طلباء میں نہیں پیدا کر سکتے جب تک کہ وہ جدید فلسفہ ونفسیات اور سیاست ومعیشت کے علوم سے انہیں مالا مال نہ کریں اور انہیں مغربی نظام حیات کا اسلامی نظام حیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ نہ کرا دیں۔ اس مقصد کو مروجہ نصاب ہرگز پورا نہیں کر سکتا۔

عجب بات ہے کہ بار بار ملت کے اصحاب نظر نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں ایک بڑی تبدیلی ہونی چاہیے۔ مگر ہم درس نظامی کے چکر سے نہیں نکل سکتے اور نہ اس کے تنگ سے دائرے کو وسیع کر سکتے ہیں' درس نظامی بڑی ذہنی کاوشوں سے مرتب کیا گیا ہے اور وہ بڑی شے ہے' مگر حالات اور ضروریات نے ایسی نئی مانگیں پیدا کر دی ہیں کہ وہ ان کو پورا نہ کریں تو جمود چھایا رہے گا۔ زمانہ آگے آگے دوڑتا جائے گا اور ہم پیچھے ہی پیچھے گھسٹتے رہیں گے۔ ہم پیچھے گھسٹنے والوں کی آواز آگے دوڑنے والی منحرف طاقتیں کبھی نہیں سنیں گی۔ ان کو متاثر کرنے کے لیے ان کے ہمدوش ہو کر مسابقت کرنا ضروری ہے۔

آج اگر ایک داعی حق نظریہ ارتقا کو نہیں جانتا۔ اگر وہ ضبط ولادت کے اساسی تصورات سے آگاہ نہیں ہے۔ اگر وہ تجزیۂ نفس کے مختلف مدارس فکر سے بیگانہ ہے' اگر اسے مارکسزم سے آگاہی نہیں ہے۔ اگر وہ جدید فلسفہ تاریخ سے تعارف نہیں رکھتا' اگر اسے بین الاقوامی سیاست کا شعور نہیں ہے' تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ چند عقیدوں اور عبادتوں اور اخلاقی ہدایات پر وعظ سنا کر نئی نسلوں کو اپنے گرد سمیٹ سکے۔ حال یہ ہے کہ موسمیات اور دنیا کے طبعی جغرافیہ سے بھی ہمارا دینی نظام تعلیم طلبا کو بقدر ضرورت واقف نہیں کراتا۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر

ہماری کمزوری کی حد یہ ہے کہ ہمارے تیار کردہ افراد اس زبان اور ان اصطلاحات اور اسالیب سے بھی آگاہ نہیں ہیں جو اس دور کے ذہن کے لیے موثر ہیں۔ انگریزی تو انگریزی ہم ادبی معیار کی اچھی اردو سے بھی طلبا کو آراستہ نہیں کر رہے ہیں۔

تمدنی زندگی میں مقام

چوتھا نکتہ یہ قابل غور ہے کہ کوئی نظام تعلیم اسی صورت میں کامیابی سے چل سکتا ہے۔ جب کہ وہ اپنے سانچوں میں ایسے انسان ڈھال کر دیتا ہو جو عملاً ایک دور تمدن میں اپنی جگہ بنا سکیں۔ ہر نظریاتی نظام تعلیم کو کارفرما اور کارکن عناصر تیار کرنا ہوتے ہیں۔ درسگاہوں سے طلبہ نکلیں تو زندگی کے کارزار تمدن میں کوئی نہ کوئی مقام ان کو طلب کرے۔ ان میں ایسی صلاحیتیں ہونی چاہئیں کہ وہ تمدن کے کسی نہ کسی شعبے یا ادارے کو چلانے کے اہل ہوں۔ وہ میدان میں آئیں تو نظام رائج سے کشمکش کرتے ہوئے بھی معاش کے راستے نکال سکیں۔ زندگی ان کی ضرورت محسوس کرے۔ تمدن میں ان کی مانگ ہو۔ وہ اول تو کسی شعبے میں اچھے لیڈر اور کارپرداز ثابت ہوں ورنہ کم از کم اچھے کارکن ضرور ہوں۔ افسوس ہے کہ ہمارا مروجہ دینی نظام تعلیم ایسے افراد تیار کر کے نہیں دے رہا کہ جو صحافت و ادب اور تصنیف و تالیف سے لے کر تجارت و صنعت اور ڈاکٹری، انجینئرنگ اور حساب کاری تک گوناگوں مشاغل کو اپنا سکیں۔ اس وقت کی یہ حالت ہے کہ بارہ بارہ سال تک کی دینی تعلیم پایا ہوا نوجوان کلرک تک نہیں بن سکتا کہ وہ حلال کی روزی کما کر اپنے حلقہ ربط میں زبان و عمل سے دین و عمل کی دعوت دیتا رہے۔ کل اگر یہاں نظام اسلامی کو چلانے کے لیے کارکنوں کی مانگ پیدا ہو تو ہمارا دینی نظام تعلیم اس مانگ کو پورا نہیں کر سکتا۔

ان نکات چہارگانہ کو پیش خدمت کر کے میں بہت ہی عاجزانہ انداز سے دینی مدارس کے کارپردازوں کی خدمت میں یہ مشورہ رکھتا ہوں کہ وہ کسی ایسے نقشے پر کام کریں کہ طلبا ان کے یہاں دس بارہ سال میں فارغ ہوں تو ایک طرف اسلام کا ایک نظام زندگی کی حیثیت سے ماہرانہ مطالعہ رکھتے ہوں اور دوسری طرف میٹرک کا ایف اے یا بی اے کے درجات کے مساوی انگریزی اور جدید علوم کی تعلیم سے آراستہ ہو کر نکلیں تاکہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے ان پر پورا میدان کھلا رہے۔ جدید علوم کے نصاب کو جوں کا توں لے لینے کے بجائے اسلامی نظریۂ حیات کی روشنی میں ناقدانہ طریق پر مطالعہ کرایا جائے تاکہ مغربی تصورات کی کمزوریاں نمایاں ہوں اور اسلامی تصورات کی برتری کا سکہ ذہنوں پر بیٹھ جائے۔ ایسے کورس

تیار کرائے جا سکتے ہیں جو اسلامی اور مغربی تصورات کا ہر دائرے میں تقابلی مطالعہ اس طرح کرائیں کہ اسلامی تصورات کا اثبات ہو اور مغربی تصورات کی تردید!

اسی کے ساتھ دینی درسگاہوں کے ماحول کو بھی اس جمود سے نکالا جائے جس میں وہ برسوں سے پڑا ہے۔ طلبا کو سادگی کے ساتھ صاف ستھرے رہن سہن کی تربیت دی جائے تاکہ ان میں عزت نفس کا احساس زندہ ہو اور وہ کسی نفسیاتی الجھن میں نہ پڑیں۔ اس سلسلے میں دینی مدارس کے مالیاتی نظام کو بھی نئے سرے سے استوار کرنا چاہیے۔

فقہی اختلافات

ہمارے اسلامی مدارس کے نصابوں میں ان کے مخصوص فقہی وکلامی نقطۂ نظر کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ چنانچہ ہر دارالعلوم سے فارغ ہونے والے نوجوان جو امام' خطیب' مدرس' مفتی یا واعظ بنتے ہیں اپنی مخصوص فقہ کی حمایت اور دوسری فقہوں کی مخالفت میں اتنی دور تک جاتے ہیں کہ گویا ہر فقہی اختلاف ایمان وکفر کا فیصلہ کرنے والا ہے۔ اس کے نتیجے میں سالہا سال سے باہمی منافرتیں' مناقشے' مناظرے' تکفیر بازیاں چاروں طرف ایک زہریلے دھوئیں کی مانند پھیلی ہوئی ہیں۔ اس مرض کا علاج جلد ہونا چاہیے۔ کتنا افسوسناک منظر ہوتا ہے جب ایک ہی موضوع پر مثلاً عورت کی حکمرانی' رجم' شریعت بل' وغیرہ — یک دم مختلف بولیاں بولی جانے لگتی ہیں۔ اس کے دو حل ہیں۔

ایک یہ کہ فقہی اختلافات کو ایک ہی چمن کے پھولوں کے مختلف رنگوں کی مانند دیکھا جائے۔ ہر دارالعلوم ایک ہی فقہ نہیں' بلکہ چاروں فقہوں کی تعلیم دے اور ساری فقہوں کو برحق قرار دے۔

دوسرے یہ کہ علماء کی ایک کونسل ہونی چاہیے جسے وہ خود ہی تشکیل دیں اور وقت کے کسی بھی نزاعی مسئلے کو اس میں زیر بحث لا کر ایک متفقہ اعلامیہ نشر کر دیں۔ متفرق انفرادی بیانات کی روک تھام کی جائے۔ جب تک فرقہ بندی کا خاتمہ نہیں ہو گا۔ اقامت دین کا کار عظیم انجام نہ پا سکے گا۔

اسی سلسلے میں انتخابی تجربے کو لیجئے بیک وقت متعدد دینی گروہ کھڑے ہوئے اور گھاٹے میں رہے حالانکہ اگر وہ اپنی کونسل کے واحد پلیٹ فارم سے اپنی سیٹیں طے کرنے کے بعد دوسروں سے اتحاد بناتے تو ایک انقلاب واقع ہو جاتا۔

دینی مدارس میں نظام تعلیم *

تعلیم کا موضوع ایک ایسا موضوع ہے جو معاشرے کا دکھتا پھوڑا بن چکا ہے جس کے درد سے ٹیسیں اہل احساس کے دل و دماغ ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ پاکستان بناتے ہوئے قیام اسلام کے جو وعدے برصغیر کے کروڑوں عوام سے استوار کیے گئے تھے وہ کئی عشرے گزرنے کے بعد بہت بڑا فراڈ ثابت ہو چکے ہیں۔ یہی فراڈ نظام تعلیم کے بارے میں سامنے آیا۔

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز کی کتاب ''دینی مدارس میں نظام تعلیم'' کو پڑھتے ہوئے میرے ذہن میں کئی خیالات اٹھے جن کا تذکرہ کر رہا ہوں۔

ایک مسئلہ یہ کہ موجودہ نظام تعلیم کا جو ڈھانچہ مسجدوں سے اٹھ کر مدرسوں تک آتا ہے اس میں آپ پیوندکاری کر کے تھوڑی بہت بہتری پیدا کر سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس پورے ڈھانچے کو بدلنے کی کوئی تدبیر بھی ممکن ہے۔ بطور خود اہل دین ایک نیا نظام تعلیم کھڑا کریں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ان مدارس میں نصابی تبدیلیاں جب بھی سوچی جاتی ہیں تو جدید علوم کے دو ایک پیریڈ بڑھا دیئے جاتے ہیں۔ ایک نئے طرز کی تعلیمی وحدت سامنے رکھ کر کام کرنا ہو تو یہ طریقہ بے اثر ہے۔ نئی کتابیں لکھوایئے جو دونوں طرف کے افکار کو یکجا لائیں اور اسلامی اصول و مقاصد کے تابع رکھیں۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ آپ تبدیلی نصاب کے لئے کیوں نہیں خاص کمیٹیاں مقرر کرتے جو نئے کورسز تجویز کریں۔ کہیں سے موطا اٹھائیں' کہیں سے کتاب الخراج یا کتاب الاموال' کہیں سے مقدمہ ابن خلدون یا احکام السلطانیہ' کہیں سے مجدد الف ثانی کے مکاتیب' کہیں سے شاہ ولی اللہ کی اصول تفسیر' کہیں سے مولانا مودودی کی الجہاد فی الاسلام یا تنقیحات' کہیں سے اقبال کے علوم اسلامی کی تشکیل جدید (وغیرہ) اور پھر جدید علوم کی تازہ معلومات کے لئے از سر نو تیار کردہ کورس (فلسفہ' نفسیات' معاشیات' اقبالیات وغیرہ) کی ترویج۔ آخر اس کی فکر

* ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۸۷ء

کیوں نہیں ہے۔

چوتھا یہ کہ آپ نے اس نظام سے اور تو ہر قسم کے افراد برآمد کر لئے مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ نظام تعلیم کبھی تخلیقی ذہن کے بیدار دل دانشور نہ دے سکے گا جو اسلام کے خلاف اٹھنے والے ہر علمی چیلنج کا جواب دے سکیں۔ آج تک تو حال زار یہی ہے۔

پھر ستم یہ کہ آج کل کے معیاری اہل تحقیق' مذہبی نظم مدارس تو کیا' جدید سرکاری نظام تعلیم بھی کم از کم اسلامی صفوں کو تو بالکل نہیں دے رہا ہے۔ اگلے دن مجھ سے نائیجیریا میں پڑھانے والے ایک استاد ملے تو یہ ضرورت ظاہر کی کہ نفسیات کے متعلق ان کو رہنمائی حاصل کرنے کے لئے کوئی آدمی بتایئے۔

میں نے انہیں صفائی سے یہ کہا کہ میری نظر میں ہمارے پاس کوئی ایسا ماہر علوم النفس نہیں ہے جو تازہ نگاہی سے مغربی نفسیات کے بھی باریک رگ و ریشے کو جانتا ہو اور پھر اسلامی نقطۂ نظر سے مادہ پرستوں کے علم النفس کے مقابلے میں خدا پرستانہ علم النفس کی بنیادیں واضح کر سکے۔ یہی حال فلسفہ' تاریخ' سیاسیات' معیشت' اجتماعیات وغیرہ علوم کا ہے۔

سالہا سال سے کام ہو رہا ہے اور اس میں جو بڑے بڑے رخنے ہیں ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔

دینی مدارس کا ''مسئلہ اختلاف'' بھی اصلاح و ترقی میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ یہ تو عین فروغ اسلام اور نفاذ اسلام میں رکاوٹ ہے۔ اختلافات پر بھی سیمینار اور میٹنگز منعقد کرنے کی ضرورت ہے۔ ان لوگوں سے پوچھا جائے کہ لڑے جھگڑے بغیر پیار اور محبت سے اختلاف کرنے کی صورتیں کیا ہیں؟ کیا تدبیر ہو کہ لوگ یہ امکان تسلیم کر لیں کہ ان کا مقابل بھی امکانی طور پر حق پر ہو سکتا ہے یا اگر مختلف گروہوں کے لوگ جمع ہوں تو اس طرح مل جل کر وقت گزاریں کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلے کہ یہ الگ الگ نقطہ ہائے نظر رکھنے والے لوگ ہیں۔

یہ تو ایک مصیبت ہے کہ ایک فرقہ وارانہ ذہنیت پر کسی مدرسے کی بنیاد رکھی جائے' پھر اسی ذہنیت کو طلبہ میں ٹھونسا جائے' قرآن کی تفسیر اور سنت کی تعبیر اسی ذہنیت کے مطابق کی جائے۔ اس کے حق میں کتب پڑھائی جائیں اور مخالف کتب کے رد کی تعلیم دی جائے۔ نیز کوئی دوسرا مسلک رکھنے والوں کے لئے نفرت کا بیج بو دیا جائے۔ حقیقی علم اور نفرت میں یا نیکی اور نفرت میں یا خدا پرستی اور نفرت میں سخت منافرت ہے۔

آج بہت سی درس گاہیں ایسی ہیں جو معاشرے کو جھگڑالو اور فتنہ آراء دینی پیشوا فراہم کر رہی ہیں اور نفرتوں کی ایجنسیاں جا بجا کھلی ہیں۔ کم سے کم سارے مدارس یہ مان لیں کہ اختلافات کے باوجود محبت و اتحاد رکھ کر کام کرنے کی ایک ایسی الگ تعلیم گاہ ہو جس میں ہر فارغ التحصیل طالب علم (عالم) کم سے کم ایک سال ضرور رہے۔ دینی اساتذہ کے لئے اس مقصد کی خاطر باقاعدہ ایک ٹیچرز ٹریننگ کالج قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے نقشے میں بیماری اختلاف کے علاج کی راہیں نکالی جا سکتی ہیں۔

واحدانی نظام تعلیم*

منٹگمری[1] کے گورنمنٹ کالج میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر مسٹر یوکرامت نے جو تقریر فرمائی ہے وہ بڑی انقلابی شان رکھتی ہے۔ انہوں نے بجا طور پر اس امر کی ضرورت ظاہر کی کہ آئندہ ایسے دینی پیشواؤں اور معلموں کی ضرورت ہے جو دینی علوم کے ساتھ ساتھ جدید دنیا کے احوال اور انسانی مسائل کو بھی جانتے ہوں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ایسے لوگ پرانے طرز کے دینی دارالعلوموں کے ذریعے پیدا نہیں کیئے جا سکتے۔ اس کی وضاحت میں انہوں نے مزید کہا کہ موجودہ یونیورسٹیوں کو دینی مدارس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیئے۔

یہ نظریہ اصولاً بالکل درست ہے کہ اگر اسلام دین و دنیا کا جامع ہے تو اس کا نظام تعلیم بھی وحدانی ہونا چاہیئے۔ موجودہ صورت میں ہماری ایک بڑی قومی پیچیدگی یہ ہے کہ قدیم مدارس ایسا عالم دین پیدا کرتے ہیں جو جدید دور سے پوری طرح آگاہ نہیں۔ اور جدید کالج ایسا عالم دنیا پیدا کرتے ہیں جو دین کا رمز آشنا نہیں۔ دونوں کا زاویۂ نگاہ خوف ناک حد تک اختلاف رکھتا ہے اور ان کا ذہنی تصادم بے شمار مشکلات کا باعث بن رہا ہے۔ مگر جب تک ایک عبوری دور میں ایسا انتظام نہ کیا جائے کہ قدیم دینی مدارس اپنے ہاں جدید علوم کا نصاب بھی اختیار کر لیں اور جدید کالج دینی تعلیم کو اپنے نظام میں سمو لیں۔ اور اس دو طرفہ کوشش سے دین و دنیا کی پوری سوجھ بوجھ رکھنے والا ایک قابل اعتماد عنصر پیدا نہ ہو جائے اس سے پہلے قدیم دینی مدارس کو بند کر دینا ان رہی سہی کوششوں کا بھی خاتمہ کر دے گا جنہیں ناسازگار حالات میں ایک طبقہ بڑی قربانیوں اور جانفشانیوں سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ دینی مدارس کو جن یونیورسٹیوں کے تابع آپ کرنا چاہتے ہیں وہ بحالات موجودہ ایسے کارپردازوں اور

---

* ہفت روزہ شہاب ۲۲ مئی ۱۹۶۰ء

[1] موجودہ نام ساہیوال۔

کارکنوں کے ذریعے چل رہی ہیں' ان میں اس طرح کا تعلیمی پروگرام اور نصاب زیر عمل ہے اور ایسا ماحول ان کی داستانوں میں پایا جاتا ہے کہ دینی طرز فکر مغرب پرستانہ مادی زاویہ نگاہ سے فوراً مغلوب ہو کر رہ جائے گا۔

قبل اس کے موجودہ یونیورسٹیاں وحدانی قسم کا اسلامی نظام تعلیم چلانے کے قابل ہو سکیں' نہایت ضروری ہے کہ وہ تمام علوم متداولہ کے نصاب اسلامی نظریہ حیات کے مطابق از سر نو مرتب کرائیں' مخصوص کتابیں لکھوائیں۔ نیز مختلف مضامین کے نصاب میں اعلیٰ درجہ کی ان عظیم کتابوں کو شریک کریں جن کی قدر و قیمت مستقل ہے — جیسے کتاب الاموال' کتاب الخراج' ہدایہ' کنز العمال' مقدمہ ابن خلدون وغیرہ۔ زمانہ قریب کے علماء و مفکرین کی گراں بہا تصانیف (ان کے تراجم) مختلف مضامین کے نصابوں میں شامل کی جائیں۔ مثلاً حجۃ اللہ البالغہ (شاہ ولی اللہ) منصب امامت (شاہ اسماعیل) تذکرہ (مولانا ابوالکلام آزاد) تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (علامہ اقبال) الکلام اور علم الکلام (شبلی نعمانی) ارض القرآن (سید سلیمان ندوی) تدوین حدیث (مولانا مناظر احسن گیلانی) اسلامی قانون بین الممالک (ڈاکٹر حمید اللہ) اسلام اور جدید معاشی نظریات (مولانا مودودی) اور اس مرتبے کی دوسری کتابیں اسلامی فکر و شعور کے لازوال سرچشمے ہیں۔ ملت کے سابق اور موجودہ مفکرین سے استفادہ کئے بغیر ہمارا نظام تعلیم اسلامی تو کجا' قومی بھی نہیں بن سکتا۔

پھر اس کے ساتھ ساتھ چند برس لگا کر ایسے اساتذہ پیدا کیجئے جن میں ایک طرف دین پر ایمان محکم موجود ہو' دوسری طرف احوال دنیا کے رمز شناس ہوں۔ تیسری طرف وہ اس عملی نفاق سے محفوظ ہوں جس کے نمونے آج بکثرت پائے جاتے ہیں۔ جب کہیں جا کر موجودہ یونیورسٹیاں اس قابل ہو سکیں گی کہ وہ اسلام کے مطابق ایک وحدانی نظام تعلیم چلا سکیں۔

ایسے بڑے بڑے معاملات میں ادھوری فکر سے کام لینا اور عظیم الشان تبدیلیوں کے مناسب قابل عمل منصوبے بنائے بغیر بھاری قدم اٹھا دینا جتنے اچھے جذبوں کا حامل ہوتا ہے' ان کے اچھے نتائج رونما نہیں ہو سکتے۔
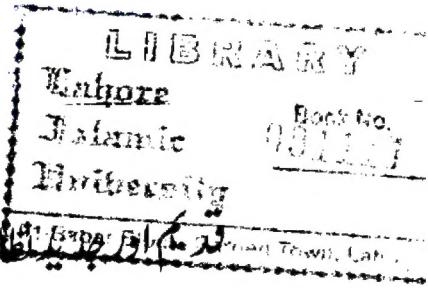
قدیم اور جدید نظام تعلیم کی ہم آہنگی

قدیم نظام تعلیم اور جدید نظام تعلیم کو ہم آہنگ کرنے کا سوال بڑا ہی ٹیڑھا ہے۔ جس طرح جدید تعلیمی اداروں میں دینیات کا پیریڈ رکھنے سے بات نہیں بنتی' اسی طرح درس نظامی کے ساتھ انگریزی پڑھا دینے سے بھی کام نہیں چلتا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ جدید مروجہ میکالوی نظام تعلیم کی اساس الحاد' ذنویت اور مادہ پرستی پر ہے' لہٰذا سارے علوم بھی اسی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ تھوڑی سی تعلیم دینیات اس کی زہر کا تریاق نہیں بن سکتی۔ وہ تو جڑ سے بدلنے کے قابل ہے۔

دوسری طرف قدیم طریق درس پر مبنی اسلامی نظام تعلیم ہے۔ اس میں اساسی دینداری تو درست ہے اور اس پر کھڑی ہونے والی عمارت بھی لادینی نہیں۔ لیکن ایک کمی یہ ہے کہ زمانہ جدید کے علوم و مسائل کا پورا پورا شعور نہ ہونے کی وجہ سے دور حاضر کے پیدا ہونے والے سوالات کا جواب مہیا کرنا اور اس کے لئے طریق استدلال اور طریق بیان کو وقت کے تقاضوں کے مطابق تشکیل دینا ممکن نہیں ہے۔ مثلاً یہ بات تو ہمارا دینی طالب علم سیکھ کر نکلے گا کہ سود حرام ہے' مگر وہ یہ نہیں سوچ سکتا کہ اگر سود حرام ہے تو بنک کاری اور بیمہ کا کیا سسٹم ایجاد کیا جا سکتا ہے یا وہ مغربی معاشرت کے متعلق شدید نفرت سے کہے گا کہ وہ بڑی خراب ہے لیکن اس کے پاس نکاح و طلاق' قتل اولاد' عام جرائم' چوری' اچکا پن' ڈاکے' قتل وغیرہ کے نہ اعداد و شمار ہیں اور نہ فلسفیوں اور دانش وروں کی معاشرتی تصانیف اور سرکاری رپورٹوں کے حوالے۔ اور ان چیزوں کے بغیر مغربی تہذیب کے حملے کا مقابلہ کرنا بہت مشکل ہے بلکہ ممکن ہی نہیں۔ محض لفاظی کے بل پر وعظ تو ہو جاتے ہیں مگر پڑھے لکھے اور عالم قسم کے مخالفین کے ساتھ سیمیناروں میں شریک ہو کر بات نہیں کی جا سکتی۔

مدارس عربیہ کے متعلق میں نے پہلے بھی کہیں لکھا ہے کہ جب تک نظریہ اسلامی پر وحدانی نصاب کا سلسلہ چلانے کے لئے کسی نئی یونیورسٹی یا کالج کا تجربہ شروع نہیں ہوتا' اس

وقت تک موجودہ دینی مدارس کے لئے بدرجہ اقل یہ صورت عمل مفید ہوسکتی ہے کہ وہ سابق نصابی پروگرام میں کمی کر کے کم ازکم دو دو نئے جدید علوم (مع انگریزی) داخل کریں۔ یا مدت تعلیم ایک سال بڑھا دیں۔

حسب ذیل مضامین میں سے مختلف مدارس مختلف مضامین چھانٹ لیں۔

۱۔ فلسفہ (الطبیعات' کونیات' اخلاق' نفسیات وغیرہ میں سے کوئی)

۲۔ معاشیات' بینکنگ سسٹم' سیاسیات و جمہوریت' اجتماعیات (Socialogy)

۳۔ علم جرائم وتعزیر

۴۔ مستشرقین کی اٹھائی ہوئی خلاف اسلام بحثیں

۵۔ نظریہ ارتقاء' نظریہ آبادی' عائلی نظام

ان مضامین پر نئے نصابی سلسلے تیار کرنے کا کام جاری رہے' اور درمیانی مدت میں ان موضوعات پر اچھی مستند کتابیں پڑھائی جائیں جن کے ساتھ خود مغربی اہل نظر کے تنقیدی مباحث بھی ہوں' اور اسلامی نقطۂ نظر سے ان کی تردید میں یہاں کا شائع شدہ مواد چھانٹا پرکھا جائے اور کچھ کمی استاد پوری کرے۔

مندرجہ بالا مضامین کے ساتھ انگریزی کی تعلیم اس معیار کی دی جائے کہ طالب علم انگریزی بولنے لکھنے اور سمجھنے پر قادر ہو۔ اس کے لئے مناسب طریق تعلیم اختیار کیا جائے محض امتحان پاس کرا دینا کوئی معیار نہیں۔

مشکل ... ہے کہ قدیم نصاب والوں کی بڑی تعداد پرانے نصاب درس نظامی کے ساتھ ا... [illegible] ہے کہ وہ اس میں کوئی چیز چھوڑ نہیں سکتی۔

حالانکہ دینی علوم کی بھی فیکلٹی وار تقسیم کر دینی چاہئے۔ مثلاً

۱۔ عربی زبان دانی + علم قرآن + حدیث (+ فقہ کم اہمیت کے ساتھ)

۲۔ عربی زبان دانی + علم قرآن + حدیث (+ منطق وفلسفہ قدیم کم اہمیت کے ساتھ)

۳۔ عربی زبان دانی + علم قرآن + حدیث (+ کلام وتصوف کم اہمیت کے ساتھ)

۴۔ عربی زبان دانی + علم قرآن + حدیث (فصاحت وبلاغت' کلام عرف' کم اہمیت کے ساتھ)

یہ باتیں میں سرسری طور پر لکھ رہا ہوں' اہل نظر کو سر جوڑ کر خود غور کرنا چاہئے۔

مصنف کی دیگر کتب

- ☆ محسن انسانیت ﷺ
- ☆ سید انسانیت ﷺ
- ☆ رسول ﷺ اور سنت رسول ﷺ
- ☆ نور کی ندیاں رواں (نعتیہ کلام)
- ☆ تحریکی شعور
- ☆ افشاں (نظموں کا مجموعہ)
- ☆ شعلہ خیال بہ اضافہ شعاع روزن
- ☆ اقبال کا شعلہ نوا
- ☆ شعاع جمال (غزلیں)
- ☆ المودودی
- ☆ عورت معرض کشمکش میں
- ☆ معرکہ دین وسیاست
- ☆ انوار و آثار
- ☆ اقامت دین اور دولت پرست معاشرہ
- ☆ دور حاضر میں نظام مصطفیٰ
- ☆ تعمیر سیرت کے لوازم
- ☆ بیمہ زندگی
- ☆ تحریک اسلامی دوسری اجتماعی تحریکوں کے مقابلہ میں
- ☆ اپنی اصلاح آپ
- ☆ اسلامی نظام ہی کیوں؟
- ☆ پھول اور ستارے
- ☆ نیکی کے سپاہی
- ☆ تحریکی کام کا خاکہ
- ☆ **Religion and Politics**

ISBN 969-503-762-3

الفیصل ناشران و تاجران کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور